فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ

جلد اوّل

کتاب العقائد

تالیف

شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی رحمہ اللہ

(فاضل مدینہ یونیورسٹی)

جمع، ترتیب و تبویب

الشیخ حافظ عبدالشکور مدنی بن حافظ علم الدین رحمہ اللہ

(فاضل مدینہ یونیورسٹی)

فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون
فتاوی
ثنائیہ مدنیہ
جلد اوّل
کتاب العقائد
تالیف
شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی
(فاضل مدینہ یونیورسٹی)
جمع، ترتیب و تبویب
الشیخ حافظ عبد الشکور مدنی بن حافظ علم الدین
(فاضل مدینہ یونیورسٹی)
تقدیم
ڈاکٹر حافظ عبد الرشید اظہر حفظہ اللہ
(فاضل مدینہ یونیورسٹی)
تحقیق و تخریج
الاخ الکریم مولانا عابد الٰہی
(فاضل درس نظامی)
www.KitaboSunnat.com
DAR-UL-IRSHAD
دار الارشاد
214۔ بی سبزہ زار سکیم لاہور۔ پاکستان
فون: 042-8402365-042-7845274
موبائل: 0300-4723844 - 0301-4678065

نام کتاب ــــ فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ

مؤلف ــــ شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ

مرتب ــــ حافظ عبدالشکور مدنی (فاضل مدینہ یونیورسٹی)

تحقیق وتخریج ــــ مولانا عابد الٰہی

کمپوزنگ ــــ عبدالقدوس (0300-8027663)

ناشر ــــ "دارالارشاد" لاہور

ایڈریس ــــ B/214 سبزہ زار سکیم لاہور فون = 7845274۔

موبائل ــــ 0333-4481597

ملنے کے پتے

1۔ مکتبہ دارالسلام اردو بازار لاہور
2۔ مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور
3۔ نعمانی کتب خانہ اردو بازار لاہور
4۔ فاروقی کتب خانہ، اردو بازار لاہور
5۔ محمدی کیسٹ ہاؤس اردو بازار لاہور
6۔ فاران اکیڈمی اردو بازار لاہور
7۔ اسلامی اکادمی اردو بازار لاہور
8۔ مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور
9۔ فیض اللہ اکیڈمی اردو بازار لاہور
10۔ مکتبہ اہلحدیث کورٹ روڈ کراچی
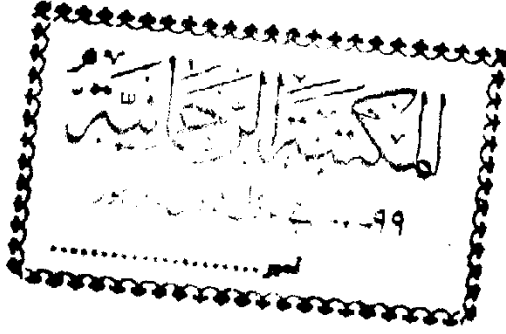
فتاوی

ثنائیہ مدنیہ

آئینۂ ترتیب

فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ

المجلد الاوّل

کتاب العقائد

① بسم اللہ کی جگہ کچھ اور پڑھنا یا لکھنا

② اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات

③ بیت اللہ شریف اور مساجد سے متعلقہ مسائل

۴ قرآن مجید اور اسکے متعلقات

﴿۵﴾ دعوت و تبلیغ اور اسلام

⟨۶⟩ دعا، اَذکار اور اَوراد و وظائف

⑦ ملائکہ، جنات اور شیاطین

⑧ قیامت، حساب و کتاب اور جنت و دوزخ وغیرہ

⑨ شریعت، قضاء اور تقدیر وغیرہ

⑩ سیرت و شمائل و فضائل رسول اللہ ﷺ اور دیگر انبیاءِ کرام علیہم السلام

﴿۱۱﴾ العلم والعلماء

﴿۱۲﴾ حدیث اور اصولِ حدیث

⑭ کتبِ احادیث اور ان کے متعلقات

⑭ بعض آیات اور احادیث کی تطبیق و توضیح

﴿۱۵﴾ الأدیان والفِرَق اور عقائد وغیرہ

﴿۱۶﴾ کفر، شرک اور مشرکین

⑰ منکرینِ حدیث وسنت

⑱ تصاویر و تماثیل وغیرہ

⑲ حلال وحرام اور ان کے متعلقات

۲۰ نذر و نیاز، صدقہ خیرات، ایصالِ ثواب اور حصولِ برکت کے اعمال وغیرہ

﴿۲۱﴾ دم، جادو، تعویذات اور توہمات وخیالات

۲۲ انسانوں اور اشیاء کے نام متعین کرنے کی شرعی حیثیت

﴿۲۳﴾ انسانی جسم و اعضاء سے متعلقہ مسائل

﴿۲۴﴾ بدعات و رسومات

﴿۲۵﴾ دورِ حاضر کے جدید مسائل اوران کا شرعی حکم

﴿۲۶﴾ قبروں اور قبرستان سے متعلقہ مسائل

۲۷ تاریخی حالات و واقعات

﴿۲۸﴾ حکومت، سیاست، قیادت و سیادت اور حکمران

★	①......مسجد کی خطابت کے لئے موجودہ زمانے میں کیا کوئی علمی معیار ہونا چاہیے یا نہیں؟ ②......کیا ایک حافظ قاری کی موجودگی میں ایک جاہل شخص کا از خود امامت کے لئے آگے بڑھنا اور امامت کا فریضہ ادا کرنا درست ہے؟ ③...... یہ روایت سنی تھی کہ ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو وعظ کرتے سنا تو اس سے دریافت کیا کہ کیا تم ناسخ و منسوخ کا علم جانتے ہو؟ جواباً اس نے نفی کا اظہار کیا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وعظ نہ کرو خود بھی گمراہ ہو گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرو گے''۔ کیا یہ روایت درست ہے؟	772
★	ہمارے ملک میں بہت سی دینی جماعتیں اور تنظیمیں ہیں مثلاً جمعیت اہل حدیث، غرباء اہل حدیث، حزب اللہ، مرکز الدعوۃ والارشاد، جماعت المسلمین، مرکزی جمعیت اہل حدیث، اشاعۃ التوحید والسنۃ (عبدالسلام رستمی) وغیرہ	773
①	ان کی جماعت سازی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟	773
②	ان جماعتوں کے امیر کی حیثیت کیا ہے؟	773
③	خلافت اسلامیہ کے احیاء کے لیے انفرادی دعوت و جہاد کرنا چاہیے یا کسی تنظیم سے مل کر؟	773
★	اسلام میں بیعت کی کیا حیثیت ہے؟ ① ڈاکٹر اسرار کی بیعت شرعی نقطہ نظر سے کیسی ہے؟ ② تبلیغی جماعت کی بیعت شرعی لحاظ سے کیسی ہے؟ ③ پیر بھائیوں کی بیعت کی شرعی حیثیت کیسی ہے؟ ④ آج کے دور میں کس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے؟ ⑤ کیا کلمہ پڑھ لینے کے بعد بھی کسی کا بیعت ہونا ضروری ہے؟	774
★	کیا زندگی میں کسی کا بیعت ہونا صحیح ہے؟ جیسے عموماً لوگ پیرو مرشد پکڑتے ہیں۔ بیعت ہونا صحیح ہے یا نہیں؟	775
★	١٩ جولائی ١٩٩٦ء شمارہ نمبر ٢٧ میں آپ کا ایک فتویٰ شائع ہوا تھا۔ جس میں آپ نے بیعت کو بدعت قرار دیا ہے۔ آج کے دورِ ناگوار میں ایک اکیلا آدمی برائیوں کے طوفان کے سامنے کیسے سینہ تان کے کھڑا ہو سکتا ہے؟ کسی جماعت میں امیر جماعت کی بیعت کے بغیر ڈسپلن قائم ہونا ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ شاہ اسماعیل شہید نے بھی سید احمد شہید کی بیعت کی تھی۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں کہ ایک اکیلا آدمی کیا کرے؟	775

﴿۲۹﴾ معاشرتی و دیگر آداب

☆	شروع کے زمانہ اسلام میں لونڈی رکھنے کا رواج تھا لیکن آج کے معاشرتی ماحول میں کیا لونڈی رکھی جاسکتی ہے؟ اس کا طریقہ کار کیا ہوگا؟	819
☆	رخساروں اور داڑھی پر جو بال اگیں وہ داڑھی ہے لیکن ٹھوڑی سے اوپر نچلے ہونٹ کے بالکل نیچے عنفقہ چھوٹی داڑھی کیا یہ بھی داڑھی میں شامل ہے؟	820
☆	جبڑے کی ہڈی سے پرے جو بال اُگیں ان کا کیا حکم ہے۔ آنکھوں کی نچلی ہڈی کے بال مونڈنا جائز ہے؟	820
☆	بعض لوگ کہتے ہیں کہ ناف کے بالکل قریب سے بال مونڈنا شروع کریں خصیوں تک۔ تَحْتَ السُّرَّہ بھی کسی حدیث میں آیا ہے یا تکونی حصے سے خصیوں تک بال صاف کئے جائیں؟	820
☆	''چہرۂ عورت کا'' پردے کے بارے میں تفصیلاً قرآن وحدیث سے جواب چاہیے اور عرض یہ ہے کہ صاف صاف چہرے کے پردے کے لئے کیوں نہیں کہا گیا؟	821
☆	غیر محرم عورت کے جنازے کو غیر مرد اٹھا سکتا ہے یا نہیں؟	822
☆	حدیث شریف میں ہے جو کسی مسلمان بھائی سے اختلاف کی وجہ سے تین دن تک کلام نہیں کرتا تو اس کی کوئی عبادت بھی قبول نہیں ہوتی ہم لوگ باہمی اختلافات کی وجہ سے طویل عرصہ تک بات چیت نہیں کرتے تو کس زُمرہ میں آتے ہیں؟	822
☆	ایک آدمی داڑھی کا مذاق اڑاتا ہے اور پھر خدا سے توبہ کر لیتا ہے کیا اس کی توبہ قبول ہوسکتی ہے؟	822
☆	بغیر وضو دین کی باتیں کرنی جائز ہیں یا نہیں؟	823
☆	اگر درود شریف کی بے ادبی ہو جائے تو اس کا کیا حل ہے؟	823
☆	بعض لڑکیاں اُلٹی مانگ نکالتی ہیں یعنی سر کے بالوں کا ''چیر'' درمیان میں نکالنے کی بجائے انگریزوں کی طرح نکالتی ہیں۔ کیا شریعت میں اس کی کوئی ممانعت تو نہیں؟	823
☆	ملاقات کے وقت مصافحہ کرنے اور سلام کہنے کا حکم تو ہے کیا واپسی کے وقت سلام کہنا اور مصافحہ کرنا کسی حدیث سے ثابت ہے؟ مصافحہ ایک ہاتھ سے کرنا چاہیے یا دو سے؟	824

۳۰ حقوق العباد اور معاشرتی برائیاں وغیرہ

☆	ایک شخص عابد کی شادی پروین اختر سے ہوئی، پروین اختر سے عابد کی ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ بعد میں عابد فوت ہو گیا۔ پروین اختر کے والدین کچھ عرصہ بعد اپنی بچی پروین اختر کو مع بچی کے لے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ والدین، پروین اختر کو گھر بٹھائے رکھتے ہیں' بعد میں اس کی شادی کسی دوسری جگہ کر دیتے ہیں۔ اب بچی کے دادا (عابد کے والد) نے اپنی پوتی کو اس کے ننھیال سے لینے کا مطالبہ کیا ہے تاکہ اس کی کفالت کریں۔ کیا وہ اس کے حقدار ہیں؟	835
☆	زید نے اپنی حقیقی بیٹی بکر کو دے دی کہ یہ آپ کی بیٹی ہے جہاں چاہیں اس کا نکاح کر دیں جب کہ یہ بزرگ عالمِ دین اور عمر تقریباً ۶۵ برس ہے۔ بکر نے اس کی شادی کر دی۔ بچی اب اس سے پردہ بھی نہیں کرتی اور یہ بزرگ تنہائی میں اس کے گھر آتے جاتے ہیں لوگوں کے منع کرنے کے باوجود جواب میں یہ کہتے ہیں کہ میں نامرد ہوں اور باز نہیں آتے۔ کیا ایسا آدمی کسی جماعت کا امیر یا امام بن سکتا ہے؟	836
☆	ایک لڑکا آٹھویں جماعت میں فیل تھا۔ دسویں جماعت کے امتحان کے لئے رشوت دے کر پیپر حل کروائے اب وہ ایک گورنمنٹ پرائمری سکول میں استاد ہے(۱) وہ اپنے اس فعل پر نادم ہے لہٰذا یہ رشوت والا گناہ کیسے دور کیا جا سکتا ہے؟ (۲) کیا اس کی تنخواہ حرام ہوگی؟	837
☆	کیا کوئی شخص دوسرے کی جگہ پر قسم اٹھا سکتا ہے؟	839
☆	حقوق العباد کے بارے میں آتا ہے کہ جب تک بندہ معاف نہ کرے اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں کرے گا۔ اب اتنی طویل زندگی میں ایک آدمی کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ اس نے کس کس کی چغلی کھائی ہے۔ کس سے لڑائی کی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان تمام باتوں کی بذریعہ اخبار معافی مانگ لی جائے تو کیا یہ حق ادا ہو جائے گا؟	840
☆	اگر کوئی آدمی مرتے وقت اپنی اولاد وغیرہ کو وصیت کر جائے کہ فلاں شخص میرا جنازہ نہ اٹھائے اور نہ ہی مجھ پر نماز پڑھے تو کیا ایسی وصیت درست ہوگی اور اسے پورا کرنا ضروری ہوگا؟	841

۳۱ نکاح اور اس کے متعلقات

۳۲ جہاد وقتال

۳۳ ناچ، گانا، آلاتِ موسیقی اور ان کے متعلقات

﴿۳۴﴾ مسکرات ونشہ آور اشیاء اور ان کا شرعی حکم

☆	سوال	صفحہ
☆	حقہ اور سگریٹ نوشی حلال ہے یا حرام؟	859
☆	کیا حقہ اور سگریٹ نوشی اسلام میں حلال ہے یا حرام؟	860
☆	چھالیہ، نسوار کھانا یا سگریٹ پینا شرعی لحاظ سے کیسا ہے؟	861
☆	شیخ الحدیث حضرت مولانا حافظ بنیامین صاحب حفظہ اللہ نے ہومیوپیتھک میں الکحل کی وجہ سے دوائیوں کو استعمال میں نہ لانے کا مشورہ دیا ہے لیکن آج کل لوگوں کا رجحان ہومیوپیتھک کی طرف زیادہ ہے، اسکے بارے میں مزید وضاحت چاہتا ہوں؟	861
☆	کسی دوائی میں اگر الکحل کی آمیزش ہو تو ایسی دوائی کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟	862

﴿۳۵﴾ گناہ، جرائم اور ان کے متعلقات

☆	سوال	صفحہ
☆	کسی شخص کو اس کے گناہ یاد آئیں اور اسے لذت محسوس ہو تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ جب کہ وہ ان گناہوں سے توبہ کر چکا ہو؟	863
☆	ہم نے اپنے لئے ایک نیا مکان بنایا ہے۔ وہاں پر بجلی لے جانا چاہتے ہیں۔ واپڈا والے ہم سے دس ہزار روپے بطور رشوت مانگ رہے ہیں۔ کیا یہ گناہ ہے؟	863
☆	کیا قاتل و مقتول دونوں دوزخی ہیں؟ اس لئے کہ مقتول کا ارادہ تھا کہ مجھے موقعہ ملا تو میں ماروں گا، لیکن اس کو موقعہ نہ مل سکا۔	863
☆	چوہا مارنے کے لئے ایک آلہ (کڑکی یا پنجرہ) استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض دوائیں گولیوں کی شکل میں ملتی ہیں کیا یہ دھوکا ہے کہ اس پر گناہ لازم آتا ہو؟	863
☆	جو مسلمان خودکشی کر لے کیا وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا؟ جیسے نبی ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ تَرَدّٰى مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خالدًا مخلدًا فيهاابداً الخ))	864
☆	عاق نامہ بوجہ نافرمانی کی اصل صورت کیا ہے؟	865
☆	رمضان المبارک میں ہر نیک عمل کا ثواب ستر درجے بڑھ جاتا ہے کیا اسی طرح گناہ میں بھی اضافہ ہوتا ہے؟	865

★	کیا خاوند اپنی بیوی کے مادرزاد منہ میں ڈال سکتا ہے۔ اگر یہ گناہ کسی سے ہو جائے تو اس کے ازالے کا طریقہ کیا ہے؟	876
★	ایک نوجوان کو کسی غیر محرم مسلمان عورت سے محبت ہو گئی مگر بُری نگاہ سے نہیں بالکل پاکیزہ جائز طریقے سے نکاح کا خواہاں ہے۔ تو کیا بندہ کا یہ فعل غیر شرعی تو نہیں؟	876
★	ایک لڑکا جس کی عمر ۱۲ یا ۱۴ سال ہے، اس نے کسی بکری سے بُرا فعل کر لیا ہے جب کہ بکری چند روز تک بیانے والی ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟	877
★	تنگ کرنے والی بلی کو مارنا جائز ہے؟	878
★	ایک شخص نے ایک سانپ کو زندہ آگ میں جلا دیا۔ بعد میں اسے پتہ چلا کہ شریعت میں اس طرح کے فعل سے منع کیا گیا ہے۔ اب اس عمل کا کفارہ کیا ہو گا؟	879

۳۶ متعلقاتِ خواب اور تعبیرُ الرؤیا

★	میں نے خواب دیکھا جس میں پہلے کچھ لوگوں کے چہرے دیکھے' پھر ایک سبز طوطا جس کے منہ میں زردی مائل سرخ رنگ کا مرغی کا چوزا جو طوطے سے چھوٹنے کی کوشش میں ہے مگر طوطا بلند ہوتے دیکھا؟	881
★	نبی پاک ﷺ کی زندگی میں یا بعد میں کسی صحابی نے آپ ﷺ سے کوئی مسئلہ دریافت کیا ہو؟ نیز ایسے ہی صحابی، تابعی یا کسی عام امتی نے حضور ﷺ سے خواب میں مسئلہ دریافت کیا ہو ہمارے لئے حجت ہو سکتا ہے؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہو گی؟	881
★	مرنے والے کا دنیا والوں کے ساتھ رابطہ ختم ہو جاتا ہے کیا اس کا خواب میں آنا اور اچھے یا بُرے حال میں دیکھنا حقیقتاً کوئی اہمیت رکھتا ہے؟ یا زندہ لوگوں کے بارے میں خواب میں خیالات کا اظہار بھی کرتا ہے؟	882
★	خوابوں کی تعبیر کیسے معلوم کی جائے؟ کیا اس کے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی راہنمائی ہے؟ اگر اس موضوع پر کوئی صحیح کتاب ہو تو اس کا نام تحریر فرمائیں!	882

✯	اُمہات المؤمنین میں سے کسی کی امتی کو خواب میں زیارت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ جیسا کہ حافظ عبدالمنان وزیر آبادی مرحوم کے متعلق واعظین بیان کرتے ہیں کہ انہیں حضرت عائشہ ؓ کی زیارت ہوئی تھی۔ کیا عقلاً نقلاً اس طرح کا واقعہ پیش آ سکتا ہے یا نہیں؟	883
✯	نبی پاک ﷺ کا خواب میں ملنا کیسا ہے۔ کسی نیک متقی بندے کو زیارت ہوسکتی ہے یا نہیں جبکہ کئی امامانِ دین اس کے خلاف ہیں؟	884
✯	کیا نبی کریم ﷺ کی خواب میں زیارت ممکن ہے؟ اور جب کہ ہماری زبان غیر عربی ہے۔ ہم حالتِ خواب میں آپ ﷺ سے کس طرح گفتگو کریں گے؟	884

۳۷ موت اور اس کے متعلقات

✯	اچانک موت جس سے اللہ کے نبی ﷺ نے پناہ مانگی ہے اگر کوئی نیک آدمی اچانک حادثہ میں فوت ہو جاتا ہے تو ایسی موت شہادت کی موت تصور کریں گے یا کہ بُری موت ہے؟	885

ان دو عظیم مشفق ہستیوں کے نام.....!

جن میں سے ایک کی تعلیمی، دینی اور روحانی تربیت اور دن رات میرے لیے خصوصی دعاؤں نے مجھے اس علمی ورثہ کو منصہ شہود پر لانے کے قابل بنایا۔ یہ وہ شخصیت ہیں جو نہ صرف میرے والد گرامی (حافظ علم الدین رحمہ اللہ) تھے بلکہ وہ میرے بنیادی طور پر ناظرہ و حفظ کے استاذ اور زندگی کے ہر موڑ پر میرے لیے مشعل راہ تھے۔ ہیں اور زندگی بھر رہیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

(أدخله الله جنة الفردوس)

دوسری عفت و پاکدامنی کی حقیقی تصویر وہ شخصیت (میری والدہ محترمہ مکرمہ رحمہا اللہ) جنھوں نے میری دینی اور دنیاوی ترقی کی خاطر دن رات سوت کات کر، اپنے سکون و آرام کو بالائے طاق رکھ کر، گھریلو معاشی تنگیوں پر اللہ کی رضا کی خاطر مردانہ وار صبر کا دامن تھامے رکھا نیز اپنے اور بیگانے سے کبھی شکوہ نہ کیا۔ ان کی اس صبر و رضا اور پُر خلوص دعاؤں نے میرے لیے تعلیمی راستے وا کیے۔

(أدخلها الله جنة الفردوس)

میں نے بھی اللہ کی توفیق سے زندگی بھر ہر طرح سے ان کی خدمت اور خوشنودی حاصل کرنے کی پوری سعی کی اور اللہ کے فضل و کرم سے دونوں ہی مجھ پر راضی اس دارِ فنا سے دارِ بقا کو سفر کر گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو روشن فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

(رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا)

حافظ عبد الشکور بن حافظ علم الدین حفظہ اللہ

سخنِ ناشر

دورِ طالبعلمی ہی سے مجھے کھانے ، پینے اور عمدہ لباس پہننے وغیرہ کے بجائے اسلامی علمی کتب جمع کرنے ،ایک بڑی (ذاتی) لائبریری بنانے اور ایک معیاری اشاعتی ادارہ قائم کرنے کا شوق دل میں جاگزیں رہتا تھا۔ میں جب بھی کسی عالمِ دین کا کتب خانہ کسی مدرسہ کی لائبریری یا کوئی اشاعتی ادارہ دیکھتا تو یہ ذوق میرے دل میں جنون کی حد تک انگڑائیاں لینے لگتا اور دل ہی میں سوچتا رہتا کہ علمِ دین کی نشرو اشاعت اور اس کے فروغ کے لیے کیسے قدم اٹھایا جائے۔

ظاہر ہے ان دونوں امور (جمع کتب اور ان کی نشرواشاعت) کی تکمیل مالی وسائل کے بغیر ناممکن تھی اور ہمارے معاشی حالات بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

لیکن اس ذاتِ لم یزل پر مجھے پختہ یقین تھا کہ اس کے حضور خلوص اور عاجزی و انکساری سے کی ہوئی دعائیں ایک دن ضرور شرفِ قبولیت حاصل کریں گی اور یہ دلی خواہش اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حقیقت کا روپ دھار کر ضرور شرمندۂ تعبیر ہوگی۔ کیونکہ وہ ایسا قادرِ مطلق ہے کہ جب کرنے پہ آئے تو ناممکن کوممکن بنا دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس ذاتِ اقدس کی شان یہ ہے۔ ﴿إِذَآ أَرَادَ شَيْـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ﴾

ہوا یوں کہ ۱۹۷۴ء میں مجھے مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ دورانِ تعلیم ملنے والا وظیفہ میں صرف دو کاموں پر خرچ کرتا۔ ایک اہم علمی کتب کی خریداری اور دوسرے والد گرامی قدر کے قرض کا بوجھ ہلکا کرنے پر۔ اللہ کے فضل وکرم سے جمعِ کتب کا شوق تو یوں پورا ہوتا رہا۔

دوسری طرف مدینہ یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد اسلامی کتب کی نشرو اشاعت کے لیے اردو بازار لاہور میں ''الحدیث اکادمی'' کے نام سے اپنے دو ساتھیوں سے مل کر ایک دکان بھی کچھ عرصہ چلتی رہی۔ کچھ مدت کے بعد بوجوہ یہ دکان ختم کرنا پڑی۔

قریباً سات سال قبل استاذ مکرم حافظ ثناء اللہ مدنی ﷾ نے جب مجھے مختلف جرائد و رسائل میں منتشر اپنے

فتاویٰ جات کو مرتب کتابی شکل میں جمع کرنے کا حکم فرمایا تو میں نے اسی دن سے اس علمی ورثہ کو خود شائع کرنے کی ٹھان لی اور یہ خواہش استاذ محترم کے گوش گزار بھی کر دی۔انھوں نے بھی بے حد خوشی کا اظہار فرمایا اور اس منصوبے پر کام کا آغاز کر دیا گیا۔

اس مجموعہ فتاویٰ کی اشاعت کا بارِ گراں اٹھانے کا باعث یہ ہوا کہ پاکستان میں اسلامی کتب کے بہت سے ناشرین معیاری اور قابلِ اعتماد طباعت میں حتی المقدور دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ لہٰذا میں نے اس کتاب کو خود شائع کرنے کا اہتمام کیا اور اسے طباعتی اعتبار سے ایک حد تک معیاری بنانے کی پوری کوشش کی ہے، متعدد بار خود پروف ریڈنگ کی ہے۔ ایک دفعہ حضرت الاستاذ مدظلہ العالی کے ساتھ مل کر بھی نظر ثانی مکمل کی تا کہ غلطیاں حتی الامکان کم ہوں۔تاہم اگر کوئی طباعتی خامی اور کسی طرح کی کوئی غلطی رہ گئی ہو تو قارئین سے التماس ہے کہ اس کی نشان دہی ضرور فرمائیں تا کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کا تدارک ہو سکے۔

علاوہ ازیں اشاعتی میدان میں قدم رکھنے کے لیے ہم نے ایک ادارے'' **دارُ الإرشاد** '' کی بنیاد رکھ دی ہے۔لہٰذا'' کتاب العقائد'' پر مشتمل'' فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ'' کی یہ پہلی جلد اسی ادارہ کی جانب سے قارئین کرام کی خدمت میں پہلی پیش کش ہے۔امید واثق ہے کہ احباب منتظمین ادارہ کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

ہم نے اس کی تیاری کے تمام مراحل (یعنی اس کی تزئین،خوبصورتی اور جلد بندی وغیرہ) میں عصری تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے اس کے مصارف میں کسی قسم کے بخل سے کام نہیں لیا بلکہ کاروباری اغراض کو بالائے طاق رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ قارئین کے ذوق وشوق کو مدنظر رکھا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس پہلی سعی کو شرفِ قبولیت بخشے اور اس کے بقیہ حصے (مجلدات) مرتب کر کے جلد از جلد منظرِ عام پر لانے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

وَ صلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و علی آلہ و صحبہ و من تبعھم الیٰ یوم الدین والحمد للّٰہ رب العالمین۔

مدیر'' **دار الإرشاد** ''لاہور

حافظ عبد الشکور مدنی

۱۴۲۶/۲/۴ھ بمطابق ۲۰۰۵/۳/۱۵

ابتدائیہ

مجموعہ فتاویٰ ہذا ربع صدی سے زائد میری کاوش پر محیط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فتاویٰ کا موضوع احکام شریعت کے نازک ترین مسائل میں سے ایک ہے جس پر لب کشائی سے قبل عدالت الٰہی میں جواب دہی کا تصور جمانا اہم دینی فریضہ ہے۔ اس بناء پر مقدور بھر کوشش کی گئی ہے کہ جملہ سوالات کے جوابات کتاب وسنت کی نصوص پر مبنی اور سلف صالحین کے منہج وعمل کے مطابق ہوں۔ اس سلسلہ میں بعض اہل علم کے فتاویٰ سے بھی راہنمائی حاصل کی گئی جو اس میدان کے شہسوار اور اپنے ادوار میں مرجع خلائق سمجھے جاتے تھے۔

مثلاً علامہ شمس الحق عظیم آبادی، محدث العصر مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری، شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری، سماحۃ الشیخ ابن باز اور محقق العصر علامہ ابن عثیمین رحمہم اللہ جیسے اجلاء کی محققانہ تحریروں سے خوب استفادہ کیا۔ بالخصوص شیخنا محدث اعظم حافظ عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ کے فتاویٰ جات تو بندہ کے لیے منارۂ روشنی ہیں آپ کی فتویٰ نویسی کا ایک عالم معترف ہے۔

انداز عالمانہ، محدثانہ ومحققانہ، مسلک سلف کے نقیب ''لا یخاف فی اللہ لومة لائم'' کی صحیح تصویر تھے بعد میں اس مسند کے وارث آپ کے بھتیجے مناظر اسلام حافظ عبدالقادر روپڑی رحمہ اللہ قرار پائے، عقیدۂ سلف پر کٹ مرنا ان کا امتیازی نشان تھا۔

مسلک اہلحدیث اور عقیدۂ سلف میں لچک سے نا آشنا نیز اس منہج کے مخالف کو قطعاً خاطر میں نہ لانا، چاہے لوگوں کی نگاہ میں وہ کتنا ہی مہتم بالشان کیوں نہ ہو۔ ''تقبل اللہ جهود هم جمیعا.''

واضح ہو کہ میرے اس مجموع کی اشاعت ۱۹۷۰ء میں ''تنظیم اہلحدیث'' لاہور کی وساطت اور ماہنامہ ''محدث'' لاہور سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ جماعت کے جملہ جرائد اور مجلات میں پھیل کر اسے قبولیت عامہ حاصل ہوئی۔ والحمد للہ علی ذلك.

بعد ازاں ۱۹۹۰ء سے باقاعدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور میں فتاویٰ جات تسلسل کے ساتھ اشاعت پذیر ہونے لگے جس کا تسلسل الحمدللہ آج تک قائم ودائم ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ انڈیا کے کئی ایک

مدیران اور ذمہ داران حضرات بطور خاص میرے بعض فتووں کو ''الاعتصام'' سے نقل کر کے اپنے زیرنگرانی جرائد ومجلّات میں اہتمام سے شائع کرتے ہیں۔ ''فلله الحمد علی ذلك.''

پھر مختلف مقامات پر منتشر فتاویٰ جات کو یکجا کتابی شکل میں مرتب کرنا ایک مشکل مرحلہ تھا دیگر اہم مشاغل درس وتدریس، کتابت فتاویٰ اور تعلیقات سنن ترمذی کی تالیف وتصنیف کی بناء پر ممکن نہ تھا۔

تلاش بسیار کے بعد نگاہ انتخاب فاضل مکرم تلمیذ رشید حافظ عبدالشکور بن حافظ علم الدین عفااللہ عنہما پر پڑی جو فی الواقع اس بات کے اہل ثابت ہوئے۔ موصوف نے بڑی عرق ریزی اور محنت شاقہ کے ساتھ ان کو جدید ترتیب وتنسیق سے مرتب فرمایا جو قابل تحسین ہے۔

مزید آنکہ تخریج احادیث وآثار کا بھی اہتمام کیا گیا جو غالباً فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ جزاه الله أحسن الجزاء ولمن سعى فيه. آخر میں اپنے عظیم دوست حافظ عبدالرشید اظہر اسلام آباد کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کتاب ھذا کے ابتدائیہ میں ایک وقیع طویل مقالہ لکھ کر اس کی قدر و منزلت کو چار چاند لگائے نیز ممتاز عالم دین حافظ صلاح الدین یوسف صاحب کی اس سے منسلک تحریر بھی میرے لئے باعث افتخار رہے۔ تقبل الله جهودهم وجزاهم أفضل الجزاء.

قارئین کرام سے التماس ہے کہ کتاب میں کوئی غلطی یا سہو نظر آنے پر مجھے ضرور مطلع کریں۔ تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیز اپنی نیک دعاؤں میں ہمارے والدین اور شیوخ عظام کو ضرور یاد رکھیں۔ جن کی نگاہ شفقت وعاطفت کی یہ سعی مرہون منت ہے۔

ويرحم الله عبدا قال آمينا. وصلى الله على نبينا محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين.
سبحانك اللهم وبحمدك، أشهد أن لا إله إلا أنت أستغفرك وأتوب إليك.

راقم

ثناء اللہ بن عیسیٰ خاں بن اسماعیل خاں

سرھالی کلاں ضلع قصور

۲۸ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ ...... الموافق ۴/۱۱/۲۰۰۲ء

عرضِ مرتب

امتِ مسلمہ کا اعزاز و امتیاز

امتِ مسلمہ میں اسلامی علوم وفنون کی جمع و تدوین کا سلسلہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں بلکہ نبی رحمت خاتم النبیین ﷺ نے سب سے پہلے کاتبینِ وحی سے کلام اللہ (قرآن مجید) کی جمع و تدوین کا کام لیا۔ چونکہ آپ امیّ تھے اور لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے اس لیے آپ ﷺ نے چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اپنی زیر نگرانی قرآن مجید کی موجودہ جمع و ترتیب کروائی، اس کی وجہ یہ ہے کہ دین اسلام چونکہ انسانیت کے لیے کامل و مکمل دستورِ حیات اور آخری سماوی دین ہے۔

قرآن مجید خالق کائنات کی طرف سے انسانیت کے لیے حتمی اور آخری پیغام ہدایت اور مسودۂ قانون ہے جسے ہادیٔ دو جہاں، خاتم النبیین ﷺ پر نازل کیا گیا ہے جن کے بعد نبوت کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ اسی لیے حق جل شانہٗ نے قرآن کریم میں واضح فرما دیا:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ . ﴾ (الحجر:۹)

”ہم نے خود اس سرچشمۂ ہدایت (قرآن مجید) کو نازل کیا ہے اور ہم خود ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔“

لہٰذا ایک طرف اللہ تعالیٰ نے اس کو انسانوں کے سینوں میں محفوظ کر دیا اور دوسری طرف نبی اکرم ﷺ نے کاتبین وحی سے لکھوا کر مرتب کروایا۔

اسی طرح آپ ﷺ کے اقوال، افعال، تقاریر، خطوط و احکامات اور دیگر سننِ مطہرہ کی جمع و ترتیب اور حفاظت کا سلسلہ بھی نبی مکرم ﷺ کے دور سے ہی شروع ہو گیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے محدثین

کی شب و روز محنتوں کے سبب آپ ﷺ کی مکمل ۲۳ سالہ نبوی زندگی کے تمام پہلوؤں (عبادات و معاملات، معاشرت، معیشت، تجارت و سیاست، حقوق اللہ اور حقوق العباد) کا حسین مرقع امت کو ورثہ میں ملا جو آج دنیا کے ہر کونے میں موجود ہے اور امت کے لیے مشعل راہ ہے نیز اس کی صحت و ثقاہت دوسرے مذاہب اور سماوی ادیان میں بھی مسلم اور قابل رشک تصور کی جاتی ہے۔

امت مسلمہ کو اس اعتبار سے تمام امم سابقہ پر فضیلت اور برتری حاصل ہے کہ اس کے مآخذ دین قرآن وسنت اپنی صحیح اور اصلی شکل میں موجود ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مسلم امہ پر بہت بڑا احسان اور اس کے لیے ایک عظیم اعزاز بھی ہے۔

کتاب وسنت کی جمع و تدوین کے ساتھ ساتھ ان کے متعلقہ دیگر علومِ اسلامیہ (فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث، اصول تفسیر اور صرف ونحو وغیرہ) بھی مسلسل ترقی و ترویج کی منزلیں طے کرتے رہے حتی کہ ایک ایسا وقت آیا جب علمائے امت کے فتاویٰ کو الگ شکل میں ترتیب دیا جانے لگا۔ الحمد للہ زیر نظر مرتب مجموعہ بھی اسی سلسلۃ الذھب کی ایک کڑی ہے۔

فتویٰ نویسی کی اہمیت:

الاستفتاء: (فتویٰ پوچھنا) اور الافتاء: (فتویٰ دینا) یہ سلسلہ قرون اولیٰ سے آج تک جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ اس لیے کہ اسلام ایک مکمل دستورِ حیات ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو ہر دور میں اپنے عقائد، عبادات، معاملات، مسلموں اور غیر مسلموں سے تعلقات، داخلی و خارجی اختلافات و نزاعات اور اخلاقیات غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں پیش آمدہ مسائل میں علماء کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ دین میں اس کی اہمیت کے پیش نظر علماء بھی خاطر خواہ اس کا اہتمام کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔

کتاب وسنت اور سیر صحابہ رضی اللہ عنہم کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ فتویٰ دینا سنت اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، سلف صالحین وائمہ دین کی سنت بھی ہے۔ قرآن مجید میں ''استفتاء'' اور ''افتاء'' دونوں کا ذکر مختلف مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً ﴿ وَ يَسۡتَفۡتُوۡنَكَ فِي النِّسَآءِ قُلِ اللّٰهُ يُفۡتِيۡكُمۡ فِيۡهِنَّ ﴾ (النساء: ۱۲۷) اور ﴿ يَسۡتَفۡتُوۡنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفۡتِيۡكُمۡ فِي الۡكَلٰلَةِ ﴾ (النساء: ۱۷۶) جن مسائل، احکام، اور اشکالات کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم ﷺ سے سوالات دریافت کیے اور آپ ﷺ کی طرف سے ان کے ارشاد

کردہ جوابات فتاوائے رسول ﷺ کہلاتے ہیں۔ جو کتب احادیث میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کثیر تعداد میں فتاویٰ تاریخ وسیر کی کتب میں موجود ہیں، یہاں تک کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسی مناسبت سے امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔

عہد رسالت میں عموماً زبانی فتاویٰ پر اکتفا کیا جاتا رہا اور عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں فتویٰ کا کام دونوں طرح سے جاری رہا۔ پھر بعد والے ادوار میں کتاب وسنت کی جمع وتدوین کے ساتھ ساتھ ان کے متعلقہ دوسرے علوم مثلاً فقہ، اصول فقہ، اصول الحدیث والتفسیر اور نحو وصرف وغیرہ میں بھی مسلسل ترقی ہوتی رہی یہاں تک کہ ایک فن کی حیثیت سے علمائے امت کے فتاویٰ کو کتابی شکل میں الگ مرتب کیا جانے لگا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں فتویٰ نویسی میں کتاب وسنت، آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کو بنیاد بنایا جاتا رہا لیکن قرون ثلاثہ کے بعد جب امت مسلمہ گروہی، مسلکی اور تقلیدی جمود کی وجہ سے فرقوں میں بٹ گئی اور ہر مفتی نے اپنے امام اور اپنے مسلک کے اصول وفروع کے مطابق فتویٰ دینا شروع کر دیا اور براہ راست کتاب وسنت اور دیگر ائمہ مجتہدین کی آراء کو نظر انداز کر دیا تو اس طرح کے تقلیدی جمود نے امت کو کتاب وسنت کے چشمۂ صافی سے مستفیض ہونے سے محروم کر دیا۔ نتیجتاً امت کئی فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ فتویٰ نویسی ایک فن کی حیثیت اختیار کر گئی اور دوسرے علوم وفنون کی طرح اس کی جمع وتدوین بھی شروع ہوگئی۔ بالآخر عالم ومفتی کے فتاویٰ کو الگ کتابی شکل میں مدون کرنے کا طریقہ رواج پانے لگا۔

فتویٰ نویسی میں اہلِ حدیث کا طرزِ عمل:

اہل حدیث اور سلفی علماء کا فتویٰ نویسی میں طریق کار اور انداز مقلدین علماء سے بالکل مختلف رہا۔ انہوں نے فتویٰ نویسی میں سلف کے طریقہ کو اپنایا اور کتاب وسنت پر اعتماد کرتے ہوئے آراء صحابہ وتبع تابعین اور دیگر ائمہ مجتہدین اور فقہائے عظام کے اقوال سے خوب خوب استفادہ کیا۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے رفقاء وتلامذۃ اور محدثین کی کوششوں نے اس کام کو مزید آگے بڑھایا جس کی وجہ سے اہل حدیث علماء کی ایک بڑی تعداد وجود میں آ گئی جنہوں نے ریسرچ اور اجتہاد کا دروازہ دوبارہ کھول دیا۔

آج کے اس تحقیقی اور سائنسی دور میں محقق علماء اور اصحاب فکر اس طرز کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں نیز کسی مسئلہ میں مسلکی اور گروہی تعصب کی بجائے تمام مذاہب کا مقارنہ وموازنہ کرنے کے بعد دلائل کے ساتھ کسی

مذہب کو راجح قرار دینے لگے ہیں۔

برصغیر میں فتویٰ نویسی:

برصغیر میں بھی انہیں فقہی اصول وقواعد کی بناء پر فقہاء کے دو گروہ رہے۔ایک گروہ اہل الرائے کا جنہوں نے تقلید کی بناء پر اپنے حنفی مذہب کے مطابق فتویٰ دیا۔ برصغیر میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے زیر اثر پروان چڑھنے والی تحریک اہل حدیث نے لوگوں پر واضح کیا کہ اسلام میں صرف کتاب وسنت کو حجیت اور استناد حاصل ہے۔ اس وجہ سے لوگوں میں عمل بالحدیث کا جذبہ عام ہوا تو اہل حدیث سلفی علماء نے براہ راست کتاب وسنت و آثار صحابہ پر اعتماد کرتے ہوئے استفتاء کے مدلل جواب تحریر کئے۔ یہ سلفی طرز افتاء اپنی لازوال خوبیوں کی وجہ سے اس قدر مقبول ہوا کہ اب بعض مقلد حنفی علماء بھی دلیل کی بناء پر مسائل میں ترجیح دیتے ہوئے وسعت نظری کا ثبوت دینے لگے ہیں۔ پاک و ہند میں چونکہ حنفی حکومتوں کا تسلط رہا اس لیے یہاں سب سے پہلے حنفی علماء نے فتاویٰ کو مرتب و مدون شکل میں پیش کیا۔ جن میں سے بعض قلمی نسخوں کی صورت میں لائبریریوں کی زینت ہیں اور بہت ان میں سے مطبوعہ شکل میں منصۂ شہود پر آ چکے ہیں۔

بہت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پاک و ہند میں علمائے اہل حدیث کے فتاویٰ کو جمع اور مدون کرنے کا ابتداء میں اہتمام نہ کیا گیا چنانچہ جہاں علماء کی بہت سی تحقیقی، فقہی، علمی اور اجتہادی تحریرات و دستاویزات ضائع ہوگئیں وہاں علمائے کرام اور مفتیان عظام کی زندگی کے ہر شعبہ میں مختلف مسائل پر قیمتی آراء اور فتاویٰ بھی کاغذ وقرطاس پر نہ لائی جاسکیں اور نسیاً منسیاً ہوگئیں۔

اسلاف کے علمی نوادرات جو اس وقت متداول ہیں ان سے بڑھ کر ان کی علمی اور تحقیقی کاوشیں اور محنتیں دست برد زمانہ کی نذر ہو چکی ہیں۔ گذشتہ ایک صدی سے اہل علم میں علماء اور مفتیان کرام کے فتاویٰ کو جمع اور مدون کرنے کا ذوق وشوق پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں کئی علماء کے فتاویٰ مرتب کئے گئے مثلاً فتاویٰ نذیریہ، فتاویٰ ثنائیہ، فتاویٰ اہل حدیث اور فتاویٰ علمائے اہل حدیث وغیرہ۔

سلفی تحریک میں سعودی جامعات سے فارغ التحصیل علماء کا کردار:

یہ انتہائی خوش کن اور قابل ذکر بات ہے کہ تقریباً گذشتہ چالیس برس سے سعودی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل علماء نے برصغیر پاک و ہند میں عمل بالحدیث اور تقلیدی جمود توڑنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسی

طرح تعلیمی، تحقیقی، تدریسی، انفرادی، اجتماعی، معاشرتی اور سیاسی زندگی میں بھی گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ خصوصاً دینی مدارس کے نصاب میں ترمیم وتزوید کر کے اسے عصر حاضر کی جدید یونیورسٹیوں کے نصاب کے ہم آہنگ بنایا۔ منطق، فلسفہ، علم کلام سے متعلقہ دینی مدارس میں مدتوں سے رائج قدیم کتب نکال کر نصاب کو سہل بنایا اور ان کی جگہ موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق جدید کتب کو نصاب میں شامل کیا۔ خاص طور پر عقائد کی وہ کتابیں جو واضح طور پر مسلک سلف سے ہٹ کر متکلمین، ماتریدیہ اور معتزلہ وغیرہ فرق باطلہ کے فرسودہ عقائد، نظریات اور ان کی تاویلات پر مشتمل تھیں انہیں نصاب سے خارج کر دیا اور ان کی جگہ عقائد میں علمائے سلف کی تاویل، تعطیل اور تکییف سے ہٹ کر خالصتاً کتاب وسنت کے مطابق لکھی گئی کتب کو تمام مراحل درا سیہ میں شامل نصاب کیا۔

پاکستان میں ان علماء کے سرخیل علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ تھے جنہوں نے پاکستان کے اندر ملکی سیاسی جماعتوں میں جماعت اہل حدیث کا تشخص قائم کیا اور منتشر نوجوان اہل حدیث نسل کو اہل حدیث کے سیاسی پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ نیز یونیورسٹیوں، کالجوں، سکولوں اور دیگر شعبہ ہائے زندگی میں کام کرنے والے لوگوں کو متأثر کیا اور دوسری جماعتوں میں شامل ہو جانے والے لوگ واپس اپنی جماعت میں آ گئے۔

استاذ محترم جناب مولانا عبیدالرحمان صاحب نے جماعت اہل حدیث کے مرکزی تعلیمی ادارہ ''جامعہ سلفیہ'' کے نظام تعلیم وتدریس اور نصاب کو پاکستان میں سب سے پہلے جدید تقاضوں کے مطابق استوار کر کے مدینہ یونیورسٹی کے ساتھ الحاق کروایا۔ یہ ان کا ناقابل فراموش عظیم کارنامہ ہے۔ استاذ الاساتذہ شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب، حافظ مقبول احمد صاحب رحمہ اللہ، مولانا عبدالسلام کیلانی صاحب، ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر صاحب اور راقم کے ساتھ سند فراغت حاصل کرنے والے ساتھیوں میں سے مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب لکھوی، حافظ مسعود عالم صاحب، حافظ عبدالحمید اظہر صاحب اور دیگر کئی درجن سعودی یونیورسٹیوں سے فارغ ہونے والے علماء نے علمی، دعوتی، اصلاحی، تربیتی، تبلیغی، تدریسی اور انفرادی واجتماعی میدان میں بغیر تشہیر کے سلفی نہج پر سنجیدگی سے شب وروز کام کیا۔ بعض نے تدریس کے ساتھ ساتھ اپنے مدارس، جامعات اور رفاہی تنظیمیں قائم کیں اور بعض نے تصنیف وتالیف میں مقام حاصل کیا۔ راقم نے بھی بحمداللہ اپنی تدریس کے ساتھ ساتھ لاہور کے وسط (بھاٹی دربار) مقبرہ علی ہجویری اور مقبرہ پیر مکی کے درمیان شرک وبدعت سے بھرے ہوئے اس علاقہ میں جامعہ ''إعانة البنات الاسلامیة'' کے نام سے طلبہ وطالبات کے لیے ایک دینی مدرسہ

اور رفاہی سماجی کاموں کے لیے ”مجلس إعانة المسلمين“ کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی، سینکڑوں طلبہ و طالبات نے حفظ و ناظرہ ،ترجمہ قرآن کریم ،سلائی کڑھائی کا کورس اور بعض نے درس نظامی کا مختصر کورس کیا۔ اس کی وجہ سے تقریباً ہر گھر میں سلفی دعوت کی شمع روشن ہوئی۔ اسی طرح یتیموں، مسکینوں، بیوگان اور مستحقین افراد کے ساتھ مختلف طریقوں سے مالی تعاون سے لوگوں کو خرافات و بدعات اور شرک جیسے موذی مرض سے نجات دلائی۔ تقریباً چودہ سال علمی تعاون اور مالی تعاون کے نام سے دونوں شعبے اس شرک زدہ علاقے میں برابر کام کرتے رہے۔ اس طرح ان علماء میں سے ہر ایک نے تعلیم و تربیت، تصنیف و تالیف، قلم و قرطاس، منبر و محراب، مدارس و مساجد اور وعظ و تقریر کے ذریعہ پاکستان کے اندرون اور بیرون عوام الناس کو خاموشی کے ساتھ انفرادی طور پر جس قدر مسلک اہل حدیث اور سلفی دعوت خوبصورت اور حکیمانہ انداز میں پیش کی اس کے مقابلہ میں اہل حدیث تنظیموں اور جماعتوں کا زیادہ وقت آپس کی سر پھٹول، اقتدار کی رسہ کشی، علماء اور معاونین کی تنظیمی و کلیدی عہدوں پر لڑائی میں وقت ضائع ہوتا رہا۔ مزید برآں جماعتوں کے سربراہان خودساختہ آپس کے فروعی اور گروہی اختلافات میں مبتلا رہے یہاں تک کہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف حسد، بغض، کینہ اور عداوت کی فضا پیدا ہوگئی۔

تقریر و تحریر میں بھی ایک دوسرے پر بے جا تنقید اور طعن و تشنیع کرتے رہے۔ نوبت بایں جا رسید کہ تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ کے میدان میں ماسوائے جلسے جلوس اور کانفرنسوں کے منظم اور ٹھوس انداز میں جماعتی اور اجتماعی بنیادوں پر کماحقہٗ کام نہ ہوسکا بلکہ جلسے جلوس اور کانفرنسیں بھی اپنا اپنا تشخص برقرار رکھنے اور مخصوص مفادات کے لیے منعقد کی جاتی رہیں۔ چنانچہ ان سے وہ فوائد اور نتائج برآمد نہ ہوئے جو متحدہ پاک و ہند میں ہمارے اسلاف اور بزرگوں کے منعقد کردہ جلسوں اور کانفرنسوں میں حاصل ہوتے رہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہماری جماعتوں کے ارباب اقتدار نے ان علماء کی تعداد، ان کی صلاحیتوں اور عملی میدان میں ان کی محنتوں اور کاوشوں کا کبھی جائزہ نہیں لیا اور نہ ہی ان جماعتوں میں انہیں ان کی صلاحیتوں کے مطابق اپنا کردار ادا کرنے کے مواقع فراہم کئے جبکہ ان کے اندر ایسے باصلاحیت علماء بکثرت پائے جاتے ہیں جو اپنے علم و تجربہ اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں کی بناء پر جماعتی اور تنظیمی شعبہ جات میں اعلیٰ کارکردگی دکھا سکتے ہیں جبکہ پاکستان میں دیگر جماعتوں میں نوجوان علماء کو ایسے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں جہاں وہ اپنی صلاحیتوں سے عوام الناس کو مستفید کرسکیں۔

صاحبِ ''فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ'' کا فتویٰ نویسی میں مقام:

پاک و ہند کی سلفی تحریک میں منصب افتاء پر بڑی بڑی قد آور شخصیات نظر آتی ہیں۔ مثلاً نواب صدیق حسن خاں، میاں سید نذیر حسین، شیخ حسین بن محسن انصاری، مولانا عبداللہ غازی پوری، مولانا شمس الحق عظیم آبادی، مولانا عبدالرحمان مبارکپوری اور مولانا عبیداللہ (رحمہم اللہ) وغیرہ۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں منصب افتاء پر ممتاز حیثیت رکھنے والے علماء یہ ہیں۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری، حافظ عبداللہ محدث روپڑی، استاذ الاساتذہ مولانا حافظ محمد گوندلوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد عبداللہ امرتسری اور مولانا ابوالبرکات احمد (رحمہم اللہ) وغیرہ جن کے فتاویٰ بھی کتابی شکل میں مرتب ہو کر منصۂ شہود پر آ چکے ہیں۔ اسی سلسلۃ الذہب کی کڑی سنجیدگی و متانت کی تصویر، علم وفضل اور زہد وتقویٰ میں مایہ ناز شخصیت استاذی المکرّم شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ صلاحیتوں کی بناء پر سالہا سال سے افتاء وتحقیق کی مسند کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ (جزاہ اللہ عنا و عن المسلمین خیر الجزاء) شیخ صاحب نے تدریس کے ساتھ ساتھ فتویٰ نویسی میں بھی ممتاز مقام حاصل کیا۔ یہ فتاویٰ جو تقریباً ربع صدی سے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے اور منتشر شکل میں تھے۔ راقم نے اللہ تعالیٰ کی توفیق اور شیخ صاحب کے حکم سے انہیں کتابی شکل میں مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ یہ فتاویٰ مجموعی طور پر بفضلہٖ تعالیٰ تقریباً چار مجلدات پر مشتمل ہوں گے۔ اس کا نام ''فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ'' رکھا گیا ہے۔ اس کی پہلی جلد ''کتاب العقائد'' کے مسائل پر مشتمل ہے۔ اس میں سینکڑوں سوالات کے جوابات تحریر ہیں جو تقریباً نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ میں نے یہ جلد تقریباً سات سال کی محنت شاقہ کے ساتھ مختلف رسائل: ''تحریک خلافت''، ''تنظیم اہل حدیث''، ''محدث''، ''اہل حدیث'' اور بالخصوص ہفت روزہ ''الاعتصام'' سے جمع کر کے ترتیب دی ہے تقریباً چودہ برس سے اس ''الاعتصام'' رسالہ میں ''احکام و مسائل'' کے نام سے اس کالم میں مسلسل حافظ صاحب کے فتاویٰ شائع ہوتے رہے اور ابھی تک یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جاری وساری ہے۔

ہم نے اس مجموعہ میں جمع، ترتیب وتنسیق کے اعتبار سے عصری تقاضوں اور جدید طباعتی نزاکتوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ سہل و آسان طرز پر شائع کرنے کی سعی کی ہے۔ تاکہ اہل علم اور عامۃ الناس کے لیے مساوی طور پر مفید ثابت ہو سکے۔

''فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ'' کی خصوصیات:

- عقائد پر مشتمل شیخ صاحب کے فتاویٰ جات کو یکجا کیا گیا ہے جو (۲۰۰۱ء) تک مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شکل میں موجود تھے۔
- یہ جلد مختلف موضوعات پر سینتیس ابواب پر مشتمل ہے۔ جن میں عقائد اور اس کے متعلقہ موضوعات پر سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں۔
- شروع میں ہر باب کا عنوان جلی حروف میں تحریر کر کے اس کے تحت متعلقہ مسائل بالتفصیل تحریر کئے گئے ہیں۔
- ایک ہی قسم کے مختلف مسائل جو مختلف صورتوں اور مختلف احوال و اوقات میں شیخ صاحب سے دریافت کئے گئے انہیں یکجا کر کے متعلقہ عنوان کے تحت درج کر دیا گیا ہے تاکہ اجمالی و تفصیلی جوابات سے آگاہی بیک وقت ہو سکے اور قاری مسئلہ کی ہمہ جہت اہمیت اور نوعیت سے زیادہ استفادہ کر سکے۔
- اس مجموعہ میں پانچ چھ ابواب نہایت اہمیت کے حامل ہیں خصوصاً ''دور حاضر کے جدید مسائل'' کے عنوان کے تحت اس باب میں تقریباً دور حاضر میں پیش آمدہ اسّی مسائل پر مدلل سیر حاصل بحث کی گئی ہے جو کسی بھی گزشتہ مرتب شدہ فتاویٰ کے اندر اس طرح منظم شکل میں مفقود ہے۔ مثلاً جی پی فنڈ، انشورنس، مختلف نظامہائے حکومت، جمہوری نظام میں سرکاری ملازمتیں، خاندانی منصوبہ بندی، بیعت کی شرعی حیثیت، انسانی اعضاء کی دوسرے کو منتقلی، انجکشن کے ذریعہ جانوروں کو حاملہ کرنا، برائلر مرغیوں کا حکم، ہنڈی کا کاروبار، بولی کی کمیٹی اور دیگر اس قسم کے جدید اہم مسائل موجود ہیں۔
- اس مجموعہ میں نیک شگون اور حصول برکت کی خاطر پہلا باب ''بسم اللہ کی جگہ ۷۸۶ پڑھنا یا لکھنا'' کے نام سے ترتیب دیا گیا ہے اور آخری بات انسانی فطرت کے مطابق '' موت اور اس کے متعلقات'' پر مشتمل ہے تاکہ انسان موت کو یاد رکھتے ہوئے صراط مستقیم پر چلتا رہے اور اپنے انجام کو نہ بھولے۔
- رسائل میں بھیجے جانے والے مراسلات میں سے ان حصوں اور عبارات کو حذف کر دیا گیا ہے جن کا پوچھے گئے مسائل سے تعلق نہیں تھا۔ اور صرف مختصر اور جامع عبارت پر مشتمل سوالات تحریر کئے گئے ہیں۔
- قاری بعض ابواب پر طائرانہ نظر کرنے سے محسوس کرتا ہے کہ انہیں کتاب العقائد میں کیسے درج کر دیا

گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض سوالات جو کئی جہات سے مختلف ابواب سے تعلق رکھتے تھے ان میں غور وفکر کے بعد دلائل کے اعتبار سے راجح جہت کی وجہ سے انہیں متعلقہ ابواب کے تحت درج کر دیا گیا ہے۔

- تمام عربی عبارتوں پر مکمل اعراب لگا دیے گئے ہیں تا کہ ہر خاص و عام صحیح طور پر استفادہ کر سکے۔
- آیات واحادیث اور دیگر ناقص حوالہ جات مکمل کرنے میں پوری کوشش کی گئی ہے۔
- چیدہ چیدہ مقامات پر حافظ صلاح الدین یوسف صاحب اور قاری نعیم الحق نعیم رحمہ اللہ کی مختصر مگر جامع اور مفید تعلیقات وتصریحات بھی موجود ہیں۔ جب کہ بعض جگہ راقم اور تلمیذ رشید مولانا خالد بن بشیر مرجالوی صاحب کی تعلیقات بھی موجود ہیں۔
- بعض سوالات کے جوابات پر دیگر اہل علم وفضل کے تنقیدی تعاقب بھی درج ہیں جو تعاقب در تعاقب اور جواب در جواب کی دلچسپ بحثوں پر مشتمل ہیں۔ جن سے صاحب فتاویٰ کی تبحر علمی، وسعت نظری، علمی رسوخ اور مجتہدانہ بصیرت اجاگر ہوتی ہے۔ خاص طور پر حافظ عبد السلام بھٹوی اور مولانا ابو الاشبال بہاری صاحب کے ''تعاقب'' اور حافظ صاحب کے ''جواب تعاقب'' اہل علم اور باذوق طلباء کے لیے نہایت مفید ہیں۔ چنانچہ مؤلف نے ''حدیث اور اصول حدیث'' کے باب میں مولانا ابوالأشبال صاحب کا ''جواب تعاقب'' نہایت خوبصورت انداز میں لکھا ہے جو کہ تقریباً ایک سو چھبیس صفحات پر مشتمل ہے۔
- ہمارے خیال میں علمائے اہل حدیث میں سے کسی عالم سے اتنی تعداد میں سوالات بطور استفتاء نہیں پوچھے گئے جتنے حافظ صاحب سے پوچھے گئے ہیں۔ خاص طور پر عقائد اور علم وراثت پر مشتمل فتاویٰ میں ان کی حیثیت امتیازی اور مثالی ہے۔ اللهم زد فزد فی علمه و حياته .

تخریجی وتحقیقی خصوصیات:

- نام ''کتاب'' و''باب'' اور ''رقم الحدیث''، اگر ''رقم الحدیث'' نہیں تو پھر ''باب'' یا ''کتاب'' کے حوالہ کے ساتھ ''رقم الکتاب'' اور ''رقم الباب'' ذکر کر دیا گیا ہے۔
- احادیث کی تنقیح وتحقیق اور ان کے صحت وضعف میں متقدم محدثین عظام کے علاوہ مؤخر محققین کرام و نبلاء عظام جیسے امام ذہبی، ابن حجر، الشوکانی، احمد شاکر، حمزۃ، شعیب الأرناؤوط، محدث العصر علامہ ناصر الدین الالبانی رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ کے فیصلہ جات نقل کر دیے گئے ہیں۔

- اس تخریج وتحقیق میں منفرد انداز یہ ہے کہ حوالہ کے شروع میں علماء محققین کا حکم یکجا کر دیا گیا ہے تا کہ ناواقف قاری کتاب اوراس کے محقق کے متعلق معلومات کسی جاننے والے سے لے کر مستفید ہو سکے لیکن پھر بھی بعض اوقات کتاب کے ساتھ محقق کتاب کا نام اور حکم نقل کردیا گیا ہے۔ جزاہ اللہ خیراً.
- ''مسند احمد'' چونکہ احمد شاکر کی تحقیق نامکمل تھی جسے شیخ حمزہ نے مکمل کیا۔اس لیے شیخ حمزہ کی کوئی اور الگ کتاب نہ سمجھی جائے۔
- احادیث کی تحقیق میں اختلاف کے وقت اہل علم کے تعاون ومشورہ سے راجح موقف اختیار کرنے کی سعی کی گئی ہے لیکن چونکہ تحقیق وتخریج کادائرہ بہت وسیع ہے اس لیے ہم اپنے راجح موقف کو حرف آخر اور حتمی نہیں سمجھتے۔ واللہ اعلم.

طباعتی خصوصیات:

- اس مجموعۂ فتاویٰ کی کتابت کمپیوٹرائزڈ ہے۔ عربی عبارات قدرے جلی اور خوبصورت عربی رسم الخط میں ہیں جو باذوق قاری کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔
- ہر سوال کے تحت اس کا جواب درج ہے۔ لفظ سوال و جواب ابتدائی سطر میں جلی حروف میں تحریر کیا گیا ہے تا کہ ہر سوال و جواب کی حیثیت علیحدہ علیحدہ رہے اور اختلاط پیدا نہ ہو۔
- عصری تقاضوں کے مطابق خوبصورت طباعت، اعلیٰ کاغذ اور مضبوط لیمینیشن والی جلد بندی کی گئی ہے۔
- بین الأقوامی طباعتی معیار کوملحوظ رکھتے ہوئے قرآنی آیات ، احادیث، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و دیگر علمائے کرام اور فضلائے عظام کے اقوال کو الگ الگ امتیازی حیثیت میں تحریر کیا گیا ہے مثلاً قرآنی آیت کے لیے ﴿......﴾ یہ علامت ، احادیث کے لیے ((......)) اور صحابہ رضی اللہ عنہم اور دیگر علمائے امت کے لیے "......" علامت لکھی گئی ہے تا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر امت کے لوگوں کے اقوال وفرامین کی الگ امتیازی حیثیت برقرار رہے اور قاری کے لیے مختلف اقوال کو سمجھنا آسان ہو۔
- ہم نے جدید عصری کتابتی علامات (نقطوں، قوموں اور بریکٹوں وغیرہ) کا خصوصی اہتمام کیا ہے تا کہ طباعت جدید تقاضوں کے مطابق ہو سکے۔
- کتابت ، طباعت اور حوالہ جات وغیرہ میں غلطیاں دور کرنے میں پوری طرح محنت اور شوق سے کام کیا

گیا ہے۔ اس غرض کے لیے اس جلد کی تقریباً بارہ مرتبہ بفضلہ تعالیٰ پروف ریڈنگ کی گئی ہے۔ اگرچہ بتقضائے بشریت غلطی کا پھر بھی احتمال موجود ہے۔

فتویٰ نویسی میں مؤلف حفظہ اللہ کی خصوصیات:

- حضرت شیخ چونکہ مدت دراز سے شیخ الحدیث کی مسند پر فائز ہیں لہٰذا فتویٰ نویسی میں انھوں نے خالصتاً سلفی طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ سب سے پہلے مسائل میں براہ راست کتاب وسنت سے دلائل پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد سلف کے اقوال وآراء سے استفادہ کرتے ہوئے فتویٰ تحریر کرتے ہیں۔
- عقائد کے مسائل میں فتاویٰ کتاب وسنت پر مبنی ہیں خصوصاً صفات الٰہیہ میں سلف کے مسلک کو اپنایا ہے اور انہیں تمثیل، تجسیم، تکییف اور تاویل سے پاک ثابت کیا ہے۔
- ان فتاویٰ کے اندر جابجا فقہ الحدیث کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے جو محققانہ اور محدثانہ طرز استدلال کی نشاندہی کرتا ہے۔
- اختلافی اور فقہی مسائل میں جابجا ہر مسلک اور فرقہ کے دلائل پھر ان کے مابین موازنہ اور محاکمہ کرتے ہوئے مجتہدانہ انداز میں اقرب الی الکتاب والسنہ مسلک کو دلیل سے ترجیح دیتے ہیں۔
- تمام احادیث واقوال عموماً بالتفصیل حوالہ جات کے ساتھ درج کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔
- شیخ صاحب چونکہ عرصہ دراز سے مسلسل بخاری شریف پڑھا رہے ہیں اس لیے مختلف مسائل کی تحقیق وتدقیق کے سلسلہ میں ''فقہ البخاری'' اور ''فتح الباری'' سے خوب استفادہ کرتے ہیں۔
- بعض مسائل کی تحقیق اور تائید میں فقہائے امت کے اقوال اور علمائے اہل حدیث کے فتاویٰ بھی ذکر کرتے ہیں۔
- ان کے فتاویٰ متشددانہ ظاہریت وخارجیت سے پاک اور فقہی حیلہ سازیوں سے ہٹ کر ہیں۔
- نیز ان فتاویٰ جات میں انھوں نے ایسی اعتدال کی راہ اختیار کی ہے جو کتاب وسنت کے دلائل پر مبنی اور آرائے سلف سے مطابقت رکھتی ہے۔ اسی لیے بعض مسائل میں وہ اپنے شیخ حافظ عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ سے بھی اختلاف کر جاتے ہیں جو ان کی مسائل میں وسیع النظری اور تقلیدی جمود سے پاک اور مجتہدانہ صلاحیت کو نمایاں کرتی ہے۔

- فتویٰ نویسی میں عموماً سہل و آسان زبان اور الفاظ استعمال کرتے ہیں۔
- عموماً دوسرے مسالک کی کتب سے اقتباسات مع حوالہ نقل کرتے ہیں اور عبارت کا ترجمہ یا مفہوم بیان کرتے ہیں تاہم بعض عربی عبارات و اقتباسات اہل علم میں متداول ہونے کی وجہ سے ترجمہ کے بغیر چھوڑ دیتے ہیں۔
- حافظ صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر انھیں فتویٰ دینے میں کسی قسم کا سہو یا غلطی ہو جائے اور کوئی دوسرا عالم اس کی نشاندہی کردے تو حافظ صاحب اسے تعصب، ضد اور ہٹ دھرمی اور انا کا مسئلہ نہیں سمجھتے بلکہ خندہ پیشانی سے اس تصحیح کو قبول کرتے ہوئے رسائل کے اندر اس کے نام شکریہ کا خط لکھنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

جلد ہذا کی نمایاں خصوصیات:

- اس مجموعۂ فتاویٰ کے شروع میں ڈاکٹر حافظ عبد الرشد اظہر صاحب نے بڑی محنت اور جذبۂ صادقہ کے ساتھ اہل علم کے لیے ''اجتہاد و افتاء'' کے موضوع پر ایک جامع، وقیع اور تحقیقی مقدمہ تحریر فرمایا ہے جو باذوق اہل علم کے لیے لازماً دلچسپی کا باعث ہوگا۔ علاوہ ازیں عام قاری کے لیے اس موضوع پر ایک معلوماتی دستاویز ثابت ہوگا۔ ان شاء اللہ، ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون نے ''فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ'' کے علمی قد میں اضافہ کردیا ہے۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء.
- اس جلد میں پائی جانے والی احادیث و آثار کی تخریج و تحقیق بھی اہل علم کی سہولت کے پیش نظر کر دی گئی ہے۔ ہمارے سلفی نوجوان مولانا عابد الٰہی صاحب نے بڑے شوق و ذوق سے اس کام کو پورا کیا ہے۔
- اسی طرح اس کی ایک اہم اور دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ اس ''مجموعۂ فتاویٰ'' میں مؤلف سے لے کر کمپوزر تک تمام لوگ علماء ہیں اور سب آپس میں استاد اور شاگرد کے رشتہ میں منسلک ہیں۔ جیسا کہ اس مجموعہ کے مؤلف (حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ) مرتب اور راقم (حافظ عبد الشکور مدنی عفی اللہ عنہ) کے استاد ہیں۔ اس اہم کام میں راقم کے مشیر خاص، نظر ثانی میں شرکت کرنے والے میرے تلمیذ رشید مولانا خالد بن بشیر مرجالوی ہیں۔ اسی طرح ان کے دو شاگرد (مولانا عابد الٰہی اور عبد القدوس) ان میں سے اول الذکر نے تخریج کے کام کی تکمیل کی اور ثانی الذکر نے کمپوزنگ اور ڈیزائنگ وغیرہ امور سرانجام دیے۔
- ہم نے اس جلد کو مندرجہ ذیل طباعتی ترتیب میں تشکیل دیا ہے۔

① ابتدائیہ (حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ مؤلف فتاویٰ ھذا)

② پیش لفظ (حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ)

③ عرض مرتب و ناشر (حافظ عبدالشکور مدنی ﷾)

④ مقدمہ بعنوان ''اجتہاد و افتاء'' (ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر ﷾)

⑤ علاوہ ازیں ہم نے مذکورہ عنوانات کے تحت تحریر شدہ عبارات کے حوالہ جات ان کے آخر میں متصل بعد ذکر کر دیے ہیں۔ اسی طرح مؤلف (حافظ صاحب) کے جوابات کے حوالہ جات بھی متن کے آخر میں متصل لکھ دیے ہیں۔

⑥ لیکن حاشیے دو قسم کے ہیں:

(۱) مؤلف کے فتاویٰ پر تعلیقات، توضیحات، تصریحات اور تردیدات وغیرہ۔

(۲) فتاویٰ جات کے متن میں پائی جانے والی احادیث و آثار وغیرہ کی تخریج۔

صاحبِ فتاویٰ کا سوانحی خاکہ:

شیخ مکرم ضلع لاہور کے ایک گاؤں ''کلس'' میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم ''سرہالی کلاں'' میں حاصل کی پھر حافظ عبداللہ روپڑی ؒ سے درس نظامی کی تعلیم مکمل کی اور وہاں سے ''جامعہ اسلامیہ'' مدینہ منورہ سے ''كلية الشريعة'' سے سند فراغت امتیازی حیثیت میں حاصل کی۔ وہاں رہ کر شہرۂ آفاق اور عبقری اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ ان میں سے مشہور یہ ہیں: مفتی اعظم سعودی عرب الشیخ ابن باز، محدث العصر صاحب تصانیف کثیرہ علامہ ناصر الدین الالبانی، شیخ المعقول والتفسیر الشیخ محمد امین الشنقیطی (؇) صاحبِ تفسیر اضواء البیان، الشیخ شیبۃ الحمد، الشیخ عبدالمحسن العباد، الشیخ حماد الأنصاری، الشیخ محمد بن اٗمان علی وغیرہ۔

پاکستانی علماء اساتذہ میں سے حافظ عبداللہ محدث روپڑی، شیخ الاساتذہ علامہ حافظ محمد گوندلوی، شیخ المنقول والمعقول مولانا محمد عبدہ، (؇) مولانا عبدالغفار ﷾ سابق شیخ الحدیث مدینہ یونیورسٹی اور دیگر اساطین علمائے اہل حدیث سے مختلف علوم وفنون میں تکمیل حاصل کی۔ علاوہ ازیں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی اور اسلامیات اعلیٰ پوزیشن میں پاس کیا۔

مختلف مدارس میں تدریسی خدمات:

مدینہ یونیورسٹی سے سند فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنے گاؤں ''سرہالی کلاں'' میں تدریس کا کام کیا پھر اپنے استاذ حافظ عبداللہ روپڑی ؒ کی جگہ ''جامعہ اہل حدیث'' لاہور میں تدریسی فرائض انجام دیتے

رہے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ''جامعہ لاہور الاسلامیۃ'' میں درس و تدریس میں مصروف رہے۔ چند سال بعد سعودیہ کی طرف سے پاکستان میں سب سے پہلے مبعوث ہو کر ۱۹۷۲ء سے ''جامعہ سلفیہ'' فیصل آباد میں متعین ہوئے۔ راقم نے بھی اسی سال آخری کلاس میں حافظ صاحب سے بعض اسباق پڑھے۔ یہاں کئی سال تک مدیر تعلیم اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔ بعد ازاں ''جامعہ لاہور الاسلامیہ'' میں بطور شیخ الحدیث متعین ہوئے اور ابھی تک یہاں اسی منصب پر فائز ہیں۔

فتویٰ نویسی:

حافظ صاحب نے چونکہ اندرون و بیرون ملک عالمی شہرت یافتہ علمائے کرام اور مفتیان عظام سے حصول علم کیا تھا اس لیے ان کے اندر علمی و تحقیقی تعمق، فتویٰ نویسی کی صلاحیت اور اس کا ذوق اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت اور مذکورہ اساطین علماء کی صحبت اور تربیت کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ ان کے فتاویٰ میں جا بجا سعودی علماء خصوصاً شیخ ابن باز رحمہ اللہ کی سلفیت اور فتویٰ کی صلاحیت، محدث البانی جیسی استناد اور اسماء الرجال پر دقت نظر، شیخ شنقیطی کا تفسیری ذوق، شیخ امان کی عقائد میں پختگی اور محدث روپڑی کی طرح ائمہ دین اور فقہائے امت کے اقوال و آراء پر دسترس اور فقہی وسعت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فتاویٰ کتاب و سنت، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے علاوہ فقہائے امت کی آراء اور ان کے افکار پر مبنی ہوتے ہیں۔ تقلیدی جمود سے ہٹ کر دلیل و حجت کے ساتھ راجح مسلک کی نشاندہی کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض مسائل میں اپنے محسن و مربی استاذ مکرم محدث روپڑی رحمہ اللہ اور دیگر عبقری اساتذہ سے بھی دلائل کی روشنی میں اختلاف کرتے ہیں جس کی مثالیں حافظ صاحب کے فتاویٰ میں موجود ہیں۔ یہی روش مسلک اہل حدیث اور سلف کو دوسرے مسالک سے ممتاز کرتی ہے۔ تفسیری تعمق، عمل بالحدیث، فقہ الحدیث، علم الاسناد، جرح و تعدیل، فقہ المقارن اور جدید مسائل میں استنباط و استخراج مجتہدانہ اور فقیہانہ طرز کا نظر آتا ہے جس کی وجہ سے ان کے فتاویٰ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ مختلف مسائل پر اب تک ہزاروں فتاویٰ تحریر کر چکے ہیں جو باقاعدگی کے ساتھ پاک و ہند کے مختلف رسائل و جرائد میں مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔

تدریسی و تصنیفی خدمات:

شیخ محترم عرصۂ دراز سے چونکہ پاکستان میں اہل حدیث مکتب فکر کے مایۂ ناز دینی مدارس میں شیخ الحدیث

کے منصب پر فائز رہے ہیں۔ اس لیے سینکڑوں طلبہ و طالبات اب تک حافظ صاحب سے حصول علم کر کے اندرون و بیرون پاکستان مختلف مدارس و مساجد اور اداروں میں تعلیمی، تحقیقی، تصنیفی اور تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً چالیس مرتبہ بخاری شریف سبقاً طلبہ و طالبات کو پڑھا چکے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ملکی و غیر ملکی حالات کے پیش نظر مضامین بھی تحریر کرتے رہتے ہیں۔ ترمذی شریف پر عربی میں تعلیقات بھی مکمل ہو چکی ہیں جس کا نام "جائزة الاحوذی فی التعلیقات السفیه علی سنن الترمذی" ہے۔ جو کہ چار مجلدات پر مشتمل ہے۔ عنقریب زیور طبع سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آ رہی ہے۔

تبلیغی و رفاہی خدمات:

استاذی المکرم اپنے آبائی گاؤں ''سرھالی کلاں'' اور ضلع قصور کے متعدد دیہات میں دعوتی، تبلیغی، سماجی اور رفاہی کام انجام دے رہے ہیں۔ تقریباً پچاس سال سے اسی گاؤں میں مسلسل خطبۂ جمعہ بھی دے رہے ہیں۔ یہاں کئی کنال پر مشتمل ایک بڑی مسجد جس کا بلند مینار کئی کلومیٹر دور سے نظر آتا ہے جو انہی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس مسجد کے ہال اور صحن میں ہزاروں لوگ بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں۔ ہر ماہ حافظ صاحب کی سرپرستی میں متعدد دیہات میں ہفتہ وار اور ماہانہ دعوتی اور تبلیغی اجتماعات وغیرہ کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح رفاہی اور سماجی کاموں کے طور پر علاقے کے دیہات میں بسنے والے غرباء و مساکین، یتامیٰ، بیوگان، مستحق افراد اور گھرانوں کی مالی معاونت کی جاتی ہے۔ بطور ثالث اور حکم بھی مختلف تنازعات، اختلافات اور جھگڑوں وغیرہ میں حافظ صاحب کے فیصلوں اور آراء پر عمل کیا جاتا ہے۔ آج کل لاہور میں ایک دینی کمپلیکس کی تعمیر بڑی تیزی سے جاری ہے اس کا نام ''مرکز أنصار السنة" ہے جس میں دینی درسگاہ، افتاء، تصنیف و تالیف، تبلیغی اور رفاہی و سماجی کاموں کو انجام دیا جائے گا۔

مدینہ یونیورسٹی میں دوران تعلیم ہر سال ''التوعیة الاسلامیة'' کی طرف سے حج کے دنوں میں حجاج کرام کے لیے دعوت و تبلیغ کا کام سرانجام دیتے رہے اور اس سلسلہ میں عرب امارات اور امریکہ کا کئی مرتبہ دورہ کر چکے ہیں۔

پاکستان کے بہت سے مدارس دینیہ میں ہر سال تقریب ''اختتام بخاری'' میں بخاری شریف کی آخری حدیث پر درس کے لیے حافظ صاحب کو مدعو کیا جاتا ہے۔ ان کے فاضلانہ اور محققانہ درس میں سینکڑوں علماء

فضلاء اور طلبہ شرکت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے۔

میں آخر میں ان سب حضرات کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس مجموعہ کی تیاری میں مختلف انداز میں تعاون کیا جیسا کہ برادرم ابوفیصل محمد سلیم اور تلمیذ رشید مولانا خالد بن بشیر صاحب کے مشورے اس جلد کی تیاری میں میرے لیے بہت مفید اور مدو معاون ثابت ہوئے۔

ایسے ہی مولانا عبد الجبار سلفی صاحب نے بھی نظر ثانی میں مدد فرمائی۔ مولانا عابد الٰہی رحمانپوری نے نہایت محنت ولگن اور ذوق وشوق سے اس کتاب میں موجود احادیث و آثار کی تخریج کر کے معاونت کی۔

علاوہ ازیں میری بڑی تین بیٹیوں، بڑے بیٹے حافظ عمر شکور اور ان کی والدہ نے متعدد بار پروف ریڈنگ وغیرہ میں بہت ساتھ دیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے انھیں دنیا و آخرت میں کامیاب کرے نیز علم و عمل اور ایمان کے زیور سے آراستہ کرے اور آخرت میں نبی اکرم ﷺ کی شفاعت نصیب فرمائے!

جب کہ میں ڈاکٹر حافظ عبد الرشید اظہر کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس پہلی جلد کے لیے ''اجتہاد و افتاء'' کے موضوع پر ایک جامع، وقیع اور تحقیقی مقدمہ لکھا جو اس مجموعہ کے لیے ایک اعزاز ہے۔

اسی طرح جماعت اہل حدیث کے نامور عالم دین، ممتاز رائٹر جناب صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے بھی کتاب ھذا کے لیے ''پیش لفظ'' لکھ کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔

اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں میری اور میرے معاون بھائیوں کی مساعیٔ جمیلہ کو شرف قبولیت سے نوازے اور آخرت میں ذریعہ نجات بنائے۔ آمین!

و صلى الله تعالىٰ على نبيه و خير خلقه محمد و آله و صحبه اجمعين برحمتك يا أرحم الراحمين .

الراقم

حافظ عبد الشکور مدنی بن حافظ علم الدین عفا اللہ عنہما

(فاضل مدینہ یونیورسٹی) مدرس جامعہ اہل حدیث

چوک دالگراں لاہور

رمضان المبارک ۱۴۲۴ھ بمطابق ۲۰۰۳/۸/۱۵

پیش لفظ

منصبِ اِفتاء کی اہمیت اور اس کے تقاضے

" فَتوٰی " کے معنی- جسے "فُتیا" بھی کہا جاتا ہے-اظہارِ رائے اوروضاحت کرنے کے ہیں؛لیکن شرعی اصطلاح میں اس سے مراد وہ وضاحت ہوتی ہے جس میں کسی پیش آمدہ مسئلہ، واقعہ یا اِشکال کی بابت شرعی حکم بیان کیا جاتا ہے۔گویا شریعت کی روشنی میں کسی اشکال کا حل پیش کرنا،کسی مسئلے کی وضاحت کرنا اور کسی واقعے کی بابت جواز یا عدمِ جواز کی تشریح کرنا "فتویٰ" کہلاتا ہے۔

عہدِ رسالت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے کوئی ایسا واقعہ یا اشکال پیش آتا،جس کی بابت ان کو شریعت کا حکم معلوم نہ ہوتا،تو صحابہ رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کرتے،تب اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں اس کی وضاحت فرما دیتا یا وحی الٰہی کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا جواب عنایت فرما دیتے۔

اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی مفتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی صاحب افتاء تھے۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی بابت یہ الفاظ موجود ہیں: ﴿ اَللّٰهُ يُفۡتِيۡكُمۡ فِيۡهِنَّ ﴾ (النساء: ١٢٧/٤) "اللہ تعالیٰ تمہیں ان عورتوں کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے (جن کی بابت تم نے استفسار کیا ہے)" ﴿ اَللّٰهُ يُفۡتِيۡكُمۡ فِي الۡكَلٰلَةِ ﴾ (النساء: ١٧٦/٤) "اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے"۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پوچھنے پر بہت سے احکام و مسائل بیان فرمائے، یہ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فتوے ہوئے۔ یہ فتوے احادیث کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

اس تفصیل سے چند باتیں واضح ہوتی ہیں:

١- مفتی کو قرآنی احکام کا بھی پورا علم ہونا چاہئے اور ذخیرۂ احادیث پر بھی اس کی نظر گہری اور وسیع ہونی چاہئے، علاوہ ازیں اسے مجتہدانہ بصیرت بھی حاصل ہو، تاکہ ہر پیش آمدہ مسئلے کا حل وہ قرآن وحدیث کی

روشنی میں پیش کر سکے، کوئی نص صریح نہ ہو تو قرآن و حدیث کے نظائر کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی حلت وحرمت اور جواز و عدم جواز کا فیصلہ کر سکے۔

۲۔ وہ کسی حالت میں بھی قرآن وحدیث اور ان کے نظائر سے صرفِ نظر کر کے محض آرائے رجال اور اقوال ائمہ کی روشنی میں فتویٰ نہ دے؛ کیونکہ وہ کسی خاص فقہ یا امام کا نمائندہ نہیں، بلکہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے منصب افتاء کا جانشین ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا فتویٰ صرف اور صرف اللہ ورسول کے بتائے ہوئے احکام اور شریعت کے اصول وضوابط کے دائرے میں ہو، نہ کہ اس سے متجاوز ہو۔

۳۔ مفتی کے اندر فقہی جمود نہیں، بلکہ فقہی توسع ہو؛ کیونکہ نئے نئے مسائل میں عوام کو سہولت اسی وقت مل سکتی ہے جب مفتی فقہی جمود سے پاک اور اسلاف کے علمی ذخیرے سے بلاتعصب استفادہ کرنے کا قائل ہو۔ ورنہ وہ قرآن وحدیث کی نصوص کو بھی نظرانداز یا ان کی دوراز کار تاویل کرے گا اور عوام کی سہولت کی بھی اسے پرواہ نہ ہوگی۔ یوں وہ اپنے فتویٰ میں اَوفق بالکتاب والسنۃ کا اہتمام کرے گا اور نہ ارفق بالناس ہی کا۔ جب کہ یہ منصب ان دونوں ہی باتوں کا متقاضی ہے۔

الحمدللہ علمائے اہل حدیث کے فتاویٰ مذکورہ خصوصیات ہی کے حامل ہوتے ہیں؛ کیونکہ انہی کی تدریسی، تبلیغی اور علمی خدمات کے نتیجے میں برصغیر پاک وہند میں فقہی وتقلیدی جمود ٹوٹا اور عمل بالحدیث کو فروغ حاصل ہوا، اس لئے اہل حدیث میں شخصیت پرستی ہے نہ اکابر پرستی اور نہ ہی کسی ایک فقہ کی پابندی پر زور۔ ان کے عوام بھی کسی مسئلے میں علماء کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد صرف قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا حل معلوم کرنا ہوتا ہے اور علماء بھی اپنی فہم کی حد تک سوال کا جواب دیتے وقت قرآن وحدیث کے دائرے سے تجاوز نہیں کرتے۔ بنابریں منصب افتاء کی اہمیت کو صرف علمائے اہل حدیث ہی سمجھتے اور اس کے تقاضوں کو بھی وہی ادا کرتے ہیں۔ کَثَّرَ اللّٰهُ سَوَادَهُمْ.

پاک وہند میں جب عمل بالحدیث کا جذبہ عام ہوا، تو عوام بھی بکثرت علمائے اہل حدیث کی طرف رجوع کرنے لگے، اور علماء نے بھی اپنی مسئولیت اور ذمے داری کا احساس کرتے ہوئے اس فرض کو خوب ادا کیا۔ لیکن المیہ یہ ہوا کہ اس وقت ان فتاویٰ کو سنبھال کر رکھنے کا خصوصی اہتمام نہیں کیا گیا، اس لئے ان کا ایک بہت بڑا حصہ محفوظ نہ رہ سکا۔ جیسے شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کی بابت ان کے ایک فاضل شاگرد مولانا سید عبدالحی (سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کی قابل قدر کتاب ''نزھۃ الخواطر'' میں ہے:

" أَمَّا الْفَتَاوَى الْمُتَفَرِّقَةُ الَّتِي شَاعَتْ فِي الْبِلَادِ فَلَا تَكَادُ أَنْ تُحْصَرَ وَظَنِّي أَنَّهَا لَوْ جُمِعَتْ لَبَلَغَتْ إِلَى مُجَلَّدَاتٍ ضِخَامٍ." (۸/۵۰۰، طبع جدید حیدر آباد دکن، ۱۹۷۰ء)

''ان کے صرف وہ متفرق فتاوٰی ہی جومختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، حیطۂ شمار سے باہر ہیں۔ میرے خیال کے مطابق اگر وہ جمع کیے جاتے تو کئی ضخیم جلدیں بنتیں۔''

میاں صاحب رحمہ اللہ کی وفات کے بعد یہ احساس ہوا، تو پھر اس کی طرف کچھ توجہ دی گئی، اورانہیں جمع اورمرتب کرکے فتاوٰی نذیریہ کے نام سے دوجلدوں میں دہلی سے شائع کیا گیا، جوبعد میں حضرت الاستاذ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کی مساعی کے نتیجے میں اہل حدیث اکادمی لاہورکی طرف سے دوبارہ تین جلدوں میں شائع ہوا۔لیکن یہ شائع شدہ فتوے بہت قلیل حصہ ہیں، بہ نسبت ان فتووں کے جوانہوں نے تحریر فرمائے۔اسی طرح دوسرے علمائے اہل حدیث کی علمی کاوشوں اورفتووں کا حشر ہوا، ان کا ریکارڈ رکھا گیا نہ ان کی وفات کے بعدانہیں جمع کرنے کی کوئی کوشش کی گئی، نتیجۂ بہت سی علمی وقیمتی تحریرات ودستاویزات دست بردزمانہ کی نذرہوگئیں۔

ہمارے (ماضی قریب) کے اکابرعلماء میں بھی اگرچہ متعددعلماء فتوٰی نویسی کے میدان میں نمایاں رہے،لیکن ان میں دوشخصیتیں نہایت ممتاز اورسرفہرست ہیں:ایک صاحب مرعاۃ المفاتیح مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری(متوفی ۱۹۹۰ء)اوردوسرے مجتہد العصرحافظ عبداللہ محدث روپڑی(متوفی ۲۰ اگست ۱۹۶۴ء) رحمہما اللہ تقسیم ملک کے بعد اول الذکر بھارت ہی میں مقیم رہے، جبکہ ثانی الذکر روپڑ(انبالہ ضلع، مشرقی پنجاب) سے لاہورآ گئے۔ یہ دونوں ہی یگانۂ عصر شخصیتیں تھیں، علم وعمل کے بحر بیکراں، مجتہدانہ ذوق وصلاحیت سے بہرہ وراورتحقیق وتدقیق کے ذروۂ علیا پر فائز۔ بنا بریں دونوں ہی عوام وخواص کے مرجع اورتحقیق وافتاء کی مسند کے صدرنشین رہے۔حضرت محدث روپڑی کے فتاوٰی توان کی وفات کے بعدان کے شاگردِ رشید مولانا ابوالسلام محمد صدیق (سرگودھا) رحمہ اللہ نے مرتب کرکے''فتاوٰی اہل حدیث'' کے نام سے شائع کردیئے تھے، جس سے اہل علم وتحقیق خوب استفادہ کرتے ہیں۔تاہم محدث مبارکپوری کے فتاوٰی اورتحقیقی مقالات ابھی تک کسی دیدہ ورمرتب ومحقق کے منتظر ہیں۔ اللہ کرے کہ وہ بھی جلد منظر عام پرآجائیں تاکہ یہ بیش قیمت علمی ورثہ بھی محفوظ ہوجائے۔

ہمارے ممدوح شیخ الحدیث مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ بھی (جن کا مجموعہ فتاوٰی اس وقت زیر نظر

ہے)اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی اور اسلاف کی علمی وعملی روایات کے حامل ہیں، علم وفضل میں نمایاں، زہد وتقویٰ میں ممتاز، سادگی اور تواضع کے پیکر اور اجتہاد وتفقہ کی صلاحیتوں سے بہرہ ور۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پہلے حضرت محدث روپڑی رحمہ اللہ سے کسب فیض کرنے کی سعادت سے نوازا، اس کے بعد جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) میں محدث عصر شیخ البانی، محقق دوراں شیخ ابن باز مفتی اعظم سعودی عرب اور عظیم مفسر شیخ محمد امین الشنقیطی (صاحب أضواء البیان) (رحمہم اللہ) جیسے اساطین علم اور اصحاب علم وفضل کے سامنے زانوئے ادب طے کرنے کا موقع دیا، جس سے ان کی علمی صلاحیتوں میں اضافہ اور تحقیقی ذوق میں مزید نکھار پیدا ہوا۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

چنانچہ وہ ایک عرصے سے جہاں ایک طرف شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہیں تو دوسری طرف اپنے بے مثال اساتذہ کی طرح مسندِ افتاء کے بھی صدرنشیں ہیں۔ اپنے فتاوی کے ذریعے سے وہ اہل حدیث کی اس علمی روایت کو بھی قائم رکھے ہوئے ہیں جس کا ذکر گزشتہ سطور میں ہوا اور اس مشن کو بھی آگے بڑھا رہے ہیں جو ہمیشہ علمائے اہل حدیث کے پیش نظر رہا، یعنی عمل بالحدیث کے جذبے کا فروغ و احیاء۔ اور یہی مشن ان کی تدریسی، دعوتی وتبلیغی، علمی وتحقیقی اور تصنیفی و تالیفی خدمات کا محور و مرکز رہا۔ تَقَبَّلَ اللّٰهُ جُهُوْدَهُمْ وَجَعَلَ مَسَاعِيَهُمْ مَشْكُوْرًا.

حافظ صاحب کے یہ فتاوی تقریباً پندرہ برس سے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں نہایت پابندی سے شائع ہو رہے ہیں جن سے عوام وخواص مستفید ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں۔ اب انہی فتووں کو مرتب کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ جس سے یقیناً ان کی افادیت کا دائرہ بھی وسیع ہوگا اور ان کی محفوظیت بھی یقینی۔ کیونکہ اخبار یا رسالہ چاہے وہ کتنا بھی وقیع ہو اُس کے قارئین کا حلقہ مخصوص اور محدود ہی ہوتا ہے اور اسی طرح اس کی زندگی بھی چند روزہ ہی ہوتی ہے؛ جبکہ کتاب کا معاملہ اس کے برعکس ہے، وہ ہر صاحب ذوق اور ضرورت مند جب چاہے خرید سکتا ہے اور کتاب کی زندگی بھی دیرپا اور مستقل ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت حافظ صاحب حفظہ اللہ کی زندگی میں برکت عطا فرمائے اور انہیں صحت و عافیت سے رکھے اور قرآن و حدیث کے اس سرچشمۂ صافی کو تا دیر جاری رکھے! تاکہ تشنگان علم وتحقیق اس سے سیراب اور فیض یاب ہوتے رہیں۔ ویرحم اللہ عبدا قال آمینا.

اُخی الفاضل حافظ عبدالشکور حفظہ اللہ (فاضل جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، مبعوث فی الباکستان) بھی تمام اہل علم کی طرف سے شکریئے اور قدر افزائی کے مستحق ہیں جنہوں نے اخبارات کی فائلوں سے یہ لولوئے متناثرہ اور معارف منتشرہ جمع کئے اور سات سال کی محنت شاقہ کے بعد انہیں مرتب کر کے یہ مجموعہ، جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، شائع کیا، جو یقیناً ایک عظیم الشان دینی، علمی اور مسلکی خدمت ہے۔ جزاہ اللہ عن الاسلام والمسلمین خیر الجزاء۔

اللہ کرے کہ پروگرام کے مطابق بقیہ فتووں کو بھی وہ اسی طرح جلد از جلد مرتب اور شائع کرنے کی توفیق سے بہرہ ور ہوں تاکہ اخبارات کے صفحات میں مدفون علوم و معارف کا یہ بیش قیمت گنجینہ اور تحقیق و تدقیق کا یہ نادر خزینہ مکمل شکل میں منظر عام پر آسکے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

صلاح الدین یوسف

رمضان المبارک ۱۴۲۱ھ

دسمبر ۲۰۰۰م

مقدمہ: اجتہاد و افتاء

(کتاب وسنت اور سلفِ امت کے مناھج کی روشنی میں)

وحی و رسالت کی ضرورت و اہمیت

نَحْمَدُهٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ . اَمَّا بَعْدُ ......!

اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ فطرت سلیمہ کے ذریعہ اگر وہ اپنی اصلی حالت پر قائم ہو تو انسان ظاہری شر و فساد سے تو بچ سکتا ہے، مگر خیر و فلاح کی تلاش کے لیے وہ بہر حال وحی و رسالت کا محتاج ہے، انسان کے اختیاری اعمال وافعال میں سے کچھ ایسے ہیں جن کا انجام پسندیدہ نظر آتا ہے، اہل خرد اور اصحاب بصیرت انہیں بجالاتے اور دوسروں کو بجالانے کی ترغیب دیتے ہیں، خواہ ان میں محنت و مشقت ہی کیوں نہ ہو، بہتر نتائج و عواقب کی خاطر راہ کی مشکلات برداشت کرلی جاتی ہیں، ایسے ہی ان میں سے کچھ کا انجام ناپسندیدہ ہوتا ہے، ان سے احتراز ضروری سمجھا جاتا ہے، مگر اکثر اعمال وافعال ایسے ہیں جن کے حسن و قبح اور انجام خیر و شر کا تصور انسانی عقل و فہم سے ماورا ہے، جیسے اصول ایمان اور ان کے جملہ متعلقات، عبادات اور غیبی امور انسانی فکر کی دسترس میں نہیں ہیں، بلکہ نفسانی خواہشات سے مغلوب انسان ظاہری معاملات میں بھی خیر و شر میں امتیاز کرنے سے عاجز آجاتا ہے، ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اعمال کے انجام خیر و شر تک رسائی کے لیے کوئی اس کی راہنمائی کرے، ظلم و ظلمات سے نکال کر اسے نور ہدایت سے نوازے۔ فرمایا:

﴿ وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ. ﴾ (الشوری: ۵۲)

''اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے روح کو اتارا ہے۔ آپ تو اس سے پہلے یہ نہیں

جانتے تھے کہ کتاب اور ایمان کیا چیز ہے؟ لیکن ہم نے اسے نور بنایا، اس کے ذریعے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور بے شک آپ صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔''

نیز انسانی عقل و شعور میں تفاوت اور فکر و نظر کے اختلاف نے اسے حیرانی و پریشانی کے چوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ مذاہب و ادیان کی کثرت و اختلاف اور ان کے خود ساختہ اور خود غرض راہنماؤں نے انسان کی اس حیرانی و پریشانی اور فکری انتشار میں مزید اضافہ کیا۔

﴿ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْأَرْضِ حَيْرَانَ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَ أُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ. ﴾ (الأنعام: ٧١)

''اس شخص کی مانند جس کو شیطانوں نے کہیں جنگل میں راہ سے بھٹکا دیا ہو، اور حیران پھرتا ہو، اس کے کچھ ساتھی بھی ہوں اور وہ اسے راہ راست کی طرف بلا رہے ہوں کہ ہمارے پاس آ جا، اے پیغمبر کہہ دیجئے! راہ راست تو صرف اللہ کی راہ ہے، اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم پروردگار جہاں کے مطیع ہو جائیں۔''

اور یہ خود غرض مذہبی راہنما، آسمانی کتابوں کے نام لیوا احبار و رھبان اور صوفیاء و مشائخ راہنمائی کے نام پر راہزنی کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ . ﴾ (التوبة: ٣٤)

''اے ایمان والو! اکثر علماء و عابد لوگ، ناحق لوگوں کا مال کھاتے اور اللہ کی راہ سے روک دیتے ہیں۔''

اس صورت حال میں بگڑے ہوئے، خود غرض اور نفس پرست انسان سے کسی خیر کی توقع نہیں رکھی جا سکتی، بلکہ خون خرابے، قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے امکانات زیادہ ہیں۔ جیسا کہ انسانی تاریخ کے جاہلی ادوار میں عملاً اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انسان کی ہدایت و راہنمائی کے لیے اپنے رسول مبعوث فرمائے

ان پر وحی نازل کی۔ عدل قائم کرنے کے لیے ان کے حقوق و فرائض کا تعین فرمایا، خالق کے مخلوق کے ساتھ اور مخلوق کے باہمی تعلقات کی حدود واضح کیں تاکہ دنیا سے خود غرضی اور نفس پرستی ختم ہو اور الفت و ایثار کا چلن عام ہو۔اور بنی آدم راہ حق صراط مستقیم پر چلیں اور نجات پائیں۔فرمایا:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ أَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ.﴾ (الحديد: ٢٥)

''بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح نشانیاں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور عدل کی ترازو اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿كِتٰبٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّوْرِ.﴾ (إبراهيم: ١)

''یہ کتاب ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے تاکہ آپ لوگوں کو اندھیرے سے اجالے کی طرف لائیں۔''

اور حکم فرمایا:

﴿اِتَّبِعُوْا مَآ أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ أَوْلِيَآءَ.﴾ (الأعراف: ٣)

''اے لوگو!اس پر چلو جو تم پر تمہارے پروردگار کی جانب سے نازل کیا گیا اور اسے چھوڑ کر ولیوں کے پیچھے نہ چلو۔''

اللہ تعالیٰ کو شریعت نازل کر کے لوگوں کی راہنمائی کرنا، ان پر حجت قائم کرنا اور ہر قسم کے عذر ختم کرنا اور اپنی مدح و ثنا بہت پسند ہے۔ اسی لیے اس نے بندوں پر احسان کرتے ہوئے سلسلۂ رسالت و نبوت جاری فرمایا، تاکہ انسان اپنے عجز اور کم مائیگی پر نظر رکھے اور اللہ کے اس احسان عظیم پر اس کی مدح و ستائش اور حمد و ثنا کرتا رہے۔

«عَنْ مُغِيْرَةَ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: لَوْ رَأَيْتُ رَجُلًا مَعَ امْرَأَتِيْ لَضَرَبْتُهُ بِالسَّيْفِ غَيْرَ مُصْفِحٍ. فَبَلَغَ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: تَعْجَبُوْنَ مِنْ غَيْرَةِ سَعْدٍ، لَأَنَا أَغْيَرُ مِنْهُ، وَاللّٰهُ أَغْيَرُ مِنِّيْ وَ مِنْ أَجْلِ غَيْرَةِ اللّٰهِ حَرَّمَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ، وَ لَا أَحَدَ أَحَبُّ إِلَيْهِ الْعُذْرُ مِنَ اللّٰهِ وَ مِنْ أَجْلِ ذٰلِكَ

بَعَثَ الْمُبَشِّرِينَ وَ الْمُنْذِرِينَ، وَ لَآ أَحَدَ اَحَبُّ اِلَيْهِ الْمَدْحَةُ مِنَ اللهِ وَ مِنْ أَجْلِ ذٰلِكَ وَعَدَ اللهُ الْجَنَّةَ .» ❶

''مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: اگر میں نے اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر مرد کو دیکھ لیا تو میں اس پر سیدھی تلوار چلادوں گا، یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہیں سعد کی غیرت پر تعجب ہورہا ہے حقیقت یہ ہے کہ میں اس سے بڑھ کر غیرت مند ہوں اور اللہ مجھ سے زیادہ غیرت والا ہے یہ اس کی غیرت ہے کہ اس نے بے حیائیاں اعلانیہ ہوں یا خفیہ حرام کردی ہیں۔ اور کوئی نہیں جسے عذر اللہ سے بڑھ کر پسند ہو۔ اسی لئے اس نے رسولوں کو بشارت دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر مبعوث فرمایا اور کوئی نہیں جسے مدح وستائش اللہ سے بڑھ کر پسند ہو اسی لئے اس نے جنت کا وعدہ کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی نازل کردہ شریعت اور عطا فرمودہ تعلیمات کا انسان آب وہوا سے بھی زیادہ محتاج ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی عمل داری اور فرماں برداری کی سخت تاکید کی اور مخالفت پر وعید شدید سے ڈرایا۔ فرمایا:

﴿ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ . ﴾ (المائدہ:٤٤)

''اور جو اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو ایسے لوگ ہی کافر ہیں۔''

﴿ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ . ﴾ (المائدہ:٤٥)

''اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام پر فیصلہ نہ کریں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔''

﴿ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ . ﴾ (المائدہ:٤٧)

''اور جو اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو ایسے لوگ ہی نافرمان ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی اہمیت کے پیش نظر ہی اس کی دعوت کے لئے اپنے منتخب بندوں انبیاء ورسل کو مبعوث فرمایا۔ ان کے ساتھ اور ان کے بعد اس کی تبلیغ وتشریح اور بیان کے لئے علماء کرام کے قابل احترام گروہ کو متعین فرمایا۔ جن کا ذکر انبیاء کرام کے ساتھ کیا۔ دین کی اساس توحید کی حقانیت وصداقت کی گواہی جہاں خود ذات باری تعالیٰ نے دی وہاں اپنے مقرب فرشتوں اور اہل علم کی گواہی کا ذکر بھی کیا۔ فرمایا:

---

❶ (صحيح البخاري ، كتاب التوحيد، باب قول النبي ﷺ « لا شخص أغير من الله» (٧٤١٦)، (٦٨٤٦).

﴿ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ. ﴾
(آل عمران:١٨)

''اللہ تعالیٰ، فرشتے اور اہل علم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ عدل کو قائم رکھنے والا ہے۔''

یہاں شہادت کے معنی بیان کرنے اور آگاہ کرنے کے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی کونی اور قرآنی آیات کے ذریعے اپنی وحدانیت کی طرف راہنمائی فرمائی، فرشتے، انبیاء کرام اور اہل علم اس کی تبلیغ وتعلیم اور توضیح و تشریح کے ذریعے گواہی دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس آیت مبارکہ میں مذکور اہل علم سے مراد وہی لوگ ہوں گے جو انبیاء کرام کے علمی، دعوتی اور تبلیغی منہج پر قائم ان کے علمی ترکہ کے وارث وامین ہیں اور زندگی کے ہر موڑ پر اللہ کی مخلوق کی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول مکرم ﷺ کی سنت مطہرہ کی روشنی میں راہنمائی کرتے ہیں اور اپنی تمام تر قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر پورے اخلاص کے ساتھ اللہ کے نازل کئے ہوئے دستور حیات اور حیات انسانی میں پیش آمدہ مسائل میں تطبیق کی راہیں تلاش کرکے متلاشیان حق کے لئے صراط مستقیم واضح کرتے ہیں، مفتیان شریعت غراء اور علماء ملت بیضاء کا یہی قابل قدر گروہ ہے جس کا ذکر اللہ نے مذکورہ بالا آیت میں اپنے اور فرشتوں کے ساتھ کیا، اور یہی وہ مقدس گروہ ہے جو اللہ کی طرف سے اس کے احکام کی دستاویزات پر دستخط کرتے ہیں۔

﴿ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ. ﴾ (المجادلہ:١١)

''اللہ تم میں سے ان لوگوں کے درجے بلند کرے گا جو ایمان لاتے ہیں اور جو علم دیے گئے ان کے درجات مزید بلند ہیں۔''

الغرض انسان جادۂ حق کی تلاش وجستجو، صراط مستقیم کی ہدایت، اس پر چلنے اور عمل کرنے کی توفیق اور استقامت کے لئے اللہ رب العزۃ والجلال کا محتاج ہے اس کی اس ضرورت واحتیاج کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء ورسل پر وحی و رسالت نازل کرکے پورا فرمایا، جس کی دعوت وتبلیغ کا فریضہ بھی انہوں نے بااحسن وجوہ سرانجام دیا، دعاۃ حق، علماء دین، مفتیان شرع متین اور وارثین انبیاء ومجتہدین اس سلسلۂ دعوت وتعلیم کو اللہ کی توفیق سے بخیر وخوبی قائم رکھے ہوئے ہیں، جس سے مخلوق پر اللہ کی طرف سے شریعت واضح اور حجت قائم ہورہی ہے۔

﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا . ﴾ (النساء: ١٦٥)

''اور رسولوں کو خوش خبری سنانے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا تھا تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ پر الزام کا کوئی موقع نہ رہے، اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔''

﴿ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ وَ لَوْ شَآءَ لَهَدٰكُمْ أَجْمَعِيْنَ . ﴾ (الأنعام: ١٤٩)

''کہہ دو! کامل حجت اللہ ہی کی ہے، سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔''

حصول ہدایت اور نزولِ وحی و رسالت پر ہمیں اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم پر شکر ادا کرتے ہوئے اس کی حمد و ستائش میں وہی کہنا چاہئے جو اہل جنت اپنے انجام خیر پر کہیں گے۔

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَا أَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ ، لَقَدْ جَآءَ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ . ﴾ (الاعراف: ٤٣)

''ہر قسم کی تعریف (شکر) اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں اس (جنت) تک پہنچایا اور ہماری کبھی رسائی نہ ہوتی اگر اللہ ہم کو نہ پہنچاتا۔ واقعی ہمارے رب کے رسول سچی باتیں لے کر آئے تھے۔''

شریعت صرف کتاب وسنت کی شکل میں وحی کا نام ہے:

صدقِ دل سے ایمان لا کر، اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کو قبول کر کے جو لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے، اصحاب رسول رضی اللہ عنہم کا یہ مقدس گروہ اور دعوت دین کی علم بردار یہ اوّلیں جماعت نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو دل و جان سے عزیز رکھتی اور اس کی پیروی کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی، یہ لوگ اپنے تمام امور و معاملات میں فرامین الٰہیہ اور ارشادات نبویہ کو ہی سند اور حرف آخر سمجھتے تھے اور ہر طرح کے حالات میں نبی کریم ﷺ فداہ ابی و امی ہی ان کے مرشد و مربی اور ہادیٔ اعظم تھے، آپ ہی کے نقوش پا ان کے لئے راہ نجات اور صراط مستقیم تھے، اسی کا انہیں حکم تھا جس پر وہ کار بند اور عمل پیرا تھے۔ فرمایا:

﴿ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ أَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ . ﴾ (النساء: ٥٩)

''اے مومنو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولی الامر کی بھی، اور اگر کسی بات میں تمہارا اختلاف واقع ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کوئی ذاتی و نجی مسئلہ درپیش ہوتا یا کوئی باہمی مشکل تو فوراً نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور پیش آمدہ مسائل و مشکلات کے بارے میں حکم الٰہی معلوم کرنے کی کوشش کرتے، تاکہ اس کے مطابق عمل کر کے فلاح و نجاح اخروی حاصل کر سکیں۔

رسول اللہ ﷺ اپنے فرائض منصبی بجالاتے ہوئے فتاویٰ و قضایا صادر فرماتے، کتاب اللہ کی تشریح و توضیح فرماتے، احکام شریعت بیان کرتے، اللہ کی طرف سے نازل کردہ قرآنی آیات اور اپنی سنت و حدیث انہیں سناتے، انہیں اپنے عمل کے ذریعے تعلیم دیتے، اعمال درست ہونے کی صورت میں ان پر صاد کرتے، یا بوقت ضرورت ان کی تصحیح کرتے، بیان شریعت کی یہ تمام صورتیں وحی الٰہی کی مختلف شکلیں تھیں، جو کبھی قرآن کریم کی صورت میں۔ وحی متلو۔ ہوتی اور کبھی قولی، فعلی اور تقریری سنت کی صورت میں۔ وحی غیر متلو۔ ہوتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی اِنۡ ھُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی . ﴾ (النجم:۳۔۴)

''اور وہ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتے، وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے۔''

﴿ مَا کَانَ حَدِیۡثًا یُّفۡتَرٰی وَ لٰکِنۡ تَصۡدِیۡقَ الَّذِیۡ بَیۡنَ یَدَیۡهِ وَ تَفۡصِیۡلَ کُلِّ شَیۡءٍ وَ ھُدًی وَّ رَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ . ﴾ (یوسف:۱۱۱)

''یہ قرآن گھڑی ہوئی بات نہیں۔ بلکہ یہ تصدیق ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے کی ہیں، کھول کھول کر بیان کرنے والا ہے ہر چیز کو اور ہدایت اور رحمت ہے ایمان دار لوگوں کے لیے۔''

﴿ وَ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَیۡكَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمۡ تَکُنۡ تَعۡلَمُ وَ کَانَ فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَیۡكَ عَظِیۡمًا . ﴾ (النساء:۱۱۳)

''اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور تمہیں وہ کچھ سکھایا جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔''

امام شافعی رحمہ اللہ نے وضاحت سے بیان کیا ہے کہ میرے پسندیدہ اور قابل قدر اہل علم کے نزدیک اس آیت میں مذکور ''حکمت'' سے مراد سنت اور صرف سنت ہے۔ (ملاحظہ ہو: الرسالة للشافعي:۷۸)

ایسے ہی شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی سلف امت کے حوالے سے مذکورہ آیت میں حکمت سے مراد سنت ہی لی ہے۔ (معارج الوصول ۔ فتاویٰ ابن تیمیہ :۱۹/۱۷۵)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جونہی پیش آمدہ مسائل میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم معلوم ہو جاتا تو وہ بلاتردد رضاء و رغبت کے ساتھ فوراً اس پرعمل پیرا ہو جاتے، کامل ایمان اور تسلیم و رضا کا یہی تقاضا تھا۔ فرمایا:

﴿ وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ .﴾ (الاحزاب:٣٦)

''اور کسی مومن مرد اور عورت کو لائق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کر دیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں۔''

نیز فرمایا:

﴿ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا .﴾ (النساء:٦٥)

''تمہارے رب کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہوں گے جب تک اپنے باہمی جھگڑوں میں تمہیں منصف نہ مان لیں اور جو فیصلہ تم کردو اس سے اپنے دل میں بھی تنگ نہ ہوں بلکہ اسے خوشی سے تسلیم کرلیں۔''

عہد نبوی میں لوگوں کے سوالات واستفتاءات کے جواب اور رسول اکرم ﷺ کی طرف سے ارشاد وافتاء اور توجیہ کا یہی طریقہ تھا، قرآن کریم نازل ہو جاتا، آپ ﷺ لوگوں کو پڑھ کر سنا دیتے، لکھوا دیتے، یاد کروا دیتے، حسب ضرورت بیان فرما دیتے حتی کہ پوری شریعت اور مکمل دین کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی شکل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس جمع ہو گیا، اور آسمان سے اس کی تکمیل کی شہادت نازل ہوگئی۔ فرمایا:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا .﴾ (المائدہ:٣)

''آج میں نے تمھارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین پسند کیا۔''

امام دارالھجرۃ مالک بن انس رحمہ اللہ نے اس آیت مبارکہ سے دین کے کمال شمول، جامعیت اور رد بدعت پر استدلال کیا۔ فرمایا:

'' قَالَ ابْنُ الْمَاجِشُوْنَ سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُوْلُ: ''مَنِ ابْتَدَعَ فِي الْاِسْلَامِ بِدْعَةً يَرَاهَا

حَسَنَةً فَقَدْ زَعَمَ أَنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ خَانَ الرِّسَالَةَ لِأَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُولُ : ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ . ﴾ فَمَا لَمْ يَكُنْ يَوْمَئِذٍ دِيْنًا فَلَا يَكُوْنُ الْيَوْمَ دِيْنًا .﴾ (الاعتصام للشاطبی ۱/۴۸، ط المنار)

''ابن الماجشون کہتے ہیں: کہ میں نے امام مالک رحمہ اللہ کو سنا فرماتے تھے: جس نے دین اسلام میں کوئی بدعت ایجاد کی اور اسے (بدعت حسنہ) اچھا باور کرتا ہے تو وہ اس بدگمانی کا شکار ہوا کہ حضرت محمد ﷺ نے اللہ کا پیغام پہنچانے میں دیانت داری سے کام نہیں لیا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے۔'' (تو جو چیز اس دن دین نہ تھی وہ آج دین نہیں ہوسکتی۔)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَ أَمَّا الْعَمَلِيَّاتُ وَ مَا يُسَمِّيهِ نَاسٌ : الْفُرُوْعُ ، وَالشَّرْعُ ، وَالفِقْهُ ، فَهٰذَا قَدْ بَيَّنَهُ الرَّسُوْلُ أَحْسَنَ بَيَانٍ ، فَمَا شَيْءٌ مِمَّا أَمَرَ اللّٰهُ بِهِ أَوْ نَهٰى عَنْهُ أَوْ حَلَّلَهُ أَوْ حَرَّمَهُ إِلَّا بَيَّنَ ذٰلِكَ وَ قَدْ قَالَ تَعَالٰى ﴿ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ . ﴾ (فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۹/۱۷۳)

''اور جہاں تک ''عملیات'' کا تعلق ہے جنہیں لوگ فروع، شرع اور فقہ کا نام دیتے ہیں تو اسے رسول اللہ ﷺ نے باحسن وجوہ بیان فرمادیا ہے۔ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا اللہ نے حکم دیا ہو، یا اس سے روکا ہو، حلال کیا ہو یا حرام کیا ہو مگر آپ ﷺ نے اس کی وضاحت فرمادی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔''

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ . ﴾ میں مذکور ''حکمت'' کی سنت کے ساتھ تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

'' وَ هٰذِهِ السُّنَّةُ الَّتِي فَرَّقَ بِهَا بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ وَ بَيْنَ الْأَعْمَالِ الْحَسَنَةِ مِنَ الْقَبِيحَةِ وَالْخَيْرِ مِنَ الشَّرِّ وَ قَدْ جَاءَ عَنْهُ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: « تَرَكْتُكُمْ عَلَى الْبَيْضَاءِ لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا لَا يَزِيْغُ عَنْهَا بَعْدِيْ إِلَّا هَالِكٌ . » (فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۹/۱۷۵)

''یہ سنت ہی ہے جس کے ذریعے نبی ﷺ نے حق و باطل میں فرق واضح کیا، نیک و بد اعمال کو

بیان کیا، خیر و شر کی وضاحت فرمائی، آپ ﷺ سے مروی ہے، فرمایا: تمہیں روشن دین پر چھوڑ کر جا رہا ہوں، جس کی رات بھی دن کی طرح ہے، اس سے صرف وہی بدنصیب بھٹکے گا جس کی قسمت میں ازلی ہلاکت لکھی ہے۔"

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے آخر میں گفتگو کا خلاصہ ان الفاظ میں کیا ہے۔ اور ہماری اس گفتگو کا مقصد بھی یہی ہے۔

" وَ أَنَّ الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ وَافِيَانِ بِجَمِيعِ أُمُورِ الدِّينِ ."

"کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ تمام امور دین کے بیان کے لئے کافی و وافی ہیں۔"

لہٰذا قرآن کریم اور حدیث نبوی کی شکل میں وحی و رسالت پر مکمل اور غیر مشروط اعتماد اور زندگی کے ہر معاملہ میں ان سے راہنمائی لینا، ان کی روشنی میں فیصلے کرنا، حکم دینا، فتاویٰ جاری کرنا اور ان پر عمل کرنا دنیا و عقبیٰ کی سعادت ہے۔

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا .﴾ (الاحزاب: ۷۱)

"اور جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی تابع داری کرے گا تو اس نے بڑی مراد پالی۔"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جذبۂ اتباعِ رسول ﷺ:

اصحاب کرام رضی اللہ عنہم نہایت مخلص، صاف دل، عمل کے لئے حریص، رضاء الٰہی کے حصول میں انتہائی سنجیدہ تھے۔ انہیں لفظی مباحث میں الجھنے کی عادت تھی اور نہ ہی مفروضے قائم کر کے موشگافیوں اور غیر واقعی مسائل کے بارے میں سوال کرنے کا شوق تھا۔ اطاعت الٰہی اور اتباع واقتداء نبوی میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب درج ذیل اثر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت پر بڑا دل آویز اور خوبصورت تبصرہ ہے۔

« عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنه قَالَ: مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْ مَاتَ، فَإِنَّ الْحَيَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ أُولٰٓئِكَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ كَانُوْٓا أَفْضَلَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ وَ أَبَرَّهَا قُلُوْبًا وَ أَعْمَقَهَا وأَقَلَّهَا تَكَلُّفًا، اخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ وَ لِإِقَامَةِ دِيْنِهٖ ، فَاعْرِفُوْا لَهُمْ فَضْلَهُمْ وَاتَّبِعُوْهُمْ عَلٰى أَثَرِهِمْ وَ تَمَسَّكُوْا بِمَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ أَخْلَاقِهِمْ وَ سِيَرِهِمْ فَإِنَّهُمْ كَانُوْا عَلَى الْهُدَى الْمُسْتَقِيْمِ .»(مشکوۃ المصابیح ۱۸۳)

''عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: جو شخص دین میں کوئی بہترین راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ ان لوگوں کے نقوش پا پر چلے جو دنیا سے جا چکے اس لئے کہ کسی زندہ شخص کے بارے میں یہ اطمینان نہیں ہے کہ وہ یقیناً فتنہ سے محفوظ رہے گا، دنیا سے جانے والے یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام ہیں جو اس امت کے افضل ترین لوگ تھے، دل سب سے زیادہ نیک، علم میں سب سے زیادہ گہرائی اور ان میں تکلف سب سے کم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے شرف سے نوازا، اپنے دین کی سربلندی کے لئے انتخاب سے سرفراز فرمایا، ان کی فضیلت کو سمجھو، ان کے نقش قدم پر چلو اور جس قدر ممکن ہو ان کی سیرت اور اخلاق و کردار کو اپناؤ کہ وہ شاہراہ ہدایت پر گامزن تھے۔''

اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل میں ہی سلامتی اور نجات سمجھتے تھے، ان کے ہاں انہی دو چیزوں کا نام دین و شریعت تھا اور یہی فقہ و افتاء اور تشریع کے مصادر تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ کتاب و سنت کی تبیین و تفہیم کے لئے مجتہدانہ انداز میں گفتگو فرماتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال حجت ہونے کے باوجود اپنی بات کی تائید میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حکیم کی آیات بھی پڑھ کر سناتے جو حدیث و سنت کی حجت و اہمیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کی تفسیر کا ایک عمدہ اور مؤثر انداز بھی تھا، تاکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں دین کی فہم و بصیرت اور اجتہادی فکر اور ملکہ پیدا ہو، جس کے نتیجہ میں ضرورت پڑنے پر بعض اوقات صحابہ کرام بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم موجودگی میں نصوص کتاب و سنت پر غور و فکر کر کے پیش آمدہ مسائل میں عمل کے لئے کوئی راہ نکال لیتے، جس کے بارے میں قرآن کریم نازل ہو جاتا یا علم ہونے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس عمل کی تصحیح و تصویب فرما دیتے، اگر وہ اجتہادی عمل غلط ہوتا تو وضاحت کر دیتے، اس طرح وہ بھی تقریری سنت کا حصہ بن جاتا۔

اصول افتاء کی نشاندھی

فقہ واجتہاد اور افتاء کا ادارہ کیسے معرض وجود میں آیا؟

عہد نبوی ﷺ میں دین وشریعت پر عمل کا سلسلہ اسی طرح بخیر وخوبی جاری وساری رہا، لوگ سادہ مزاج، صافی القلب اور سلیم الفطرت تھے، عجمی اور فارسی افکار مسلمانوں پر اثر انداز نہیں ہوئے تھے، یونانی فلسفہ نے اسلامی علوم میں راہ نہیں پائی تھی، قیل وقال، کٹ حجتیوں، کج بحثی، فقہی موشگافیوں، مفروضے قائم کرنے اور بے جا سوالات کا رواج نہیں تھا، اختلاف پیدا ہوا تھا اور نہ ہی اس کے اسباب رونما ہوئے تھے، نبی اکرم ﷺ نے اپنی وفات سے قبل اختلاف سے بچنے کا نسخہ کیمیا بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بتا دیا تھا۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

« عَنْ مَالِكِ بْنِ أَنَسٍ مُرْسَلًا قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ « تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا بِهِمَا كِتَابُ اللّٰهِ وَ سُنَّتِي .» (رواه مالك والحاكم والبيهقي)

''میں تم میں دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں، جن کی بدولت تم گمراہ نہیں ہوگے، اللہ کی کتاب اور میری سنت۔''

مرکز ومحور شریعت مطہرہ رسول اللہ ﷺ کا دنیا سے اٹھنا تھا کہ وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور مسلمانوں کے مابین فہم دین میں اختلاف کا آغاز ہوگیا، جس کے داخلی وخارجی متعدد اسباب تھے، جن کی وضاحت کے لیے متعدد کتب تالیف ہو چکی ہیں، جن میں سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی "رفع الملام عن الأئمة الأعلام" اور شاہ ولی اللہ محدث دھلوی رحمہ اللہ کی "الإنصاف فی أسباب الخلاف" بہت معروف اور ائمہ کرام کے دفاع کی نہایت مخلصانہ مساعی ہیں۔

شیخین ابو بکر صدیق وعمر فاروق رضی اللہ عنہما کے عہد خلافت میں یہ اختلاف بہت کم تھے، اصحاب رسول کی اکثریت مدینہ طیبہ میں موجود تھی جن سے مشاورت اور استفادہ کر کے معاملات میں فصل الخطاب تک آسانی سے رہنمائی ہو جاتی تھی، اور فیصلہ کن رائے سامنے آجاتی تھی۔ اسی دور میں کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کی روشنی میں اجتہاد وافتاء کے لیے اصول وقواعد کی تأسیس کا آغاز ہوگیا تھا۔ جن کو سامنے رکھ

کرمحدثین نے حدیث نبوی ﷺ کی فقہی ترتیب کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا اور "فقه السنة النبوية" کا قابل قدر عدیم النظیر ذخیرہ امت کے لیے مدون کیا۔

خلافت صدیقی و فاروقی میں فقہی منہج :

صاحبین رضی اللہ عنہما کے عہد خلافت کی صورت حال اور امور دین میں مشاورت کے بارے میں حافظ ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

« عَنْ مَيْمُوْنِ بْنِ مِهْرَانَ قَالَ: كَانَ " أَبُوْ بَكْرٍ الصِّدِّيْقُ إِذَا وَرَدَ عَلَيْهِ حُكْمٌ نَظَرَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَإِنْ وَجَدَ فِيْهِ مَا يَقْضِيْ بِهٖ قَضٰى بِهٖ وَ إِنْ لَمْ يَجِدْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ نَظَرَ فِيْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ فَإِنْ وَجَدَ فِيْهَا مَا يَقْضِيْ بِهٖ قَضٰى بِهٖ ، فَإِنْ أَعْيَاهُ ذٰلِكَ سَأَلَ النَّاسَ هَلْ عَلِمْتُمْ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَضٰى فِيْهِ بِقَضَاءٍ ؟ فَرُبَّمَا قَامَ إِلَيْهِ الْقَوْمُ فَيَقُوْلُوْنَ قَضٰى فِيْهِ بِكَذَا وَ كَذَا فَإِنْ لَمْ يَجِدْ سُنَّةً سَنَّهَا النَّبِيُّ ﷺ جَمَعَ رُؤُسَاءَ النَّاسِ فَاسْتَشَارَهُمْ فَإِذَا اجْتَمَعَ رَأْيُهُمْ عَلٰى شَيْءٍ قَضٰى بِهٖ ...... وَكَانَ عُمَرُ يَفْعَلُ ذٰلِكَ فَإِذَا أَعْيَاهُ أَنْ يَجِدَ ذٰلِكَ فِي الْكِتَابِ وَ السُّنَّةِ سَأَلَ هَلْ كَانَ أَبُوْ بَكْرٍ قَضٰى فِيْهِ بِقَضَاءٍ ؟ فَإِنْ كَانَ لِأَبِيْ بَكْرٍ قَضَاءٌ قَضٰى بِهٖ وَ إِلَّا جَمَعَ عُلَمَاءَ النَّاسِ وَاسْتَشَارَهُمْ فَإِذَا اجْتَمَعَ رَأْيُهُمْ عَلٰى شَيْءٍ قَضٰى بِهٖ ."(أعلام الموقعين عن رب العالمين : ١/ ٦٢)

"میمون بن مہران راوی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے جب کوئی فیصلہ، طلب مسئلہ پیش ہوتا تو وہ قرآن حکیم میں غور وفکر کرتے، اگر اس میں کوئی دلیل مل جاتی جس کی بنیاد پر فیصلہ کر سکیں تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے، اگر قرآن حکیم میں مطلوبہ حل نہ ملتا تو سنت نبویہ میں غور وفکر کرتے، اگر سنت سے کوئی ایسی دلیل مل جاتی جس کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتے تو اس پر اعتماد کر کے فیصلہ صادر کر دیتے، اگر مطلوبہ حل سنت میں بھی نہ ملتا تو لوگوں سے دریافت فرماتے کہ اس مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی فیصلہ ان کے علم میں ہے؟ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ بہت سارے لوگ انہیں بتاتے کہ اس نوعیت کے مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ نے یوں فیصلہ دیا تھا، اگر لوگوں سے پوچھنے پر بھی نبی ﷺ کی سنت کا پتہ نہ چلتا تو صاحب الرائے لوگوں کو جمع کر کے ان سے مشاورت کرتے، اگر وہ کسی بات پر متفق ہو جاتے تو ان کے اتفاق رائے کو بنیاد بنا کر فیصلہ فر۔

دیتے......حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اسی طریق اجتہاد پر گامزن تھے، جب انہیں باوجود کوشش اور تلاش کے کتاب وسنت میں مطلوبہ فیصلہ نہ ملتا تو لوگوں سے دریافت کرتے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا ہے؟ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کوئی فیصلہ مل جاتا تو اس کے مطابق عمل کرتے بصورت دیگر لوگوں میں سے اہل علم کو جمع کر کے ان سے مشاورت کرتے جس بات پر وہ اتفاق رائے کر لیتے اس کے مطابق فیصلہ کرتے۔''

یہ صرف میمون بن مہران رضی اللہ عنہ کی روایت یا ابن قیم رحمہ اللہ کی نقل ہی نہیں بلکہ یہ تلخیص واختصار ہے ان متعدد وقائع وحوادث کا جو سنت نبویہ اور اخبار وآثار صحابہ پر مشتمل اسفار مقدسہ میں بکھرے پڑے ہیں۔ ملاحظہ ہو: سنن الدارمی : (باب من هاب الفتيا و كره التنطع والمبتدع)

ہم نے ایجاز و اختصار کے پیش نظر صرف ایک روایت بطور نمونہ پیش کی ہے۔ اسے بغور پڑھنے اور صورت حال پر گہری نظر ڈالنے سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ:

- کتاب اللہ کی طرف مجتہدانہ ومخلصانہ رجوع۔
- سنت وحدیث نبوی کی انسانی جدو جہد کی آخری حدوں تک تلاش وجستجو اور اس کا حصول۔
- اخبار وآثار صحابہ کا بھرپور تتبع اور ان سے استفادہ۔
- سنت خلفاء راشدین کا استقصاء اور اس سے احتجاج (جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے واضح ہے)۔
- اپنے دور کے نامور اہل علم سے مشاورت اور ان کے اتفاق پر اعتماد۔

یہ تھے وہ اصول وضوابط جن کی بنیاد عملی طور پر عہد خلافت راشدہ میں رکھ دی گئی تھی۔ اگرچہ متأخرین کی طرح ان کی حیثیت مرتب ومدون اور لگے بندھے قواعد کی نہ تھی، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مأثور ومنقول مبارک فقہی روایات میں ان اصول کا اثر ونفوذ بہت نمایاں ہے۔

امت میں اختلاف کا آغاز:

پھر جب اصحاب رسول رضی اللہ عنہم دعوت دین اور جہاد کے لیے مختلف بلاد وامصار میں پھیل گئے، دوسری طرف لوگ بکثرت دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے تو اختلافات کا دائرہ وسیع اور اس کا حل مشکل ہوتا چلا گیا۔ اور عجمی ویونانی فکر وفلسفہ کے مسلمانوں میں در آنے کی وجہ سے نیز عہد نبوی اور عصر خلافت راشدہ سے بُعد کی وجہ سے اہل ہواء وہوس بھی پر پرزے نکالنے لگے، مسند حدیث کے صدر نشینوں اور مقام تحدیث کے عالی مرتبت

عبا پوشوں کی خلعت فاخرہ کو حسد و طمع کی نظر سے دیکھا جانے لگا، اور تہی دستان علم حدیث اپنے عجز و کم مائیگی کی وجہ سے لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کے لیے بے پر کی اڑانے لگے، اور کچھ لوگ بے دلیل خانہ ساز اصولوں اور درایت و تفقہ وغیرہ کی خوبصورت اور دلکش اصطلاحات کا سہارا لے کر محدثین کرام (رحمہم اللہ) اور ائمہ ھدیٰ پر پھبتیاں کسنے لگے تو اہل فکر و نظر، حفاظ حدیث اور اصحاب بصیرت علماء اسلام نے بر وقت ضرورت محسوس کی اور بھرپور محنت کی، ان کے اخلاص اور للّٰہیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے کام میں بڑی برکت عطا فرمائی۔ جہاں حدیث و سنت محفوظ ہوئی وہاں اس کی روشنی میں فقہ و افتاء اور اجتہاد کا ادارہ بھی امت میں منظم و مربوط شکل میں پروان چڑھنے لگا، انہی جہود مخلصہ و مبارکہ کی بدولت تلمودی فقہ، نصرانی پاپائیت اور ہندوانہ فکر و فلسفہ کی بے جا بندشیں اور راہبانہ حدود و قیود مسلمانوں کو اپنی گرفت میں لینے میں بری طرح ناکام ہوئیں، ایسے ہی مادر پدر آزادئ استنباط و استدلال اور منطقی طرز اجتہاد بھی اسلام کے علمی وفقہی ذخیرے میں کوئی قابل ذکر مقام حاصل کر سکا اور نہ عامۃ المسلمین میں رواج پا سکا۔ بحمد اللہ مسلمانوں کے قابل اعتماد اور ثقہ علمی ترکے پر ''فقہ الکتاب والسنۃ'' کی چھاپ ہی غالب اور نمایاں رہی جس پر فقہاء محدثین خصوصاً پوری امت کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ وعنداللہ فی ذاك الجزاء.

علماء امت کے دو گروہ اور تقسیم کار:

« عَنْ أَبِيْ مُوْسَى الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :« مَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللّٰهُ بِهِ مِنَ الْهُدَى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيْرِ أَصَابَ أَرْضًا فَكَانَتْ مِنْهَا طَائِفَةٌ طَيِّبَةٌ قَبِلَتِ الْمَآءَ فَأَنْبَتَتِ الْكَلَاءَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيْرَ وَكَانَتْ مِنْهَا أَجَادِبُ أَمْسَكَتِ الْمَآءَ فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَ سَقَوْا وَ زَرَعُوْا وَ أَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةً أُخْرَى إِنَّمَا هِيَ قِيْعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَآءً وَ لَا تُنْبِتُ كَلَأً فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ وَنَفَعَهُ مَا بَعَثَنِي اللّٰهُ بِهِ فَعَلِمَ وَ عَلَّمَ وَ مَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِهِ رَأْسًا وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللّٰهِ الَّذِيْٓ أُرْسِلْتُ بِهِ . » [1]

''حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے جو ہدایت اور علم دے کر مبعوث فرمایا اس کی مثال بہت ساری بارش کی طرح ہے، جو کسی قطعۂ زمین

[1] (صحیح البخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم و علم، (۷۹)

پر برستی ہے اس زمین کا ایک حصہ اچھا تھا اس نے پانی کو جذب کیا اور بڑی گھاس اور پودے اگائے، اور دوسرا حصہ سخت اور بنجر تھا اس نے پانی ذخیرہ کر لیا جس سے اللہ نے لوگوں کو فائدہ پہنچایا، انہوں نے اس سے خوب پیا، پلایا اور کھیت سیراب کئے، اور تیسرا ٹکڑا چٹیل میدان ہے، جو پانی کو روکتا نہیں اور گھاس اگاتا نہیں، یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے اللہ کے دین میں تفقہ اور فہم حاصل کی، اسے اس علم نے نفع بخشا جسے دے کر اللہ نے مجھے مبعوث فرمایا، سو اس نے علم وہدایت کو سیکھا اور سکھایا۔ اور (تیسرے قطعۂ زمین کی) مثال اس شخص کی سی ہے جس نے اس علم وہدایت کی طرف سر اٹھا کے بھی نہ دیکھا اور اللہ تعالیٰ کی میرے ساتھ ارسال کردہ ہدایت کو قبول نہیں کیا۔

اس حدیث کی روشنی میں حافظ شمس الدین محمد بن ابی بکر المعروف ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ متوفی ۷۵۱ھ نے علماء امت کی دو حصوں میں تقسیم کی اور ان کے کارناموں کا ذکر کیا ہے، ذیل میں ہم ان کے بیان کا خلاصہ درج کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

''چونکہ دعوت الی اللہ اور رسالت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو لوگوں تک پہنچانا فلاح یافتہ حزب اللہ اور سچے متبعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شعار ہے''۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ . ﴾ (یوسف:۱۰۸)

''کہہ دیجئے! یہ میری راہ ہے، میں سوچ سمجھ کر اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور جس نے میری اتباع کی وہ بھی، اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تبلیغ رسالت کی دو صورتیں ہیں۔

ا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ وحی کے الفاظ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کی بعینہٖ تبلیغ۔

ب: فرامین نبویہ اور رسالت محمدیہ کے معانی ومطالب کو لوگوں تک پہنچانا۔

اسی طرح امت محمدیہ کے علماء بھی دو حصوں میں تقسیم ہیں۔

علماء کی پہلی قسم۔ حفاظ ورواۃ حدیث:

اور اس قسم میں وہ ائمہ اسلام اور محدثین کرام کی

قابل قدر جماعت، جس نے امت کے لیے دین حق کے اصول وفروع محفوظ رکھے اور اس کے چشمۂ صافی کو ہر قسم کی تبدیلی اور گدلاہٹ سے بچائے رکھا حتی کہ اس میل کچیل سے پاک شیریں گھاٹ پر تشنگی بجھانے وہ لوگ آ پہنچے جن کی قسمت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکی لکھی ہوئی تھی اور دین متین کی روشن جبین پر ابھی خود ساختہ آراء اور خانہ ساز اقوال کا دھبہ نہیں لگا تھا۔ دین و شریعت کا چشمۂ مصفّٰی خوب خوب جاری تھا اور اللہ کے بندے اس سے جی بھر کر سیراب ہو رہے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الرد علی الزنادقة و الجهمية" میں اس گروہ علماء کو بڑا خوبصورت خراج تحسین پیش کیا اور ان کے مخالفین پر سخت نکیر کیا ہے۔

علماء اسلام کی دوسری قسم۔ فقہائے امت:

محدثین کرام کی مذکورہ بالا جماعت کے علاوہ دوسرا گروہ فقہائے امت اور فقہائے محدثین کا ہے۔ جن کے اقوال و فتاویٰ عامۃ المسلمین میں رواج پذیر ہوئے، بلکہ اکثر متاخرین کے فتاویٰ کا دار و مدار انہی کے اقوال پر ہے۔ انہیں نصوص کتاب و سنت سے مسائل استنباط کرنے کا خصوصی ملکہ حاصل تھا۔ کوئی شخص بھی ان فقہائے عظام کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے شریعت کی رو سے حلال و حرام کے درمیان خط امتیاز کھینچا اور استدلال و استنباط کے ذریعے فقہ اسلامی کی بنیاد رکھی "اولوالامر" سے مراد یہی علماء ہیں۔ ارباب حکومت کو بھی ان کی اطاعت کرنا پڑتی ہے۔ یہ لوگ زمین پر ایسے ہی چمکتے ہیں جیسے آسمان پر ستارے، انہی کی بدولت اندھیروں میں بھٹکتے ہوئے لوگ راہ پاتے ہیں، جس قدر لوگ خورد و نوش کے محتاج ہیں اس سے کہیں زیادہ ان بزرگوں کی تعلیمات کے ضرورت مند ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ دنیا کی اصلاح کا دارومدار دو طبقوں کی اصلاح پر ہے۔

1. علماءِ اسلام
2. حکامِ وقت

عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اگر یہ دو گروہ ٹھیک ہو جائیں تو پوری امت کی اصلاح ہو سکتی ہے، یہ بگڑتے ہیں تو پورا معاشرہ فساد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ درج ذیل آیت مبارکہ میں بھی انہی کی اطاعت کا حکم ہے۔

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ، فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَ الرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَ أَحْسَنُ تَأْوِيلًا . ﴾ (النساء:٥٩)

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرواور رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے صاحب امر ہیں، پھر اگر کسی شيئ میں باہم جھگڑو تو اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹا دو، اگر تم اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ تو یہی بہتر اور انجام کے اعتبار سے اچھا ہے۔'' (انتهى ملخصا من أعلام الموقعين: ۱/۸-۹)

مفتی کا مقام ومرتبہ:

مفتی کی عظمت شان اور اس کے مقام ومرتبہ کو سمجھنے کے لیے یہ کافی ہے کہ فتویٰ کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن حکیم میں اپنی ذات اقدس کی طرف کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ . ﴾ (النساء:۱۲۷)

''اور لوگ آپ (ﷺ) سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے! اللہ تمھیں ان کے بارے میں فتوی دیتا ہے۔''

﴿ يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ . ﴾ (النساء:۱۷٦)

''لوگ آپ (ﷺ) سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے! اللہ تمھیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ فتویٰ شریعت کا حصہ اور اس کے احکام کا اساسی جز ہے۔ اور اس کے بیان اور تشریح وتوضیح کو بھی شامل ہے اور تشریح صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ یعنی جادۂ حق، دستور حیات اور صراط مستقیم کی تعیین کے لیے شریعت کے اصل الاصول قرآن حکیم کی صورت میں وحی نازل کرنا، حدیث وسنت کی شکل میں بذریعہ وحی خفی رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات کے ساتھ اس کی تشریح وتکمیل اور بیان، یہ سب اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لیا۔ ارشاد فرمایا:

﴿ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ○ فَإِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ○ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ . ﴾

(القيامة:۱۷-۱۹)

''اس (قرآن) کا (آپ کے سینے میں) جمع کرنا اور (آپ کی زبان سے) اس کا پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔ پس جب ہم اس کو پڑھ لیں تو آپ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں۔ پھر اس کا بیان کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام اور اہل علم کو قرآن کریم میں متعدد مقامات میں اپنے ساتھ ذکر کا اعزاز بخشا ہے اور ان سے اپنے دین متین کی دعوت و تبلیغ اور بیان و توضیح کا کام لے کر انہیں درجات رفیعہ اور فضائل جلیلہ سے نوازا ہے۔ سوال و جواب کی صورت میں دین و شریعت کا بیان قرآن حکیم کا ایک مستقل اسلوب اور حصہ ہے۔ مثلاً ارشاد فرمایا:

﴿ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ . ﴾ (البقرة:١٨٩)

''آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے چاند کی شکلوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دیجئے! یہ لوگوں کے لیے اوقات مقررہ اور موسم حج کی تعیین کے لئے ہیں۔''

﴿ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ . ﴾ (البقرة:٢١٥)

''آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے حرمت کے مہینوں میں لڑائی کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔''

﴿ وَ يَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ . ﴾ (البقرة:٢١٩)

''آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دیجئے! ضرورت سے بچا ہوا۔''

﴿ وَ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي . ﴾ (الاسراء:٨٥)

''آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں؟ کہہ دیجئے! روح میرے رب کے امر سے ہے۔''

قرآن کریم میں سوال و جواب کے اس اسلوب کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ دین شریعت کے بیان اور وحی الٰہی کی تشریح کا اعزاز جہاں اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطاء فرمایا ویسے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اس عظیم کام کی ذمہ داری اللہ نے اہل علم پر ڈال دی اور لوگوں کو ان سے سوال کرنے کا حکم دیا۔ فرمایا:

﴿ وَ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ . ﴾ (النحل:٤٤)

''اور ہم نے تیری طرف یہ ذکر نازل کیا ہے تاکہ تو لوگوں کیلئے کھول کر بیان کر دے۔ اس کو جو ان کی طرف اتارا گیا ہے تاکہ وہ غور کریں۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَ مَآ أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ

يُؤْمِنُونَ . ﴾ (النحل:٦٤)

''اور ہم نے جو تم پر کتاب نازل کی ہے۔تو صرف اس لئے کہ جس امر میں ان کو اختلاف ہے اسے کھول کر ان کے لئے بیان کردو، اور اسے ہم نے ان لوگوں کے لیے ہدایت و رحمت بنا کر اتارا ہے جو ایمان لے آتے ہیں۔''

اہل علم سے سوال کے حکم کا ذکر بعد میں آرہا ہے۔

الغرض ''بیان قرآن'' جس کی ذمہ داری، اللہ تعالیٰ نے خود لی ہے اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف بھی کی ہے۔ امام محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ المتوفی ۲۰۴ھ نے اپنی معروف کتاب ''الرسالہ'' میں اس بیان کی چار صورتیں ذکر کی ہیں۔

بیان قرآن کی صورتیں:

① قرآن کریم میں صریح نص کے ساتھ ایسا واضح بیان جس کی تفہیم کے لیے عربی زبان واسلوب کی معرفت ہی کافی ہے۔ جیسے نماز، روزہ، حج اور زکوۃ وغیرہ کی فرضیت، یا فواحش و منکرات کی حرمت اور وضو کے فرائض کا بیان ہے۔

② ایسے امور جن کی فرضیت کا محکم بیان تو کتاب اللہ میں ہی ہے۔ مگر اس کی کمیت و کیفیت رسول اللہ ﷺ کی زبانِ حق ترجمان کے ذریعے بیان فرمائی۔ جیسے نمازوں اور ان کی رکعات کی تعداد اور زکوۃ کا وقت اور نصاب وغیرہ۔

③ بعض ایسے امور اور مسائل بھی ہیں جنہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنتِ مطہرہ کے ذریعے بیان کیا اور ان کے حکم کی نص صریح کتاب اللہ میں نہیں، اسی لئے اللہ نے اپنے رسول ﷺ کی اطاعت قرآن کریم میں فرض قرار دی ہے۔ فرمایا:

﴿ وَمَآ آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا . ﴾ (الحشر:٧)

''اور جو چیز تم کو رسول (ﷺ) دیں اسے لے لو اور جس سے منع کریں اس سے باز رہو۔''

گویا جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کا حکم قبول کیا اس نے اللہ کی طرف سے فرض ہونے کی وجہ سے قبول کیا۔

④ ایسے امور جن کی طلب وجستجو اور معرفت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے اولو الامر اہل علم پر

اجتہاد فرض کیا ہے، جیسے جہت قبلہ کی تعیین، جزاء الصید میں مثل کا فیصلہ اور شہادت کے لیے ذوی العدل کی تعریف، مذکورہ بالا فرائض کی اطاعت میں جس طرح مخلوق کا امتحان ہے اسی طرح یہاں اجتہاد کے حکم کے ذریعے ان کی اطاعت کا امتحان مقصود ہے۔ (ملاحظہ ہو: "الرسالہ" للشافعي ص: ۲۱)

امام شافعی رحمہ اللہ کے ذکر کردہ کتاب اللہ کے بیان کی اس شکل کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے جہاں شریعت اسلامی کی جامعیت اور شمولیت واضح کی اور بتایا کہ اس کے دامن وسعت نے قیامت تک پیش آنے والے جملہ امور حیات اور مسائل زندگی کو سمیٹا ہوا ہے۔ وہاں انسانی قضایا و معاملات کو غیر محدود اور شریعت کی نصوص کو محدود معطل، خاموش اور بالتبع ناکافی وغیر وافی اور ناقص قرار دے کر، عوام یا حکام کے ہاں پسندیدہ صوابدید پر مبنی ''عجمی تصورِ اجتہاد'' کی روک تھام بھی فرما دی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى . ﴾ (القيامة: ٣٦)

''کیا انسان خیال کرتا ہے کہ اسے ایسے ہی (بغیر امر و نہی کے) چھوڑ دیا جائے گا۔''

یعنی کسی کے واھمۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آنی چاہئے کہ انسان زندگی کے کسی مرحلے میں خالق و مالک کی طرف سے آزاد و خود مختار اور اس کی نازل کردہ شریعت کاملہ کے دائرہ سے باہر اور قانوناً بے مہار بھی ہوسکتا ہے۔

''بیانِ قرآن'' کی آخری صورت کی رو سے اب دیکھنا یہ ہے کہ زندگی میں پیش آمدہ نئے مسائل کے بارے میں کون اخلاص کے ساتھ محنت کر کے عمل کے ذریعے صحیح راہ متعین کرتا اور پھر اس پر دیانت داری سے چلتا ہے؟ اور کون ہے جو ہوا و ہوس سے مغلوب ہو کر فرار کی راہ اختیار کرتا اور اطاعت و عمل سے جان چھڑاتا ہے؟ فرمایا:

﴿ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ. ﴾ (آل عمران: ١٥٤)

''اور تاکہ اللہ تمھارے سینوں کی باتوں کو آزمائے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو خالص اور صاف کردے اور اللہ سینوں کے بھیدوں کو خوب جاننے والا ہے۔''

لہٰذا نصوص کتاب وسنت سے استدلال و استنباط سے صرف نظر کر کے خود ساختہ اصولوں پر مبنی اجتہاد کے ذریعے حیلوں اور رخصتوں کی تلاش کے لیے فتوے لینا اور دینا امتحان میں ناکامی کی نشاندہی کرتا ہے۔

جبکہ عزیمت و استقامت کے ساتھ قرب و رضاء الٰہی کے حصول کی حسب استطاعت بھرپور کوشش،

ایمان، اخلاص، اطاعت اور امتحان میں کامیابی کی دلیل ہے۔فرمایا:

﴿ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ . ﴾ (العنکبوت:۲)

''سو اللہ ضرور ظاہر کرے گا ان کو جنہوں نے سچ کہا اور ان کو بھی جو جھوٹے ہیں۔''

الغرض۔جیسے صریح نصوص کتاب اللہ واجب القبول والعمل ہیں ویسے ہی حدیث وسنت نبویہ میں وارد محکم فرائض بھی واجب القبول والطاعۃ ہیں۔اور علماء مجتہدین کے اجتہادات اور مفتیان شرع متین کے فتاویٰ بھی قرآن کا بیان ہونے کی حیثیت سے اولوا الامر اہل علم کی اطاعت کے ذیل میں آتے ہیں۔ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے تابع ہے۔بشرطیکہ وہ اجتہادات وفتاویٰ سلف صالحین کے اصول کے مطابق نصوص شریعت سے استدلال پر مبنی ہوں، نہ کہ استحسان کے نام سے صوابدیدی اجتہاد پر۔ امام شافعی رحمہ اللہ اجتہاد پر مدلل گفتگو کے بعد فرماتے ہیں:

" وهذا يدل على أنه ليس لأحد دون رسول الله ﷺ أن يقول إلا بالاستدلال...... ولا يقول بما استحسن فإن القول بما استحسن شيئ يحدثه لاعلى مثال سبق " (الرسالة: ٢٥)

''یہ اس امر کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں کہ استدلال کے بغیر کچھ کہے......(مجتہد کو چاہئے) کہ استحسان کے ساتھ کچھ نہ کہے، استحسان پر مبنی قول تو ایسے ہے جسے (مجتہد) سابق مثال (منصوص) کے بغیر ایجاد کرتا ہے۔''

واضح ہے کہ مجتہد کو اس کا حق نہیں ہے۔

امام موصوف آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:

"وليس لأحد أبدا أن يقول في شيئ: حل ولا حرم إلا من جهة العلم ،وجهة العلم الخبر في الكتاب أو السنة أو الإجماع أو القياس " (الرسالة:٣٩)

''کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی چیز کے بارے میں یہ فتویٰ دے کہ وہ حلال ہے یا حرام ہے مگر از روئے علم اور علم صرف کتاب وسنت وارد خبر ہے۔یا اجماع اور قیاس۔''

یاد رہے کہ ''اجماع'' نص شریعت اور اس کے مفہوم کی قطعیت پر اتفاق کا نام ہے۔اور ''قیاس'' علۃ مشترکہ کی وجہ سے منصوص علیہ اصل کے حکم کی فرع پر تطبیق کو کہا جاتا ہے۔گویا استحسان کے برعکس اجماع اور قیاس دونوں کا مبنی

مجتہد و مفتی کی صوابدیدی رائے یا ترجیح بلا مرجح کی بجائے مأثور و منقول شرعی دلیل ہوتی ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا شمار مقلدین کے ہاں بالاتفاق ائمۂ اربعہ میں ہوتا ہے۔ اور دنیا بھر میں رائج فقہ وفتاوی کے مسلمہ چوتھے ستون ہیں، امام موصوف کی مذکورہ بالا تصریحات اور اجتہاد کے بارے میں رائے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ تخریج احکام میں قیاس و تعلیل کے استعمال میں فقہاء محدثین کا طرز عمل اور منہج استدلال کس قدر محتاط ہے۔ اور ان کے تلامذہ اہل حدیث کے فتاویٰ میں کتاب و سنت پر اعتماد اور اصول فقہ و اجتہاد کی تطبیق کا کتنا حسین امتزاج ہے اور یہ کہ انہیں قیاس و تعلیل کے منکر اور ظواہر نصوص کے پابند بتانا کسی طرح بھی قرین انصاف نہیں۔

البتہ اہل الرائے فقہاء کی طرح قیاس و تعلیل کے نام سے شریعت میں رائے کے بے جا استعمال کو انہوں نے کبھی روا رکھا ہے اور نہ ہی اس کی اجازت دی ہے۔ اس لئے کہ کتاب و سنت اور آثار صحابہ میں اس کی شدید مذمت آئی ہے۔ بقول امام شافعی فتویٰ تو جہت علم سے ہی جاری ہوسکتا ہے جو صرف کتاب و سنت ہے نہ کہ رائے اور عقل محض۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لَا تَقۡفُ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ ۔ اِنَّ السَّمۡعَ وَ الۡبَصَرَ وَ الۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡہُ مَسۡـُٔوۡلًا ۔ ﴾ (الاسراء:٣٦)

''اور جس کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے مت پڑ کہ کان، آنکھ اور دل سب سے ضرور باز پرس ہوگی۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَ لَا تَقُوۡلُوۡا لِمَا تَصِفُ اَلۡسِنَتُکُمُ الۡکَذِبَ ہٰذَا حَلٰلٌ وَّ ہٰذَا حَرَامٌ لِّتَفۡتَرُوۡا عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ ۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی الۡکَذِبَ لَا یُفۡلِحُوۡنَ ۔ ﴾ (النحل:١١٦)

''اور یونہی جو جھوٹ تمہاری زبانوں پر آجائے مت کہدیا کرو کہ، یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، تاکہ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھنے لگو، بلا شبہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پائیں گے۔''

قرآن کریم میں اس مفہوم کی اور بھی بہت سی آیات ہیں۔

سلف صالحین، محدثین کرام اور ان کے منہج سلیم پر رواں دواں علماء وفقہائے حدیث کی طرف سے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے ادب و احترام اور تخریج احکام میں حزم و احتیاط کا اہل الرائے فقہاء اور ان کے مکتبۂ فکر سے منسوب علماء نے کھلے دل سے کم ہی اعتراف کیا ہے، عام طور پر انہیں تنگ نظری اور

ظاہر پرستی کا مورد الزام ہی ٹھہرایا ہے جبکہ اس الزام کی فی الواقع کوئی حقیقت نہیں ہے۔اس کی تردید کے لیے گذشتہ صفحات میں مذکورہ ائمہٗ حدیث کی مرتّبہ کتب السنہ کا وجود، امت کے ہاں ان کی پذیرائی اور مقبولیت پر اجماع کسی بھی دوسری دلیل سے مستغنی کرنے کے لیے کافی ہے۔

مسندِ افتاء کے پہلے صدر نشین:

ان معروضات سے جہاں اسلام میں مفتیانِ شرع کے مقام ومرتبہ کی تعیین ہوجاتی ہے، وہاں ان کی فضیلت وعظمت کی یہ روشن دلیل بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے جس نے افتاء کے منصب شریف اور عہدۂ جلیلہ کو رونق بخشی وہ خود سید المرسلین، امام المتقین، خاتم النبیین اور وحی الٰہی کے مبلغ اور امین رسول رب العالمین ﷺ کی ذات گرامی ہے۔

آپ ﷺ اللہ کی طرف سے اس کی نازل کردہ وحی کے ساتھ فتوے دیتے تھے۔اس سلسلے میں آپ کے حسن عمل کی مدح وتوصیف بھی اللہ تعالیٰ نے فرمائی۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ مَآ أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَ مَآ أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ . ﴾ (ص:٨٦)

"(اے رسول ﷺ) کہہ دیجیے! میں تم سے اس کا صلہ نہیں مانگتا اور نہ ہی میں تکلف کرنے والوں میں ہوں۔"

"جوامع الکلم" چونکہ رسالت مآب ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔اس لئے آپ ﷺ کے فتاویٰ الفاظ کے اعتبار سے مختصر اور احکام ومعانی کے لحاظ سے بڑے جامع ہیں۔واجب الاتباع اور فیصلہ کن حیثیت کے اعتبار سے کتاب اللہ کے ساتھ دوسرے درجہ میں آتے ہیں۔کسی مسئلہ میں فتاویٰ نبویہ میسر ہوں تو کسی مسلمان کو ان سے روگردانی کا حق نہیں۔حکم باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ أَحْسَنُ تَأْوِيلًا . ﴾ (النساء:٥٩)

"پھر اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ یہ بات بہت اچھی اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہے۔"

نبی اکرم ﷺ کے فتاویٰ مبارکہ حدیث رسول کا ایک حصہ اور آپ ﷺ کی طرف سے وحی کے بیان کا ایک اسلوب ہیں۔آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کے دین فہمی کے لیے سوالات کے جواب میں مختلف

اوقات میں جو فتاویٰ ارشاد فرمائے۔ وہ کتب حدیث میں جا بجا موجود ہیں، ان فتاویٰ مبارکہ کا اکثر حصہ وحی الٰہی پر مبنی ہے،ان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اجتہاد نبوی سے صادر ہوئے، لیکن بعض فتاویٰ یقیناً اصلاً اجتہاد پر مبنی ہیں، اس مختصر عجالہ میں مثالیں پیش کرنے کی گنجائش نہیں، تفصیل کے لیے مطولات کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ بالخصوص احمد بن عبدالصمد الانصاری الغرناطی (المتوفی ۵۸۰ ملاحظہ ہوالدیباج الذھب ۱/ ۲۱۵) کی تالیف "آفاق الشموس و أعلاق النفوس" جس میں انہوں نے "أقضیۃ الرسول ﷺ" جمع کئے ہیں۔

- حافظ ابن قیم رحمہ اللہ (م ۷۵۱ھ) نے بھی اپنی کتاب "اعلام الموقعین عن رب العالمین" کے آخری حصے میں ان کا ایک بڑا مجموعہ مرتب کر دیا ہے۔ (اعلام: ۴/ ۲۶۶ وبعدھا)
- نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ (م ۱۳۰۷ھ) نے اسے "فتاویٰ امام المتقین" کے نام سے فارسی ترجمہ کر کے الگ سے بھی شائع کر دیا تھا۔

فتاویٰ نبویہ کا تسلسل:

رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد جیسے امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور دعوت وتبلیغ رسالت کا فریضہ امت کے ذمہ قرار پایا ویسے ہی وحی رسالت کا بیان اور دین وشریعت کی تشریح و توضیح علماء امت کی منصبی ذمہ داری ٹھہری، اللہ تعالیٰ نے ان کے استنباط کو قرآن کریم میں لوگوں کے لیے مرجع قرار دیا، اوران سے سوال کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ . ﴾

(النساء ۸۳)

"اور اگر اسے رسول ﷺ اور اولی الامر کی طرف لوٹاتے تو ان میں سے وہ لوگ اسے تحقیق کر کے جان لیتے جو تحقیق کرتے ہیں۔"

نیز فرمایا: ﴿ فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ . ﴾ (النحل ۴۳)

"سو پوچھ لو اہل علم سے اگر تم نہیں جانتے ہو تو۔"

نیز فرمایا: ﴿ فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ . ﴾ (الانبیاء ۷)

افتاء کی اہمیت وفضیلت کے بارے میں گفتگو اور اس بارے میں نصوص کتاب وسنت کا ذکر تو اس سے

متعلقہ عنوان کے تحت ہی آئے گا ان شاء اللہ یہاں تو صرف مفتی کے مقام و مرتبہ کی وضاحت مقصود ہے۔

مفتیان کرام تبلیغ احکام میں بھی دعوت دین کی طرح رسول اللہ ﷺ کے قائم مقام اور نائب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ابو اسحق ابراہیم بن موسیٰ المعروف علامہ شاطبی رحمہ اللہ ۷۹۰ھجری اپنی معروف کتاب ''الموافقات'' میں رقمطراز ہیں:

"اَلْمُفْتِی قَائِمٌ فِی الْأُمَّةِ مَقَامَ النَّبِیِّ ﷺ لِأَنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِیَاءِ وَ إِنَّ الْأَنْبِیَاءَ لَمْ یُوَرِّثُوا دِیْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَإِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ." (الموافقات: ۴/ ۲۴۴)

مفتی امت میں نبی ﷺ کے قائم مقام ہے،کیونکہ علماء انبیاء کے(علم کے) وارث ہیں اور انبیاء کرام نے اپنے ورثہ میں درہم و دینار نہیں چھوڑے انبیاء کرام علیہم السلام کا ترکہ تو صرف علم ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ہر دور کے مفتی اپنے عہد کے ھادی و راہنما اور پیشوا و مقتدا ہوتے ہیں۔ جو اقتدار کی جنگ میں الجھے بغیر اور منصب کے لیے للچائے بغیر امت کی تعلیم و تربیت اور توجیہ و ارشاد کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

مفتی کے اسی مقام و مرتبہ اور فتویٰ کی اہمیت کے پیش نظر خلافت اسلامیہ کے کسی دور میں بھی فتویٰ کو بنظر استخفاف نہیں دیکھا گیا اور نہ کبھی مفتی کو غیر اہم سمجھا گیا، ان کے حق میں تعیین کے لیے شاہی فرمان جاری ہوئے بغیر ہی ہمیشہ ان کا اور ان کے عالی شان مقام ومنصب کا احترام کیا گیا۔نشۂ اقتدار سے مدہوش حکام و امراء نے بھی اپنی مرضی کے فتاویٰ حاصل کرنے یا ناپسندیدہ فتاویٰ سے روکنے کے لیے ائمۂ ہدیٰ کو مجبور کیا،انہیں سزائیں دیں،کوڑے مارے اور قید وبند میں رکھا مگر فتاویٰ کو غیر اہم اور نا قابل التفات قرار دے کر نظر انداز نہیں کیا۔ اس سلسلے میں امام مالک،امام احمد بن حنبل اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ جیسے ائمہ دین کا صبر و ثبات اہل علم کے استقلال واستقامت کا روشن باب اور مدعیان علم و جہاد اور علم برداران فقہ واجتہاد کے لیے قابل عمل نمونہ اور بہترین مثال ہے۔

اہل علم اور اولو الامر مفتیان کرام کا یہ مقام و مرتبہ جہاں عظیم الشان عز وشرف ہے وہاں شدید ترین ذمہ داری مسئولیت اور سخت ترین امتحان بھی ہے جس میں سرخ رو ہونے کے لیے انتہائی حزم و احتیاط اور احساس مسئولیت کی ضرورت ہے۔ اس میدان میں وہی لوگ خوش نصیب اور سعادت مند ہیں۔ مگر افسوس کہ بہت کم ہیں۔ جو نظر و اجتہاد کی جولانگاہ میں وحی و رسالت کی وسعتوں کو اپنی فکری تنگ دامانی میں سمونے، اپنے میزان فقہ وفہم میں تولنے اور پیمانۂ علم و بصیرت میں ماپنے کی بجائے،منزل الوحی، واسع العلم اور علام الغیوب جل جلالہ

کی ہمہ دانی و ہمہ گیری اور ھادیٔ برحق، معلم انسانیت اور مرشد کامل کی رسالت کے سامنے سپر انداز ہو کر ایمان ویقین کی دولت سمیٹ لیتے ہیں۔ اور ہر باب میں عبادت الٰہی اور اطاعت رسول کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوٓا إِلَى اللَّهِ وَ رَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا ۚ وَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَ مَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَ يَخْشَ اللَّهَ وَ يَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ. ﴾ (النور ٥١۔ ٥٢)

''مومنوں کی تو صرف یہ بات ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف بلایا جائے تا کہ وہ ان میں فیصلہ کریں تو کہیں کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرے گا اور اللہ سے ڈرے گا اور اس کا تقویٰ اختیار کرے گا تو ایسے لوگ ہی مراد پانے والے ہیں۔''

« وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: « كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى.» قِيلَ مَنْ أَبَى؟ قَالَ: « مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ وَ مَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبَى.» [1]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری تمام امت جنت میں داخل ہوگی ماسوا اس کے جس نے انکار کیا۔ آپ سے دریافت کیا گیا: انکار کون کرے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔''

« وَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: « لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ.»

(رواہ فی شرح السنۃ وقال النووی ھذا حدیث صحیح)

''عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس وقت تک تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی ہر خواہش میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائے۔''

[1] (صحیح البخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب الاقتداء بسنن رسول اللہ ﷺ (۷۲۸۰)

اور حق بات یہ ہے کہ کتاب وسنت پر اعتماد اور ان کی نصوص سے مخلصانہ استدلال و استنباط کی توفیق بھی دربارالٰہی سے صرف انہیں ہی نصیب ہوتی ہے جو دست بستہ و باادب دربارالٰہی میں حاضری دیتے اور درس گاہ رسالت میں زانوئے تلمذ طے کرتے ہیں۔ یہی فلاح و نجاح اور سلامتی کی راہ ہے، انہی خوش بخت ائمہ مجتہدین کے اجتہادات اور مفتیان شرع متین کے فتاویٰ کو امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب وسنت کے دلائل کی روشنی میں اللہ کی طرف سے بیان قرآن کی ایک صورت قرار دیا ہے۔

زہے نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جا ہے

﴿ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ . ﴾ (المجادلہ: ۱۱)

''اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کے جو ایمان لائے ہیں اور ان کے جو علم دیے گئے ہیں درجے بلند کردے گا۔''

آیے! اب نظر ڈالتے ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ان اعاظم رجال پر جو عہد نبوی میں یا اس کے بعد افتاء واجتہاد کے منصب شریف اور مقام جلیل پر فائز ہوئے، ان کے فقہی مسلک، کتاب وسنت سے منہج استدلال اور طریق استنباط سے اجتہاد وافتاء کے باب میں جادۂ حق اور راہ صواب متعین کرنے میں بڑی راہنمائی میسر آتی ہے۔

عہد نبوی میں فقہاء ومفتیان صحابہ رضی اللہ عنہم:

اصحاب رسول رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد عہد رسالت مآب میں ہی فقہ و افتاء اور اجتہاد کے مقام رفیع پر فائز ہو چکی تھی۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کے بیان کے مطابق آیت ذیل سے وہی لوگ مراد ہیں۔

﴿ وَ يَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ . ﴾ (سبا: ٦)

''اور جن لوگوں کو علم دیا گیا وہ جانتے ہیں کہ جو (قرآن) تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کیا گیا وہ حق ہے۔''

بخاری ومسلم میں مروی ہے کہ جو عورت رجم کی گئی تھی اس سے متعلق لڑکے کے والد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا تھا:

« إن أهل العلم أخبروني أن على ابني جلد مائة وتغريب عام .» [1]

[1] (صحيح البخاري ، باب اذا رمى امرأته...... (٦٨٤٢، ٦٨٤٣) و فيه : " ثم اني سالت أهل العلم فأخبروني...... الخ" ، صحيح مسلم ، باب من اعتراف على نفسه بالزنى (٤٤٣٥)، و فيه: " فسالت أهل العلم فاخبروني أنما على ابني الخ "

''مجھے اہل علم نے بتایا کہ میرے بیٹے کی سزا سو۱۰۰ کوڑے اور ایک سال جلاوطنی ہے۔''

غزوہ حنین میں تقسیم غنائم کے وقت نبی ﷺ کو انصار کے بارے میں کچھ ناراضگی کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« مَا حَدِيثٌ بَلَغَنِي عَنْكُمْ ؟ .» فَقَالَ لَهُ فُقَهَاءُ الْأَنْصَارِ ! أَمَّا ذُوُوا رَأْيِنَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ ! فَلَمْ يَقُولُوا شَيْئًا .» (متفق علیہ۔ البخاری فی الجهاد و مسلم فی الزکاۃ)

''یعنی مجھے آپ لوگوں کی طرف سے یہ کیا خبر ملی ہے؟ تو فقہاء انصار نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہمارے اصحاب رائے نے تو کچھ نہیں کہا۔''

حضرات خلفاء راشدین کے بارے میں نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الْمَهْدِيِّيْنَ مِنْ بَعْدِي .» [1]

''میری سنت کو لازم پکڑو اور میرے بعد میرے ہدایت یافتہ خلفاء کی سنت کی پیروی کرو۔''

یہ آپ ﷺ کی طرف سے اپنے خلفاء کو فقیہ و مجتہد اور مفتی قرار دینے کی واضح دلیل ہے۔

جامع الترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«أعلمهم بالحلال والحرام معاذبن جبل، وأفرضهم زيد بن ثابت وأقراهم أبي.»

(الحدیث بطولہ فی الترمذی) [2]

''صحابہ رضی اللہ عنہم میں حلال وحرام کے بارے میں سب سے بڑے عالم معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں۔ فرائض میں مواریث کے بڑے عالم زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہیں اور سب سے بڑھ کر قاری ابی رضی اللہ عنہ ہیں۔''

صحیح بخاری میں ہے:

«عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ أنه قال: " أقرأنا أبي و أقضانا علي " .»(تفسیر البقرہ)

''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے تھے: ہم میں بہترین قاری ابی رضی اللہ عنہ ہیں اور بہترین قاضی علی رضی اللہ عنہ ہیں۔''

---

[1] (صحيح البخاري ، كتاب فرض الخمس والمغازي، باب ما كان النبي ﷺ يُعطي المؤلفة...... (٣١٤٧)، صحيح مسلم، باب إعطاء المولفة قلوبهم ...... (٢٤٣٦)، واللفظ له.

[2] (اخرجه ابوداؤد والترمذی وابن ماجة عن العرباض بن سارية)

الغرض عصر نبوی میں فقہ وافتاء سے متصف صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ جن میں سرفہرست خلفاء اربعہ، عبداللہ بن مسعود، ابوموسیٰ اشعری، ابی بن کعب، زید بن ثابت، حذیفہ بن الیمان، عمار بن یاسر، ابوعبیدۃ ابن الجراح، معاذ بن جبل، ابو درداء، عبدالرحمٰن بن عوف اور عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہم ہیں۔ (جوامع السیرۃ للامام ابن حزم :ص۳۱۹ و ما بعدہ ۔ اعلام الموقعین: حافظ ابن القیم، (۱/۳۹۔۴۲)

بلکہ وہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دور دراز علاقوں میں اپنی طرف سے والی مقرر فرمایا تھا۔ سب فقیہ اور مفتی تھے اور عہد نبوی میں ہی فتاویٰ جاری کرتے تھے۔ اور یہ امت کے لیے عمل افتاء واجتہاد اور کتاب وسنت کے فہم اور اس سے استدلال کی مشق اور نبوی تربیت تھی۔ ان کے علاوہ بھی عہد نبوی میں اور اس کے بعد مفتیان صحابہ وصحابیات کی طویل فہرست ہے جو امت کی علمی ودینی راہنمائی فرماتے اور فریضہ تبلیغ دین میں مشغول تھے مثلاً:

ابوذر غفاری، سلمان فارسی، مصعب بن عمیر القرشی، سالم بن معقل مولی ابی حذیفہ، سعد بن معاذ الانصاری، عثمان بن مظعون القرشی، جعفر بن ابی طالب، زید بن حارثہ الکلبی مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خالد بن سعید بن العاص، خبیب بن عدی الانصاری، عبداللہ بن جحش اسدی، حمزہ بن عبدالمطلب، سیدہ فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خزیمہ بن ثابت الانصاری، خالد بن الولید القرشی، عبداللہ بن رواحہ الانصاری، ابوسعید الخدری، اسامہ بن زید حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عمرو بن العاص القرشی، ام المومنین ام سلمہ ھند بنت ابی امیہ، ام المومنین زینب بنت جحش اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم۔ جن کے عظیم فقہی مسائل کو امام زرکشی رحمہ اللہ نے ایک مستقل تالیف میں جمع کیا ہے اس کا نام "الإجابة فيما استدركته عائشة على الصحابة" ہے۔ ان سب حضرات کے فتاویٰ و اجتہادات کتب حدیث و تاریخ میں مروی اور منقول ہیں۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض سے تو بکثرت فتاویٰ مروی ہیں اور بعض کے فتاویٰ کی تعداد ذرا کم ہے اور کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم متوسط تعداد کے حامل ہیں، جن صحابہ کے فتاویٰ منقول ومحفوظ ہیں ان کی تعداد ایک سوتیس سے بھی متجاوز ہے۔ مذکورۃ الصدر حضرات کے فتاویٰ بکثرت منقول ہیں۔ علامہ حافظ ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک صحابی کے فتاویٰ اگر جمع کئے جائیں تو ان سے ایک ضخیم کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ چنانچہ ایک بڑے محدث وامام ابوبکر محمد بن موسیٰ نے امیر المومنین مامون الرشید کے لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے فتاویٰ مرتب کئے تو وہ بیس اجزاء پر مشتمل تھے۔ حافظ ابو محمد ابن حزم اور علامہ ابن قیم رحمہما اللہ نے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی باقاعدہ فہرست مرتب فرمادی ہے۔ جو منصب افتاء پر فائز تھے۔ نیز انہوں نے یہ تفصیل بھی ذکر کر دی ہے کہ وہ فتویٰ دینے میں کثرت، قلت یا

توسط کے اعتبار سے کس درجہ میں آتے ہیں۔ بلکہ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے تو ان تابعین، تبع تابعین اور آئمہ دین رحمہم اللہ کی ایک مفصل فہرست بھی مرتب فرما دی ہے جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد مختلف بلاد و امصار میں منصب افتاء پر فائز تھے۔ (جوامع السیرۃ ص: ۳۱۹، الرسالۃ الثالثۃ)

یہاں ہمارا مقصود فتاویٰ یا مفتیان کرام کا تاریخی تسلسل بیان کرنا نہیں ہے بلکہ ان عظیم شخصیات کا ذکر کر کے مفتی کے مقام ومرتبہ کی طرف توجہ دلانا اور اس ذمہ داری کی اہمیت واضح کرنا مطلوب ہے۔ وباللہ التوفیق.

محدثینِ کرام کی مساعیٔ جمیلہ:

شریعت اسلامیہ کا اولین مصدر قرآن حکیم تو عہد نبوی سے ہی سینوں میں محفوظ اور صحیفوں میں مدون ومرتب موجود اور متداول تھا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے حدیث وسنت کی ترتیب وتدوین اور حفاظت کے لیے بھی محدثین کی جماعت اور طائفہ منصورہ کو توفیق عطا فرما دی جنھوں نے "ما انا علیه و اصحابی" کے اعزاز اور طرۂ امتیاز کو قائم رکھا اور بشارت نبویہ کو عملی جامہ پہنایا۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سینوں میں محفوظ ذخیرۂ حدیث کو جمع کیا، تاریخ جانچنے کے مسلمہ اصولوں پر کتاب اللہ کی روشنی میں حدیث نبوی کی صحت وسقم پرکھنے کے مستزاد اصول مرتب کیے۔ رواۃ حدیث کی جرح وتعدیل کے قواعد وضع کیے، ان کی سان پر اسانید میں مذکور رجال کو چڑھا کر صحیح، ضعیف اور موضوع کو الگ الگ کیا۔ اس کا ہر طرح سے دفاع کیا، اصول ومصطلحات اور مناھج ترتیب دیے، رواۃ حدیث کے احوال وتراجم تک رسائی حاصل کی، علم رجال، علم اسانید، اصول حدیث اور قواعد تحدیث کی کتابیں تالیف کیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ.

فقہاء محدثین کا علمی وفقہی کارنامہ:

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور توفیق خاص سے حدیث نبوی کی تدوین وترتیب کا یہ عظیم کام عہد تابعین وتبع تابعین میں مکمل ہو گیا، تو ان کے سعادت کیش تلامذہ ائمۂ حدیث اور فقہاء محدثین نے امت کو پیش آمدہ مسائل ومشکلات کو سامنے رکھ کر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی فقہی وتشریعی ترتیب وتدوین کا آغاز کر دیا جس میں انہوں نے اللہ کی توفیق خاص سے عصر نبوی اور عہد خلافت راشدہ کے مخلصانہ طرز فکر ونظر اور طریق اجتہاد کا بھرپور تتبع کیا، اسی منہج کا تسلسل برقرار رکھتے ہوئے، مذکورہ بالا اصول وقواعد کو پیش نظر رکھ کر تیسری صدی کے آخر تک کتب السنہ کی شکل میں اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق بندوں پر حجت قائم کر دی اور شریعت پر عمل کے لیے ہر ممکن سہولت فراہم کر دی۔

نصوص کتاب وسنت پر مشتمل اور فقہی استدلال واستنباط سے مزین ان کتب مبارکہ اور اسفار مقدسہ کو اللہ کریم نے امت اسلامیہ کے ہاں تلقی بالقبول سے سرفراز فرمایا۔جن کی فہرست کافی طویل ہے۔عہد وار تذکرے اور تعارف کی بڑی ضرورت ہے مگر یہاں اس کا محل نہیں۔ان میں سے درج ذیل بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

① الجامع الصحيح، للامام المحدث الفقيه أبي عبدالله محمد بن إسماعيل البخاری رحمه الله المتوفی ٢٥٦هج

② الجامع الصحيح، للإمام أبي الحسين مسلم بن الحجاج القشيری رحمه الله ٢٦١هج .

③ كتاب السنن ، للإمام الحافظ المجتهد أبي داؤد سليمان بن أشعث السجستانی رحمه الله المتوفی ٢٧٥هج .

④ جامع الترمذی ، للإمام الحافظ الفقيه أبي عيسٰى محمد بن عيسٰى الترمذی رحمه الله ٢٧٩هج .

⑤ المجتبى من السنن ، للإمام أحمد بن شعيب النسائی رحمه الله ٣٠٣هج .

⑥ المؤطا ، للإمام دارالهجرة مالك بن أنس الأصبحی رحمه الله ١٧٩هج .

⑦ كتاب السنن ، للإمام أبي عبدالله محمد بن يزيد بن ماجه القزوينی رحمه الله ٢٧٥هج .

⑧ كتاب السنن ، للإمام علی بن عمرالدارقطنی رحمه الله ٣٨٥ هج .

⑨ كتاب السنن ، للإمام أبي عبدالله بن عبدالرحمن الدارمی رحمه الله ٢٥٥هج .

ان کتابوں کی اہمیت:

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ پر مبنی فقہ و اجتہاد ، استدلال و استنباط اور حدیث نبوی کی ان کتب مبارکہ اور شریعت اسلامیہ کی ان مؤقر دستاویزات اور مستند صحائف کو دیکھ کر درج ذیل فرمان نبوی کی حقانیت و صداقت پر ایمان ویقین میں بڑا اضافہ ہوتا ہے۔

«تركتكم على مثل البيضاء ليلها كنهارها لايزيغ عنها إلاهالك.» (رواہ ابن ماجہ)

”میں تمہیں واضح، روشن راستہ پر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔جس کی رات بھی دن کی طرح اجلی ہے۔ اس راہ راست سے کوئی ہلاکت نصیب ہی بھٹکے گا۔“

یہ اور اس قبیل کی دیگر کتب فقہ وفتاویٰ نبوی کا مجموعہ اور تسلسل اور خلفاء راشدین کے اجتہادی فکر وعمل اور منہج کا امتداد ہے۔ جو تا حال محفوظ و مصئون اور معمول بہا بھی ہے اور جاری وساری بھی اور ان شاء اللہ رہے

گا۔ ارشاد نبوی ہے:

«عَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :« لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِيْ مَنْصُوْرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰى يَأْتِيَ أَمْرُ اللّٰهِ وَ هُمْ كَذٰلِكَ .» (رواه مسلم والترمذی وابن ماجه)

''میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر کار بند اور دلیل و حجت میں غالب رہے گا۔ ان کا ساتھ چھوڑنے والا انھیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا یہاں تک کہ اللہ کا حکم (روزِ قیامت) آ پہنچے گا اور وہ اسی حالت میں ہوں گے۔''

شریعت مطہرہ کے چشمۂ صافی کو شریعت ہی کے نام سے مکدر کرنے کی بڑی کوششیں ہوئیں مگر بحمد اللہ شریعت من وعن محفوظ ہے اور شاہراہ اسلام صراط مستقیم واضح و روشن تر۔

﴿اللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ .﴾ (النور ۳۵)

ائمۂ ہدیٰ اور فقہاء محدثین کی یہ فقہی مساعی اور رجوع الی الکتاب والسنہ کا جذبۂ صادقہ اجتہاد بھی ہے اور جہاد بھی۔ جس کے لیے بڑے معرکے بپا ہوئے۔ جن کے بیان کا یہ محل نہیں۔ محدثین اور ان کی وارث جماعت حقہ اور طائفہ منصورہ ہر معرکے سے کامیاب و کامران اور سرخ رو ہو کر نکلا۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :« مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ أُمَّةٍ قَبْلِيْ إِلَّا كَانَ لَهُ مِنْ أُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَ أَصْحَابٌ يَأْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَ يَقْتَدُوْنَ بِأَمْرِهٖ ثُمَّ إِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا لَا يُؤْمَرُوْنَ فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَ مَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَ مَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَ لَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْإِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ .» (رواه مسلم (۱۷۹)

''عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جس امت میں بھی کوئی نبی مبعوث فرمایا اس کے ایسے ساتھی اور حمایتی تھے جو اس کی سنت پر عمل پیرا رہتے اور ان کے طریقے کے مطابق چلتے تھے۔ پھر ان کے بعد ایسے لوگ آ جاتے کہ جو کچھ کہتے کرتے نہیں تھے اور جو کرتے اس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا ہوتا تھا۔ ان کے خلاف جو کوئی

ہاتھ سے جہاد کرے وہ بھی مومن، جو زبان سے جہاد کرے وہ بھی مومن اور جو کوئی دل سے جہاد کرے
وہ بھی مومن ہے۔اس کے بعد رائی کے دانے برابر ایمان نہیں رہتا۔"

ان کتابوں کے امتیازی اوصاف جن کی بدولت یہ مسلمانوں کی متفق علیہ کتب قرار پائیں:

یہ کتابیں بلا امتیاز مسلک و مشرب تمام اھل السنہ کے ہاں قابل اعتماد اور معمول بہا ہیں۔ بلا شبہ انہیں کتب اسلام ہونے کا شرف حاصل ہے۔چونکہ بعد میں اہل السنہ کے تمام فقہی ذخیرہ اور کتب فتاویٰ کا اصل الاصول اور مرجع یہی کتابیں ہیں۔اس لئے ذیل میں ہم ان کے امتیازی اوصاف اور خصوصیات پر نظر ڈالتے ہیں تا کہ قارئین کرام کو کتب فتاویٰ کی قیمت واہمیت اور مفتیان شرع متین کی اصابت رائے، فکری و نظری کاوشوں، اجتہادی واصولی تگ وتاز اور علمی وفقہی گہرائی وگیرائی اور وسعت نظر کا اندازہ ہو سکے اور وہ جان سکیں کہ خارجی واجنبی اثرات سے مرعوب، سرکاری مراعات یافتہ ہمارے عدالتی اہلکار امت کے ان قابل فخر اہل علم وفضل اور مجتہدین پر "گلی کوچوں میں بیٹھے مفتیوں" کی پھبتیاں کسنے اور ان کے بارے میں استہزاء وتمسخر میں کس حد تک جرم کے مرتکب ہیں جبکہ ان کا اپنا مبلغ علم انگریزی کی چند رٹی رٹائی مصطلحات اور بدیسی کفریہ عدالتوں کے فیصلوں کی نظیروں سے زیادہ کچھ بھی نہیں، ان کے فیصلوں میں حکومتی دباؤ اور سیم وزر کی تاثیر بھی مسلم حقیقت ہے۔جبکہ ہمارے یہ درویش صفت مفتی قرونِ اولی کی بے لوث خدمت اور حق گوئی کی عالی شان روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

کتب السنۃ والحدیث کے امتیازی اوصاف وخصائص:

① گذشتہ سطور میں مذکورہ سلف صالحین یعنی صحابہ وتابعین کے ہاں معمول بہا اصول فقہ واجتہاد کی پاسداری اور عملی تطبیق۔

② ہر مسئلہ میں کتاب وسنت اور آثار صحابہ وتابعین سے استدلال واستنباط۔

③ بلا امتیاز مسلک ومشرب موافق ومخالف آراء واقوال اور ان کے دلائل کا حتی الامکان استیعاب۔

④ ذاتی رجحان اور شخصی میلان سے قطع نظر دلیل کی بنیاد پر ترجیح الراجح اور مسلک حق کی تائید وحمایت۔

⑤ غیر واقعی مفروضوں اور لایعنی مباحث ومسائل سے مکمل اجتناب۔

⑥ روزمرہ پیش آنے والے مسائل کا ذکر اور ان کے لئے کتاب وسنت سے استدلال۔

⑦ سیدھا سادہ اور تکلف سے پاک طرزِ استنباط واستدلال اور عام فہم آسان اسلوب بیان۔

⑧ احادیث وآ ثارحتی کہ اقوال ائمہ کے بیان میں بھی سند کا اہتمام۔

ان اوصاف وامتیازات پرنظرڈالتے ہوئے ہماری علمی کم مائیگی، تفقہ و ادراک میں بے بضاعتی، فقہ وحدیث میں قصورفہم و بصیرت اور استقراء ناقص پیش نظر رہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کتابوں کے مزایا وخصائص اور محاسن ومحامد کی نشاندہی ایک انتہائی مشکل کام ہے۔جو ہماری فکری جولان گاہ کے دائرے میں آ سکتا ہے اور نہ ہی احاطہ تحریر وبیان میں، اس کے لیے جوحسن تعبیر مطلوب ہے ہم اس سے بھی تہی دامن ہیں، ان میں سے ہرکتاب کے بارے میں الگ الگ مباحث و مقالات لکھے جا چکے ہیں اور مستقل کتابیں تالیف ہو چکی ہیں، بالخصوص صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے متعلق تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔جس میں ان کی محدثانہ وفقیہانہ حیثیتیں اجاگر کی گئی ہیں۔ مولانا عبدالسلام مبارکپوری رحمہ اللہ کی ''سیرت البخاری''اس موضوع پر اردو زبان میں بڑی وقیع اور کامیاب تالیف ہے۔

فقہ واجتہاداور افتاء کے باب میں سلف صالحین، صحابہ وتابعین، ائمہ فقہ اور فقہائے محدثین کی مساعیٔ جمیلہ کے نتیجہ میں اور ان کے فقہی واصولی مناہج کی روشنی میں جب امت اسلامیہ میں فقہ و افتاء کا کام منظّم ومرتب ہونے لگااور مستقل فن کی شکل اختیار کرنے لگاتو الگ سے اس کے اصول وقواعد بھی ترتیب دیئے جانے لگےاور ہر دور میں علماء اسلام کی ایک بڑی تعداد اس کار خیر میں مشغول رہی ، جو پیش آمدہ جدید مسائل پر غور کر کے مجتہدانہ انداز میں لوگوں کی راہنمائی کرتی رہی۔ اسی لئے فکر وتدبر اور اجتہادو تفقہ کادروازہ باوجود ہزارکوششوں کے علماء حق نے کبھی بندنہیں ہونے دیا اور نہ ہی کبھی اباحیت پسندوں اور علم دشمن حریت استدلال واستنباط کےعلمبرداروں کو دین وشریعت کے نام پرہوا پرستی کی اجازت دی 'ارشادواجتہاداور افتاء کا یہ مبارک سلسلہ تاہنوز بخیروخوبی علمی اور فقہی بنیادوں پرجاری وساری ہے۔آپ کے ہاتھوں میں موجود یہ کتاب بھی اسی مبارک سلسلہ کی ایک خوبصورت کڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول عام سے نوازے'مؤلف ومرتب اور قارئین کے لیے باعث رشد وہدایت اور ذخیرۂ آخرت بنائے۔آمین وما ذلك على الله بعزيز .

فتویٰ کیا ہے؟:

لغت عرب کی مستند کتب: الصحاح، القاموس المحيط اور لسان العرب وغیرہ میں ہے:

" أفتاه في الأمر أبانهٗ له، و الفتيا و الفتوى وتفتح ما أفتى به الفقيه".

یعنی ''کسی چیز کیلئے کوئی معاملہ واضح کیا اور دوٹوک رائے دی۔''

ابوالقاسم الحسین بن محمد الراغب الأ صفہانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" الفتیا والفتویٰ : الجواب عما یُشکل من الأحکام ویقال: إِسۡتَفۡتَیۡتَ فأفتاك"(مفردات القرآن ص ۳۷۳)

"فتیا اور فتویٰ مشکل احکام کے بارے میں صادر ہونے والے جواب کو کہتے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: تو نے اس سے استفتاء (سوال) کیا تو اس نے تجھے فتوی (جواب) دیا۔"

فقیہ کسی مسئلہ میں شرعی حکم واضح کرے تو اس حکم کے لیے فتیا، فُتوٰی ۔ ف پر ضمہ کے ساتھ اور فتویٰ ف پر فتح کے ساتھ۔ استعمال ہوتا ہے،گویا اس کے دو اساسی مادے، ف۔ت۔و اور ف۔ت۔ی اور تین لغات ہیں۔بعض اہل علم نے فتیا اور فتویٰ میں فرق بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔مگر معتبر کتب لغت میں اس تفریق کی کوئی اصل و اساس دریافت نہیں ہوسکی۔ لہٰذا انہیں باہم مترادف سمجھنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ البتہ متقدمین اہل لغت کے ہاں فتیا کثیر الاستعمال تھا اور متاخرین کے ہاں فتویٰ کے استعمال نے زیادہ رواج پا لیا ہے۔ اس لیے حدیث میں عموماً فتیا کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی جمع "فتاویٰ اور فتاوِی" معروف و متداول ہے۔

فقہی اصطلاح میں کسی وضاحت طلب مسئلہ میں اس موضوع کے بارے میں خصوصی اہلیت کے حامل فقیہ و مجتہد عالم کی طرف سے جاری کردہ حکم، رائے، فیصلے اور وضاحت کی نص اور بیان کو فتویٰ کہتے ہیں، جو سائل کے سوال کے جواب میں صادر ہوتا ہے۔لغوی و اصطلاحی معنی میں عموم وخصوص کا فرق ہوگا۔یعنی لغت میں کسی مسئلہ میں رائے دینے اور وضاحت کرنے کو افتاء کہتے ہیں۔ جبکہ فقہی، شرعی اور دینی اصطلاح میں کسی دینی و شرعی معاملے کی وضاحت کرنے،تعلیم دینے اور دوٹوک بیان دینے کو افتاء کہتے ہیں۔ اگر اس کی نسبت شارع کی طرف ہو تو افتاء کا اطلاق حکم ایجاد کرنے پر ہوگا۔قرآن کریم میں ہے:

﴿یستفتونك قل الله یفتیکم فی الکلالة .﴾ (النساء ۱۷۶)

"(اے پیغمبر!) لوگ تجھ سے حکم دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجئے !اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں حکم دیتا ہے۔"

فتویٰ جاری کرنے والے کے مقام و مرتبہ اور حیثیت کے مطابق "افتاء" کے معنی میں تبدیلی ہوئی۔ اس لیے کہ "افتاء" کی نسبت ذات باری تعالیٰ کی طرف ہوئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی۔صحابہ وتابعین،

فقہاء اسلام اور علماء شریعت کی طرف بھی۔ ہماری اس بحث میں مفتی سے مراد علماء شریعت ہی ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ فہم و بصیرت اور قوت استدلال و استنباط اور اجتہادی ملکہ راسخہ کی بدولت کتاب و سنت کے مطابق منہج سلف صالحین کی روشنی میں لوگوں کو پیش آمدہ دینی مشکلات حل کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ لفظ مختلف صیغوں کی صورت میں گیارہ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ حصول فتویٰ کے لیے سوال کرنا ہو تو اس کے لیے ''استفتاء'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ اسلوب

(: استفہام انکاری کے لیے بھی وارد ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فاستفتهم ألربك البنات ولهم البنون . ﴾ (الصافات ١٤٩)

''ان سے پوچھو تو کہ بھلا تمہارے رب کے لئے تو بیٹیاں اور ان کے لیے بیٹے ہیں (ہرگز نہیں)۔''

: استفہام تقریری کے لیے بھی آیا ہے۔ فرمایا:

﴿ فاستفتهم أهم أشد خلقا أم من خلقنا . ﴾ (الصافات ١١)

''تو ان سے پوچھئے کہ ان کو بنانا مشکل ہے یا جو خلقت ہم نے پیدا کی ہے؟''

ج: اور حصول حکم و علم کی خاطر سوال کے مترادف کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے اور زیادہ تر اسی معنی کے لیے ہے فرمایا:

﴿ يستفتونك في النساء قل الله يفتيكم فيهن . ﴾ (النساء ١٢٧)

''(اے نبی ﷺ) لوگ تجھ سے (یتیم) عورتوں کے بارے میں فتویٰ طلب کرتے ہیں۔ کہہ دو! اللہ تمہیں ان کے بارے میں حکم دیتا ہے۔''

حدیث نبوی میں بھی یہ لفظ انہی معانی کے لیے بکثرت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

«عن النواس بن سمعان قال: سألت رسول الله ﷺ عن البر و الإثم فقال: «البر حسن الخلق والإثم ما حاك في نفسك و كرهت أن يعلمه الناس .» وفي لفظ : « الإثم ما حاك في صدرك و كرهت أن يطلع الناس عليه .» (رواه احمد في مسنده ج ٦ ص ١٩٨ ط جديد) و لفظ مسلم : « والإثم ما حاك في نفسك و كرهت أن يطلع عليه الناس .» (مسلم ١٦/ ١١١)

''حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ

کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نیکی حسن خلق ہے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے جی میں کھٹکے اور تمہیں یہ بات بری لگے کہ وہ لوگوں کو معلوم ہو جائے۔ (مسند احمد اور صحیح مسلم کی روایات کے الفاظ میں تھوڑا سا فرق ہے مفہوم سب کا یہی ہے)

« وعن عائشة رضى الله عنها قالت: قال رسول الله ﷺ :« يا عائشة أشعرت أن الله أفتا نى فيما استفتيته فيه؟ .» (البخارى فى الطب ـ باب السحر)

وفى رواية « ياعائشة أعلمت ....» وفى أخرى :« أشعرت أن الله أفتانى فيما فيه شفائى .»الخ (البخارى=كتاب :بدأالخلق، باب صفة ابليس وجنوده)

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ تمہیں پتہ چلا کہ جس بارے میں میں نے اللہ سے استفسار کیا تھا اس نے مجھے بتا دیا ہے؟ ایک روایت میں ہے اے عائشہ تمہیں علم ہوا ......؟ اور ایک دوسری روایت میں یوں ہے: کیا تمہیں پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس چیز کے متعلق بتا دیا ہے جس میں میری صحت و شفا ہے۔"

« عن أبى ثعلبة الخشنى قال: قال رسول الله ﷺ : « الإثم مالم تسكن إليه النفس ولم يطمئن إليه القلب وإن أفتاك المفتون .» (مسند الامام أحمد ٦/ ٢٢٣)

"ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: گناہ وہ ہے جس پر نفس کو قرار نہ ہو اور دل کو اطمینان نہ ہو۔"

« عن وابصة بن معبد الأسدى رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ : « يا وابصة استفت قلبك واستفت نفسك .» ثلاث مرات، ثم قال:« البر ما اطمأنت إليه النفس والإثم ما حاك فى النفس وتردد فى الصدر وإن أفتاك الناس وأفتوك .»

(مسند الامام أحمد ٦/٢٢٣)

"وابصہ بن معبد اسدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے وابصہ! اپنے دل سے استفتاء کر اور اپنے جی سے پوچھ تین بار: یہی فرمایا پھر بتایا کہ نیکی وہ ہے جس پر تمہارا جی مطمئن ہو اور گناہ وہ ہے جو جی میں کھٹکے اور دل میں اس کے بارے میں تردد ہو اگرچہ لوگ تمہیں اس کا جائز ہونا بتائیں اور اس کا فتویٰ دیں۔"

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ:

استفتاء: حصول علم، معرفت حق اور شرعی امور میں پیش آمدہ مشکلات کے حل کے لیے سوال کرنے کو کہتے ہیں۔

مستفتی: طالب علم و معرفت اور سائل کو۔

افتاء: مشکل دینی مسائل کے بارے میں شریعت کی روشنی میں اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کا حکم بتانے، رائے ظاہر کرنے اور وضاحت کرنے کو کہتے ہیں۔

فتویٰ: کا لفظ جواب اور بیان حکم کی نص پر بولا جاتا ہے۔ اور

مفتی: مجیب یعنی جواب دینے والے اور وضاحت کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔

فتویٰ اور قضاء میں فرق:

مفتی کے فتویٰ اور قاضی کی طرف سے جاری کردہ عدالتی حکم میں متعدد وجوہ سے فرق کیا جاتا ہے۔ جس کا خلاصہ مندرجہ ذیل نکات میں مرتب کیا جا سکتا ہے۔ وباللہ التوفیق.

1. فتویٰ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے کتاب و سنت کے حوالے سے کسی مجتہد عالم دین کی وہ وضاحت ہوتی ہے جس میں سائل یا مستفتی کے لیے شرعاً مطلوب عمل یا ترک عمل کا بیان ہو۔ یعنی احکام شریعت کا بیان فتویٰ کہلاتا ہے۔

جبکہ قاضی کی طرف سے عدالتی فیصلہ کے ساتھ اس پر عمل کا لازمی حکم بھی ہوتا ہے۔

2. وہ تمام امور و معاملات اور قضایا جن میں قاضی کا حکم معتبر ہے ان میں مفتی کا فتویٰ بھی جاری و ساری ہوتا ہے، برعکس اس کے مفتی کے دائرہ فکر و نظر اور توضیح و بیان میں آنے والے بہت سارے امور و مسائل میں قاضی کو حکم جاری کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ مثلاً عبادات کے بارے میں فتویٰ تو جاری اور قابل قبول ہے۔ مگر قاضی کے حکم کی عبادات کے بارے میں کوئی حیثیت نہیں اور نہ ہی یہ اس کے دائرہ کار و اختیار میں ہے۔ یعنی قاضی اس طرح کے فیصلے صادر نہیں کرتا کہ یہ نماز صحیح یا فاسد ہے یا پانی کے بارے میں یہ حکم نہیں دے سکتا کہ وہ طاہر و مطہر ہے یا نجس اور اس سے وضو ہو سکتا ہے یا نہیں۔ البتہ مفتی اس طرح کے امور میں فتویٰ جاری کرتا ہے۔ ایسے ہی عبادات کے متعلقہ امور میں بھی قاضی کے حکم کی بجائے مفتی کے فتویٰ کو اہمیت حاصل ہے۔ اس زاویہ سے مفتی کا فتویٰ قاضی کے حکم کی نسبت بہت مہتم بالشان ہے۔ اس لیے کہ وہ عمومی شرعی حکم کا درجہ رکھتا ہے جو سائل اور غیر سائل سب کے لیے واجب القبول والعمل

ہے۔ بلکہ وہ زمان و مکان کی قید سے بھی بالاتر ہوتا ہے۔ جبکہ قاضی کا حکم صرف متعلقہ شخص یعنی محکوم علیہ تک ہی محدود ہوتا ہے۔

۳ حقوق العباد اور دنیوی معاملات ہوں یا عبادات مستفتی یعنی سائل مفتی کے پاس برضاء و رغبت اور اپنے اختیار سے آتا ہے لہٰذا جاری شدہ فتویٰ سے سرتابی کے لیے اس کے پاس کوئی عذر اور اخلاقی جواز باقی نہیں رہتا، جبکہ قاضی کی عدالت میں عموماً مجبوراً جانا پڑتا ہے یالایا جاتا ہے۔

۴ مفتی کے فتویٰ پر عمل کے لیے سائل پر کوئی حکومتی اور قانونی دباؤ نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی مرضی سے پوچھتا اور بظاہر عمل کرنے میں بھی مختار ہوتا ہے۔ جہاں تک اخلاص اور نیت کا تعلق ہے وہ اس کا اور اللہ کا معاملہ ہے، وہ اسی کے حضور جواب دہ ہوگا۔ بہر حال فتویٰ پر اطمینان نہ ہونے یا سمجھ نہ آنے کی صورت میں وہ اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے میں آزاد ہے۔ جبکہ اس کے برعکس قاضی کے حکم پر عمل کروانے کے لیے اس کی پشت پر ریاستی طاقت موجود ہوتی ہے۔ یہاں اس کی ذاتی پسند و ناپسند، اطمینان اور عدم اطمینان کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس اعتبار سے قاضی کا حکم فتویٰ کی نسبت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

۵ قاضی بظاہر حاکم وقت کا کارندہ، نمائندہ اس کا مقرر کردہ اور اس کے احکام کا پابند ہوتا ہے۔ جبکہ مفتی براہ راست اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ترجمان اور صرف انہی کے احکام کا پابند اور صرف اللہ کے حضور ہی جواب دہ ہوتا ہے۔

۶ نیک دل، شریعت کے پابند قاضی کو قدم قدم پر مفتی کی طرف رجوع کر کے اس سے راہنمائی لینا پڑتی ہے، مفتی اس کے حکم کے بارے میں صحیح یا غلط کا فیصلہ بھی کر سکتا ہے۔ جبکہ مفتی کے فتویٰ پر قاضی بحیثیت قاضی رائے زنی نہیں کر سکتا، اور نہ ہی اس کو اس کا حق حاصل ہے، اس لیے سلف کے زمانہ سے لے کر تا حال مفتیوں کے مبنی بر کتاب وسنت فتاویٰ اسلامی فقہ کی صورت میں مرتب و مدون اور امت کے ہاں معمول بہا ہیں۔ جبکہ قاضیوں کے احکام کی جمع و تدوین کا اس حد تک اہتمام نہیں کیا گیا۔ فتویٰ کے مقابلے میں ان کی ہمیشہ ثانوی حیثیت ہی رہی ہے۔ جو مجتہدین اور کبار علماء منصب قضاء پر فائز ہوئے ان کے بھی علمی وفقہی کارنامے معروف و متداول ہیں اور عدالتی احکام اور فیصلے دستبرد زمانہ کی نذر ہو گئے۔

عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ کے قضایا و احکام اپنی ذاتی حیثیت اور اہمیت کی وجہ سے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس لیے کہ ''اقضیۃ الرسول ﷺ'' سنت رسول ہونے کی وجہ سے وحی الٰہی کا حصہ ہیں اور خلفاء راشدین

کے فیصلے اور احکام کو فتاویٰ اور سنت خلفاء راشدین مہدیین ہونے کا شرف و اعزاز حاصل ہے اور فرمان نبوی ہے:

«عَنْ عِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :« فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ عَضُوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ .» ❶

”حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سو میری اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑنا اسے دانتوں کے ساتھ مضبوطی سے تھام لینا۔“

❶ (رواہ احمد وابوداؤد والترمذی وابن ماجہ والدارقطنی وابن حبان والحاکم وصححہ الترمذی)

فتویٰ کے اصلاحی ومعاشرتی فوائد

فتویٰ اگر مقاصد شریعت اور روح اسلام کے مطابق، کتاب وسنت کے دلائل پرمبنی ہو، سلف امت کے علمی منہج اور اصولی طریقہ پرجاری کیا گیاہو، شخصی، گروہی اور حزبی تعصّبات سے بالا ہو، ضعیف ادلہ اور شاذ اقوال کا سہارا لے کر سائل کوخوش کرنے یا مفتی کی تشہیر کے لئے نہ ہو، بلکہ مطلوب رضاالٰہی اور مقصود اصلاح ومصلحت امت ہوتو بہترین دینی ومعاشرتی فوائد کا حامل ہوتا ہے، امت کی اصلاح وتعلیم اور شیرازہ بندی میں فتویٰ کا کردار بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مثلا:

ا۔ دین کے متعلق لاعلمی اور جہالت کا سدّباب:

مستفتی کا سوال اور مفتی کا جواب، تعلیم وتعلم اور علمی مذاکرہ کی ایک شکل ہے، جس کے ذریعے سائل دینی احکام سیکھتا ہے اور یہ حصول علم ہی کی ایک قسم ہے، جس کی اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بڑی تاکید فرمائی ہے۔

حکم الٰہی ہے:

﴿ فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ . ﴾ (النحل ٤٣)

''پس اگرتم نہیں جانتے ہوتو اہل علم سے سوال کرلو۔''

نیزارشادفرمایا:

﴿ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ . ﴾ (التوبہ: ١٢٢)

''سوایسے کیوں نہیں کرلیتے کہ ان کی ہر جماعت میں سے ایک چھوٹا گروہ نکل کھڑا ہوتا کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور جب اپنی قوم کے پاس واپس آئیں توانہیں ڈرائیں تاکہ وہ ڈریں اور احتیاط برتیں۔''

بلکہ قرآن حکیم کی اولیں وحی بھی تحصیل علم کی تاکید پر مشتمل ہے۔ فرمایا:

﴿ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ . ﴾ (العلق ۱)

''پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔''

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اصلاح وتعلیم کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مبارک فتاویٰ صادر فرمائے۔ اس کے نتیجے میں مصلحین و مجتہدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک عظیم الشان جماعت تیار ہوئی جنہوں نے دعوت دین اور تعلیم کتاب وسنت کے لیے عہد نبوی میں اور اس کے بعد ایسا بہترین کردار ادا کیا جس کی نظیر سابقہ کسی امت میں نہیں ملتی، مدرسہ نبویہ سے علم وفضل اور فہم وفراست سے آراستہ ایسی جماعت تیار ہوئی جو کل تک پڑھنے لکھنے سے بھی بے بہرہ تھے مگر نبوی تعلیم کے نتیجے میں پوری انسانیت کے لیے منارۂ نور ثابت ہوئے، ان کی اصلاح وتربیت میں اللہ کی توفیق سے اصل کردار فتاویٰ وتوجیہات نبویہ کا ہی تھا۔

۲۔ فتویٰ امت کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے:

درست اور صحیح فتویٰ فرد اور معاشرہ کو صراط مستقیم پر رواں دواں رہنے میں بڑی مدد دیتا ہے اور امت کو مذموم بدعات سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس سے جادۂ حق کی تعیین وتوضیح ہو جاتی ہے جس سے فرد اور معاشرے میں اجتماعی فکر وعمل کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ یَرَی الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ وَ یَهْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ . ﴾ (سبا: ٦)

''اور جنہیں علم دیا گیا ہے وہ دیکھ لیں گے کہ جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے اور وہ غالب وستودہ صفات کی راہ دکھاتا ہے۔''

نزول شرائع کا مقصد بھی اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی شیرازہ بندی اور تفرقہ سے بچاؤ ہی ٹھہرایا ہے۔

﴿ وَ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ . ﴾ (الشوریٰ: ۱۳)

''یہ کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں رہ کر ٹکڑیوں میں نہ بٹو۔''

۳۔ فتویٰ امت اور علماءِ امت کے مابین رابطہ ہے:

امت جب تک اپنے محسن ومربی علماء سے وابستہ رہے گی، ان سے وفا کرے گی، ان سے خیر د

شر میں امتیاز سیکھتی رہے گی، دین و دنیا میں راہنمائی حاصل کرتی رہے گی، اتباع کتاب وسنت میں علماء کی اطاعت کرتی رہے گی، اور معروف میں ان کی نصیحت پر عمل پیرا رہے گی تب تک دنیا وعقبیٰ کی سعادتوں سے مالا مال رہے گی۔ دنیا میں کامیابی و کامرانی اور آخرت کی فوز و فلاح اس کا مقدر ہوگی۔ ان شاء اللہ.

اہل علم وفضل کی اطاعت وفرمان برداری کے انجام خیر کے لیے یہی ضمانت کافی ہے کہ الہ العالمین نے اس کی ہدایت وراہنمائی فرمائی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَطِيعُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ . ﴾ (النساء:٥٩)

''اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولوا الأمر کی بھی۔''

جمہور اہل علم نے اس آیت میں مذکور ''اولی الأمر'' سے مراد ''امراء'' لیے ہیں اور بعض سلف نے جن میں ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سرفہرست ہیں ''اولی الأمر'' کی تفسیر ''علماء'' سے کی ہے جبکہ قرون اولی میں امراء بھی علماء ہی ہوا کرتے تھے۔

عبد بن حمید، ابن جریر طبری اور ابن ابی حاتم (رحمۃ اللہ علیہم) نے عطاء رحمہ اللہ کا بیان روایت کیا ہے کہ وہ ﴿ أَطِيعُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ . ﴾ سے اتباع کتاب وسنت مراد لیتے ہیں اور ''اولی الأمر'' کی تفسیر ''اہل علم وفقہ'' سے کرتے ہیں۔ (المحرر الوجیز ٤/ ١١٠)

مسلمانوں کی تاریخ میں بالخصوص خیرا القرون میں ولاۃ الامور اور حکمرانوں نے ...... جبکہ وہ خود بھی علماء ہوتے تھے ...... ہمیشہ اہل فقہ واجتہاد اور اصحاب علم وبصیرت کے ساتھ احترام واکرام کا سلوک ہی روا رکھا اور انہیں مشاورت میں شریک رکھا، یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ (رحمہم اللہ اجمعین)

۴۔ فتویٰ سے طالبِ حق کے لیے فہم وبصیرت کے دریچے کھلتے ہیں:

اگر طالب حق اور مستفتی کی کسی ثقہ، مخلص اور صاحب فکر ونظر مفتی تک ...... اللہ کی توفیق سے ...... رسائی ہو جائے تو اس کے سامنے علم وفہم اور نور وحی ورسالت کے دریچے وا ہو جاتے ہیں۔ فقہ وبصیرت اور معرفت حق کی روشنی میسر آ جاتی ہے، گویا اسے اسلام کے چشمۂ صافی تک رسائی حاصل ہوجاتی ہے جہاں سے وہ اپنی علمی ودینی تشنگی دور کرسکتا ہے اور دل دماغ کو جلا بخش سکتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی ﷺ کی زبان مبارک پر وعدہ ہے:

« عَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ :« مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ .» (رواه البخاري)

”حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا فرماتے تھے۔اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمائے اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں۔“

لقمان حکیم نے بھی اپنے لخت جگر کو نصیحت فرمائی تھی:

« يَا بُنَيَّ جَالِسِ الْعُلَمَآءَ وَ زَاحِمْهُمْ بِرُكْبَتِكَ ، فَاِنَّ اللّٰهَ يُحْيِي الْقُلُوْبَ الْمَيْتَةَ بِالْحِكْمَةِ كَمَا يُحْيِي الْأَرْضَ الْمَيْتَةَ بِوَابِلِ السَّمَاءِ .»

(صحيح جامع بيان العلم وفضله۔الفقره ٣٩٩)

”بیٹے! علماء کی مجلس میں بیٹھا کرو، ان کے حضور زانوئے تلمذ طے کیا کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ حکمت کے ساتھ مردہ دلوں کو جلا بخشتے ہیں جیسے مردہ زمین کو آسمانی بارش سے زندگی عطا فرماتے ہیں۔“

فتویٰ سے بہترین معاشرتی واصلاحی نتائج حاصل کرنے کے لئے مفتی کا ثقہ و متمکن اور مخلص عالم ہونا اور مستفتی کا مخلص، طالب حق اور علم و عمل کے لئے حریص ہونا اولیں شرط ہے۔

۵۔دینی فرائض کی صحیح بجا آوری کے لئے فتویٰ بہترین مدومعاون ہے:

فتویٰ اگر اس احساس ذمہ داری کے ساتھ جاری کیا گیا ہو کہ رب العالمین کی طرف سے اس کے دین کی تشریح و توضیح ہے اور اس کی مخلوق کی خیر خواہی و راہنمائی ہے تو اس سے شرعی و دینی فرائض و واجبات کی صحیح ادائیگی میں بڑی سہولت پیدا ہوتی ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ .﴾ (الزمر:٥٥)

”اور پیروی کرو اس بہترن چیز (وحی) کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔“

نیز فرمایا:

﴿ وَ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ. ﴾

(النحل : ٤٤)

''یہ ذکر (کتاب) ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے تاکہ لوگوں کی جانب جو اتارا گیا ہے آپ ان کے لئے اسے کھول کھول کر بیان کر دیں شاید کہ وہ غور و فکر کریں۔''

فتویٰ جس قدر صحیح دلائل اور ان کے صحیح فہم و استدلال پر مبنی اور درست ہوگا اسی قدر دینی فرائض و واجبات کو منشاء الٰہی اور مراد رسول ﷺ کے مطابق ادا کرنے میں ہادی و راہنما اور ممد و معاون ثابت ہوگا اور اس سے بدعات کا قلع قمع اور سنت کا احیاء ہوگا۔

گویا معاشرے میں احیاء دین اور اتباع کتاب و سنت کی تحریک بپا کرنے کے لئے فتویٰ بہترین ذریعہ اور بنیادی عناصر میں سے ہے۔

نااہل لوگوں کے فتاویٰ کے معاشرتی و دینی نقصانات

منصب افتاء واجتہاد علم وعمل اور توجیہ وارشاد کی ایک خاص الخاص ذمہ داری ہے،اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہرکس وناکس کے بس کی بات نہیں ہے،بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ: ''جب روٹیاں پکانے والے باورچی کی نگرانی اور احتساب ہوتا ہے تو جاہل مفتیوں کو کیوں آزاد اور بے لگام چھوڑ دیا جائے۔'' (اعلام الموقعين ٤/٢١٧)

اصحاب رسول ﷺ فتویٰ دینے میں کس قدر محتاط تھے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان میں سے ہرایک کی آرزو ہوتی تھی کہ اس کی جگہ کوئی اور ہی اس ذمہ داری کو قبول کرلے تو بہتر ہے حالانکہ وہ سب کے سب آسمان علم وفضل کے روشن ستارے اور سرچشمۂ علوم نبوت ورسالت کے وھارے تھے اور شرف صحابیت کی بدولت صائب الرائے بھی۔حضرت عطاء رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ایسے حضرات کو دیکھا ہے جب ان سے کوئی فتویٰ پوچھا جاتا تو احساس ذمہ داری کی شدت سے کانپنے لگتے۔ (اعلام: ٤/٢١٨)

فقہ وحدیث کے جلیل القدر امام حضرت شعبی رحمہ اللہ سے ایک بار کوئی مسئلہ دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''لاأدري'' کہ میں نہیں جانتا۔سائل نے عرض کی: " ألا تستحيي من قولك لا أدري؟ و أنت فقيه أهل العراق" کہ تم " لاأدري" کہتے ہوئے حیاء محسوس نہیں کرتے حالانکہ آپ اہل عراق کے فقیہ ہیں،توامام شعبی رحمہ اللہ نے فرمایا:" لكن الملائكة لم تستحي حين قالوا :﴿ لا علم لنا إلا ما علمتنا .﴾" (اعلام ٤/٢١٨)

عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں: میں نے ایک سوبیس انصار صحابہ کو دیکھا ہرایک مسئلہ پوچھنے پر دوسرے کی طرف بھیج دیتا تھا۔ (اعلام ٤/٢١٨)

قاسم بن محمد سے کسی نے فتویٰ پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ: میں اسے بہتر طریقے سے نہیں بتا سکتا تو سائل نے عرض کیا کہ مجھے آپ کے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا تو قاسم بن محمد نے فرمایا: ''میری لمبی داڑھی اور میرے گرد لوگوں کے جمگھٹے کو نہ دیکھو اللہ کی قسم میں اسے اچھی طرح نہیں جانتا۔'' (ایضا۲۱۹)

سبحان اللہ! ایک طرف یہ اہل علم وتقویٰ ہیں دوسری طرف ہمارے دور کے جاہل جری مفتی ہیں جن میں

سے بعض سائل کا سوال سمجھنے سے بھی قاصر ہیں، مگر مفتی کہلانے کا شوق انہیں ایک پل آرام نہیں کرنے دیتا۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنے دور کا رونا انہی الفاظ میں رویا ہے:

اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کتاب وسنت کے دلائل سے مزین فتویٰ دیتے تھے پھر تابعین کی صورتحال بھی اسی طرح کی تھی ائمہ کرام کا بھی یہی وصف تھا، حکم کے ساتھ استدلال اور وجہ استدلال بھی واضح فرمادیتے تھے، پھر عہد نبوی دور ختم ہوا تو ہم ایک قدم اور پستی میں گرے بلا دلیل اور ہاں یا نہ میں فتویٰ دیا جانے لگا۔ مگر مدلل فتویٰ کے فضل وکمال کا اعتراف باقی تھا پھر وہ زمانہ بھی آ گیا کہ دلیل کے ساتھ فتویٰ دینے والوں کا مذاق اڑایا جانے لگا، اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے بعد اس سے بدترین طریقہ کیا نکلے گا۔ والله المستعان.

(اعلام ٤/٢٦٠)

افسوس کہ ایسا ہی ہوا ہم اب ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں ایسے لوگ بھی فتویٰ دینے میں باک محسوس نہیں کرتے جنہوں نے علوم دین سرے سے پڑھے ہی نہیں، قرآن وحدیث کے فہم تک ان کی رسائی بھی نہیں اور وہ استدلال واستنباط کے اصول وقواعد سے ذرہ بھر واقف نہیں۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

اسی صورت حال کی پیش گوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی، عنقریب صحیحین میں مروی عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ذکر آ رہا ہے۔ اس صورت حال میں سوال کرنے والوں کا فرض ہے کہ جن سے پوچھتے ہیں ان کا علمی وتعلیمی پس منظر بھی معلوم کرلیا کریں ورنہ وہ بھی برابر کے شریک گناہ ہیں۔

نااہل مفتیوں کے فتاویٰ سے جو علمی ودینی نقصانات ہوتے ہیں ان کا حقیقی اندازہ لگانا تو ممکن ہی نہیں۔ ہم ذیل میں چند آثار سیئہ کا ذکر کرتے ہیں تاکہ قارئین کو صورت حال کا کچھ اندازہ ہو سکے "إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت وما توفيقي إلا بالله عليه توكلتُ وإليه أنيب".

نا اہل مفتیوں کے فتاوٰی سے علمی و دینی نقصانات

ا۔ دین کے نام پر حدودِ الٰہی کی پائمالی:

اہل دین و ایمان کے لئے یہ صورت حال انتہائی اذیت ناک ہوتی ہے جب ان کی موجودگی میں دین و شریعت کے نام پر نااہل اور اباحیت پسند بزعم خویش مفتیوں کے خانہ ساز فتووں اور بے اصل اجتہادات کے سہارے حدود الٰہی پائمال کی جاتی ہیں، حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا جاتا ہے، ہمارے معاشرے میں اس کی مثالوں کی کمی نہیں، حتیٰ کہ "اس بازار" کی رونقیں بھی جواز متعہ کے مکروہ فتاویٰ کی وجہ سے قائم ہیں۔ سودی معیشت کو فروغ دینے کے لیے سرکاری ملاؤں، علماء سوء اور شہرت، جدت اور ترقی کے خولیا میں مبتلاء مفتیوں کے فتاویٰ بنکوں اور دیگر سودی اور جوئے کے اداروں کا رأس المال ہیں۔ عورت و مرد کی دیت میں فرق، اسلام میں رجم کی سزا کے خلاف مستشرقین اور اہل مغرب کے آلۂ کار بعض حضرات نے جو فتاویٰ دیے اور اسلام کی حقیقی تعلیمات کے خلاف جو طوفان بدتمیزی کھڑا کیا اور انہیں "روایتی اسلام" کہہ کر اس کا جو تمسخر اڑایا وہ وطن عزیز کی تاریخ کا سیاہ باب ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے لوگوں کو جس طرح ذلیل و رسوا کیا وہ بھی نشان عبرت ہے۔ جن کو خوش کرنے کے لیے حدود الٰہی اور نصوص شریعت کے خلاف ہرزہ سرائی کی گئی انہی کو اللہ تعالیٰ نے ان کی رسوائی کا سامان بنا دیا۔ الغرض نااہل لوگوں کے فتاویٰ سے حدود الٰہی کی حرمت مجروح ہوتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴾ (النحل: ١١٦)

"کسی چیز کو اپنی زبان سے جھوٹ موٹ نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھنے لگو، بے شک اللہ پر بہتان باندھنے والے کامیابی سے محروم ہی رہتے ہیں۔"

« عَنْ أَبِي ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ: « إِنَّ اللَّهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوهَا، وَ حَدَّ حُدُودًا فَلَا تَعْتَدُوهَا، وَ حَرَّمَ أَشْيَاءَ فَلَا تَنْتَهِكُوهَا، وَ

سَكَتَ عَنْ أَشْيَاءَ رَحْمَةً بِكُمْ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا .»

(رواه الدار قطني وغيره والحديث حسن)

''ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ راوی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ نے کچھ فرائض مقرر کئے ہیں، انہیں ضائع نہ کرو، اور کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزیں حرام قرار دی ہیں ان کی بے حرمتی نہ کرو، اور کچھ چیزوں کے بارے میں خاموشی اختیار فرمائی ہے۔ بھول سے نہیں بلکہ تم پر رحم فرماتے ہوئے۔ سوان کے بارے میں بحث و تکرار نہ کرو۔''

۲۔ دین اور احکام دین کے بارے میں جاہلانہ جرأت:

نااہل مفتیوں کے فتاویٰ سے سائل میں بے جا جرأت پیدا ہوجاتی ہے اور اس میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ کسی بھی مسئلہ میں فتویٰ کے ذریعہ اپنی مرضی کی راہ نکل سکتی ہے، اس سے خشیت الٰہی میں کمی آ جاتی ہے، اللہ کی نگرانی کا احساس ماند پڑ جاتا ہے اور احکام شریعت کا احترام کم ہوجاتا ہے۔ ہواؤ ہوس کی پیروی کی راہیں کھلتی ہیں اور بالآخر انسان معصیت کی دلدل میں دھنس جاتا ہے۔ اور اسے اس کا شعور بھی نہیں ہوتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پر بے علمی سے کچھ کہنے کو فواحش و منکرات اور شرک جیسے بدترین اعمال کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَ الْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ أَنْ تُشْرِكُوا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَّ أَنْ تَقُولُوا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ . ﴾

(الأعراف ۳۳)

''کہہ دیجئے! میرے رب نے تو بے حیائی کی باتوں کو ظاہر ہوں یا باطن اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو حرام کیا ہے اور اس کو بھی کہ تم کسی کو اللہ کے ساتھ شریک بناؤ جس کی اس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اس کو بھی کہ اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں علم نہ ہو۔''

۳۔ اس سے حق کے لبادے میں باطل کی نشر و اشاعت ہوتی ہے:

نااہل مفتیوں کے فتاویٰ سے حق کے لبادے میں باطل کی نشر و اشاعت ہوتی ہے، یہ تلبیس ابلیس ہے۔ اور حق کے نام پر اللہ کی مخلوق کو گمراہ کرنے کا علماء سوء کا بدترین طریقہ ہے۔ عصر حاضر میں بالخصوص علامہ قرضاوی

کے انٹرنیٹ پر نشر ہونے والے فتاویٰ کچھ اسی نوعیت کے ہیں۔ باطل اور گمراہی کی نشر و اشاعت میں علماء سوء کے فتاویٰ کا جو کردار ہے وہ شاید کسی بڑے سے بڑے بے دین ادارے کا بھی نہ ہو۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اتباع حق کی تاکید کی ہے اور ظن کی پیروی سے منع فرمایا ہے۔

﴿ قل الله يهدى للحق أفمن يهدى إلى الحق أحق أن يتبع أمن لا يهدى إلا أن يهدى فما لكم كيف تحكمون. وما يتبع أكثرهم إلا ظنا إن الظن لايغنى من الحق شيئا إن الله عليم بما يفعلون. ﴾ (يونس ٣٥-٣٦)

''کہہ دو! اللہ حق کا راستہ دکھاتا ہے۔ بھلا جو حق کا راستہ دکھائے وہ اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ کہ جب تک کوئی راستہ نہ بتائے، راستہ نہ پائے، تو تم کو کیا ہوا ہے؟ کیسا انصاف کرتے ہو، اور ان کے اکثر صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور کچھ شک نہیں کہ ظن حق کے مقابلے میں کچھ بھی کارآمد نہیں ہوسکتا۔ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے واقف ہے۔''

« عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْه قَالَ : سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰه ﷺ يَقُوْلَ : « إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انتزاعا ينتزعه من العباد، وَ لٰكِنْ يَقْبِضُ الْعُلَمَاءَ ، حَتّٰى إذا لم يبق عالما، اتخذ الناس رؤسا جهالا، فسئلوا فأفتوا بغير علم، فضلوا وأضلو. » [1]

''عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں سے چھین نہیں لے گا۔ لیکن علماء کو قبض کر کے علم کو اٹھا لے گا، حتیٰ کہ جب کسی عالم کو باقی نہیں چھوڑے گا، لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنا لیں گے، تو ان سے سوال کئے جائیں گے تو وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔''

۴۔ امت صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتی ہے:

بلاشبہ ہر طرح کی خیر سلف صالحین کی اتباع میں ہے۔ کیونکہ ان کا منہج استدلال و عمل خالص کتاب وسنت پر مبنی ہے، اسی میں دنیا و آخرت کی فلاح وسعادت ہے جب کہ بدعت ہر برائی کی اساس ہے۔ نااہل لوگوں کے

[1] (اخرجه البخاری فی العلم برقم ۱۰۰ ومسلم فی العلم برقم ۲٦۷۳)

فتاویٰ اتباع سلف اور جادۂ حق سے روگردانی کا باعث بنتے ہیں اور ان سے بدعات کی راہیں کھلتی ہیں۔ رسالت مآب ﷺ نے مذکورہ بالا حدیث میں صریح الفاظ کے ساتھ اس کی نشاندہی فرمادی ہے:

﴿ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ . ﴾ (التوبة:٤٢)

''تاکہ جو مرے بصیرت پر (حق کو جان کر) مرے اور جو جیتا رہے وہ بھی بصیرت پر جیتا رہے۔''

۵۔ امت علماءِ حق سے دور ہو جاتی ہے:

نااہل مفتیوں کے فتاویٰ امت کا اہل علم وفضل، اصحاب ورع وتقوی، علماء حق اور ثقہ فقہاء و مجتہدین سے رابطہ منقطع کر دیتے ہیں۔ جن اہل علم وعمل مجتہد مفتیان کرام کی بدولت امت اسلامیہ رشد و ہدایت پر قائم ہے، ان سے وابستگی امت کی سعادت ونیک بختی ہے، ان سے دوری ہلاکت کی راہ ہے، دورحاضر میں یہ رسم چل نکلی ہے کہ ہر بلند بانگ خطیب، رنگین قصص واعظ سیم وزر کے زور پر تشہیر کا ماہر مفتی بن بیٹھا ہے۔

اب رہی نہ آبروئے شیوۂ اہل نظر

کسی کو یہ توفیق نہیں کہ امت کا درد محسوس کرے، اس کے حال پر رحم کرے، نصیحت سے کام لے اور سائل کو اہل علم وفضل کی راہ دکھائے کہ اس میں اس کا بھی بھلا ہے اور دوسروں کا بھی، مگر افسوس کہ جن کی بے علمی کے شاخسانے سراسر افسانے ہیں وہ بھی اپنے افتاء کا ڈھنڈورا پیٹتے نہیں شرماتے۔ جیسے فٹ پاتھوں پر نجومی پروفیسروں سے ''جو چاہو سو پوچھو'' کے بورڈ نظر آتے ہیں ویسے ہی ان جاہل و جری مفتیوں کے سر بازار کپڑے کے بڑے بڑے بینر آویزاں نظر آ جاتے ہیں کہ فون کریں اور مسئلہ پوچھیں دونوں میں قدر مشترک دین الٰہی کے بارے میں جاہلانہ جرأت، قلت حیاء اور وحی الشیطان ہے۔ ولا حول ولا قوة إلا بالله.

﴿ وَلَوْ رَدُّوْهُ إِلَى الرَّسُوْلِ وَإِلٰى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهُ مِنْهُمْ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَا تَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيْلًا . ﴾ (النساء٨٣)

''اور اگر اس کو رسول ﷺ اور اپنے اولی الامر کے پاس پہنچاتے تو وہ لوگ اس کو سمجھ لیتے جو استنباط کر سکتے ہیں۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو چند اشخاص کے سوا سب شیطان کے پیرو ہو جاتے۔''

ایک مخلصانہ نصیحت:

ہمارے مؤقر تعلیمی اداروں، علمی مراکز، دینی تنظیموں اور اسلامی جماعتوں کے ذمہ داروں کا فرض ہے کہ وہ ذاتی تعلقات اور شخصی و تنظیمی مفادات سے بالا ہو کر اخلاص و سنجیدگی سے اس صورت حال کا جائزہ لیں، اہل و نااہل میں فرق کو سمجھیں، ہر کس و ناکس کی فتویٰ نویسی کی حوصلہ شکنی کریں، اسے اپنی نوازشوں کا حصہ نہ بنائیں، اِفتاء کے قابل قدر ادارہ کی آبرو کا پاس کریں، اسے منظّم کریں اس کی حرمت بحال کریں، اس میں مشاورت کی روایت کا احیاء کریں، مفتی کی اہلیت و استعداد پرکھنے اور اسے متعارف کرانے کو رواج دیں، نااہل مفتیوں کے چنگل سے قوم کو آزاد کرائیں۔ اس سے فتویٰ کی عظمت رفتہ بحال ہوگی، کلمۂ حق کا مقام و مرتبہ اجاگر ہوگا، دین و شریعت کا وقار دلوں میں جگہ پکڑے گا۔ ان شاء اللہ.

﴿ ذٰلِكَ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ . ﴾ (الحج: ۳۲)

''ایک یہ ہے اور دوسرا جو شخص اللہ کی نشانیوں کی عزت وحرمت کرے یہ دلوں کے تقوی کی وجہ سے ہوتا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿ ذٰلِكَ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ عِنْدَ رَبِّهِ . ﴾ (الحج: ۳۰)

''یہ ہے اور جو کوئی اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کرے اس کے لئے اس کے رب کے ہاں بہتری ہے۔''

ہمارے مذہبی رسائل و جرائد نے یہ رسم اختیار کر لی ہے کہ ہر سوال کے جواب کو فتویٰ باور کراتے ہیں، اپنی اشاعت بڑھانے کے لئے شاذ اقوال اور نادر آراء کو اچھالتے ہیں۔ جس سے ایک طرف اختلاف وافتراق کو شہ ملتی ہے اور دوسری طرف فتویٰ کی حرمت مجروح ہوتی ہے، افتاء کے لفظ کو اجتہادی فکر وفہم اور بصیرت کے حامل علمی جوابات تک ہی محدود رکھا جائے تو لوگوں میں اہل علماء اور نا اہل مفتیوں میں فرق کرنے کا سلیقہ پیدا ہو۔ وعند الله فی ذاك الجزاء .

﴿ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ . ﴾ (الزمر: ۹)

''کہہ دیجئے! کیا جو لوگ جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے برابر ہو سکتے ہیں۔ نصیحت تو صرف عقل مند ہی حاصل کرتے ہیں۔'' ﴿ سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ . ﴾

مستفتی اور استفتاء

سائل کی فضیلت اور سوال کا سلیقہ:

علم اور حصولِ علم کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جہاں علم کی فضیلت بیان فرمائی وہاں اس کے حصول کی تاکید بھی کی ہے۔ فرمایا:

﴿ وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا . ﴾ (البقرہ: ٢٦٩)

''اور جس شخص کو دانائی دے دی گئی پس وہ بڑی بھلائی سے نوازا گیا۔''

فرمایا:

﴿ فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ . ﴾ (النحل: ٤٣)

''پس اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھ لو۔''

نیز فرمایا:

﴿ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ . ﴾ (التوبۃ: ١٢٢)

''تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تاکہ دین میں سمجھ حاصل کرتے۔''

خشیت الٰہی اور اخلاص کے ساتھ آنیوالے کی طرف توجہ کا حکم اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو بھی دیا۔

فرمایا:

﴿ وَ أَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى O وَ هُوَ يَخْشٰى Oفَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى . ﴾ (عبس: ٨۔١٠)

''اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آیا اور اللہ سے ڈرتا ہے، اس سے تم بے رخی کرتے ہو۔''

طالب حق کی فضیلت اور اس کی خیر خواہی کی تاکید احادیث نبویہ میں بہت کچھ آئی ہے۔

« عَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : « مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَ إِنَّمَآ أَنَا قَاسِمٌ وَ اللّٰهُ يُعْطِيْ . » (متفق علیہ)

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اسے دین میں سمجھ عطا فرما دیتے ہیں اور اللہ (علم) عطا فرماتا ہے اور میں تقسیم کرنے والا ہوں۔''

گویا جو شخص دین اور اس کے قواعد نہیں سیکھتا، وہ اللہ کی جود و عطا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم جیسی بے مثال خیر سے محروم ہے۔

«عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :« مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ بِهِ طَرِيْقًا إِلَى الْجَنَّةِ .» (رواہ مسلم)

''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص علم کی تلاش کے لئے کسی راستہ پر چلا اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے جنت کی راہ اس کے لئے آسان فرما دیتے ہیں۔''

فتویٰ طلب کرنے والا سائل بھی چونکہ علم دین سیکھنے اور اس پر عمل کرنے کی غرض سے ہی مفتی و عالم کی طرف رجوع کرتا ہے، بشرط اخلاص، حسن نیت وہ بھی ان تمام فضائل اور بشارتوں کا مستحق ہے۔ سوال اگر واقعاتی اور شریعت کا فکر و فہم اور عملی تصور معلوم کرنے کے لئے ہو تو حصول علم کا بہترین ذریعہ ہے اور بذات خود عبادت بھی۔ مثلاً:

- قرب الٰہی کی مبارک راہیں تلاش کرنے کے لئے۔
- فہم قرآن و سنت کے لئے۔
- اتباع رسول میں تسہیل کے لئے۔
- حصول جنت کے اسباب کے متعلق۔
- جہنم سے بچاؤ کی تدبیروں کے بارے میں۔
- حلال و حرام میں تمیز کے لئے۔
- کوئی نیا عمل سامنے آئے تو اس کی صحت و خطاء کے بارے میں۔
- کوئی نئی صورت حال سامنے آئے تو اس میں راہ حق و صواب معلوم کرنے کے لئے۔
- باہم تنازعات کی صورت میں صحیح فیصلہ تک رسائی کے لئے۔
- سوالات کی ان تمام نوعیتوں کا ذکر احادیث میں آیا ہے، اختصار پیش نظر ہے ورنہ ان احادیث کا ذکر

کر دیا جاتا۔

جیسے سلیقے سے سوال کا حکم دیا گیا ہے ویسے ہی بے جا سوالوں کی شریعت میں حوصلہ شکنی کی گئی ہے، مفتی حضرات کا فرض ہے کہ جواب سے قبل سوال کا جائزہ لیں، مناسب اور موزوں ہے؟ قابل تصحیح ہے؟ یا نا قابل جواب؟ ہم ذیل میں اس نوعیت کے سوالات کی نشاندہی کرتے ہیں جنہیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے تاکہ مستفتی اور سائل آداب سوال سے آراستہ ہو سکے، حصول علم اور طلب حق کا سلیقہ اپنا سکے، اس سے مجالس علم کا حسن دوبالا ہوتا ہے۔

بے مقصد اور کثرت سوال سے اجتناب:

« عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ:« دَعُونِي مَا تَرَكْتُمْ إِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ سُؤَالُهُمْ وَاخْتِلَافُهُمْ عَلَىٰ أَنْبِيَائِهِمْ، فَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَاجْتَنِبُوهُ وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ .»

(رواه البخاري في الاعتصام بالكتاب والسنة برقم ٦٨٥٨ ومسلم في الحج وفي الفضائل برقم ١٣٣٧)

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: چھوڑ دو مجھے جب تک میں تمہیں چھوڑے رکھوں، تم سے پہلے لوگوں کو ان کے سوال کرنے اور اپنے انبیاء پر اختلاف نے ہلاک کیا، سو جب میں کسی شئ سے تمہیں روک دوں تو اس سے اجتناب کرو اور جب میں تمہیں کسی امر کا حکم دوں تو جس قدر ہو سکے اسے بجالاؤ۔“

گویا اس حدیث مبارک میں مستفتی کے لئے ایک قابل عمل طریقہ کار متعین کر دیا گیا ہے۔

یعنی کتاب و سنت پر حسب امکان نظر رکھے، جس قدر علم ہو مامورات پر عمل پیرا ہو، حسب توفیق منہیات سے اجتناب کرے، اس طریقہ کار اور عملی منہج کا تقاضا ہے کہ

1. علم دین صرف کتاب و سنت سے سیکھے، فرائض، واجبات اور منہیات و محرمات کا یہی واحد مصدر ہے۔
2. عملی زندگی میں اس کا التزام بھی کرے۔ اس طریق کار کے نتیجے میں ایک مومن کی زندگی سراسر تعلیم و تعلم اور تطبیق و اطلاق سے تعبیر ہو جاتی ہے جس سے تزکیہ نفس اصلاح احوال اور تعمیر شخصیت کی راہ ہموار ہوتی ہے اور حصول رضاء الٰہی انسان کی منزل قرار پاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طریق کار پر کار بند رہنے کی تاکید فرمائی اور اس کی مخالفت سے احتراز کا حکم دیا اور کثرت سوال کو اس منہج

سلیم کے منافی قرار دیا۔

« عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِيْ وَقَّاصٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :« إِنَّ أَعْظَمَ الْمُسْلِمِيْنَ فِي الْمُسْلِمِيْنَ جُرْمًا مَنْ سَأَلَ عَنْ شَيْءٍ لَمْ يُحَرَّمْ عَلَى النَّاسِ فَحُرِّمَ مِنْ أَجْلِ مَسْئَلَتِهِ .» (متفق علیه)

"حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسلمانوں میں سب سے بڑھ کر مجرم وہ شخص ہے جس کے سوال کی وجہ سے کوئی حلال چیز حرام ہو گئی۔"

رسالت مآب ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اس حدیث میں مذکور صورت کا تو امکان نہیں رہا مگر اس سے بے مقصد اور بکثرت سوال کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔

ناپسندیدہ سوالات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ا۔ مفتی کو الجھانے اور عاجز ثابت کرنے کے لیے سوالات کرنا:

تقریباً سبھی انبیاء کرام علیہم السلام کو اپنی اپنی امتوں کی طرف سے اس قسم کے سوالات سے واسطہ پڑا، وہ لوگ صرف تکلف اور سرکشی کے لیے سوال کرتے تھے۔ مثلاً:

بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے گائے کے متعلق پے درپے سوالات کیے، وہ چونکہ سرکشی کا شکار تھے۔ فرماں برداری نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ﴿ وَ مَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ .﴾ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس حرکت پر ان کی مذمت فرمائی اور امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کو اپنے نبی کے ساتھ اس طرح کی گستاخی کرنے سے منع فرمایا۔

﴿ أَمْ تُرِيْدُوْنَ أَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ وَ مَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيْلِ .﴾ (البقرہ: ۱۰۸)

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول ﷺ سے اس طرح کے سوال کرو جس طرح کے سوال پہلے موسیٰ علیہ السلام سے کیے گئے تھے اور جس شخص نے ایمان کی بجائے کفر اختیار کیا وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔"

بنی اسرائیل کے سوالوں کی طرح کے کچھ سوالات اہل کتاب نے رسول اللہ ﷺ سے بھی کیے۔ فرمایا:

﴿ يَسْئَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَقَدْ سَأَلُوْا مُوْسٰى أَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْا أَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ .﴾ (النساء: ۱۵۳)

''(اے محمد ﷺ) سوال کرتے ہیں تجھ سے اہل کتاب کہ تو ان پر آسمان سے ایک لکھی لکھائی کتاب اتار لائے، تو یہ لوگ موسیٰ سے اس سے بھی بڑے سوال کر چکے ہیں، سو انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں اللہ کو ظاہر کر کے دکھاؤ، سو ان کے ظلم (اس سوال) کی وجہ سے ان کو بجلی نے آ پکڑا۔''

اسی نوعیت کے متعدد باغیانہ سوالات کفار مکہ نے بھی رسول اللہ ﷺ سے کیے:

﴿ وَ قَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَلَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوْعًا. أَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا. أَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا. أَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا. ﴾ (الاسراء ۹۰ - ۹۳)

''اور کہنے لگے ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہمارے لئے تو زمین میں سے چشمہ جاری نہ کردے۔ یا تمہارے لئے کوئی کھجوروں اور انگوروں کا باغ نہ ہو۔ اور اس کے بیچ میں نہریں نکال لاؤ، یا جیسا تمھارا خیال ہے ہم پر آسمان کے ٹکڑے لا گراؤ، یا اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آؤ، یا تمھارا سونے کا گھر ہو، یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور ہم تمھارے چڑھنے کو بھی نہیں مانیں گے جب تک کوئی کتاب نہ لاؤ جسے ہم پڑھ بھی لیں۔ کہہ دو! میرا رب پاک ہے میں تو صرف ایک بشر رسول ہوں۔''

لہٰذا اس قسم کے فضول اور بے مقصد سوالات سے گریز کرنا ضروری ہے جس کا بندے کو دنیا و آخرت میں کوئی فائدہ نہ ہو مثلاً: عذاب قبر کے بارے میں بے جا سوالات، حوا کی قبر کے بارے میں کرید کرنا، یوسف علیہ السلام اور زلیخا کے نکاح کے بارے میں سوالات کرنا، عبادت کے فلسفے پوچھنا، تقدیر کے بارے میں علم الٰہی پر اعتراض کرنا وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ علم اور اہل علم کا مذاق اڑانے کے لئے سوال کرنا:

« عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قال: كان قوم يسألون رسول الله ﷺ استهزاء فيقول الرجل: من أبي؟ ويقول الرجل: تضل ناقته، أين ناقتي؟ فأنزل الله فيهم هذه

الآية: ﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ . ﴾ ❶

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مذاق اڑانے کے لئے اس قسم کے سوال کرتے تھے۔کوئی کہتا میرا باپ کون ہے؟ کسی کی اونٹنی گم ہو جاتی تو پوچھتا میری اونٹنی کہاں ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمادی: ﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ . ﴾ الخ (اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں سوال مت کرو کہ اگرتم پر وہ ظاہر کردی جائیں تو تمہیں بری لگیں)۔''

اس آیت کا سبب نزول اس کے علاوہ کوئی ملے تو اسے تعارض پر محمول نہ کریں۔ ایک آیت کے ایک سے زیادہ سبب نزول بھی ہو سکتے ہیں۔ نیز آیت ایک سے زیادہ بار بھی نازل ہوسکتی ہے۔

﴿ وَالرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ آمَنَّا بِهِ . ﴾ (آل عمران: ۷)

۳۔ بلاضرورت تفصیلات معلوم کرنے کی کوشش کرنا:

جیسے بنی اسرائیل نے گائے کے بارے میں تفصیلات جاننے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے لئے مشکلات پیدا کیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی طرف سے فرضیت حج بیان کی، اور فرمایا:

« يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ الْحَجَّ فَحُجُّوْا . »

''لوگو! بے شک اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے سو حج کرو۔''

ایک صحابی نے عرض کی اللہ کے رسول! کیا ہر سال حج فرض ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار کی۔ اس شخص نے تین بار یہ سوال دہرایا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ ، وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ . »

''اگر میں ''ہاں'' کہہ دیتا تو حج ہر سال فرض ہو جاتا اور تم اس کی طاقت نہ رکھتے۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' سابقہ امتیں سوالات اور انبیاء سے اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔جس چیز کو میں چھوڑ دوں آپ بھی اسے چھوڑ دیں۔'' (مسلم) یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

مثلاً: اصحاب کہف کے اسماء گرامی اور پھر ان کے کتے کا نام جاننے کی کوشش کرنا، ایسے ہی انبیاء کرام علیہم السلام

❶ (المائدہ: ۱۰۱، رواہ البخاری فی صحیحه)

کے فضلات کی طہارت ونجاست اور نبی ﷺ کے سائے کے بارے میں سوال کرنا، ان سوالات کے ساتھ انسان کی دین و دنیا کی کوئی مصلحت وسعادت وابستہ نہیں، اور نہ ہی ان کے نتیجے میں کوئی مفید علم حاصل ہوتا ہے۔ ادب کا تقاضا ہے کہ سائل مفتی پر پیش کرنے سے پہلے اپنے سوال پر اخلاص سے غور کرلے، کہ کس حد تک اس کی ضرورت ہے۔

۴۔ غیبی اور مخفی امور کے بارے میں سوالات:

مثلاً ایسے امور کے بارے میں جاننے کی کوشش کرنا جن کا علم اللہ نے کسی کو نہیں دیا۔ فرمایا:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّا ذَا تَكْسِبُ غَدًا وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ ، إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ . ﴾

(لقمان ٣٤)

''بے شک اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے، وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے؟ کوئی شخص نہیں جانتا کہ کل کیا کمائے گا اور کوئی نفس نہیں جانتا کہ کس سرزمین پر اسے موت آئے گی، بے شک اللہ ہی جاننے والا، خبردار ہے۔''

سو ان امور کے بارے میں فتوے پوچھنا، اس قسم کے دوسرے مسائل کریدنا مثلاً روح کے بارے میں جاننے کی کوشش، کسی جزوی بات کا ناقص علم ہو جائے تو اس پر اترانا یا علم الٰہی پر کوئی اعتراض کرنا سراسر گمراہی اور بدنصیبی ہے۔ اس قسم کے سوالات سے احتراز اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور حصول علم و استفتاء کا ادب ہے۔

۵۔ شیطانی وسوسوں اور واہموں کی بنیاد پر سوال کرنا:

انسان اگر وسوسوں کی دلدل میں پھنس جائے تو اس میں دھنستا ہی چلا جاتا ہے، ہر گھڑی نئی سوچیں ہر پل نئے خیالات، ان کی کوئی ابتدا، نہ انتہاء، ان کی بنیاد پر گفتگو شروع کر دے تو پاگل یا نیم پاگل ٹھہرے۔

نبی اکرم ﷺ نے مثال دے کر سمجھایا اور اس تکلیف دہ صورت حال سے نکلنے کا راستہ بھی بتایا:

« عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ « يَأْتِي الشَّيْطَانُ الْعَبْدَ أَوْ أَحَدَكُمْ فَيَقُوْلُ مَنْ خَلَقَ كَذَا وَ كَذَا ، حَتّٰى يَقُوْلَ : مَنْ خَلَقَ رَبَّكَ ؟ .» (رواه البخاري ومسلم) وَ فِيْ رِوَايَةِ الْبُخَارِيْ :« فَإِذَا بَلَغَهٗ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ وَ لْيَنْتَهِ .» وَ فِيْ لَفْظٍ لِمُسْلِمٍ : « فَمَنْ

وَجَدَ ذٰلِكَ شَيْئًا فَلْيَقُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ .»

’’انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: شیطان بندے یا تم میں سے کسی ایک کے پاس آتا ہے، کہتا ہے فلاں فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا، حتیٰ کہ کہتا ہے تیرے رب کو کس نے پیدا کیا، صحیح بخاری میں اس کے بعد یوں ہے، جب بات یہاں تک پہنچ جائے تو انسان کو چاہئے کہ اللہ کی پناہ میں آئے اور سوالات سے رک جائے، مسلم شریف کے الفاظ اس طرح ہیں، جو شخص ایسی صورت حال سے دوچار ہوا سے چاہئے کہ یوں کہے ’’آمنت باللہ‘‘ میں اللہ پر ایمان لایا۔‘‘

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ علاج بتانے کا مطلب یہ ہے کہ شیطانی وسوسوں کی تو کوئی حد ہی نہیں آپ اس کی دلیل کا جواب دیں گے تو وہ کوئی اور وسوسہ ڈال دے گا، اہل ایمان کو فتنوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کرنا شیطان کا مشغلہ ہے، اس کا واحد اور بہترین علاج تعوذ باللہ اور اس کی بات کی طرف توجہ نہ دینا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ إِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ .﴾ (الاعراف: ۲۰۰)

’’اور اگر شیطان کی طرف سے تمہارے دل میں کسی طرح کا وسوسہ پیدا ہو تو اللہ سے پناہ مانگو، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔‘‘

اس سے شیطان غمگین ہوتا، روتا اور ذلیل ہوتا ہے۔

لہٰذا اس قسم کے فضول سوالات جن کی حیثیت شیطانی وسوسوں سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں، ان کا اظہار اور ان کی بنیاد پر مفتی حضرات سے فتویٰ مانگنا آداب استفتاء کے منافی ہے۔

۶۔ مفروضوں پر مبنی غیر واقعی سوالات کرنا:

حقیقت میں یہ بھی شیطانی وساوس کا حصہ ہی ہے، اہل حدیث اور اہل الرائے کے مابین یہ وجہ نزاع بھی تھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مفروضے قائم کر کے فتوے جاری کرنے کا رواج قطعاً نہ تھا نہ ہی اسلام کے عمومی مزاج سے یہ بات موزوں لگتی ہے۔ جماعت محدثین نے اصحاب رسول رضی اللہ عنہم کے اس طرز فکر وعمل اور طریق اجتہاد کو قائم رکھا۔

حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے جو واقع نہیں ہوا اس کے بارے میں سوال نہ کرو کہ میں نے عمر رضی اللہ عنہ کو سنا انہوں نے ایسے سائل پر لعنت بھیجی۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے کوئی سوال کرتا تو پوچھتے کہ یہ امر واقع ہے؟ اگر کہا جاتا کہ نہیں واقع ہوا تو فرماتے چھوڑو جب ہو گا تب دیکھیں گے۔ اس قسم کے متعدد آثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ماثور ہیں۔ (ملاحظہ ہو: جامع العلوم والحکم لابن رجب ص ۸۷ نیز فتح الباری لابن حجر ۱۳/۷۶۶)

مگر فقہاء اہل عراق کے ہاں اس فکر کو کافی پذیرائی حاصل ہوگئی تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ بعض اوقات وہ لوگ اس فکری وسعت اور فقہی وتفنی مفروضوں کی وجہ سے نصوص پر بھی ہاتھ صاف کر جاتے تھے۔اس طرز استفتاء و افتاء نے اسلام کے فقہی ذخیرے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور وہ لادین عناصر کے تمسخر کا نشانہ بنا، اسلامی فکر و فقہ کو سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اسلام کی جامعیت کا روشن تصور دھندلا گیا، اور کج فکر لوگوں میں عجمی تصور اجتہاد کو پنپنے کا موقع ملا، نتیجتاً دلوں میں نصوص کتاب وسنت یعنی وحی الٰہی کی عظمت کمزور پڑ گئی، اور مسائل کو سلجھانے کا فطری طریقہ کار محدود سے محدود تر ہوتا چلا گیا، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ فقہی و اجتہادی انداز بھی پچھلوں میں متاثر ہوا کہ مسائل کے حل کو نفس زندگی سے الگ کوئی حیثیت نہ دی جائے بلکہ انسانیت کی مختلف دینی واخلاقی اور روحانی سمتوں کو پیش نظر رکھ کر ہی فیصلہ کیا جائے۔

الغرض محدثین کرام کو "أرأیت إن کان کذا" (یعنی اگر ایسا ہو جائے تو تمہاری کیا رائے ہوتی) سے سخت چڑ تھی، امام شعبی رحمہ اللہ جو محدثین کے مکتب فکر کے نامور فقیہ تھے فقہاء عراق کو از راہ طنز "ألأرأیتیون" کے نام سے پکارتے تھے اور فرماتے کہ میرے نزدیک اس سے بڑھ کر ناپسندیدہ کلمہ کوئی نہیں۔(أرأیت)

محدثین کا خیال تھا کہ مسائل کی فطری رفتار سے تجاوز نہ کیا جائے بلکہ افتاء واستفتاء کی صلاحیتوں کو انہی حدود تک محدود رکھا جائے جن کی کتاب وسنت میں اجازت ہے، ورنہ وحی کی حرمت پر حرف آنے کا خطرہ ہے۔اور ایسا ہوا بھی، کتنی نصوص صریحہ وصحیحہ ان مفروضوں اور موہومہ اصولوں کی بھینٹ چڑھیں۔

« عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْه قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : « مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ .» (قال النووی حدیث حسن رواہ الترمذی وغیرہ ھکذا)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لایعنی چیزوں سے سروکار نہ رکھنا بندے کے اسلام کے حسن کا حصہ ہے۔"

قرآن حکیم میں بھی لوگوں کے غیر متعلقہ سوالات سے صرف نظر کر کے انہیں مفید جوابات دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا غیر واقعی، غیر مفید اور مفروضوں پر مبنی سوالات سے اجتناب کتاب وسنت کی تعلیم اور سلف صالح کا طرز عمل ہے۔

الإفتاء

جواب کا قرینہ یعنی فتویٰ دینے کے آداب:

مفتی کو جیسے اپنے ادب کا پاس ہے، وہ یہ بھی نہ بھولے کہ کس عظیم ذات والا صفات کی ترجمانی کررہا ہے اور کس مکرم ومحترم شخصیت کی مسندارشادوتوجیہ اور مقام افتاء پرفائز ہے،اس کے ادب کے کیا قرینے ہیں؟ گویاادب کی پاسداری سائل سے مجیب پر ہزار گنا بڑھ کر ہے۔

لہٰذاہم ذیل میں ان اصول وضوابط کی کتاب وسنت کی روشنی میں نشاندہی کرنے کی کوشش کریں گے،فتویٰ دینے میں جن کی پاسداری آداب افتاء کا تقاضا ہے،اس سے جیسے اس منصب شریف سے وابستہ حضرات گرامی میں احساس مسئولیت کی تجدید ہوگی وہاں ہمارے اہل فکرونظراور متلاشیان حق کواندازہ کرنے میں بھی مدد ملے گی کہ محدثین کے مکتب فکر سے وابستہ ''فقہ الحدیث'' کے حامل فقہاء اہل حدیث اور مفتیان کرام کس درجہ اخلاص وسنجیدگی سے یہ فرض اداکرتے ہیں۔وباللہ التوفیق.

ا۔فتویٰ کی اساس صرف کتاب وسنت ہے:

تشریع یعنی شریعت مقررکرناصرف اللہ وحدہٗ کا حق ہے اور اس نے اپنے اس حق میں کسی کو شریک نہیں کیابلکہ اس کی تبلیغ ورسالت کے لئے بھی اپنے خاص اور چیدہ وبرگزیدہ بندے مقرر فرمائے، لہٰذا اس کی غیرمشروط پیروی واجب ہے اوراس کے علاوہ کسی بھی شریعت،عرف وعادت اور خودساختہ نظام کی کوئی حیثیت نہیں، بلکہ کوئی ایسانظام،دستوراور قانون جواللہ کی طرف سے نازل کردہ شریعت کے منافی ہواسے ترک کرنا،اوراس پرعمل نہ کرنا بھی اسی طرح فرض اور واجب ہے جس طرح احکام شریعت حقہ پرعمل کرنافرض اور واجب ہے،اس کے بغیرتوحید کی تکمیل نہیں ہوسکتی، جسے شریعت کے کسی حکم کا علم ہوجائے،اللہ نے اس پراس کی اتباع فرض کردی ہے،اب اس کے پاس سمع وطاعت کے بغیرکوئی چارہ کاراور راہ نجات نہیں،اپنی ذات پربندے کےحق اوراپنے امورومعاملات میں اس کے اختیارکی اللہ نےنفی کردی ہے۔فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ

أَمْرِهِمْ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴾ (الأحزاب:٣٦)

''اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی امر مقرر کر دیں تو اس کام میں اپنا بھی کوئی اختیار سمجھیں اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ راہ سے بھٹکا اور صریح گمراہی میں جا پڑا۔''

نیز فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَ أَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ﴾ (التوبة:١١١)

''بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کے جان و مال خرید لئے ہیں، اس کے بدلے میں ان کے لئے جنت ہے۔''

احکام دین و شریعت کے سامنے سمع و طاعت کو مومن کا شعار قرار دیا۔ فرمایا:

﴿ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا دُعُوْٓا إِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا وَ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (النور:٥١)

''مومنوں کی تو صرف یہی بات ہوتی ہے جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں۔ تا کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کریں۔ تو کہیں کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

یہ اور اس قسم کی متعدد نصوص اس کے علاوہ ہیں، جو واضح طور پر بتاتی ہیں کہ، خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل کردہ شریعت ہی اب واجب العمل ہے، اس کے علاوہ ہر شریعت کی پیروی کو اللہ نے اپنے بندوں پر حرام قرار دے دیا ہے، وہ کوئی منسوخ آسمانی شریعت ہو، یا انسانوں کا وضع کردہ اور خود ساختہ نظام، تورات کی تبدیل شدہ شریعت ہو یا انجیل کی تحریف شدہ شکل، انگریزی قانون ہو یا فرنسی و رومانی اور یونانی دستورِ حیات یا اسلام کے نام پر کتاب و سنت کو نظر انداز کر کے وضع کیا ہوا کوئی فقہی ذخیرہ سب کا ایک ہی حکم ہے، اور یہ سب صراط مستقیم کی مخالفت کے مختلف حیلے بہانے ہیں جو بالآخر انسانیت کی ہلاکت و بربادی پر منتج ہوتے ہیں۔ واجب الاتباع صرف صراط مستقیم ہے۔ جو سراسر سلامتی کی راہ ہے جو کسی خوش بخت کو ہی میسر آتی ہے۔ فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا إِلٰى دَارِ السَّلٰمِ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (يونس:٢٥)

''اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے، اور جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی ہدایت دیتا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَ أَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ. ﴾

(الانعام: ۱۵۳)

''اور بے شک یہی میری سیدھی راہ ہے، تو تم اسی کی اتباع کرنا، اور دوسرے راستوں پر نہ چلنا کہ ان پر چل کر اللہ کی راہ سے الگ ہو جاؤ گے۔''

« عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خَطًّا ثُمَّ قَالَ: « هٰذَا سَبِیْلُ اللّٰهِ .» ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطًا عَنْ یَمِیْنِهٖ وَ عَنْ شِمَالِهٖ وَ قَالَ : « هٰذِهٖ سُبُلٌ وَ عَلٰی كُلِّ سَبِیْلٍ مِنْهَا شَیْطَانٌ یَدْعُوْا إِلَیْهِ .» وَ قَرَأَ : ﴿ وَ أَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ . ﴾ [1]

''عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے، پھر اس کے دائیں اور بائیں کئی خطوط کھینچے اور فرمایا، یہ ایسے راستے ہیں، جن میں سے ہر راستے پر ایک شیطان مقرر ہے، جو اس کی طرف بلاتا ہے اور یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿ وَ أَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ . ﴾ ''

رسول اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تورات کا ورق دیکھ کر شدید غصہ کا اظہار کیا اور فرمایا:

« وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ ، لَوْ بَدَا لَكُمْ مُوْسٰی فَاتَّبَعْتُمُوْهُ وَ تَرَكْتُمُوْنِیْ لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِیْلِ وَ لَوْ كَانَ حَیًّا وَ أَدْرَكَ نُبُوَّتِیْ لَاتَّبَعَنِیْ .» (رواہ الدارمی)

''اس ذات گرامی کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر موسیٰ علیہ السلام آپ کے سامنے نمودار ہو جائیں اور تم لوگ مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرلو، تو بھی راہ راست سے بھٹک جاؤ، اور اگر وہ زندہ ہوتے اور میرا عہد نبوت پا لیتے تو وہ بھی میری پیروی ہی کرتے۔''

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" أجمع الناس على أن من استبانت له سنة رسول الله ﷺ لم يكن له أن يدعها

---

[1] (رواہ احمد والنسائی والدارمی وقال الالبانی فی التعلیق علی المشکوۃ واسنادہ حسن وصححہ الحاکم)

لقول أحد من الناس . " (أعلام المؤقعين ٢/٢٨٢)

لہٰذا مفتیانِ شرع متین کا فرض ہے کہ افتاء میں اس ادب کی پاسداری کریں، وحی الٰہی کی اولیت، اولویت اور فوقیت کو عملاً قبول کریں، مسائل کی راہنمائی صرف کتاب وسنت کی روشنی میں ہی کریں، علماء دین کی طرف رجوع کرنے والے لوگ اس حسن ظن اور ارادت مندی کی وجہ سے ہی ان کے پاس آتے ہیں کہ وہ انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی راہ بتلائیں گے۔ دیانت داری اور علمی امانت کا تقاضا ہے کہ حسن ظن کو ٹھیس نہ پہنچے۔ وباللہ التوفیق.

۲۔دوسرا ادب:شریعت سے رائے کا معارضہ نہ ہونے پائے:

بعض اوقات انسان ہوائے نفس کا شکار ہوجاتا ہے،وحی الٰہی اور نصوص شریعت پر عمل میں گرانی محسوس کرتا ہے،کوئی قرآنی حکم یا کوئی حدیث نبوی اس کے دل کو نہیں بھاتی، اس کی فہم وفراست اپنے لئے کسی دوسری راہ کو بہتر باور کرتی ہے،جیسا کہ سننے میں آتا ہے،کہ یہ بات دل کو نہیں لگتی، ذوق وجدان تسلیم نہیں کرتے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا ہوگا یا کیا ہوگا ،اب تمنائے خام، خواہشات نفس اور ذوق وجدان کی صحت وسقم کا کوئی معیار تو مقرر نہیں ،صرف شریعت ہی معیار ہے اسے وجدان کی سان پہ چڑھا دیا ، اس کج روی سے تو پوری شریعت کا ڈھانچہ ہی انسان کے لئے بکھر کر رہ جائے اور وہ ہلاکت کے گھڑے میں جاگرے،اس طرح کی صورت حال میں شریعت کو حکم اور فیصل مان کر رائے کا جائزہ لیناہی سلامتی کی راہ ہے،خواہشات نفس کی تکمیل کے لئے کتاب وسنت کو نظرانداز کرکے اقوال الرجال اور بے اساس فقہی آرا کا سہارا لے کر سائل کے لئے راہیں تلاش کرنا،اسے خوش کرنا یقیناً اتباع ہوا کی ذیل میں آتا ہے، جو آداب افتاء کے سراسر منافی ہے، اصحاب رسول ﷺ نصوص کی موجودگی میں رائے پر عمل کو بہت معیوب سمجھتے تھے، اس سے شدت کے ساتھ منع فرماتے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ .﴾ (ص: ٢٦)

''اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے،تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو اور خواہش کی پیروی نہ کیا کرو، خواہش کی پیروی تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔''

« وَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ :« لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ

هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ .» ❶

''عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:'' تم میں کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہش میری وحی کے تابع نہ ہو۔''

صحیح بخاری میں سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّهِمُوا رَأْيَكُمْ عَلَىٰ دِينِكُمْ لَقَدْ رَأَيْتُنِي يَوْمَ أَبِي جُنْدُلٍ، وَلَوْ أَسْتَطِيعُ أَنْ أَرُدَّ أَمْرَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ لَرَدَدْتُهُ .» (فتح الباری ۱۳ /۲۸۲)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

« إِيَّاكُمْ وَ أَصْحَابَ الرَّأْيِ فَإِنَّهُمْ أَعْدَاءُ السُّنَنِ ، أعيتهم الأحاديث أن يَحْفَظُوهَا ، فَقَالُوا بِالرَّأْيِ ، فَضَلُّوا وَ أَضَلُّوا .» ❷

''اصحاب رائے سے بچنا بلاشبہ وہ لوگ سنتوں کے دشمن ہیں، احادیث کو یاد کرنے سے وہ عاجز رہے تو رائے پر ہی فتویٰ دینے لگے، سو خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا:

« يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ الرَّأْيَ إِنَّمَا كَانَ مِنَ الرَّسُولِ ﷺ مُصِيبًا ، لِأَنَّ اللّٰهَ كَانَ يُرِيهِ وَ إِنَّمَا هُوَ مِنَ الظَّنِّ وَالتَّكَلُّفِ .» (جامع بيان العلم وفضله ابن عبدالبر ص ۴۴۲)

'' لوگو! بے شک رائے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے تو درست تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو دکھاتا تھا (''بما أراك الله'' کی طرف اشارہ ہے) اور ہماری طرف سے تو محض اٹکل اور تکلف ہی ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''إِنَّمَا هُوَ كِتَابُ اللّٰهِ وَ سُنَّةُ رَسُولِهِ فَمَنْ قَالَ بَعْدَ ذٰلِكَ شَيْئًا بِرَأْيِهِ فَمَا أَدْرِي أَفِي حَسَنَاتِهِ يَجِدُهُ أَمْ سَيِّئَاتِهِ . '' (جامع البيان ۲/۳۲)

''کتاب اللہ ہے یا سنت رسول اس کے بعد جس شخص نے اپنی رائے سے کوئی بات کی، مجھے معلوم

❶ (رواه في شرح السنة وقال النووي في الاربعين هذا حديث صحيح روينا في كتاب الحجة باسناد صحيح)

❷ (اخرجه البيهقي ورواه ابن عبدالبر في جامع بيان العلم وفضله بطرق ۴۴۳ وفتح الباري:۲۸۹/۱۳)

نہیں کہ وہ اسے اپنی نیکیوں میں پائے گا یا برائیوں میں۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رائے کی مذمت میں جو کچھ کہا ہے اس سے مراد رائے محض ہے جس کی کوئی اصل اور دلیل کتاب وسنت میں نہ ہو، فکر ونظر اور بحث وتحقیق کے بغیر بلا توقف جس کا اظہار کردیا جائے۔

یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کے خلاف ہے۔فرمایا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَ رَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ ﴾ (الحجرات: ١)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھ کر بات نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔''

اس سے بھی بدترین رائے ان لوگوں کی ہوگی جو نصوص شریعت سے واقف ہیں، اس کے باوجود ان کے مخالف آراء پر اعتماد کرتے ہیں، شخصیتوں کو دیکھ کر بلا دلیل قول پر عمل کرتے ہیں، نصوص کی حسب منشاء تأویلات کرتے ہیں، ظاہر ومتبادر معنی سے صرف نظر کرکے انہیں اپنی فاسد اور مفید مطلب رائے کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں، جس میں کبھی مذہبی تعصب کارفرما ہوتا ہے، کبھی عوام الناس کی خوشنودی اور کبھی مستفتی کا مالی ومعاشرتی مقام ومرتبہ، لیکن صورت حال جیسی بھی ہو افتاء کا ادب مفتی سے اتباع حق کا تقاضا کرتا ہے۔ بصورت دیگر ارشاد باری تعالیٰ یاد رہے۔

﴿ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيرًا ﴾ (النساء: ١١٥)

''اور جو شخص سیدھی راہ معلوم ہوجانے کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا اور مومنوں کے راستے کے علاوہ کسی اور راستے پر چلے گا تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے ادھر ہی چلنے دیں گے اور جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔''

۳۔ اضطراری حالت میں حسبِ ضرورت رائے سے کام لے اور اس کی وضاحت کردے:

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بعض اوقات ضرورت پیش آنے پر رائے سے کام لیتے تھے، مگر انہوں نے کبھی بھی اپنی اجتہادی آراء کو حرف آخر سمجھا اور نہ ہی انہیں دین قرار دے کر کتاب وسنت کی طرح واجب القبول والاتباع ٹھہرایا۔ بلکہ صراحت کی کہ یہ ہماری رائے ہے جس میں صواب وخطأ دونوں کا احتمال ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رائے واجتہاد سے فتویٰ وفیصلہ دیتے تو فرماتے:

" هذا رأيي فإن يكن صوابا فمن الله وإن يكن خطأ فمني ومن الشيطان"

(أعلام الموقعين ۱/ ۵۷)

''یہ میری رائے ہے اگر درست ہوتو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر خطا ہوتو میری اور شیطان کی طرف سے ہے۔''

اس معنی کی تصریحات حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، عبداللہ بن مسعود اور دیگر متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فرامین میں بھی ملتی ہیں، جنہیں حافظ ابی عمر یوسف ابن عبدالبر رحمہ اللہ (م ۴۶۳ھ) نے "جامع بیان العلم و فضله" میں۔ حافظ ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر المعروف بابن قیم الجوزیۃ (م ۷۵۱ھ) نے "أعلام الموقعين عن رب العلمين" میں اور حافظ ابوالفضل احمد بن علی بن محمد المعروف بابن حجر العسقلانی (رحمہ اللہ) (م ۸۵۲ھ) نے ''فتح الباری ج :۱۳'' میں نقل کرکے رائے سے فتویٰ جاری کرنے کے بارے میں منہج صحابہ کی صراحت کی ہے کہ وہ رائے کو کتاب وسنت کا علم نہیں سمجھتے تھے۔ اس پر اعتماد کر کے فتویٰ سے روکتے تھے۔ اگر مجبوراً انہیں رائے سے کام لینا پڑتا تو اس کی صراحت کر دیتے تھے کہ یہ ان کا ظن ہے۔ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بری ہیں۔ صرف دلیل نہ ملنے تک ہی اس پر عمل ہوسکتا ہے۔ (ملاحظہ ہو مذکورۃ الصدر کتب ثلاثہ)

مفتی کا فرض ہے کہ ایسی کتابوں پراعتماد سے احتراز کرے جن میں اس نوعیت کی آراء جمع اور مدون ہیں جن کا نصوص کتاب وسنت اور احکام شریعت حقہ سے تعارض واضح ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان پراعتماد اور عمل ضلال واضلال ہے۔

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يُضِلُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴾ (ص: ۲۶)

''بے شک جولوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں، ان کے لئے سخت عذاب ہے کہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا۔''

الغرض سبیل اللہ، سبیل الرسول اور سبیل المومنین یعنی اتباع سلف صالحین ہی صراط مستقیم ہے اس پر استقامت اختیار کرنا، اس کی طرف راہنمائی کرنا متبع حق مفتی کا شعار ہے اور اسی میں اس کا وقار ہے۔

وعندالله في ذاك الجزاء وبالله التوفيق.

۴۔شخصیت پرستی سے اجتناب:

مفتی کو فتویٰ دیتے وقت اور سائل کو اس پر عمل کرتے وقت شخصیت کی بجائے ادلہ صحیحہ پر اعتماد کرنا چاہیے۔ شخصیات جس قدر بھی اعلیٰ و بالا ہوں، نصوص کتاب وسنت یعنی وحی الٰہی کے مقابل ان کی کوئی حیثیت نہیں، وہ وحی کے مبلغ اور ترجمان ہیں، ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے تابع ہے ارشاد ربانی ہے:

﴿ يَأَيُّهَا الَّذِينَ امَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ أُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُولِ إِنْ كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ. ﴾ (النساء:٥٩)

''اے مومنو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری کرو اور جو تم میں سے اولی الامر ہیں ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو جائے تو اگر اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرو۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا علمی و فقہی اور عملی منہج بھی یہی تھا۔ کتنے ہی مسائل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باوجود احترام فراواں کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے علمی اور عملی اختلاف کیا، دیگر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم)، تابعین عظام (رحمہم اللہ) اور ائمہ ہدیٰ بھی اسی منہج پر قائم رہے۔ امام شافعی اور دیگر ائمہ کا یہ فرمان بہت معروف ہے:

" إِذَا صَحَّ الْحَدِيثُ فَاضْرِبُوا بِقَوْلِيَ الْحَائِط . " (أعلام المؤقعين)

''صحیح حدیث مل جائے تو میرے قول کو دیوار پردے مارو۔'' (یہی ان اعاظم رجال کی عظمت ہے۔رحمهم الله تعالىٰ رحمة واسعة .)

۵۔صحیح دلیل مل جائے تو اپنی رائے پر مبنی فتویٰ سے رجوع کرلے:

مفتی کو کتاب وسنت کی کوئی نص نہیں مل سکی، عندالضرورت اس نے اجتہاد و رائے سے کام لیا اور مجبوراً فتویٰ جاری کر دیا، پھر اسے اپنے فتویٰ کے برعکس کوئی دلیل صحیح مل گئی، ایسی صورت میں مفتی کو چاہئے کہ اپنے فتویٰ اور رائے سے رجوع کرلے اور دلیل کی پیروی کرلے۔

﴿ وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ. ﴾ (المائده ٨٤)

''اور ہمیں کیا حق ہے کہ اللہ پر اور حق بات پر جو ہمارے پاس آچکی ایمان نہ لائیں۔''

راسخ فی العلم اہل ایمان کا یہی وطیرہ ہے۔سلف صالحین کا یہی طریق کار تھا۔خطیب بغدادی ابوبکر احمد بن علی بن ثابت (م۴۶۳ھ) نے اپنی کتاب" الفقیه والمتفقه" میں ایک مستقل عنوان کے تحت اس کی متعدد مثالیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نقل کی ہیں۔(ملاحظہ ہو: "ذکر ما روی من رجوع الصحابة من آرائهم التی رووها إلى أحاديث النبی إذا سمعوها و وعوها") اس میں انہوں نے حضرت عمر بن خطاب،عبداللہ بن مسعوداور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسے نابغہ روزگار اساطین علم شخصیات کا اپنی آراء سے سرعام رجوع کرنے کا ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ کتب احادیث و آثار میں خلفاء راشدین اور دیگر متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس نوعیت کے آثار ملتے ہیں۔رضی الله عنهم وأرضاهم وارزقنا اتباعهم .

۶۔مذہبی تعصب سے پرہیز:

فہم نصوص میں اختلاف پایا جاتا ہے۔اجتہاد و رائے کے مختلف مدرسہ ہائے فکر موجود ہیں، جن کے ڈانڈے بہرحال کتاب وسنت پر جا کر مل جاتے ہیں۔اس اختلاف کو کسی صورت بھی تعصب کا رنگ نہیں اختیار کرنا چاہئے، انبیاء کرام علیہم السلام کی الہامی تعلیمات ان حزبی گروہی تعصبات کا شکار ہوئیں تو انسانیت نے اس کی وجہ سے بہت کچھ کھویا اورنقصان اٹھایا۔معاشرے ہلاکت و بربادی اور باہم سر پھٹول کا شکار ہوئے اختلاف فکر وفہم جس قدر بھی شدید ہو اور طرق استدلال و استنباط جتنے بھی مختلف ہوں، ان کی بنیاد پر اخذ و استفادہ کی راہیں مسدود نہیں ہونی چاہئیں اور اسے انکار حق تک کسی صورت نہیں پہنچنا چاہئے۔ باب افتاء واجتہاد میں یہ نقطہ انجماد ہی نہیں بلکہ منفی بھی ہے، جس سے مفتی و مجتہد کی شخصیت مجروح ہوتی اور امت کی آبرو پر حرف آتا ہے، یہ طرز عمل تعلیمات الٰہیہ اور ارشادات نبویہ کے منافی ہے۔ عدل و انصاف کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتا، حق جہاں سے ملے اور جس سے ملے اسے قبول کرنا ہی سلامتی کی راہ ہے۔فرمایا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ . ﴾ (التوبہ:۱۱۹)

''اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو اور راست باز لوگوں کے ساتھ رہو۔''

نیز فرمایا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰىٓ اَنْ لَّا تَعْدِلُوا اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ . ﴾ (المائدہ:۸)

''اے اہل ایمان! تم اللہ کے لئے حق پر قائم ہو جاؤ، انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن

جاؤ۔ کسی قوم کی عداوت تمھیں اس بات پر مجبور نہ کردے کہ تم عدل سے ہٹ جاؤ، عدل کرو، وہ ہی تقویٰ کے قریب تر ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔''

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے کفر و شرک اور ناروا سلوک کے باجود ان کی بعض خوبیوں کا ذکر کیا اور ان سے بعض امور میں سوال کرنے کا حکم بھی دیا۔ فرمایا:

﴿ وَ لَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِيْنَ آمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا إِنَّا نَصَارٰى . ذٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ أَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ . ﴾ (المائدہ:۸۲)

''اور ایمان والوں کے سب سے زیادہ دوستی کے قریب آپ یقیناً انہیں پائیں گے جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں، یہ اس لئے کہ ان میں علماء اور رھبان ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔''

بقول علامہ محمد امین شنقیطی صاحب "أضواء البیان" اللہ تعالیٰ نے:﴿ وَ كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ . ﴾ کہہ کر ملکہ سبا کی رائے کی تصدیق فرمائی حالانکہ وہ مشرک تھی، اس کا کفر اس کے قول کی تصدیق میں رکاوٹ نہیں بنا۔

لا تحقرن الرأی و ہو موافق
حکم الصواب إذا أتی من ناقص
فالدر و ہو أعز شیئ یقتنی
ما حط قیمتہ ہو ان الفائص" (أضواء البیان ۱/۶۸)

۷۔ کسی امام مجتہد اور مفتی سے غلطی ہو جائے تو اسے معذور سمجھیں:

ائمۂ مجتہدین میں سے کسی کی اجتہادی غلطی نظر سے گزرے تو اسے معذور خیال کرنا چاہئے، انہوں نے بصراحت اپنی تقلید سے منع فرمایا اور مخالفِ دلیل اقوال کو مسترد کرنے کا حکم بھی دیا، ان کا سب سے بڑا عذر یہ ہے کہ ان کے عہد میں حدیث نبوی کی تدوین نہ ہونے کی وجہ سے بہت ساری احادیث ان تک نہیں پہنچ سکیں اس لئے انہیں رائے وقیاس اور اجتہاد سے مسائل استنباط کرنا پڑے۔ صحیح بخاری میں ہے:

« عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ ، وَ إِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ .»

(رواہ البخاری برقم ۷۳۵۲)

''حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے تھے: جب حاکم فیصلہ کرنے کے لیے اجتہاد کرے پھر وہ درست فیصلہ کرے تو اس کے لئے دو اجر ہیں، جب حکم دے، اجتہاد کرے اور غلطی کرے تو اس کے لئے ایک اجر ہے۔''

اس صورت حال میں اجتہادی خطاء کی وجہ سے ائمۂ فقہ پر لعن وطعن کسی مفتی و مجتہد کے شایان شان نہیں۔ البتہ حق واضح ہونے اور دلیل ظاہر ہونے کے باوجود اگر کوئی تقلید کے بندھن میں بندھا ہوا ہے اور اقوال وآراء الرجال پر مبنی فتوے جاری کرتا ہے تو قابل مذمت مجرم ہے۔ اس کا یہ عمل آداب افتاء اور قرینۂ جواب کے منافی ہے۔ بلکہ وہ مفتی جیسے جلیل القدر منصب کا اہل ہی نہیں۔

۸۔ اہلِ علم سے مشاورت کا اہتمام کرنا چاہئے:

اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مشاورت کرنے کا حکم دیا حالانکہ آپ سید الاولین والآخرین اور امام الانبیاء والمرسلین ہیں۔ فرمایا:

﴿ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ. ﴾ (آل عمران ۱۵۹)

''سو آپ ان سے درگزر کریں اور ان کے لئے استغفار کریں اور کام میں ان سے مشورے لیا کریں۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر دینی امور میں اپنے صحابہ اور امہات المومنین سے مشورہ لیا۔

خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے بھی دینی امور و معاملات میں پیش آمدہ اجتہادی مسائل میں مشاورت کی روایت کو برقرار رکھا اور سنت نبویہ پر قائم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کی مدح وستائش بھی فرمائی۔ فرمایا:

﴿ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ أَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ...... ﴾

(الشوری ۳۸)

''اور وہ جنہوں نے اپنے رب کے فرمان کو قبول کیا اور انہوں نے نماز قائم کی اور ان کا ہر کام باہم مشورہ سے ہوتا ہے۔''

جمع و تدوین قرآن کے مسئلہ میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کے مابین مشاورت کتب احادیث میں مذکور ہے، ایسے ہی مانعین زکوۃ اور مرتدین کے خلاف قتال کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مشاورت، سواد عراق کی تقسیم کے بارے میں حضرت عمر کا صحابہ کے ساتھ طویل مناقشہ مشہور و معروف ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ

باب قول الله تعالٰى "وامرهم شورى بينهم" وشاورهم في الامر)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو اپنے عہد خلافت میں باقاعدہ کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک مجلس مشاورت قائم کر رکھی تھی جن سے وہ اہم امور میں مشورہ لیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو باوجود صغر سنی کے اس مجلس میں شریک کیا تو بعض صحابہ نے اس پر اعتراض کیا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امتحان لے کر ان کی اہلیت کا ثبوت فراہم کیا۔ (صحیح بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورة اذا جاء نصر الله)

مشاورت کی ضرورت واہمیت کے پیش نظر ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فقہاء صحابہ کو مدینہ میں سکونت رکھنے کا پابند کیا تھا۔ تاکہ عندالضرورت ان سے استفادہ کر کے قول فیصل تک پہنچا جا سکے۔

(روى الطبرى عن الشعبى أن عمر منع المهاجرين وكبار الصحابة الخروج والانتشار فى الأقطار التى فتحت) (تاريخ الطبرى ٣٩٧/٤)

جب سے اس روایت نے دم توڑا اور یہ خوبصورت سنت نبویہ ترک ہوئی، مسلمانوں کے باہمی اختلاف نے بڑی بھیانک شکل اختیار کر رکھی ہے۔ بین المسلکی اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی حتی کہ اب ایک ہی مسلک کے درمیان گروہی اختلافات نے عداوت کی صورت اختیار کر رکھی ہے جس کے نتیجے میں اختلاف در اختلاف بڑھ رہا ہے اور نادر فتویٰ جاری کر کے امت کا شیرازہ بکھیرنے کا شوق ہماری دینی روایت بنتا جا رہا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ فتویٰ نویسی کے اس ادب کا پاس کرتے ہوئے، اس سنت نبویہ کا خیال رکھا جائے، سلف صالحین کی مشاورت کی روایت کا احیاء کیا جائے اور اس کے ذریعے امت کی تنظیم وتوحید صفوف کی کوشش کی جائے۔ اس سے کم از کم روز افزوں اختلاف میں کمی ضرور ہوگی اور فتویٰ لادین عناصر کے تمسخر سے محفوظ ہوگا۔ ان شاء اللہ۔

۹۔ افتاء کے لئے طویل بحث وتمحیص، تلاش وجستجو اور عمیق فکر ونظر سے کام لیا جائے:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''أعلم الناس'' ہونے کے باوجود متعدد سوالوں کے جواب میں طویل سکوت اختیار فرمایا اور وحی الٰہی کا انتظار کیا، جو امت کے لئے بہترین تعلیم ہے، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا منہج فکر ونظر اور اجتہاد وافتاء بھی یہی تھا وہ افتاء میں جلد بازی سے کام نہیں لیتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس استفتاء آیا۔ ایک شخص نے ایک خاتون سے نکاح کیا، رخصتی نہیں ہوئی، ابھی ازدواجی تعلق قائم نہیں ہوا، وہ شخص فوت ہو گیا، عورت کا مہر بھی مقرر نہیں کیا گیا تھا۔

حبر الأمۃ عبداللہ بن مسعود جواب سے گریز کر رہے ہیں اور خاموش ہیں، لوگ ایک ماہ تک بتکرار ان کے پاس حاضر ہوتے رہے اور باصرار پوچھتے رہے۔ پھر کہیں جواب ملا اور ان الفاظ کے ساتھ:

" فإني أقول فيها أن لها صداق كصداق نسائها لا وكس ولا شطط، وأن لها الميراث ، وعليها العدة فإن يك صوابا فمن الله، وإن يك خطأ فمني ومن الشيطان ، والله ورسوله بريئان" .

یعنی "میں اس مسئلہ میں یہ کہتا ہوں، کہ اس عورت کے لئے باقی خاندان کی عورتوں کی طرح مہر ہے۔ نہ ان سے کم ہو اور نہ زیادہ اور اس کیلئے خاوند کی میراث میں حصہ ہے، اور اسے عدت بھی گزارنا پڑے گی، اگر یہ فتویٰ درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر خطاء ہے تو میری طرف سے ہے اور شیطان کی طرف سے، اللہ اور اس کا رسول ﷺ اس سے بری ہیں۔"

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ سن کر ابوسنان اشجعی اور ان کے خاندان کے کچھ دوسرے لوگوں نے گواہی دی کہ عہد نبوی ﷺ میں بروع بنت واشق الخذریہ اور ان کے خاوند ہلال بن مرہ الاشجعی کے ساتھ یہی صورت حال پیش آئی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی فیصلہ دیا تھا جو آپ نے دیا ہے، تو اپنا فیصلہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کے موافق پا کر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو بڑی خوشی ہوئی۔ (رواہ الخمسة والسياق لابی داؤد فی سننه ، كتاب النكاح، باب فيمن تزوج ولم يسم صداقا حتى مات ۲/۳۱۹)

تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کا یہی طرز عمل تھا، پوری دل جمعی کے ساتھ کتاب وسنت میں مسئلہ تلاش کرتے، خلفاء راشدین کے اقوال کا پتہ چلاتے، مکمل جدوجہد اور اجتہاد کے بعد اطمینان ہونے پر فتویٰ دیتے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"إن الذي يفتي الناس في كل ما يستفتي لمجنون ." (رواہ دارمی ۵۶)

"جو شخص ہر مسئلہ میں لوگوں کو فتویٰ دے، جو اس سے پوچھا جائے تو یقیناً وہ مجنون ہے۔"

اصحاب رسول اور سلف امت کا یہ منہج افتاء واجتہاد اور طرز استدلال کتاب وسنت سے ماخوذ ہے، جس کی پابندی ہر مفتی کا فرض ہے۔ وباللہ التوفیق.

۱۰۔ مفتی کو چاہئے کہ مستند اور مدلل کتب پر اعتماد کرے:

مفتی کی شخصیت کی تعمیر وتکوین میں اساتذہ کے بعد سب سے اہم کردار کتابوں کا ہے۔ کتب فقہ وفتاویٰ

بھی علماء اور مفتیوں کی طرح ہیں، بہت سارے علماء و مؤلفین ایسے ہیں جنہوں نے پڑھا اور لکھا تو بہت ہے مگر انہیں مسائل کا ادراک اور تفقہ حاصل نہیں، یہ لوگ جو کچھ پڑھتے ہیں، لکھ دیتے ہیں جس سے کتابوں کا حجم اور تعداد تو بڑھ جاتے ہیں مگر فوائد کم ہی ہوتے ہیں۔ جن کو فہم وبصیرت اور تفقہ فی الدین کی دولت حاصل ہے، انہوں نے پڑھا اور سمجھا زیادہ لکھا کم ہے، وہ مطالعہ کی بجائے حاصل مطالعہ لکھتے ہیں۔ نصوص سے استدلال کرتے ہیں۔ ما سوا ان اقتباسات کے جن میں جامعیت، ندرت، بلاغت وبیان اور معانی کے اعلیٰ پائے کے نمونے ہوں حقیقتاً یہ نقول بھی حاصل مطالعہ میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کا انتخاب و اختیار بذات خود حسن ذوق اور فہم و ادراک کی عمدہ دلیل ہے۔ اس کی سب سے بہترین مثال قرآن حکیم میں سابقہ امتوں کے احوال اور ان سے حاصل ہونے والے دروس و عِبَر کا عظیم الشان انتخاب ہے۔

ائمۂ محدثین کا انتخاب حدیث بھی اس کی اچھی مثال ہے۔ جنہوں نے بہت سیکھا، جمع کیا اور پڑھا مگر کم لکھا اور خوب لکھا مثلاً امام بخاری رحمہ اللہ نے چھ لاکھ اخبار وآثار میں سے صرف چند ہزار کا انتخاب کیا پھر ان سے استدلال کر کے جو تراجم ابواب قائم کئے وہ ''فقہ البخاری'' کی دلیل ٹھہرے، تقریباً یہی صورت حال باقی مؤلفین کتب ستہ کی ہے۔ اس کے برعکس مرتبین کتب فقہ اور فقہاء مذاہب باوجود فقہ و اصول فقہ کے ساتھ طویل ممارست کا دعوی رکھنے کے ائمۂ فقہ کے اقوال وفتاویٰ اور اجتہادات کی تنقیح کر سکے نہ ہی سبر وتقسیم کے عمل سے انہیں گزار سکے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں کے نتیجے میں تقلید وجمود نے پرورش پائی اور انہیں راہنما بنانے والے پست ہمتی کا شکار ہوئے۔ جبکہ فقہاء محدثین کی مؤلفات نے اجتہادی فکر کو عام کیا، حریت فکر کو فروغ دیا اور باوجود ہزار کوششوں کے باب اجتہاد مسدود نہیں ہونے دیا، یہ کتابیں نہ صرف یہ کہ سلف صالحین کے مجتہدانہ کاوشوں کی امین، امت اسلامیہ کا علمی سرمایہ اور اہل علم وفضل کا رأس المال ہیں بلکہ مجتہد گر بھی ہیں۔

متاخرین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی مؤلفات، علامہ ابن خلدون کا مقدمہ، علامہ شاطبی کی ''الموافقات'' اور ''الاعتصام'' عز بن عبدالسلام کی کتابیں، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی مصنفات کی مقبولیت کا یہی راز ہے۔ شارحین حدیث میں ابوسلیمان الخطابی، علامہ شرف الدین النووی، حافظ ابن حجر العسقلانی اور امیر یمانی وغیرہ کی مؤلفات کی بھی یہی خصوصیت ہے۔ ورنہ عام طور پر کتابیں کتابوں کو جنم دیتی رہتی ہیں۔ نقل در نقل کا سلسلہ جاری ہے اور مؤلف کا نام نامی زینت غلاف اور

زیب عنوان ہوتا ہے۔ کتاب کے اندر اس کی شخصیت کم ہی نظر آتی ہے۔ عصر حاضر کی اکثر کتابیں اسی نوعیت کی ہیں۔ اِلا من رحم اللہ۔

دینی علوم میں اسناد عالیہ کی تلاش وجستجو بڑا مبارک شغل ہے۔ محدثین کے ہاں روایت حدیث میں اس کی بالخصوص بڑی فضیلت واہمیت ہے۔ عالی اسانید کی تلاش کی بدولت کتنے ہی تابعی صحابیت اور تبع تابعی تابعیت کے شرف سے سرفراز ہوئے اور ایسے کتنے لوگ ہوں گے جنہوں نے عصر صحابہ پایا مگر کسی صحابی سے ملاقات نہ کر سکے اور مقام تابعیت سے محروم رہے، عالی سند کے حصول کے لئے جہد مسلسل کا نتیجہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ باوجود ۱۹۴ھ میں پیدا ہونے کے ایسے اعاظم رجال اور محدثین سے روایت کرنے میں کامیاب ہوئے جو امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اساتذہ وشیوخ کے ہم طبقہ ہیں مثلاً:

مکی بن ابراہیم (م ۲۱۵ ھ)، علی بن عیاش (م ۲۰۵ ھ)، ابونعیم فضل بن دکین (م ۲۱۹ ھ)، عبید اللہ بن موسیٰ (م ۲۱۳ ھ)، عصام بن خلاد الحمصی (م ۲۱۵ ھ)، خلاد بن یحییٰ السلمی (م ۲۱۷ ھ)۔

انہی اساتذہ کرام اور محدثین عظام رحمہم اللہ کے تلمذ کا نتیجہ ہے کہ صحیح بخاری شریف میں ایک معقول تعداد سنداً ثلاثیات احادیث کی جمع ہوگئی جن میں امام بخاریؒ اور نبی ﷺ کے درمیان صرف تین رواۃ ہیں۔

لہٰذا مفتی ومجتہد کا فرض ہے کہ افتاء (جو خالص اجتہادی عمل ہے) کے لئے ایسی کتابوں سے مدد لے اور انہیں پیش نظر رکھے جو براہ راست کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے مستفاد ہیں، دلیل پر اعتماد کرتی اور مستند ہیں فقہی فروع پر مشتمل کتب یا فقہ وفتاویٰ کی کتابوں سے نقل درنقل عمل اجتہاد کے منافی ہے اور اس سے ہمتیں پست ہوتی ہیں۔ ذیل میں ان کتب کی نشاندہی کی جاتی ہے اور وہ سب کی سب پوری امت میں معروف ومتداول ہیں۔

قرآن حکیم فرقان حمید، اور امہات کتب الحدیث والآثار، مسند اعظم، مسند امام احمد بن حنبل، اصول سبعہ، سنن دارقطنی، سنن دارمی، شرح السنہ بغوی، اور جامع الاصول تو ہر مفتی ومجتہد عالم دین کا رأس المال اور سرمایۂ گراں مایہ ہے۔ اس کے علاوہ:

"کتاب الأم" للامام الشافعی، "المغنی" لابن قدامہ، "المجموع" للنووی، "فتح القدیر" لابن الھمام الحنفی، "بدایة المجتھد ونھایة المقتصد" لابن رشد، "مجموع الفتاویٰ" لشیخ الاسلام ابن تیمیة، "فتح الباری" لابن حجر اور "نیل الاوطار" للشوکانی۔ ایسی کتابیں ہیں جن کے مؤلفین نے موافق

ومخالف تمام دلائل ذکر کرنے کی کوشش کی ہے اور ترجیح مع الدلیل کا اہتمام کیا ہے۔

کسی مفتی ومجتہد عالم دین کا مکتبہ ان اسفار مبارکہ سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ یہ اور ان جیسی دیگر کتب پر اعتماد اور ان سے استفادہ آداب افتاء کا حصہ اور احکام شریعت غراء کو ان کے مظان میں تلاش کرنے کا طریقہ ہے۔ جو یقیناً صحابہ وتابعین اور سلف امت کا طریق کار اور منہج اجتہاد ہے۔ عہد خلفاء راشدین میں چونکہ اصحاب رسول ﷺ کے سینے اور صحائف ہی علوم و معارف کے خزینے، احادیث وسنن نبویہ کے گنجینے اور دین وشریعت کے مراجع تھے، اس لئے وہ مہمات الامور میں انہی کی طرف رجوع فرماتے تھے۔ خصوصاً عشرہ مبشرہ اور اصحاب بدر پر تو ان کا اعتماد حیرت انگیز تھا اب ان کے قائم مقام کتب احادیث وآثار ہیں، لہٰذا ان سے استفادہ سنت خلفاء راشدین کا اتباع ہے۔

أهل الحديث هم أهل النبي وإن
لم يصحبو نفسه أنفاسه صحبوا

و قال الآخر:

سلامي على أهل الحديث فإنهم
مصابيح علم بل نجوم سمائه
بهم يهتدي من يقتدي بعلومهم
و يرقى بهم ذو الداء علة دائه
و من يكن الوحي المطهر علمه
فلا ريب في توفيقه و اهتدائه

اللهم إنا نسألك علما نافعا وعملا متقبلا ورزقا طيبا.

برصغیر کی چار اہم کتبِ فتاویٰ

برصغیر میں فتویٰ نویسی کی تاریخ بڑی طویل ہے۔ اس پر کسی لمبی تحریر کی تو اس وقت گنجائش نہیں، البتہ عصر حاضر میں اہل الحدیث مدرسۂ فکر کی ترجمان چار اہم کتب کا تذکرہ موضوع کی مناسبت سے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک خوبصورت کڑی ہے۔ اللہ کے فضل وکرم سے امید رکھی جاسکتی ہے کہ یہ اس سلسلہ کا رکن خامس ثابت ہوگی۔ وما ذلك على الله بعزيز.

ا۔ فتاویٰ نذیریہ:

گزشتہ دوصدیوں کے دوران برصغیر پاک وہند میں جن اساطین علم نے حدیث رسول اللہ ﷺ کی نشرو اشاعت اور عمل بالحدیث کی تدریس و ترویج میں بھر پور اور تاریخی کردار ادا کیا اور مسلک محدثین کو کما حقہٗ متعارف کرایا ان میں میاں صاحب شیخ الکل فی الکل استاذ العرب والعجم سید نذیر حسین محدث دھلوی اور ناشر الکتاب والسنہ والجاہ نواب سید محمد صدیق الحسن خان بھوپالی قنوجی رحمہ اللہ کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں۔

اول الذکر نے تعلیم و تدریس اور تربیت کے ذریعے، ثانی الذکر نے تصنیف و تالیف اور نشرو توزیع کے ذریعے تاریخ اہل حدیث میں ان مٹ نقوش ثبت کئے ہیں، دنیا بھر کی کوئی لائبریری حضرت النواب رحمہ اللہ کی مؤلفات سے خالی نہیں ہوگی اور میاں صاحب مرحوم کو شیخ الکل کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے نام کے ساتھ اس کے علاوہ کوئی لقب جچتا بھی نہیں، عروس البلاد دہلی میں ساٹھ برس مسلسل درس حدیث دیا، ولی اللہ مسند تدریس کے صدر نشین رہے، شاہ محمد اسحاق محدث دھلوی رحمہ اللہ کے جانشین، ان کے علمی وفکری اور اصلاحی تحریک کے وارث تھے۔ سیدین کریمین سید احمد شہید بریلوی اور شاہ محمد اسماعیل شہید دہلوی کی تحریک جہاد کے امین اور اس کی باقیات کے قائد وراہنما اور مرکز تھے، پوری دنیا میں ان کا فیض تدریس پہنچ چکا تھا، ان کے فضل وکمال کا موافق ومخالف سبھی کو اعتراف تھا، مسلمانوں کے ارشاد وتوجیہ میں ان کی اولیات کی وجہ سے وہ مرجع خلائق بن چکے تھے۔ ان کے عہد میں دینی امور میں ان کی رائے اور فتویٰ کو حرف آخر کی حیثیت حاصل تھی، اسلام کے خلاف اٹھنے والے کسی بھی فتنہ سے کبھی غافل نہیں رہے، ان کی ژرف نگاہی فورا خطرہ بھانپ لیتی اور

وہ اس کے سد باب کے لئے کمربستہ ہوجاتے تھے، لائق وفائق تلامذہ کی اتنی بڑی تعداد قرون اخیرہ میں شاید ہی کسی کو میسر آئی ہو جتنی تعداد ان کو ملی۔ ایک ہزار کے قریب ممتاز علماء نے ان سے کسب فیض کیا۔ ان کے تلامذہ میں سید عبداللہ غزنوی، میاں غلام رسول قلعہ والے، مولانا شمس الحق محدث عظیم آبادی، استاذ پنجاب حافظ عبدالمنان وزیر آبادی، مولانا محمد حسین بٹالوی، امام سید عبدالجبار غزنوی، سید عبدالواحد غزنوی اور مولانا عبدالرحمن مبارکپوری رحمہم اللہ جیسے نابغۂ روزگار اعاظم رجال کے اسماء گرامی ملتے ہیں، امام مالک رحمہ اللہ کی طرح ہر طبقۂ زندگی اور مکتبۂ فکر میں ان کے نقوشِ علم وفکر پائے جاتے ہیں، ان کے تلامذہ اپنی مؤلفات میں ان کے فقہی رجحانات اور علمی افکار کا ذکر کرتے ہیں، جو مسلک محدثین کے ترجمان اور منہج سلف صالحین کے آئینہ دار ہیں، فتاویٰ نذیریہ انہی کے نام سے منسوب ہے۔ اگرچہ اس میں ان کے شاگردوں کے فتاویٰ بھی شامل ہیں مگر حقیقتاً وہ میاں صاحب مرحوم کے فتاویٰ کا مجموعہ ہی ہے۔ باقی مفتیان کرام کو ان کے کاتب، معاون اور محرر کی حیثیت سے ہی دیکھا جانا چاہئے، یہ مرحوم کی دیانت، تواضع اور شاگردوں کے ساتھ شفقت ہے کہ ان کے نام بھی ان فتاویٰ میں مذکور ہیں، اس مجموعہ میں اردو، عربی اور فارسی زبانوں میں فتاویٰ شامل ہیں۔ میاں صاحب کی علمی گہرائی، حدیث سے خصوصی شغف، اجتہادی بصیرت اور افتاء کی مجتہدانہ صلاحیت و استعداد اس میں نمایاں ہے، میاں صاحب کے تمام فتاویٰ جمع ہوجاتے تو بڑا ضخیم مجموعہ تیار ہوتا مگر یہ مختصر مجموعہ بھی بڑی زبردست فقہی دستاویز ہے۔ جو سب سے پہلے مولانا شمس الحق محدث عظیم آبادی رحمہ اللہ کی کوششوں سے دہلی سے طبع ہوا پھر ۱۹۷۱ء میں اہل حدیث اکیڈمی لاہور کی طرف سے مولانا عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کے ایماء پر شیخ محمد اشرف مرحوم نے شائع کیا۔

میاں صاحب مرحوم ۱۲۲۰ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۰ میں وفات پائی، مذکورہ مجموعہ فتاویٰ کے علاوہ ان کی کتاب ''معیار الحق'' نے بھی اہل علم کے ہاں بڑی شہرت پائی اور اپنے موضوع پر انقلابی کتاب ثابت ہوئی۔

۲۔ فتاویٰ ثنائیہ:

متحدہ ہندوستان میں اسلام کے دفاع کے لیے جن حضرات کا کام سب کے ہاں معترف بہ اور مسلم ہے۔ شیخ الاسلام مناظر اسلام مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کی شخصیت ان میں سے زیادہ معروف ہے۔ فتنہ نصاریٰ کی طرف سے بپا ہو، ہندی بت پرستوں آریہ سماج کی طرف سے سر اٹھائے یا کسی انگریز کے پروردہ اور خود ساختہ متنبی کذاب کا پیدا کردہ ہو، سرکوبی کے لئے جو بطل جلیل سب سے پہلے میدان میں نکلتا تھا وہ مولانا

ثناء اللہ رحمہ اللہ ہی ہوتے تھے، باطل کے خلاف چومکھی لڑائی لڑنے والے اس مردِ جلیل کے کام میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ آپ رحمہ اللہ امرتسر میں اٹھارھویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوئے ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے دوران ہجرت کر کے پاکستان تشریف لائے ۱۳۶۷ ہجری بمطابق ۱۹۴۸ء کو سرگودھا میں وفات پائی۔ آپ مولانا محمد حسین بٹالوی کے تربیت یافتہ اور استاذ پنجاب حافظ عبدالمنان محدث وزیر آبادی کے تلمیذ خاص تھے۔ درالعلوم دیوبند میں مولانا محمود الحسن دیوبندی سے، مدرسہ فیض عام کانپور میں مولانا احمد حسن رحمہ اللہ سے درس حدیث لیا اور سند فراغت حاصل کی، میاں نذیر حسین محدث دھلوی سے بھی انہیں سند و اجازت حدیث حاصل تھی۔

مولانا امرتسری مرحوم کی تصانیف کی فہرست بڑی طویل ہے، اور وہ چار حصوں پر مشتمل ہیں:

۱۔ ردّ عیسائیت ۲۔ ردّ آریہ ۳۔ ردّ مرزائیت ۴۔ تفسیر القرآن

مگر سب سے زیادہ شہرت تفسیر ثنائی اردو اور تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن کو حاصل ہوئی۔ (ملاحظہ ہو تفصیل کے لئے مقدمہ تفسیر ثنائی)

ردّ ''قادیانیت'' میں مرحوم کا نام اور کام اپنے استاذ مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہ اللہ کے بعد تا حال سب سے اعلی و بالا ہے، باقی سب ان کے خوشہ چین اور زلہ خوار ہیں، اعتراف کریں یا انکار ﴿يحبون أن يحمدوا بما لم يفعلوا.﴾

مولانا امرتسر سے ایک ہفت روزہ جریدہ بنام ''اخبار اہلحدیث'' بھی باقاعدگی سے نکالتے تھے مذکورہ کتب اسی ہفت روزہ میں چھپنے والے سوالات و جوابات کا مجموعہ ہے۔ جسے مولانا محمد داؤد راز دھلوی رحمہ اللہ نے جمع کیا اور استاذ گرامی مولانا ابوسعید محمد شرف الدین محدث دھلوی رحمہ اللہ نے نظر ثانی کی اور مفید حواشی و تعلیقات لکھے، پہلی بار مرتب نے دھلی سے شائع کیا پھر ۱۹۷۲ء میں علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم نے اپنے ادارہ ''ترجمان السنہ'' لاہور کی طرف سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ اگرچہ بہت مفصل و مدلل فتاویٰ پر مشتمل نہیں ہے لیکن اہل حدیث مکتب فکر میں اسے کافی پذیرائی حاصل ہے۔ جس کی ایک وجہ تو شیخ الاسلام مولانا امرتسری رحمہ اللہ کے ساتھ لوگوں کی محبت و عقیدت ہے لیکن کسی کتاب کی مقبولیت و افادیت میں اس کے ذاتی محاسن کے علاوہ مصنف کا اخلاص بھی بڑا اہم عنصر ہوتا ہے، اس مجموعہ کی مقبولیت کا راز بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم.

۳۔ فتاویٰ اہل حدیث:

پنجاب میں مسلک اہل حدیث کی خدمت، کتاب و سنت کی نشر و اشاعت اور مخالفین حق کے ساتھ

مناظروں کے لئے امرتسر ہی کی ایک دوسری اہم اور قابل قدر شخصیت حضرت العلام مجتہد العصر حافظ محمد عبداللہ محدث روپڑی کی ہے۔ کمیر پور امرتسر میں ۱۳۰۴ھ کو پیدا ہوئے، ۱۹۶۴ء میں لاہور میں وفات پائی، حافظ عبداللہ غازی پوری اور امام سید عبدالجبار غزنوی سے کسب فیض کیا، بڑے صاحب فہم وبصیرت اور زیرک عالم دین تھے۔ان کے فضل وکمال علمی کا بڑے بڑے اہل علم نے شباب میں ہی اعتراف کرلیا تھا، نہایت مصلح ومتقی، عالم باعمل تھے زندگی بھر صوم داؤدی پر کاربند رہے۔ ان کے تلامذہ میں سید بدیع الدین شاہ راشدی، شیخ عبدالرحمن افریقی بانی مدرسہ دارالحدیث مدینہ منورہ، مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی، مولانا عبدالقادر عارف حصاری، حافظ عبدالقادر روپڑی، حافظ محمد اسماعیل روپڑی، مولانا محمد صدیق سرگودھوی رحمہم اللہ، حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب فتاویٰ ہذا، حافظ مقبول احمد رحمہ اللہ اور مولانا عبدالسلام کیلانی جیسے فاضل علماء قابل ذکر ہیں۔

۴۴ کے قریب چھوٹی بڑی وقیع تصنیفات ان کی یادگار ہیں، اس کے علاوہ جامع مسجد قدس اور اس سے ملحقہ مدرسہ جامعہ اہلحدیث اور ہفت روزہ ''تنظیم اہل حدیث'' ان کا صدقہ جاریہ ہے۔ مرحوم نے یہ ہفت روزہ ۱۹۳۳ء میں امرتسر سے اپنی زیر ادارت جاری کیا تھا جو تاحال اسلام کی نشر واشاعت اور مخالفین اسلام کی تردید میں مشغول ہے۔ جہد مسلسل میں تو فرق نہیں آیا مگر اب اس کا علمی معیار قابل توجہ ہے۔ مذکورہ مجموعۂ فتاویٰ حافظ صاحب رحمہ اللہ کے ان علمی جوابات پر مشتمل ہے جو اس ہفت روزہ میں چھپتے رہے اور ان کے تلمیذ خاص مولانا محمد صدیق سرگودھوی رحمہ اللہ نے فقہی ترتیب کے ساتھ جمع کر کے ۱۳۹۲ھ ۱۹۷۳ء میں پہلی بار شائع کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان میں من حیث المجموع یہ نہایت عمدہ مجموعہ فتاویٰ ہے۔ موصوف کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین، کتاب وسنت پر گہری نظر اور مجتہدانہ بصیرت سے نوازا ہوا تھا، اس کی جھلک اس مجموعہ میں بسہولت ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ فتاویٰ امتیازی شان کا حامل ہے۔

۴۔ فتاویٰ علمائے اہل حدیث:

فقہ مقارن اور اس میں عدل واعتدال جماعت محدثین کے فقہی منہج کا امتیازی وصف ہے۔ گزشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا کہ اہل حدیث مدرسۂ فکر کی مؤلفات خصوصاً کتب صحاح موافق ومخالف سب کے دلائل پوری دیانت وامانت سے ذکر کرتی ہیں۔ ترجیح مع الدلیل ان کتابوں کا طرۂ امتیاز ہے، فتاویٰ کے باب میں بھی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ کوئی اس قسم کا مجموعہ تیار ہو، جس سے آزادئ فکر، وسعت نظر اور محدثین کے کام کے فقہی واجتہادی منہج کے تسلسل کو قائم رکھنے اور فروغ دینے میں مدد ملے تاکہ تقلید وجمود کے جراثیم کسی طرح

بھی اوساط اہل حدیث میں جنم نہ لینے پائیں۔ الحمد اللہ اس کمی کو ہمارے فاضل استاذ گرامی واجب القدر شیخ الحدیث مولانا ابوالحسنات علی محمد سعیدی رحمہ اللہ نے پورا کرنے کی کوشش کی، آپ نے اکیلے ہی تمام اہل حدیث علماء کے فتاویٰ کی جمع وتدوین اور ترتیب وتبویب کا بیڑا اٹھایا، جسے انہوں نے جماعتی رسائل وجرائد اور مجلّات میں مطبوعہ مقالات وفتاویٰ نیز مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتبِ فتاویٰ کی مدد سے جمع کیا۔ ابھی اس کی ۱۴ جلدیں طبع ہوئی تھیں، کام جاری تھا کہ ان کو موت نے مہلت نہ دی اور وہ ۶ جولائی ۱۹۸۷ء کو وفات پا گئے۔ اندازہ تھا کہ یہ کام ۲۵ جلدوں میں مکمل ہوگا۔ اگر یہ مجموعہ مکمل ہو جاتا تو یقیناً فقہ الحدیث کے باب میں فتاویٰ کی سب سے گرانقدر دستاویز ہوتی، ولکن اللہ یفعل ما یرید لعل اللہ یحدث بعد ذٰلک أمرا.

مولانا (رحمہ اللہ) بیہقیٔ وقت، مفتی پاک وہند مولانا ابوسعید محمد شرف الدین محدث رحمہ اللہ کے تربیت یافتہ اور تلمیذ خاص تھے۔ نہایت سادہ مزاج اور مرنجان مرنج طبیعت کے مالک تھے۔ علم دوستی اور خدمت دین کے جذبۂ صادقہ سے سرشار تھے۔ فقر وفاقہ کے باوجود پوری عمر خدمت کتاب وسنت میں گزار دی، عمر بھر دنیا داروں کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، عملی زندگی میں فی الواقع نمونۂ سلف تھے، انہوں نے یہ سب کچھ اپنے استاذ گرامی مولانا شرف الدین محدث دہلوی م۱۳۸۱ھ اور اپنے مربی ومحسن ولی کامل صوفی ولی محمد فیروزپوری رحمہ اللہ (م ۱۹۷۸ء) کے فیض صحبت سے پایا تھا۔ رحمهم الله جميعا.

سینکڑوں شاگرد، متعدد تصانیف اور ایک دینی مدرسہ "جامعہ سعیدیہ" خانیوال ان کی باقیات صالحات ہیں، برادر گرامی حافظ عبدالستار چک نمبر ۷ میاں چنوں، حافظ عبدالرزاق سعیدی شیخوپورہ، مولانا عبدلرزاق مسعود انگلینڈ، رفیق محترم حافظ عبدالستار حماد مترجم کتب کثیرہ اور راقم الحروف کو مرحوم سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ وفق الله الجميع لما يحبه ويرضاه.

کتاب اور صاحب کتاب

زیر نظر مجموعہ شیخ الحدیث والفقہ ، استاذ العلماء والعالم الفقیہ الاصولی النظار محترم المقام حافظ ثناء اللہ مدنی بن عیسیٰ حفظہ اللہ کے ان فتاویٰ پر مشتمل ہے جو سالہا سال سے ملکی رسائل وجرائد میں چھپ رہے ہیں۔ خصوصاً ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور میں۔ موصوف کی شخصیت جہاں تدریس حدیث وفقہ میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے وہاں آپ افتاء وارشاد میں بھی خصوصاً اہل حدیث حلقوں میں مرجع کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ (متعنا اللہ بطول حیاتہ) موصوف نے ازاول تا آخر علوم متداولہ کی جملہ کتب حضرت العلام مجتہد العصر حافظ محمد عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ سے پڑھیں، پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے ''جامعہ اسلامیہ'' مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ جہاں ان کو ایسے نادر روزگار اساتذۂ کرام سے کسب فیض کا موقع ملا جو کم ہی کسی سعادت مند کو میسر آتا ہے۔

دور حاضر میں پورے عالم اسلام میں جن لوگوں کا نام اور کام لوحِ اعزاز واکرام پر جلی حروف سے ثبت ہے وہ پانچ اساطین واعلام علم ودعوت ہیں:

- حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۸۴ھ الموافق ۱۹۶۴ء)
- الشیخ محمد الأمین الشنقیطی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۹۳ھ الموافق ۱۹۷۴ء)
- حافظ محمد محدث گوندلوی رحمہ اللہ (متوفی ۱۴۰۵ھ الموافق ۱۹۸۵ء)
- الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ (متوفی ۱۴۲۰ھ (محرم) الموافق ۱۹۹۹ء (مئی)
- الشیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ (متوفی ۱۴۲۰ھ (جمادی ثانیہ) الموافق ۱۹۹۹ء (اکتوبر)

ان میں سے اول الذکر تفقہ فی الدین اور مجتہدانہ بصیرت میں اپنی مثال آپ تھے۔ ثانی الذکر تفسیر القرآن بالقرآن اور فہم علوم القرآن میں بے نظیر ملکہ رکھتے تھے، ثالث الذکر علمی گہرائی، زہد وتقویٰ اور کثرت تلامذہ میں یکتائے روزگار تھے، رابع الذکر خدمت دین، اعتدال ومروت، فقہی استدلال اور احکام شریعت کے باہمی ربط میں امامت کا درجہ رکھتے تھے اور آخر الذکر معرفت حدیث وعلوم حدیث، تصحیح وتضعیف اور نقد رجال وعلل حدیث میں سند کی حیثیت رکھتے تھے، اور عصر حاضر میں جرح وتعدیل کے باب میں ان کا کلام قول فیصل ہے۔ ان سب کی مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ ہر حال میں درس وتدریس کتاب وسنت اور تعلیم وتربیتِ امت

میں مشغول رہے اور کبھی بھی اس منصب شریف سے منقطع نہیں ہوئے، رحمہم اللہ تعالیٰ. صاحب کتاب حافظ صاحب ممدوح کو ان سب سے تحصیلِ علم کا شرف حاصل ہے۔ ایسی عظیم الشان سعادت بھی کم خوش نصیبوں کو ہی حاصل ہوتی ہے۔

﴿ واتقو الله ويعلمكم الله .﴾ (القرآن)

جیسے ان سب کا پَر توَ موصوف میں نظر آتا ہے توقع کی جاسکتی ہے کہ ان کا یہ مجموعۂ فتاویٰ ان جملہ خصوصیات کا آئینہ دار ہوگا، ان شاء اللہ. جبکہ ان کے ذاتی اوصاف اور شخصی محاسن اس پر مستزاد ہیں، دینی قدریں اور شرعی حدود و قیود مانع ہیں ورنہ موصوف کی شخصیت کے بارے میں کہنے اور لکھنے کو بہت کچھ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجرِ جزیل سے نوازے، ان کے علم وعمل اور عمر میں برکت فرمائے!! آمین!

یہ چند سطور بھی نوک قلم پر اس لئے آ گئی ہیں کہ یہ رسم دنیا ہے اور آداب الفت ومحبت بھی، حق اخوت ہے اور ان کی خدمات کے اعتراف کا تقاضا بھی۔ ورنہ ممدوح محترم تعارف کے محتاج ہیں نہ تعریف کے شائق، آنجناب اللہ کی توفیق اور اس کے فضل وکرم سے مدح وستائش سے بے نیاز اور خدمت دین کے جذبہ سے مالامال ہیں، درس وتدریس اور نشر واشاعت قرآن وسنت اور فتویٰ نویسی میں ان کی خدمات کا دائرہ بحمد اللہ بہت وسیع ہو چکا ہے، ان سطور کا مقصد صرف یہ ہے کہ قارئین کرام کا شوق مطالعہ فزوں سے فزوں تر ہو اور ان کی دین سمجھنے اور سیکھنے کی تڑپ کے لئے مہمیز کا کام دیں۔ والله من وراء القصد .

اللہ رب العزت جزائے خیر سے نوازے فاضل دوست مولانا حافظ عبدالشکور بن حافظ علم الدین عفااللہ عنہما کو کہ انہوں نے بہت محنت اور جانکاہی سے ان گراں مایہ تحریروں کو یکجا کیا۔ انہیں فقہی ترتیب وتبویب سے مرتب کیا اور قارئین کے مطالعہ کی میز تک پہنچایا۔ یقیناً وہ مؤلف اور قاری کے ساتھ اجر میں برابر کے شریک ہوں گے، ان شاء اللہ. اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی اس علمی وفقہی جدوجہد کو شرف قبولیت سے نوازے اور ذخیرۂ آخرت بنائے! اور ہم سب کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائے!

ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم .

ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر بن عبدالعزیز عفااللہ عنہما

اسلام آباد

۱۷ ذی القعدہ ۱۴۲۳ھ ...... ۲۱ جنوری ۲۰۰۳ م

فرمانِ باری تعالیٰ

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْأَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْآخِرَةِ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ . ﴾ (سبا، پارہ ۲۲)

فرمانِ رسول ﷺ

« مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ. »

① بسم اللہ کی جگہ کچھ اور پڑھنا یا لکھنا

سوال: کیا "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" لکھنے یا پڑھنے کی بجائے جو ۷۸۶ لکھتے ہیں اس کا اجر وثواب ملتا ہے؟ یہ بدعت کہاں سے ایجاد ہوئی؟ میں نے کچھ بھائیوں سے سوال کیا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ صرف بے ادبی سے بچنے کے لیے لکھتے ہیں۔

جواب: ''بسم اللہ'' کی بجائے ۷۸۶ لکھنے سے اجر وثواب نہیں ملتا کیونکہ یہ مُنَزَّل مِنَ اللّٰهِ قرآن نہیں ہے۔ یہ بدعت ''علم الاعداد'' کے حاملین نے نکالی ہے۔ تحریر میں ''بِسْمِ اللّٰهِ'' لکھنا بے ادبی نہیں ہے۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو رسول اللہ ﷺ ہرقل مشرک کافر کی طرف مرسلہ چٹھی میں ''بسم اللہ'' تحریر نہ فرماتے۔ ❶ چٹھی میں ''بسم اللہ'' لکھنا بھی گویا دعوت کا ایک اہم حصہ ہے جب کہ ۷۸۶ عدد یکسر اس سے خالی ہے۔

سوال: کیا ''بِسْمِ اللّٰهِ'' کی جگہ ۷۸۶ لکھا جا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: ''بِسْمِ اللّٰهِ'' کی بجائے تحریر میں ۷۸۶ لکھنا کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔ صحیح حدیث میں ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ.» ❷

یعنی ''جو دین میں اضافہ کا مرتکب ہو وہ مردود ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کی جملہ کتابات و رسائل کتب احادیث میں محفوظ ہیں۔ سبھی کا آغاز بسملہ سے ہے، یہاں تک کہ جو چٹھیاں غیر مسلم رؤساء و ملوک کو لکھی گئیں ان کی ابتداء بھی ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے ہے۔ ❸

---

❶(۱) صحیح البخاری، بدء الوحی رقم (۷).

❷(۲) صحیح البخاری، کتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا علی جور فالصلح مردود (۲۶۹۷).

❸(۳) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب دعا النبی ﷺ إلی الإسلام والنبوة ...... (۲۹٤۱)، صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب کتب النبی ﷺ إلی هرقل...... (٤٦۰۷).

سوال: خط شروع کرنے سے پہلے پوری ’’ بِسْمِ اللّٰهِ ‘‘ لکھنی چاہیے یا صرف بسملہ لکھنا کافی ہے؟

جواب: خط وکتابت کے آغاز میں مکمل « بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.» لکھنی چاہیے۔ نبی ﷺ کے روَسا و ملوک کی طرف جملہ رسائل اس امر کی واضح دلیل ہیں۔ اور لفظ بسملہ میں محض بطور تسمیہ (نام) ذکر کیا ہے جس سے مقصود پوری « بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.» ہے۔

❀❀❀❀❀❀❀

۲ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات

سوال: بعض لوگ لفظ ''اللہ'' کی جگہ لفظ ''خدا'' بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ شریعت میں اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: لفظ ''خدا'' اور لفظ ''اللہ'' کی کنہہ اور حقیقت کے ادراک کے لیے ضروری ہے کہ اہل لسان کی طرف مراجعت کریں تاکہ مَا بِهِ الِامْتِيَاز کا انکشاف ہو اور زیر بحث مسئلہ خود بخود نکھر کر اصلی شکل وصورت میں سامنے آئے۔

پہلے لفظی ترجمہ کی تعریف ذہن نشین کر لیں تاکہ آئندہ بحث کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ کلام کو ایک زبان سے بمطابقت رعایت نظم وترتیب اور مترجم شئ کے تمام اصل معانی کو محفوظ رکھنے دوسری زبان میں منتقل کر دینے کا نام لفظی ترجمہ ہے۔ (التفسیر والمفسرون)

اب دونوں لفظوں میں سے ہر ایک کی بالا ختصار علیحدہ علیحدہ تعریفات اور معانی ملاحظہ فرمائیں۔

- خدا خود ہی آنے والا اور موجود ہونے والا اللہ تعالیٰ۔ (فیروز اللغات، اردو جدید)
- خدا یہ لفظ خود اور آیعنی آئندہ سے مرکب ہے۔ اور یہ ترجمہ ہے واجب الوجود کا۔ (فیروز اللغات فارسی)
- خدا جمع خدایاں۔ (فیروز اللغات اردو)
- خدا خالق: عبادت کے لائق چیز، مذہب کے مطابق اعلیٰ چیز، انتہائی عقیدت کی چیز، مافوق الانسان چیز۔ (چیمبرز سٹوڈنٹس لغت)

اور لفظ ''اللہ'' سے مراد:

'' اَلذَّاتُ الْوَاجِبُ الْوُجُوْد الْمُسْتَجْمِعُ جَمِيْعَ صِفَاتِ الْكَمَالِ الْمُنَزَّه عَنْ جَمِيْعِ النَّقَائِصِ . ''

''یعنی وہ ذات جو خود بخود ہے۔ کسی دوسرے نے اس کو بنایا نہیں۔ تمام کمالات کا جامع اور جملہ عیوب سے پاک ہے۔''

اس کے مشتق اور غیر مشتق ہونے میں اختلاف ہے، بعض لوگ اسے علم ذاتی غیر مشتق مانتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ لفظ ''اللہ'' ہمیشہ موصوف واقع ہوتا ہے۔ لفظ ''اللہ'' کے سوا کوئی علم ذاتی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اور اگر اس کو علم ذاتی نہ مانا جائے تو کلمۂ توحید سے توحید ثابت نہیں ہوتی۔ اس وقت ''لَا اِلٰهَ اِلَّا الرَّحْمٰن'' کی مثل ہوگا، جو شرکت سے مانع نہیں۔ اور جو لوگ اسے اسم وصفی مانتے ہیں ان کا مبدأ اشتقاق میں اختلاف ہے۔

1. کہا جاتا ہے کہ یہ: أَلَهَ (بفتح اللام) يَالَهُ أُلُوهَةً وَّ أُلُوهِيَّةً. (مصادر) بمعنی: عَبَدَ عِبَادَةً سے ہے۔
2. بعض کے نزدیک: أَلِهَ (بکسر اللام) بمعنی تَحَيَّرَ ہے۔ چونکہ باری تعالیٰ کو پانے سے عقلیں حیران ہیں اس لیے ان کے نزدیک اصل اس سے ہے۔
3. اور بعض دوسروں کے نزدیک یہ : لَاهَ يَلِيْهُ سے ہے۔ بیضاوی نے يَلِيْهُ اور ابن کثیر نے يَلُوْهُ پڑھا ہے۔ بمعنی اِحتِجَاب وَ رِفعَت ہے۔ کیوں کہ ذات باری تعالیٰ ہر چیز سے بلند اور اِدراک سے محجوب ہے، (لیکن اس سے رؤیت کی نفی لازم نہیں آتی) اس لیے اللہ کو اللہ کہتے ہیں۔
4. بعض لوگ کہتے ہیں کہ اصل میں لَاهَ تھا جو سریانی زبان کا لفظ ہے۔ اس پر الف لام داخل کر کے مُعَرَّب بنایا گیا ہے۔ جیسا کہ تفسیر کبیر اور ابن کثیر وغیرہ میں ہے۔ علامہ خلیل ہراس شارح العقیدۃ الواسطیہ کے نزدیک صحیح مسلک یہ ہے کہ لفظ الجلالۃ پہلے باب (عبد) سے مشتق ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں :'' اَللّٰهُ ذُوْالْاِلٰهِيَّةِ وَالْعُبُوْدِيَّةِ عَلٰى خَلْقِه اَجْمَعِيْن.'' لیکن اس پر عَلَمِيَّتْ غالب ہے باقی اسماء اس کی خبر اور صفت ہیں کہا جاتا ہے: اَللّٰهُ ، رَحْمٰنٌ ، رَحِيْمٌ، سَمِيْعٌ ، عَلِيْمٌ ، جیسے کہا جاتا ہے: اَلرَّحْمٰنُ الرَّحِيْم.

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:'' إِنَّهٗ مُخْتَصٌّ بِالْمَعْبُوْدِ بِالْحَقِّ .'' یعنی'' لفظ اللہ معبود برحق کے ساتھ مخصوص ہے'' (صـ ۱٦، الجزء الأول)

محقق العصر مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

''یہ لفظ کیا بلحاظ رسم الخط [1] اور کیا بلحاظ [2] اشتقاق و معنی [3] عجیب عجیب خصوصیتیں رکھتا ہے۔ رسم الخط کی رو سے اس طرح کہ اس کی تحریر کا طریق یوں ہے۔ (اللہ) اگر ہمزہ کو ابتداء سے گرا دیں تو باقی صورت (للہ) رہ جاتی ہے اور یہ لام جارہ داخل کرنے سے (للہ) کی صورت ہے۔''

پھر اگر اس کے پہلے لام کو بھی گرا دیں تو صورت (لہ) کی رہ جاتی ہے۔ یعنی لام جارہ اور ضمیر غائب سے مرکب اور اگر لام ثانی کو بھی گرا دیں تو صرف وہ صورت ضمیر غائب کی رہ جاتی ہے اور یہ سب یعنی (لِلّٰہِ) اور (لَہٗ) اور (ہ) ذات باری حق کے لیے وارد ہیں۔ چنانچہ یہ تینوں ایک ہی آیت میں موجود ہیں:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ . ﴾ (سبا، پارہ ۲۲)

''سب خوبیاں اللہ ہی کے لیے خاص ہیں جس کی ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اس کی تعریف ہے آخرت میں بھی اور وہ بڑا باحکمت (اور) ہر چیز سے خبردار ہے۔''

لفظ (هُوَ) جو اس آیت میں اسم ضمیر ہے۔ اصل میں صرف (ہ) ہی تھا۔ واو تلفظ میں سہولت پیدا کرنے کے لیے زیادہ کی گئی ہے، دلیل اس کی یہ ہے کہ اس کی جمع و تثنیہ هُمَا اور هُمْ ہے اگر واوَ اصلی ہوتی تو تثنیہ اور جمع میں قائم رہتی سُبْحَانَ اللّٰهِ! یہ کیسا مبارک لفظ ہے کہ اس کے حروف مجموعی اور انفرادی ہر دو طرح پر اس ذات پاک پر دلالت کر سکتے ہیں۔

عِبَارَاتُنَا شَتّٰى وَ حُسْنُكَ وَاحِدٌ
وَ كُلٌّ إِلٰى ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

''ہماری عبارتیں مختلف ہیں اور تیرا حسن ایک ہی ہے۔ ہر کوئی اسی جمال (بے مثال) کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔'' (واضح البیان فی تفسیر أم القرآن ۷۵، ۷۶)

اس مختصر جامع بحث سے معلوم ہوا کہ لفظ ''اللہ'' میں بے انتہاء گہرائی، وسعت اور جامعیت ہے جو کسی بدل میں ممکن نہیں جب کہ لفظ خدا، وسعت سے قاصر اور محدود معنی پر دال ہے بلکہ ہمہ تن صفات باری تعالیٰ سے عاری ہے۔ اسی طرح جمیع ''اَسْمَاءُ اللّٰهِ الْحُسْنٰى'' مخصوص خصوصیات و امتیازات کے حامل ہیں جن کی جملہ تفاصیل ''كِتَابُ الْاَسْمَاءِ وَالصِّفَاتِ'' امام بیہقی رحمہ اللہ وغیرہ میں موجود ہیں۔ اس بنا پر رَبُّ الْعِبَاد نے مخلوقات کو ان کے ساتھ ورد و وظیفہ کا حکم دیا ہے۔ عاجز بندوں کے لیے تقرب الٰہی کا سب سے اعلیٰ اور عمدہ طریقہ یہی ہے کہ ان کے وسیلہ سے اللہ کے ہاں التجا کریں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ الْأَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ أَسْمَآئِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ . ﴾ (الأعراف: ۱۸۰)

''اور اللہ کے نام اچھے ہی اچھے ہیں تو اس کو اس کے ناموں سے پکارو اور جو لوگ اس کے ناموں میں کجی (اختیار) کرتے ہیں ان کو چھوڑ دو وہ جو کچھ کر رہے ہیں۔ عنقریب اس کی سزا پائیں گے۔''

دوسری جگہ ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ أَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى . ﴾

(بنی إسرائیل: ۱۱۰)

''کہہ دو! کہ تم اللہ (کے نام سے) پکارو یا رحمٰن (کے نام سے) جس نام سے پکارو اس کے سب نام اچھے ہیں۔''

بہرصورت ہمارے ہاں بکثرت لفظ ''خدا'' کا استعمال سابقہ سرکاری فارسی زبان کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ جس سے باسلوب احسن احتراز کی سعی و تدبیر ہونی چاہیے۔ عَلَى الْأَقَل اس کا اطلاق کراہت سے خالی نہیں۔ (وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ)

سوال: کافی عرصہ ہوا ''اَلدَّعْوَة'' میں یہ مسئلہ نظروں سے گزرا کہ ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ. ﴾ (یونس: ۳) اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے۔ چنانچہ یہ عقیدہ نہیں رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے۔ بلکہ اس کی قدرت ہر جگہ موجود ہے۔ اس سلسلے میں صحیح عقیدے کی وضاحت مطلوب ہے؟

جواب: بلاریب اللہ عزوجل کا عرش پر مستوی ہونا متعدد قرآنی نصوص سے ثابت ہے۔ اور بہت ساری احادیث نبویہ ﷺ بھی اسی مفہوم کی مؤکد و مؤید ذخیرہ کتب محدثین میں موجود ہیں جن کو تواتر معنوی کا درجہ حاصل ہے اور ائمہ سلف کے بے شمار اقوال و آثار اس بات پر مصرح ہیں جو تاویلات باطلہ کے قطعاً متحمل نہیں ہیں۔ لفظ ''عرش'' کے معنی ''تخت'' اور ''بلند مقام'' کے ہیں۔

الازہری رحمہ اللہ نے کہا: ''اَلْعَرْشُ فِيْ كَلَامِ الْعَرَبِ سَرِيْرُ الْمَلِكِ.'' یعنی بادشاہ کا تخت۔

اور جوہری رحمہ اللہ کا کہنا ہے:

'' اَلْعَرْشُ سَرِيْرُ الْمَلِكِ وَ عَرْشُ الْبَيْتِ سَقْفُهٗ ، وَالْعَرْشُ وَالْعَرِيْشُ مَا يُسْتَظَلُّ بِهٖ وَ

عَرْشُ الْقَدَمِ مَا نَتَأَ فِيْ ظَهْرِهَا وَ فِيْهِ الْأَصَابِعُ وَ عَرْشُ الْبِئْرِ طَيُّهَا بِالْخَشَبِ ، بَعْدَ أَنْ يُطْوٰى أَسْفَلُهَا بِالْحِجَارَةِ قَدْرَ قَامَةٍ لِذٰلِكَ الْخَشَبِ هُوَالْعَرْشُ وَالْجَمْعُ عُرُوْشٌ وَ عَرْشٌ، يَعْرُشُ وَ يَعْرِشُ عَرْشًا أَيْ بَنٰى بِنَاءً مِّنْ خَشَبٍ .'' (الصحاح: ۳۴۹/۱-۳۵۰)

ڈاکٹر غنیمان فرماتے ہیں جو کچھ اہل لغت نے ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرش بلند و بالا تخت کا نام ہے جس کے اوپر بادشاہ براجمان ہوتا ہے اور اس کا اطلاق چھت پر بھی ہوتا ہے اور رَبِّ جَلَّ وَ عَلَا کے عرش پر دونوں معنی منطبق ہیں وہ اس کے مستوی ہونے کا محل ہے اور کائنات کے لیے چھت بھی ہے۔

(شرح کتاب التوحید من صحیح البخاری: ۳۵۰/۱)

اور لفظ ''استواء'' کی تعبیر میں سلف سے مختلف الفاظ منقول ہیں۔

❁ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' قَالَ أَبُوالْعَالِيَةِ: ''اِسْتَوٰى إِلَى السَّمَآءِ'' أَيْ اِرْتَفَعَ فَسَوَّاهُنَّ'' خَلَقَهُنَّ . وَقَالَ مُجَاهِدٌ: '' اِسْتَوٰى عَلَا عَلَى الْعَرْشِ.''

❁ یعنی ابوالعالیہ نے کہا: ''اِسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ'' کا معنی ہے آسمان کی طرف چڑھا، '' فَسَوّٰهُنَّ '' ان کو پیدا کیا۔

❁ اور مجاہد نے کہا: ''اِسْتَوٰى'' کا معنی ہے عرش پر بلند ہوا۔ (ترجمة الباب صحیح بخاری) [1]

❁ ربیع بن انس نے کہا:

''ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَآءِ: اِرْتَفَعَ إِلَى السَّمَآءِ'' (تفسیر طبری: ۴۲۹/۱ تحقیق محمود شاکر)

❁ اور لالکائی نے بسند بشر بن عمر سے بیان کیا ہے، میں نے کئی ایک مفسرین سے سنا ہے وہ کہتے تھے:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى .﴾، اِرْتَفَعَ. (شرح أصول اعتقاد أهل السنة)

❁ اور حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' اَلْإِسْتِوَاءُ: اَلْإِسْتِقْرَارُ فِي الْعُلُوِّ وَ بِهٰذَا خَاطَبَنَا اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فَقَالَ :لِتَسْتَوُوْا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ.''

❁ کلبی اور مقاتل رحمہما اللہ نے کہا: ''اِسْتَقَرَّ'' قرار پکڑا، اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا صَعِدَ چڑھا۔

---

[1] (۴) صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب ﴿و کان عرشه علی المآء .﴾

❁ امام بغوی رحمہ اللہ ائمہ سے یہ معانی نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: معتزلہ نے استواء کی تاویل ''استیلاء'' یعنی غلبہ سے کی ہے۔

❁ اور اہل سنت کہتے ہیں: اَلْإِسْتِوَاءُ عَلَى الْعَرْشِ صِفَةُ اللّٰهِ تَعَالٰى بِلَا كَيْفٍ ،يَجِبُ عَلَى الْعَبْدِ اَلْإِيْمَانُ بِه ،وَ يَكِلُ الْعِلْمَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ .(تفسیر البغوی:۲۳۷/۲) یعنی عرش پر مستوی ہونا کیفیت بیان کرنے کے بغیر اللہ کی صفت ہے۔ بندے پر واجب ہے کہ اللہ پر ایمان لائے اور اس میں کنہہ کا علم اللہ کے سپرد کردے۔

❁ اور صاحب ''التحفة المهدية شرح الرسالة التدمیریہ'' مذکورہ الفاظ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وَهٰذِهِ الْعِبَارَاتُ وَ إِنِ اخْتَلَفَتْ فَمَقْصُوْدُ هُمْ وَاحِدٌ وَهُوَ إِثْبَاتُ عُلُوِّ اللّٰهِ عَلَى الْعَرْشِ.'' (۱۴۷/۱)

تاہم جن لوگوں نے ''اِسْتَوٰى'' کی تاویل ''اِسْتَوْلٰى ''(غالب ہوا) سے کی ہے ان کا استدلال ایک شعر سے ہے:

ثُمَّ اسْتَوٰى بِشْرٌ عَلَى الْعِرَاقِ
مِنْ غَيْرِ سَيْفٍ أَوْ دَمٍ مُهْرَاقِ

یعنی بشر عراق پر بلاقتل و غارت کے غالب آ گیا۔ لیکن اس کے بارے میں صاحب التحفة المهدية فرماتے ہیں:

''وَلَمْ يَثْبُتْ بِنَقْلٍ صَحِيْحٍ أَنَّهٗ شِعْرٌ عَرَبِيٌّ ،وَ كَانَ غَيْرُ وَاحِدٍ مِّنْ أَئِمَّةِ اللُّغَةِ قَدْ اَنْكَرُوْهُ ،وَ قَالُوْا: إِنَّهٗ بَيْتٌ مَصْنُوْعٌ لَا يُعْرَفُ فِي اللُّغَةِ .''

''یعنی یہ بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی کہ یہ عربی شعر ہو بہت سارے ائمہ لغت نے اس کا انکار کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ لغت میں غیر معروف اور من گھڑت شعر ہے۔''

چنانچہ ابوالمظفر اپنی کتاب ''الافصاح'' میں فرماتے ہیں:

'' سُئِلَ الْخَلِيْلُ هَلْ وَجَدْتَ فِي اللُّغَةِ اِسْتَوٰى بِمَعْنَى اِسْتَوْلٰى؟ فَقَالَ: هٰذَا مَالَا تَعْرِفُهُ الْعَرَبُ وَلَا هُوَ جَائِزٌ فِيْ لُغَتِهَا .''

''یعنی خلیل سے دریافت ہوا کہ تو نے لغت میں ''اِسْتَوٰی'' بمعنی ''استولی ''(غالب ہوا) پایا ہے کہا یہ وہ شے ہے جس سے عرب ناواقف ہیں۔ اور نہ ان کی زبان میں یہ جائز ہی ہے۔''

ابونصر سجزی نے ''الإبانة'' میں کہا ہے:

'' وَأَئِمَّتُنَا كَسُفْيَانَ وَ مَالِكٍ وَالْحَمَّادَيْنِ وَ ابْنِ عُيَيْنَةَ وَالْفُضَيْلِ وَابْنِ الْمُبَارَكِ وَأَحْمَدَ ابْنِ حَنْبَلٍ وَ إِسْحَاقَ مُتَّفِقُوْنَ عَلٰى أَنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ فَوْقَ الْعَرْشِ وَ عِلْمُهٗ بِكُلِّ مَكَانٍ وَ أَنَّهٗ يَنْزِلُ إِلٰى سَمَاءِ الدُّنْيَا وَ أَنَّهٗ يَغْضَبُ وَ يَرْضٰى وَ يَتَكَلَّمُ بِمَا شَاءَ. ''

(سِيَرُ أَعْلَامِ النُّبَلَاء :۱۷/ ۶۵۰)

''یعنی ہمارے ائمہ جیسے سفیان، مالک، دونوں حماد، ابن عیینہ، الفضیل، ابن المبارک، احمد بن حنبل اور اسحاق سب اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ عرش کے اوپر ہے اور اسکا علم ہر جگہ ہے اور وہ آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے۔ وہ راضی، ناراضی ہوتا ہے جس شے کے ساتھ چاہتا ہے کلام کرتا ہے۔''

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے عرش پر مستوی ہے: ''كَمَا يَلِيْقُ بِجَلَالِهٖ'' البتہ اس کا علم ہر شے کو محیط ہے ﴿ وَ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْئٍ عِلْمًا . ﴾ (الطلاق:۱۲) جملہ اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے، اس کا خلاف الحاد اور گمراہی ہے۔ واللہ الهادی للصواب.

سوال: ہمارا کوئی رشتے دار، عزیز یا دوست ہمارے سامنے اللہ تعالیٰ کو اس کی ساری صفات کے ساتھ ماننے سے انکار کر دے اور اللہ تعالیٰ کو برا بھلا بھی کہے تو:

۱ ...... کیا اس شخص کا نکاح باقی رہے گا؟

۲ ...... اس شخص سے ہمیں کیا سلوک کرنا چاہیے؟

۳ ...... ایسے شخص کی خوشی میں شریک ہونا کیسا ہے؟

جواب : اللہ رب العزت کے بارے میں گستاخی کرنے والا آدمی مرتد اور دین سے خارج ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْإِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ . ﴾

(المائدہ:۵)

''اور جو شخص ایمان سے منکر ہوا، اس کے عمل ضائع ہو گئے اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہوگا''

ایسے پاگل اور مخبوط الحواس شخص کو ہر ممکن طریقے سے سمجھانا چاہیے۔ اگر وہ اپنی حرکات سے باز نہ آئے تو اس سے مکمل بائیکاٹ ہونا چاہیے۔ قرآن میں ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ عَدُوِّى وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَآءَ . ﴾ (الممتحنة: ١)

''مومنو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔''

سوال: اللہ کے لیے لفظ ''خدا'' استعمال کرنا درست ہے یا نہیں؟

جواب: اللہ کے لیے لفظ ''خدا'' کا استعمال کتاب وسنت سے ثابت نہیں اس پر میرا ایک تفصیلی فتویٰ ''نداء الجہاد'' اور ''الاعتصام'' میں کچھ عرصہ قبل شائع ہو چکا ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁

③ بیت اللہ شریف اور مساجد سے متعلقہ مسائل

سوال: ایک دیو بندی عالم کی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ حدیث شد رحال میں جو تین مساجد کے علاوہ سفر کرنا منع ہے تو اس سے روضۂ رسول ﷺ کی طرف قصد کر کے سفر کرنا منع نہیں ہوتا۔ کیونکہ حدیث میں مساجد کا ذکر ہے اور جہاں سفر کرنے کی ممانعت ہے وہ جگہیں محذوف ہیں۔ لہٰذا نحوی اعتبار سے وہ ان تین مساجد کے علاوہ باقی مسجدیں ہیں۔ دراصل مصنف یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ آپ ﷺ کی قبر اطہر کی زیارت کی نیت سے سفر جائز ہے۔ کیا مصنف کا استدلال درست ہے۔ مصنف نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی دلیل کے طور پر نقل کیا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دمشق میں نبی ﷺ کی خواب میں زیارت ہوئی اور حضرت ﷺ نے فرمایا کہ بلال رضی اللہ عنہ تم ہماری زیارت کو کیوں نہیں آتے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ فوراً اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ پہنچے اور قبر اطہر پر حاضری دی۔ سنداً یہ واقعہ کیسا ہے؟ نیز اگر روضۂ رسول ﷺ کی زیارت کے لیے قصداً سفر کیا جائے تو کیا یہ صحیح ہے یا اگر ممانعت کی حدیث ہے مع صحت تحریر کیجئے۔

جواب: دیو بندی عالم کا استدلال محل نظر ہے۔ نسائی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، میں بصرہ بن ابی بصرہ کو ملا، انہوں نے کہا، آپ کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے کہا پہاڑ طور سے، کہا اگر میری ملاقات آپ سے پہلے ہوتی تو آپ پہاڑ طور پر نہ آتے۔ میں نے کہا کیوں؟ کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ سفر نہ کیا جائے مگر تین مسجدوں کی طرف۔ مسجد حرام، میری مسجد اور مسجد بیت المقدس۔ [1] علامہ سندھی حنفی اس حدیث پر لکھتے ہیں:

"اِسْتِدْلَالُ بَصْرَةَ بِهِ وَهُوَ رَاوِي الْحَدِيْثِ يَدُلُّ عَلٰى أَنَّ الْمُسْتَثْنٰى مِنْهُ عَامٌّ أَيُّ مَكَانٍ مِّنَ الْأَمْكِنَةِ."

---

[1] (٥) النسائی، کتاب المساجد، باب ما تشد الرحال إلیه (٧٠١). صحیح البخاری، فضل الصلاة فی مسجد مکة والمدینة (١١٨٩). و أصل القصة فی المؤطا: کتاب الجمعة، باب ما جاء فی الساعة التی فی یوم الجمعة.

یعنی'' بصرہ راوی حدیث کا استدلال اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مستثنیٰ منہ عام ہے۔ یعنی کسی جگہ کی طرف (تقرب کے لیے) سفر کرنا جائز نہیں۔ مگر تین مسجدیں .... الخ۔''

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ''قَاعِدَةٌ جَلِيْلَةٌ فِي التَّوَسُّلِ وَالْوَسِيْلَةِ ''میں لکھتے ہیں:

'' امام مالک رحمہ اللہ سے ایک شخص کی بابت جس نے نذر مانی کہ قبر نبی ﷺ کو آئے گا۔ سوال ہوا تو امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر قبر کا ارادہ کیا ہے تو نہ آئے کیوں کہ حدیث میں ہے کہ تین مسجدوں کے سوا کسی جگہ کی طرف (بہ نیت تقرب) سفر جائز نہیں۔'' ❶

شیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ اس پر مزید رقمطراز ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ طلب علم اور دیگر ضروریات کے لیے سفر کا کوئی حرج نہیں۔ صرف کسی جگہ کی طرف جس میں قبر نبوی ﷺ بھی داخل ہے۔ ثواب کی نیت سے سفر کرنا جائز نہیں۔ ہاں اگر یہاں سے مسجد نبوی کی نیت سے سفر کرے اور وہاں پہنچ کر نبی ﷺ کی قبر کی بھی زیارت کرے تو اس کا کوئی حرج نہیں بلکہ ایسا ہی کرنا چاہیے تاکہ انسان شبہ سے بھی نکل جائے اور کام بھی دونوں ہو جائیں۔'' (مسئلہ زیارت قبر نبوی :۳۱)

نیز حضرت قزعہ سے روایت ہے کہ میں نے کوہ طور کی زیارت کا قصد کیا تو اس بارے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا تو انہوں نے بھی آنحضرت ﷺ کی یہی حدیث سنائی یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی۔ اور پھر کہا لہٰذا طور جانے کا خیال چھوڑ دیجیے، وہاں مت جایئے۔ ❷ (بحواله أخبار مكة للأزرقي بإسناد صحيح)

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا واقعہ سند کے اعتبار سے غیر درست ہے۔ ❸ دوسری بات یہ ہے کہ شریعت کی بنیاد خوابوں پر نہیں ہے۔

سوال: عام مسجدوں میں رواج ہے کہ امام کے لیے مصلی کے اوپر ایک فالتو جائے نماز منقش ہوتا ہے جس پر بیت اللہ کی تصویر ہوتی ہے۔ چونکہ بیت اللہ عزت والا اللہ کا گھر ہے اور ہمارے امام سلام کے بعد جو بیٹھتے ہیں تو ان کے (چوتڑ) پیٹھ کعبہ شریف کی تصویر پر ہوتے ہیں یہ کیا بیت اللہ کی بے عزتی نہیں ہے؟

جواب : منقش مصلی پر نماز پڑھنے سے قطعًا پرہیز کرنا چاہیے۔ اس پر بیت اللہ کی تصویر بنی ہو یا نہ۔ صحیح

❶(٦) مجموع الفتاوىٰ لابن تيمية (٣٣٥/٢٧)

❷(٧) ابن أبي شيبة، كتاب صلاة التطوع والامامة في الصلاة في بيت المقدس رقم الباب (٢١٠) (٢٦٨/٢) ح(٧٥٣٨) فيه عن قزعة: سألت عمر...الخ إرواء الغليل(١٤١/٤-١٤٢)وصححه.

❸(٨) اسد الغابة (١/ ٢٤٤- ٢٤٥)لابن الأثير بغير سند وسير أعلام النبلاء للذهبي(٣٥٨/١)وقال : إسناده لين وهو منكر.

حدیث میں ہے:

« إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى فِيْ خَمِيْصَةٍ لَهَا أَعْلَامٌ فَنَظَرَ إِلٰى أَعْلَامِهَا نَظْرَةً فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ : « اِذْهَبُوا بِخَمِيْصَتِيْ هٰذِهٖ إِلٰى أَبِي جَهْمٍ وَائْتُوْنِيْ بِأَنْبِجَانِيَّةِ أَبِيْ جَهْمٍ فَإِنَّهَا أَلْهَتْنِيْ آنِفًا عَنْ صَلَاتِيْ .»(بخاری، بَابٌ إِذَا صَلّٰى فِيْ ثَوْبٍ لَه أَعْلَامٌ وَنَظَرَ إِلٰى أَعْلَامِهَا) ❶

یعنی ''نبی ﷺ نے ایک دفعہ دھاری دار کمبل میں نماز پڑھی تو اس کے نقش و نگار پر نگاہ پڑ گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر فرمایا: میرے اس کمبل کو ابوجہم کے پاس لے جاؤ (اس کے بدلے میں) اس سے سادہ موٹا کمبل لے آؤ۔ کیونکہ اس نے مجھے میری نماز سے غافل کر دیا ہے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَيُسْتَنْبَطُ مِنْهُ كَرَاهِيَةُ كُلِّ مَا يَشْغَلُ عَنِ الصَّلَاةِ مِنَ الْاِصْبَاغِ وَالنُّقُوْشِ وَ نَحْوِهَا. '' (فتح الباری ۱/ ۴۸۳) ❷

سوال: کیا غیر مسلم کو اجازت ہے کہ وہ مسجد میں آ کر اپنی عبادت کرے؟

جواب: مسئلہ ہذا میں اہل علم کا سخت اختلاف ہے۔ لیکن میرے خیال میں بطور تالیف یا مصلحت دین کوئی حرج نہیں جس طرح کہ نصرانی وفد نجران کو آپ ﷺ نے مسجد نبوی ﷺ میں ٹھہرایا۔❸ اور وہ اپنے طور طریقہ پر عبادت کرتا رہا۔ (تفسیر ابن کثیر وغیرہ) لیکن عام حالات میں اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ بظاہر اس سے ان کی شان و شوکت کا پہلو نکلتا ہے۔ جو غلبۂ دین کے منافی ہے۔

قرآن میں ہے: ﴿ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ . ﴾ (الفتح:۲۸)

---

❶(۹) صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، باب إذا صلی فی ثوب له أعلام ..(۳۷۳)، (۷۵۲).

❷(۱۰) باقی رہا مسئلہ بیت اللہ کی توہین کا تو اس سلسلے میں واضح ہو کہ کسی چیز کی تصویر پر اس اصل چیز کے احکام نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات اس کے برعکس احکام لاگو ہوتے ہیں۔ مثلاً انسان کا ادب و احترام کرنے کا حکم ہے مگر انسانی تصویر کا احترام کرنا ممنوع ہے۔ جیسا کہ بعض احادیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔(فأخرج صورة إبراهيم و إسماعيل فی أيديهما من الأزلام......الخ صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب أین رکز النبی ﷺ الرایة یوم الفتح ؟(۴۲۸۸)عن ابن عباس رضی الله عنهما.) (قاری نعیم الحق نعیم رحمہ اللہ)

❸(۱۱) الطبقات لابن سعد(۱/ ۳۵۷) البدایة والنهایة (۵/ ۱۵)، تاریخ الإسلام للذهبی(المغازی/ ۶۹۵) قال ابن اسحاق حدثنی محمد بن جعفر بن الزبیر قال...... الخ.

اور حدیث میں ہے: «اَلْإِسْلَامُ يَعْلُوْ وَلَا يُعْلٰى عَلَيْهِ .»[1]

سوال: قبلہ کی طرف پاؤں پھیلا کر لیٹنا یا سونا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب: جائز ہے کسی حدیث میں منع نہیں آیا۔

سوال: زید نے اپنی گرہ سے مسجد کے لیے ایک پلاٹ گورنمنٹ سے خریدا۔ اپنی گرہ سے مسجد تعمیر کی۔ کسی سے ایک پیسہ تک نہ لیا۔ خود اس کی دیکھ بھال کرتا رہا اور اس مسجد کا متولی بنا رہا۔ مسجد کے اخراجات اپنی گرہ سے ادا کرتا رہا۔ زید کی وفات کے بعد اس کی اولاد دیکھ بھال کرتی رہی۔ اولاد نے بھی اس مسجد کے لیے کسی سے چندہ نہ لیا۔ بعض افراد نے اس مسجد کی ایک انجمن رجسٹرڈ کرالی۔ جس نے متولیان کی بے خبری میں مسجد پر قبضہ کر لیا۔ شریعت اس بارے میں کیا فیصلہ صادر فرماتی ہے۔ انجمن کا یہ فعل درست ہے یا غلط ہے؟ نیز پلاٹ مسجد کے لیے خریدا گیا تھا وہ وقف نہیں ہے اور نہ ہی مسجد کو وقف کیا گیا ہے۔

جواب: بہ نیت مسجد جو زمین خریدی گئی ہو اور بالفعل وہاں مسجد بھی تعمیر کر دی گئی ہو۔ نیز مدت مدید سے وہاں نمازیں بھی پڑھی جا رہی ہوں یہ سب احوال اور قرائن و شواہد اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ قطعہ اراضی وقف ہے بالقول وقف کی صراحت نہ بھی ہو تو کوئی حرج نہیں اسے وقف ہی سمجھا جائے گا۔ بعض صحیح روایات میں وارد ہے ہجرت کے بعد جب نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں نزول فرمایا تو آپ نے یہاں مسجد کی بنیاد کے عزم کا اظہار کیا۔ اس سلسلہ میں بنی النجار کو بلا بھیجا تاکہ مخصوص ٹکڑا مسجد تعمیر کرنے کی خاطر خریدا جا سکے۔ جب آپ ﷺ نے سودا کرنا چاہا تو انہوں نے کہا: "لَا نَطْلُبُ ثَمَنَهٗ إِلَّا إِلَى اللّٰهِ." یعنی ہم تو اس کی قیمت کے صرف اللہ عزوجل سے متمنی ہیں، اسی بات کو وقف کے حکم میں سمجھ کر امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے۔ " بَابُ وَقْفِ الْأَرْضِ لِلْمَسْجِدِ." یعنی زمین کا مسجد کے لیے وقف کرنا۔[2]
(بخاری: ۳۸۹/۱) حتی کہ جو لوگ وقف العقار کے قائل نہیں وہ بھی اس مسئلہ میں متفق ہیں۔

اور جہاں تک تولیت کا تعلق ہے شریعت نے اس کو بھی قابل اعتبار سمجھا ہے۔ (ملاحظہ ہو: بلوغ المرام، باب الوقف)

---

[1] (۱۲) حسنه ابن حجر والألبانی. صحيح البخاری، كتاب الجنائز، باب إذا أسلم الصبی فمات هل يصلی عليه؟ رقم الباب (۷۹) تعليقا، دار قطنی (۲۵۲/۳)، إرواء الغليل (۱۲۶۸)، فتح الباری (۲۲۰/۳) عن ابن عباس.

[2] (۱۳) صحيح البخاری، كتاب الوصايا، باب وقف الأرض للمسجد (۲۷۷۴).

لہٰذا متولی وقف شدہ شی کی اصلاح اور نگہبانی کا ذمہ دار ہے چاہے وہ مسجد ہو یا کوئی اور چیز بلاوجہ اس کے اختیارات کو سلب یا معطل کر دینا درست بات نہیں ہاں اگر وہ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کا مرتکب ہے تو بطریق احسن اس کا محاسبہ ضروری ہے۔ متولی سے صرفِ نظر کر کے علیحدہ انجمن قائم کر لینا، پھر مسجد پر قبضہ مستحسن فعل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ ''اَلْخِلَافُ شَرٌّ.'' یعنی اختلاف بری شے ہے۔ ❶ بلکہ جذبۂ اخوت و مودت کے تحت مسجد کے معاملات کو چلانے کے لیے باہمی مل کر متفقہ انجمن ❷ تشکیل دینی چاہیے۔

﴿ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى . ﴾ (المائدة:٢) (هٰذَا مَا عِنْدِيْ، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ)

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس بارے میں کہ جس طرح مردوں کے لیے مساجد میں دینی تبلیغی اصلاحی اجتماعات اور جلسے منعقد کئے جاتے ہیں کیا اسی طرح عورتوں کے لیے بھی مساجد میں ان کی اصلاح اور تربیت کے لیے جلسے منعقد کئے جا سکتے ہیں؟ جبکہ مبلغات اور مقررات بھی صرف عورتیں ہی ہوں۔ کتاب و سنت کی روشنی میں مسئلہ واضح فرمائیں۔

جواب: بوقت ضرورت جملہ تحفظات کے ساتھ اگر عورتوں کے تبلیغی و اصلاحی اجتماعات اور محافل خیر کا انعقاد مسجدوں میں ہو جائے تو اسلامی شریعت کی رو سے منع نہیں جائز ہے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ہے:

« لَا تَمْنَعُوا النِّسَاءَ حُظُوظَهُنَّ مِنَ الْمَسَاجِدِ ،إِذَا اسْتَأْذَنَّكُمْ .»

(فتح الباري ٢/ ٣٤٨)

''یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب عورتیں تم سے اجازت مانگیں تو ان کو مساجد کے حصہ سے منع نہ کرو۔'' ❸

---

❶ (١٤) صححه الألباني،صحيح أبي داؤد ،كتاب المناسك ،باب الصلاة بمنى(١٩٦٠).

❷ تنظیم سازی کی یہ ''مغربی بدعت'' جب سے ہمارے اسلامی ملکوں میں آئی ہے اس نے ہر چیز کا ستیاناس کر دیا ہے۔ سیاسی پارٹیاں بھی اسی بدعت کا نتیجہ ہیں جنہوں نے ملک کا بیڑا غرق کیا۔ مذہبی جماعتوں کے اندر بھی اسی نے دھڑے بندیوں کو فروغ دیا اور مسجدوں، مدرسوں اور دینی اداروں کے اندر بھی باہمی محاذ آرائی کا باعث بالعموم یہی تنظیم سازی کا رجحان ہے۔ اس لیے اس ''بدعت'' سے جتنا بچا جا سکے بچنے کا اہتمام اور شخص واحد کے ذریعے سے جب تک صحیح طریقے سے کام چل رہا ہو اس کو تبدیل کرنے سے گریز ہی کرنا چاہیے جیسا کہ حضرت مفتی صاحب دام ظلہ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (صلاح الدین یوسف)

❸ (١٥) صحيح مسلم، كتاب الصلاة،باب خروج النساء إلى المساجد(٩٩٥).المشكاة(١٠٨٢).

حدیث ہذا کے عموم میں تبلیغی، اصلاحی، تربیتی اجتماعات کو منعقد کرنا بھی شامل ہے۔ شرعاً عورتوں کو بیعت اللہ میں آمدو رفت کی اجازت کا تقاضا ہے کہ ان کو بھی اپنی حدود کے اندر فریضہ ''امر بالمعروف والنھی عن المنکر'' کی ادائیگی کا حق حاصل ہو۔ عیدگاہ جو مسجد کے حکم میں ہے، رسول اللہ ﷺ اس میں خواتین کے لیے وعظ و نصیحت اور تذکیر کا مخصوص انداز اختیار کر کے بعض اہم مسائل میں ان سے ایفاء عہد کا مطالبہ فرماتے۔ ❶

پھر ازواج مطہرات کا آپ ﷺ کے ہمراہ اعتکاف بیٹھنا ❷ اور گاہے بگاہے بعض کا آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہونا ❸ اور بحالت اعتکاف مباشرت سے منع کرنا ❹ اور بعض بے سہارا خواتین کا مستقل طور پر مسجد نبوی ﷺ میں قیام کرنا۔ ❺ وغیرہ وغیرہ۔

جملہ امور اس بات کے مؤید ہیں کہ عورتوں کو مساجد میں قیام کی اجازت ہے وقوف کے جواز سے ''دعوت الی اللہ'' کا پہلو خود بخود ثابت ہو گیا۔ کیونکہ مومن ہر حالت میں اشاعت اسلام کا مکلّف ہے فرمایا:

«بَلِّغُوا عَنِّی وَلَو آیَةً.» ❻

یاد رہے اوائل اسلام میں مردوں کے اجتماعات ہیئت و شکل کے اعتبار سے ہمارے جلسوں کی طرح بالاہتمام منعقد نہیں ہوتے تھے بلکہ آج ان کے جواز کا انحصار محض عمومی نصوص پر ہے جن میں ''دعوت الی اللہ'' کی ترغیب و تحریض ہے۔ اسی طرح عورتوں کے معاملہ کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔

سوال: بند کمرے کے اندر قبلہ کی طرف پاؤں کر کے سویا جا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: سونے والا کمرے کے اندر ہو یا باہر۔ کسی حدیث میں قبلہ رخ پاؤں کرنا منع نہیں آیا۔ البتہ طبعی

---

❶(١٦) صحیح البخاری، کتاب العیدین، باب موعظة الإمام النساء یوم العید(٩٧٩). صحیح مسلم، کتاب العیدین، باب صلاة العیدین(٢٠٤٤، ٢٠٤٨).

❷(١٧) صحیح البخاری، کتاب الاعتکاف، باب اعتکاف النساء(٢٠٣٣)و(٢٠٣٧). صحیح مسلم، کتاب الاعتکاف، باب الاعتکاف العشر الأواخر(٢٧٨٤)و باب متی یدخل من أراد الاعتکاف(٢٧٨٥).

❸(١٨) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب زیارة المرأة زوجها فی اعتکافه(٢٠٣٨)و(٢٠٣٥).

❹(١٩) (البقرة:١٨٧).

❺(٢٠) صحیح البخاری کتاب الصلاة باب نوم المرأة فی المسجد (٤٣٩).

❻ (٢١) صحیح البخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب ما ذکر عن بنی إسرائیل (٣٤٦١ عن عبداللہ بن عمرو)

احترام کا تقاضا یہ ہے کہ قبلہ کی طرف پاؤں کرنے سے احتراز کیا جائے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ . ﴾(الحج:٣٢)

سوال: جنازہ اٹھایا ہوا ہو تو میت کے پاؤں قبلہ کی طرف ہو جائیں تو کوئی حرج تو نہیں؟ جب کہ قبرستان کی طرف جائیں تو پیٹھ قبلہ کی طرف ہوتی ہے (یعنی راستہ ہی ایسا ہے)

نیز بتائیں کہ قبلہ کی طرف پاؤں نہ کرنے کا حکم آیا حدیث سے ثابت ہے یا کہ صرف تعظیم اور ادب کی خاطر ہے؟

جواب : میت کے پاؤں قبلہ رخ ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ کسی روایت میں منع نہیں آیا۔ البتہ اگر کوئی عمومی آیت: ﴿ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ . ﴾(الحج :٣٢) کے پیش نظر ایسا نہ کرے تو یہ بھی درست فعل ہے۔

جب کہ دوسری طرف نماز پڑھنے کی بعض صورتوں میں قبلہ رخ پاؤں کرنے کا جواز بھی وارد ہے تو اس صورت میں ان روایات کو مستثنیات کی سی حیثیت حاصل ہوگی۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَاب. بہرصورت مسئلہ ہذا میں تشدد کا پہلو اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ جونسی صورت بھی ہو غیر درست فعل ہے۔

سوال: مسجد کے قریب قبر بنانا کیسا ہے؟ یا قبر کے نزدیک مسجد بنانا جائز ہے کہ نہیں؟ ایسی مساجد میں نماز ہو جاتی ہے؟ جب کہ قبر نبوی ﷺ آج کل مسجد کے اندر ہی موجود ہے۔ اردگرد مسجد ہے۔ لوگ نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ اگر یہ استثناء ہے تو کس دلیل سے؟ (یہاں پر تین قبریں ہیں)

جواب : مسجد کے نزدیک قبر بنانا یا قبر کے نزدیک مسجد تعمیر کرنا دونوں طرح ناجائز ہے۔ کیونکہ اسلام میں مسجد اور قبر کا اجتماع ممنوع ہے حدیث میں ہے:

« اِجْعَلُوْا فِيْ بُيُوْتِكُمْ صَلَاتَكُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْهَا قُبُوْرًا.» (بخاری و مسلم)

یعنی ''گھروں میں بھی نماز پڑھا کرو انہیں قبریں مت بناؤ!'' [1]

اور دوسری روایت میں ہے:

« اَلْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدٌ إِلَّا الْمَقْبَرَةَ وَالْحَمَّامَ .» (رَوَاهُ الْبَزَّارُ وَغَيْرُهُ)

---

[1] (٢٢) صحيح البخارى ، باب كراهية الصلاة فى المقابر (٤٣٢) ، صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب استحباب صلاة النافلة فى بيته……(١٨٢٤).

یعنی ''قبرستان اور حمام کے علاوہ تمام زمین مسجد ہے۔'' ❶

اول الذکر روایت سے اکثر اہل علم نے استدلال کیا ہے کہ قبرستان محل نماز نہیں ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث ہذا پر «كَرَاهَةُ الصَّلَاةِ فِي الْمَقَابِرِ» کا ترجمہ قائم کیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ جس نے قبرستان میں یا کسی قبر کی جانب رخ کر کے نماز پڑھی وہ اس کا اعادہ کرے اور جہاں تک مسجد نبوی کا تعلق ہے سو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اس کی فضیلت خصوصی حیثیت سے ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے میری اس مسجد میں نماز کا ثواب دوسری مساجد کے مقابلہ میں ہزار نماز سے زیادہ ہے۔ ماسوائے مسجد الحرام کے کہ وہ اس سے افضل ہے۔ ❷

اور دوسری روایت میں ہے کہ میرے بیت یعنی حجرہ اور منبر کے درمیان کا قطعہ جنت کے باغات سے ہے۔ ❸ لہٰذا اگر مسجد نبوی ﷺ میں نماز کی کراہت کا فتویٰ دیا جائے تو اس کی حیثیت دوسری مساجد کے برابر ہو جائے گی اور ان فضائل کی نفی لازم آئے گی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی معروف کتاب: '' الجواب الباهر''

سوال: بخدمت مدیر ''الاعتصام'' و مفتی ''الاعتصام'' سلام مسنون!

روز نامہ ''جنگ'' لاہور کی ۱۲ مئی کی اشاعت میں ہی خبر نظروں سے گذری کہ ''گورنر مکہ'' نے خانہ کعبہ کو غسل دیا اور ہزاروں عبادت گزاروں نے اس روح پرور منظر کو دیکھا نیز غلاف کعبہ ۱۹ مئی کو تبدیل ہو گا۔ ایک غلاف کی تیاری پر ۱۷ ملین ریال کا خرچہ آیا ہے۔ غلاف کی تیاری مکہ مکرمہ میں قائم خصوصی کارخانے میں ہوئی ہے۔ (جنگ لاہور ۱۲ مئی ۱۹۹۴ء)

سوال یہ ہے کہ یہ غسل و غلاف کعبہ اور اس پر اتنا کثیر خرچ۔ کیا حدیث وسنت سے ثابت ہے؟ یا کہ یہ ایک تاریخی قسم کی رسم ہے۔ جسے نبھایا جا رہا ہے؟ جب کہ اتنے خرچہ سے کئی غریب مسلمان ممالک اور بے شمار

---

❶ (۲۳) صححه الحاكم والذهبي وابن حبان وابن خزيمة والألباني وإرشاد الحق الأثري. صحيح أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب في المواضع التي لا تجوز فيها الصلاة (٤٩٢)، أحمد (٣/٨٣، ٩٣)، الترمذي (٣١٧)، مسند السراج بتحقيق الأثري (٥٠١، ٥٠٢)، الحاكم (١/٢٥١)، الإرواء (٢٨٧) (١/٣٢٠).

❷ (٢٤) صحيح البخاري، كتاب وباب فضل الصلاة في مسجد مكة والمدينة (١١٩٠)، صحيح مسلم، كتاب الحج، باب فضل الصلاة لمسجد مكة والمدينة (٣٣٧٤).

❸ (٢٥) صحيح البخاري، كتاب فضل الصلاة في مسجد مكة والمدينة، باب فضل ما بين القبر والمنبر (١١٩٥، ١١٩٦)، صحيح مسلم، كتاب الحج، باب فضل ما بين قبره صلى الله عليه وسلم ومنبره (٣٣٦٨).

غریب اہل اسلام کی معاونت و کفالت ہو سکتی ہے نیز دیگر معاملات میں جب اسراف سے اجتناب اور سادگی اور کفایت شعاری کا درس دیا جاتا ہے تو غلاف کعبہ کے سلسلہ میں اس پر عمل کیوں نہیں کیا جاتا؟

علاوہ ازیں کعبہ شریف اپنی عظمت کے باوجود جب پتھر سے تعمیر شدہ ہے تو اسے کپڑے پہنانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اس کا کیا فائدہ ہے؟ کیا اسے لباس و غلاف پہنانا غیر ضروری و بے مقصد نہیں؟

جواب: کعبہ کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اغلب ادوار میں اس پر بہتر سے بہتر غلاف چڑھایا گیا۔ اہل علم نے اس پر نکیر نہیں فرمائی۔ بالخصوص سلف صالحین جن کے افعال و اقوال کو منارۂ ہدایت سمجھا جاتا ہے بلکہ فعل ہذا کو بنظر استحسان دیکھا گیا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ، قاضی زین الدین عبدالباسط کے بارے میں فرماتے ہیں:

" فَبَالَغَ فِیْ تَحْسِیْنِهَا بِحَیْثُ یَعْجِزُ الْوَاصِفُ عَنْ صِفَةِ حُسْنِهَا جَزَاهُ اللّٰهُ عَلٰی ذٰلِكَ أَفْضَلَ الْمُجَازَاةِ ." (فتح الباری ۳/ ٤٦٠)

یعنی "اس نے غلاف کی بے انتہاء تحسین و تزیین کی کہ بیان کرنے والا اس کے بیان اور توصیف سے قاصر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس عمل پر ان کو بہترین بدلہ سے نوازے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے انفاق ہذا اسراف و تبذیر کے زمرہ میں داخل نہیں۔ کیونکہ اس پر بتواتر عملی اجازت موجود ہے۔ اسی بنا پر اہل علم کہتے ہیں کہ دیگر مساجد کو کعبہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس عظیم خدمت کے علاوہ واضح ہو کہ موجودہ دور میں سعودی حکومت کی افضل ترین حسنات سے حرمین کی توسیع کا شاندار منصوبہ ہے جو تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ آل سعود کا یہ ایک عظیم کارنامہ ہے جس کی مثال پیش کرنے سے آج کی دنیا قاصر ہے۔ رب تعالیٰ نے انہیں زمینی خزانوں سے نوازا ہے تو اس کے پسندیدہ مقامات پر زائرین کے آرام کی خاطر اس دولت کو اس کی راہ میں لٹایا اور پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ رَبِّ زِدْ فَزِدْ. ہر زائر کی زبان سے بے ساختہ اس حکومت کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْن، اس موحد سرکار کو تادیر قائم رکھنا تاکہ تیرے دین برحق کی خدمت کرتی رہے۔ آمین یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْن .

اسی طرح غسل کعبہ بھی عملی تواتر کی قبیل سے ہے بعض روایات میں تصریح موجود ہے کہ فتح مکہ کے موقعہ پر نبی ﷺ نے بتوں کو توڑنے اور تصویروں کو مٹانے کے بعد کعبہ کو غسل دینے کا حکم دیا تھا۔

« إِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَ بِغَسْلِ الْكَعْبَةِ بَعْدَ مَا كَسَرَ الْأَصْنَامَ وَ طَمَسَ

التَّصَاوِيرَ.» ❶...... الحدیث (تاریخ الکعبة المعظمة صـ۳۲۷، بحوالہ حسین عبداللہ با سلامہ۔ بخاری)

یاد رہے کسوۃ کعبہ کے تیسرے باب میں کافی مواد موجود ہے جو فی الجملہ مفید ہے۔ ملاحظہ ہو: (ص۲۲۷-۲۷۲) نیز غلاف صرف کعبہ کے احترام کی خاطر پہنایا جاتا ہے جو اسی کا خاصہ ہے۔ ❷ ترمذی میں حدیث ہے:

« و سترتم بیوتکم کما تستر الکعبة .» ❸

یعنی ''قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم اپنے گھروں کو ایسے ڈھانکو گے جیسے کعبہ ڈھانکا جاتا ہے۔'' ❹

یہاں مزید عقلی توجیہات کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ مسلمان ہمیشہ احکام الٰہی کا پابند ہوتا ہے چاہے کسی شے کی مشروعیت اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

حجر اسود کے بارے میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جس نے اس کا برحق استلام کیا روز جزا اس کا گواہ بن کر آئے گا۔ ❺ اگرچہ ان روایات میں سے کئی ایک متکلم فیہ ہیں لیکن مجموعی طور پر وہ قابل حجت ہیں۔ (فتح الباری (۳/ ۴۶۲)، بَابُ مَا ذُكِرَ فِي الْحَجَرِ الْأَسْوَدِ). لیکن کعبہ کی بابت کوئی روایت نظر سے نہیں گزری جس میں اس بات کی تصریح ہو۔ وَاللّٰهُ الْهَادِيْ لِلصَّوَابِ.

سوال: مقام ابراہیم علیہ السلام پر پاؤں کے نشانات کیا واقعی ابراہیم علیہ السلام کے قدم کے ہیں؟

---

❶ (۲۶) الطحاوی (۲۸۳/۴) شرح معانی الآثار

❷ جس میں کسی دوسری عمارت کو شریک نہیں کرنا چاہیے اسی لیے وہ حتی المقدور اچھا ہونا چاہیے گھٹیا قسم کے کپڑوں سے کسی کا کیا احترام ہوگا۔ (نعیم الحق نعیم)

❸ (۲۷) ضعفه الألبانی، الترمذی، ابواب صفة القیامة، رقم الباب (۳۵) ح(۲۴۷۶) وضعیف سنن الترمذی (۲۶۰۷).

❹ کسی عمارت کو یا زیب و زینت کی خاطر ڈھانکا جاتا ہے (جیسے گھروں میں پردے لٹکانا) یا ادب و احترام کی خاطر (جیسے کعبۃ اللہ پر غلاف چڑھایا جاتا ہے) ترمذی کی اس روایت سے معلوم ہوا کہ جب گھروں کو زیب و زینت کے خیال سے ڈھانکنا بھی شرعاً پسند نہیں کیا گیا تو پھر عمارت کو کسی ادب و احترام کی خاطر ڈھانکنا کیسے جائز ہوسکتا ہے کیوں کہ اس سے کعبۃ اللہ کے امتیاز و تشخص کا مجروح ہونا اور اس کی خصوصیات میں دوسری عمارتوں کا شریک ہونا لازم آتا ہے۔ (نعیم الحق نعیم)

❺ (۲۸) صححه الحاکم والذهبی وابن خزیمة وابن حجر. الحاکم (۴۵۷/۱) (۱۶۸۰) وابن خزیمة (۲۲۰/۴، ۲۲۱) عن ابن عباس وعبدالله بن عمرو . فتح الباری (۴۶۲/۳) شرح الحدیث (۱۵۹۷).

جواب : تاریخی اور تفسیری روایات میں اسی طرح مشہور ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں :

" وَكَانَتُ آثَارُ قَدَمَيُهِ ظَاهِرَةً فِيُهِ وَلَمُ يَزَلُ هٰذَا مَعُرُوفاً تَعُرِفُهُ الُعَرَبُ فِيُ جَاهِلِيَّتِهَا۔"

(تفسیر ابن کثیر ۱/۱۱۸)

یعنی "حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کے نشانات پتھر میں نمایاں ہیں۔ ہمیشہ سے یہ بات معروف ہے۔ عرب اپنے زمانۂ جاہلیت میں بھی اس سے شناسا تھے۔"

تفسیر قرطبی (۱۱۳/۲) میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اثبات نقل کیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتح الباری:۸/۱۶۹) شہرت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کا اصل ہے۔

سوال: گورنمنٹ مکتب سکولوں کے لیے مسجد کی عمارت استعمال کی جاتی ہے یہ قرآن وسنت کی روشنی میں جائز ہے یا ناجائز؟ جب کہ یہاں پر چھوٹے بچے ایک دوسرے کو گالی گلوچ دیتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

جواب : مکتب سکولوں کے لیے مسجد کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ تاہم کوشش کرنی چاہیے کہ بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ مسجد ہی میں نہیں بلکہ ہر جگہ ہی اپنی زبان کو گالی گلوچ سے پاک رکھیں۔

❀❀❀❀❀❀❀

فرمانِ باری تعالیٰ

﴿ وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ (آل عمران: ١٣٥)

فرمانِ رسول ﷺ

« إِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلٰى لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِهِ. » (جامع ترمذی: ١٠/١٦٩، مع تحفة الأحوذی)

﴿۴﴾ قرآن مجید اوراس کے متعلقات

سوال: قرآن پاک کی ویڈیو فلم بنا سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: احترام کے تقاضوں کے مطابق ہوتو جائز ہے۔

سوال: قرآن پاک ہاتھ سے گر جائے تو بسم اللہ پڑھ کر اٹھالیں۔ یہ کافی ہے یا کوئی اور قید بھی ہے؟

جواب: بسم اللہ کے علاوہ کوتاہی پر ندامت کا اظہار بھی ہونا چاہیے۔

سوال: فرعون کے بارے میں اکثر علماء کہتے ہیں کہ وہ لاولد تھا۔ جب کہ اشرف علی تھانوی صاحب نے بہشتی زیور جلد نمبر ۸ میں فرعون کی بیٹی کا ذکر کیا ہے۔ اس بارے میں واضح جواب چاہیے؟

جواب: تفسیر ''احسن التفاسیر'' میں ہے: حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا کے فرعون سے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس واسطے آسیہ رضی اللہ عنہا نے یہ بھی کہا کہ ہم اس کو لے پالک بیٹا بنا لیں گے۔ (۵/۷۷) لیکن اس سے مطلق اولاد کی نفی لازم نہیں آتی۔ ممکن ہے ہو۔ مجھے کوئی نفی کی نص معلوم نہیں ہو سکی۔

سوال: اگر قرآن مجید گر جائے تو اس کے گرنے کا کوئی صدقہ یا خیرات کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

جواب: قرآن گرنے کا شرع میں کوئی مخصوص صدقہ نہیں، البتہ اپنی اس کوتاہی پر رب کے حضور استغفار کی صورت میں توبہ وانابت کا اظہار ضرور ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوْٓا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ . ﴾

(آل عمران:۱۳۵)

''اور وہ کہ جب کوئی کھلا گناہ یا اپنے حق میں کوئی اور برائی کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے؟ اور جو جان بوجھ کر اپنے افعال پر اڑے نہیں رہتے۔''

سوال: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى .﴾ کے بعد مقتدی "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى." کہیں یا نہیں؟

جواب: آیت کریمہ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى.﴾ کے بعد مقتدی کے لیے "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى." کہنا کسی مرفوع متصل روایت سے ثابت نہیں۔ [1] اسی طرح دیگر بعض آیات کے جوابات بھی مقتدی کے لیے ثابت نہیں ہو سکے۔ جملہ تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہو میرا تفصیلی فتویٰ: (ماہنامہ محدث لاہور، جلد ۹، عدد ۱-۲)

سوال: اللہ قرآن میں فرماتا ہے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ یا اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت عطا فرماتا ہے۔ ایسا قرآن میں بہت سی جگہ ہے اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: قرآنی آیات میں سے مقصود یہ ہے کہ لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن میں ضبط کا مادہ ہوتا ہے اور نفس پر کنٹرول کر سکتے ہیں۔ دوسرے وہ جو اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں اور کسی کا حکم اپنے اوپر لینے کے لیے تیار نہیں۔ ایسے لوگوں کو ہدایت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ انکار کر کے یا خواہش نفسانی کے تابع ہو کر حق سے دور ہو جاتے ہیں اور اللہ کی طرف سے ایسے لوگوں کو توفیق نہیں ملتی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو کر ان کی باگ ڈور ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے جس سے گمراہی کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَأَمَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ إِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ . وَ أَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ .﴾ (التوبة: ١٢٥)

"سو جو ایمان لائے ہیں ان کا تو ایمان زیادہ کیا اور وہ خوش ہوتے ہیں اور جن کے دلوں میں مرض ہے ان کے حق میں خبث پر خبث زیادہ کیا اور وہ مرے بھی تو کافر کے کافر۔"

نیز علامہ سعدی "تَيْسِيْرُ الْكَرِيْمِ الرَّحْمٰنِ فِيْ تَفْسِيْرِ كَلَامِ الْمَنَّانِ" میں فرماتے ہیں:

" فَاقْتَضَتْ حِكْمَتُهٗ تَعَالٰى إِضْلَالَهُمْ لِعَدَمِ صَلَاحِيَّتِهِمْ لِلْهُدٰى كَمَا اقْتَضٰى فَضْلُه

---

[1] (۲۹) ابوداود نے اسے روایت کیا ہے۔ اس میں ابو سبیعی مدلس ہے جس کی وجہ سے یہ روایت ضعیف ہے۔

فائدہ= ① "سورۃ التین" کی آخری آیت ﴿ أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ ﴾ کے جواب میں " اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِي حِسَابًا يَسِيْرًا " کے ساتھ صرف امام جواب دے سکتا ہے۔ (احمد (٤٨/٦) (١٤٠٩٧) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا۔ اس کی سند صحیح ہے۔ ② سورۃ "الرحمٰن" کی آیت ﴿ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا ...... ﴾الخ" کے جواب میں سننے والے ان الفاظ کے ساتھ " وَ لَا بِشَيْءٍ مِّنْ نِّعَمِتِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ " جواب دے سکتے ہیں یاد رکھنا چاہیے یہ نماز سے باہر کی بات ہے عام حالات کی بات ہے نماز کا اس میں ذکر نہیں۔ (الحاکم (٤٧٣/٢) (٣٧٦٦)، وصححه على شرط الشيخين و وافقه الذهبي.) مأخوذ من "احکام و مسائل" از مبشر احمد ربانی عفی اللّٰه عنه.

وَ حِكْمَتُهٗ هِدَايَةَ مَنِ اتَّصَفَ بِالْإِيْمَانِ وَ تَحَلّٰى بِالْأَعْمَالِ الصَّالِحَةِ ."(٦/١)

یعنی "اللہ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ کفار میں ہدایت کی صلاحیت نہ ہونے کی بنا پر ان کو گمراہ کر دیا گیا۔ جس طرح کہ اس کے فضل وحکمت کا اقتضاء ہوا کہ ایمان سے متصف اور اعمال صالحہ کو اپنانے والے کو ہدایت دے۔"

سوال: عرض ہے کہ ہمارے گاؤں "سوکن ونڈ" کے گورنمنٹ رضائے مصطفیٰ ہائی سکول کے ایک استاد نے چھٹی جماعت کے ٹیسٹ پیپرز گائیڈ یعنی امدادی کتب (جو سکول میں لانا منع ہیں۔ جن میں دینیات و عربی کی قرآنی آیات موجود ہیں) بچوں سے اکٹھی کر کے (جن کی تعداد تقریباً ۵۰ ہے) مٹی کا تیل ڈال کر جلا دیں۔ اس کے متعلق شرعی احکام کیا ہیں؟ اس استاد کو قرآن وسنت کی روشنی میں شرعی سزا دی جا سکتی ہے یا نہیں؟

جواب: قرآنی آیات والے بوسیدہ اوراق کو ضائع کرنا جائز ہے۔ پانی میں بہا دیئے جائیں یا پاکیزہ زمین میں دفن کر دیئے جائیں۔ اوراق کو جلانے کا عمل بھی درست ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

" وَ أَمَرَ بِمَا سِوَاهُ مِنَ الْقُرْآنِ فِيْ كُلِّ صَحِيْفَةٍ أَوْ مُصْحَفٍ أَنْ يُّحْرَقَ ."

(باب جمع القرآن)

"حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے صحف سے منقول قرآن کے علاوہ ہر صحیفے یا مصحف میں جو قرآن ہے اسے جلانے کا حکم صادر فرمایا۔"[1]

شارح بخاری امام ابوالحسن ابن بطال رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فِيْ هٰذَا الْحَدِيْثِ جَوَازُ تَحْرِيْقِ الْكُتُبِ الَّتِيْ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ بِالنَّارِ وَ إِنَّ ذٰلِكَ إِكْرَامٌ لَهَا وَصَوْنٌ عَنْ وَطْئِهَا بِالْأَقْدَامِ ،وَقَدْ أَخْرَجَ عَبْدُ الرَّزَّاقِ عَنْ طَرِيْقِ طَاؤُوْسٍ أَنَّهٗ كَانَ يُحْرِقُ الرَّسَائِلَ الَّتِيْ فِيْهَا الْبَسْمَلَةُ إِذَا اجْتَمَعَتْ، وَكَذَا فَعَلَ عُرْوَةُ ."

"اس حدیث میں یہ مسئلہ ہے کہ ان کتابوں کو جلانا جائز ہے، جن میں اللہ عزوجل کا اسم گرامی ہو۔

---

[1] (٣٠) صحيح البخاري (٤٩٨٧).

اس میں ان کی عزت واکرام ہے، بجائے اس کے کہ قدموں کے نیچے روندے جائیں اور ان کی بے ادبی ہو۔ طاؤس کے پاس جب اللہ کے نام والے کتب و رسائل جمع ہو جاتے تو انہیں جلا ڈالتے۔ عروہ کا فعل بھی اسی طرح مروی ہے۔(فتح الباری:۲۱/۹)

لہٰذا موصوف کے فعل ہذا پر شرعی طور پر کوئی مواخذہ نہیں۔

سوال: ہمارے ہاں ایک دیو بندی مبلغ نے یہ بیان کیا ہے: ''قرآن مجید کلام الٰہی نہیں ہے بلکہ مخلوق ہے'' ان کا موقف یہ ہے کہ قرآن مجید صفت ہے اور صفت پیدا ہوتی ہے، اس لیے قرآن مجید مخلوق ٹھہرا۔ جب ہم نے ان سے بحث کی تو وہ کہنے لگے کہ ''ہم اپنے علماء سے فتویٰ منگوا کر آپ کو دکھا سکتے ہیں۔ آپ بھی اپنے علماء سے فتویٰ منگوا کر تسلی کر لیں'' اس مسئلہ کا جواب مطلوب ہے؟

جواب: قرآن مجید کلام اللہ اور غیر مخلوق ہے۔ سورہ توبہ میں ہے:

﴿ حَتّٰی یَسۡمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ . ﴾ (التوبۃ:٦)

''یہاں تک کہ کلام الٰہی سننے لگے۔''

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے بے مثال اور بے نظیر ہے اسی طرح اس کی صفات بھی بے مثال اور بے نظیر ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ وَ ھُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ. ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

''اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ دیکھتا سنتا ہے۔''

اس آیت کریمہ میں جہاں باری تعالیٰ کی بے مثالی ذکر ہوئی ہے وہاں اس کا دیکھنا اور سننا بھی مذکور ہے۔ یعنی صفات الٰہی کا اثبات ہے۔ اس طرح سارا قرآن کریم صفت الٰہی غیر مخلوق اور معجز ہے۔ امام طحاوی حنفی رحمہ اللہ عقیدہ طحاویہ میں فرماتے ہیں:

'' إِنَّ الۡقُرۡآنَ کَلَامُ اللّٰہِ ،مِنۡہُ بَدَا بِلَاکَیۡفِیَّاتٍ قَوۡلًا وَ أَنۡزَلَہٗ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ وَحۡیًا، وَصَدَّقَہُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ عَلٰی ذٰلِکَ حَقًّا وَ أَیۡقَنُوۡا أَنَّہٗ کَلَامُ اللّٰہِ الۡحَقِیۡقَۃَ ،لَیۡسَ مَخۡلُوۡقًا کَکَلَامِ الۡبَرِیَّۃِ ،فَمَنۡ سَمِعَہٗ فَزَعَمَ أَنَّہٗ کَلَامُ الۡبَشَرِ فَقَدۡ کَفَرَ وَ قَدۡ ذَمَّہُ اللّٰہُ وَ عَابَہٗ وَ أَوۡعَدَ بِسَقَرَ ،حَیۡثُ قَالَ تَعَالٰی:﴿ سَأُصۡلِیۡہِ سَقَرَ . ﴾ فَلَمَّا أَوۡعَدَ اللّٰہُ بِسَقَرَ لِمَنۡ قَالَ:﴿ إِنۡ ھٰذَا إِلَّا قَوۡلُ الۡبَشَرِ . ﴾ عَلِمۡنَا وَ أَیۡقَنَّا أَنَّہٗ قَوۡلُ خَالِقِ الۡبَشَرِ ،وَلَا یُشۡبِہُ

قَوْلَ الْبَشَرِ." (شرح العقيدة الطحاوية ،ص:١٢٧-١٢٨)

''قرآن اللہ کا کلام ہے جو اسی سے ظاہر ہوا۔ ہمیں اس کے تکلم کی کیفیت معلوم نہیں۔ اس نے وحی کی صورت میں اسے اپنے رسولِ کریم ﷺ پر نازل فرمایا۔ اور مومنوں نے اس کے برحق ہونے کی تصدیق کی اور انہیں یقین ہوا کہ یہ حقیقتاً اللہ کا کلام اور غیر مخلوق ہے۔ لوگوں کے کلام کی طرح مخلوق نہیں۔ جو اسے سن کر خیال کرے کہ یہ بشر کا کلام ہے تو وہ کافر ہے۔ ایسے شخص کی اللہ نے مذمت کی اور اس پر عیب لگایا اور دوزخ کے طبقہ ''سقر'' میں داخل کرنے کی دھمکی دی، جس آدمی نے یہ کہا تھا کہ ''قرآن تو محض انسانی کلام ہے۔'' اللہ نے اس کو دوزخ کی دھمکی دی تو ہمیں علم اور یقین ہو گیا کہ یہ خالق بشر کا کلام ہے۔ اور بشر کے کلام کے مشابہ نہیں۔''

کتب توحید میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول معروف ہے کہ ''اللہ جانتا ہے لیکن اس کا جاننا ہمارے جاننے کی طرح نہیں۔ اللہ قادر ہے، اس کی قدرت ہماری قدرت کی طرح نہیں۔ اللہ متکلم ہے لیکن اس کا کلام مخلوق کے کلام جیسا نہیں۔ اللہ سمیع ہے اس کا سننا ہمارے سننے کی طرح نہیں۔ وہ دیکھتا ہے اس کا دیکھنا ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں۔'' اس لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا . ﴾ (مریم:٦٥)

''بھلا تم اس کا کوئی ہم نام جانتے ہو۔''

شارح عقیدہ طحاویہ علامہ ابن ابی العز حنفی فرماتے ہیں:

" وَبِالْجُمْلَةِ أَهْلُ السُّنَّةِ كُلُّهُمْ مِنْ أَهْلِ الْمَذَاهِبِ الْأَرْبَعَةِ وَغَيْرِهِمْ مِنَ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ مُتَّفِقُوْنَ عَلَى أَنَّ كَلَامَ اللّٰهِ غَيْرُ مَخْلُوْقٍ."

''جملہ اہل سنت، مذاہب اربعہ کے پیروکار اور دیگر سلف و خلف سب اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے۔'' (ص:١٣٧)

تفصیلی بحث کے لیے کتب توحید ملاحظہ فرمائیں۔

سوال: قرآن مجید میں ہے:

1 ...... ﴿ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا . ﴾

۲ ...... ﴿ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا . ﴾

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ غور و تدبر اور فہم کا تعلق دل سے ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کام دل کا نہیں ہے بلکہ دماغ کا ہے۔

جواب : عقل و شعور اور تدبر و فہم کا اصل محل اور مقام بنی آدم کا دل ہے جس طرح کہ متعدد قرآنی آیات اور بے شمار احادیث نبویہ ﷺ میں تصریح موجود ہے۔ بطور مثال سورۃ الحج کی آیت نمبر ۴۸ ملاحظہ فرمائیں، فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَ لَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ. ﴾ (الحج:٤٦)

یعنی ''کیا ان لوگوں نے زمین میں سیر نہیں کی تا کہ ان کے دل (ایسے) ہوتے کہ ان سے سمجھ سکتے اور کان (ایسے) ہوتے کہ ان سے سن سکتے بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں (وہ) اندھے ہوتے ہیں۔''

زیر آیت ہذا امام شوکانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

'' وَ أَسْنَدَ التَّعَقُّلَ إِلَى قُلُوبٍ لِأَنَّهَا مَحَلُّ الْعَقْلِ كَمَا أَنَّ الْآذَانَ مَحَلُّ السَّمْعِ وَ قِيلَ: الْعَقْلُ مَحَلُّهُ الدِّمَاغُ ،وَلَا مَانِعَ مِنْ ذٰلِكَ فَالْقَلْبُ هُوَالَّذِي يَبْعَثُ عَلَى إِدْرَاكِ الْعَقْلِ وَ إِنْ كَانَ مَحَلُّه خَارِجًا عَنْهُ.'' (فتح القدير:٤٥٩/٣)

یعنی ''ادراک و شعور کی نسبت قلوب کی طرف اس لیے ہے کہ وہ عقل کا محل ہیں جس طرح کہ کان سماع کا محل ہیں۔ اور ایک غیر معروف قول یہ بھی ہے کہ عقل کا محل دماغ ہے۔ یہ بات اول الذکر قول کے منافی نہیں کیوں کہ دل منشائے ادراک و فہم ہے۔ اگرچہ عقل کا جائے استقرار قلب سے خارج دماغ ہے۔''

اس توضیح و تشریح سے معلوم ہوا کہ اصلاً دل ہی چشمۂ ظہور عقل و فہم ہے۔ اور من وجہ اس کا تعلق دماغ سے بھی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا قرآن نے اصل کے اعتبار سے فہم و تدبر کی نسبت دل کی طرف کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَنْ كَانَ لَه قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ . ﴾ (ق :٣٧)

اور علامہ فخر الدین رازی کے سوال نمبر ۴ عنوان قائم کر کے فرماتے ہیں:

" هَلْ تَدُلُّ الْآيَةُ عَلٰى اَنَّ الْعَقْلَ هُوَ الْعِلْمُ وَ عَلٰى اَنَّ مَحَلَّ الْعِلْمِ هُوَ الْقَلْبُ ؟ "

''کیا آیت اس بات پر دال ہے کہ عقل سے مراد یہاں علم ہے اور اس بات پر بھی کہ علم کا محل دل ہے؟''

جواباً فرماتے ہیں ہاں اس لیے کہ اللہ کے قول ﴿ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا. ﴾ سے مقصود علم ہے اور اللہ کا قول: ﴿ يَعْقِلُوْنَ بِهَا ﴾ مثل دلیل کے ہے کہ قَلْبٌ لَه فَهْمٌ وَإِدْرَاكٌ ہے پس اس سے ثابت ہوا کہ دل محل عقل وفہم ہے۔(تفسیر کبیر جز ۲۳،صـ٤٥)

نیز مفسر قرآن مولانا امیر علی فرماتے ہیں۔ بعض نے لکھا ہے آیت میں قلوب کی طرف سمجھنے کی نسبت فرمائی۔ بِقَوْلِه: ﴿ يَعْقِلُوْنَ بِهَا . ﴾ یعنی ''ان قلوب سے سمجھتے'' تو یہ نسبت اس وجہ سے کہ عقل کا محل قلب ہے جیسے سننے کا محل کان۔ (تفسیر مواهب الرحمن جز: ۱۷،ص:۳٤۳)

اور جن متجددین اور فلاسفہ نے عقل کا ابتدائی اور استقراری تعلق صرف دماغ سے تسلیم کیا ہے وہ سعی موہومہ اور تحصیل لاحاصل کا شکار ہیں خواہ مخواہ اپنی کمزور عقل کے سہارے تاویلات باطلہ پر اعتماد کر کے منصب نبوت کو بھلا بیٹھنا اچھی بات نہیں۔ دراں حالیکہ صحیح عقل ہر لمحہ نبوت کی روشنی کی محتاج ہے۔ وَالتَّوْفِيْقُ بِيَدِ اللّٰهِ . کتاب وسنت سے قطعاً اس نظریہ کی تائید نہیں ہوتی بلکہ یہ واضح نصوص کے برعکس ہے۔ ایک حدیث میں وارد ہے:

« إِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلٰى لِسَانِ عُمَرَ وَ قَلْبِهِ.» [1] (جامع ترمذی: ۱۰/۱٦۹، مع تحفة الأحوذی)

یعنی ''اللہ تعالیٰ نے عمر کی زبان اور دل پر حق کو جاری کر دیا ہے۔'' حدیث ہذا سے بھی معلوم ہوا کہ اصل منبع تعقل دل ہے۔

یاد رہے اس مسئلہ میں مولانا مودودی مرحوم سے لغزش ہوئی ہے۔ انہوں نے اس قسم کے کلام کو محض ادبی اسلوب اور تخیل قرار دے کر ٹال دیا ہے اور کہا ہے کہ قرآن سائنس کی زبان میں نہیں بلکہ ادب کی زبان میں کلام کرتا ہے۔ گویا اس میں مسلّمہ امر کا فکر ہے جس کی مزید تشریح وتفسیر محتاج بیان نہیں۔ ملاحظہ ہو: (تفہیم القرآن: ۲/ ۲۳٦)

---

[1] (۳۱) صححه الترمذی وأحمد شاكر والألبانی والحاكم والذهبی. صحیح الترمذی، المناقب (۳۹٤۷) ،أحمد (۲/ ۹۵،۳۵) (۵٦۹۷،۵۱٤۵_شاكر) ،ابن ماجه (۱۰۸) ،فضائل الصحابة (۳۱۵) لأحمد عن أبی هريرة، (۳۹۵)عن ابن عمر.الحاكم فی المستدرك (۸۷/۳) (٤۵۰۱)عن أبی ذر.

سوال: قرآنی آیات کے جمع متکلم کے صیغوں کو واحد متکلم کے صیغوں میں تبدیل کر لینا کیا حکم رکھتا ہے؟ مذکورہ کتاب کے صفحہ نمبر ۱۱۵ حدیث نمبر ۸۶۵ میں قرآنی آیت: ﴿ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا ﴾ الخ صیغہ واحد متکلم میں موجود ہے۔ حدیث کی سند پر غور فرمائیں اور مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔ کیا دوسری آیات میں بھی ایسے صیغہ واحد متکلم بنایا جا سکتا ہے؟

جواب: سوال میں مشار الیہ روایت جو قرآنی آیات میں صیغوں کی تبدیلی کے جواز پر دلالت کرتی ہے وہ ضعیف اور نا قابل حجت ہے کیوں کہ اس میں عبداللہ بن الولید بن قیس التجیبی المصری ضعیف راوی ہے۔

❁ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" لَيِّنُ الْحَدِيْث وَلَه عِنْدَ أَبِي دَاؤُدَ حَدِيْثٌ وَاحِدٌ فِي الدُّعَاءِ إِذَا اسْتَيَقَظ وَ ضَعَّفَهُ الدَّارَ قُطْنِيُّ ." (تقریب ۱/۴۵۹، (تهذیب ۶/۶۹)

❁ اور علامہ البانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" وَ إِسْنَادُه ضَعِيْفٌ فِيْهِ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ الْوَلِيْدِ وَهُوَ الْمِصْرِيُّ وَهُوَ لَيِّنُ الْحَدِيْث كَمَا فِي التَّقْرِيْب ." (مشكوة ۱/۳۸۲، رقم الحديث ۱۲۱۴. عَمَلُ الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ لِابْنِ السُّنِّي ۲۷۶، حديث رقم ۷۶۱ . سنن أبي داود ، بَابُ مَا يَقُوْلُ الرجل إذا تعار من الليل۔ مع عون المعبود ۴/۴۷۴)

❁ نیز صاحب المرعاۃ فرماتے ہیں:

" وَ اَخْرَجَه اَيْضًا النَّسَائِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ وَ صَحَّحَهُ وَابْنُ مَرْدَوَيْهِ وَابْنُ السُّنِّيِّ فِي عَمَلِ الْيَوْمِ وَاللَّيْلَة ." (۲/۱۶۷)

یاد رہے تمام ائمہ کے ہاں اس حدیث کا مدار عبداللہ بن الولید پر ہے اور وہ ضعیف ہے لہٰذا حدیث ضعیف ٹھہری۔ مسئلہ ہذا میں کوئی صحیح واضح نص ایسی نگاہ سے نہیں گزری جو قرآنی آیات میں صیغوں کی تبدیلی کے جواز پر دال ہو۔ لہٰذا بلا دلیل ایسے اقدام سے احتیاط میں ہی راہ سلامتی ہے۔ اور اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ ﴿ حَتّٰی يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ . ﴾

سوال: چند سال سے اہل حدیث حضرات ہر سال تقریب بخاری بڑے اہتمام سے مناتے ہیں، تقریب کے اشتہار دیواروں پر چسپاں کیے جاتے ہیں۔ تقریب کے دن کھانے پینے کا بھی انتظام ہوتا ہے اور کئی جگہ کیمرہ مینوں کو بلایا جاتا ہے اور بڑی عقیدت سے اس تقریب کو سنت کا درجہ دے ڈالا گیا ہے۔ قرآن مجید جو اللہ کی

کتاب ہے اس کی تقریب کیوں نہیں منائی جاتی۔ شاید یہ کام ''اہل قرآن'' کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے؟ اگر ''اور'' کوئی قرآن کی تقریب منائے اور کھانے پینے کا انتظام کرے تو اسے اہل حدیث حضرات جھٹ بدعت کہہ دیتے ہیں۔ یعنی: ''تقریب قرآن'' بدعت اور ''تقریب حدیث'' سنت؟ حالانکہ ''تقریب قرآن'' صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ''حبرُ الامۃ'' قرآن کی تقریب مناتے، جانور ذبح کرتے اور لوگوں کو کھلاتے۔

دریافت طلب بات یہ ہے کہ اہل حدیث قرآن کی تقریب کیوں نہیں مناتے؟

جواب : بلا شبہ قرآن مجید کی تلاوت اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت بالعموم اور صحیح بخاری کا پڑھنا بالخصوص باعث برکت ورحمت ہے۔ اس سلسلہ میں کتب تاریخ ورجال میں بہت سا مواد موجود ہے اور جہاں تک انعقاد تقاریب کا تعلق ہے سو یہ طبعی خوشی میں داخل ہے ضروری امور سے نہیں۔ جس طرح کہ فتح الباری کے اختتام کے بعد ولیمہ کی عام دعوت کی گئی جس میں پانچ سو اشرفیاں خرچ کی گئیں اور بڑے بڑے علماء کے سامنے یہ کتاب پیش کی گئی اور اس قدر مقبول ہوئی کہ سلاطین زمانہ نے اشرفیوں سے تول کر خریدی (سیرۃ البخاری ،۱۸۳) نیز سائل کی اطلاع کے لیے گزارش ہے، کئی ایک مقامات پر ''تقریب قرآن'' کا بھی اہتمام موجود ہے۔ بطور مثال ''جامعہ اہل حدیث'' مسجد قدس چوک دالگراں لاہور کے ۵ جنوری ۱۹۹۶ کے اشتہار کو اٹھا کر دیکھیں بیک وقت دونوں ہی تقریبوں کا اہتمام نظر آئے گا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب قول دراصل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے۔ ❶

سوال: محترم! ہم خط میں اللہ کا نام، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک لکھتے ہیں، بعض اوقات رسائل وغیرہ آتے ہیں جن میں آیات قرآنی لکھی ہوتی ہیں۔ ان کا ڈاک کے ذریعے آنا درست ہے یا نہیں؟ ڈاک کے ذریعے آنے کی صورت میں بے ادبی ہوگی یا نہیں؟

جواب : قرآنی آیات اور اسم الٰہی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک پر مشتمل رسائل وخطوط کو بذریعہ ڈاک بھیجنے کا کوئی حرج نہیں، جائز ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رؤساء وملوک اور امراء کی طرف ارسال کردہ پیغامات اس امر کی واضح دلیل ہیں۔ ❷ ملاحظہ ہو: (صحیح بخاری بَدْءُ الْوَحْيِ اور کِتَابُ الشُّرُوْطِ وغیرہ)

---

❶ (۳۲) البیهقی (۳۳۱/۲) (۱۹۵۷) (الشعب) فصل فی تعلیم القرآن.

❷ (۳۳) انظر الرقم المسلسل (۳)، (۱)

سوال: قرآن کے ضعیف پرزوں کو تلف کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جلانے کے فعل کی دلیل سنت نبوی ﷺ سے ہے؟ دفن کرنا یا دریا برد کرنا کیسا ہے؟

جواب: قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق یا پرزوں کو کسی محفوظ مقام پر دفن کر دیا جائے یا کسی کنوئیں یا نہر وغیرہ میں ڈال دیا جائے یا اوراق کو دھو ڈالا جائے۔ فتنے کا ڈر نہ ہو تو جلانے کا بھی جواز ہے۔ چنانچہ اسماعیلی کی روایت میں ہے۔« أَنْ تُمحَ أَوْ تُحرَقَ »یعنی اوراق کو تلف کر دیا جائے یا جلا دیا جائے۔

شارح صحیح بخاری ابن بطال نے کہا: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن کتابوں میں اللہ کا نام لکھا ہو ان کو آگ سے جلا دینا جائز ہے۔ اور اس میں ان کا اکرام ہے اور پاؤں کے نیچے آنے سے بچاؤ ہے۔ طاؤس نے کہا جن چٹھیوں میں "بِسْمِ اللّٰهِ" لکھی ہوتی تھی انہیں اکٹھا کر کے جلا دیا جاتا تھا۔ عروہ نے بھی اسی طرح کیا۔ البتہ ابراہیم نے اس فعل کو مکروہ سمجھا ہے۔(۲۱/۹) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فعل حفاظت قرآن کی نصوص کے پیش نظر تھا۔ اسی بنا پر فعل ہذا کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی مستحسن سمجھا تھا۔ (فتح الباری ۲۱/۹)

سوال: بخاری میں سورۃ البقرہ کی تفسیر آیت:﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ...... ﴾ کی وضاحت میں ہے کہ اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ اللہ کے کرم پر بھروسہ کر کے قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم سچی کر دیتا ہے۔ اس حدیث سے غلط قسم کے لوگ عوام کو بے وقوف بناتے ہیں اور اپنے پیروں کی شان جتاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو کس طرح سمجھایا جائے کہ اس کا مفہوم کیا ہے؟

جواب: مطالبین قصاص حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ وغیرہ کو بذات خود اس بات کا علم نہ تھا کہ ہم سے بدلہ نہیں لیا جائے گا بلکہ رسول اللہ ﷺ کو بھی علم نہیں تھا۔ اسی بنا پر آپ ﷺ نے پُر اصرار انداز میں فرمایا:

« يَا أَنَسُ كِتَابُ اللّٰهِ الْقِصَاصُ.»

قوم نے جب عدم قصاص پر رضا کا اظہار کیا تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ مَنْ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ . » [1]

یعنی "اللہ کے بندوں میں سے بعض وہ ہیں اگر وہ اللہ پر قسم کھا لیں تو اسے پورا کر دیتا ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ کسی بات کا مقام قبولیت حاصل کر لینا محض اللہ کے فضل و کرم سے ہے۔ بندے کا اس میں کوئی کمال نہیں۔ اس لیے جھوٹی شہرت کے علمبرداروں کے لیے اس قصہ میں ادنیٰ سا بھی تمسک نہیں۔

---

[1] (٣٤) صحيح البخاری، كتاب الصلح، باب الصلح فی الدية(٢٧٠٣)والجهاد(٢٨٠٦).

سوال: ایک آدمی جو کہ (پابند ہے صوم وصلوۃ کا) نے ایک کیلنڈر فروخت کرنے والے کو دیکھا کہ وہ بزرگان دین واولیائے کرام کی تصوراتی تصاویر مع عورتوں کی تصاویر فروخت کر رہا ہے اس نے جیب سے رقم دے کر وہ کیلنڈر لے کر پھاڑ دیئے کہ یہ تصاویر بزرگان دین کی نہیں ہیں بلکہ عورت کے ساتھ بزرگان دین اور اولیاء کرام کی تصاویر دین متین وشریعت مطہرہ کی خلاف ورزی اور اولیائے کرام کی توہین ہے۔ تصاویر والے کیلنڈروں کے نیچے چند آیات قرآنی کے کیلنڈر تھے جو کہ اس کو معلوم نہ تھے۔ جب اس نے تصاویر والے کیلنڈر پھاڑے تو ساتھ ہی وہ بھی نادانستہ پھٹ گئے۔ اب جب اس کو پتہ چلا تو وہ پشیمان ہوا۔ آپ فرمائیں کہ اس شخص کی سزا کیا ہے۔ اور کیا اس کی معافی قابل قبول ہوگی؟

جواب: ایسی صورت میں اللہ کے حضور معافی کی درخواست کرنی چاہیے اور یہی کافی ہے۔ صحیح حدیث میں ہے: « فَإِنَّ الْعَبْدَ إِذَا اعْتَرَفَ بِذَنْبِهِ ثُمَّ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ . » [1]

❀❀❀❀❀❀❀

---

[1] (۳۵) صحیح البخاری، کتاب المغاری، باب حدیث الإفك (٤١٤١) ،صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی حدیث الإفك وقبول توبة القاذف (٧٠٢٠).

فرمانِ باری تعالیٰ

﴿ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ أَدْعُوْٓا إِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ . ﴾ (یوسف:۱۰۸)

فرمانِ رسول ﷺ

« بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً . »

﴿۵﴾ دعوت و تبلیغ اور اسلام

سوال: آج کل سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ یا اصطلاح ''اسلام'' ہے۔ وہ کونسا عقیدہ، نظریہ، مسلک، نظام، پروگرام ہے جس کے ساتھ ''اسلامی'' کا ''لاحقہ'' نہیں لگا دیا جاتا۔ اسلام کا متعین مفہوم کیا ہے؟

جواب: اسلام کا واضح مفہوم یہ ہے کہ سب کچھ فرمان الٰہی کے تابع کر دیا جائے۔ اس کسوٹی پر سب کو پرکھا جائے۔ مشہور حدیث ہے: «تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ.» [1]

سوال: کیا کافر کو دعوت دین دیئے بغیر قتل کرنا جائز ہے؟

جواب: نبی ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جب جہادی مہم پر روانہ فرماتے تو سب سے پہلے دعوت توحید کی تاکید فرماتے۔ انکار کی صورت میں دوسرے نمبر پر جزیہ کی ادائیگی اگر اس سے بھی انکار ہو تو پھر قتال۔ [2] کفار کے ساتھ مذکورہ طریقہ کار کو اختیار کرنا چاہیے۔

سوال: ایک شخص ''اسلم'' اپنے سگے بھائی ''اکرم'' کی بیوی سے ناجائز تعلقات استوار کر کے ''اکرم'' سے اس کی بیوی کو طلاق دلا کر خود اس سے کورٹ میرج کر لیتا ہے۔ بعد میں ''اکرم'' دوسری شادی کر لیتا ہے۔ کافی عرصہ بعد ''اسلم'' ''اکرم'' کے گھر پھر آنا جانا شروع کر لیتا اور اکرم کی دوسری بیوی سے بھی ناجائز تعلقات قائم کر لیتا ہے جس پر مضبوط شواہد موجود ہوں اور ''اکرم'' اس معاملے میں دیوثیت کا کردار ادا کر رہا ہو ''اسلم'' کی اولاد دینی کاموں میں مصروف ہو اور اسلم کے اس غلط کام کی وجہ سے انہیں جگہ جگہ رسوائی ہو۔ اولاد کے منع کرنے پر اسلم سے قطع تعلقات اور قطع کلامی ہو رہی ہو۔ اولاد کو ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہ ہو۔ ان حالات

---

[1] (۳٦) صححه الألباني ومال إليه الحاكم و الذهبي. «تركت فيكم أمرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما: كتاب الله وسنة نبيه.» المؤطا، كتاب القدر، باب النهي عن القول بالقدر (۲/۳۲۱) بلغاً. للإمام مالك، الحاكم، كتاب العلم (۱/۹۳) عن ابن عباس وأبي هريرة. الصحيحة (٤/۳٦۱) صحيح الجامع الصغير (۲۹۳۷).

[2] (۳۷) صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب تأمير الامام الامراء على البعوث...... (٤٥۲۲).

. میں اسلم کی اولاد اپنے والد سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کیسے کرے؟ اور ﴿وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ﴾ پر کیسے عمل ہو؟ کیا اولاد علاقہ کی با اثر شخصیات سے مدد طلب کر سکتی ہے؟ اس سے والد کی مزید رسوائی کا بھی اندیشہ ہو سکتا ہے؟ اور ناراضگی میں اضافہ بھی۔

جواب: صحیح احادیث میں برائی سے روکنے کے تین درجات بیان ہوئے ہیں:

① برائی کو ہاتھ سے روکے۔

② اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے۔

③ اگر یہ کام بھی نہ کر سکے تو برائی کو دل سے برا سمجھے فوائد وثمرات کے اعتبار سے یہ ایمان کا کم ترین درجہ ہے۔[1]

اس حدیث کو نصب العین بنا کر والد صاحب کی اصلاح کے لیے کوشاں رہیں۔ امید ہے کہ اس صورت میں آپ عدالت الٰہی میں بری الذمہ قرار پائیں گے۔ شرعی حدود سے تجاوز کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اس کام کے لیے باعزت طریقے سے خیر خواہ شخصیات کا تعاون حاصل کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اللہ رب العزت ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین!

سوال: ایک غیر مسلم (عیسائی) کے ساتھ دینی معاملات کے بارے میں بحث کرنا جائز ہے یا نہیں؟ یہ عیسائی ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کو مانتے ہی نہیں۔ اور نہ ہماری کتاب قرآن مجید ہی کو مانتے ہیں۔

جواب: دین اسلام کی سربلندی اور اظہار صداقت کے لیے غیر مسلموں سے بحث مباحثہ ہونا چاہیے تا کہ اتمام حجت ہو سکے۔

قرآن میں ہے:

﴿ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ . ﴾ (النساء: ١٦٥)

”تا کہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کو اللہ پر الزام کا موقع نہ رہے۔“

جس طرح کہ رسول اکرم ﷺ کا وفد نجران (عیسائی وفد) سے الوہیت مسیح علیہ السلام پر تبادلہ خیال ہوا تھا، اس کی جملہ وضاحتیں ”کتاب اللہ سورہ آل عمران“ اور ”کتب تفاسیر“ میں موجود ہیں۔ یہ لوگ بھی رسول اللہ ﷺ

[1] (٣٨) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان(١٧٧)، ابو داؤد (١١٤٠)، الترمذی(٢١٧٣)، ابن ماجه(٤٠١٣).

کی رسالت کے منکر تھے۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے ان لوگوں سے جملہ مسائل پر گفتگو فرمائی جو مابعد بہت سارے افراد کی رشدو ہدایت کا سبب بنی۔ اسی طرح بسلسلہ دعوت اسلام آپ ﷺ نے ایک چٹھی ہرقل عیسائی بادشاہ کی طرف بھی ارسال فرمائی تھی۔ ❶ جس کی تفصیل صحیح بخاری کے اوائل میں موجود ہے۔ ہاں البتہ یہ ازبس ضروری ہے کہ انداز تخاطب معاندانہ اور مخاصمانہ کے بجائے ناصحانہ ہونا چاہیے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تُجَادِلُوٓا أَهۡلَ ٱلۡكِتَـٰبِ إِلَّا بِٱلَّتِى هِىَ أَحۡسَنُ إِلَّا ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنۡهُمۡ . ﴾ (العنكبوت:٤٦)

''اور اہل کتاب سے جھگڑا نہ کرو مگر ایسے طریق سے کہ نہایت اچھا ہو۔ ہاں جو ان میں سے بے انصافی کریں (ان کے ساتھ اسی طرح مجادلہ کرو)

ظاہر ہے جو شخص آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کا قائل نہیں۔ اس سے اعتراف قرآن کی توقع بھی عبث ہے وہ تو یہی کہے گا کہ تعلیمات مسیح علیہ السلام دائمی و ابدی ہیں جب کہ واقعات وحقائق دعوٰی مزعومہ کی تکذیب کر رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے فرمایا تھا:

﴿ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُولٍ يَأۡتِى مِنۢ بَعۡدِى ٱسۡمُهُۥٓ أَحۡمَدُ . ﴾ (الصف:٦)

''اور ایک پیغمبر جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام احمد ہوگا۔ ان کی بشارت سناتا ہوں''

یاد رہے کہ نبی موعود کا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے پیدا ہونا تورات کی کتاب استثناء باب ۱۷، ۱۸، ۱۹ سے اور مکہ (فاران) سے ظاہر ہونا استثناء سے ثابت ہے۔ اسی طرح کتاب استثناء ۳۳ باب ۱، ۲ درس میں ہے ''یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ علیہ السلام مرد خدا نے اپنے مرنے سے آگے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔ سینا سے آنے سے موسیٰ علیہ السلام اور شعیر سے خداوند کے ساتھ آنے سے مراد حضرت عیسٰی علیہ السلام ہیں باقی پیش گوئی محمد رسول اللہ ﷺ کی بابت ہے جو دس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ فاران کے پہاڑ سے فاران والوں پر جلوہ گر ہوئے تھے۔ آتشی شریعت سے مراد نورانی اور آسمانی شریعت ہے۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے آگ میں سے کلام سنا تھا'' ''ان کے ''سے مراد یہ تھی کہ اہلِ

❶ (۳۹) انظر الرقم المسلسل (۱)

مکہ فتح مکہ کے وقت مسلمان ہو جائیں گے ۔(رحمۃ للعالمین ۱/ ۱۱۱) تعلیمات مسیح علیہ السلام میں یہ بات معروف ہے کہ انہوں نے کہا تھا: میں صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اب بتایئے "مسیح" کی نبوت عالمگیر کیسے بن گئی، جب کہ ان کا اقرار مدعا کے منافی ہے؟

واضح ہو کہ اولاد اسماعیل میں نبوت ہونے کی بابت بائبل کی کتابوں میں بہت سے حوالے ملتے ہیں:

اول: یہ کہ اسحاق اور اسماعیل علیہما السلام سے اللہ نے برابر کے وعدے کیے تھے۔

دوم: یہ کہ عرب میں پیدا ہونے والے نبی کے نشانات اور علامات کی پیش گوئیاں بہت سے انبیاء نے کی ہیں اور چونکہ عرب میں صرف اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہی آباد تھی، اس لیے ان پیشین گوئیوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نبی موعود اسماعیلی ہوگا۔

سوم: موسیٰ علیہ السلام کی بیان کردہ پیشین گوئی اس بارہ میں بہت واضح ہے۔ درس ۸۱ میں ...... ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ کتاب استثناء باب ۱۸ یہ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسماعیل ہیں اور موسیٰ علیہ السلام جیسا نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کی طرح صاحب کتاب، صاحب شریعت، صاحب جہاد، مہاجر و غازی ہیں، اور منہ میں کلام سے مطلب وحی کے اصل الفاظ کا محفوظ رہنا ہے۔ یہ خصوصیت صرف قرآن مجید کی رہی ہے۔ بائبل کے مجموعہ میں سے کسی کتاب کو یہ درجہ حاصل نہیں کہ اس کے الفاظ بھی اصلی محفوظ رہے ہوں۔ (رحمۃ للعالمین: ۱/ ۱۷۸-۱۷۹)

سوال: اسلام بزور شمشیر پھیلا یا امن و اخلاق سے؟

جواب: واقعات اس بات پر شاہد ہیں کہ حسب ضرورت اسلام کی اشاعت دونوں طرح ہوئی ہے۔ لیکن بزور شمشیر کا مفہوم صرف یہ ہے کہ لڑائیاں بہت سارے لوگوں کی ہدایت کا سبب بنیں لیکن زبردستی کسی کو مسلمان نہیں بنایا گیا۔ کچھ کفار ایسے بھی تھے جو مسلمان نہیں ہوئے لیکن جزیہ ادا کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ اسلامی جنگوں سے مقصد کلمۃ اللہ کی سربلندی تھا اور وہ ہر دو صورت میں حاصل ہے۔

سوال: ایک آدمی گھر میں پردے اور نماز کے متعلق کہتا رہتا ہے لیکن گھر والے کبھی مانتے ہیں کبھی سستی کر جاتے ہیں۔ کیا ایسا آدمی گھر سے باہر لوگوں کو تبلیغ کر سکتا ہے؟

جواب: واضح ہو کہ آدمی کا کام کسی بات کو منوانا نہیں بلکہ اس کا فرض صرف احسن طریق سے دعوت پیش کرنا ہے، چاہے گھر میں ہو یا باہر، توفیق دینے والا وہ خالق و مالک ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

قرآن مجید میں ہے:

﴿ فَذَكِّرْ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ . لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ . ﴾(الغاشية:٢١-٢٢)

''تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو، تم ان پر داروغہ نہیں ہو۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ لَّيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَآءُ . ﴾ (البقرة:٢٧٢)

(اے نبی ﷺ!) ''تم ان لوگوں کی ہدایت کے ذمہ دار نہیں ہو بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔''

سوال: اسلام میں مرتد کی سزا کیا ہے؟

جواب: اسلامی شریعت میں مرتد انسان کی سزا قتل ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح روایت میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

« مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ . » [1]

یعنی ''جس نے اپنا دین تبدیل کیا، اسے قتل کر دو۔''

طبرانی کی ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں:

« مَنْ خَالَفَ دِينَهُ دِينَ الْإِسْلَامِ فَاضْرِبُوا عُنُقَهُ .» [2]

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل سے قبل مرتد سے توبہ کے لیے بھی کہا جائے۔ اگر تائب ہو جائے تو فبہا، ورنہ اسے قتل کر دیا جائے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (نَيْلُ الْأَوْطَار، بَابُ الْمُرْتَدِ، ٧/ ٢٠١ تا ٢٠٦)

جدید کتابوں کے بجائے اس قسم کے مسائل میں ائمہ سلف کی کتب سے براہ راست استفادہ اور راہنمائی زیادہ مفید ہے۔ تاہم چند حوالے درج کر دیئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رضا کے لیے صالح عمل کی توفیق بخشے۔ آمین!

سوال: ① کتاب وسنت کی رو سے ''المسلم'' کی تعریف کیا ہے؟

② کفر بواح سے کیا مراد ہے؟

---

[1] (٤٠) صحيح البخاري، كتاب استتابة المرتدين، باب حكم المرتد...... (٦٩٢٢).

[2] (٤١) المعجم الكبير، (١١/ ١٩٣) (١١٦١٧) للطبراني. وقال الهيثمي في المجمع (٦/ ٢٩٣) فيه الحكم بن أبان وهو ضعيف، لكن معناه صحيح كما في البخاري، وانظر: الإرواء (٢٤٧١).

۳ اس حدیث ۔ "اَلْکَفُّ عَمَّنْ قَالَ : لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لَا تُکَفِّرُهُ بِذَنْبٍ وَلَا تُخْرِجُهُ مِنَ الْاِسْلَامِ بِعَمَلٍ." کا کیا مطلب ہے؟

جواب: ۱ "المسلم" کی تعریف الفاظ نبوی ﷺ میں یوں ہے:

«اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَ يَدِهٖ . » ❶

یعنی "اصلی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے جملہ مسلمان سلامت رہیں۔"

اصطلاحی تعریف مسلمان کی یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور آپ کے خاتم النبیین ﷺ ہونے پر یقین واعتقاد رکھتا ہے۔

۲ کفر کی وہ صورت جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو یعنی واضح کفر۔

۳ جس خوش قسمت نے کفر سے تائب ہو کر توحید کا اقرار کر لیا۔ اس سے جنگ وجدال اور قتل وغارت حرام ہو جاتا ہے اور اس کے لیے تمام وہ حقوق ثابت ہو جاتے ہیں جو جملہ مسلمانوں کو اسلامی ریاست میں حاصل ہوتے ہیں اور کبیرہ گناہ کی وجہ سے ہم کسی کو کافر قرار نہیں دیتے۔ جس طرح کہ معتزلہ اور خوارج نے اس کو بالترتیب منزلۃ بین المنزلتین اور کافر کہا ہے اور خلاف شرع عملی کوتاہی کی بنا پر ہم اس کو اسلام سے خارج نہیں گردانتے جس طرح کہ بعض اہل بدعت کا شیوہ ہے۔

سوال: امتِ محمدیہ کا ہر شخص مبلغ ہے یا اس کے لیے کچھ شرائط ہیں؟

جواب: امتِ محمدیہ کا ہر فرد مبلغ ہو سکتا ہے بشرطیکہ متعلقہ موضوع سے واقفیت رکھتا ہو۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ . ﴾ (یوسف:۱۰۸)

"کہہ دو میرا رستہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ (از روئے یقین و برہان) سمجھ بوجھ کر میں بھی (لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں) اور میرے پیرو بھی۔"

حدیث میں ہے: « بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً . »❷

سوال: عورتوں کے مدارس میں جو تبلیغی اجتماعات منعقد کئے جاتے ہیں جن میں صرف خواتین مبلغات ہی تبلیغ کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ کچھ لوگ اس کام کو اچھا نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کے مبارک زمانہ میں

---

❶ (٤٢) انظر الرقم (٤٧).

❷ (٤٣) انظر الرقم (٢١).

اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں خواتین ایسا نہیں کرتی تھیں اور صرف مرد صحابہ رضی اللہ عنہم ہی تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے تھے۔سوال یہ ہے کہ خواتین کو تبلیغ کا موقعہ نہ ملے تو خواتین مبلغات کتمان علم کی مجرم تو نہ ہوں گی اور: « بَلِّغُوا عَنِّیْ وَلَوْ آیَةً.» کی ذمہ داری ان پر بھی واجب ہے یا نہیں؟

جواب: دین حنیف کی نشرواشاعت جس طرح مرد پر واجب ہے اسی طرح عورت پر بھی ضروری ہے کہ مختلف ذرائع سے اس فریضہ کو ادا کرے تاریخ اسلام اس بات پر شاہد ہے کہ اسلام کی اشاعت میں عورت کا ہمیشہ سے عظیم کردار رہا ہے۔ دراصل یہی وہ پہلا مدرسہ ہے جہاں سے ہر فرد ابتدائی مراحل میں تعلیم وتربیت حاصل کرتا ہے جس کے اثرات تا زندگی انسان کے لیے معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ پھر آغاز وحی میں اس کی جدوجہد سے پیغام نبوت کی آبیاری ہوئی۔ جو بعد میں اقوام عالم کے لیے رشد و ہدایت کا باعث بنی۔

کثرت ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہی حکمت مضمر تھی کہ فریضہ دعوت وتبلیغ بطریق احسن سرانجام دیا جا سکے۔ بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گوشۂ خانگی جس پر مطلع ہونا ہر شخص کے لیے ممکن نہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علم وفضل سے کون واقف نہیں۔ کبار صحابہ کرام مشکل ترین مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے، کئی ایک مسائل میں وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کمزور پہلوؤں پر گرفت فرماتی تھیں، اس سلسلہ میں علامہ زرکشی کی معروف تصنیف "اَلْإِجَابَةُ بِمَا اسْتَدْرَکَتْهُ عَائِشَةُ عَلَی الصَّحَابَةِ." کے موضوع سخن سے یہ بات عیاں ہے۔ پھر حضرت اسماء بنت یزید کی خطابت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ جو خطیبۃ النساء کے لقب سے معروف تھیں۔ (الإصابة، ۴/ ۲۲۹)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "اَلدُّرَرُ الْکَامِنَة ." میں ۷۰ محدثات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ان میں سے وہ بھی تھیں جن کی شاگردی امام احمد بن حنبل، علامہ سیوطی، ابوبکر الخطیب بغدادی اور مؤرخ ابن عساکر رحمہم اللہ جیسے اجلاء نے اختیار کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انصار کی عورتوں کی تعریف غایت درجہ بیان فرمائی ہے کہ "تَفَقُّه فِی الدِّیْن" میں ان کو حیاء مانع نہیں۔ ان جملہ دلائل سے معلوم ہوا کہ مرد کی طرح عورت بھی اشاعت دین اور دعوت وتبلیغ کی مکلّف ہے لیکن اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ جملہ تحفظات کے ساتھ اس واجب کو ادا کرے۔

سوال: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: « اَللّٰهُمَّ أَعِزِّ الْإِسْلَامَ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَوْ بِعَمْرِو بْنِ هِشَامٍ.»

سوال یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کے لیے دعا کیوں نہ کی۔ دونوں میں سے ایک کیوں مانگا؟

جواب: روایت کے اصل الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

« اَللّٰھُمَّ أَعِزَّ الْإِسْلَامَ بِأَحَبِّ الرَّجُلَیْنِ إِلَیْكَ بِأَبِی جَھْلٍ أَوْ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ. قَالَ: وَ کَانَ أَحَبُّھُمَا إِلَیْهِ عُمَرُ . » ❶ (جامع ترمذی جـ۱۰، صـ ۱۶۹ مع تحفة الأحوذی)

یعنی ''یا اللہ ابوجہل یا عمر دونوں میں سے جو تیرے ہاں زیادہ پیارا ہے اس کے ذریعہ اسلام کو قوت عطا فرما۔ راوی نے کہا اللہ کے ہاں دونوں میں سے محبوب ترین عمر تھے۔''

سوال: مسلم اور مومن میں کیا فرق ہے؟

جواب : ایمان اور اسلام دونوں مترادف ہیں۔ انفرادی صورت میں ہر ایک کا دوسرے پر اطلاق ہوتا ہے لیکن جب دونوں جمع ہو جائیں تو ایمان کا تعلق باطنی امور سے ہوتا ہے جب کہ اسلام کا ظواہر سے۔ اس کی واضح مثال'' حدیث جبریل'' اور'' قصہ وفد عبدالقیس'' میں ''حدیث جبریل'' میں ایمان کی تعریف باطنی امور سے کی گئی ہے۔ فرمایا:

« اَلْإِیْمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِکَتِهٖ وَ بِلِقَآئِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ تُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ .»❷

اور ''قصہ وفد عبدالقیس'' میں ایمان کی تعریف ظاہری امور سے کی گئی ہے فرمایا:

«أَتَدْرُوْنَ مَا الْإِیْمَانُ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ.» ؟ قَالُوْا: اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ ،قَالَ: « شَھَادَةُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ إِقَامُ الصَّلٰوةِ وَ إِیْتَاءُ الزَّکَاةِ وَ صِیَامُ رَمَضَانَ وَ أَنْ تُعْطُوْا مِنَ الْمَغْنَمِ الْخُمُسَ .» ❸ (بخاری باب أَدَاءِ الْخُمُسِ مِنَ الْإِیْمَانِ)

لیکن ''حدیث جبریل'' میں اسلام کی تعریف انہی ظاہری امور سے کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ''حدیث جبریل'' میں چونکہ دونوں جمع ہو گئے ہیں۔ اس لیے ایمان کی تعریف میں باطن کا لحاظ رکھا گیا ہے اور

---

❶(٤٤) صححه الترمذی والحاکم والذهبی وابن حبان والألبانی وأحمد شاکر والمبارکفوری .صحيح الترمذی، أبواب المناقب ،باب فی مناقب عمر رضی الله عنه (٣٩٤٦)،أحمد ٩٥/٢،(٥٦٩٦) شاکر . وفضائل الصحابة (٣١٢) لأحمد. ابن حبان (٣٠٥/١٥)الإحسان ،عن ابن عمر)والحاکم (٨٣/٣) عن ابن مسعود.وعبدالله بن أحمد (٣١١_الزوائد علی الصحابة) عن ابن عباس .والمشکاة(٦٠٣٦)التحقيق الثانی للألبانی.

❷(٤٥) صحيح البخاری، کتاب الايمان، باب سوال جبريل النبی ﷺ ...... (٥٠)، (٤٧٧٧)، مسلم کتاب الايمان، باب الايمان ما هو ؟ ......(٩٧).

❸(٤٦) صحيح البخاری ، کتاب الايمان ، باب اداء الخمس من الايمان (٥٣)، (٨٧،٥٢٣)، مسلم کتاب الايمان، باب الأمر بالايمان بالله تعالیٰ...... (١١٦).

اسلام میں ظاہر کا اسی بنا پر اہل علم نے کہا کہ ایمان کا درجہ اسلام سے بڑا ہے۔ "اَلْمُسْلِمُ" کی تعریف میں فرمایا:

« اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ.» ❶

یعنی "کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سلامت رہیں۔"

لیکن مومن کے بارے میں فرمایا:

« اَلْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَ النَّاسُ بَوَائِقَهٗ » ❷

یعنی "مومن وہ ہے جس کی آفتوں سے لوگ مامون رہیں۔"

یعنی اس کی قلبی جلاء کی بناء پر لوگ اس سے خطرہ محسوس نہ کریں۔ جب کہ "المسلم" سے صرف ظاہری اذیت ناک پہلوؤں کی نفی کی گئی ہے۔ اگرچہ دل سے لوگ اس سے خطرہ محسوس کرتے رہیں۔

اس دقیق فرق کے پیش نظر علامہ خطابی رقمطراز ہیں:

" وَالْحَقُّ أَنَّ بَيْنَهُمَا عُمُوْمًا وَ خُصُوْصًا فَكُلُّ مُؤْمِنٍ مُسْلِمٌ وَ لَيْسَ كُلُّ مُسْلِمٍ مُؤْمِنًا."

حق بات یہ ہے کہ مؤمن اور مسلم میں عموم اور خصوص کی نسبت ہے پس ہر مؤمن مسلم ہے لیکن ہر مسلم مؤمن نہیں۔"

امید ہے تشفی کے لیے بالاختصار بحث کافی ہوگی۔ جملہ تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہو :"الإیمان" للإمام ابن تيمية.

---

❶(٤٧) صحيح البخارى، كتاب الإيمان، باب « المسلم من سلم المسلمون......»(١٠)، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان تفاضل الإيمان(١٦١، ١٦٢).

❷(٤٨) " المومن من أمنه الناس على دمائهم و أموالهم" اخرجه احمد (٣٧٩/٢)، رقم(٨٩١٥)، (١٥٤/٣)، ح (١١٤٩٩)، قال محققه ـ حمزة اسناده صحيح و الآخر حسن ـ قال والله لا يؤمن ، والله لا يؤمن ، والله لا يؤمن ـ قيل و من يا رسول الله قال الذى لا يأمن جاره بوائقه ـ صحيح البخارى ، كتاب الادب ، باب اثم من لا يامن جاره بوائقه (٦٠١٦)، ولفظ " المومن من امن الناس بوائقه " لم أجد والله اعلم و فى رواية الترمذى " من أكل طيباً و عمل فى سنةٍ و امن الناس بوائقهٔ دخل الجنة " برقم (٢٦٥٣) ضعفه الألبانى المشكاة التحقيق الثانى ح (١٧٦)، و قال : قلت و علته ابو بشر عن ابى وائل و هو مجهول.

سوال: اسلامی ثقافت وتہذیب کیا ہے؟ یا اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: اسلامی تہذیب وثقافت کا بالاختصار مفہوم یہ ہے کہ زندگی کے جملہ معمولات کو فرمان نبوی کے مطابق ڈھالا جائے مثلاً حجامت، لباس، وضع قطع، طرز معاشرت، ستر وحجاب، سلام کلام، میل ملاقات کے آداب، آداب مجالس، آداب اکل وشرب، دیانت وامانت، اقامت عدل وانصاف، جہادی مہمات واستعداد میں اسلامی اقدار وروایات کا لحاظ رکھنا، وعدہ معاہدات کا احترام، بلند اخلاق کا مظاہرہ، طہارت وصفائی اختیار کرنا، اسلامی تہذیب وثقافت کے اہم ترین اجزاء ہیں۔

اسلام نے غیر اقوام کی نقالی سے ہمیں سختی سے منع کیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ .» [1]

یعنی ''جو کسی قوم سے مشابہت اختیار کرتا ہے، سو وہ ان سے ہے۔''

حدیث ہذا کی نہایت عمدہ تشریح وتوضیح کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ اهل حدیث : ۳۳۸/۳ تا ۳۴۴ـ لشیخنا محدث روپڑی)

❀❀❀❀❀❀❀

[1] (۴۹) حسنه وصححه الألباني، صحیح أبی داؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس الشهرة (۴۰۳۱)، الارواء (۱۲۶۹)، المشکاة (۴۳۴۷).

﴿٦﴾ دعا، اَذکار اور اَوراد و وظائف

سوال: زندہ مسلمانوں کے لیے مغفرت کی دعا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: زندہ مسلمان اپنے اور دوسرے کے لیے مغفرت کی دعا کر سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَلِأَخِيْ . ﴾ (الاعراف:۱۵۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی: ''اے میرے پروردگار! مجھے اور میرے بھائی کو معاف فرما۔''

سوال: بہت سی مسجدوں میں ذکر کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں، جن میں خود ساختہ طریقوں سے ذکر الٰہی کا اہتمام اور بعض الفاظ کا مخصوص انداز میں ورد کرایا جاتا ہے۔ کیا احادیث میں ان کا کوئی ثبوت ملتا ہے؟

جواب: بلا ریب اللہ کی یاد اور اس کا ذکر ہر مومن کا مطلوب اور حرز جان ہے۔ لیکن اس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی اور مخصوص ہئیت اجتماعی اور خاص انداز میں ذکر مقطع (الفاظ کو کاٹ کر جیسے ھُو، ھُو) کا شریعت مطہرہ میں کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔ جس طرح کہ مشارالیہ قوم کے ہاں مروج ہے۔ یاد رہے، جو شیٔ عہد نبوت میں دین کی تھی وہ آج بھی دین ہے اور جو اس وقت دین نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں بن سکتی۔'' چاہے اس کے اثبات کے لیے سوجتن کیے جائیں۔ (قَالَهُ الْإِمَامُ مالك) [1]

اسی بناء پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مسجد میں جمے ہوئے حلقہ ذکر جہاں سو سو دفعہ تسبیحات اور تکبیرات کا ورد کرایا جا رہا تھا تند و تیز لہجہ میں فرمایا:

''وَيْلَكُمْ يَا أُمَّةَ مُحَمَّدٍ ! مَا أَسْرَعَ هِلَاكَتُكُمْ ! صَحَابَةُ نَبِيِّكُمْ مُتَوَافِرُوْنَ وَ هٰذِهٖ ثِيَابُهٗ لَمْ تُبْلَ وَ آنِيَتُهٗ لَمْ تُكْسَرْ ،وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ إِنَّكُمْ لَعَلٰى مِلَّةٍ هِيَ أَهْدٰى مِنْ مِّلَّةِ مُحَمَّدٍ أَوْ فَاتِحُوْ بَابَ ضَلَالَةٍ؟ قَالُوْا : وَاللّٰهِ يَا أَبَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ ! مَا أَرَدْنَا إِلَّا الْخَيْرَ ،

[1] (۵۰) (الاعتصام فی ذم البدع (۱/۳۳) للشاطبی).

قَالَ: وَ كَمْ مِّنْ مُّرِيْدٍ لِلْخَيْرِ لَمْ يُصِبْهُ ."❶ (سنن النسائی ۶۸/۱ بإسناد صحیح)

یعنی ''اے امتِ محمد! تمہیں کیا ہو گیا، کس قدر جلدی برباد ہو رہے ہو؟ ابھی تو نبی اکرم ﷺ کے اصحاب تم میں بکثرت موجود ہیں اور یہ آپ ﷺ کے کپڑے بوسیدہ نہیں ہوئے اور برتن ٹوٹے نہیں پائے۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! کیا تمہارا مسلک زیادہ ہدایت والا ہے یا محمد ﷺ کا دین یا کیا تم گمراہی کا دروازہ کھول رہے ہو؟ لوگوں نے کہا: ابوعبدالرحمٰن! ہمارا ارادہ تو محض خیر ہے۔ جواباً فرمایا: کتنے ہی وہ لوگ ہیں جو خیر کو چاہتے ہوئے بھی اس سے محروم رہتے ہیں۔''

لہٰذا ماثورہ ادعیہ کے ساتھ یادِ الٰہی کی کیفیت وہی ہونی چاہیے جس کی تصریح کتاب ھُدٰی میں بایں الفاظ موجود ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ . ﴾ (آل عمران: ۱۹۱)

''جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں۔''

یہاں یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ بعض روایات میں وارد ہے:

« مَا جَلَسَ قَوْمٌ مَجْلِسًا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَ نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَ ذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهٗ.» ❷ (رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه)

یعنی ''جب کوئی قوم کسی مجلس میں '' اَللّٰهُ '' کا ذکر کرتی ہے تو فرشتے ان کا احاطہ کر لیتے ہیں اور رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اور ان پر تسلی نازل ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر خیر اُن (فرشتوں) میں کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں۔''

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی تفسیر صحیح مسلم کی حدیث میں یوں ہے:

« مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِيْ بَيْتٍ مِّنْ بُيُوْتِ اللّٰهِ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَ يَتَدَارَسُوْنَهٗ بَيْنَهُمْ إِلَّا

---

❶ (۵۱) الدارمی، باب فی کراهية أخذ الرأی (۲۰۶). وقال محققه سليم: "إسناده جيد واللفظ له". والطبرانی فی الكبير (۹/۱۲۶، ۱۲۷) (۷۶۳۳، ۷۶۳۶).

❷ (۵۲) صحيح مسلم، كتاب الذكر و الدعاء، باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن وعلى الذكر (۶۸۵۵)، وابن ماجه، الأدب، باب فضل الذكر (۳۷۹۱).

نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَ غَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَ حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَ ذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ.» ❶

یعنی ''جب کوئی قوم اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر یعنی مسجد وغیرہ میں جمع ہو کر آپس میں کتاب اللہ کو پڑھتے پڑھاتے ہیں تو ان پر سکینت نازل ہوتی ہے۔ اور اللہ کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اور فرشتے گھیر لیتے ہیں اور ان کا تذکرہ جو اللہ کے پاس ہیں ان میں ہوتا ہے۔''

صاحب المرعاۃ '' فِيْ بَيْتٍ مِّنْ بُيُوْتِ اللّٰهِ'' کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

'' هُوَ شَامِلٌ جَمِيْعَ مَا يُبْنٰى لِلّٰهِ تَقَرُّبًا إِلَيْهِ مِنَ الْمَسَاجِدِ وَالْمَدَارِسِ وَالرِّبَاطِ. ''

یعنی لفظ حدیث ''اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں'' یہ لفظ شامل ہے تمام ان چیزوں کو جن کی تعمیر اللہ کے تقرب کے لیے ہوئی ہے۔ مثلاً مساجد، مدارس اور رباط۔ یعنی فقراء کے لیے دینی وقف گاہیں وغیرہ۔ (۱۸۴/۱)

اس سے معلوم ہوا ان احادیث کے مصداق وہ پاکباز لوگ ہیں جو ہمہ تن کتاب و سنت کی اشاعت میں مصروف کار رہتے ہیں نہ کہ اہل بدعت جو اپنی طرف سے محافل ذکر کا اختراع کر کے رسول الثقلین ﷺ کے ذمے تھوپتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ پہلی حدیث میں سابقہ پروگرام کے تحت کسی خاص محفل کے انعقاد کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ مقصود یہاں اتفاقی مجلس ہے جو عام طور پر مساجد میں جمتی رہتی ہے قطع نظر ذکری اجتماعی قیادت کے۔ ہر ایک اپنی بساط کے مطابق انفرادی طور پر ذکر میں مصروف رہتا ہے۔ یہ بھی مجلس کی صورت ہی ہے۔

اور جہاں تک اس محفل سے آپ کے محظوظ ہونے کا تعلق ہے، سو اس بارے میں عرض ہے بدعت کا یہ خاصہ ہے کہ ہمیشہ اس میں تحسینی پہلو غالب نظر آتا ہے جب کہ رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

« مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ .» ❷ (بخاری)

---

❶ (۵۳) صحیح مسلم ایضاً (۶۸۵۳).

❷ (۵۴) انظر الرقم المسلسل (۲) .

یعنی ''جس نے ہمارے دین میں اضافہ کیا وہ مردود ہے۔'' ......اَللّٰهُمَّ أَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهُ وَ أَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهُ .

سوال: کراچی کے حالات دن بدن ابتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض علماء کا یہ کہنا ہے کہ مساجد میں استغفار یا ''سلام'' اور آیت کریمہ کے ختم کئے جائیں۔ سوا لاکھ مرتبہ، اور چلتے پھرتے بھی ان کا ورد کیا جائے۔ کیا یہ اوراد احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں۔ حوالہ تحریر فرمائیں اور کیا احادیث میں سوا لاکھ کی گنتی بھی ملتی ہے؟

اسی طرح ایک دوسرے عالم کا فرمانا کہ انہوں نے طاعون کی وباء کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ سورۃ یٰسین کی تلاوت کی جائے۔ اور لفظ: مُبِیْن پر اذانیں دی جائیں۔

جواب: مصائب و مشکلات سے نجات کے لیے بلاشبہ آیت کریمہ: ﴿ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحٰنَکَ إِنِّی کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ . ﴾ کا ورد کرنا مسنون ہے لیکن عدد اور وقت کا تعین کتاب و سنت سے ثابت نہیں۔

لہٰذا بلا تحدید یہ وظیفہ جاری رہنا چاہیے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری دعائیں ایسے موقع پر پڑھنی رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں ان کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔ مثلاً:

1- « لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمُ لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبُّ الْأَرْضِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمُ.»[1] (بخاری و مسلم)

2- « حَسْبِيَ اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ.» [2] (بخاری)

3- « اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ أَرْجُوْ فَلَا تَكِلْنِيْ إِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَّأَصْلِحْ لِيْ شَأْنِيْ كُلَّهُ لَا إِلٰـهَ إِلَّا أَنْتَ. » [3] (أبو داود بسند حسن)

---

[1] (٥٥) صحيح البخاری ، كتاب الدعوات ، باب الدعاء عند الكرب (٦٣٤٥، ٦٣٤٦)، صحيح مسلم ، كتاب الذكر والدعاء باب دعاء الكرب(٦٩٢١،٦٩٢٤) .

[2] (٥٦) صحيح البخاری،كتاب التفسير،باب قوله:﴿الذين قال لهم الناس إن الناس قد جمعوا لكم ﴾ (٤٥٦٣،٤٥٦٤).

[3] (٥٧) حسنه الهيثمی والألبانی وحمزة،صحيح أبی داؤد،كتاب الأدب،باب ما يقول إذا أصبح(٥٠٩٠)، أحمد (٤٢/٥)،الكلم الطيب(١٢١)،ابن السنی(٣٤٢)مجمع(١٤٠/١٠).

بہتر ہے صحیح دعاؤں پر مشتمل کوئی کتاب ''اَلْکَلِمُ الطَّیِّب'' تحقیق البانی وغیرہ اپنے پاس رکھیں۔ فرصت کے لمحات میں اللہ کی یاد میں منہمک رہیں۔ اور عمومی استغفار وغیرہ کے لیے بھی مسجدوں کا انتخاب شرط نہیں۔ ہر طاہر مقام پر ورد ہوسکتا ہے۔ اسی طرح وبا طاعون میں سورۃ یاسین کے ہر لفظ مُبِیْنَ پر اذانیں دینی بھی کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔ اذانوں کے بغیر ہی مذکورہ سورت کی تلاوت باعث برکت اور حرز جان ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

« مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »[1] (بخاری)

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

سوال: کلمہ جیسے کلمہ طیبہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہے جیسے سننے میں آیا ہے کہ کلمے چھ ہیں: کلمۂ شہادت تمجید، ردکفر وغیرہ، چھ کلمے کے بارے میں تفصیل سے بیان کریں۔ کیا چھ کلمے حدیث میں وارد ہیں یا نہیں؟

جواب: چھ کلمے مرتب صورت میں نہیں البتہ متفرق صورت میں ان کے اکثر و بیشتر الفاظ ثابت ہیں۔[2]

سوال: عوام میں شش کلمے (چھ کلمے) مشہور ہیں۔ کیا دین میں ان کی کوئی اصل ہے۔ اگر دین میں کوئی ثبوت ہے تو آیا ان کلموں کے نام احادیث سے ثابت ہیں؟ مثلاً اول کلمہ طیبہ، دوسرا کلمہ شہادت، تیسرا کلمہ تمجید، چوتھا کلمہ توحید، پانچواں کلمہ استغفار، چھٹا کلمہ ردکفر۔ نیز مذکورہ کلموں میں سے کوئی احادیث میں ہے تو آیا انہی الفاظ سے ہے جو مشہور ہیں؟

جواب: چھ کلموں میں سے انفرادی طور پر بعض کلمات ثابت ہیں۔ لیکن یہ نام غیر معروف ہیں۔

---

[1] (٥٨) انظر الرقم المسلسل (٢).

[2] مروجہ چھ کلمے معنی کی مناسبت سے باقاعدہ الگ الگ عنوان کے تحت مثلاً کلمہ تمجید اور ردکفر وغیرہ قرآن وسنت کی نصوص سے بالکل ثابت نہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی معنوی مناسبت ہی کی بنا پر نکاح کے موقع پر بعض جاہل علماء میاں بیوی کو پڑھاتے ہیں صرف کلمہ توحید و رسالت کفر سے اسلام میں داخلہ کے لیے نصاً ثابت ہے اس اعتبار سے بقیہ کلمے خود ساختہ ہیں جن کی شریعت میں کوئی پابندی نہیں۔ (حافظ عبدالشکور مدنی)

سوال: اگر کوئی شخص کسی خاص وقت پر مخصوص تعداد میں کوئی ذکر کرے جو تعداد حدیث میں مذکور نہ ہو تو کیا ایسا فعل بدعت میں شمار ہو سکتا ہے یا نہیں؟ کیا ایسا کرنا باعث ثواب ہو سکتا ہے؟ خصوصاً جو اسے ضروری سمجھ کر ہمیشہ کرے۔

جواب: جملہ ذکر اذکار اور ورد وظائف میں اپنی طرف سے تعداد مقرر کرنا جائز نہیں۔ یہ صرف نبی اکرم ﷺ کا کام ہے۔ اپنی طرف سے تعین کرنا بدعت شمار ہو گا۔

حدیث میں ہے:

« مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » [1]

یعنی ''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

سوال: تسبیح کس ہاتھ پر پڑھنی چاہیے؟

جواب: تسبیح صرف داہنے ہاتھ پر پڑھنی چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

'' رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْقِدُ التَّسْبِيْحَ. قَالَ ابْنُ قُدَامَةَ : بِيَمِيْنِهِ. ''

[2] (سنن أبی داؤد ، بَابُ التَّسْبِيْحِ بِالْحَصٰی)

یعنی ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تسبیح کی گرہ لگاتے تھے۔ راوی حدیث ابن قدامہ نے کہا: داہنے ہاتھ کے ساتھ گرہ لگاتے تھے۔

نیز حدیث: « كَانَ يُحِبُّ التَّيَمُّنَ. » [3] کے پیش نظر آغاز چھوٹی انگلی سے ہونا چاہیے۔ واللہ أعلم

سوال: اگر ایک آدمی رات کو یا دن کو ورد کرتا ہے۔ تو اس کی ہوا نکل جاتی ہے وہ ورد کرتا رہے یا دوبارہ وضو کر کے ورد کرے؟

جواب: ورد وظیفہ ہر حالت میں درست ہے چاہے انسان باوضو ہو یا بے وضو۔ حدیث میں ہے:

---

[1] (٥٩) انظر الرقم المسلسل (٢)

[2] (٦٠) صححه الألبانی. صحیح أبی داؤد، کتاب الوتر، باب التسبیح بالحصی (١٥٠٢).

[3] (٦١) عن عائشة رضی الله عنها قالت : کان النبی ﷺ یعجبه التیمن فی تنعله و ترجله و طهوره و فی شأنه کله. صحیح البخاری کتاب الوضوء باب التیمن ......(١٦٧)، صحیح مسلم ، کتاب الطهارة، باب التیمن فی الطهور (٦١٧).

« كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْ كُلِّ اَحْيَانِه. » ❶

(رواه مسلم و رواه البخاری فی ترجمة الباب ، باب تقصر الحائض المناسك كلها)

یعنی "نبی ﷺ ہر حالت میں اللہ کا ذکر کرتے تھے۔"

تاہم بلاشبہ طہارت پسندیدہ امر ہے لیکن ضروری نہیں۔

❀❀❀❀❀❀❀

---

❶ صحیح البخاری ، کتاب الاذان ، باب یتتبع المؤذن فاه هاهنا و هاهنا ؟ (٦٣٤) تعلیقاً ، صحیح مسلم ، کتاب الحیض ، باب ذکر الله تعالیٰ فی حال الجنابة و غیرها(٨٢٦) .

فرمانِ باری تعالیٰ

﴿ فِيهِنَّ قَٰصِرَٰتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ. ﴾ (الرحمٰن: ٥٦)

فرمانِ رسول ﷺ

« اَللّٰهُمَّ إِنِّىْ أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَآئِثِ. »

﴿7﴾ ملائکہ، جنات اور شیاطین

سوال: شیطان کی بیوی اور اولاد ہے یا نہیں؟

جواب: نصوص صحیحہ صریحہ اس بات پر دال ہیں کہ شیاطین اور جنات میں سلسلہ مناکحت اور توالد موجود ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

﴿ فِيهِنَّ قٰصِرَاتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ. ﴾ (الرحمٰن:٥٦)

''ان میں نیچی نگاہ والی عورتیں ہیں جن کو اہل جنت سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا اور نہ کسی جن نے۔''

زیر آیت امام بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَ فِيهِ دَلِيلٌ عَلٰى أَنَّ الْجِنَّ يَطْمِثُوْنَ. '' (أنوار التنزيل و أسرار التأويل ،جزء ٤، ص١٧٩)

یعنی اس میں دلیل ہے کہ جنات جماع کرتے ہیں۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ أَفَتَتَّخِذُوْنَه وَ ذُرِّيَّتَهٗ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ . ﴾ (الكهف:٥٠)

''کیا تم اس کو یعنی ابلیس کو اور اس کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔''

''اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ ابلیس کی ذُرّیت بھی ہے۔''

نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور ادعیہ میں سے یہ دعا ہے کہ:

« اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَآئِثِ.»[1]

شارح حدیث امام خطابی رحمہ اللہ نے اس کی تشریح و توضیح یوں کی ہے کہ لفظ ''اَلْخُبُث'' خبیث کی جمع ہے

[1] (٦٣) صحيح البخارى ،كتاب الوضوء ،باب ما يقول عند الخلاء (١٤٢)، والدعوات(٦٣٢٢)صحيح مسلم، كتاب الحيض ،باب ما يقول إذا أراد دخول الخلاء(٨٣١).

اور ''اَلْخَبَائِث'' خَبِيْثَةٌ کی جمع ہے۔

'' يُرِيْدُ ذُكْرَانَ الشَّيَاطِيْنِ وَ إِنَاثَهُمْ .'' (تحفة الأحوذي:٤٤/١)

یعنی ''مقصود اس سے شیاطین کا نر اور مادہ ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ شیاطین میں ذُکوریّت اور اُنُوثیّت کی صفات موجود ہیں اور ان صفات کی موجودگی سابقہ دونوں چیزوں پر دال ہے۔یعنی ان میں ازدواجی تعلق اور ولادت کا سلسلہ بھی موجود ہے۔ مسئلہ ہذا میں اگرچہ بعض لوگوں نے انکار اور دیگر بعض نے تردد کا اظہار کیا ہے لیکن دلائل کے اعتبار سے ترجیح اسی مسلک کو ہے جس کی ہم نے وضاحت کر دی ہے۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ ، وَعِلْمُهُ أَتَمُّ.

سوال: کراماً کاتبین قلبی اعمال پر ہی مطلع ہو جاتے ہیں، یا عملی صورت میں ظہور کے بعد؟

جواب: کتاب وسنت سے یہ بات بداہتہً معلوم ہوتی ہے کہ دلوں کے بھیدوں سے صرف اللہ عزوجل ہی واقف ہے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔ وہ فرشتے ہوں یا انس وجن وغیرہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ . اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ . ﴾ (الملك:١٣-١٤)

''اور تم (لوگ) بات پوشیدہ کہو یا ظاہر وہ دل کے بھیدوں تک سے واقف ہے۔ بھلا جس نے پیدا کیا، وہ بے خبر ہے؟ وہ تو پوشیدہ باتوں کو جاننے والا اور ہر چیز سے آگاہ ہے۔''

اور صورت مرقومہ میں فرشتوں کی طرف جس علم کی نسبت کی گئی۔ یہ وہ علم ہے جو تجدد اور استمرار کی شکل میں معرض وجود میں آتا ہے۔آیت کریمہ میں مضارع کے صیغوں کا استعمال بھی اس بات کی واضح دلیل ہے۔ اس لیے کہ صیغہ مضارع میں حال اور مستقبل کا زمانہ پایا جاتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ . مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ . ﴾ (ق:١٧-١٨)

''جب (وہ کوئی کام کرتا ہے تو) دو لکھنے والے جو دائیں اور بائیں بیٹھے ہیں، لکھ لیتے ہیں کوئی بات اس کی زبان پر نہیں آتی مگر ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے۔''

لیکن اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ صحیح بخاری میں حدیث ہے: اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

”جب میرا بندہ برائی کا ارادہ کرتا ہے۔ حکم ہوتا ہے کہ فرشتو! اسے تحریر میں مت لانا حتی کہ عمل کر گذرے، اگر یہ عمل کر لیتا ہے تو صرف ایک برائی لکھو۔ اور اگر اس نے میری رضا کی خاطر برائی کو ترک کر دیا تو اس کے لیے ایک نیکی لکھ دو۔“ ❶ (کتاب التوحید)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے باطنی قلبی اُمور پر مطلع ہو جاتے ہیں۔

اس اشکال کا جواب یوں ہے کہ یہاں فرشتوں کا قلبی امر پر مطلع ہونا اللہ کی طرف سے آگاہی پانے کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ ابن ابی الدنیا نے ابوعمران الجونی سے بیان کیا ہے کہ ”بارگاہ الٰہی سے آواز آتی ہے: فلاں کے لیے اتنا اتنا ثواب لکھ دو۔ فرشتہ عرض کرتا ہے: اے پروردگار اس نے تو یہ عمل کیا بھی نہیں۔ اللہ فرماتا ہے: اس نے نیت تو کر لی ہے۔“ اور بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ برائی کی بدبو اور نیکی کی خوشبو کی وجہ سے فرشتوں کو معلوم ہو جاتا ہے یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ فرشتے میں علم کا ادراک پیدا کر دیتا ہے۔ جس سے اس کو محسوس ہو جاتا ہے۔

بہر صورت وجہ کوئی بھی ہو۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ دلوں کے راز صرف اللہ کے ہاں محفوظ ہیں اور وہی واقف ہے۔ اس کے سوا یہاں تک کسی کی رسائی نہیں۔ ﴿ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ . ﴾ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتح الباری: ۳۲۵/۱۱)

سوال: کیا جن اپنی مرضی سے اپنی شکل تبدیل کر سکتے ہیں؟ تاکہ انسانوں کو نظر آ سکیں؟

جواب: جنات اجسام لطیفہ سے عبارت ہیں۔ ان میں مختلف شکلیں اختیار کرنے کی قوت موجود ہے۔ کتب احادیث میں متعدد واقعات اس بات کے مؤید ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ❷، حفظ زکوٰۃ رمضان کے تحت فرماتے ہیں:

” وَأَنَّهُ قَدْ يَتَصَوَّرُ بِبَعْضِ الصُّوَرِ فَتَمَكَّنَ رُؤْيَتُهُ وَأَنَّ قَوْلَه تَعَالٰى :﴿ إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ . ﴾مَخْصُوصٌ بِمَا إِذَا كَانَ عَلٰى صُورَتِهِ الَّتِي خُلِقَ عَلَيْهَا .“ (فتح الباری ۴۸۹/۴)

---

❶ (٦٤) صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول الله تعالٰی:﴿یریدون أن یبدلوا کلم الله﴾ (٧٥٠١)، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب إذا هم العبد بحسنة کتبت ...... (٣٣٤ـ٣٣٨).

❷ (٦٥) صحیح البخاری، کتاب الوکالة، باب إذا وکل رجلا فترك الوکیل شیئا...... (٢٣١١)، (٣٢٧٥).

یعنی ''بعض دفعہ شیطان بعض صورتیں اختیار کر لیتا ہے جس سے اس کی رؤیت ممکن ہو جاتی ہے اور اللہ کا فرمان کہ وہ اور اس کے بھائی تم کو ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔ یہ اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے جب وہ اپنی اصلی تخلیقی حالت میں ہو۔''

اور صاحب تفسیر فتوحات الٰہیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" أَيْ إِذَا كَانُوْا عَلٰى صُوَرِهِمُ الْأَصْلِيَّةِ أَمَّا إِذَا تَصَوَّرُوْا فِيْ غَيْرِهَا فَنَرَاهُمْ كَمَا وَقَعَ كَثِيْرًا ."(١٣٣/٢)

چند سطور بعد فرماتے ہیں:

" فَأَجْسَادُهُمْ مِثْلَ الْهَوَاءِ نَعْلَمُهُ وَ نَتَحَقَّقُهُ وَلَا نَرَاهُ وَ هٰذَا وَجْهُ عَدَمِ رُؤْيَتِنَا لَهُمْ وَوَجْهُ رُؤْيَتِهِمْ لَنَا كَثَافَةُ أَجْسَادِنَا وَوَجْهُ رُؤْيَةِ بَعْضِهِمْ بَعْضًا أَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَوّٰى شُعَاعَ أَبْصَارِهِمْ جِدًّا،حَتّٰى يَرٰى بَعْضُهُمْ بَعْضًا وَلَوْ جُعِلَ فِيْنَا تِلْكَ الْقُوَّةُ لَرَأَيْنَاهُمْ وَلٰكِنْ لَّمْ يَجْعَلْهَا لَنَا."

ایک دفعہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے شیطان کو بصورت ہاتھی دیکھا تھا اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

« فَإِذَا هُوَبِدَابَّةٍ شِبْهُ الْغُلَامِ الْمُحْتَلِمِ فَقُلْتُ لَهُ: أَجِنِّيٌّ أَمْ إِنْسِيٌّ؟ قَالَ: بَلْ جِنِّيٌّ . » (فتح الباری ٤٨٨/٤، ٤٨٩)

اور صحیح مسلم میں بصورت سانپ بھی ذکر ہے۔ [1]

حاصل یہ ہے کہ جسم کثیف کی صورت میں انسان کا جن کو دیکھنا ممکن ہے لیکن بصورت جسم لطیف ناممکن ہے۔ کَمَا تَقَدَّم.

سوال: کیا جن انسانوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ یا تکلیف دے سکتے ہیں؟ ان سے چھٹکارے کا کیا طریقہ ہے؟

جواب: جن انسان کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے۔ [2] ایک شیطان نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز

---

[1] (٦٦) صحيح مسلم، كتاب السلام، باب قتل الحيات وغيرها(٥٨٣٩).

[2] (٦٧) صحيح البخارى، كتاب العمل فى الصلاة ، باب ما يجوز من العمل فى الصلاة (١٢١٠).

خراب کرنے کی سعی کی تھی اور قرآن میں ہے:

﴿ وَ أَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا. ﴾ (الجن: ٦)

''اور یہ کہ بعض بنی آدم بعض جنات کی پناہ پکڑا کرتے تھے۔ (اس سے) ان کی سرکشی اور بڑھ گئی تھی۔''

ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کا طریقہ کار یہ ہے کہ مسنون ورد اور وظائف کا اہتمام کیا جائے جو کتب احادیث میں موجود ہیں۔ بالخصوص آیۃ الکرسی اور سورہ بقرۃ کی تلاوت۔

سوال: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ دنیا کا نظام خود اکیلا چلا سکتا ہے۔ مگر اس نے نظام فرشتوں کے ذریعہ کیوں چلا رکھا ہے۔ اس میں کیا حکمت ہے اور اگر فرشتوں کی تقسیم رزق سے شرک لازم نہیں آتا تو حضور ﷺ کی تقسیم باذن اللہ سے کیوں آ جاتا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے۔ اس نے اپنی حکمت کاملہ سے فرشتوں کو مختلف امور پر مقرر کر رکھا ہے جو ہر دم اس کے محتاج ہیں: ﴿ لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ أَمَرَهُمْ. ﴾ اس کا نام شرک نہیں۔ شرک تو یہ ہے کہ غیر اللہ کو اس کے افعال و اعمال میں بقاعدہ حصہ دار تصور کرنا جس طرح بعض اہل بدعت کا نبی ﷺ کے بارے میں یہ عقیدہ ہے، حضرت عیسیٰ کے معجزات باذن اللہ کی قبیل سے ہیں۔ کوئی بھی ان کو شرک نہیں گردانتا کیوں کہ مؤثر حقیقی صرف اللہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر صرف ظہور ہوا ہے۔

❀❀❀❀❀❀❀

فرمانِ باری تعالیٰ
﴿ يَسْئَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ. ﴾
(الأعراف: ١٨٧)
فرمانِ رسول ﷺ
« مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَمُوتُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ أَوْ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ إِلَّا وَقَاهُ اللّٰهُ فِتْنَةَ الْقَبْرِ. »

﴿۸﴾ قیامت، حساب و کتاب اور جنت و دوزخ وغیرہ

سوال: علیین و سجین میں اعمال نامے اور روح دونوں رکھے جاتے ہیں یا کوئی ایک؟

جواب: علیین اور سجین سے اعمال نامے اور روح دونوں کا تعلق ہوتا ہے۔(فتاویٰ عزیزی)

سوال: قیامت کی نشانیوں میں کیا کنوؤں اور مسجدوں کا بکثرت پایا جانا شامل ہے؟

جواب: کنوؤں کا کثرت سے پایا جانا قیامت کی علامات سے ہو، میرے علم میں نہیں البتہ مسجدوں کا تذکرہ بعض انداز میں ملتا ہے۔ مثلاً فرمایا:

«مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وهِيَ خَرَابٌ مِّنَ الْهُدٰى.» [1]

(رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيْمَانِ بحواله مِشْكوة ،كِتَابُ الْعِلْم)

یعنی ”مسجدیں ان کی آباد ہوں گی اور حقیقت میں خراب ہوں گی ہدایت سے یعنی مسجدیں قرآن و سنت کے درس اور ذکرِ الٰہی سے خالی اور بے رونق ہوں گی۔“ (مرقاۃ)

سوال: ”ہر طرح کے نیک اعمال کا صلہ آخرت میں ملے گا۔“

کیا فرشتے بھی جو درود پڑھتے ہیں انہیں بھی اس کا صلہ آخرت میں ملے گا؟

جواب: جنت اور دوزخ کی صورت میں جزا و سزا کا تعلق انس و جن سے ہے جب کہ فرشتوں میں مادۂ شر کا ادنیٰ شائبہ بھی نہیں اور نہ وہ ان معنوں میں شریعت کے مکلّف ہیں۔ لہٰذا ان کی طرف صلہ کی نسبت بے معنی ہے۔

سوال: عالم برزخ کے کیا معنی ہیں؟ اور کون سے مقام کو عالم برزخ کہا جاتا ہے؟ کیا نیک اور بدلوگوں کی

---

[1] (٦٨) المشكوٰة (٢٧٦)وقال الألباني :ورواه ابن عدى في "الكامل" ......وأبو عمر الداني في " السنن الواردة في الفتن"عن على موقوفا عليه وفيه بشر بن الوليد وفيه ضعف وكان شاخ وخرف . والبيهقي في الشعب (٢/ ٣١١، ٣١٢)وقال: هذا موقوف وإسناده إلى شريك مجهول والأول منقطع والله أعلم.

روح عالم برزخ میں ہی جاتی ہے؟

جواب: دو چیزوں کے درمیان جو چیز اٹکاؤ کی طرح ہو اس کو برزخ کہتے ہیں۔ انسان کا قبر میں رہنے کا زمانہ دنیا اور عقبیٰ کے مابین ایک اٹکاؤ کا زمانہ ہے۔ اس لیے اس کو برزخ کہا جاتا ہے۔(احسن التفاسیر، ۴/۳۲۳)

سوال: کچھ احادیث میں آتا ہے کہ اگر کسی نے فلاں کام کیا تو وہ بغیر حساب کے جنت میں جائے گا۔[1] لیکن اگر اس کے ذمہ حقوق العباد ہوں گے تو وہ کس طرح جنت میں جائے گا۔ نیز قرآن پاک میں آتا ہے کہ جو چھوٹی نیکی کرے گا اس کی جزا پائے گا اور جو چھوٹی سی برائی کرے گا تو وہ اس کی بھی سزا پائے گا۔ پھر بغیر حساب جنت میں کیسے جائے گا؟

جواب: حقوق العباد کا معاملہ واقعی بڑا پر خطر ہے لیکن اللہ جب کسی فرد کو بغیر حساب جنت میں لے جانا چاہے گا تو اس کا معاملہ اپنی طرف سے نپٹا کر بلا حساب جنت میں داخل کرنے کی کوئی رکاوٹ یا ممانعت نہیں ہوگی۔ فی الجملہ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (الفتح ۱۱/۳۰۱) اس صورت میں بلا حساب جنت میں داخلہ اللہ کی نظر شفقت، رحمت خاص اور درگزر سے ہی ممکن ہوگا۔ صحیح حدیث میں ہے:

« لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ أَحَدٌ بِعَمَلِهِ.»[2] الحدیث

کوئی شخص جنت میں محض اپنے عمل کی بنیاد پر نہیں جائے گا، جب تک اللہ اسے اپنے دامان رحمت میں نہ ڈھانپ لے گا۔

سوال: الاعتصام کے ۱۵ ستمبر کے شمارے میں ایک مضمون ''پندرہ خصلتیں'' کے عنوان سے چھپا تھا۔ اس کے حوالہ سے عرض ہے کہ یہ پندرہ کی پندرہ خصلتیں آج پوری امت میں موجود ہیں اور کچھ لوگ ان کو قرب

---

[1] (٦٩) الاوّل: " قال الله تعالىٰ يوم القيامة للمجاهدين والشهداء ادخلوا الجنة فيدخلونها بغير حساب و لا عذاب" ، الحاكم(٧٢/٢)، و صححه و وافقه الذهبي۔ والثاني : " الذين لا يسترقون و لا يكتوون و لا يتطيرون و على ربهم يتوكلون...... يدخلون الجنة بغير حساب و لا عذاب ...... الخ "صحيح البخاري (٦٤٧٢)، مسلم(٢٢٠)، في الايمان و المشكاة بتحقيق الثاني للألباني (٥٢٢٥)، والحديث الاخر الحاكم(٧٠/٨) و صححه و وافقه الذهبي و ابو عوانة (٩٤/٥) .

[2] (٧٠) « لن يد خل الجنة أحدًا عملُه .» :قالو ا :و لا أنتَ ؟ يا رسو ل الله (صلى الله عليه وسلم)قال:« ولا أنا إلا أن يتغمدني الله منه رحمة.» صحيح البخاري،كتاب الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل ،عن عائشة رضى الله عنها(٦٤٦٤ إلى ٦٤٦٧)،صحيح مسلم، كتاب صفات المنافقين، باب لن يد خل أحد الجنة......(٧١٢٢) واللفظ له عن أبي هريرة وجابر و عائشة رضى الله عنهم.

قیامت کی علامات بیان کرتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟ دوسرے بریلوی حضرات چودھویں صدی کا بہت ذکر کرتے ہیں جو کہ اب گزر چکی بلکہ اگلی صدی کے دس سال بھی گذر گئے ہیں۔ اس کے بارے میں قرآن اور حدیث کا کیا فرمان ہے؟ دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا امام مہدی دونوں میں سے کون پہلے آئے گا اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس بارے میں کیا ارشاد ہے؟

جواب: قرب قیامت کی بہت ساری علامات ہیں، جن کا تذکرہ متعدد احادیث میں موجود ہے۔ ان میں سے بہت سی روایات کو حافظ ابن کثیر نے ''النهایة'' میں جمع کر دیا ہے۔ کتاب ہذا پہلی دفعہ ۱۳۸۸ھ میں ریاض (سعودی عرب) سے دو جلدوں میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے۔ تصنیف لطیف بے حد مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

بنابریں محولہ بالا پندرہ خصلتیں بھی قرب قیامت کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اسی روایت کے آخر میں ہے: پھر یکے بعد دیگر بلا وقفہ علامات کا ظہور ہو گا جس طرح تسبیح کا جواہر دھاگہ اور لڑی ٹوٹنے سے پے در پے دانے بکھر جاتے ہیں۔ صاحب مشکوٰۃ نے بھی اس روایت کو "أَشْرَاطُ السَّاعَة" کے عنوان کے تحت بیان کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: غزنوی ترجمہ مشکوۃ(٤ / ١٠١)

بعض آثار میں وارد ہے کہ دنیا کی کل عمر سات ہزار سال ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چھ ہزار سال کے دوران ہے۔ مفسر سلیمان الجمل فرماتے ہیں، آثار سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی مدت ہزار سال سے متجاوز ہے۔ لیکن یہ زیادتی پانچ سو سال کو نہیں پہنچ سکے گی۔ موضوع ہذا پر علامہ سیوطی کی ایک تصنیف "بناء الكشف عن مجاوزة هذة الأمة الألف ." موجود ہے۔

(الفتوحات الْإِلٰهِيَّة ، ٤/ ٤١٣ طبع مصر)

انہی آثار پر اعتماد کرتے ہوئے بعض حضرات نے چودھویں صدی ہجری کی اہمیت اجاگر کرنے کی سعی کی ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ تحدید کے بارے میں وارد آثار و اقوال لائق اعتناء و استناد اور قابل تسلی نہیں۔ قرآنی فیصلہ حتمی ویقینی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ ﴾ (الأعراف:١٨٧)

''یعنی (لوگ) تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہ اس کے واقع ہونے کا وقت کب

ہے کہہ دو! کہ اس کا علم تو میرے پروردگار ہی کو ہے۔ وہی اسے اس کے وقت پر ظاہر کر دے گا۔“
اور ”حدیث جبریل“ میں ہے آپ نے قیامت کے بارے میں سائل کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

« مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ.»[1]

”مسئول عنہ کو بھی سائل سے زیادہ علم نہیں۔“

حافظ ابن کثیر مسئلۂ مہدی پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

” وَ أَظُنُّ ظُهُوْرَہ قَبْلَ نُزُوْلِ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ كَمَا دَلَّتْ عَلٰى ذَالِكَ الْأَحَادِيْثُ.“

یعنی ”میرا خیال ہے مہدی کا ظہور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام سے پہلے ہوگا جس طرح کہ کئی ایک احادیث اس بات پر دال ہیں۔“

بسط و تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (النهاية: ص ٢٧ تا ٣٣ اور عون المعبود: ٤/ ١٧٠)

سوال: کیا قیامت کے دن لوگ ماں کے نام پر بلائے جائیں گے یا باپ کے نام پر؟

جواب: روز جزا لوگوں کو باپوں کے ناموں پر پکارا جائے گا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے مسئلہ ہذا کے اثبات کے لیے اپنی صحیح میں باقاعدہ تبویب قائم کی ہے، فرماتے ہیں: "بَابُ يُدْعَى النَّاسُ بِآبَائِهِمْ"، پھر اس کے تحت جس حدیث سے استدلال کیا ہے اس کے الفاظ یوں ہیں:

« يُقَالُ: هٰذِهِ غَدْرَةُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ.»[2] (بخاری:٢/٢١٢)

اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ماں کے نام پر پکارا جائے گا ان کا استدلال قراءت شاذہ سے ہے:

﴿ يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِم . ﴾ (بنی إسرائیل:٧١)

اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں یہ معاملہ عیسیٰ علیہ السلام کے احترام کے پیش نظر ہوگا۔ صحیح بات ہے کہ قراءت شاذہ قابل حجت نہیں، لہٰذا ترجیح پہلے مسلک کو ہے۔

سوال: اگر کوئی آدمی قبر کے عذاب سے بچ جاتا ہے تو کیا وہ دوزخ کے عذاب سے بھی بچ جائے گا؟

جواب: ہاں! ظاہر یہی ہے۔ کیونکہ قبر آخرت کی منزلوں میں سے ایک منزل ہے۔ اس میں جزا سزا کا اصل تعلق جنت اور دوزخ سے ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (صحيح بخاری، كتاب الجنائز)

سوال: ▢...... دفنانے کے بعد روح اپنا وقت آسمان پر گزارتی ہے یا قبر میں یا دونوں جگہ؟

---

[1] (٧١) انظر الرقم المسلسل (٤٥).

[2] (٧٢) صحيح البخاری، كتاب الأدب(٦١٧٧)، (٦١٧٨).

۲ ...... موت کے بعد غسل، جنازے اور دفن ہونے تک انسانی روح پر کیا بیتتی ہے۔ اس کے کیا احساسات ہوتے ہیں۔

۳ ...... کیا وہ رشتہ داروں کو دیکھتا اور ان کی آہ وبکا کو سنتا ہے جسم کو چھونے سے اسے تکلیف ہوتی ہے یا نہیں؟

جواب: ۱ ...... قبر میں بعد از سوال مومن کی روح عِلِّیِّین میں اور کافر کی سِجِّین میں چلی جاتی ہے۔ لیکن ہر روح کا مستقر سے معنوی اتصال بدستور قائم رہتا ہے۔ اور یہ اتصال دنیاوی زندگی کے مشابہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے قریب تر حالت سوئے ہوئے انسان کی ہے۔ بظاہر اس کی روح انفصالی شکل میں کئی جگہ گھومتی پھرتی ہے۔ اور بعض علماء نے اس کو سورج کی شعاعوں سے بھی تشبیہ دی ہے جو دور دور تک پھیلتی جاتی ہیں۔

چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اپنے مطبوعہ فتاویٰ میں فرماتے ہیں:

" إِنَّ أَرْوَاحَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ عِلِّيِّيْنَ وَ أَرْوَاحَ الْكُفَّارِ فِيْ سِجِّيْنَ وَ لِكُلِّ رُوْحٍ اِتِّصَالٌ وَهُوَ اِتِّصَالٌ مَعْنَوِيٌّ لَا يُشْبِهُ الْاِتِّصَالَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا بَلْ أَشْبَهُ شَيْئٍ بِهٖ حَالَ النَّائِمِ انْفِعَالًا ،وَ شَبَّهَهٗ بَعْضُهُمْ بِالشَّمْسِ أَيْ بِشُعَاعِ الشَّمْسِ وَ هٰذَا مَجْمَعُ مَا افْتَرَقَ مِنَ الْأَخْبَارِ أَنَّ مَحَلَّ الْأَرْوَاحِ فِيْ عِلِّيِّيْنَ وَ سِجِّيْنَ وَ مِنْ كَوْنِ أَفْنِيَةِ الْأَرْوَاحِ عِنْدَ أَفْنِيَةِ قُبُوْرِهِمْ كَمَا نَقَلَهُ ابْنُ عَبْدِالْبَرِّ عَنِ الْجَمْهُوْرِ ."

اور شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ابن عبدالبر رحمہ اللہ کا قول یعنی روحوں کا عالم قبور میں ہونا اور مالک کا قول یعنی روحیں جہاں چاہتی ہیں کھاتی پیتی ہیں۔ یہ اقوال ضعیف ہیں کیونکہ قرآن کے ظاہر کے مخالف ہیں۔ قرآن کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ ارواح اللہ کے ہاں ممسک (نہیں) ہیں۔ انہیں نعمتیں اور عذاب اللہ کی مشیت کے تحت پہنچتا رہتا ہے۔ اس میں کوئی مانع (رکاوٹ) نہیں کہ ان پر عذاب اور نعمتیں پیش ہوں۔ پھر سب بدن یا اس کے بعض اجزاء کو اس کا احساس بھی ہو اور مشارالیہ دلیل اللہ کا ارشاد ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا...... . ﴾" (حاشیہ فتح الباری: ۳/۲۲۳)

نیز ایک صحیح حدیث میں ہے:

« إِنْ أَمْسَكْتَ نَفْسِيْ فَارْحَمْهَا وَ إِنْ أَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا.» ❶

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (شرح العقیدۃ الطحاویۃ، ص۳۸۹، اور ۳۹۱-۳۹۲،فتح الباری ۲۴۳/٤ ،بمعه حاشيه شيخ ابن باز رحمه الله تعالىٰ)

۲ ......اس دوران میں بھی من وجہ روح کا تعلق بلا اعادہ بدن سے قائم رہتا ہے جس کا احساس اسے مختلف امور میں کرا دیا جاتا ہے مثلاً صالح انسان شدت سے ثواب موعود کا منتظر رہتا ہے جبکہ نافرمان پریشانی کا اظہار کرتا ہے۔ اس پر امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

" بَابُ قَوْلِ الْمَيِّتِ وَ هُوَ عَلَى الْجَنَازَةِ قَدِّمُوْنِيْ. " ❷

''باب اس بات کا کہ میت ،اس وقت جب کہ اس کی لاش چار پائی پر ہوتی ہے، یہ کہتی ہے مجھے جلدی لے چلو۔'' هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَ عِلْمُهٗ أَتَمُّ.

سوال: کہا جاتا ہے کہ جب کوئی آدمی جمعہ کی رات یا جمعہ کے دن فوت ہو جائے تو اللہ جل جلالہ اس پر سے قیامت تک عذاب ہٹا لیتا ہے۔ یہ مسئلہ کیا درست ہے؟

جواب: جمعہ کی رات یا دن موت کی فضیلت کے بارے میں وارد روایات ضعیف ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے صحیح بخاری کے ''کتاب الجنائز'' کے اختتام پر حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث:

« مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ أَوْ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ إِلَّا وَقَاهُ اللّٰهُ فِتْنَةَ الْقَبْرِ.» ❸

یعنی ''جو مسلمان جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات فوت ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے عذاب قبر سے محفوظ فرما لیتا ہے۔''

نقل کرنے کے بعد رقمطراز ہیں:

" فِيْ إِسْنَادِهٖ ضُعْفٌ وَ أَخْرَجَهٗ أَبُوْ يَعْلٰى مِنْ حَدِيْثِ أَنَسٍ نَحْوَهٗ وَ إِسْنَادُهٗ أَضْعَفُ. "

یعنی ''اس حدیث کی سند میں ضعف ہے اور اس کی مانند حدیث ابو یعلی نے بھی حضرت انس سے

❶ (۷۳) صحيح البخاری، كتاب الدعوات، رقم الباب(۱۳) ح(٦۳۲۰). صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب الدعاء عند النوم(٦۸۹۲). المشكاة(۲۳۸۳)عن أبي هريرة.

❷ (٧٤) صحيح البخاری، كتاب الجنائز، رقم الباب(٥۲) ح(۱۳۱٦).

❸ (٧٥) حسنه الألبانی بشواهده. المشكاة(۱۳٦٧) و صحيح الترمذی، كتاب الجنائز، باب ما جاء فيمن يموت يوم الجمعة(۱۰٧٤). فتح الباری(۲٥۳/۳)شرح هذا الحديث رقم(۱۳۸٧).

بیان کی ہے لیکن اس کی سند اس سے بھی زیادہ کمزور ہے۔''

مذکور حدیث کے بارے میں امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَلَيْسَ إِسْنَادُهُ بِمُتَّصِلٍ ، رَبِيْعَةُ بْنُ سَيْفٍ إِنَّمَا يَرْوِيْ عَنْ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الْحُبَلِيِّ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو وَ لَا نَعْرِفُ لِرَبِيْعَةَ بْنِ سَيْفٍ سِمَاعًا مِنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو ."

یعنی ''یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند متصل نہیں۔ ربیعہ بن سیف کی روایت تو عبداللہ بن عمرو سے ابوعبدالرحمٰن حبلی کے واسطہ سے ہے۔ ربیعہ بن سیف کا سماع عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے معلوم نہیں ہو سکا۔''

(بَابُ مَا جَاءَ فِيْمَنْ يَمُوْتُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ .)

شارح ترمذی علامہ مبارکپوری فرماتے ہیں:

" فَالْحَدِيْثُ ضَعِيْفٌ لِانْقِطَاعِهٖ، لٰكِنْ لَهٗ شَوَاهِدُ . "

''پس انقطاع کی بنا پر حدیث ضعیف ہے لیکن اس کے کچھ شواہد ہیں۔''

پھر علامہ سیوطی سے بحوالہ ''مرقاۃ'' کچھ آثار وشواہد نقل کیے ہیں۔ (تحفۃ الأحوذی:۴/۱۸۸) بہرصورت ان آثار کی صحت یا قابل صحت ہونا مشکوک ہی نظر آتا ہے۔ جب کہ علامہ سیوطی کی شخصیت بھی رطب و یابس جمع کرنے میں معروف ہے۔ مجھے اس وقت سخت تعجب ہوا جب میں نے استاد محترم مفتی محمد عبدہٗ صاحب مدظلہ العالی کی کتاب ''احکام جنائز'' کا مراجعہ کیا تو اس کے حواشی میں بحوالہ تحفہ فرماتے ہیں:

" مُسْنَدُ أَحْمَدَ وَ التِّرْمَذِيِّ، وَلَهٗ شَوَاهِدُ،فَالْحَدِيْثُ بِمَجْمُوْعِ طُرُقِهٖ حَسَنٌ أَوْ صَحِيْحٌ ."

یعنی ''عبداللہ بن عمرو کی روایت مسند احمد اور ترمذی میں ہے اور اس کے کچھ شواہد بھی ہیں۔ پس حدیث مجموع طرق کے اعتبار سے حسن یا صحیح ہے۔''

دراں حالیکہ مذکور عبارت محل مقصود میں قطعاً نہیں ہے۔ البتہ ایک دوسرے مقام پر علامہ موصوف فرماتے ہیں:

یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس کی تائید متعدد حدیثوں سے ہوتی ہے۔'' (فتاویٰ ثنائیہ : ۲/ ۲۵)

گویا کہ موصوف کا رجحان اثبات مسئلہ رفع عذاب کی طرف ہے لیکن اس بارے میں درجہ حجت و استدلال کا حصول ایک مشکل امر ہے۔ اور یہ بات مسلمہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا انتقال سوموار کے روز ہوا تھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرض الموت میں اسی تمنا کا اظہار کیا تھا۔ اس پر امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں تبویب یوں قائم کی ہے: '' بَابُ مَوْتِ یَوْمِ الْاِثْنَیْنِ . '' ❶

شارحین حدیث نے لکھا ہے: اس سے مصنف کا مقصود جمعہ کی فضیلت کے بارے میں وارد حدیث کی تضعیف ہے۔

واقعاتی طور پر وفات کا جو دن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول خاتم النبیین ﷺ کے لیے منتخب اور پسند فرمایا وہی افضل اور بہتر ہونا چاہیے۔ اسی بنا پر خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس دن موت کی چاہت کی تھی۔

(ھٰذَا مَا عِنْدِیْ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَاب)

سوال: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں سے پوچھے گا کہ تم نے فلاں جرم کیا تھا تو وہ شخص انکار کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کی زبان کو بند کر دے گا اور ہاتھ پاؤں بولنے لگیں گے۔ سوال یہ ہے کہ ہاتھ پاؤں کس کے خلاف گواہی دیں گے۔ کیوں کہ وہ خود مجرم ہیں۔ اگر روح کے خلاف گواہی دیں گے۔ تو روح کا تو کوئی حقیقی جسم نہیں، روح تو حکم الٰہی ہے۔ جیسے: ''رُوْحٌ مِّنْ أَمْرِ رَبِّی'' یعنی عذاب کس کو ہوگا اور گواہی کس کے خلاف دیں گے؟

علمائے کرام کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ لکھا ہے وہی ہوگا یہ بھی خدا نے لکھ دیا ہے کہ فلاں کافر ہے اور فلاں مسلمان ہے۔ تو بتائیں کہ پھر انسان کے اختیار میں کیا ہے۔ ایک انسان کی تقدیر میں لکھا ہوا ہے کہ یہ کافر ہے خواہ وہ کتنی ہی محنت کیوں نہ کرے وہ مسلمان نہیں ہوسکتا، خدا نے تو خود ہی کافر اور مسلمان بنا دیا ہے تو انسان کے بس کی کوئی بات نہیں۔

جواب: انسان کے نفس میں محفوظ کفریات، شرکیات، مظالم اور معاصی جن کے اقرار و اعتراف سے روز جزاء زبان انکاری ہوگی۔ مثلاً قرآن میں مقولۂ کفار ہے:

﴿ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ . ﴾ (الأنعام:۲۳)

---

❶ (۷٦) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، رقم الباب (۹٤).

”اللہ کی قسم تو ہمارا پروردگار ہے۔ ہم شریک نہیں بناتے تھے۔“

تو اس کو مہر لگا کر گونگا بنا دیا جائے گا۔ پھر جوارح ان امور کی نشاندہی کریں گے تا کہ وجود کی شہادت سے انکار و تردد کی تمام راہیں مسدود ہو کر عذاب الٰہی سے بچنے نہ پائیں۔ ایک حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بندہ اپنے برے اعمال سے قیامت کے دن مکر جائے گا اور کہے گا: اے پروردگار کوئی گواہ ہو تو مانوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو خود گواہ ہے اور لکھنے والے فرشتے گواہ ہیں۔ پھر اس کے منہ پر مہر کر دی جائے گی اور ہاتھ پاؤں کو حکم ہو گا کہ بولو! اور اس کی بداعمالیاں بیان کر دو! وہ اس کے سب کرتوت بیان کر دیں گے۔ تب بندہ کہے گا جاؤ دور ہو میں تمہارے بچانے کے لیے سب ترکیب کر رہا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث کے بیان کرتے وقت ہنس پڑے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم جانتے ہو میں کیوں ہنسا ہوں۔ بندے کے اپنے رب سے منہ در منہ کلام کرنے پر۔ [1] (صحیح مسلم، کتاب الزھد)

بایں ہمہ اعضاء کی شہادت کا تعلق روح سمیت تمام انسانی باطنی مشینری سے ہوگا جو اخفاء حق میں معاون بنے گی۔ اور عذاب روح اور جسم دونوں کو ہو گا۔ جس طرح کہ ”حدیث قبر“ میں اس کی واضح دلیل ہے۔ اور روح کے بارے میں یہ نظریہ کہ اس کا حقیقی کوئی وجود نہیں ہے۔ سراسر غلط اور کتاب وسنت کے منافی ہے بلکہ روح رب کریم کی مربوب مخلوق ہے شارح عقیدہ طحاویہ فرماتے ہیں:

”وَقَدْ أَجْمَعَتِ الرُّسُلُ عَلٰى أَنَّهَا مُحْدَثَةٌ مَخْلُوْقَةٌ مَصْنُوْعَةٌ مَرْبُوْبَةٌ مُدَبَّرَةٌ.“

(ص ۳۷۹)

یعنی ”رسولوں علیہم السلام کا اس بات پر اجماع ہے کہ روح محدث مخلوق، مصنوع، مربوب اور مدبر ہے۔“

اور قرآن کی آیت: ﴿ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی ﴾ کی تفسیر میں علامہ سعدی رقمطراز ہیں:

”أَيْ مِنْ جُمْلَةِ مَخْلُوْقَاتِهِ الَّتِيْ أَمَرَهَا اللّٰهُ أَنْ تَكُوْنَ فَكَانَتْ.“ (۳۱۱/٤)

یعنی ”روح اللہ کی جملہ مخلوقات سے ہے جس کو اس نے بننے کا حکم دیا پس وہ بن گئی۔“

نیز علامہ عثمانی مرحوم فرماتے ہیں: دنیا میں کانوں سے آیات تنزیلیہ سنیں اور آنکھوں سے آیات تکوینیہ دیکھیں مگر کسی کو نہ مانا۔ یہ خبر نہ تھی کہ گناہوں کا یہ سارا ریکارڈ خود انہی کی ذات میں محفوظ ہے جو وقت پر کھول دیا جائے گا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں کفار اپنے جرائم کا زبان سے انکار کریں گے اس وقت حکم

[1] (۷۷) صحیح مسلم، باب "الدنیا سجن المؤمن وجنة الكافر" (۷٤۳۹).

ہو گا کہ ان کے اعضاء کی شہادت پیش کی جائے گی جن کے ذریعہ سے گناہ کئے تھے۔ چنانچہ ہر ایک عضو شہادت دے گا اور اس طرح زبان کی تکذیب ہو جائے گی۔ تب مبہوت و حیران ہو کر اپنے اعضاء کو کہے گا :(کم بختو!) دور ہو جاؤ۔ تمہاری ہی طرف سے تو میں جھگڑتا اور مدافعت کرتا رہا (تم خود ہی اپنے جرموں کا اعتراف کرنے لگے)۔ (سورة المؤمن حاشیه نمبر:۹)

اللہ عزوجل وحدہ لاشریک چونکہ عالم الغیب والشہادۃ ہے اور اس کا علم ہر شے کو محیط ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا. ﴾ (الطلاق:۱۲)

''اور یہ کہ اللہ اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔''

جس کو اس نے اپنی حکمت کاملہ کی بنا پر لوح محفوظ کی صورت میں لکھ رکھا ہے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ کس بندے نے ایمان اختیار کرنا ہے اور کس نے کفر کا ارتکاب کرنا ہے۔

اس بارے میں بعض لوگوں کا نظریہ کہ اللہ نے لکھا ہوا ہے۔ اس لیے بندہ کسی فعل کا ارتکاب کرتا ہے یہ غلط ہے بلکہ اس طرح کہنا چاہیے کہ بندے نے کرنا تھا اس لیے اللہ نے لکھا ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے: قلم کو حکم ہوا لکھ اس نے کہا: میں کیا لکھوں؟ حکم ہوا: تقدیر لکھ۔ پس قلم نے جو کچھ ہو چکا تھا اور جو کچھ ہونا تھا لکھ دیا۔ [1]

غور فرمایئے! اس میں اللہ کا کیا قصور ہے؟ ہاں اگر اللہ کی تحریر بندے کے لیے رکاوٹ بنتی تو واقعی اعتراض ممکن تھا۔ لیکن جب معاملہ یوں نہیں بلکہ بندے سے جو کچھ ہونا تھا قلم نے وہی کچھ مقید کیا ہے پھر اس پر بھی گرفت نہیں بلکہ فعل جب ہو گزرا تو اسے پکڑا، مزید وضاحت کے لیے اس کو یوں سمجھیں بفرض محال اگر اللہ کو علم نہ ہوتا تو بھی بندے نے نیکی یا بدی کرنی تھی تو اللہ کے علم سے کونسا جبر لازم آ گیا۔

یاد رہے اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ بندوں کے تمام افعال کا خالق صرف اللہ ہے اور کسب بندوں کا ہے قرآن میں ہے:

﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ . ﴾ (الصافات:۹٦)

''حالانکہ تم کو اور جو تم بناتے ہو اس کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔''

---

[1] (۷۸) صححه الألباني، صحيح الترمذي، أبواب القدر، رقم الباب (۱٦)، المشكاة، (۹٤) والصحيحة (۱۳۳).

﴿ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَّ إِمَّا كَفُورًا . ﴾ (الدھر:۳)

''(اور) اسے رستہ بھی دکھا دیا (اب) خواہ وہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا۔''

﴿ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا . قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا . وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا . ﴾ (الشمس:۸-۱۰)

''پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیز گاری کرنے کی سمجھ دی کہ جس نے (اپنے) نفس کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔''

بخلاف جبریہ کے کہ ان کا کہنا ہے کہ بندہ مجبور محض ہے جس طرح کوئی شے ہوا میں معلق ہو تو بلا ارادہ ہلتی رہتی ہے۔ اسی طرح انسان بھی مَسْلُوبُ الْاِخْتِيَار ہے اور معتزلہ کے نزدیک بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے۔ یہ دونوں نظریے گمراہ اور کتاب وسنت کے خلاف ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ بندہ نہ تو مجبور محض ہے اور نہ مختار مطلق بلکہ اس کی حالت بین بین ہے جس کو کسب اور اکتساب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دیکھئے روح کی حقیقت سے (علماء کے اٹھارہ سو اقوال کے باوجود) ہم ناواقف ہیں لیکن اس کے آثار کی وجہ سے ہم تسلیم کرتے ہیں اسی طرح اللہ کی ذات وصفات پر ہمارا ایمان ہے لیکن کنہہ وحقیقت کا ادراک نہیں۔ ٹھیک اسی طرح کسب واکتساب کو سمجھ لینا چاہیے۔

مزید بسط وتفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: شرح العقيدة الطحاوية، (ص ۴۳۱-۴۴۰)

سوال: جو عورت فوت ہو جاتی ہے اور بچہ ابھی پیدا نہیں ہوا بطن میں ہی ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ اس میں روح ڈال دی گئی ہو یا نہ، اگر اس میں روح ڈال دی گئی ہو تو کیا قیامت کے روز دوبارہ ماں کے بطن سے جدا کیا جائے گا۔ اگر روح نہ ڈالی گئی ہو تو کیا ہو گا؟

جواب: وہ بچہ جو فوت شدہ والدہ کے شکم میں رہ جاتا ہے نفخ روح سے قبل یا بعد ہر دو صورت میں روز جزاء اس کا ظہور ہو گا۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا . ﴾ (الحج:۲)

''اور تمام حمل والیوں کے حمل گر پڑیں گے۔''

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' إِنَّهَا تُلْقِي جَنِينَهَا بِغَيْرِ تَمَامٍ مِنْ شِدَّةِ الْهَوْلِ. '' (فتح القدير ۴۳۵/۳)

یعنی ''عورت ہولناکی کی وجہ سے اپنے پیٹ میں چھپا ہوا بچہ گرا دے گی۔''

اسلام نے اس قسم کے بچوں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک ذمیہ عورت مسلمان کی منکوحہ جس کے بطن میں بچہ تھا، فوت ہوگئی۔ حمل کے احترام کی خاطر فرمایا کہ اس کو مسلم قبرستان میں دفن کیا جائے۔ حالانکہ وہ غیر مسلمہ تھی۔ (تلخیص الحبیر ۱۴۷/۲)

پھر مسند احمد میں حدیث ہے:

«وَالسِّقْطُ يُصَلّٰى عَلَيْهِ.» ❶ (سَنَدُہ حَسَنٌ)

(قبل از وقت پیدا ہونے والا یا مردہ بچہ، اس کی نماز (جنازہ) پڑھی جائے۔

اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچہ بچہ جس کے والدین پر دوزخ واجب ہو چکی ہو گی وہ اللہ عزوجل سے مُخَاصَمَہ اور منازعہ کر کے ان کو جنت میں لے جائے گا۔ ❷ (رَوَاہُ ابْنُ مَاجہ وَ سَنَدُہٗ ضَعِیفٌ) اور صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں ہے:

" صِغَارُهُمْ دَعَامِيصُ أَهْلِ الْجَنَّةِ يَلْقٰى أَحَدُهُمْ أَبَاهُ فَيَأْخُذَ بِنَاحِيَةِ ثَوْبِهِ فَلَا يُفَارِقُهُ حَتّٰى يُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ. " ❸ (بحواله المرعاة ۵۱۶/۲)

یعنی ''چھوٹے بچے اہل جنت کے پانی کے سیاہ کیڑے کی طرح ہوں گے ان میں سے ایک اپنے باپ سے ملے گا جب تک جنت میں داخل نہیں کرے گا چھوڑے گا نہیں۔''

مسند احمد میں ہے:

« إِنَّ السِّقْطَ لَيَجُرُّ أُمَّهُ إِلَى الْجَنَّةِ إِذَا أَحْتَسَبَتْهُ.» ❹

ناقص یا مردہ بچہ اپنی ماں کو جنت کی طرف کھینچ کر لے جائے گا بشرطیکہ ماں نے ثواب کی نیت

---

❶(۷۹) صححه الألباني وحمزة،صحيح أبي داؤد، كتاب الجنائز، باب المشي أمام الجنائز (۳۱۸۰) ،ابن ماجه (۱۵۰۷،۱۴۸۱) وكتاب الجنائز صـ۱۲۸ للألباني(بالأردية) ،أحمد (۲۴۹/٤) (۱۸۰۹۱).

❷(۸۰) ضعفه الألباني،ابن ماجة، كتاب الجنائز، باب ما جاء فيمن أصيب بسقط (۱۶۰۸)، ضعيف ابن ماجه (۳۵۳) والمشكاة (۱۷۵۷).

❸(۸۱) باب فضل من يموت له ولد فيحتسبه (۶۷۰۱).

❹(۸۲) صحيح ودرست الفاظ حديث: «والذى نفسى بيده ! إن السقط ليجر أمه بسرره إلى الجنة إذا احتسبته.» صححه الألباني،صحيح ابن ماجه، كتاب الجنائز(۱۶۰۹)،(۱۳۰۵)،أحمد (۲۴۱/۵).

سے صبر کیا ہو۔"

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و شرع متین اس مسئلہ کی بابت کہ میت سے قبر میں جب یہ سوال کیا جاتا ہے کہ « مَا كُنتَ تَقُولُ فِي هٰذَاالرَّجُلِ ؟.» "تو اس مرد کے متعلق کیا کہتا تھا؟" تو کیا رسول اکرم ﷺ کی صورت وہاں دکھائی جاتی ہے یا آپ خود تشریف لاتے ہیں؟ اس حدیث میں بعض لوگ نحوی نقطہ کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ ھذا اسم اشارہ قریب کے لیے ہے جس سے معلوم ہوا کہ آپ وہاں موجود ہوتے ہیں اور فرشتے آپ کی طرف اشارہ کرکے کہتے ہیں: «مَا كُنتَ تَقُولُ فِي هٰذِاالرَّجُلِ؟.» جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

جواب: « مَا كُنتَ تَقُولُ فِي هٰذَا الرَّجُلِ ؟.»[1] میں لام عہد ذہنی ہے۔ ھٰذَا اور مَا مشارالیہ حَاضِر فِي الذِّهن ہے جس طرح کہ "تنوير الحوالك لِلسُّيُوطِیْ" میں ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا پسند کردہ مسلک بھی یہی ہے۔ کلام عرب میں یہ استعمال شائع و ذائع عام ہے چنانچہ "قصہ ہرقل" میں ہے:

" اِنِّي سَائِلٌ هٰذَا عَنْ هٰذَا الرَّجُلِ."

پھر مسئول (میت) کا جواب بصیغہ غائب بھی اس امر کا مؤید مثلاً:

"هُوَ عَبْدُاللّٰهِ وَ رَسُوْلُهٗ" [2]..... "اَشْهَدُ اَنَّهٗ عَبْدُاللّٰهِ وَ رَسُوْلُهٗ."[3]

وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ مزید آنکہ مقام ہذا مقام امتحان ہے اس بنا پر اسم گرامی کی تصریح ترک کر دی گئی ہے۔ اسکا بھی تقاضا ہے کہ آپ کی شخصیت سامنے نہ ہو۔

رفع حجاب یا حضور بالجسم کے نظریہ پر واضح صریح کتاب و سنت میں کوئی دلیل موجود نہیں بلکہ اس نظریہ کا کمزور پہلو یہ ہے کہ واقف سے واقفیت تو آسان تر کام ہے لیکن سابقہ وجودی عدم معرفت کی صورت میں حفظ اوصاف کے باوجود معاملہ مشتبہ ہونے کا امکان ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہوا۔ ابوجہل کے لیے وجودی معرفت آسان ہے کیونکہ اسنے آپ کو دیکھا ہوا ہے جب کہ بعد والے مومن کے لیے مشکل ہے کیونکہ اس کو آپ کی رؤیت حاصل نہیں حالانکہ اصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مومن کی معرفت ایمان پر موقوف ہے

---

[1] (٨٣) صحيح البخاري ،كتاب الجنائز ،باب الميت يسمع خفق النعال (١٣٣٨) ،صحيح مسلم ،كتاب الجنة ونعيمها ،باب عرض مقعد الميت من الجنة والنار(٧٢١٦) ،المشكاة (١٢٦، ١٣٠، ١٣١).

[2] (٨٤) صحيح الترمذي (١٠٨٣) حسنه الألباني،الصحيحة (١٣٩١).

[3] (٨٥) صحيح البخاري، كتاب الجنائز،باب ماجاء في عذاب القبر (١٣٧٤).

جس کا اصلاً تعلق باطن سے ہے جبکہ کافر وجودی معرفت کے باوجود پہچان سے قاصر ہے کیونکہ قلب سیاہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ: "فِيْ هٰذَاالرَّجُلِ میں حَاضر فِي الْخَارِجِ"نہیں بلکہ ''حَاضر فِي الذِّهْن''مراد ہے علاوہ ازیں یہ بھی امکان ہے کہ ''هٰذَا بِمَعْنٰى ذٰلِكَ'' ہو۔ جیسے قرآن میں ہے:

﴿ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ . ﴾ (البقرة: ١)

آیت میں: ذٰلِكَ بِمَعْنٰى هٰذَا ہے۔ ممکن ہے: "هٰذَا الرَّجُل" میں بمعنیٰ ذٰلِكَ ہو۔ ابن کثیر میں ہے:

" كُلًّا مِّنْهُمَا مَكَانَ الْاٰخَرِ وَهٰذَا مَعْرُوفٌ فِيْ كَلَامِهِمْ. "

یعنی'' عرب لوگ اسم اشارہ قریب اور بعید کو ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ طریقۂ کار ان کے کلام میں معروف ہے۔''

❀❀❀❀❀❀❀

﴿۹﴾ شریعت، قضاء اور تقدیر وغیرہ

سوال: جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا:

- ...... ﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ . ﴾(المائدة: ٤٤)
- ...... ﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ . ﴾(المائدة: ٤٥)
- ...... ﴿ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ . ﴾(المائدة: ٤٨)

- جناب مفتی صاحب ان آیات کی روشنی میں اس بات کی وضاحت فرما دیں کہ ہمارے ملک پاکستان کے جج صاحبان کے فیصلوں کا کیا حکم ہے؟
- انہیں فاضل جج کے لقب سے نوازنے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟
- علمائے کرام کا ان لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنا کیسا ہے؟

جواب: ہمارے ملک پاکستان میں جج صاحبان کے جو فیصلے شریعت کے مطابق ہیں وہ قابل تحسین ہیں۔ اور جو اس کے خلاف ہیں وہ مردود ہیں۔ شرعاً ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

اگر کوئی جج خلاف شریعت فیصلہ حلال سمجھ کر کرتا ہے بلاشبہ وہ کافر اور ملت اسلامیہ سے خارج ہے اور جو یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ میں حرام کا مرتکب ہوں، اور قبیح فعل کر رہا ہوں، ایسے جج کا کفر، ظلم اور فسق اسے ملت اسلامیہ سے خارج نہیں کرتا۔ کیونکہ کفر اور ظلم وغیرہ کے درجات ہیں۔ اس سے خُرُوج عَنِ الْمِلَّة لازم نہیں آتا۔ جملہ تفاصیل صحیح بخاری کی ''کتاب الایمان'' میں ہیں۔ [1] اس بنا پر گنہگار جج پر فاضل جج کے اطلاق کا

---

[1] (٨٦) انظر صحيح البخارى ، كتاب الايمان ، باب كفران العشير و كفر دون كفر رقم الباب (٢١)، و باب المعاصى من امر الجاهلية و لا يكفر صاحبها بارتكابها الا بالشرك ، رقم الباب (٢٢) ، والحديث" سباب المسلم فسوق و قتاله كفر ." صحيح البخارى (٤٨).

جواز ہے۔ بخلاف پہلی قسم کے۔ رہا یہ مسئلہ کہ علماء ان حضرات سے ملاقات کر سکتے ہیں یا نہیں؟ تو علماء کا مقصد اگر اصلاح ہے تو ان حضرات سے میل ملاقات کا کوئی حرج نہیں۔

سوال: رزق کے حصول میں انسان کس حد تک مختار ہے؟ رزق میں زیادتی و کمی تقدیر پر منحصر ہے؟ یا انسان کی کوشش کا عمل دخل ہے؟

❁ سوال یہ ہے کہ بندہ پر کسب رزق و معاش ضروری ہے؟ رزق انسان کی قسمت، تقدیر میں لکھا جا چکا ہوتا ہے۔ انسان اگر کوشش بھی کرے تو وہی حاصل کر سکتا ہے جو اس کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ اپنی تالیف ''منہاج العابدین: ۲۳۰، اردو ترجمہ مولانا محمد زکریا'' میں لکھتے ہیں:

① ''مکتوب علی ظهر الحوت و الثور رزق فلان بن فلان فلا یزداد الحریص إلا جهدًا.''

② '' الرزق مقسوم مفروغ منه و لیس تقوی تقی بزائده ولا فجور فاجر بناقصه.'' (ص: ۱۹٤)

احادیث سے ثابت ہے کہ رزق کا بڑھنا اور کم ہونا انسان کے اعمال کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ جس طرح روایت میں آتا ہے:

«مَنْ سَرَّهٗ أَنْ يَّبْسُطَ اللّٰهُ رِزْقَهٗ وَ أَنْ يُّنْسَأَ لَهٗ مِنْ أَثَرِهٖ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ.» ❶ (الحدیث)

رزق میں فراخی و وسعت ہر انسان کا فطری حق ہے مگر ہزار کوشش کرے نتیجہ اس کی تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ کی بیان کردہ روایت کے مطابق، مگر دوسری حدیث میں رزق کا بڑھنا اور کم ہونا انسان کے اعمال سے وابستہ نہیں ہے۔ مومن اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں۔ رزق دینا اللہ پر فرض ہے اسی طرح امام غزالی رحمہ اللہ نے (ص: ۱۹۹، ایضاً) میں روایت بیان کی ہے: ''أربعة قد فرغ منهن الخلق و الخلق و الرزق و الأجل.''

جواب: انسانی رزق محدود و مقسوم ہے۔ مکتوب میں ذرہ بھر کمی و بیشی واقع نہیں ہو سکتی۔ اور جن احادیث میں بعض اعمال خیر کی بنا پر رزق میں زیادتی کا ذکر ہے یہ بھی تقدیر کا حصہ ہے۔ انسان کو چونکہ مکتوب کا علم نہیں بلکہ اس بات سے بھی لاعلم ہے کہ کل اس نے کیا کچھ کرنا ہے اس بنا پر اس کو اعمال میں سعی کا حکم ہے۔ اللہ رب العزت نے ''سورۃ الانعام'' میں ان مشرکین کی پر زور تردید کی ہے۔ جنہوں نے شرکیہ افعال کے لیے

---

❶ (۸۷) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب من أحب البسط فی الرزق (۲۰۶۷)، صحیح مسلم، کتاب البر و الصلة، باب صلة الرحم و تحریم قطیعتها (٦٥٢٣).

مشیت الٰہی کو وجہ جواز بنانا چاہا۔ وجہ ابطال یہ ہے کہ اگر یہ دلیل و حجت ان کے لیے نفع بخش ہوتی تو اللہ ان کو متنوع عذاب میں مبتلا نہ کرتا بلکہ فرمایا:

﴿ حَتّٰى ذَاقُوْا بَأْسَنَا . ﴾ (الانعام:١٤٨)

بعض روایات میں وارد ہے کہ تم میں سے ہر ایک کا جنت اور دوزخ میں ٹھکانا لکھا ہوا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی کیا ہم عمل کرنا چھوڑ دیں۔ صرف تقدیر پر بھروسہ و اعتماد کر کے بیٹھ جائیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا مت کرو:

« اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ . » [1]

یعنی ''ہر ایک کے لیے وہ شی آسان ہے جس کے لیے وہ پیدا ہوا ہے۔''

سوال میں مشارٌ الیہ آثار و اقوال میں بھی تقریبًا اسی امر کی وضاحت ہے کہ قضاء و قدر سے کوئی شی خارج نہیں۔ ''مَاشَآءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ .'' حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فَالَّذِیْ فِیْ عِلْمِ اللّٰهِ لَا يَتَقَدَّمُ وَلَا يَتَأَخَّرُ وَالَّذِیْ فِیْ عِلْمِ الْمَلَكِ هُوَ الَّذِیْ يُمْكِنُ فِيْهِ الزِّيَادَةُ وَالنَّقْصُ وَ إِلَيْهِ الْإِشَارَةُ بِقَوْلِهِ تَعَالٰى: ﴿ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ وَ عِنْدَهٗۤ أُمُّ الْكِتٰبِ. ﴾ فَالْمَحْوُ وَالْإِثْبَاتُ بِالنِّسْبَةِ لِمَا فِیْ عِلْمِ الْمَلَكِ وَمَا فِیْ أُمِّ الْكِتَابِ هُوَ الَّذِیْ فِیْ عِلْمِ اللّٰهِ فَلَا مَحْوَ فِيْهِ أَلْبَتَّةَ وَيُقَالُ لَه : اَلْقَضَاءُ الْمُبْرَمُ وَ يُقَالُ لِلْأَوَّلِ : اَلْقَضَاءُ الْمُعَلَّقُ." (فتح الباری ١٠/٤١٦)

سوال: شریعت کے نزدیک ''نظریۂ ضرورت'' کی کیا حقیقت ہے؟

جواب: نظریۂ ضرورت سے مقصود وہ حالت ہے جس میں آدمی اپنے اختیارات استعمال نہ کر سکے جیسے سن سات ہجری میں مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں اس حالت میں بیت اللہ کا طواف کیا کہ اس کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے جب کہ اس کی تطہیر بعد میں ہوئی چونکہ کفار کا غلبہ تھا، وہ اس میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ اس لیے وقتی طور پر اس میں دخل مصلحت کے خلاف سمجھا گیا جس سے کئی خرابیاں جنم لے سکتی تھیں۔ اسی طرح اسلام نے بحالت اضطراری بعض حرام چیزوں کے کھانے کو مباح قرار دیا ہے۔

---

[1] (٨٨) صحیح البخاری، کتاب القدر، باب جف القلم علی علم الله(٦٥٩٦)،صحیح مسلم،کتاب القدر، باب کیفیة خلق الآدمی فی بطن أمه(٦٧٣١).

مثلاً مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو۔ بوقت مجبوری ان کے کھانے کو بالشروط جائز رکھا ہے۔ ❶ اس قسم کی حالت اگر سودی کاروبار میں لاحق ہو تو بعض اہل علم نے اکل ربا کے جواز کا بھی فتویٰ دیا ہے۔ لیکن صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سود کو ایسی حالت میں بھی جائز قرار دینا درست نہیں کیونکہ استثنائی چیزیں مخصوص ہیں جبکہ ربوی معاملات میں ایسی کوئی تخصیص وارد نہیں۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَ عِلْمُهٗ أَتَمُّ .

سوال: شرعی مسئلہ کی وضاحت کرنے میں اور فتویٰ جاری کرنے میں کیا فرق ہے؟

جواب: مسئلہ کی وضاحت کرنا عام ہے چاہے سائل کے جواب میں ہو یا ویسے ہی کتاب و سنت سے لوگوں کی حاجات و ضروریات کے پیش نظر کسی شے کو کھول کر بیان کر دیا جائے۔ اور سائل کی پیش آمدہ مشکل حل کرنے کا نام فتویٰ ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" أَيُّ جَوَابِ السُّؤَالِ عَنْ حَادِثَةِ الَّتِيْ تُشْكِلُ عَلَى السَّائِلِ ." (فتح الباری:۲٦٥/۸)

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ از روئے شرع کیا کسی مسلمان جوان عورت کو غیر مسلم مرد ججوں کی جیوری میں شامل ہو کر عدالتی فیصلے کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ جب کہ وہ عورت قانون اور شریعت کا علم بھی نہ رکھتی ہو؟

جواب: شرعاً عورت کے لیے ویسے ہی جائز نہیں کہ عہدۂ قضاء پر فائز ہو، چہ جائیکہ غیر مسلم ججوں کے ساتھ بیٹھ کر فیصلے کرے۔ مزید آنکہ قانون و شریعت سے عدم واقفیت بھی اہم ترین موانع سے ایک مانع ہے۔ اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورت قصاص و حدود میں گواہی نہیں دے سکتی تو پھر وہ جج کیسے بن سکتی ہے؟ "فتح الباری ۲٦٦/۵" میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَاتَّفَقُوْا عَلَى اشْتِرَاطِ الذُّكُوْرِيَّةِ فِي الْقَاضِي إِلَّا عَنِ الْحَنَفِيَّةِ وَاسْتَثْنَوْا الْحُدُوْدَ وَأَطْلَقَ ابْنُ جَرِيْرٍ ،وَحُجَّةُ الْجُمْهُوْرِ الْحَدِيْثُ الصَّحِيْحُ : «مَا أَفْلَحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أُمُوْرَهُمُ امْرَأَةً.» وَقَدْ تَقَدَّمَ، وَلِأَنَّ الْقَاضِيَ يَحْتَاجُ إِلَى كَمَالِ الرَّأْيِ وَرَأْيُ الْمَرْأَةِ نَاقِصٌ ،وَلَاسِيَّمَا فِيْ مَحَافِلِ الرِّجَالِ ."

"اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جج کے لیے مرد ہونا شرط ہے سوائے حنفیہ کے، انہوں نے

---

❶ (۸۹) البقرۃ:۱۷۳.

حدود کو مستثنیٰ قرار دیا ہے (یہ مرد کے ساتھ مخصوص ہیں۔ البتہ مالی معاملات میں حنفیہ کے نزدیک عورت کی قضاء جائز ہے) اور ابن جریر کے نزدیک علی الاطلاق جواز ہے۔ جمہور کی دلیل صحیح حدیث ہے کہ جو قوم اپنے معاملات کا ذمہ دار عورت کو بنا دے وہ ناکام ہے۔ [1] اور اس لیے بھی کہ جج کو کمال رائے کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ عورت کی رائے ناقص ہے بالخصوص مردوں کی محافل میں۔"

❀❀❀❀❀❀❀

[1] (۹۰) انظر الرقم المسلسل (۲۳۲).

فرمانِ باری تعالیٰ

﴿ إِنَّ اللّٰهَ وَمَلاَئِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰـآَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ آمَـنُـوْا صَـلُّوْا عَلَيْـهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْماً . ﴾ (الأحزاب:٥٦)

فرمانِ رسول ﷺ

« اَللّٰهُـمَّ صَلِّ عَلٰـى مُحَـمَّدٍ وَّ اٰلِـهٖ وَ أَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ .»

«لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْـــهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَ وَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ.» (بخاری و مسلم)

﴿۱۰﴾ سیرت وشمائل وفضائل رسول ﷺ اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام

سوال: نبی اکرم ﷺ کا سایہ تھا یا نہیں؟

جواب: حدیث کی کتاب مجمع الزوائد طبع بیروت (۴/ ۳۲۱) میں تصریح ہے کہ «فَرَأَتْ ظِلَّه» ❶ یعنی حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے نبی ﷺ کا سایہ دیکھا۔

سوال: ''سورۃ البقرہ'' کی آیت ۱۵۴ کے مطابق شہداء زندہ ہیں۔ کیا ہمارے نبی اکرم ﷺ اور باقی انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیاء وصلحاء بھی شہدا کی طرح زندہ ہیں؟ شہداء کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کہا ہے اور ہمیں یہ حکم ہے کہ انہیں مردہ نہ کہو۔ انبیائے کرام کا مرتبہ تو شہداء سے بلند ہے۔ ہم انبیائے کرام کو کیا کہیں گے؟

جواب: واضح ہو کہ درجات کے اعتبار سے دنیوی زندگی کی طرح برزخی زندگی میں بھی تفاوت ہے۔ ایک عام مومن کی زندگی ہے۔ پھر شہداء کی زندگی جو طیورِ جنت سے تعلق کی بنا پر ممتاز ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی زندگی قرب الٰہی کی وجہ سے سب سے بڑھ کر ممتاز ہے۔ دنیاوی زندگی میں ہم اس کا شعور حاصل نہیں کر سکتے۔ قرآن نے یہی کچھ بیان فرمایا ہے: ﴿ وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ . ﴾

دنیاوی زندگی میں انبیاء علیہم السلام کے بارے میں وہی عقیدہ رکھیں گے جو قرآن نے بیان فرمایا ہے:

﴿ إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّإِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ . ﴾ (الزمر: ۳۰)

''اے نبی! تجھے بھی موت آنی ہے اور انہوں نے بھی مرنا ہے۔''

سوال: (ا) آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کا نزول زمین پر کس علاقے میں ہوا تھا؟ اکٹھے ایک ہی جگہ یا الگ الگ؟ اگر

---

❶ (۹۱) أحمد (٦/ ١٣٢، ٣٣٨). وفى حديث آخر ذكر ظل رسول الله ﷺ، انظر: الحاكم (٤/ ٤٥٦) وصححه الذهبي.

الگ الگ ہوا کتنا عرصہ الگ رہے؟

(ب) بیت اللہ کو دنیا کی پہلی مسجد کہا جاتا ہے [1] اور آدم علیہ السلام کی مسجد بھی یہی تھی۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کا نزول اس کے قرب وجوار میں ہوا تو کیا اس کی عمارت کی تعمیر آدم علیہ السلام نے کی تھی یا پہلے سے عمارت موجود تھی؟

(ج) حجرا سود ابتداءً کہاں سے آیا؟ ابراہیم علیہ السلام کو تعمیر مسجد کے لیے اس کی بنیادوں کی نشاندہی کی گئی گویا ظاہراً عمارت موجود نہ تھی تو اس وقت حجرا سود کہاں تھا؟ کیا انہوں نے بھی دیوار میں ہی نصب کیا تھا؟

جواب: (ا) تفسیر قرطبی میں ہے: آدم علیہ السلام کا نزول سرندیپ ہند میں ہوا۔ اور حوا علیہا السلام کو جدہ میں اتارا گیا۔ (۱/ ۳۱۹،۳۲۰) زمانۂ فراق کی مدت کے بارے میں کوئی صحیح صریح نص نظر سے نہیں گزری۔

(ب) تاریخوں میں ہے کہ بیت اللہ کی پہلی بنا فرشتوں نے کی اور دوسری تعمیر آدم علیہ السلام نے۔ (تاریخ الکعبة المعظمة : ٤٠ تا ٤٧) آدم علیہ السلام کی تعمیر کعبہ سے لازم نہیں آتا کہ وہ قرب و جوار میں تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ملک شام میں سکونت کے باوجود بیت اللہ کے بانی ہیں۔

(ج) بعض روایات کے مطابق اس کی آمد جنت سے ہے۔ [2] اگرچہ بعض میں ضعف ہے لیکن دیگر بعض قابل استدلال ہیں۔ (فتح الباری ٣/ ٤٦٢) بلکہ کعبہ کی اساس موجود تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے انہی بنیادوں پر عمارت کو استوار کیا۔ ملاحظہ ہو ''تاریخ الکعبه المعظمة'' تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ کے ساتھ ساتھ ہی حجراسود کا وجود زمین پر قائم رہا ہے۔ اگرچہ کیفیات کی وضاحت مشکل امر ہے۔ چاہے وہ دور ابراہیمی میں ہو یا اس سے قبل۔

سوال: سیدنا یوسف علیہ السلام کی بیوی کا نام کیا تھا؟ ہمارے ہاں ایک مولوی صاحب نے زلیخا نامی عورت کے سیدنا یوسف علیہ السلام کی بیوی ہونے کی نفی کی ہے اور کہا ہے وہ زانیہ ہے۔ کیا موصوف کا یہ کہنا درست ہے۔ مولوی صاحب موصوف کا کہنا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی بیوی کا نام آمس ناتھ تھا۔ حوالہ مولانا سلیمان منصور پوری کی کتاب ''الجمال والکمال'' کا دیتے ہیں۔

---

[1] (٩٢) صحیح البخاری کتاب احادیث الانبیاء باب: ١٠، ح(٣٣٦٦)، صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب المساجد و مواضع الصلاة (١١٦١)، احمد (١٥٧/٥).

[2] (٩٣) صححه الألبانی صحیح الترمذی(٨٧٧) و قال الترمذی : هذا حدیث حسن صحیح، والمشکاة (٢٥٧٧) و تحقیق الثانی للألبانی(٢٥١٠)، باب دخول مکة والطواف.

جواب: واقعی قاضی سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الجمال والکمال'' میں بدلائل اس بات سے انکار کیا ہے کہ زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کی بیوی ہو۔ میرے خیال میں انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی بیوی کا نام راعیل ذکر کیا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ اور فرشتے آخری رسول اللہ ﷺ پر کونسا درود پڑھتے ہیں؟

جواب: امام بخاری رحمہ اللہ نے ابو العالیہ الریاحی رحمہ اللہ سے بیان کیا ہے:

" إِنَّ صَلَاةَ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰى ثَنَاؤُهٗ عَلَيْهِ عِنْدَ مَلَآئِكَتِهٖ وَ صَلٰوةُ الْمَلَآئِكَةِ الدُّعَاءُ. " [1] (بحوالہ فتح القدیر، امام شوکانی ٤/ ٣٠١)

یعنی ''اللہ سبحانہ کی صلوٰۃ سے مقصود یہ ہے کہ اللہ اپنے فرشتوں کے پاس نبی ﷺ کی تعریف کرتا ہے اور فرشتوں کی صلوٰۃ دعا ہے۔''

یعنی ''فرشتوں کا اللہ سے رحمت کی زیادتی طلب کرنا۔'' (فتح الباری)

سوال: حضرت آدم اور حوا علیہما السلام کا نکاح کس نے کیا تھا اور نکاح کا صرف حق مہر حضور اکرم ﷺ پر بیس مرتبہ درود شریف پڑھنا تھا۔ یہ بات کہاں تک درست ہے؟

جواب: حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں معلوم کرنا کہ ان کا نکاح کس نے پڑھایا تھا اور حق مہر کیا کچھ مقرر ہوا تھا۔ ضروریات دین سے نہیں ہے۔ ایسے امور میں اگر کوئی شئی بالنص ثابت ہو جائے تو فبھا اور اگر نہ بھی معلوم ہو تو سابقہ علت کی بناء پر ہم اس کے مکلّف نہیں لیکن قرآنی شہادت کے سبب اس بات پر یقین رکھنا ضروری ہے کہ حوا علیہا السلام آدم علیہ السلام کی بیوی تھی۔ ممکن ہے اللہ کے امر تزویج کے ساتھ ہی حوا علیہا السلام آدم علیہ السلام کی بیوی بن گئی ہو جس طرح کہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نبی ﷺ کا عقد مجرد امر تزویج ہی سے تھا۔

امام شوکانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" دَخَلَ عَلَيْهَا بِغَيْرِ إِذْنٍ وَلَا عَقْدٍ وَلَا تَقْدِيْرِ صَدَاقٍ وَلَا شَيْئٍ مِمَّا هُوَ مُعْتَبَرٌ فِي النِّكَاحِ فِيْ حَقِّ أُمَّتِهٖ. " (تفسیر فَتْحُ الْقَدِیْر: ٤/ ٢٨٥)

یعنی ''نبی ﷺ کا زینب سے ازدواجی تعلق بلا اذن اور بلا عقد اور بلا تقرر مہر اور اس کے بغیر کہ جس شئی کو آپ ﷺ کی امت کے حق میں قابل اعتبار سمجھا گیا ہے قائم ہو گیا تھا۔''

---

[1] (٩٤) صحیح البخاری، کتاب التفسیر فی ترجمة الباب: ﴿إن اللّٰه و ملٰئكته يصلون على النبى﴾.

حضرت آدم علیہ السلام کے نکاح، مہر نبی ﷺ پر درود کی صورت میں مقرر ہونا شرعی نصوص سے ثابت نہیں۔

سوال: کیا نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک پر " اَلصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! " کہنا جائز ہے یا نہیں؟

اگر کوئی آدمی اپنے تخیل میں اپنے گھر بیٹھا یا رسول اللہ کہہ لے اور عقیدہ نبی ﷺ کی سماعت کا نہ ہو تو اس میں کیا حرج ہے؟

جواب: یہ الفاظ کسی مرفوع صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہیں۔ البتہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے فعل سے منقول ہے کہ جب وہ سفر سے واپس آتے تو یوں کہتے:

" اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا أَبَابَکْرٍ ! اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَاأَبَتَاہُ ! . " [1]

پھر فوراً واپس چلے آتے اور عام حالات میں بلاسفر ان کا یہ معمول نہ تھا۔ جب کہ جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہر حالت میں اس پر عامل نہیں تھے۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی ﷺ کی ذات گرامی پر درود وسلام الفاظ مسنونہ سے بھیجنا مطلقاً مسنون ہے خواہ کوئی قریب سے پڑھے یا دور سے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہر حالت میں آپ ﷺ تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اور بدعی الفاظ سے اجر وثواب کی توقع عبث ہے:

« کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ. » [2]

اور تخیلی حالت میں یا رسول اللہ کہنا سلف صالحین سے ثابت نہیں ہو سکا۔ حالانکہ ان چیزوں کے وہ ہم سے زیادہ حقدار تھے۔ إِذْ لَیْسَ فَلَیْسَ البتہ بطور حکایت جائز ہے۔ جس طرح کہ ہم دن رات کتب احادیث میں پڑھتے ہیں۔ تاہم حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا مذکور فعل محض تَعَبُّدِیْ تعمیل حالت پر محمول ہو گا۔ جس طرح کہ: « اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ. » میں ہے اس سے سماع لازم نہیں آتا۔ جیسا کہ حضرت عمر نے حجر اسود

---

[1] (٩٥) موطا للإمام مالك، كتاب الصلاة،باب ماجاء في الصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم (٣٩٧)،عبد الرزاق (٦٧٢٤)،البيهقي (٥/٢٤٥)،المطالب العالية (١٣٢٠)لابن حجروصححه.

[2] (٩٦) صححه ابن حبان و الألباني و حمزة و بشارعواد و شعيب الارنوؤط . احمد(٣/٣١٠) (١٤٢٧٠)، عن جابر رضى الله عنه ، صحيح ابن ماجه ، باب اجتناب البدع (٤٥)، ابن حبان (١٠)، الدارمي (٢١٢)، بتحقيق حسين سليم و صححه، صحيح النسائي للألباني(١٤٨٧)، و زاد " و كل ضلالة في النار...... الخ، الارواء (٦٠٨).

کو مخاطب ہو کر فرمایا تھا: « إِنِّي لَأَعْلَمُ إِنَّكَ حَجَرٌ .» ❶ یہ محض بدون سماع حکم کی تعمیل ہے۔

سوال: ایک آیت مبارکہ: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْماً . ﴾ (الأحزاب:٥٦) ''بے شک میں (اللہ) اور میرے فرشتے درود اور سلام نبی پر بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والوں تم درود اور سلام نبی کریم ﷺ پر بھیجو۔''

بعض لوگ درود کے متعلق کہتے ہیں کہ آپ لوگ درود تو پڑھتے ہیں مگر سلام نہیں پڑھتے جب کہ قرآن مجید میں درود اور سلام الگ الگ ذکر ہے۔ درود جو بھی ہے۔ درود کو وہ مانتے ہیں مگر سلام کے متعلق وضاحت فرمائیں کہ سلام پڑھا جائے تو کونسا سلام پڑھا جائے اور کیسے اور کب پڑھا جائے؟

جواب : جس طرح ہم نبی اکرم ﷺ پر درود پڑھنے کے قائل ہیں اسی طرح سلام کے بھی قائل ہیں ہر نماز کے تشہد میں درود سے پہلے ہر مسلمان آپ ﷺ کی ذات گرامی پر سلام بھی پڑھتا ہے۔ اسی طرح اہل الحدیث کا جملہ کتب احادیث میں یہ طریقہ کار ہے کہ ہر حدیث کے شروع میں بالخصوص جہاں ''قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ'' تحریر ہوتا ہے وہاں ''صلوٰۃ'' کے ساتھ ''سلام'' ضرور لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔(ﷺ) بلکہ کئی ایک ائمہ ''صلوۃ و سلام'' کے ساتھ ''و آلہ'' کے اضافہ کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ پھر اہل حدیث کے سرخیل امام ابن قیم رحمہ اللہ نے مستقل اس موضوع پر کتاب تصنیف کی ہے اس میں بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ جہاں آپ ﷺ کی ذات گرامی پر ''صلوۃ'' پڑھا جاتا ہے وہاں ساتھ ''سلام'' کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔ کتاب کا مکمل نام یوں ہے: ''جلاء الأفهام في الصلاة والسلام على خير الأنام'' اور امام سخاوی رحمہ اللہ کی کتاب ''القول البديع'' کا موضوع سخن بھی یہی ہے۔ ان ائمہ کرام نے بڑے واضح دلائل سے احادیث نبویہ کی روشنی میں اس امر کو ثابت کیا ہے کہ کن کن مواقع پر ''صلوۃ وسلام'' کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔

لہٰذا اہل حدیث پر بریلوی حضرات کی یہ الزام تراشی کہ یہ صرف ''صلوۃ'' کے قائل ہیں، ''سلام'' کے نہیں، محض بہتان ہے۔ بلکہ حنفیہ کے نزدیک تو نماز میں نہ تشہد ضروری ہے اور نہ درود وسلام ❷ صرف تشہد میں بیٹھنا ہی کافی ہے جب کہ صحیح احادیث سے ان کا التزام ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ''سلام'' میں ''اَلسَّلَامُ

---

❶ (٩٧) صحيح مسلم ، كتاب الحج ، باب استحباب تقبيل الحجر الاسود في الطواف (٣٠٦٧)

❷ (٩٨) و قال أصحابنا هي (يعني درود) فرض في العمر إما في الصلاة أو في خارجها انتهى. ہمارے اصحاب یعنی علماء حنفیہ کہتے ہیں: تمام عمر میں ایک مرتبہ درود پڑھنا فرض ہے چاہے وہ نماز میں پڑھ لے یا نماز سے باہر۔ ردالمختار على درالمختار المعروف فتاوٰی شامی (١/٣٨٠، ٣٨٣) ط. مكتبة رشيديه. كوئته.

عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ" یا "اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِيِّ" یا "صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ" بلاصیغہ خطاب اطلاق کا جواز ہے۔

صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تشہد میں نبی ﷺ کی حیات طیبہ میں بصیغۂ خطاب "اَلسَّلَام عَلَیْكَ اَیُّهَاالنَّبِیُّ" پڑھا کرتے تھے لیکن بعد میں اسے ترک کر کے "اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِيِّ" اختیار کر لیا تھا۔ ❶ (صِفَةُ صَلٰوةِ النَّبِيِّ ﷺ ص: ۱۳۹)

ہاں البتہ بطور حکایت صیغۂ خطاب یا نداء کا علی الاطلاق جواز ہے۔ جس طرح کہ کتاب و سنت میں اس کی متعدد امثلہ موجود ہیں۔ اسی بنا پر جمہور اہل علم "التحیات" کے "سلام" میں صیغۂ خطاب و نداء کے قائل ہیں۔ یاد رہے بعض مقامات پر محض بطور حکم بھی اس کا استعمال ہے۔ جس طرح قرآن میں ہے:

﴿ قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ ...... الخ . ﴾

یا اہل قبور کو حرف خطاب اور نداء سے پکارا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ لیکن صیغۂ خطاب یا نداء نبی ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے کے اعتقاد سے پڑھا جائے جس طرح کہ بریلوی عقائد و اعمال سے ظاہر ہے تو یہ بلاشبہ شرک ہے۔ کیونکہ عقیدہ "اَللّٰهُمَّ اَلْحِقْنِيْ بِالرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی." کے منافی ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے "جلاء الافہام" میں "صلوۃ و سلام" پڑھنے کے چالیس سے زائد مقامات ذکر کئے ہیں۔ بالاجمال بعض امور کی فہرست بحوالہ فتح الباری مرعاۃ المفاتیح میں بھی موجود ہے۔ (۱/۶۷۴) مثلاً تشہد ❷، نماز جنازہ ❸، مسجد میں داخل ہوتے اور نکلتے وقت ❹ وغیرہ وغیرہ۔

اس سلسلہ میں موضوع سے متعلق کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں تو بیش بہا فوائد حاصل ہوں گے۔ ان شاء اللہ۔

پھر اخیر میں یہ بھی یاد رہے کہ سائل نے قرآنی آیت کے ترجمہ میں درود کے علاوہ "سلام" کی نسبت بھی

---

❶ (۹۹) صحیح البخاری، کتاب الاستئذان، باب الأخذ بالیدین (۶۲۶۵) عن ابن مسعود . مؤطا للإمام مالك، کتاب الصلاة، باب التشهد فی الصلاة (۵۴) عن ابن عمر . السنن الکبری (۲/۱۴۴) للبیهقی عن عائشة رضی الله عنهم.

❷ (۱۰۰) صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب یتخیر من الدعا بعد التشهد ولیس بواجب (۸۳۵)، صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب الصلاة علی النبی صلی الله علیه وسلم بعد التشهد (۹۰۷).

❸ (۱۰۱) الحاکم (۱/۳۶۰) رقم (۱۳۳۱) وصححه علی شرط الشیخین ووافقه الذهبی، عبدالرزاق (۳/۴۸۹).

❹ (۱۰۲) صححه الألبانی، صحیح أبی داؤد، کتاب الصلاة، باب ما یقول الرجل عند دخوله المسجد (۴۶۵).

اللہ اور فرشتوں کی طرف کر دی ہے یہ غلط ہے آیت میں ''سلام'' کی نسبت صرف مومنوں کی طرف ہے۔ البتہ درود میں اشتراک ہے۔

سوال: کیا نبی ﷺ کا پیشاب، پاخانہ وغیرہ پاک ہیں؟

جواب: کسی بھی صحیح حدیث سے ثابت نہیں کہ آپ ﷺ کا پیشاب پاخانہ وغیرہ پاک تھا بلکہ روایات سے ثابت ہے کہ بعض دفعہ آپ ﷺ پانی سے استنجا کرتے [1] اور بعض دفعہ پتھروں سے [2] اور بسا اوقات دونوں کو جمع کر لیتے۔ [3] پھر پیشاب کے لیے نرم زمین تلاش کرتے تاکہ پیشاب کے چھینٹوں سے بچ سکیں [4] اور لیٹرین بھی استعمال کرتے، [5] اور ایک دفعہ آپ ﷺ جنابت کی حالت میں بھول کر جائے نماز پر آ کھڑے ہوئے۔ یاد آنے پر پہلے غسل کیا پھر نماز پڑھائی۔ [6] (بخاری کتاب الصلوٰۃ)

ظاہر ہے کہ ان تمام امور کا اہتمام پیشاب، پاخانے وغیرہ کی نجاست کی بنا پر کیا جاتا تھا۔

سوال: کسی نیک بزرگ یا پیر یا پیشوا کے ہاتھ اور پاؤں کو تعظیماً بوسہ دینا درست ہے یا نہیں کیونکہ ابوداؤد شریف جلد نمبر۳ حدیث نمبر۱۷۸۴ میں ہے کہ کچھ لوگ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیا۔ کیا ہم بھی کسی نیک سیرت بزرگ کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دے سکتے ہیں؟

جواب: امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں کئی احادیث نقل کی ہیں۔ جن میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

---

[1] (۱۰۳) صحیح البخاری کتاب الوضوء باب الاستنجاء بالماء (۱۵۰، ۱۵۱)، (۱۴۳)، مسلم (۶۱۹ تا ۶۲۱).

[2] (۱۰۴) صحیح البخاری ایضاً باب الاستنجاء بالحجارۃ (۱۵۵)، (۳۸۶۰).

[3] (۱۰۵) علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس مسئلہ میں کوئی حدیث صحیح نہیں، اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو روایت ''اہل قباء'' والوں کے بارے میں ہے۔ وہ ضعیف الاسناد ہے اس کو نووی، ابن حجر و غیرھما نے بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ تمام المنۃ(ص:۶۵)و قال الهیثمی فی المجمع (۲۱۲/۱)، رواه البزار و فیه محمد بن عبد العزیز بن عمرالزهری ضعفه البخاری والنسائی و غیرهما.

[4] (۱۰۶)بغیة الباحث عن زوائد مسندالحارث (۲۰۵/۱)، برقم (۶۵) و قال البوصیری فی اتحاف الخیرة...... برقم (۶۴۴)، هذا اسناد ضعیف بتدلیس الولید بن مسلم و ضعیف الجامع الصغیر للألبانی(۴۳۳۱).

[5] (۱۰۷) صحیح البخاری ایضاً باب من تبرز علی لَبِنَتَیْن (۱۴۵) و باب التبرز فی البیوت (۱۴۸، ۱۴۹)، مسلم الطهارة، باب الاستطابة (۶۱۱، ۶۱۲)، (۸۳۱).

[6] (۱۰۸) صحیح البخاری کتاب الغسل باب اذا ذکر فی المسجد أنه جنب...... (۲۷۵).

کی محبت کی ان صورتوں کا ذکر ہے جن میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے ہاتھ پاؤں یا جسم کو بوسہ دیا۔[1] اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ماتھے پر بوسہ دیا[2] اور انہیں اپنے ساتھ لگایا۔ اسی طرح آپ ﷺ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو چوما کرتے تھے۔[3] حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات میں دونوں کا آپس میں چومنا ثابت ہے۔[4] سوال میں جس روایت کی طرف اشارہ ہے وہ ''وفد عبدالقیس'' کا واقعہ ہے جن میں ایک شخص ''منذر الاشج'' بھی تھا۔ لیکن دوسرے ساتھیوں کے رسول اللہ ﷺ کی طرف لپک کر بوسہ دینے کے باوجود اس شخص نے تحمل اور وقار کا مظاہرہ کیا اور تسلی سے اپنا سامان اور سواری باندھ کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور دوسروں کے بوسوں سے اظہار محبت کے باوجود منذر کے تحمل اور تسلی سے کام کرنے کی تعریف فرمائی۔[5] (سنن ابی دائود مع عون المعبود: ۵۲۳/۴۔ ۵۲۶)

مذکورہ بالا احادیث میں ذکر کردہ افعال محبت کی علامات ہیں اور رسول کریم ﷺ کی محبت دین کی اصل ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے:

«لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِه وَ وَلَدِه وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ.»[6] (بخاری و مسلم)

اور بخاری ہی کی ایک دوسری حدیث میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو آپ نے یہ وضاحت بھی فرمائی

---

[1] (۱۰۹) صَحّح الألباني قبلة اليد والجسد دون الرجل .قبلة اليد في أبي داؤد،كتاب الأدب ،باب قبلة الرجل (۵۲۲۵) وضعيف أبي داؤد (۱۱۱۷) وباب قبلة الرجل (۵۲۲۵)وضعيف ابن ماجه،(۳۷۰۴)وباب في قبلة الجسد ،صحيح أبي داؤد (۵۲۲٤).

[2] (۱۱۰) ضعفه الألباني،ضعيف أبي داؤد، باب قبلة ما بين العينين (۵۲۲۰)، المشكاة (٤٦۸٦).

[3] (۱۱۱) صححه الألباني،صحيح أبي داؤد ،باب في قبلة الرجل ولده (۵۲۱۸).

[4] (۱۱۲) صححه الألباني ،صحيح أبي داؤد ،باب في القيام (۵۲۱۷) والترمذي ،أبواب المناقب ،باب فضل فاطمة (٤۱٤٦). (فائدہ) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عائشہ کو بوسہ دیا......الخ [صححه الألباني، صحيح أبي داؤد ،باب قبلة الخد (۵۲۲۲)].

[5] (۱۱۳) حسنه الألباني بذكر اليد دون الرجل .(۵۲۲۵)، صحيح أبي داؤد،كتاب الأدب ،باب في قبلة الرجل، والمشكاة دون "الرجل" (٤٦۸۸).

[6] (۱۱٤) صحيح البخاري، كتاب الإيمان ،باب حب الرسول صلى الله عليه وسلم(۱۵،۱٤)، صحيح مسلم .كتاب الإيمان ،باب وجوب محبة رسول الله صلى الله عليه وسلم أكثر من الأهل ......(۱٦۸،۱٦۹).

کہ اگر کوئی شخص اپنی جان سے بھی زیادہ نبی ﷺ سے پیار نہ کرے تو وہ بھی مومن نہیں۔

یہ محبت اگرچہ رسول اللہ ﷺ کا خاصہ ہے جو کسی اور سے نہیں کی جا سکتی تاہم وہ افعال جو محبت کا مظہر ہیں۔ دوسروں کے ساتھ بھی انجام دیئے جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ اپنی اولاد کے ہاتھ پاؤں چومنا پیار کی نشانی ہے اور خود نبی ﷺ نے اس کی ترغیب فرمائی ہے اور ایسی چیزوں سے محرومی بے رحمی پر محمول کی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارا یہی وتیرہ بزرگوں اور پیروں سے روا ہے؟ بظاہر اگر اس کی وجہ دین کی محبت اور علم کا احترام ہو تو یہ صورت جائز معلوم ہوتی ہے لیکن بعض کام مختلف پہلوؤں کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک پہلو سے پسندیدہ ہونے کے باوصف دوسرے پہلو سے خرابیوں کا باعث ہوتے ہیں یا کسی بڑے گناہ سے مشابہت ہو سکتی ہے تو برائی کے ذرائع بند کرنے کے لیے اہل علم اس سے روکتے بھی ہیں۔ جیسے کسی پیر، فقیر کے پاؤں کو بوسہ دینے کے لیے جھکنے کی صورت سجدہ کے مشابہ ہے۔ اور محمد ﷺ کی کامل شریعت میں اسی وجہ سے سجدۂ تعظیمی تک کو شرک قرار دیا گیا ہے۔

امام شاطبی رحمہ اللہ وغیرہ نے بدعت کی بحث میں ایک بدعت اضافی کا ذکر کیا ہے جس کی تعریف ایسا کام ہے جو کتاب و سنت کی طرف منسوب ہو۔ لیکن شریعت کی مقررہ حدود سے متجاوز ہو جائے۔ سلف صالحین سے اس احتیاط کے پیش نظر ایسی چیزوں کو چھوڑنا یا مٹا دینا بھی ثابت ہے جس سے عوام حدود شرعیہ کا پاس نہ رکھیں جیسے کہ صلح حدیبیہ کے وقت جس درخت کے نیچے چودہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی ❶ جب بعد میں اس کو دیکھنے کے لیے لوگ خاص اہتمام کرتے نظر آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس درخت کو ہی کٹوا دیا۔ ❷ امام شاطبی رحمہ اللہ اولیاء اللہ کی تعظیم میں ان کی پیروی کی تاکید کرتے ہیں لیکن ان کو چومنا چاٹنا بدعات اضافیہ میں شمار کرتے ہیں، کیونکہ امام مالک رحمہ اللہ نے بزرگوں کی تعظیم کی غرض سے ان کے ہاتھوں کا بوسہ برا جانا ہے۔

امام سلیمان بن حرب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہاتھ کا بوسہ ایک چھوٹا سجدہ ہے۔ اسی طرح حافظ ابن عبدالبر نے بعض اسلاف سے نقل کیا ہے کہ بلکہ اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا، جب ایک شخص نے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہا اور اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ اور کہا کہ یہ کام عربوں میں ہلکا آدمی

---

❶ (١١٥) ابن ابی شیبة (١/٨٤/٢) بحوالہ قبروں پر مساجد للألبانی (ص: ٨٨ الاردية) والطبقات لابن سعد (٤١٦/١) غزوة رسول الله ﷺ الحديبية و فتح الباری (٤٤٨/٧) و صححه.

❷ (١١٦) ایضاً

کرتا ہے اور عجم میں ذلیل آدمی، یہی وجہ ہے کہ علماء ایسے کام کی خواہش رکھنے والے کو تکبر کا مریض قرار دیتے ہیں کہ اس غرض سے اپنے ہاتھوں کو لوگوں کے سامنے کرنا بالاتفاق مکروہ ہے۔(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، الابداع فی مضار الابتداع۔ ص۱۹۲۔۱۹۳)

شرک کی تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتداء نیک لوگوں کے ساتھ عقیدت کے ایسے اظہار سے ہوئی۔ ❶ جو بظاہر ان کی نیکی کی عظمت کا اعتراف تھا جو بعد میں ان سے متعلقہ تصاویر اور قبروں کے احترام کی ایسی صورت اختیار کرتا رہا، جنہیں شریعت کی تکمیل میں بالآخر منع کر دیا گیا۔ ❷ لہٰذا تصویر کشی اب بدترین عذاب کی وعید کا مستوجب ہے۔ ❸

آج کل مختلف تہذیبوں میں میل ملاقات کے آداب سے بعض لوگ ایک دوسرے کو بوسہ بھی دیتے ہیں جس کا مقصد خلوص و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسا اظہار چونکہ تکبر کی بنا پر نہیں ہوتا۔ لہٰذا اسے بھی مکروہ نہیں کہا جا سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دست بوسی اور قدم بوسی کی اجازت یا تو صرف محبت کی غرض سے ہوسکتی ہے جیسے انسان اپنے بچوں سے کرتا ہے یا نبی ﷺ کے ایسے احترام کی صورت میں جو عظمت رکوع اور سجود کے شبہ سے خالی ہو۔ فتنوں کے اس دور میں ایسے آداب جن سے مقررہ حدود سے تجاوز کرنے کا خطرہ ہو یا عوام کے شرک و بدعت میں مبتلا ہونے کا خوف ہو، احتراز ہی کرنا چاہیے۔ (وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَاب).

مزید تحقیق اور تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: اَلتَّعْلِيْقَاتُ السَّلَفِيَّةُ عَلٰى سُنَنِ النَّسَائِيِّ للشيخ محمد عطاء الله حنيف (رقم

---

❶ (۱۱۷) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت ﴿ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا وَ لَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَ نَسْرًا ﴾ (نوح:۲۳) کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "یہ پانچوں نوح علیہ السلام کی قوم کے نیک لوگوں کے نام تھے جب ان کی موت ہوگئی تو شیطان نے ان کے دل میں ڈالا کہ اپنی مجلسوں میں جہاں وہ بیٹھتے تھے، ان کے بت قائم کر لیں اور ان بتوں کے نام اپنے نیک لوگوں کے نام پر رکھ لیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اس وقت ان بتوں کی پوجا نہیں ہوئی تھی، لیکن جب وہ لوگ مر گئے جنھوں نے بت قائم کیے تھے اور علم لوگوں میں نہ رہا تو ان کی پوجا ہونے لگی۔ (صحيح البخاري ، كتاب التفسير ، رقم(۴۹۲۰).

❷ (۱۱۸) ((فقال(النبی ﷺ) ان اولٰئِكَ اِذَا كَانَ فِيْهِم رجل صالح فمات بنو على قبره مسجداً و صَوَّرُوْا فيه تلك الصور فاولئك شرار الخلق عند الله يوم القيامة.)) (صحيح البخاري، كتاب الصلاة ، باب هل تنبش قبور مشرك...... (۴۲۷)،(۱۳۴۱)، (۴۳۴) عن عائشة رضى الله عنها.

❸ (۱۱۹) ايضاً .

حدیث:۳۰۸۳ (٤٠٨٣)، نیز ملاحظہ ہو: مولانا رحمہ اللہ کا مضمون ''مروجہ قدم بوسی کی شرعی حیثیت'' (شائع شدہ در ''الاعتصام'' جلد ۳۵، مارچ ۱۹۸۴ء، ص ۸۲۱-۸۲۲)

سوال: درود ابراہیمی میں: «كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَ عَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ.» کی مثل آل محمد اور محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے رحمت طلب کی گئی ہے کیا نبی مکرم ﷺ اور امت محمدیہ ﷺ پہلے رحمت سے خالی ہیں۔ تمثیلی رحمت کا کیا مطلب؟

جواب: تمثیل رحمت سے مقصود صرف نیک اور بھلی شہرت ہے جس طرح کہ ان کی اپنے عہد میں تھی ورنہ نبی ﷺ اور آپ ﷺ کی آل کا تعلق مشبہ بہ کے ساتھ بھی ہے جس طرح کہ مشبہ سے ہے لہٰذا نبی ﷺ اور آپ ﷺ کی آل کو فضیلت و منقبت دونوں جہتوں سے حاصل ہو گی، اس طرح آپ ﷺ اور آپ کی آل حضرت ابراہیم اور آل ابراہیم علیہ السلام سے افضل ترین ٹھہرے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اس اعتراض کے بہت سارے جوابات دیئے ہیں۔ ملاحظہ ہو: ''جلاء الأفهام'' اور ''شرح العقيدة الطحاوية'' (٢٦٩-٢٧٠) اور ''صفة صلاة النبي ﷺ للألباني''۔

سوال: نبی مأمور بالجہاد اور غیر مأمور بہ میں فرق کی وضاحت فرمائیں؟

جواب: انبیاء علیہم السلام کی شہادت یا دشمن کے ہاتھوں قتل کے بارے میں علماء میں دو مختلف آراء مشہور ہیں:

① دشمن کے ہاتھوں رسول کا قتل ناممکن ہے۔

② دشمن کے ہاتھوں نبی یا رسول کا قتل ممکن ہے۔ جیسا کہ متعدد قرآنی آیات سے ظاہر ہے۔[1]

اصل بات یہ ہے کہ مسئلہ ہذا کچھ وضاحت کا متقاضی ہے۔

اولاً: لفظ ''قتل'' کی تعریف ملاحظہ فرمائیں:

''قتل کے حقیقی معنی ہیں (موت فطری کے علاوہ کسی اور طریقے سے) روح کو جسم سے جدا کر دینا خواہ ذبح کی صورت میں ہو یا کسی اور طریقے سے۔''

اب تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ ''رسل اللہ'' دو طبقوں میں منقسم ہیں:

ایک وہ جن کو دشمنوں کے ساتھ جنگ کا حکم دیا گیا تھا۔ دوسرے وہ جو محض مبلغ تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لڑائی کے مامور نہیں تھے۔

---

[1] (١٢٠) ﴿ وَ إِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ ...... وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ...... الخ ﴾ (البقرة:٦١).

جہاں تک پہلے گروہ کا تعلق ہے ان کا قتل ممکن نہیں کیونکہ قرآن مجید میں ان کے لیے غلبہ ثابت کیا گیا ہے جو مغلوب کی ضد ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَ رُسُلِيْ . ﴾ (المجادلة:۲۱)

''اللہ کا حکم ناطق ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے۔''

اس سے پہلی آیت میں ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ أُولٰٓئِكَ فِي الْأَذَلِّيْنَ . ﴾ (المجادلة:۲۰)

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ نہایت ذلیل ہوں گے۔''

اور مذکورہ جملے کے بعد ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ . ﴾

''بیشک اللہ زور آور (اور) زبردست ہے۔''

قرآن مجید میں اکثر و بیشتر غلبے کا اطلاق مسلح غلبہ پر ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَ إِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْا أَلْفًا...... ﴾ (الأنفال:٦٥)

''اگر تم میں بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے وہ دو سو کافروں پر غالب رہیں گے اور اگر سو ۱۰۰ (ایسے) ہوں گے تو ہزار پر غالب رہیں گے۔''

نیز فرمایا:

﴿ فَإِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَ إِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ أَلْفٌ يَّغْلِبُوْا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللّٰهِ . ﴾ (الأنفال:٦٦)

''پس اگر تم سے ایک سو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے۔ تو دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر ایک ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب رہیں گے۔''

''سورۃ الروم'' کے آغاز میں ہے:

﴿ الٓمّٓ . غُلِبَتِ الرُّوْمُ . فِيْٓ أَدْنَى الْأَرْضِ وَ هُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ○ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ . ﴾ (الروم:۱-٤)

''الم (اہل) روم مغلوب ہو گئے نزدیک کے ملک میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آ جائیں گے۔ چند ہی سال میں۔''

اور ''سورۃ البقرہ'' میں ہے:

﴿ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ . ﴾ (البقرة:٢٤٩)

''وہ کہنے لگے کہ بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر فتح حاصل کی ہے۔''

ان کے علاوہ بھی بے شمار آیات ہیں جو اسی مفہوم پر دال ہیں کہ غلبہ سے مراد مسلح غلبہ ہے جو کفار کے ساتھ جنگ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے اس بات کی بھی صراحت فرمائی ہے کہ مقتول کو غالب نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ مغلوب ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ وَمَن يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ . ﴾ (النساء:٧٤)

''اور جو شخص اللہ کی راہ میں جنگ کرے پھر شہید ہو جائے یا غلبہ پائے۔''

ان آیات سے معلوم ہوا کہ نبی مامور بالجہاد پر قتل کا فعل واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ اللہ عزوجل نے ازل میں یہ فیصلہ لکھ چھوڑا ہے کہ نبی مقاتل غالب رہے گا اور اس کے وعدے میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا، ارشاد ہے:

﴿ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَٰتِ اللَّهِ . ﴾ (الأنعام:٣٤)

''اور اللہ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔''

''مزید آنکہ محققین اہل علم نے اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ غلبۃ الانبیاء کی دو قسمیں ہیں۔''

دلائل و براہین کے ذریعہ غالب آنا، یہ تمام نبیوں کے لیے بلا تردد ثابت شدہ امر ہے۔ البتہ مسلح جدوجہد سے غلبہ حاصل کرنا یہ صرف ان پیغمبروں کے ساتھ مخصوص ہے جو مامور بالقتال تھے۔ اللہ تعالیٰ نے منصور سے مکمل طور پر نفی کی ہے کہ وہ مغلوب ہو۔ فرمایا:

﴿ إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ . ﴾ (آل عمران:١٦٠)

''اگر اللہ تمہارا مددگار ہے، تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔''

مقاتل سے منقول ہے کہ آیت: ﴿ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ . ﴾ کا شان نزول یہ ہے کہ بعض لوگوں نے کہا: کیا محمد ﷺ اور اس کے اصحاب یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ روم اور فارس پر ایسے ہی غالب آ جائیں گے جس طرح

کہ وہ عرب پر غلبہ حاصل کر چکے ہیں؟ حالانکہ روم اور فارس عددی اور مسلح قوت کے اعتبار سے بے حد طاقتور ہیں۔ ان پر غالب نہیں آ سکتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اس سے معلوم ہوا غلبہ سے مراد تلوار اور ہتھیار کے ذریعہ غلبہ ہے۔ کیونکہ صورت سبب کا اخراج ناممکن ہے۔ بلکہ اس کا لحاظ رکھنا ضروری امر ہے۔

اس مسلک کے برعکس امام ابن جریر رحمہ اللہ زیر آیت: ﴿ إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا . ﴾ (غافر: ۵۱) فرماتے ہیں: ''رسول مامور بالجہاد کے قتل سے کوئی شے مانع نہیں۔ [1] اس وقت اللہ کی طرف سے منصوص امداد کو دو امروں میں سے ایک امر پر محمول کیا جائے گا:

(۱) کہ اللہ رسول کی وفات کے بعد اس کی امداد کرے، وہ اس طرح کہ دشمن کو اس کی وفات کے بعد رسول کے قاتلین پر مسلط کر دے جو ان سے انتقام لے۔ جیسے حضرت یحییٰ، زکریا، یسعیا کے قاتلین پر بخت نصر کو مسلط کر دیا گیا تھا۔

(۲) آیت: ﴿ إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا . ﴾ میں لفظ ''رسل'' کو خصوص پر محمول کیا جائے کہ اس سے مراد اکیلے ہمارے نبی اکرم ﷺ ہیں۔ ہمارے شیخ علامہ محمد الامین الشنقیطی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ''اضواء البیان'' میں اس کا یوں تعاقب کیا ہے۔

① یہ کتاب اللہ کے ظاہر، مُتَبَادِر إِلَى الذِّهْن کو بلا دلیل کتاب و سنت و اجماع امت ترک کرنا ہے۔ اندریں حالات یہ حکم لگانا کہ مقتول منصور ہے۔ اس میں سخت بُعد اور عربی زبان میں غیر معروف ہے۔ قرآن کو بلا دلیل اس پر محمول کرنا ظاہر غلطی ہے اسی طرح لفظ ''رُسُل'' کو بھی صرف نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی پر محمول کرنا اس میں بھی سخت قلق ہے۔

جہاں تک تعلق ہے ان آیات کا جن میں نبیوں سے عمومی امداد کا وعدہ کیا گیا ہے تو وہ بلا نزاع برحق ہیں۔

② اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مطلق امداد پر اکتفاء نہیں کیا، جس کا مفہوم پشت میں مظلوم کی فریاد رسی کرنا ہے۔ بلکہ صراحت کی ہے کہ رسولوں کی امداد کے ذریعہ غلبہ کی امداد ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي . ﴾ (المجادلة: ۲۱)

---

[1] (۱۲۱) جامع البیان (جـ ۱۲، جزء ۲۴، صـ ۷۴-۷۵).

یہ بھی یاد رہے غلبہ جو اللہ نے قضاء و قدر میں رسولوں کے لیے لکھ چھوڑا ہے وہ مطلق امداد سے اخص ہے۔ کیونکہ یہ خاص قسم کی امداد کا نام ہے۔ لغت میں غلبہ بمعنی قہر ہے اور نصر بمعنی مظلوم کی اعانت کرنا لہٰذا اعم کا بیان اخص کے ساتھ ضروری ہے۔ اس توضیح سے امام ابن جریر رحمہ اللہ کے مذکور مسلک کی کمزوری بھی ظاہر ہوگئی۔ فتامل ! نیز حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصری رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں۔ کبھی کوئی نبی قتل نہیں ہوا ماسوائے اس کے جس کو جنگ کا حکم نہیں دیا گیا۔ ہر وہ نبی جس کو جنگ کا حکم ہوا ہے اس کی امداد ہوئی۔ (تفسیر القرطبی : ۱/ ۳۶۸)

لہٰذا قرآن مجید میں منصوص قتل انبیاء محمول ہے ان نبیوں پر جنہیں لڑائی کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ ان کی اکثریت انبیاء بنی اسرائیل سے تعلق رکھتی ہے جیسا کہ تفاسیر میں بطور امثلہ مصرح ہے۔ قرآن کریم نے بھی مسئلہ ہذا کو یہودیوں کے مظالم و جرائم کا سلسلہ کلام میں بیان کیا ہے۔ بنا بریں: ﴿ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ﴾ میں بلاوجہ ارادہ مقدر ماننا غیر معقول ہے۔ جبکہ مقصود یہاں یہود کے افعال شنیعہ کی فہرست پیش کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ محض ارادہ قابل مؤاخذہ یا قابل مذمت شئ نہیں۔ جب تک عملی شکل میں ظہور نہ ہو۔ اس لیے جن لوگوں نے بلاوجہ آیت ہذا میں ارادہ مقدر مان کر مطلقاً قتل انبیاء کے انکار کی سعی کی ہے وہ نا قابل تسلیم اور غیر درست نظریہ ہے۔

پھر لفظ ''بغیر حق'' قید میں بھی عدم تقدیر کا ایماء موجود ہے۔ فَافْهَمْ!

امام قرطبی رحمہ اللہ نے یہ بھی سوال اٹھایا ہے، کہ اس کا کیا جواز ہے، کہ کفار کو کھلا چھوڑ دیا۔ وہ انبیاء کو قتل کرتے پھریں؟ اس کا جواب انہوں نے یوں دیا ہے کہ مقصود اس سے انبیاء علیہم السلام کی کرامت اور درجات میں رفعت و بلندی اور زیادتی ہے۔ بندۂ مومن کی مانند جو فی سبیل اللہ شہادت کے مقام پر فائز ہوتا ہے۔ یہ کوئی رسوائی کی بات نہیں۔ آخر میں یہ بھی یاد رہے کہ مذکور کا تعلق صرف واقعاتی صورتوں سے ہے، نہ کہ امکانی سے۔ اللہ تعالیٰ جملہ اہل اسلام کو حق کی پیروی کی توفیق بخشے۔ آمین!

سوال: عَبد رسول اور نبی مَلِک میں فرق کی وضاحت مطلوب ہے؟

جواب: شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف: ''اَلْفُرْقَانُ بَيْنَ أَوْلِيَآءِ الرَّحْمٰنِ وَ أَوْلِيَآءِ الشَّيْطٰنِ'' میں طبقات انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں ایک اہم فرق کی وضاحت کی ہے، جو لائق مطالعہ اور علم میں اضافے کا موجب اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں: جس طرح اولیاء کرام میں دو طبقے ہیں، سابقین

مقربین اور اصحاب مقتدین۔

اسی کی نظیر انبیاء علیہم السلام "عبد رسول" اور "نبی ملک" کی تقسیم ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سرورکونین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو ان دونوں کے درمیان اختیار عطا فرمایا تھا۔ خواہ "عبد رسول" بنیں۔ خواہ "نبی ملک" آپ نے "عبد رسول" بننا پسند فرمایا۔ ❶ پس "نبی ملک" تو جیسے داؤد علیہ السلام اور ان کے امثال ہیں۔ اللہ عزوجل حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے فرماتا ہے:

﴿ قَالَ رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْبَغِيْ لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِيْ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ ۝ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّاءٍ وَّغَوَّاصٍ ۝ وَ آخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْأَصْفَادِ ۝ هٰذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ وَ إِنَّ لَهُ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَآبٍ ۝﴾ (ص:٣٥-٤٠)

"حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا کی، اے پروردگار! میرے لیے مغفرت کر اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما! کہ میرے بعد کسی کو شایاں نہ ہو۔ بے شک تو بڑا عطا فرمانے والا ہے۔ پھر ہم نے ہوا کو ان کے زیر فرمان کر دیا جہاں وہ پہنچنا چاہتے ان کے حکم سے نرم نرم چلنے لگتی۔ اور دیووں کو بھی (ان کے زیر فرمان کیا) وہ سب عمارتیں بنانے والے اور غوطہ مارنے والے تھے۔ اور اوروں کو بھی، جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ (ہم نے کہا) یہ ہماری بخشش ہے (چاہو) تو احسان کرو یا (چاہو تو) رکھ چھوڑو (تم سے) کچھ حساب نہیں ہے۔"

پس "نبی ملک" پر جو کچھ فرض کیا گیا وہ اس کو انجام دیتے ہیں اور جس کو اللہ نے اس پر حرام کر دیا اسے ترک کر دیتا ہے۔ ولایت اور اموال میں جس طرح پسند کرتا اور مناسب سمجھتا ہے تصرف کرتا ہے اس کے بغیر کہ اس پر کوئی گناہ ہو لیکن "عبد رسول" اپنے رب کی مرضی کے بغیر کسی کو نہیں دیتا اور یہ نہیں کرتا کہ جسے چاہے عطا کر دے، اور جسے چاہے محروم رکھے۔ بلکہ جس کو عطا کرنے کا حکم پروردگار دے اسے عطا کرتا اور جس کی تولیت کا امر کرے اسے والی بناتا ہے۔ پس اس کے سارے کے سارے کام اللہ کی عبادات ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

❶ (١٢٢) صححه أحمد شاكر. أحمد ٢٣١/٢ (٧١٦٠ شاكر) مجمع الزوائد (١٨/٩-١٩) وقال: رواه أحمد والبزار وأبويعلى رجال الأولين رجال الصحيح.

« إِنِّي وَاللّٰهِ لَآ أُعْطِيْ أَحَداً وَّلَا أَمْنَعُ أَحَداً ، إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ أَضَعُ حَيْثُ أُمِرْتُ.»❶

''اللہ کی قسم! میں نہ کسی کو عطا کرتا ہوں اور نہ کسی سے روکتا ہوں۔ میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں، جہاں مجھے حکم دیا گیا، رکھ دیتا ہوں، اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اموال شرعیہ کو اللہ اور رسول ﷺ کی طرف منسوب کرتا ہے۔''

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ . ﴾ (الأنفال:١)

''یعنی کہہ دو مال غنیمت اللہ اور رسول ﷺ کا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿ مَآ أَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ أَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ . ﴾ (الحشر:٧)

''یعنی جو مال اللہ نے اپنے پیغمبر کو دیہات والوں سے دلوایا ہے۔ وہ اللہ اور رسول کے لیے ہے۔''

اور اسی طرح فرمایا:

﴿ وَاعْلَمُوْآ أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ . ﴾ (الأنفال:٤١)

''اور جان رکھو کہ جو چیز تم (کفار سے) لوٹ کر لاؤ۔ اس میں سے پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔''

اور اسی لیے اقوال علماء میں سے ظاہر تر یہی قول ہے کہ یہ اموال اولی الامر کے اجتہاد کے مطابق وہاں خرچ کیے جائیں جہاں اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہو۔

چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ اور دیگر سلف کا یہی مذہب ہے اور امام احمد رحمہ اللہ سے بھی یہی مشہور ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے تین حصے کر دیے جائیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ مقصود یہاں یہ ہے کہ ''عبد رسول''، ''نبی ملک'' سے افضل ہے۔ چنانچہ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد المصطفیٰ علیہم السلام افضل ہیں۔ حضرت یوسف، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام سے کہ مقربین، سابقین، ابرار، اصحاب الیمین سے افضل ہیں۔

❶(١٢٣) صحيح البخاري، كتاب فرض الخمس، باب قوله تعالى :﴿فأن لله خمسه وللرسول﴾(٣١١٧)بهذا اللفظ: ما أعطيكم ولا أمنعكم إنما أنا قاسم......الخ. وانظر الرقم المسلسل (١٣٨).

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہ بھی تصریح کی ہے۔ کہ اولیاء اللہ میں سب سے افضل مرسلین ہیں۔ اور مرسلین میں سب سے افضل اولوالعزم ہیں حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور حضرت محمد المصطفی ﷺ ہیں۔

اولوالعزم میں سب سے افضل محمد ﷺ خاتم النبیین امام المتقین سید ولد آدم اور امام الانبیاء ہیں۔

تمام انبیاء کرام پر علی الاطلاق آپ کی فضیلت کے سلسلہ میں کتب احادیث مثلاً مشکوۃ المصابیح، سنن الدارمی، دلائل النبوۃ، بیہقی، دلائل النبوۃ اصفہانی اور خصائص الکبری سیوطی وغیرہ میں وارد متعدد احادیث موجود ہیں۔[1] إِنْ شِئْتَ الْبَسْطَ فَرَاجِعْهَا.

سوال: [1]...... الفاظ صلوٰۃ اور عَلَيْهِ السَّلَام کن کے لیے مخصوص ہیں؟

[2]...... الفاظ رَضِيَ اللّٰهُ کن کے لیے مخصوص ہیں؟

[3]...... الفاظ رَحْمَةُ اللّٰهِ کن کے لیے مخصوص ہیں؟

جواب: ساری امت مسلمہ اس بات پر متفق ہے کہ صلوٰۃ اور سلام کا اطلاق انبیاء علیہم السلام کی ذوات عالیہ کے لیے ہے۔ اس بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ ان لفظوں کا اطلاق غیر نبی پر ہوسکتا ہے یا نہیں۔ اس باب میں حافظ ابن کثیر نے اپنی شہرۂ آفاق تفسیر میں زیر آیت: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ وَ مَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ. ﴾ (الأحزاب :٥٦) نہایت عمدہ اور قیمتی بحث کی ہے جو پیش خدمت ہے چنانچہ فرماتے ہیں: نبیوں کے سوا غیر نبیوں پر صلوٰۃ بھیجنا اگر تبعًا ہو تو بے شک جائز ہے۔ جیسے حدیث میں ہے:

« اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ وَ أَزْوَاجِهٖ وَ ذُرِّيَّتِهٖ .»[2]

ہاں صرف غیر نبیوں پر صلوٰۃ بھیجنے میں اختلاف ہے، بعض تو اسے جائز بتلاتے ہیں اور دلیل میں آیت: ﴿ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ ...... ﴾ (الأحزاب:١٠٣) اور ﴿ أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ . ﴾ (البقرة:١٥٧) اور ﴿ صَلِّ عَلَيْهِمْ . ﴾ پیش کرتے ہیں۔ اور حدیث بھی کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کسی قوم کا صدقہ آتا تو آپ فرماتے :« اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِمْ .»[3] چنانچہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، جب میرے والد

---

[1] (١٢٤) انظر (التفسير(٢٦/٣) لابن كثير .

[2] (١٢٥) صحيح البخارى، كتاب أحاديث الأنبياء ،رقم الباب (١٠) ح (٣٣٦٩)،صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب الصلاة على النبى صلى الله عليه وسلم بعد التشهد (٩١١) والمؤطا(٣٩٥).

[3] (١٢٦) صحيح البخارى، كتاب المغازى ،باب غزوة الحد يبية (٤١٦٦)،صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب الدعاء لمن أتى بصدقة (٢٤٩٢).

آپ کے پاس صدقہ کا مال لائے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی آلِ اَبِیْ اَوْفٰی.» ❶ (صحیحین)

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے کہا یا رسول اللہ! مجھ پر اور میرے خاوند پر صلوٰۃ بھیجئے تو آپ نے فرمایا:

« صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْكَ وَ عَلٰی زَوْجِكِ.»❷

لیکن جمہور علماء اس کے خلاف ہیں اور کہتے ہیں کہ انبیاء کے سوا اوروں پر خالصتاً ''صلوٰۃ'' بھیجنا ممنوع ہے۔ اس لیے کہ اس لفظ کا استعمال انبیاء علیہم السلام کے لیے اس قدر بہ کثرت ہو گیا ہے کہ سنتے ہی ذہن میں یہی خیال جاتا ہے کہ یہ نام کسی نبی علیہ السلام کا ہے تو احتیاط اسی میں ہے کہ غیر نبی کے لیے یہ الفاظ نہ کہے جائیں مثلاً ابوبکر ''صلی اللہ علیہ'' یا علی'' ﷺ '' نہ کہا جائے۔ گو معناً اس میں کوئی قباحت نہیں، جیسے ''محمد عزوجل'' نہیں کہا جاتا حالانکہ ذی عزت اور ذی مرتبہ آپ بھی ہیں، اس لیے کہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے مشہور ہو چکے ہیں اور کتاب وسنت میں ''صلوٰۃ'' کا استعمال غیر انبیاء کے لیے ہوا ہے وہ بطور دعا کے ہے۔ اسی وجہ سے ''آل ابی اوفی' کو اس کے بعد کسی نے ان الفاظ سے یاد نہیں کیا نہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو اور نہ ان کی بیوی کو، یہی مسلک ہمیں بھی اچھا لگتا ہے۔ واللہ أعلم

بعض ایک اور وجہ بھی بیان کرتے ہیں یعنی یہ کہ غیر انبیاء کے لیے یہ الفاظ صلوٰۃ استعمال کرنا بدعتیوں کا شیوہ ہو گیا ہے۔ وہ اپنے بزرگوں کے حق میں یہی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ پس ان کی اقتداء ہمیں نہ کرنی چاہیے۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ یہ مخالفت کس درجہ کی ہے۔ حرمت کے طور پر یا کراہت کے طور پر یا خلاف اولیٰ ہے۔

صحیح یہ ہے کہ یہ مکروہ تنزیہی ہے۔ اس لیے کہ بدعتیوں کا طریقہ ہے جس پر کاربند ہونا ہمیں ٹھیک نہیں اور مکروہ وہی ہوتا ہے جس میں نہی مقصود ہو۔ زیادہ تر اعتبار اس میں اسی پر ہے کہ صلوٰۃ کا لفظ سلف میں نبیوں پر ہی بولا جاتا ہے جیسے کہ عزوجل کا لفظ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے بولا جاتا رہا۔

اب رہا ''سلام'' سو اس کے بارے میں شیخ ابو محمد جوینی فرماتے ہیں کہ یہ بھی ''صلوٰۃ'' کے معنی میں

---

❶(١٢٧) صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب صلاۃ الإمام دُعائه لصاحب الصدقة ......(١٤٩٧)،صحیح مسلم (٢٤٩٢).

❷(١٢٨) صححه الألبانی،صحیح أبی داؤد، کتاب الوتر، باب الصلاۃ علی غیر النبی ﷺ (١٥٣٣).

ہے۔ پس غائب پر اس کا استعمال نہ کیا جائے اور جو نبی نہ ہو اس کے لیے خاصتاً اسے بھی نہ بولا جائے پس علی "علیہ السلام" نہ کہا جائے، زندوں اور مردوں کا یہی حکم ہے۔ ہاں جو سامنے موجود ہو اس سے خطاب کر کے "سَلَامٌ عَلَیْکُمْ یا اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یا عَلَیْکُمْ" کہنا جائز ہے اور اس پر اجماع ہے۔ یہاں پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عموماً مصنفین کے قلم سے علی "علیہ السلام" نکلتا ہے یا علی کرم اللہ وجہہ نکلتا ہے گو معنیٰ اس میں کوئی حرج نہ ہو لیکن اس سے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی جناب میں ایک طرح سوء ادبی پائی جاتی ہے۔ ہمیں سب صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ حسن عقیدت رکھنی چاہیے۔ یہ الفاظ تعظیم و تکریم کے ہیں اس لیے حضرت علی سے زیادہ مستحق ان کے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر اور عثمان ہیں۔ (رضی اللہ عنہم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کے سوا کسی اور پر صلوٰۃ نہ بھیجنی چاہیے۔ ہاں مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے دعائے مغفرت کرنی چاہیے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ بعض لوگ آخرت کے اعمال سے دنیا کے جمع کرنے کی فکر میں ہیں۔ اور بعض مولوی واعظین اپنے خلیفوں اور امیروں کے لیے "صلوٰۃ" کے وہی الفاظ بولتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے لیے تھے۔ جب تیرے پاس میرا یہ خط پہنچے تو ان سے کہہ دینا کہ "صلوٰۃ" صرف نبیوں کے لیے ہے اور عام مسلمانوں کے لیے اس کے سوا جو چاہیں دعا کریں۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہر صبح ستر ہزار فرشتے اتر کر قبر رسول اللہ ﷺ کو گھیر لیتے ہیں اور اپنے پر سمیٹ کر نبی ﷺ کے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں اور ستر ہزار رات کو آتے ہیں۔ یہاں تک کہ قیامت کے دن جب آپ کی قبر مبارک شق ہو گی تو آپ ﷺ کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے۔ [1]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ پر "صلوٰۃ و سلام" ایک ساتھ بھیجنے چاہئیں۔ صرف صلی اللہ علیہ یا صرف علیہ السلام نہ کہے۔ اس آیت میں بھی دونوں ہی کا حکم ہے۔ پس اولیٰ یہ ہے کہ یوں کہا جائے صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا ۔ انتھی

اس بحث میں بالخصوص ان لوگوں کے لیے بھی دعوت غور و فکر ہے جنہوں نے اپنی مسجدوں کے نام اسلام میں امتیازی حیثیت کی حامل مساجد جیسے رکھے ہوئے ہیں۔

---

[1] (١٢٩) ضعفه حسين سليم أسد الدارني محقق الدارمي. الدارمي، باب ما أكرم الله تعالى نبيه صلى الله عليه وسلم بعد موته.رقم (٩٤) وقال :فيه علتان : (الأولى) ضعف عبدالله بن صالح (والثانية) الانقطاع أيضاً ،فإن نبيه بن وهب لم يدرك كعباً.

جہاں تک دعائیہ الفاظ "تَرَضِّی" اور "تَرَحُّم" کا تعلق ہے اگرچہ بظاہر ان کا اطلاق سب مومن مسلمانوں کے لیے عام اور یکساں ہے لیکن اندریں صورت افضل و اولیٰ یہ ہے کہ "رضی اللہ عنہ" کو زمرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مختص کر دیا جائے۔ اس لیے کہ یہی وہ پاکباز ہستیاں ہیں جن کو خَالِقُ الْکَوْن نے بنصوص قرآنیہ سند رضا مرحمت فرمائی ہے:

﴿ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ﴾ (البینة:۸) اور پھر عرف عام میں بھی "رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ" کے استعمال سے مُتَبَادِر إِلَى الذِّهن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی ہوتے ہیں اور رَحِمَهُ اللّٰهِ یا رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ کا اطلاق عام اولین و آخرین سب پر ہے اس میں بعد والوں میں سے کسی کی نہ تخصیص ہے اور نہ استثناء۔ هٰذَا مَا عِنْدِیْ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

سوال: ایک مقرر نے فرمایا کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنی پیدائش کے پہلے دن ہی سجدہ کر کے پڑھنا شروع کر دیا: «رَبِّ اغْفِرْ لِأُمَّتِیْ.» یعنی سجدہ میں بار بار پڑھتے والدہ محترمہ نے خود سنا تھا۔

اگر درست ہے تو مجھے بھی کوئی شک نہ ہے...... لیکن ...... اگر درست نہیں ہے تو پھر مبالغہ آرائی کیوں کی گئی ہے؟ نہ اس وقت نبوت اور نہ ہی امت کا علم ...... یہ مسئلہ زندگی میں پہلی دفعہ سنا گیا ہے اس لیے تحقیق طلب ہے، صرف اور صرف علم کے لیے وگرنہ نبی پاک ﷺ پر کسی قسم کا کوئی شک نہ ہے۔

جواب: نبی ﷺ کا اپنی پیدائش کے پہلے دن سجدہ میں گر جانا کسی مستند حوالہ سے ثابت نہیں۔

سوال: کسی کے نام کے ساتھ محمد ہو تو اس کے اوپر "ص" ڈالنی چاہیے کہ نہیں؟

جواب: نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کے علاوہ اسم محمد پر نہیں ڈالنی چاہیے کیونکہ اسم مسمی کا لاحقہ ہوتا ہے جس سے کسی شخصیت کے امتیازات و محاسن اجاگر ہوتے ہیں۔

مزید یہ بھی یاد رہے کہ نبی ﷺ کے اسم گرامی پر صرف "ص" کے بجائے (ﷺ) لکھنا چاہیے۔

سوال: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ ہے کہ انہوں نے غیر عورت کا دودھ نہیں پیا۔ صرف والدہ کا پیا تھا۔ مگر حضور اکرم ﷺ نے حلیمہ سعدیہ کا پیا تھا حالانکہ وہ ایک غیر عورت تھیں۔ بتائیں کہ وہ کس دین پر تھیں؟ شیعہ حضرات اس مسئلہ کو اچھالتے ہیں۔ وضاحت فرما دیں۔

جواب: قصہ موسیٰ علیہ السلام میں ماں سے فراق اور جدائی کے بعد اس کے دست شفقت کا حصول مقصود تھا جو بفضل اللہ حاصل ہو گیا۔ جب کہ ہمارے نبی اکرم ﷺ کے واقعہ میں حقیقی اور رضاعی والدہ کی شفقت و محبت ہر لمحہ

آپ کے ساتھ رہی۔ اس لیے فعل ہذا کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ باقی غیر عورت سے رضاعت میں شرعی کوئی پابندی نہیں بلکہ عمومی احوال میں جواز ہے۔ حلیمہ سے رضاعت کا قصہ چونکہ آپ ﷺ کی صغرسنی سے متعلق ہے لہٰذا اس کے دین کے بارے میں سوال قبل از وقت ہے۔ اور بعد از نبوت حلیمہ کے اسلام کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ ملاحظہ ہو حاشیہ مشکوٰۃ وغیرہ۔

سوال: نبی آخرالزماں کیا صرف انسانوں کے لیے نبی ہیں یا جنوں کے لیے بھی نیز یہ بھی فرمائیے کہ گناہگار آدمی کو تو جہنم کی سزا ہے تو جنوں کے لیے کون سا عذاب ہے؟

جواب: نبی کریم ﷺ کی بعثت جنوں اور انسانوں سب کے لیے ہے۔ کتاب وسنت میں جنات کے مسلمان ہونے کے واقعات اس کے واضح دلائل میں سے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ يٰقَوْمَنَآ أَجِيبُوا دَاعِيَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ وَ يُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴾ (الأحقاف:٣١)

اور صحیح مسلم میں حدیث ہے:

«وَ بُعِثْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً.» ❶

''میں تمام مخلوق کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔''

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اس موضوع پر مستقل تالیف بنام ''عُمُومُ الرِّسَالَةِ إِلَى الْجِنِّ وَالْإِنْسِ'' لائق مطالعہ ہے۔ نیز گناہ گار جنوں کے لیے بھی انسانوں کی طرح آگ کا عذاب ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿ لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ . ﴾ (السجدة:١٢)

''کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا۔''

سوال: کچھ لوگ کہتے ہیں درود شریف کو آدمی جہاں پڑھے اس کو فرشتے فوراً آناً فاناً حضور ﷺ کے پاس پہنچا دیتے ہیں اور روضہ مبارک پر جا کر آدمی پڑھے تو آپ ﷺ خود اس کو سنتے ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: جن روایات میں نبی اکرم ﷺ تک درود پہنچانے کا تذکرہ ہے وہ قابل عمل و احتجاج ہیں۔ ایک روایت میں ہے:

---

❶ (١٣٠) صحیح مسلم، کتاب وباب المساجد و مواضع الصلاة (١١٦٧).

«إِنَّ لِلّٰهِ مَلَائِكَةً سَيَّاحِينَ فِي الْأَرْضِ يُبَلِّغُونِي مِنْ أُمَّتِي السَّلَامَ.» [1](رواہ النسائی والدارمی وأحمد و ابن حبان فی صحیحه والحاكم وقال:صحیح وأقره الذهبی.)

اور طبرانی کبیر میں بسند حسن الفاظ یوں ہیں:

«حَيْثُمَا كُنْتُمْ فَصَلُّوا عَلَيَّ فَإِنَّ صَلٰوتَكُمْ تَبْلُغُنِي.» [2]

''تم جہاں کہیں ہو مجھ پر درود پڑھو تمہارا درود مجھے پہنچ جاتا ہے۔''

اور طبرانی اوسط میں ہے:

«مَنْ صَلّٰى بَلَغَتْنِي صَلٰوتُهُ.» [3]

یعنی ''جو مجھ پر درود پڑھتا ہے اس کا درود مجھے پہنچ جاتا ہے۔''

اور جس روایت میں ہے:

«مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ عِنْدَ قَبْرِي سَمِعْتُهُ.» [4]

یعنی ''جو میری قبر کے پاس درود پڑھتا ہے۔ میں اسے سنتا ہوں۔''

اس کو بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ حدیث سخت ضعیف نا قابل حجت ہے۔ اس روایت کا دارومدار محمد بن مروان السدی پر ہے۔ وہ متروک الحدیث اور متہم بالکذب ہے۔ اس کی سند میں الجلاء بن عمرو راوی بھی ضعیف اور نا قابل حجت ہے۔

صاحب المرعاۃ فرماتے ہیں:

'' وَ بِالْجُمْلَةِ حَدِيثُ أَبِي هُرَيْرَةَ هٰذَا ضَعِيفٌ غاية الضُّعْفِ وَاهٍ سَاقِطٌ بَلْ لَوِ ادَّعٰى

---

[1] (١٣١) صححه الألبانی والذهبی والحاكم،صحیح سنن النسائی، كتاب السهو،باب السلام علی النبی صلی الله علیه و سلم(١٢١٥)،المشكاة(٩٢٤)،الحاكم(٤٢١/٢).

[2] (١٣٢) صححه الألبانی بشواهده،صحیح أبی داؤد،كتاب المناسك،باب زيارة القبور (٢٠٤٢)، المشكاة (٩٢٦)، تحذير الساجد للألبانی(صـ٩٦،٩٧).

[3] (١٣٣) مجمع البحرین(٤٦٤٣)وقال محققه عبد القدوس:فالحدیث حسن الإسناد ،الطبرانی (٣٨٠/٢ ـ١٦٦٣ ـ الأوسط).

[4] (١٣٤) قال الألبانی وابن الجوزی وابن تيمية: " هذا موضوع ".شعب الإيمان(٢١٨/٢) (١٥٨٣) للبيهقی، المشكاة (٩٣٤)وقال:فی إسناده محمد بن مروان السدی وهو كذاب،الموضوعات(٣٠٣/١).وشاهده أبومعاوية وهو مجهول كما فی الضعيفة(٢٠٣)،مجموع الفتاوٰی(٢٤١/٢٧،٢٤٢).

أَحَدٌ كَوْنَهٗ مَوْضُوْعًا لَا يَكُوْنُ فِيْهِ شَيْئٌ مِنَ الْمُبَالَغَةِ." (۶۹۹/۱)

سوال: ۸ جولائی ۱۹۹۴ء کے شمارہ میں ''دینی تعلیم و تربیت کے اسلامی اصول و آداب'' کے موضوع کی آٹھویں قسط شائع ہوئی ہے جس میں صاحب مضمون ایک واقعہ کا ذکر فرماتے ہوئے ایک سوال لکھ گئے ہیں جو کہ نبی کریم ﷺ کی کثرت ازدواج کے متعلق ہے۔ حاشاو کلا رائی بھر بھی طبیعت میں خلش یا اعتراض پیدا نہیں ہوا لیکن اس خیال سے کہ کوئی نانجار یہ سوال کر ہی بیٹھے تو جواب کیا ہونا چاہیے؟

جواب: نبی اکرم ﷺ نے فی الواقع دس سے زائد نکاح کئے تھے۔ ان میں کئی قسم کی حکمتیں مضمر تھیں۔ مثلاً زندگی کے خانگی حصہ دین اسلام کی اشاعت ان کے ذریعہ مقصود تھی۔ نیز جس قبیلہ سے آپ ﷺ کا ازدواجی تعلق قائم ہوا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے ان سے مخاصمت اور جنگ کے امکانات بھی محدود ہو گئے۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب: ''رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنَ'' مؤلفہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی رَحْمَةً وَاسِعَةً ."

سوال: کیا نبی اکرم ﷺ کو وسیلہ بنایا جا سکتا ہے؟ جیسے تمام لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہمارے لیے واسطہ یا وسیلہ ہیں جس طرح آدم علیہ السلام کا وسیلہ بنے تھے۔ جو فضائل اعمال میں لکھا ہے کہ جب آدم علیہ السلام نے آنکھ کھولی تو اللہ کے نام کے ساتھ محمد ﷺ کا نام تھا۔ آدم علیہ السلام نے اللہ کو اس نام کا واسطہ دیا تو ان کی بخشش ہو گئی۔

جواب: یاد رہے وسیلہ کی دو قسمیں ہیں: ایک مشروع اور دوسری ممنوع۔

پھر مشروع وسیلہ کی تین قسمیں ہیں:

① مومن کا اللہ سے وسیلہ چاہنا۔ اس کی برتر ذات، اس کے اسمائے حُسنٰی اور صفات عالیہ کے ذریعہ۔

② مومن کا وسیلہ چاہنا اپنے اعمال صالحہ کے ذریعہ۔

③ مومن کا اللہ تعالیٰ سے وسیلہ چاہنا اپنے حق میں مومن بھائی کی دعا کے ذریعہ۔

اور ان تینوں قسموں کی مشروعیت پر بے شمار دلائل کتاب و سنت میں موجود ہیں۔

اور تین قسمیں وسیلہ کی وہ ہیں جو ممنوع ہیں:

1 کسی ذات اور شخص کو وسیلہ بنانا مثلاً کسی مخصوص آدمی کا نام لے کر کہے کہ اے اللہ! میں تیری بارگاہ میں فلاں شخص کو وسیلہ بنا کر پیش کرتا ہوں کہ تو اس کے وسیلہ سے میری حاجت پوری فرما دے! وسیلہ لینے

والے کے دل میں فلاں شخص سے اس شخص کی ذات مراد ہو۔

۲ کسی کی جاہ، حق، حرمت اور برکت کا وسیلہ لینا مثلاً وسیلہ لینے والا کہے: اے اللہ! فلاں شخص کا تیرے پاس جو مرتبہ ہے اس کو وسیلہ بناتا ہوں، یا فلاں شخص کا تجھ پر جو حق ہے اس کو وسیلہ بناتا ہوں یا اس شخص کی حرمت اور برکت کو وسیلہ بناتا ہوں کہ تو میری حاجت پوری فرما دے!

۳ کسی کے وسیلہ سے اللہ پر قسم کھانا مثلاً کہنے والا کہے: اے اللہ !فلاں شخص کے وسیلہ سے تجھ پر قسم کھاتا ہوں کہ تو میری حاجت پوری فرما دے!

ممنوع وسیلہ کو حلال سمجھنے والے انہی تین طریقوں پر وسیلہ لیتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تینوں ہی طریقے باطل اور اصول دین کے مخالف ہیں۔ (کتاب ''مشروع اور ممنوع وسیلہ کی حقیقت'')

اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کی ذات کو وسیلہ بنانا ناجائز ہے اور نبی ﷺ کی اتباع کو وسیلہ بنانا جائز ہے۔ کیونکہ اتباع عمل صالح ہے۔ نیز یہ قصہ کہ آدم علیہ السلام نے خطاء کی معافی کے لیے نبی ﷺ کی ذات کا وسیلہ لیا، من گھڑت واقعہ ہے جس کی کوئی اصل نہیں۔ اس میں راوی عبدالرحمٰن بن زید [1] بالاتفاق ضعیف ہے۔ کثرت سے غلطیاں کرتا ہے۔ اور ابو حاتم بن حبان کا قول ہے۔ عبدالرحمٰن بے خبری میں احادیث الٹ پھیر کے بیان کرتا تھا۔ مرسل کو مرفوع بنا دیا اور موقوف کو مسند قرار دے دیا۔

خود امام حاکم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الضعفاء'' میں ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تعجب کا اظہار کیا ہے کہ حاکم نے اس روایت کو کیسے نقل کر دیا کہ جب کہ خود انہوں نے اپنی کتاب ''المدخل'' میں ذکر کیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم اپنے والد سے موضوع احادیث کی روایت کرتے تھے۔ تاہم احادیث صحیحہ سے اور قرآنی شہادت سے ثابت یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی خطاء ان کے استغفار و توبہ کی وجہ سے معاف ہوئی ہے نہ کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات کو وسیلہ بنانے سے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِينَ . ﴾

(الأعراف:۲۳)

---

[1] (۱۳۵) قال البخاری ضعفه عليّ (ابن المدینی) جدًا . وانظر المیزان (۵٦٤/۲) وقال ابن سعد: کان کثیر الحدیث ضعیفاً جدًا .وقال أبو حاتم لیس بقوی . وقال الطحاوی :حدیثه عند أهل العلم بالحدیث فی النهایة من الضعف ،وقال الحاکم وأبو نعیم : روی عن أبیه أحا دیث موضوعة ،وقال ابن الجوزی : أجمعوا علی ضعفه . التهذیب رقم (۳۵۸).

''ان دونوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اگر تو نے ہم کو نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں ہوں گے۔''

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا فرمان ہے: کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ اللہ کو اس کی ذات کے سوا کسی اور ذریعہ سے پکارے۔ (دُر مختار)

سوال: بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میں سو رہا تھا، تمام زمین کے خزانوں کی چابیاں لائی گئیں اور میرے ہاتھ میں رکھ دی گئیں۔ اسی طرح بخاری و مسلم میں آیا ہے کہ بے شک اللہ دیتا ہے، میں تقسیم کرتا ہوں۔ ان احادیث سے بعض حضرات حضور ﷺ کے متعلق اپنے مخصوص عقائد لوگوں کو بتاتے ہیں۔ ان کی وضاحت کیسے کی جائے۔ جب کہ ان حدیثوں سے بقول ان کے آپ ﷺ کا مختار ہونا ثابت ہوتا ہے۔ نیز حضور ﷺ کا خواب سچا ہوتا ہے؟

جواب: اس بشارت کا تعلق مستقبل سے ہے۔ بعد کے ادوار میں دنیا نے دیکھا کہ مسلمان ایوان کسریٰ میں قرآنی آیات: ﴿كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّاتٍ وَّ عُيُوْنٍ.﴾ پڑھتے ہوئے داخل ہوئے۔ اور ہر سمت سے مدینے کی طرف مال کھچا کھچ آ رہا تھا ورنہ بذات خود آپ ﷺ کا جب انتقال ہوا تو درع ایک یہودی کے ہاں جو کے عوض گروی رکھی ہوئی تھی۔ [1] (بخاری کتاب المغازی)

انس رضی اللہ عنہ کی روایت مسند احمد میں بایں الفاظ ہے:

« فَمَا وَجَدَ مَا يَفْتِكُهَا بِهِ . » [2]

یعنی ''آپ ﷺ کے پاس کوئی شی تھی نہیں جس سے اس درع کو چھڑا سکیں۔''

اور حدیث: « وَاللّٰهُ الْمُعْطِيْ وَ أَنَا الْقَاسِمُ . » [3] سے علوم نبوت مراد ہیں۔ بلا شبہ: ﴿بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ .﴾ کی بناء پر آپ ﷺ نے تبلیغ دین میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اور کئی ایک اہل علم نے اس سے مراد مال کی تقسیم سمجھی ہے۔ کیونکہ لفظ قسم کا اصل تعلق مال سے ہے۔ اس بناء پر امام بخاری رحمہ اللہ

---

[1] (۱۳٦) صحیح البخاری، کتاب الجهاد، باب ما قیل فی درع النبی ﷺ (۲۹۱٦) والمغازی، رقم الباب (۸۷) ح (٤٤٦٦) عن عائشة رضی الله عنها.

[2] (۱۳۷) صححه محققه حمزة. أحمد (۱۰۲/۳) (۱۱۹۳۲ ـ شاکر).

[3] (۱۳۸) صحیح البخاری، کتاب العلم، باب من یرد الله به خیرا (۷۱). وفرض الخمس، باب قوله تعالیٰ: ﴿فأن لله خمسه وللرسول﴾ (۳۱۱٦) واللفظ له، صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب النهی عن المسألة (۲۳۹۲).

حدیث کو ''کتاب الخمس'' میں بَابُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:﴿ فَأَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَه وَ لِلرَّسُوْلِ.﴾ کے تحت لائے ہیں اور امام مسلم رحمہ اللہ نے اس کو ''کتاب الزکاۃ'' میں ذکر کیا ہے۔ لہٰذا اہل بدعت کا اس سے کوئی تمسک نہیں ہوسکتا۔

سوال: بخاری میں ہے آپ ﷺ پیچھے بھی ایسے دیکھتے جیسے آگے۔ اس خصوصیت کی کیا وجہ تھی؟ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: '' میرا دل جاگتا ہے اور آنکھ سوتی ہے۔'' ایسی خصوصیات سے آپ ﷺ کا مَا وَرَآءَ الْبَشَرَ ثابت ہونا خیال کیا جاتا ہے۔ معترضین کی تسلی کیسے ہو؟

جواب: حالت نماز میں نبی ﷺ کا پیچھے دیکھنا [1] خرق عادت تھا۔ امام احمد اور امام بخاری رحمہما اللہ نے اسی بات کو اختیار کیا ہے۔ مقصود اس سے آپ ﷺ کا اعزاز و اکرام تھا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَالصَّوَابُ الْمُخْتَارُ أَنَّه مَحْمُوْلٌ عَلٰی ظَاهِرِهٖ وَ أَنَّ هٰذِهِ الْأَبْصَارَ إِدْرَاكٌ حَقِيْقِيٌّ خَاصٌّ بِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ انْخَرَقَتْ لَه فِيْهِ الْعَادَةُ. '' (فتح الباری ۱/ ۵۱۴)

یعنی ''درست اور مختار بات یہ ہے کہ حدیث ہذا ظاہر پر محمول ہوگی اور یہ دیکھنا خلاف معمول آپ ﷺ کے ساتھ مخصوص تھا۔'' اور

((وَلَا يَنَامُ قَلْبِيْ.)) [2]

''میرا دل سوتا نہیں۔''

اس میں حکمت یہ تھی کہ ہر حالت میں قلب قبول وحی اور حق کے لیے مستعد اور خواب غفلت کی آلودگی سے پاک رہے جو بتقاضائے بشریت ہر انسان کو لاحق ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''اگر ہم حضور ﷺ کو پیدا نہ کرتے تو کائنات بھی پیدا نہ کرتے'' کیا یہ صحیح ہے کہ یہ کائنات حضور ﷺ کے لیے پیدا کی گئی ہے؟

جواب: قابل استناد ایسی کوئی حدیث نہیں۔ [3]

---

[1] (۱۳۹) صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب تسویة الصفوف (۷۱۸).

[2] (۱۴۰) صحیح البخاری، کتاب الوضوء باب التخفیف فی الوضوء (۱۳۸)

[3] (۱۴۱) '' لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ '' یہ موضوع من گھڑت روایت سے استدلال کیا جاتا ہے اس کو امام صنعانی نے '' الاحادیث الموضوعة رقم (۷۸) علامہ عجلونی کشف الخفاء (۲/ ۱۶۲) امام شوکانی نے الفوائد (۳۲۶) امام ابن الجوزی اور امام ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے موضوع من گھڑت ضعیف قرار دیا ہے

سوال: آپ ﷺ کی کل بیویاں کتنی تھیں؟

جواب: نبی ﷺ کی نو بیویاں تھیں [1] ماریہ اور ریحانہ کو ملا کر گیارہ۔ دونوں عدد صحیح بخاری کتاب الغسل میں ہیں۔

سوال: حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے کتنے لڑکے تھے؟

جواب: اس سلسلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ راجح قول کے مطابق نبی ﷺ کے تین لڑکے تھے: قاسم، ابراہیم اور طیب طاہر عبداللہ۔ [2]

سوال: کیا چھوٹے بچے کو بھی نبی ﷺ کا اسم گرامی سن کر درود پڑھنا چاہیے؟

جواب: بلاشبہ نبی اکرم ﷺ کا اسم گرامی سن کر ہر شخص کو درود ضرور پڑھنا چاہیے۔ ترک کی صورت میں بارگاہِ رب العزت میں جوابدہ ہے چھوٹے بچہ کو بھی اگر سماع حاصل ہے اور اس امر کا اسے شعور بھی ہے تو ضرور درود پڑھنا چاہیے۔ اور اگر وہ نادان ہے تو وہ مَرْفُوْعُ الْقَلَم ہے۔ حدیث میں ہے: تین اشخاص پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔ ان میں سے بچہ [3] بھی ہے۔ یہاں تک کہ سن بلوغت کو پہنچے:

« وَعَنِ الصَّبِيِّ حَتّٰى يَحْتَلِمَ .» [4]

سوال: کیا قرآن واحادیث کی تفاسیر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی مکرم ﷺ کی ذات وجہ تخلیق کائنات ہے؟

جواب: کتاب وسنت کی صحیح نصوص سے قطعًا یہ بات ثابت نہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی وجہ تخلیق کائنات ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں میں سب سے پہلے حضرت نبی محترم ﷺ کی تخلیق کی۔ کیا یہ بات درست ہے؟

---

[1] (١٤٢) صحيح البخارى ،باب الجنب يخرج ويمشى فى السوق وغيره (٢٨٤).

[2] (١٤٣) عن ابن عباس قال : ولدت خديجة لرسول الله ﷺ غلامين وأربع نسوة : القاسم وعبدالله وفاطمة وأم كلثوم و زينب ورقية وقال الزبير بن بكار : عبد الله هو الطيب والطاهر وقال ابن هشام وأما إبراهيم فمن مارية القبطية التى أهداها له المقوقس صاحب إسكندرية......الخ البداية والنهاية (٢٧٣/٢) ومختصر سيرت رسول ﷺ صـ٤٢٧ للمباركفورى ورحمة اللعالمين ٩٣/٢ لسليمان منصورفورى.

[3] نابالغ بچے پر شرعی احکام "فرضا" لاگو تو نہیں ہوتے تاہم تعلیم وتربیت کے نقطۂ نظر سے اسے نماز روزے وغیرہ کی طرح درود شریف پڑھنے کی بھی تلقین کرنی چاہیے۔ (نعیم الحق نعیم)

[4] (١٤٤) صحيح البخارى كتاب الطلاق باب الطلاق فى الاغلاق و الكره...... تعليقاً و وصله ابو داؤد كتاب الحدود باب فى المجنون يسرق (٤٣٩٨ تا٤٤٠٣) عن عائشة و على و ابن عباس رضى الله عنهم۔ والترمذى(١٤٥٨) ، حسنه الترمذى و صححه الالبانى الارواء ٦،٥/٢) .

جواب: تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ آپ ﷺ نبیوں میں سب سے اخیر میں پیدا ہوئے۔ اسی بنا پر خاتم النبیین ﷺ ٹھہرے۔ جب کہ صحیح احادیث کے مطابق ''اَوَّلُ الرُّسُلُ'' سے ملقب نوح علیہ السلام ہیں۔[1] ہاں البتہ آپ ﷺ کی نبوت اس وقت ثابت ہو چکی تھی جب آدم علیہ السلام روح اور جسد کے درمیان تھے۔[2] (ترمذی حدیث صحیح) اور ''شرح السنہ'' کی صحیح روایت میں ہے:

« إِنِّیْ أَنَا عِنْدَاللّٰهِ مَكْتُوبٌ خَاتَمُ النَّبِيِّين وَ أَنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِیْ طِيْنَتِهِ .» [3]

''تخلیق اور کتابت میں فرق کسی ذی شعور پر مخفی نہیں۔''

سوال: کیا نبی اکرم ﷺ نے معراج جاتے ہوئے مسجد اقصیٰ میں تمام نبیوں کی امامت کرائی تھی؟ کیوں کہ حدیث مسلم شریف میں ہے: آپ ﷺ نے صرف دو رکعت نماز ادا کی تھی۔ بہت لوگ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے تمام نبیوں کی امامت کی۔ اس لئے آپ ﷺ امام الانبیاء ہوئے۔

جواب: مسجد اقصیٰ میں آپ ﷺ نے جملہ انبیاء علیہم السلام کی جو امامت کرائی تھی وہ تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں تھیں۔ ملاحظہ ہو: "تفسیر أضواء البیان" لہٰذا آپ ﷺ امام الانبیاء ٹھہرے۔

---

[1] (١٤٥) صحيح البخاری كتاب احاديث الانبياء باب قول الله عزوجل ﴿ و لقد أرسلنا نوحا إلى قومه ﴾ رقم(٣٣٤٠)

[2] (١٤٦)صححه الترمذی والألبانی. صحيح الترمذی ،أبواب المناقب ،باب ما جاء فی فضل النبی ﷺ (٣٨٧٠) ،المشكوٰة (٥٧٥٨) ،الصحيحة (١٨٥٦).

[3] (١٤٧) صححه الحاكم والذهبی والألبانی و حمزة .شرح السنة (١٣/ ٢٠٧)رقم (٣٦٢٦) ،الحاكم (٤١٨/٢) رقم (٣٥٦٦) أحمد (١٢٧/٤) (١٧.٨٥-شاكر وحمزة)،مجمع الزوائد (٢٢٣/٨) وقال : رواه أحمد بأسا نيد و أحد رجالها رجال الصحيح غير سعيد بن سو يد وقد وثقه ابن حبان .و فيهم بدل " أنا عند الله" إنی عند الله"......الخ

فرمان باری تعالیٰ

﴿ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَآئِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُوْنِيْ بِأَسْمَآءِ هٰؤُلَآءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَآ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ . قَالَ يٰآدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ إِنِّيْ أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ أَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ . ﴾ (البقرة: ۳۱-۳۳)

فرمان رسول ﷺ

« فَلَمَّا خَلَقَه قَالَ : اذْهَبْ فَسَلِّمْ عَلٰى أُولٰئِكَ النَّفَرِ، وَهُمْ نَفَرٌ مِّنَ الْمَلَآئِكَةِ جُلُوْسٌ ، فَاسْتَمِعْ مَا يُحَيُّوْنَكَ فَإِنَّهَا تَحِيَّتُكَ وَ تَحِيَّةُ ذُرِّيَّتِكَ ، فَذَهَبَ فَقَالَ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ ، فَقَالُوْا : اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ ، فَقَالَ : فَزَادُوْهُ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ. »

﴿۱۱﴾ العلم والعلماء

سوال: عِلْمُ الْاَدْیَان پہلے یا عِلْمُ الْاَبْدَان؟ دلائل کی روشنی میں بیان کریں۔

جواب: ''علم الادیان'' القائی اور قدیم ہے جب کہ ''علم الابدان'' حادث اور تجرباتی شے ہے۔ جس کا وجود مرور حوادث کا مرہون منت ہے۔ قرآن مجید نے بسلسلہ قصہ تخلیق انسان بیان فرمایا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو معرض وجود میں لانے کے بعد مَبْدَئِیًّا دینی تعلیم سے آراستہ کیا گیا۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُوْنِیْ بِأَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِیْنَ ٥ قَالُوْا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَآ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ . قَالَ یٰٓاٰدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ إِنِّیْ أَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَ أَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ . ﴾ (البقرة: ۳۱-۳۳)

''اور اس نے آدم علیہ السلام کو سب (چیزوں) کے نام سکھائے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے کیا اور فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ! انہوں نے کہا تو پاک ہے جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے۔ اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں بے شک تو دانا (اور) حکمت والا ہے (تب) اللہ نے (آدم علیہ السلام کو) حکم دیا کہ آدم علیہ السلام تم ان کو ان چیزوں کے نام بتاؤ! جب انہوں نے ان کو نام بتائے تو (فرشتوں سے) فرمایا کیوں میں نے تم سے کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی (سب) پوشیدہ باتیں جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو پوشیدہ کرتے ہو (سب) مجھ کو معلوم ہے۔''

اور صحیح حدیث میں وارد ہے:

« فَلَمَّا خَلَقَه قَالَ:اذْهَبْ فَسَلِّمْ عَلٰی أُولٰئِكَ النَّفَرِ، وَهُمْ نَفَرٌ مِّنَ الْمَلٰٓائِكَةِ جُلُوْسٌ ،

فَاسْتَمِعْ مَا يُحَيُّوْنَكَ فَإِنَّهَا تَحِيَّتُكَ وَ تَحِيَّةُ ذُرِّيَّتِكَ ، فَذَهَبَ فَقَالَ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ ، فَقَالُوا : السَّلَامُ عَلَيْكَ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ ، فَقَالَ : فَزَادُوْهُ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ .» [1]

''یعنی پس جب پیدا کیا اللہ عزوجل نے آدم کو کہا: جا !اس جماعت کو سلام کہہ، اور وہ بیٹھی ہوئی فرشتوں کی جماعت تھی۔ پس ان کے جواب کو سن! یہی تحفہ ہے تیرا اور تیری اولاد کا۔ وہ گئے اور السلام علیکم کہا، جواباً انہوں نے کہا: السلام علیک و رحمۃ اللہ ، نبی ﷺ نے فرمایا: فرشتوں نے ''ورحمۃ اللہ'' کا اضافہ کر دیا۔''

اسی طرح دوسری حدیث میں ہے:

«اِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهُ: اكْتُبْ ، قَالَ : رَبِّ وَمَاذَا أَكْتُبُ؟ قَالَ :مَقَادِيْرَ كُلِّ شَيْئٍ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ .» [2] (رَوَاهُ أَبُوْدَاؤُدَ ، بَابٌ فِي الْقَدْرِ، رقم :٤٥٣٥)

یعنی ''سب سے پہلی شے اللہ نے قلم پیدا کی پس اسے کہا لکھ، کہا کیا لکھوں، کہا تا قیامت ہر شے کی تقدیر لکھ دے۔''

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ أَصْلُ الْأُصُوْلُ دینی اور سماوی علم ہے اور طبی علم حادث اور اختیاری شے ہے جو بعد میں ضرورت کی بنا پر ایجاد ہوا۔

سوال: معروف معانی میں دیندار افراد (علماء خطباء،اور مدرسین علوم شرعیہ) کی حجامت،لباس،نشست و برخاست اور رہن سہن کی عام عادات میں دوسرے لوگوں سے کوئی امتیاز ہونا چاہیے یا نہیں؟

جواب: ہاں! اہل دین حضرات کا فرض ہے کہ عملی اعتبار سے عامۃ الناس کے لیے جملہ معاملات میں عمدہ نمونہ بنیں تا کہ علم کے ساتھ ساتھ ان کے عمل سے بھی رہنمائی حاصل ہو۔

سوال: ایک آدمی دور سے کسی آدمی پر گولی چلاتا ہے یا اس پر کسی مہلک ہتھیار سے حملہ کرنا چاہتا ہے۔ ایک دوسرا آدمی جو اس آدمی (جس پر وار ہوا) چاہتا ہے کہ اس کی علمی حیثیت یا دین وتقویٰ کی وجہ سے بہت عزت کرتا ہے، اس دشمن کے وار کے سامنے اپنے آپ کو کر دیتا ہے تا کہ اس کا وار اس پر ہو اور وہ محترم ہستی بچ

---

[1] (١٤٨) صحیح البخاری، کتاب أحادیث الأنبیآء، باب خلق آدم وذریته(٣٣٢٦) ،صحیح مسلم، کتاب الجنة ونعیمها، باب یدخل الجنة أقوام أفئدتهم مثل أفئدة الطیر(٧١٦٣).

[2] (١٤٩) صححه الألبانی،صحیح أبی داؤد، کتاب السنة، باب فی القدر (٤٧٠٠)، والترمذی أبواب القدر رقم الباب (١٦) ح (٢٢٥٨) ،أحمد (٣١٧/٥) ،المشکاة (٩٤).

جائے۔ آیا یہ شرعًا جائز ہے یا یہ خودکشی کے تحت آ جاتا ہے۔ زید کہتا ہے کہ یہ جائز ہے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ہو جاتے تھے تاکہ کفار کے حملے ان پر ہوں تو بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے محفوظ رہے۔ ایسے واقعات احادیث صحیحہ میں موجود ہیں۔ لیکن عمرو کہتا ہے کہ یہ معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مخصوص تھا۔ کیونکہ یہ محض اعلاء کلمۃ اللہ اور اللہ کی راہ میں اپنے آپ کو شہادت کے لیے پیش کرنا تھا۔ دوسروں کے لیے ایسا کرنا اس میں نہیں آتا۔ لہٰذا یہ خودکشی ہوگی۔

جواب: کسی بھی ذی وقار محترم شخصیت صاحب ورع وتقویٰ اور بالخصوص عالم فاضل ذی شان کی جان کو درپیش ناحق قتل سے نجات دلانے کی خاطر دوسرے آدمی کا اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا بظاہر جائز معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض روایات میں وارد ہے کہ جو شخص اپنے مال یا اہل وعیال وغیرہ کی عزت وآبرو کی خاطر مر گیا تو وہ شہید ہے۔ اصل الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

❁...... «مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ .» [1] (متفق علیه بحواله مشکوۃ، ص ۳۰۵)

❁...... « مَنْ قُتِلَ دُوْنَ دِيْنِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ دَمِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَ مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَ مَنْ قُتِلَ دُوْنَ أَهْلِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ .» [2] (رواه الترمذی و أبوداؤد والنسائی بحواله مشکوۃ: ۳۰۶)

جب دنیا کے حقیر مال ومتاع وغیرہ کی خاطر جان قربان کرنے والا شخص بلند مرتبہ شہادت پر فائز ہو جاتا ہے۔ بندہ مومن مسلمان کی شان تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے اس کے موازنہ ومقابلہ میں دنیا وما فیہا اور خانہ کعبہ کی عظمت بھی کمتر ہی نظر آتی ہے۔

مندرجہ بالا شخص بھی وہ جس کی عظمت ورفعت قعر سمندر میں موجود مخلوق بھی گن گا رہی ہے اور قرآنی نوید ہے:﴿ إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا . ﴾(الفاطر:۲۸) ان اوصاف کے حامل انسان کی جان کے بچاؤ کی خاطر ڈھال بن کر سامنے کھڑا ہونے والا مسلم بطریق اولیٰ اس مرتبہ ومقام کا استحقاق رکھتا ہے۔

خودکشی تو ایک مایوسی کا عمل ہے جس میں رحمت الٰہی سے ناامیدی اور یأس کا اظہار ہوتا ہے۔ اہل اصول کہتے ہیں:

---

[1] (١٥٠) صحيح البخاري، كتاب المظالم، باب من قاتل دون ماله(٢٤٨٠).

[2] (١٥١) صححه الترمذي والألباني. صحيح سنن النسائي، كتاب تحريم الدم، باب من قاتل دون دينه (٣٨١٦). الترمذي، كتاب الحدود، باب ما جاء فيمن قتل دون ماله فهو شهيد(١٤٥٥). صحيح أبي داؤد (٤٧٧٢) واللفظ له. ابن ماجه(٢٨٥٠).

''مَنْ تَعَجَّلَ بِشَيءٍ قَبْلَ أَوَانِهٖ عُوْقِبَ بِحِرْمَانِهٖ .''

یعنی ''جو قبل از وقت کسی شی کے حصول کے لیے کوشاں ہوتا ہے اس کا نتیجہ محرومی ہے۔''

جب کہ یہاں زیر بحث مسئلہ میں عزم بالجہاد کارفرما ہے جو مسابقت کا درس دیتا ہے۔ یہی وہ جذبہ صادقہ تھا جس کی بنا پر شمع رسالت کے پروانوں نے بسلسلۂ تحفظ ناموس رسالت ﷺ اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔ جو تاریخ کا سنہری باب ہے۔ ان قربانیوں کو خاصۂ رسول اللہ ﷺ قرار دینا درست نہیں۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات میں اصل عموم ہے۔ دعویٰ بلا دلیل حجت و استناد قابل قبول نہ ہو گا جب کہ بعد میں جنگ جمل میں بھی ایسے نمونوں کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو: (البدایة والنهایة)

اس لیے بلا تردد کہا جا سکتا ہے کہ فعل ہذا قابل پیروی اور اسلام کے امتیازات میں سے ہے جس پر عمل پیرا ہونے والا عظیم اجر و ثواب کا مستحق ٹھہرے گا۔ إن شاء اللہ تعالیٰ. وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰى اَلْهَادِي إِلَى الصَّوَاب.

✿✿✿✿✿✿✿

﴿۱۴﴾ حدیث اور اصول حدیث

سوال: حدیث ''میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کا اختلاف بڑی رحمت'' ہے۔ (رَوَاہُ الْبَیْہَقِیُّ فِی الْمَدْخَلِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا وَ رَوَاہُ الدَّارَقُطْنِیُّ وَالدَّارِمِیُّ وَ ابْنُ عَسَاکِرَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ وَ صَحَّحَہُ الْحَاکِمُ .)

مذکورہ بالا حدیث صحیح یا ضعیف ہے؟

جواب: مشار الیہ روایت سخت ضعیف من گھڑت ہے۔ اس میں نعیم بن حماد راوی ضعیف ہے اور عبدالرحیم بن زید جھوٹا ہے۔ اور ''المیزان'' میں ہے: '' ھٰذَا الْحَدِیْثُ بَاطِلٌ .''

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سِلْسِلَۃُ الْأَحَادِیْثِ الضَّعِیْفَۃِ وَالْمَوْضُوعَۃُ ۱/۷۵، رقم ۶۰)

اسی طرح ''اِخْتِلَافُ أُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ .'' بے اصل روایت ہے۔ علامہ مناوی رحمہ اللہ نے سبکی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ یہ روایت محدثین کے ہاں معروف نہیں۔ مجھے اس کی صحیح، ضعیف اور من گھڑت سند کا علم نہیں ہو سکا۔ شیخ زکریا الانصاری رحمہ اللہ نے تفسیر بیضاوی پر اپنی تعلیقات میں اسی بات کو برقرار رکھا ہے۔ (ق۹۲/۲)

پھر محققین اہل علم کے نزدیک اس کا معنی مستنکر ہے۔ چنانچہ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے (اَلْإِحْکَامِ فِی أُصُولِ الْأَحْکَامِ ۵/۶۴) میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ حدیث نہیں۔ پھر فرماتے ہیں:

''وَھٰذَا مِنْ أَفْسَدِ قَوْلٍ یَکُوْنُ، لِأَنَّہُ لَوْکَانَ الْاِخْتِلَافُ رَحْمَۃً لَکَانَ الْاِتِّفَاقُ سَخَطًا وَ ھٰذَا مَا لَا یَقُوْلُہُ مُسْلِمٌ لِأَنَّہ لَیْسَ إِلَّا اتِّفَاقٌ أَوِ اخْتِلَافٌ وَ لَیْسَ إِلَّا رَحْمَۃٌ أَوْ سَخَطٌ. وَقَالَ فِیْ مَکَانٍ آخَرَ: بَاطِلٌ مَکْذُوْبٌ''

(بحوالہ: سِلْسِلَۃُ الْاَحَادِیْثِ الضَّعِیْفَۃِ وَالْمَوْضُوْعَۃِ لِلْعَلَّامَہ الألبانی ۱/۷۰، رقم ۵۷)

یعنی ''یہ قول انتہائی ردی قسم کا ہے، اس لیے کہ اگر اختلاف باعث رحمت ہے تو اتفاق باعث ناراضگی

ہوا۔ کوئی مسلمان بھی اس بات کا قائل نہیں کہ امر واقع اس طرح ہو کیونکہ دو ہی امر ہیں یا اتفاق ہے یا اختلاف۔ رحمت ہے یا ناراضگی۔ اور دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: یہ روایت باطل جھوٹی ہے۔ روایت ہذا پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو: (سِلْسِلَةُ الْأَحَادِيْثِ الضَّعِيْفَةِ وَالْمَوْضُوْعَةِ ص ۷۰ تا ۷۳)

سوال: کتاب تو ایک متعین کتاب ہے۔ یعنی قرآن مجید، لیکن سنت کی اصطلاح جس قدر مقدس ہے، اتنا ہی اس کا مفہوم غیر متعین ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک ہر حدیث سنت ہے۔ لیکن دوسروں کے نزدیک سنت سے مراد سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے وہ اعمال ہیں جو آپ ﷺ نے التزاماً سرانجام دیے تھے؟

جواب: حدیث و سنت کا مفہوم متقدمین کے ہاں ایک ہی ہے کہ ہر ایک کا دوسرے پر اطلاق ہے لیکن بعد میں متجددین کا سوءِ فہم ہے کہ دونوں میں فرق ہے۔ جب کہ واقعات سے اس نظریہ کی تائید نہیں ہوتی۔ اصول فقہ کی کتابوں کی طرف مراجعت فرمائیں، بات کھل کر سامنے آ جائے گی۔

سوال: کیا اس کی وضاحت ضروری نہیں کہ سنت نبوی ﷺ کا متعین مفہوم کیا ہے؟ اور وہ کونسی کتاب ہے جس میں یہ سنت اس طرح محفوظ ہے کہ اسے سب سنت تسلیم کرتے ہیں؟

جواب: سنت نبوی ﷺ کا متعین مفہوم وہی ہے جس کی وضاحت سینکڑوں سال قبل محدثین کرام کر چکے ہیں، علامہ شوکانی رحمہ اللہ کی کتاب ''ارشاد الفحول'' اٹھا کر دیکھیے بات کھل کر سامنے آ جائے گی۔ مسلمانوں کا ایک ایک بچہ اس بات سے واقف ہے کہ نبی ﷺ کے قول وفعل وغیرہ پر حدیث یا سنت کا اطلاق ہے۔

سنت کے سلسلہ میں کتابوں کی درجہ بندی کے سات مراتب ہیں جو امت مسلمہ کے ہاں مسلمہ ہیں۔ تقدیم صحیح بخاری اور مسلم کو حاصل ہے۔ ملاحظہ ہو ''علوم الحدیث'' اور ''شرح نُخْبَةِ الْفِكَر'' وغیرہ۔

سوال: امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ''إِعْفَاءِ لِحْيَه'' کا جو مفہوم لیا ہے جیسا کہ آگے بروایت ابن ھانی آ رہا ہے۔ کیا وہ اس میں حق پر ہیں یا حدیث کے سمجھنے میں ان سے تَسَامُح ہو گیا ہے جب کہ انہوں نے مسند میں ''إِعْفَاءِ لِحْيَه'' سے متعلق پانچ چھ حدیثیں روایت کی ہیں۔ ان کے شاگرد ابن ھانی نیساپوری کہتے ہیں:

" سَأَلَ أَبَا عَبْدِاللّٰهِ عَنِ الرَّجُلِ يَأْخُذُ مِنْ عَارِضَيْهِ؟ قَالَ: يَأْخُذُ مِنَ اللِّحْيَةِ مَا فَضَلَ عَنِ الْقَبْضَةِ، قُلْتُ: فَحَدِيْثُ النَّبِيِّ ﷺ : أَحْفُوا الشَّوَارِبَ وَأَعْفُوا اللُّحى قَالَ: يَأْخُذُ مِنْ طُوْلِهَا وَ مِنْ تَحْتِ حَلْقِهِ وَ رَأَيْتُ أَبَا عَبْدِاللّٰهِ يُأْخُذُ مِنْ عَارِضَيْهِ وَ مِنْ تَحْتِ حَلْقِهِ." (مَسَائِلُ الْإِمام أحمد بن حنبل لابن هانی النیشا پوری :۱۵۱/۲-۱۵۲طبع المکتب الإسلامی)

جواب: ڈاڑھی کی بابت مختار بات یہ ہے کہ اسے اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَالْمُخْتَارُ تَرْكُهَا عَلٰى حَالِهَا وَ اَنْ لَّا يَتَعَرَّضَ لَهَا بِتَقْصِيْرٍ وَ لَاغَيْرِه."

(فتح الباری: ۱۰/ ۳۵)

اور امام احمد رحمہ اللہ نے جو وضاحت فرمائی ہے۔ یہ بعض اقوال و آثار اور حدیث عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده وغیرہ پر مبنی ہے حتی کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (راوی حدیث توفیر لِحیَة ،حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے فعل ''اَخذِ لِحیَة " کے بارے میں تشریح وتوضیح کرتے ہوئے)رقمطراز ہیں:

" اَلَّذِیْ یَظْهَرُ أَنَّ ابْنَ عُمَرَ کَانَ لَایَخُصُّ هٰذَا التَّخْصِیْصَ بِالنُّسُكِ بَلْ کَانَ یَحْمِلُ الْأَمْرَ بِالْإِعْفَاءِ عَلٰی غَیْرِ الْحَالَةِ الَّتِیْ تَتَشَوَّهُ فِیْهَا الصُّوْرَةُ بِإِفْرَاطِ طُوْلِ شَعْرِ اللِّحْیَةِ أَوْعَرْضِه." (فتح الباری: ۱۰/ ۳۵۰)

یعنی ''جو بات ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما مٹھی سے زائد ڈاڑھی کاٹنے کے فعل کو حج اور عمرہ کے ساتھ مخصوص نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے ہاں "اعفاء لِحیَه " کا عمل اس حالت پر محمول تھا کہ اس سے بالوں کے طول وعرض میں بڑھنے سے قباحت پیدا نہ ہو۔''

صورت مسئولہ میں امام احمد رحمہ اللہ کی تشریح بھی ایسی ہی حالت پر محمول ہوگی تا کہ رواۃ حدیث کے فہم میں مطابقت پیدا ہو سکے۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَ عِلْمُهٗ أَتَمُّ.

سوال: مورخہ ۳۰ شوال کے ''الاعتصام'' کے ص ۱۶ پر (سنن ابی داؤد بروایت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ) حدیث مبارک کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

''جو شخص مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری روح کو مجھ پر لوٹا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دے دیتا ہوں۔''

کیا یہ حدیث واقعی صحیح ہے؟ وضاحت طلب مسئلہ یہ ہے کہ دور حاضر میں دنیا کا کوئی حصہ شاید ایسا ہوگا۔ جہاں مسلمان نہ ہوں۔ اتنی بڑی مسلمانوں کی تعداد میں سے یہ بات قابل یقین ہے کہ کوئی بھی لمحہ ایسا نہ ہوگا جب بے شمار دفعہ درود شریف نہ پڑھا جاتا ہو۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضور ﷺ ہر وقت قبر میں زندہ ہی رہے مگر اگر زندہ بھی ہوں تو بشری تقاضا کے تحت ساری دنیا کے مسلمانوں کے درود و سلام کا جواب کس انداز میں دیتے ہیں کیونکہ یہ تو خدا ہی کا خاصا ہے کہ وہ تمام مخلوق کے سوال جواب کا حل کر سکتا ہے مگر انسانی فطرت کے لیے بعید از قیاس ہے۔

جواب: حدیث ہذا تصحیح یا تحسین کی محتمل ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے ''الاذکار'' اور ''ریاض الصالحین'' میں اس پر صحت کا حکم لگایا ہے۔ [1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ: بِأَنَّ رُوَاتَهٗ ثِقَاتٌ. یعنی حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں اگرچہ بعض محدثین نے اس میں ایک راوی ابوصخر حمید بن زیاد میں کلام کیا ہے۔ لیکن فی الجملہ وہ قابل حجت ہے۔ حدیث کی صحت کی صورت میں موجود اشکال کا حل یوں ہے کہ امور آخرت کا ادراک عقل سے ممکن نہیں ہے۔ برزخی احوال آخرت کے احوال سے زیادہ مشابہہ ہیں۔ لہٰذا ظاہر حدیث پر ایمان لانا اور اس کی تصدیق کرنا واجب ہے۔ اس کا علم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سپرد کر دینا چاہیے۔ برزخی معاملہ کو، جو کچھ ہم دنیا میں مشاہدہ کرتے ہیں اس پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ یہ غائب کو شاہد پر قیاس کرنے کے مترادف ہے۔ جو حد درجہ جہالت اور ظلم و زیادتی و گمراہی وکند ذہنی ہے۔ (مرعاة المفاتيح ١/ ٦٩٠)

سوال: ایک شیعہ ہمسائے نے ایک کتابچہ مجھے لا کر دیا، جس میں کئی ایک لغویات کے علاوہ یہ حدیث بھی درج تھی:

« قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:« يَاعَلِيُّ أَنْتَ وَشِيْعَتُكَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ.»

جس کا ترجمہ یوں درج تھا: ''اے علی! تو اور تیرے شیعہ جنتی ہیں۔'' اس کی استنادی حیثیت سے مطلع فرمائیں؟

---

[1] (١٥٢) صححه النووي وابن القيم وحمزة وحسنه الألباني. صحيح أبي داؤد، كتاب المناسك، باب زيارة القبور (٢١٤١)، أحمد، (٥٢٧/٢)(١٠٧٥٩) بتحقيق حمزة. رياض الصالحين، رقم(١٤٠٢)، سنن الكبرى (٢٤٥/٥) للبيهقي. عون المعبود شرح الحديث هذا. وقال ابن حجر رواته ثقات كما في عون.

جواب : مشار الیہ روایت کی کوئی اصل نہیں۔ مناقب علی رضی اللہ عنہ میں اکثر روافض کی وضعی روایات ہیں۔ جن کی کوئی اصل نہیں۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا .

سوال: احادیث کی اکثر کتب میں صحیح احادیث کے ساتھ ضعیف احادیث بھی شامل ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ جب کہ محدثین کو ان کے ضعف کا بھی پتہ تھا۔ پھر انہوں نے ضعیف روایات کو شامل رکھا۔ کیا حکمت تھی؟ کیوں کہ آج کے زمانے میں باطل فرقے ان ہی ضعیف روایات سے دلیل لیتے ہیں؟

جواب: واضح ہو کہ ضعف کے مختلف درجات کے اعتبار سے ضعیف روایات کی پچاس سے زائد اقسام ہیں جن کی تفصیل ''توضیح الافکار'' میں موجود ہے۔ ہر قسم کے قبول و رد کا تعلق ضعف کی حیثیت کے ساتھ ہوتا ہے جو تفصیلی بحث کا متقاضی ہے۔

المختصر بعض ضعیف روایات ایسی ہیں، جو کثرت طرق کی بناء پر کسی نہ کسی انداز میں قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ اور کچھ ضعیف ایسی بھی ہیں جن کے مدلول (مفہوم) پر عمل کرنے میں اہل علم کا اتفاق ہے اور انہیں قبول کر کے ان پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو: (توضیح الأفکار ۱/ ۲۵۴)

احادیث بیان کرنے کے اصول (علم المصطلح) اسماء الرجال اور علم جرح و تعدیل تو محدثین کرام کی مساعی جمیلہ کا عظیم امتیاز ہے۔ فرق باطلہ چونکہ ان کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا ان کا معترض ہونا کوئی انوکھی بات نہیں کیونکہ مقولہ مشہور ہے کہ آدمی ہمیشہ اس چیز کا دشمن ہوتا ہے جس سے وہ ناواقف ہو۔ رب العزت ہم سب کی رہنمائی فرمائے۔ آمین!

سوال: « تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ ......كِتَابُ اللّٰهِ وَ سُنَّةُ رَسُوْلِهِ.» اور « تَرَكْتُ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ ......كِتَابُ اللّٰهِ وَ عِتْرَتِيْ.»

دونوں حدیثوں کا حوالہ کتب، صحت روایت اور مفہوم مختصراً مطلوب ہے؟

جواب: حدیث: « تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ. » موطا امام مالک رحمہ اللہ میں ''بَابُ النَّهْيِ عَنِ الْقَوْلِ بِالْقَدَرِ'' کے تحت بیان ہوئی ہے۔ [1] روایت ہذا بلاغات امام مالک رحمہ اللہ سے ہے۔

علامہ زرقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] (۱۵۳) انظر الرقم المسلسل ۳۳.

" مِنْ أَنَّ بَلَاغَهُ صَحِيحٌ كَمَا قَالَ ابْنُ عُيَيْنَةَ ." (شرح الزرقانی ٢٤٦/٤)

"یعنی مالک کی بلاغ صحیح ہیں جس طرح کہ ابن عیینہ نے کہا ہے۔"

مقدمہ شرح زرقانی رحمہ اللہ میں ہے، ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا:

" وَجَمِيعُ مَا فِيهِ مِنْ قَوْلِهِ بَلَغَنِي...... كُلُّهَا مُسْنَدَةٌ مِنْ غَيْرِ طريق مَالِكٍ إِلَّا أَرْبَعَةً لَا تُعْرَفُ ." (٨/١)

لیکن روایت ہذا کا شمار چار غیر معروف میں نہیں۔ مگر علامہ البانی نے اسے معضل کہہ کر ایک شاہد کی بنا پر قابل اعتبار قرار دیا ہے جسے حاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔ [1] دیکھئے: (مشکوۃ بتعلیق الألبانی: ٦٦/١)

مفہوم اس کا یہ ہے کہ میں تم میں کتاب وسنت کو چھوڑے جا رہا ہوں جب تک عملی زندگی میں ان کو مضبوطی سے پکڑے رکھو گے گمراہ نہیں ہو گے۔ یہی دو اصل ہیں۔ ابدی نجات اور عصمت کی راہ ان کے سوا کوئی نہیں۔

دوسری روایت: « تَرَكْتُ فِيكُمْ ثَقَلَيْن......» [2] الخ

روایت ہذا مختلف الفاظ کے ساتھ صحیح مسلم اور جامع ترمذی وغیرہ میں موجود ہے۔ بعض طرق میں اگرچہ کچھ کلام ہے لیکن فی الجملہ قابل حجت ہے۔ البتہ سوال میں مصرح الفاظ نظر سے نہیں گزرے اگرچہ ان کا مفہوم دیگر روایات میں موجود ہے۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ میرے بعد اللہ کی شریعت کے ساتھ مضبوطی سے تمسک کرنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کے ساتھ اظہار محبت کرنا اور ان کی سیرت و کردار کو اپنے لیے راہنمائے ہدایت تصور کرنا۔

اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَ تَرْضٰى.

سوال: "مَا رَآهُ الْمُسْلِمُونَ حَسَنًا فَهُوَ حَسَنٌ" کیا حدیث ہے؟ اگر ہے تو اسنادی حیثیت بیان فرمائیں؟

جواب: حدیث ھذا علامہ عجلونی رحمہ اللہ نے (كشف الخفاء ١٢/٢) [3] اور علامہ سخاوی رحمہ اللہ نے (المقاصد

---

[1] (١٥٤) انظر الرقم المسلسل (٣٦) .

[2] (١٥٥) صحیح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی رضی الله عنه (٦٢٢٥- ٦٢٢٨)، أحمد (٣٦٦/٤) والصحيحة (١٧٦١).

[3] (١٥٦) كشف الخفاء و مزيل الإلباس (١٨٨/٢).

الحسنة میں ص ۳۶۷) پر بحوالہ (کتاب السنہ امام احمد) ایک روایت کے ضمن میں بایں الفاظ ذکر کی ہے:

«فَمَا رَآهُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَاللّٰهِ حَسَنٌ.» ❶

پھر دونوں نے کہا کہ یہ روایت موقوف حسن ہے۔ یعنی صحابی ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے جو حسن درجہ کا ہے۔ علامہ عجلونی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حافظ ابن عبدالہادی نے اس حدیث کو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حد درجہ کمزور سند سے مرفوع بیان کیا ہے۔ صحیح ترین بات یہ ہے کہ یہ ابن مسعود پر موقوف ہے۔

نیز دونوں نے اس بات کی بھی نفی کی ہے کہ یہ روایت مسند احمد میں ہو لیکن "اَلْمَقَاصِدُ الْحَسَنَه" کے معلق عبداللہ محمد صدیق نے کہا ہے کہ یہ روایت مسند احمد میں بھی موجود ہے۔ ❷

سوال: کیا ''ام السائب'' نامی عورت کا بیٹا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فوت ہو کر اس کی ماں کے صلوۃ الحاجۃ پڑھنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوا تھا۔ اس واقعے کی اسنادی حیثیت بیان فرمائیں؟

جواب: مشار الیہ قصہ من گھڑت ہے "اسماء الاصحاب" کی معتبر کتابوں ''الاصابۃ'' اور ''الاستیعاب'' وغیرہ میں اس کا کوئی اصل نہیں۔

سوال: ابوداؤد شریف میں مذکورہ ایک روایت سلام میں " وَ مَغْفِرَتُهٗ " کے اضافہ والی کس پایہ کی ہے؟ کیا قابل عمل ہے؟

جواب: ابوداؤد میں " وَمَغْفِرَتُهٗ " کا اضافہ ہے۔

امام منذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس روایت کی سند میں ابو مرحوم عبدالرحیم بن میمون اور سہل بن معاذ دونوں ناقابل حجت ہیں پھر فرماتے ہیں:

" وَقَالَ:فِيْهِ سَعِيْدُ بْنُ أَبِيْ مَرْيَمَ أَظُنُّ أَنِّيْ سَمِعْتُ نَافِعَ بْنَ يَزِيْدَ ." (المختصر:۶۹/۸)

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری (۶/۱۱) میں تین روایات میں یہ لفظ نقل کیا ہے۔

یعنی ''جب ضعیف احادیث کو آپس میں ملایا جائے تو " وَ بَرَكَاتُهٗ " پر زیادتی کی مشروعیت کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ کچھ اس کا اصل موجود ہے جس کی بناء پر روایت قابل عمل ہو سکتی ہے۔''

❶(۱۵۷) قال الألباني، لا أصل له مرفوعاً و إنما ورد موقوفًا على ابن مسعود الضعيفة(۱۷/۲)،(ح:۵۳۳).

❷(۱۵۸) صححه أحمد شاكر موقوفا على ابن مسعود رضي الله عنه.أحمد(۳۷۹/۲)(۳۶۰۰)شاكر،مجمع الزوائد(۱۷۷/۱) و ابو نعيم في الحلية (۳۷۵/۱).

مسنون خطبہ میں الفاظ

سوال ۞ (ا) کیا خطبہ میں "ونؤمن به ونتوكل عليه" کے الفاظ صحیح سند سے ثابت ہیں؟

۞ (ب) "لفظ أشهد" صرف واحد کے صیغہ سے ہے یا جمع سے بھی (نشهد) ؟

۞ (ج) "لفظ يضلل" کے ساتھ ضمیر "ہ" کا اضافہ ثابت ہے؟

جواب: مسنون خطبہ میں "ونؤمن به ونتوكل عليه" کے الفاظ ثابت نہیں۔ یہ الفاظ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں تاریخ بغداد میں ہیں لیکن یہ روایت سند کے اعتبار سے سخت ضعیف ہے۔

لفظ "أشهد" صرف واحد کے صیغے سے ثابت ہے، جمع نہیں۔

لفظ "یضلل" کے ساتھ "ہ" ضمیر کا اضافہ بھی ثابت نہیں، روایت ہذا صحیح مسلم (۱۱/۳) سنن النسائی (۱/ ۲۳٤) بیهقی (۳/ ۲۱٤) اور مسند أحمد (۳/ ۳۱۹، ۳۷۱) میں موجود ہے۔

تعاقب از مولانا ابو الأشبال حفظہ اللہ ......(۱)

محترم حافظ ثناء اللہ صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

"الاعتصام": ج ۵۴، تاریخ ۱۷ ذیقعدہ ۱۴۲۳ھ کے "احکام ومسائل" میں "خطبہ مسنونہ" کے الفاظ سے متعلق ایک سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا:

مسنون خطبہ میں "ونؤمن به ونتوكل عليه" کے الفاظ ثابت نہیں۔ یہ الفاظ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت تاریخ بغداد میں ہیں لیکن یہ روایت سند کے اعتبار سے سخت ضعیف ہے۔ لفظ "أشهد" صرف واحد کے صیغے سے ثابت ہے، جمع نہیں۔

لفظ "یضلل" کے ساتھ "ہ" ضمیر کا اضافہ بھی ثابت نہیں، روایت ہذا صحیح مسلم (۱۱/۳) سنن النسائی ۱/ ۲۳٤) بیهقی (۳/ ۲۱٤) اور مسند احمد (۳/ ۳۱۹، ۳۷۱) میں موجود ہے۔"

(ا) "ونؤمن به ونتوكل عليه" کے متعلق آپ کی یہ تحقیق صحیح معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ یہ اضافہ کنز العمال (۱۳/ ۲۴۳) میں "تاریخ ابن عساکر" کے حوالے سے ابن عباس کے واسطے سے مرقوم ہے۔ نیز

المطالب العالیه (۱/ ۱۷۳) میں الحارث کے حوالے سے ابوہریرہ و ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطے سے موجود ہے۔ البیان والتعریف (۲/ ۲۸۷) میں جامع کبیر کے حوالے سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطے سے مکتوب ہے۔ یہ وہ حوالے ہیں جن میں اسناد کا ذکر نہیں۔ اب وہ حوالے دیکھیں جن میں اسناد بھی مذکور ہیں۔ اب آپ کی ذمہ داری ہے کہ ان اسناد کی تحقیق کر لیں۔

① "دلائل النبوة بیهقی" (۲/ ۲۲٤) عن ابن عباس رضی اللّٰه عنهما.

② "معرفة الصحابة" أبو نعیم أصفهانی (۳/ ٥٤۲) فی ترجمة ضماد بن ثعلبه الأزدی عن ابن عباس رضی الله عنهما.

③ "المسند المستخرج علی صحیح مسلم" أبو نعیم أصفهانی (۲/ ٤٥٦) عن ابن عباس رضی الله عنهما.

اگر کوئی جستجو میں لگے تو مزید حوالے بھی مل سکتے ہیں۔

(ب) لفظ "یضلل" کے ساتھ "ہ" ضمیر کا اضافہ بھی ثابت نہیں۔ سو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ سنن نسائی مطبوعہ قدیمی کتب خانہ پاکستان (۱/ ۲۰۸) میں "یضلله" متن میں موجود ہے۔ البتہ حاشیے میں "یضلل" کا نسخہ ہے۔ نیز "التعلیقات السلفیه" (۱/ ۱٦٥) حدیث رقم ۱۴۰۵ میں متن کے اندر "یضلله" مرقوم ہے البتہ بین السطور اس کے اوپر "خ" "یضلل" بھی مکتوب ہے۔

غالباً آپ نے جواب لکھنے میں عجلت سے کام لیا ہے یا کسی کی تحقیق پر بھروسہ کر کے لکھ دیا ہے۔ واللہ اعلم لہٰذا مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ (أبوالأشبال احمد شاغف۔ مکۃ المکرّمۃ)

جواب تعاقب از حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ ......(۱)

گرامی قدر مولانا ابو الأشبال صاحب! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کے حسبِ ہدایت میسر مراجع کی طرف رجوع کیا تو اعتماد و استناد کے قابل کوئی ایسی چیز نہیں مل سکی جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ یہ الفاظ خطبۂ نبویہ میں ثابت ہیں۔

جہاں تک ''ومن یضلل'' میں ''ہ'' ضمیر کے اضافے کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں عرض ہے کہ میں نے مزید جن نسخوں کا مراجعہ کیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

1 ''مکتب مطبوعات اسلامیہ'' حلب جو شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی تحقیق سے شائع شدہ ہے۔ اس میں صرف ''یضلل'' ہے۔ ''یضلله'' کے نسخے کی طرف اشارہ تک نہیں۔

2 ''مکتبة المعارف'' ریاض۔ اس نسخے میں علامہ البانی رحمہ اللہ نے صرف ''یضلل'' ذکر کیا ہے اور ''یضلله'' محذوف ہے۔

پھر شیخ موصوف کی کتاب ''خطبة الحاجة'' میں بھی اس نسخے کی طرف اشارہ تک موجود نہیں۔ نیز انہوں نے اپنی جملہ تصانیف کے شروع میں جو خطبہ ذکر کیا ہے، اس میں ''ہ'' ضمیر کا قطعاً ذکر نہیں۔ البتہ ''مشکوٰۃ باب علاماتِ النبوۃ'' میں ضماد ازدی کے حوالے سے جو خطبہ نبوی نقل ہوا ہے۔ اس میں ''یضلله'' ہے۔ حدیث ہذا چونکہ اصلاً صحیح مسلم سے نقل کی ہے اس میں ''ہ'' ضمیر محذوف ہے جس کی تصحیح مشکوٰۃ کے حاشیے پر علامہ البانی نے صحیح مسلم سے کی ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ سنن نسائی کے جن نسخوں میں ''یضلله'' ہے یہ غیر مستند اضافہ ہے جس کی چھان بین کی مزید ضرورت ہے۔

امید ہے کہ فتووں میں راہنمائی کے عمل میں تسلسل جاری رہے گا۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء.

تعاقب از مولانا ابو الأشبال حفظہ اللہ......(۲)

مکرمی ومحبی حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب......السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

''خطبۂ جمعہ'' کے الفاظ سے متعلق آپ کے ایک فتوے پر میں نے بعض ملاحظات ارسال کیے تھے، جن پر آپ نے ''الاعتصام'' (جلد ۵۴ شمارہ ۲۵ ص ۹) پر رقم فرمایا تھا کہ:

''آپ کے حسب ہدایت میسر مراجع کی طرف رجوع کیا تو اعتماد واستناد کے قابل کوئی ایسی چیز نہیں مل سکی جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ یہ الفاظ ''خطبۂ نبویہ'' میں ثابت ہیں۔''

جناب من! میں نے ان حوالوں میں ''المسند المستخرج''...... (۴۵۵/۲ ، ۴۵۶) کا بھی حوالہ دیا ہے۔ ابونعیم نے تین سندوں سے اس میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کو جگہ دی ہے جس میں "ونؤمن به ونتوكل عليه" موجود ہے۔ سلسلۂ سند یوں ہے:

پہلی سند:

"حدثنا محمد بن أحمد بن الحسن، ثنا بشر بن موسى، ثنا إسماعيل بن الخليل، ثنا يحيى بن أبي زائدة، ثنا داؤد بن أبي هند."

اس سند کے سارے رواۃ ثقہ ہیں۔ محمد بن احمد کا ترجمہ ''تاریخ بغداد'' (۲۸۹/۱۔ ت ۱۴۰) میں ہے۔ فقال: " وكان ثقة مامونا "

- '' بشر بن موسى" کا ترجمہ بھی ''تاریخ بغداد'' (۸۶/۷۔ ت ۳۵۲۳) میں ہے:'' وقال: ثقة نبيل." ۔
- إسماعيل بن الخليل المترجم في "التقريب" قال الحافظ: ثقة.
- يحيى بن أبي زائدة المترجم في "التقريب" قال الحافظ: ثقة متقن.
- داؤد بن أبي هند المترجم في "التقريب" قال الحافظ: ثقة متقن.

دوسری سند:

ح وثنا جعفر بن محمد بن عمرو، ثنا أبو الحصين الوادعي، ثنا يحيى بن

عبدالحميد، ثنا يحيى بن أبى زائدة ويزيد بن زريع، عن داؤد بن أبى هند۔
اس سند کے راویوں پر اگر کچھ کلام بھی ہو تو کوئی حرج نہیں کیونکہ سند اول کے سارے راوی ثقہ ہیں۔
''جعفر بن محمد'' کا ترجمہ مجھے جلدی میں مل نہیں سکا ،أبو الحصین الوادعی ''ثقہ'' ہیں، دیکھو ''تاریخ بغداد''

(۲۲۹/۲۔ ت ۷۸)

- يحيى بن عبدالحميد : المترجم فى "التقريب" . قال الحافظ: حافظ إلا أنهم اتهموه بسرقة الحديث، مزی نے ''تهذيب الكمال'' میں ان کا ترجمہ نقل کیا ہے۔ صرف تہمت لگانے سے مجروح نہیں ہو سکتے اس کا ثبوت درکار ہے۔
- يحيى بن أبى زائدة: کا ترجمہ پہلی سند میں بیان ہو چکا ہے کہ وہ ثقہ متقن ہیں۔
- يزيد بن زريع المترجم فى "التقريب" قال الحافظ: ثقة ثبت.
- داؤد بن أبى هند: قد مرفى الأول .

تیسری سند:

ح وثنا أبو أحمد محمد بن أحمد، ثنا عبدالله بن محمد بن شيرويه، ثنا إسحاق بن إبراهيم، أنبا عبد الاعلى، ثنا داؤد بن أبى هند، عن عمرو بن سعيد، عن سعيد بن جبير، عن ابن عباس رضى الله عنهما . (الحديث)
اس سند کے بھی سارے راوی ثقہ ہیں۔ أبو أحمد محمد بن أحمد کا ترجمہ ''طبقات الحفاظ'' للسيوطی (ص ۳۸۷ و ۳۸۸) میں ہے۔ قال السيوطی: وكان من علماء المحدثين ومتقنيهم، صوّاما، صالحا ، ثقة.

- عبدالله بن محمد بن شيرويه: کا ترجمہ "تذكرة الحفاظ" (۷۰۵/۲)میں ہے۔ قال الذهبی: وهو ثقة باتفاق .
- إسحاق بن إبراهيم: هو ابن راهويه قال الحافظ فى " التقريب" : ثقة حافظ مجتهد .
- وعبد الاعلىٰ هو ابن عبدالأعلى السامى. قال الحافظ فى "التقريب" : ثقة، وفوقه كلهم من الثقات من رجال التقريب.

أبونعیم نے پہلی اور تیسری سند میں جو تحدیث کا التزام کیا ہے وہ بھی قابل توجہ ہے۔
اب یہ کہنا کہ ''اعتماد واستناد کے قابل کوئی ایسی چیز نہیں مل سکی ''نصف النہار کو نصف اللیل'' باور کرانے

کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ آگے آپ فرماتے ہیں: جہاں تک "ومن یضلله" میں "ہ" ضمیر کے اضافے کا تعلق ہے الخ'' سائل نے ''مسنون خطبہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے، کسی خاص روایت کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے جیسا کہ الفاظ سے واضح ہوتا ہے یا میری ناقص سمجھ ہے۔ اور جب یہ بات ہے تو پھر کسی بھی روایت میں ''خطبہ مسنون'' کے الفاظ "ومن یضلله" کے ساتھ ثابت ہو جائیں تو جواب اثبات میں ہوگا، بس اس روایت کی نشان دہی کافی ہے۔ میں نے ''سنن نسائی'' کا جو حوالہ لکھا تھا آپ نے اس کو غیر مستند قرار دیا ہے اور اس کے لیے ''مکتب مطبوعات اسلامیہ'' حلب کے نسخے کا حوالہ دیا ہے اور اسے آپ نے عبدالفتاح ابوغدہ کی تحقیق لکھا ہے جس کا علم مجھے نہیں۔ البتہ میرے پاس وہ نسخہ ہے جس پر عبدالفتاح ابوغدہ نے صرف ترقیم کا اضافہ کیا ہے۔ اس کی تیسری جلد ص ۱۸۸ حدیث رقم ۱۵۷۸ میں "ومن یضلله" موجود ہے۔ اسی طرح البانی رحمہ اللہ کی صحیح سنن النسائی [لناشر: مکتب التربیة العربی لدول الخلیج (۱/ ۳۴۵ و ۳۴۶ حدیث رقم ۱۴۸۷)] میں بھی "ومن یضلله" موجود ہے۔ نیز ''التعلیقات السلفیه" (۱/ ۱۸۸ حدیث ۱۵۷۹) بھی دیکھ لیں۔

پھر آپ نے فرمایا کہ ''پھر شیخ موصوف کی کتاب ''خطبة الحاجة'' میں بھی اس نسخے کی طرف اشارہ تک موجود نہیں ہے۔ نیز انہوں نے اپنی جملہ تصانیف کے شروع میں جو خطبہ ذکر کیا ہے اس میں ''ہ'' ضمیر کا قطعاً ذکر نہیں۔''

شیخ البانی رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ اعتراف حق کی بجائے آئیں بائیں بہت کیا کرتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی تجربہ شیخ البانی رحمہ اللہ کے ساتھ ''قراءۃ فاتحہ خلف الامام'' کے سلسلہ میں ہے۔ نیز ان کے اکثر تلامذہ کے ساتھ میری ملاقات ہوتی رہتی ہے، اللہ ہی کو معلوم کہ وہ ایسے کیوں کرتے ہیں۔ میں نے شیخ البانی رحمہ اللہ کو جب وہ یہاں سعودی عرب تشریف لائے تھے، ان کی کتابوں پر جو تعلیقات میں نے اپنے نسخوں پر لکھ رکھی تھیں، ان کی نقل انہیں پیش کی کہ آپ مناسب سمجھیں تو آئندہ ایڈیشن میں تصحیح کر لیں۔ ان میں سے صرف دو مثالیں آپ کی ضیافت طبع کے لیے لکھ رہا ہوں، مشکاۃ (۹۲۶/۲) میں ہے:

۳۰۷۸۔ (۹) وعن أنس، قال: قال رسول الله ﷺ: ((من قطع میراث وارثه قطع الله میراثه من الجنة یوم القیامة)) رواه ابن ماجه. (۳)

شیخ البانی رحمہ اللہ حاشیے پر رقم طراز ہیں:

(۳) لم أجده في ابن ماجه، ولا أعتقد إلا أن عزوهُ إلیه خطأ، فقد أورده السیوطي

فی "الجامع الکبیر" (۲/ ۲۸۵ / ۲) من روایۃ سعید بن منصور فقط عن سلیمان بن موسی مرسلا.

اب آیے! ذرا ''سنن ابن ماجہ'' کی طرف رجوع کر کے دیکھتے ہیں، اٹھایے ''سنن ابن ماجہ'' تحقیق محمد فواد عبدالباقی (۹۰۲/۲)

۲۷۰۳۔ حدثنا سوید بن سعید، ثنا عبدالرحیم بن زید العمی ، عن أبیه، عن أنس بن مالك، قال: قال رسول الله ﷺ: ((من فرمن میراث وارثه، قطع الله میراثه من الجنة یوم القیامة .))

اس میں اور ''مشکاۃ'' کے نسخے میں صرف ایک لفظ کا فرق ہے۔ ہوسکتا ہے کسی نسخہ میں ہو۔ ہوسکتا ہے کہ الشیخ البانی رحمہ اللہ کے تلامذہ یہ کہہ کر جان چھڑا لیں کہ ''ابن ماجہ'' کا یہ مطبوعہ نسخہ ہی غلط ہے۔ لہٰذا اس پر حجت قائم کرنے کے لیے ''ابن ماجہ'' مخطوطہ مصورہ ''مکتبہ محمودیہ'' مدینہ سے اس کا اصل یہاں ثبت کر دیتا ہوں:

...... ❶ حدثنا سوید بن سعید ، ثنا عبد الرحیم بن زید العمی عن أبیه عن أنس بن مالك ،قال : قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : ((من فرمن میراث وارثه قطع الله میراثه من الجنة یوم القیامة.))

مثال ثانی: صحیح الجامع الصغیر (۴۴۰/۱) کھولیے:

۱۳۹۰۔ أم القرآن هی السبع المثانی، والقرآن العظیم (خ) عن أبی بکر

(۱) البانی رحمہ اللہ حاشیے میں لکھتے ہیں:

(۱) کذا فی الأصل و ((الجامع الصغیر)) أیضاً، وعلیه شرح المناوی، وفی "الکبیر" (۱/ ۲/۱۳۲) : ((خ، هب عن أبی هریرة "وهذا أقرب، فإن له أصلاً عن أبی هریرة رضی اللّٰه عنه عند غیر البخاری کالترمذی وغیره، کماسیأتی بلفظ "والذی نفسی بیده ما أنزل ......" أما عن أبی بکر فلا أصل له عند أحد منهم، وإنما هو عند البخاری عن أبی سعید بن المعلی کما سیاتی بلفظ ((الحمدلله رب العالمین هی...... .))

❶ یہاں ابتدا میں تین لفظ غیر واضح خط میں درج ہیں جو غالباً سند کا حصہ نہیں ہیں ''صحیفہ اہل حدیث'' نے غالباً اندازے سے ہی "الحیف فی الوقتیه" لکھا ہے۔ (الاعتصام)

اب آیئے! فتح الباری (۸/۳۸۱) کھولیے:

٤٧٠٤ـ حدثنا آدم ،حدثنا ابن أبی ذئب، حدثنا سعید المقبری عن أبی هریرة رضی الله عنه، قال: قال رسول اللهﷺ ((ام القرآن هی السبع المثانی والقرآن العظیم .))

ان دو مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ البانی رحمہ اللہ کی تحقیق پر اعتماد کرنے والا ہمیشہ دھوکا کھائے گا۔ واللہ اعلم.
آپ کی مذکورہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے البانی صاحب رحمہ اللہ کے عمل کو بھی دلیل میں پیش کیا ہے جب کہ یہ صفت تو صرف نبی کریم ﷺ کے ساتھ مختص ہے کہ آپ ﷺ کا ہر ارشاد واجب التعمیل اور ہر عمل حجت ہے، آپ ﷺ کے علاوہ کسی کا عمل دین میں نہ حجت ہے نہ دلیل۔ نیز آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ البانی صاحب رحمہ اللہ نے جن روایتوں پر عمل نہیں کیا وہ قابل اعتماد و استناد نہیں؟ جناب من! کسی کی دل آزاری مقصود نہیں، حق کی پاسداری کا ارادہ ہے۔ إن أرید إلا الإصلاح، وما توفیقی إلا بالله.

جواب تعاقب از حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ......(۲)

ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور جلد۵۴ (۱۷رذیقعدہ ۱۴۲۲ھ) میں ''احکام ومسائل'' کے ضمن میں میرا ایک فتویٰ شائع ہوا جس میں ایک سائل کے جواب میں لکھا تھا کہ ''خطبۂ مسنونہ'' میں "ونؤمن به ونتوكل عليه" کے الفاظ ثابت نہیں اور لفظ "أشهد" صرف واحد کے صیغے سے ثابت ہے، جمع (نشهد) نہیں اور لفظ "يضلل" کے ساتھ "ہ" ضمیر کا اضافہ بھی ثابت نہیں۔

اس پر مکہ مکرمہ سے مولانا ابوالأشبال حفظہ اللہ نے تعاقب کیا کہ مذکورہ الفاظ خطبۂ مسنونہ میں ثابت ہیں، فلاں فلاں کتابوں کی طرف رجوع کریں۔ میسر مراجع میں مجھے اطمینان بخش کوئی حوالہ دستیاب نہ ہوسکا۔ میرے اس جواب اور شکریے پر غالباً انہیں اطمینان نہ ہوا جس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک مضمون میں کیا۔ اس خط نما مضمون میں انہوں نے میرے علاوہ علامہ البانی رحمہ اللہ پر برہمی کا خاصا اظہار کیا، انہیں اور ان کے شاگردوں کو نابلد قرار دینے کی سعی کی جو کسی بھی اعتبار سے لائق اعتنا نہیں۔ کیونکہ مسائل کے سمجھنے اور بیان کرنے میں خطا و صواب دونوں کا احتمال ہوتا ہے اور کسی بھی شخص سے اختلافِ رائے کی گنجائش بھی اسی لیے ہے۔ البتہ اس اختلاف کے باعث کسی فوت شدہ پر خواہ مخواہ طعن کرنا خلافِ سنت اور علمائے حق کی شان کے منافی ہے......

مولانا موصوف نے اپنے مضمون کی کاپی مجھے بھی ارسال کی۔ افسوس کہ وہ مجھ سے ضائع ہوگئی جس کی ایک طویل کہانی ہے۔ میں بذاتہٖ اس تحریر کو پڑھ نہیں سکا تھا۔ بعدازاں ایک مولوی صاحب میرے پاس تشریف لائے، ان کے ہاتھ میں ۲۱ردسمبر ۲۰۰۲ء کا ''صحیفہ اہل حدیث کراچی'' تھا۔ میری نظر مضمون ''بعض اہم روایاتِ کی تحقیق'' پر پڑی تو معلوم ہوا کہ موصوف کا یہی وہ مضمون ہے جس کی کاپی مجھے بھیجی گئی تھی۔ اس کے مطالعے کے بعد حسب استطاعت کاوش کا ماحاصل قارئین کرام کے پیش خدمت ہے۔ امید ہے کہ یہ تبصرہ باعث اطمینان اور موجب تسلی ثابت ہوگا۔ واضح ہو کہ اس موضوع پر ''خطبۂ مسنونہ'' کے نام سے میرے لائق ترین شاگرد حافظ عبدالرؤف بن عبدالحنان کی گراں قدر تصنیف بھی شائع ہوچکی ہے جو علمی حلقوں کے لیے نادر تحفہ ہے۔ جزاه الله احسن الجزاء. جانبین کی طرف سے ابتداء سے تاحال علمی تحقیق وتنقید ملاحظہ فرمائیں تاکہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل میں آسانی رہے۔ والله يهدى من يشاء إلى صراط مستقيم.

آمدم برسرِ مطلب:

اس سلسلہ میں ہم قدرے تفصیلی بحث کرنا چاہتے ہیں ہماری یہ کوشش ہوگی کہ ہر شے کو مستند حوالوں سے پیش کیا جائے تاکہ قارئین کرام کے سامنے کھل کر اصل مسئلہ کی صورت واضح ہو۔

[1] ''نؤمن به ونتوكل عليه''

(1) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث:

اس حدیث کو ابوالقاسم الحسن بن محمد نیساپوری نے اپنی کتاب "عقلاء المجانین" (ص ۱۱۔۱۲) میں اور نیساپوری سے ابن عساکر نے ''تاریخ دمشق'' (۵۴/۴۰۷) میں روایت کیا ہے۔ اس کی سند یوں ہے:

قال النيسابورى: أخبرنا أبو الحسن على بن محمد قال: حدثنا احمد ابن محمد بن عمير و محمد بن عمران بن عتبة بدمشق، قالا: حدثنا ابراهيم عن عمرو بن سعيد عن سعيد بن جبير ❶ عن ابن عباس

اس سند میں "أومن به وأتوكل عليه" کا اضافہ ہے، یہ الفاظ نیساپوری کے ہاں ہیں جب کہ ابن عساکر کے ہاں "نؤمن به ونتوكل به" ہے۔

اس حدیث کی سند میں انقطاع کا خدشہ ہے کیونکہ علماءِ جرح وتعدیل نے یحییٰ بن سعید الاموی جو ابن ابان الکوفی ہیں کے شیوخ میں داؤد بن أبی ہند کا ذکر نہیں کیا۔

اس سند میں انقطاع کا خدشہ ہی نہیں بلکہ فی الواقع انقطاع ہے کیونکہ حافظ ابن عبدالبر نے ''الاستیعاب'' (ص۲/۲۰۹ ترجمۃ ضماد) میں کہا ہے:

"ذكر حديثه يحيى بن سعيد الأموى عن ابن إسحاق عن داؤد بن أبى هند عن عمرو بن سعيد عن سعيد بن جبير عن ابن عباس قال."

حافظ ابن عبدالبر کے اس کلام سے معلوم ہوا کہ یحییٰ بن سعید اور داؤد بن أبی ہند کے درمیان ابن اسحاق کا واسطہ ہے اور ابن اسحاق مدلس ہیں، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جو سند ذکر کی ہے اس میں ان کی تحدیث یا سماع کی صراحت نہیں ہے۔ ❷ واللہ اعلم۔

---

❶ عقلاء المجانین کے مطبوعہ نسخے میں "عمرو بن سعید بن جبیر" ہے جو درست نہیں۔

❷ علمائے جرح وتعدیل نے یحییٰ بن سعید کے شیوخ میں ابن اسحاق کا ذکر کیا ہے۔ داؤد بن أبی ہند کا نہیں۔ ملاحظہ ہو "الجرح والتعدیل (۹/ ۱۵۱) تاریخ بغداد (۱۴/ ۱۳۲) تهذيب الكمال (۲/ ۸۵۔ ۸۶) اور کاشف ذہبی (۳/ ۲۲۵)

ابراہیم بن سعید الجوہری:

صحیح مسلم کے رجال میں سے ہیں۔ محمد بن عمران بن عتبہ کے ترجمے میں ابن عساکر نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور اس کے بارے میں کسی قسم کی جرح و تعدیل نقل نہیں کی۔ مگر اس کی احمد بن محمد بن عمیر نے متابعت کی ہے جس کا ترجمہ مجھے نہیں ملا، اس کے ترجمے کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ابوالحسن علی بن محمد:

کون ہیں؟ نیساپوری نے (ص ۸) میں مظفری کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں۔ جس سند سے انہوں نے یہ اشعار نقل کیے ہیں اس میں ان کے شیخ "ابوالحسن علی بن محمد بن عبدالله السرخسی" ہیں۔ کیا یہاں بھی یہی سرخسی ہیں یا کوئی دوسرے؟ جب کہ ابن عساکر کے ہاں نیساپوری کے شیخ کا نام اس طرح سے ہے۔ "ابوالحسن علی بن محمد بن صخر" یہ سرخسی یا ابن صخر کون ہے؟ اس کی تحقیق کی ضرورت ہے۔ نیز نیساپوری کی بھی ثقاہت مطلوب ہے۔ حافظ ذہبی نے "سير أعلام النبلاء" (۱۷/ ۲۳۷/ ترجمة ۱۴۳) میں ان کا ذکر کیا ہے اور یہ کہا ہے: المفسر الواعظ صاحب كتاب "عقلاء المجانين."

ابن العماد نے "شذرات الذهب" (۳/ ۱۸۱) میں کہا ہے: وفيها (توفي سنة ۴۰۶) أبو القاسم الحسن بن محمد بن حبيب النيسابوري المفسر، صنف في علوم القرآن والآداب، وله كتاب "عقلاء المجانبين" سمع الأصم وجماعة .

دونوں نے ان کے بارے میں کوئی تعدیل ذکر نہیں کی بلکہ حافظ ذہبی نے تو کہا ہے: "وقد تكلم فيه الحاكم في رفعه نقلها عن مسعود بن علي السجزي. والله أعلم.

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ سند اس قابل نہیں کہ اس کے "نؤمن به ونتوكل عليه" کے اضافے کو قبول کیا جائے...... یہ اضافہ داؤد بن أبی ہند سے ایک دوسری سند میں بھی ہے جو یہ ہے:

قال الحافظ أبو نعيم في " المستخرج على صحيح مسلم" (۲/ ۴۵۶) وفي "معرفة الصحابة" (۴/۱۵۴۲۔ ۱۵۱۳): وثنا جعفر بن محمد بن عمر، ثنا أبو الحصين الوادعي۔ ثنا يحيى بن عبدالحميد، ثنا يحيى بن أبي زائدة ، ويزيد بن زريع عن داؤد بن أبي هند به .

اس میں بھی "نؤمن به ونتوكل عليه " کا اضافہ ہے مگر یہ سند بھی قابل اعتماد نہیں ہے۔

یحییٰ بن عبدالحمید: یہ الحماني ہے جو متکلم فیہ ہے۔ جوزجانی نے " احوال الرجال "(ترجمة ۱۱۵) میں کہا ہے: ساقط متلون ، ترك حديثه فلا ينبعث.

بخاری نے ''تاریخ کبیر'' (۲۹۱/۸) میں کہا ہے: يتكلمون فيه رواه أحمد وابن نمير.

اور امام بخاری رحمہ اللہ نے "الضعفاء الصغير" میں فرمایا ہے: (ترجمۃ رقم ۳۹۸) يتكلمون فيه عن شريك وغيره، سكتوا عنه .

امام نسائی رحمہ اللہ نے ''الضعفاء والمتروکین'' میں فرمایا ہے: (رقم ۶۲۵) ضعیف، کوفی وقال عثمان بن سعيد : كان ابن الحماني شيخاً فيه غفلة، لم يكن يقدر أن يصون نفسه كما يفعل اصحاب الحديث. [الجرح والتعديل : ۹/ ۱۷۰]

امام ذہبی رحمہ اللہ نے ''میزان الاعتدال'' میں کہا ہے: (۳۹۲/۴) وثقه يحيى بن معين وغيره .

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: كان يكذب جهاراً. امام نسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ضعيف.

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "كان أحمد و علي يتكلمان فيه ."

محمد بن عبداللہ بن نمیر نے کہا ہے: ابن الحماني كذاب، وقال مرة: ثقة، وقال ابن عدى: يحيى مسند صالح، مزید دیکھیں: تهذيب التهذيب. (۱۱/ ۲۱٤)

جس راوی کا حال یہ ہو اس کے اضافے کو کیسے قبول کیا جا سکتا ہے؟

تنبیہ: ابونعیم نے "المستخرج" میں داؤد بن أبي ہند سے اس حدیث کو تین سندوں سے روایت کیا ہے، جیسا کہ مولانا ابوالأشبال نے بھی ذکر کیا ہے:

پہلی سند:

حدثنا محمد بن أحمد بن الحسن، ثنا بشر بن موسىٰ، ثنا إسماعيل ابن الخليل ثنا يحييٰ بن أبى زائدة ثنا داؤد بن أبى هند .

دوسری سند:

مذکورہ سند

تیسری سند:

ثنا أبوأحمد محمد بن أحمد، ثناعبدالله بن محمد شيرويه، ثنا إسحاق بن ابراهيم

،أنبا عبدالأعلى، ثناداؤد بن أبى هند.

ابونعیم نے اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد کہا ہے:

لفظ "جعفر" أتم، والسياق له،

ابونعیم نے یہ صراحت کر دی کہ حدیث کا جو انہوں نے سیاق ذکر کیا ہے یہ جعفر بن محمد بن عمرو کا سیاق ہے۔ ❶ جس کی سند میں ابن الحمانی ہے اور اسی سیاق میں یہ الفاظ (نؤمن به ......) ہیں۔

لہٰذا مولانا کا دوسری دو سندوں کو اس کی تائید کے لیے پیش کرنا بے معنی ہے بلکہ اس سے ان کی معرفت بعلوم الحدیث کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ کے بارے میں کبھی تو یہ کہہ دیں گے کہ "وہ عجمی النسل ہیں" اور کبھی یہ کہ "ان کی تحقیقات پر اعتماد کرنے والا ہمیشہ دھوکہ میں رہے گا۔" إنا لله وإنا إليه راجعون. (كبرت كلمة تخرج من أفواههم.)

ان کا دوسری دو سندوں کو یحییٰ الحمانی کی سند کے لیے شاہد کے طور پر ذکر کرنا، اس سے دو امور میں سے ایک امر لازم آتا ہے:

① وہ ابونعیم کی بات کو سمجھ نہیں سکے اور یہ کوئی بعید نہیں کیونکہ ہیں تو وہ خود بھی عجمی النسل۔

② اگر وہ ان کی بات کو سمجھے ہیں تو پھر انہوں نے قارئین کو دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے۔

مذکورہ الفاظ "نؤمن به ونتوكل عليه." یزید بن زریع سے ایک دوسرے طریق میں بھی ہیں اور یہ طریق محمد بن عبداللہ الرقاشی کا ہے اور اس طریق سے اسے امام بیہقی نے "دلائل النبوة" (۲/۲۲۵) میں روایت کیا ہے۔

اس رقاشی کے بارے میں علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے "الکاشف" میں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "تقریب" میں کہا ہے: صدوق يخطئ. حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مزید یہ بھی کہا ہے کہ: تغير حفظه لما سكن بغداد.

لہٰذا ایسے راوی کا اضافہ قابل قبول نہیں۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ یزید بن زریع سے بکر بن خلف ابوبشر کی روایت میں یہ اضافہ نہیں ہے اور ابوبشر ثقہ ہیں جیسا کہ ذہبی رحمہ اللہ نے "الکاشف" میں کہا ہے

---

❶ جعفر بن محمد بن عمرو کے ترجمہ میں مجھے نہیں ملا۔ اس سند "جعفر بن محمد بن عمرو عن أبي الحصين عن يحيى بن عبدالحميد" سے ابونعیم "المستخرج" میں اسی طرح "حلیۃ الاولیاء" میں بھی کئی روایات لائے ہیں۔ مثلاً دیکھیں: المستخرج (ج ۱/ رقم:۵۷۷، ج ۲/ ۸۶۹، ۸۹۷، ۹۶۱، ۹۶٤، ۹۸٤، ۱۰۰۳، ۱۰٤۰۔ "حلية الاولياء" (۱/ ۹۸، ۱۰٤، ۲۵۱) مواضع اخرى كثيرة.

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے انہیں صدوق کہا ہے۔

یہ الفاظ اس حدیث میں ثابت نہیں۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ داؤد بن أبی ہند سے اس کے جو دوسرے طرق ہیں ان میں یہ اضافہ نہیں ہے اور وہ درج ذیل ہیں:

1 عبد الأعلی بن عبد الأعلی عن داؤد بن أبی هند به .

أخرجه مسلم (٦/ ١٥٧، كتاب الجمعة) وابن حبان (٨/ ١٨٧) رقم ٦٥٣٤. وأبو نعيم فی "المستخرج" (٢/ ٤٥٦/ ١٩٥٥) وابن منده فی "الإيمان" (١/ ١٣٢/٢٧٦) والبيهقی فی "السنن" (٣/ ٢١٤) و "الدلائل" (٢/ ٢٢٣- ٢٢٤) من طرق عن عبدالأعلیٰ به .

2 حفص بن غياث ، أخرجه احمد (١/ ٣٠٢) اور اس کی سند صحیح مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔

3 خالد بن عبدالله الواسطی ، أخرجه الطبرانی فی "الكبير" (٨/ ٣٦٣/ ٨١٤٧) وابن مندة فی "الايمان" (١/ ٢٧٣/ ١٣١)

قفال شاشی نے "دلائل النبوة" میں جیسا کہ قوام السنۃ إسماعیل بن محمد اصفہانی نے "دلائل النبوۃ" میں ذکر کیا ہے۔ اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے "التاريخ الكبير" (۴/ ۲۴۱) میں خالد بن عبداللہ سے دو سندوں سے معلق ذکر کیا ہے اور انہوں نے تفصیلی قصہ ذکر کرنے کی بجائے اس کی طرف اشارہ ہی کیا ہے۔

4 يحیٰ بن زكريا بن أبی زائدة، أخرجه من طريقه أحمد (١/ ٣٥٠) والنسائی (٦/ ٨٩- ٩٠) وأبو نعيم فی "المستخرج" (٢/ ٤٥٦/ ١٩٥٥)

وابن أبی زائدة أيضاً من رجال الستة، وهو ثقة متقن كما فی "التقريب"۔

5 صالح بن عمرو وهوالواسطی۔ ان کے طریق سے اسے لالکائی نے "شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة" میں ذکر کیا ہے اور صالح صحیح مسلم کے راویوں میں سے ہیں۔ وهوثقة كما قال الذهبی فی "الكاشف" والحافظ فی "التقريب" .

6 مسلمة بن محمد الثقفی ، أخرجه من طريقه ابن مندة فی "الإيمان". (١/ ٢٨٣/ ١٣١)

اس ثقفی میں کلام ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے "الکاشف" میں کہا ہے:

ضعّف، وقال الحافظ فی "التقريب" : لين الحديث.

اس حدیث میں "نؤمن به ونتوكل عليه" کی زیادتی ثابت نہ ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ عمرو بن سعید ثقفی سے داؤد بن أبی ہند کی طرح، عبداللہ بن عون اور یونس بن یزید نے بھی یہ روایت ذکر کی ہے اور ان دونوں کی سند میں مذکورہ زیادتی نہیں۔

أخرجه الطبراني في "الكبير" (٨/ ٣٦٤/ ٨١٤٨) بإسناد جيد عن ابن عون ويونس عن عمرو بن سعيدبه .

ابن عون سے مراد عبدالله بن عون ابوعون البصری ہیں جو کتب ستہ کے راویوں سے ہیں۔

قال الذهبي عنه في "الكاشف": احدالأعلام وقال الحافظ: ثقة ثبت فاضل .

یونس سے مراد ابن عبیدالبصری ہیں۔ قال الذهبي: من العلماء العاملين الأثبات، وقال الحافظ: ثقة ثبت فاضل ورع .

ابونعیم نے "المعرفة" (ج ۴/ رقم ۱۵۱۳) میں ابن عون اور یونس کی روایت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ابونعیم نے الحمانی عن داؤد کے طریق سے حدیث ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے:

رواه ابن عون و يونس بن عبيدالله عن عمرو بن سعيد نحوه .

ضماد کے قصے والی یہ حدیث ایک دوسری سند سے بھی مروی ہے۔ اسے ابونعیم نے "دلائل النبوة" (ص ۱۸۸۔ ۱۸۹) میں محمد بن عمر الواقدی کے طریق سے روایت کیا ہے۔

قال: حدثني محمد ابن سليط عن ابيه عن عبدالرحمن العدوى، قال: قال ضماد: قدمت مكة معتمراً ......وفيه: "الحمد لله أحمده وأستعينه وأومن به وأتوكل عليه، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلاهادى له وأشهد"

مگر یہ سند انتہائی ضعیف ہے۔

عبدالرحمٰن العدوی یہ عبدالرحمٰن بن زید ہے جو ضعیف ہے اور اتباع التابعین میں سے ہے۔ لہٰذا اس کی یہ روایت معضل ہے، نیز اس میں واقدی ہے جو متروک و متہم ہے، محمد بن سلیط اور اس کے باپ سلیط کے حالات (ترجمہ) تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ الحارث کے حوالے سے ابوہریرۃ و ابن عباس رضی اللہ عنہم کی حدیث قلت: یہ ایک بہت طویل حدیث ہے، اس میں ہے کہ:

" ثم خطب فقال: الحمدلله أحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه، ونشهد أن لاإله إلا الله وحده لاشريك له وأن محمداً عبده ورسوله، ونعوذبالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له" ومن يضلل فلا هادى له، أخرجه الحارث بن أبى أسامة فى "مسنده" (رقم ٢٠٥ من بغية الباحث) وكما فى "المطالب العالية" (١/ ٢٩٣/ ٧٤١) ❶

اس کی سند یوں ہے۔

قال الحارث: حدثنا داؤد بن المحبر ثناميسرة بن عبدالله عن أبى عائشة، السعدى عن يزيد بن عمر عن أبى سلمة بن عبدالرحمن عن أبى هريرة وابن عباس .

یہ حدیث موضوع ہے۔''حافظ ہیثمی رحمہ اللہ نے "بغية الباحث" میں اس کو ذکر کرنے کے بعد کہا ہے:

یہ حدیث موضوع ہے، اگرچہ اس کا بعض اس سند کے علاوہ دیگر حسن احادیث میں ہے۔ داؤد بن محبر کذاب راوی ہے۔''

اور اسے ذکر کرنے سے پہلے یوں باب باندھا ہے۔

"باب فى خطبة قد كذبها داؤد بن المحبر على رسول الله صلى الله عليه وسلم" سیوطی نے اس حدیث کو "اللآلى المصنوعة" (٢/ ٣٦١- ٣٧٣) میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے:

" قال الحافظ ابن حجر فى "المطالب العالية" : هذالحديث بطوله موضوع على رسول الله صلى الله عليه وسلم والمتهم به ميسرة بن عبدربه لابورك به، اه والله أعلم ."

قلت: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس حدیث کے مختلف اجزاء کو مختلف ابواب میں ذکر کیا ہے اور اس کی سند پر کلام کیا ہے۔ سیوطی نے ان کا جو کلام نقل کیا ہے وہ ''المطالب'' (۳/۱۳۴/۲۶۰۴) میں ہے اور ایک دوسرے مقام (۳/ ۳۹۷/ ۳۲۶۸) پر اس کا ایک جزء ذکر کیا ہے اور کہا ہے: "داؤد وشيخه معروفان بالوضع" اور بعض مقامات پر یوں کہا ہے: "هذا موضوع، اختلقه ميسرة ابن عبد ربه، فقبحه الله فيما افترى" ملاحظہ ہو (١/ ١٣٥/ ٢٥٤، وأيضاً ٢/٢٦٦/ ١٨٦٨)

قلت: ابوسلمۃ بن عبدالرحمٰن سے اس کی ایک دوسری سند بھی ہے اور یہ عمر بن عبدالعزیز کی سند ہے۔ اس سند سے اسے ابن الجوزی نے "الموضوعات" (٣/ ٤٤٥/ ١٦٧٦ نسخة محققه) میں صرف ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

---

❶ حبیب الرحمٰن اعظمی کی تحقیق سے '' مطالب '' کا جو نسخہ چھپا تھا وہ بغیر اسانید کے تھا۔ بعد میں '' دارالوطن '' الریاض سے یہ کتاب '' ابی بلال غنیم اور ابی تمیم یاسر کی تحقیق سے اسانید کے ساتھ چھپی۔

سے روایت کیا ہے۔ یعنی ان کے ساتھ ابن عباس کا ذکر نہیں۔

اس میں ہے "فقام فقال: الحمدلله نحمده ونستعينه و نؤمن به" پھر طویل کلام ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

اس سند سے بھی یہ حدیث موضوع ہے، ابن الجوزی نے اسے "موضوع" کہا ہے اور سیوطی نے "اللآلی المصنوعة" (۳۶۱/۲) میں ان کی موافقت کی ہے۔ تفصیل کے لیے مذکورہ دونوں کتابوں کو دیکھا جائے۔

تاریخ بغداد (۴۴۱/۱۴) میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی حدیث میں بھی "أؤمن به وأتوكل عليه" ہے۔ مگر اس کی سند میں عمرو بن شیمر ہے جو کذاب اور وضاع ہے اور اس سے نیچے والے دو راوی محل نظر ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے "الأم" (۶/ ۳۴۶) اور "مسند" (ص ٦٧) میں اور شافعی سے بیہقی نے "معرفة السنن والآثار" (٢/ ٤٩٦) میں کریب مولی ابن عباس کی سند سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے:

((ان النبی ﷺ خطب يوما فقال: ((إن الحمدلله نستعينه و نستغفره [ونستهديه ونستنصره] ونعوذ بالله من شرور أنفسنا......))

اس میں "نستهديه ونستنصر" کا اضافہ ہے مگر "نؤمن به ونتوكل عليه" نہیں ہے۔ البتہ یہ سند بھی انتہائی گھٹیا درجے کی ہے۔ اس میں إبراهيم بن محمد بن أبی يحییٰ الأسلمی ہے جو متروك بلکہ متهم ہے۔

ایک اور روایت ہے جس میں صرف " أومن به" کے الفاظ ہیں۔ اس روایت کو ابن جریر نے اپنی "تاریخ" (۷/۲) میں سعيد بن عبدالرحمن الجمحي سے روایت کیا ہے کہ انہیں نبی اکرم ﷺ کے اس خطبہ کے الفاظ پہنچے ہیں جو آپ نے مدینہ منورہ میں سب سے پہلے بنو سالم بن عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ کے ہاں ارشاد فرمایا: وہ الفاظ یہ ہیں۔

((الحمدلله أحمد وأستعينه وأستغفره وأستهديه وأومن به ولا أكفره الخ))

اسے ابن کثیر نے "البداية والنهاية" (۳/ ۲۱۲) میں بھی ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ابن جریر نے اسے اسی طرح ذکر کیا ہے اور اس کی سند مرسل ہے۔

میں کہتا ہوں بلکہ یہ معضل ہے (جس میں ایک ہی جگہ سے کم از کم دو راوی ساقط ہیں) کیونکہ جمحی کا شمار تبع تابعین میں ہوتا ہے اور وہ بغداد کے قاضی تھے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ:

"صدوق ، له أوهام، من الثامنة ."

اور طبقہ ثامنہ سے مراد تبع تابعین کا درمیانہ طبقہ ہے۔

خلاصہ:

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ کسی معتبر اور قابل اعتماد سند سے "نؤمن به ونتوكل عليه" کے الفاظ ثابت نہیں ہیں۔ ان الفاظ کا ذکر ضماد ازدی کے قصے والی حدیث میں، اسی طرح ابن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی طویل حدیث میں اور سعید بن عبدالرحمٰن الجمحی کی مفصل روایت میں ہے۔

- ضماد ازدی کے قصے والی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عبدالرحمٰن بن زید العدوی سے مروی ہے۔
- ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کی جن بعض روایات میں یہ الفاظ ہیں وہ صحیح نہیں ہیں، جب کہ صحیح روایات میں ان کا ذکر نہیں ہے۔
- ابن عباس و ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی طویل حدیث موضوع ہے اور
- سعید بن عبدالرحمٰن جمحی کی روایت معضل ہونے کے ساتھ ساتھ واقدی کی وجہ سے انتہائی ضعیف بھی ہے۔
- جابر رضی اللہ عنہ والی حدیث کی سند انتہائی گھٹیا درجے کی ہے بلکہ اس سند سے وہ بھی موضوع ہے۔

ب: (من يضلله)

"نؤمن به ونتوكل عليه" پر کلام کے بعد اب "يضلله" میں ضمیر "ہ" کے اضافے کی طرف آتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ یہ اضافہ اس میں ثابت ہے یا نہیں؟

یہ اضافہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی ''خطبۂ جمعہ'' والی حدیث میں ''نسائی'' کے ہاں، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ''خطبۃ الحاجۃ'' والی حدیث میں ابن أبی شیبہ اور ابن سنی کے ہاں اور عبدالرحمٰن بن زید العدوی کی ضماد ازدی کے قصے والی معضل حدیث میں ہے۔ مگر یہ اضافہ ان تینوں احادیث میں سے کسی میں بھی ثابت نہیں۔ اب اس کی تفصیل ملاحظہ کریں۔

ا۔ حدیث جابر رضی اللہ عنہ:

اس میں نسائی کے ہاں "ومن يضلله" ہے جب کہ میرے نزدیک یہ اضافہ کسی ناسخ کی غلطی کی وجہ سے ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

قال النسائی(۳/ ۱۸۸): أخبرنا عتبة بن عبدالله قال: أنبأنا ابن المبارك عن سفيان عن جعفر بن محمد عن أبيه عن جابر بن عبدالله قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول فی خطبته، يحمد الله ويثنی عليه بما هوأ هله ثم يقول: ((من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادی له ....))

یہ اس حدیث کی نسائی کے ہاں سند اور متن ہے، اس حدیث کو سفیان سے عبداللہ بن مبارک اور وکیع نے روایت کیا ہے۔

امام نسائی کے ہاں عبداللہ بن مبارک سے اس حدیث کو عتبۃ بن عبداللہ نے روایت کیا ہے اور یہ ابو عبداللہ مروزی ہیں۔امام نسائی نے ان کی توثیق کی ہے اور حافظ ابن حجر نے انہیں ''صدوق'' کہا ہے۔جیسے یہ امام نسائی کے استاذ ہیں ویسے ہی امام ابن خزیمۃ کے بھی استاذ ہیں۔اس حدیث کو انہوں نے بھی اپنی ''صحیح'' (صحیح ابن خزیمۃ) (۱۷۸۵) میں عتبۃ بن عبداللہ ہی سے روایت کیا ہے اور ان کے یہاں "یضلل" ہے یعنی لفظ ''ہ'' کا اضافہ نہیں ہے۔

اسی طرح ابونعیم نے ''حلیۃ الاولیاء'' (۱۸۹/۳) میں بھی اس حدیث کو عتبۃ بن عبداللہ کے طریق سے ابن مبارک سے روایت کیا ہے اور ان کے ہاں بھی ضمیر کا اضافہ نہیں اور ان کے ہاں "یضلل الله" ہے یعنی "یضلل" کی بجائے ، نیز جس سند سے یہ حدیث ''مجتبیٰ نسائی'' میں ہے بعینہ اس سند سے نسائی نے اسے ''السنن الکبریٰ'' (۵۸۹۲/۴۴۹/۳) میں بھی روایت کیا ہے اور اس میں "یضلل" ہے "یضلله" نہیں ہے۔

اس حدیث کو عبداللہ بن مبارک سے حبان بن موسیٰ نے بھی روایت کیا ہے اور اس طریق میں بھی صرف "یضلل" ہے ''ہ'' کا اضافہ نہیں ہے۔

حبان بن موسیٰ کے طریق سے اسے ''الآجری'' نے ''الشریعۃ'' (ص ۴۵ ۔ ۴۶، ۱۹۶، تحقیق محمد الفقی، ج ۱/ص ۳۹۸ ج ۸۴، ج ۲/ص ۸۲۵، ج ۴۰۸ تحقیق الدکتور عبداللہ الدمیجی میں اور بیہقی نے ''الأسماء والصفات'' (حدیث ۱۳۷ تحقیق عبداللہ الحاشدی) اور ''الاعتقاد'' (ص ۱۸۴۔ ۱۸۵) میں روایت کیا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نسائی کے ہاں "یضلله" میں ''ہ'' کا جو اضافہ ہے یہ کسی ناسخ کی غلطی یا وہم کی بناپر ہوا ہے۔

اس پر مستزاد یہ کہ اس حدیث کو سفیان ثوری سے ابن المبارک کی طرح وکیع نے بھی روایت کیا ہے اور

ان کے طریق سے اس حدیث کو احمد (۳/ ۳۷۱) مسلم (۱۵۶/۲) ابونعیم نے "المستخرج علی صحیح مسلم" (۲/ ٤٥٥/ ۱۹٥۳) میں، ابن أبي عاصم نے "السنة" (رقم ۲٤، ۲٥۹) میں اور بیہقی نے "السنن" (۳/ ۲۱٤) اور "الأسماء والصفات" (رقم ۱۳۷) میں روایت کیا ہے اور اس طریق میں بھی "یضلله" نہیں بلکہ "یضلل" ہی ہے۔

اس حدیث کو خطیب بغدادی نے ''تاریخ بغداد'' (۱۴/ ۴۴۰۔ ۴۴۱) میں من طریق عمرو ابن شمر عن أبي جعفر محمد بن علی عن علی بن الحسین عن جابر رضی الله عنه روایت کیا ہے۔ گو یہ سند عمرو بن شمر کی وجہ سے گھٹیا درجے کی ہے لیکن اس میں بھی "یضلل" ہی ہے۔ "یضلله" نہیں۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ مجتبیٰ میں "یضلله" میں ''ہ'' کا اضافہ ناسخ کا وہم یا غلطی ہے۔

۲۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث:

یہ حدیث ''خطبۃ الحاجۃ'' والی حدیث ہے۔ اس کی بعض روایات میں "یضلله" ہے یعنی ''ہ'' ضمیر کا اضافہ ہے۔ مگر یہ اضافہ بھی کسی ناسخ یا بعض رواۃ سے وہم کی بنا پر ہوا ہے۔ اب ذرا تفصیل ملاحظہ کریں۔ یہ اضافہ دو روایتوں میں ہے جن کی تفصیل یہ ہے۔

پہلی روایت:

" قال ابن أبي شيبة في "مصنفه".(٤/ ٣٤/ ١٧٥٠٨): ناحميد بن عبدالرحمن عن المسعودی ، عن أبي اسحاق ، عن أبي الأحوص، عن عبدالله قال: علمنا رسول الله صلى الله عليه وسلم خطبة الصلاة وخطبة الحاجة، فأماخطبة الصلاة فا لتشهد ، وأما خطبة الحاجةقال: الحمدلله ...... فذكر الخطبة وفيه : ((ومن يضلله .))

اس حدیث میں "یضلله" ہے جب کہ بعینہٖ اس سند سے اس حدیث کو ابن أبي شیبہ نے اپنی ''سند'' (۱/ ۲۲۹/ ۳۴۰) میں بھی روایت کیا ہے اور ''مسند'' میں "یضلل" ہے "یضلله" نہیں اور بعینہٖ اس سند سے اس حدیث کو ابن أبي شیبۃ سے ابن أبي عاصم نے "السنة" (۲٥٦) میں روایت کیا ہے۔

قال: ثنا أبوبكر ، ثنا حميد بن عبدالرحمن عن المسعودی عن أبي إسحاق عن أبي الأحوص عن عبدالله عن النبي صلى الله عليه وسلم مثله،

''مثلہ'' سے ابن أبي عاصم کی مراد مثل حدیث یزید بن زریع عن المسعودی " ہے اور اس طریق سے

ابن أبي عاصم نے اسے اس سے پہلے روایت کیا ہے۔ (نمبر ۴۵۵) اور الفاظ کے لیے اسی کی طرف إحالہ کیا ہے اور اس روایت میں "یضلل" ہے۔"یضلله" نہیں۔

أخرجه النسائى فى العمل: (٤٨٩) والجمعة، (٦٠) من طريق يزيد بن زريع، والطحاوى فى المشكل (١/٣-٤)والشاشى فى "مسنده" (٧٠٩) من طريق عبدالرحمن بن زياد، والطبرانى فى "الدعاء".(٩٣٢) من طريق آدم بن أبي أياس، والبهيقى فى "السنن" (٣/ ٢١٤-٢١٥) من طريق على بن قادم الخزاعى أربعتهم عن المسعودى به .

مذکورہ سب راویوں نے مسعودی سے روایت کرتے ہوئے."یضلل" ہی کہا ہے "یضلله" نہیں، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مصنف ابن أبي شیبہ میں جو"یضلله" ہے وہ کسی راوی یا ناسخ کو وہم ہوا ہے۔

نیز اس کے ابو اسحاق سے مسعودی کے علاوہ دوسرے طرق بھی ہیں اور ان میں بھی "یضلل" ہے "یضلله" نہیں۔ یہ طرق درج ذیل ہیں:

① الأعمش عن أبى اسحاق عن أبى الأحوص عن ابن مسعودأخرجه الترمذى (١١٠٥) والنسائى (٦/ ٨٩- المجتبى) و "العمل" (٤٨٨) وابن الجارود (٦٧٩) والطرابى فى "الكبير" (١٠/ ١٢١/ ١٠٠٧٩) و "الدعاء" (٩٣٢) والآجرى فى "الشريعة" (ص ١٩٧ تحقيق الفقى، ج ٢/ ص ٨٢٧ ج ٤١٠ تحقيق د/ عبدالله) .

② يونس بن أبى اسحاق عن أبى إسحاق به- أخرجه ابن ماجه(١٨٩٢) والطبرانى فى "الدعاء" (٩٣٢) .

③ أشعث بن سوار عن أبى إسحاق به، أخرجه الطبرانى فى "الدعاء" (٩٣٢).

④ معمر بن راشد عنه أخرجه عبدالرزاق (١١/ ١٦٢/ ٢٠٢٠٦) ومن طريقه البغوى فى "شرح السنة" (٩/٤٩/٢٢٦٨).

⑤ زهير بن معاوية عنه، أخرجه النسائى فى "العمل" (٤٩٠) .

معمر اور زہیر کے طریق سے یہ حدیث موقوف ہے۔

دوسری روایت:

ابواسحاق نے جس طرح اس حدیث کو ابوالأحوص کے واسطے سے ابن مسعود سے روایت کیا ہے، اسی طرح انہوں نے اس کو ابوعبیدۃ بن عبداللہ بن مسعود کے واسطے سے بھی روایت کیا ہے۔ اسی طرح سے ابواسحاق سے اس کو ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ اب تفصیل ملاحظہ کریں۔

1. شُعبة بن الحجاج عن أبی إسحاق عن أبی عبیدة عن ابن مسعود . قال ابن السنی فی "عمل الیوم واللیلة" (۵۹۹) : أخبرنا أبو خلیفة، حدثنا أبو الولید الطیالسی ومحمد بن کثیر قالا: حدثنا شعبة عن أبی إسحاق قال: سمعت أبا عبیدة عن عبدالله رضی الله عنه قال: علمنا رسول الله صلی الله علیه وسلم خطبة الحاجة فساق الحدیث: اس حدیث میں "یضلله" ہے۔

اس میں "یضلله" میں ضمیر کا اضافہ تو ہے مگر ابن السنی کے یہاں یہ اضافہ بھی میرے نزدیک کسی ناسخ کی غلطی سے ہوا ہے۔ اگر اسے ذکر کرنے میں ابن السنی کے شیخ ابوخلیفۃ جن کا نام "الفضل بن حباب" ہے کو وہم نہیں ہوا تو بعینہ اس سند سے اس حدیث کو طبرانی نے بھی ''دعاء'' (۹۳۱) میں روایت کیا ہے۔ ابوخلیفۃ جیسے ابن السنی کے شیخ ہیں طبرانی کے بھی شیخ ہیں۔ لیکن انہوں نے شعبہ سے اسے حماد بن سلمۃ اور حفص بن عمر الحوضی کی سند سے بھی روایت کیا ہے اور آخر میں کہا ہے: واللفظ لحدیث حماد عن شعبة اور حماد کی حدیث میں "یضلل" ہے۔ ابوخلیفہ کے لفظ کا چونکہ انہوں نے ذکر نہیں کیا لہٰذا ممکن ہے کہ ان کی روایت میں "یضلله" ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ صرف "یضلل" ہو اور یہ احتمال زیادہ قوی ہے کیونکہ اگر طبرانی کے ہاں ابوخلیفہ کی روایت میں "یضلله" ہوتا تو وہ اس کی طرف اشارہ کر دیتے۔ واللہ اعلم.

اس حدیث کو ابوالولید الطیالسی کی سند سے دارمی (۲/۱۴۲) نے بھی اور محمد بن کثیر یہ العبدی ابوعبداللہ البصری ہیں۔ کی سند سے طحاوی نے بھی "مشکل الآثار" (۱/ ٤) میں روایت کیا ہے اور ان کے ہاں "یضلل" ہے ''ہ'' کا اضافہ نہیں ہے۔

نیز شعبہ سے اس کی دوسری سندیں بھی ہیں اور ان میں بھی صرف "یضلل" ہے۔ "یضلله" نہیں اور وہ سندیں درج ذیل ہیں:

1. محمد بن جعفر عن أبی إسحاق به. أخرجه أحمد (۱/ ۳۹۲- ۳۹۳) والنسائی فی

"المجتبى" (٣/ ١٠٤ـ١٠٥) و "العمل" (٤٩١) وفي كتاب الجمعة أيضاً (٦١)

② حجاج بن منهال عنه. أخرجه الدارمي (٢/ ١٤٢)

③ أبوداؤد الطيالسي عنه. أخرجه في مسنده، (١/ ٣٠٦ـ منحة المعبود) ومن طريقه البيهقي، (٧/ ١٤٦)

④ يحيى بن أبي بكير عنه .أخرجه أبو يعلى (٥٢٥٧)

⑤ بشر بن عمر الزهراني عنه.أخرجه الطحاوي في المشكل (١/ ٤)

⑥ حماد بن سلمة عنه .أخرجه الطبراني في "الكبير" (١٠/ رقم ـ ١٠٠٠٨) و"الأوسط" (٢٤١٤) وفي "الدعاء" أيضاً (٩٣١) والشاشي في "مسنده" (٩١٧)

⑦ حفص بن عمر الحوضي عنه . أخرجه الطبراني في "الدعاء"

⑧ آدم بن أبي إياس عنه.أخرجه الحاكم (٢/ ١٨٢ـ ١٨٣)

عفان بن مسلم عنه، أخرجه أحمد (١/ ٣٩٣) والشاشي في "مسنده" (٩١٨) وأبونعيم في "الحلية" (٧/ ١٧٨ـ ١٧٩)

⑩ بشر بن عمر الزهراني عنه ، أخرجه الطحاوي في "مشكل الآثار" (١/ ٤)

شعبہ نے الزہرانی اور عفان بن مسلم کی روایت میں ''ابوعبیدہ'' کے ساتھ ''ابوالأحوص'' کا ذکر بھی کیا ہے۔ اسی طرح اسرائیل نے بھی دونوں کو جمع کر دیا ہے اور اسرائیل کی روایت عنقریب آ رہی ہے۔

② إسماعيل بن حماد عن أبي اسحاق .أخرجه النسائي في "العمل" (٤٩٢) والطبراني في "الأوسط" (٧٨٧٢) و "الدعاء" (٩٣٣) وأبويعلى (٧٢٢١) واللالكائي في "شرح أصول الاعتقاد" (٤/ ٦٥٨/ ١١٥٥)

③ سفيان الثوري عنه ، أخرجه عبدالرزاق (٦/ ١٨٧/ ١٠٤٤٩) وأحمد (١/ ٤٣٢) وأبوداؤد (٢١١٨) وأبو يعلى (٥٢٣٣، ٥٢٥٧) والبيهقي (٧/ ١٤٦) من طرق عن الثوري عن أبي اسحاق عن أبي عبيدة عن عبدالله موقوفاً عليه .

ثوری نے اس حدیث کو ابواسحاق سے موقوفاً روایت کیا ہے، اور عبدالرزاق کے ہاں ثوری کی طرح معمر نے بھی اسے موقوفاً روایت کیا ہے۔

آجری نے "الشریعة" (۱۹۶۔ ۱۹۷) میں اور شاشی نے ''مسند'' (۷۱۱) میں اسے عبداللہ بن موسیٰ کے طریق سے ثوری سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔

شاشی کے ہاں ''أبو عبیدة'' کی بجائے " أبو الأحوص" ہے اور یہ بھی درست ہے کیونکہ ابو اسحاق نے اس حدیث کو دونوں کے واسطے سے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔

ابو اسحاق سے ان کے پوتے اسرائیل بن یونس بن أبی اسحاق نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور انہوں نے سند میں دونوں ابوعبیدة اور ابوالأحوص کا ذکر کیا ہے۔

اسرائیل کی سند سے اس کو احمد (۱/۴۳۲)، ابو داؤد (۲۱۱۸)، نسائی نے ''عمل'' (۴۹۳) میں، ابو یعلی (۵۲۳۴)، شاشی نے ''مسند'' (۷۱۰، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶) میں اور بیہقی (۷/۱۴۶) نے روایت کیا ہے۔

اسرائیل کی طرح بعض روایات میں شعبہ نے بھی دونوں ہی کا ذکر کیا ہے۔

خلاصہ

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ابواسحاق سے اس حدیث کے جتنے بھی طرق ہیں، ان میں سے سوائے مسعودی کے طریق کے کسی دوسرے طریق میں "یضلله" نہیں ہے اور مسعودی کے طریق میں "یضلله" میں ضمیر کا جو اضافہ ہے اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس کا ذکر گزر چکا۔

اسی طرح شعبہ سے اس حدیث کے جتنے بھی طرق ہیں، ان میں سے سوائے ابوخلیفة الفضل بن حباب کے طریق کے کسی دوسرے طریق میں ''ہ'' کا اضافہ نہیں اور وہ دس طرق ہیں جیسا کہ تفصیل سے ذکر ہوا۔ لہٰذا اس طریق میں اضافہ یا تو کسی راوی یا کسی ناسخ سے سہواً ہوا ہے۔ نیز ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کی دو اور سندیں بھی ہے اور ان میں بھی "یضلل" ہے، "یضلله" نہیں۔

ان میں سے پہلی سند ابوعیاض کی ہے اور اس سند سے اس حدیث کو ابوداؤد نے ''الجمعة'' اور ''النکاح'' (۱۰۹۷، ۲۱۱۹) ابن أبی عاصم نے ''السنة'' (۲۵۸) میں، طبرانی نے ''کبیر'' (۱۰/۲۶۱/۱۰۴۹۹) ''أوسط'' (۲۵۳۰) اور ''دعاء'' (۹۳۴) میں، شاشی نے ''مسند'' (۸۰۵، ۸۰۶) میں اور بیہقی (۳/۲۱۵، ۷/۱۴۶) نے روایت کیا ہے۔

اس سند میں ہے ((کان ﷺ إذا تشهد قال: الحمدلله، نستعینه ونستغفره، ونعوذبالله من شرور أنفسنا، من یهده الله فلا مضل له، ومن یضلل فلا هادی، وأشهد......الخ .

اور دوسری سند یہ ہے:

القاسم بن عبدالرحمن عن ابيه عن ابن مسعود أنه قال في خطبة النكاح: ((إن الحمدلله نحمده ...... ومن يضلل فلاهادى له، وأشهد .))

اس سند سے یہ موقوف ہے اور اسے قاضی ابو یوسف نے "کتاب الآثار" (۱۳۹) حدیث ۶۳۱ میں روایت کیا ہے۔

اس کی ابن مسعود سے ایک تیسری سند بھی ہے اور یہ ابو وائل شقیق بن سلمۃ کی سند ہے۔اس سند سے اسے بیہقی (۷/۱۴۶)۔ ابن مندہ نے ''توحید'' (۲/۱۲۴) میں اور شاشی نے ''مسند'' (رقم ۵۰۸) میں روایت کیا ہے، مگر اس روایت میں محل شاہد نہیں۔

اس خطبے کا ذکر بعض مرسل روایات میں بھی ہے اور ان میں بھی ''یضلل'' ہے ''یضللہ'' نہیں اور وہ ابوسلمۃ بن عبدالرحمٰن اور زہری کی روایات ہیں۔

① ...... أبو سلمة بن عبدالرحمن قال: كانت أول خطبة خطبها رسول الله ﷺ بالمدينة أن قام فيهم فحمد الله وأثنى عليه بما هو أهله ...... ثم خطب رسول الله ﷺ مرة أخرى فقال: ((إن الحمد لله أحمد و أستعينه ، نعوذ بالله من شرور أنفسنا وسيئات أعمالنا، من يهده الله فلامضل له، ومن يضلل فلا هادى له، وأشهد أن لا اله إلا الله...... .))

أخرجه البيهقى فى "الدلائل" (٢/ ٥٢٤-٥٢٥) وهناد فى "زهده" (رقم ٥٠٢)

وذكره ابن إسحاق بلاغا عن أبى سلمة بن عبدالرحمن، أنظر "السيرة النبوية" لابن هشام (١/ ٥٠١)

② ...... مرسل الزهرى، أخرجه أبوداؤد فى "سننه" (١٠٩٨) و فى "المراسيل" (ص ٩٣) والبيهقى (٣/ ٢١٥) من طريق يونس أنه سال ابن شهاب عن تشهد رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم الجمعة فقال ابن شهاب: ((إن الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذبه من شرور أنفسنا، من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلل فلاهادى له، وأشهد أن لا إله إله الله .))

وأخرجه أبوداؤد أيضاً فى المراسيل "من طريق عقيل بن خالد عن الزهرى به .

ان دونوں مرسل روایتوں میں بھی "یضلل" ہے، "یضللہ" نہیں، اسی طرح بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ

کے خطبوں میں بھی "یضلل" ہی ہے۔ مثلاً الآجری نے ''الشریعۃ'' (۲۰۰۔۲۰۱) میں، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ''السنۃ'' (رقم ۷۶۵) میں، ابن بطۃ نے ''الإبانہ'' (۲/۱۳۰/۱۵۶۱ کتاب القدر) میں اور لالکائی نے ''شرح الاصول'' (۴/۶۵۹۔۶۶۰) میں عبداللہ بن الحارث بن نوفل سے روایت کی ہے کہ:

"خطبنا عمر بن الخطاب رضی الله عنه بالجابية والجاثليق مائل بين يديه والترجمان يترجم فقال عمر: من يهده الله فلامضل له ومن يضلل فلا هادى له "الحديث إلى آخره ."

اس کی سند میں عبدالاعلیٰ بن عبداللہ بن عامر البصری ہے جو اس اثر کا عبداللہ بن حارث سے راوی ہے۔ اس سے ایک جماعت نے روایت کی ہے اور ابن حبان نے اسے ''ثقات'' میں ذکر کیا ہے۔ لہٰذا اس سند کی تحسین ممکن ہے۔

عبدالرزاق نے ''مصنف'' (۶/۱۸۸/۱۰۴۵۰) میں مغیرۃ بن مقسم کے طریق سے ابراہیم نخعی سے روایت کی ہے کہ:

"كانوا يحبون أن يتشهدوا إذا خطب الرجل على نفسه أو على غيره، والخصمان إذا اختصما: إن الحمد لله نستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور أنفسنا، من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلل فلاهادى له وأشهد...... ."

"كانوا يحبون" سے ابراہیم نخعی کی مراد اصحاب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یعنی مسروق، علقمۃ اور ابووائل وغیرہ ہیں۔ ❶ جیسا کہ حافظ عراقی وغیرہ نے کہا ہے۔

اس اثر کے سب راوی ثقہ ہیں لیکن مغیرۃ بن مقسم ابراہیم نخعی سے تدلیس کرتے ہیں۔

ابونعیم نے ''حلیۃ الاولیاء'' (۵/۳۰۲) میں من طریق الولید بن مسلم روایت کی ہے۔

قال الوليد : قال عبدالله بن العلاء: سمعت عمر بن عبدالعزيز يخطب في الجامع بخطبة واحدة يرددها، يفتح بسبع كلمات: إن الحمد لله نحمده ونستعينه و نستغفره ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيآت أعملنا من يهده الله فلا مضل له

---

❶ شیخ البانی رحمہ اللہ کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ انھوں نے "تخریج الکلم الطیب" میں نخعی کے اثر "کانوا یکرھون التمائم کلھا" سے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم مراد لیے ہیں۔

ومن یضلل الله فلاھادی له، وأشھد ...... "

اس کی سند میں الولید بن مسلم کی تدلیس کا خدشہ نہ ہو تو وہ حسن درجے کی ہے۔

ان آثار کے بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ان میں بھی "یضلل" ہے "یضلله" نہیں۔

جن بعض روایات میں "یضلله" ہے تو ان میں ناسخ یا راوی کی غلطی کا قوی امکان ہے کیونکہ اس سے قبل "من یھده الله" ہے تو اس بنا پر ناسخ یا راوی کو "یضلله" کہنے میں مغالطہ ہوسکتا ہے۔

ج: لفظ "أشھد" پر بحث

مذکورہ احادیث میں سے بعض احادیث کی بعض روایات میں "أشھد" کی بجائے "نشھد" بالنون ہے اور وہ درج ذیل احادیث ہیں۔

① ......ابن عباس و ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کی طویل حدیث میں جو شروع میں مذکور ہے۔ "نشھد بالنون" ہے مگر یہ حدیث من گھڑت ہے جیسا کہ تفصیل سے ذکر ہوا۔

② ......عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی شقیق بن سلمۃ والی سند سے جو حدیث ہے جس کی تخریج گزشتہ سطور میں گزری۔ اس میں "مسند شاشی" میں "نشھد" ہے۔ اس کی سند یوں ہے۔

حدثنا ابن عفان العامری ناعبیدالله بن موسی أنا حریث بن أبی مطرعن واصل الأحدب عن شقیق بن سلمة عنه .

ابن عفان العامری یہ حسن بن علی بن عفان ہے۔ بعینہ اس سند سے اسے بیہقی (۷/ ۱۴۶) نے بھی روایت کیا ہے اور ان کے ہاں "أشھد" ہے۔

لیکن محقق نے حاشیہ میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ مفتی محمد سعید مدراسی کے نسخے میں "نشھد" ہے۔

عامری کی سند سے اس حدیث کو ابن مندہ نے بھی "التوحید" (۲/ ۱۴۴) میں روایت کیا ہے لیکن انہوں نے خطبے کے الفاظ ذکر نہیں کیے بلکہ خطبہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بیہقی کے ہاں "أشھد" کا ہونا اسی طرح اس حدیث کی ابن مسعود سے دیگر جو تین سندیں ہیں ان میں بھی "أشھد" ہی کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ کسی ناسخ یا راوی کی غلطی سے "نشھد" ہوگیا ہوگا۔

③ ......نبیط بن شریط رضی اللہ عنہ کی حدیث:

اس کو ابن سعد نے "طبقات" (۶/ ۳۰) میں روایت کیا ہے۔ جس سند سے ابن سعد نے اس کو روایت کیا

ہے اسی سند سے اسے بیہقی (۲۱۵/۳) نے بھی روایت کیا ہے اور بیہقی کے ہاں ''أشہد'' ہے، ''نشہد'' نہیں۔

۴......زہری رحمہ اللہ کی مرسل روایت:

اسے ابوداؤد نے ''مراسیل'' (ص۹۳) میں عقیل بن خالد کے طریق سے روایت کیا ہے۔ اس کو بیہقی رحمہ اللہ نے ''سنن، (۲۱۵/۳) میں یونس بن یزید کے طریق سے بھی زہری رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے اور اس طریق میں ''أشهد'' ہے ''نشهد'' نہیں۔

اس طریق سے اسے ابوداؤد نے ''سنن'' (۱۰۹۷) اور ''مراسیل'' میں بھی روایت کیا ہے مگر انہوں نے اس کے الفاظ ذکر نہیں کیے۔ سنن میں ابن مسعود کی حدیث جو ان سے ابوعیاض کے طریق سے ہے کی طرف اِحالہ کیا ہے اور ''مراسیل'' میں عقیل کی روایت کی طرف۔

خلاصہ

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ صحیح ''أشہد'' ہے ''نشہد'' نہیں۔ ابن عباس و ابوہریرہ رضی اللہ عنہما والی حدیث موضوع ہے۔ لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ والی حدیث میں شاشی کے ہاں اگر ''نشہد'' ہے تو بعینہٖ اسی سند میں بیہقی کے ہاں ''أشهد'' ہے۔ نیز ابن مسعود سے اس کی جو دیگر اسانید ہیں ان میں ''أشهد'' ہی ہے۔

اسی طرح حدیث عبط میں ابن سعد کے ہاں اگر ''نشهد'' ہے تو بیہقی کے ہاں اس میں ''أشهد'' ہے۔

اسی طرح زہری کی مرسل روایت میں عقیل کی روایت میں ''نشهد'' ہے تو یونس کی روایت میں ''أشهد'' ہے اور یہی روایت دوسری احادیث کے موافق ہے اور اس میں ناسخ یا راوی کی غلطی کا قوی امکان ہے کیونکہ اس سے پہلے تمام صیغے جمع متکلم کے ہیں۔

تعاقب از مولانا ابو الأشبال حفظہ اللہ......(۳)

خطبۂ مسنونہ کے الفاظ پر میری معروضات کا تفصیلی جواب نظر نواز ہوا۔ حضرت مدنی صاحب کا نقطۂ نظر سامنے آیا۔ اب میں بھی قدرے تفصیل سے لکھ رہا ہوں اگرچہ میں ہمیشہ سے اختصار پسند ہوں، طوالت سے پرہیز کرتا ہوں۔

اصل مسئلے پر گفتگو سے قبل ایک لطیفہ بیان کرتا ہوں جس کا تعلق میرے سابقہ مضمون سے ہے۔ الاعتصام شمارہ:۷ اص:۱۲ کا حاشیہ پڑھ لیجیے۔ میں نے ''ابن ماجہ'' کے مخطوطہ سے عکس لے کر چسپاں کیا تھا جسے ''صحیفہ اہل حدیث'' والے بھی پڑھنے سے قاصر رہے اور ''الاعتصام'' والے بھی۔ دراصل وہ جملہ عنوان باب ہے۔ " الحیف فی الوصیة"

اب اصل مسئلے پر گفتگو کرتے ہیں۔ حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب نے ابونعیم کے اس جملے " لفظ جعفر أتم والسیاق له" کا مفہوم یہ سمجھا اور بیان کیا ہے کہ دوسرے دونوں طریق میں جملہ "ونؤمن به و نتوکل علیه" نہیں ہے۔ میرے نزدیک بوجوہ یہ فہم صحیح نہیں۔ کیوں کہ اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے ابونعیم کے ان دونوں طریق کے متون ابونعیم ہی کی کسی کتاب سے تلاش کرکے پیش کرنا پڑیں گے، تبھی یہ دعویٰ صحیح ہوگا۔ بصورت دیگر یہ دعویٰ بے دلیل ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ جملہ " و نؤمن به و نتوکل علیه" ان تینوں طرق میں موجود ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ کتاب صحیح مسلم پر تخریج ہے جیسا کہ سب کو معلوم ہے اور امام مسلم نے اپنی تصنیف ''صحیح'' میں اوّل تا آخر غالباً یہ طریقہ اپنایا ہے۔ یعنی جب وہ ایک سے زائد اسناد کو یکجا بیان کرتے ہیں تو جب ان کے متون میں تقدیم و تاخیر یا مقدمات متن میں کمی بیشی یا بعض لفظوں میں تغیر پاتے ہیں تو ان کے متون میں سے اس طریق کے متن کو بیان کرتے ہیں جو باعتبار فہم اسہل (آسان تر) ہوتا ہے۔ اور پھر بیان سند کے وقت ہی یہ واضح کردیتے ہیں کہ یہ فلاں کا بیان کردہ لفظ ہے اور اگر کسی راوی نے اصل متن میں کوئی لفظ یا جملہ زیادہ یا کم کیا ہوتا ہے تو اس کو بھی بیان کردیتے ہیں۔ جیسا کہ ابتداء ہی میں ''کتاب الایمان'' کی سب

سے پہلی حدیث کو بیان کرتے ہوئے اوّل اسناد کے متن کو نہیں بیان کیا بلکہ اسناد ثانی کے متن کو بیان کیا اور آخر میں ان سندوں کو بیان کیا جن میں نقص وزیادہ پایا۔ اب اگر کوئی تتبع کرے اور سند اوّل کے متن پر مطلع ہو جائے تو شاید یہ عقدہ بہتر طریقے سے حل ہو جائے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''فتح الباری'' میں کسی مقام پر سند اوّل کے متن کا پتہ بتایا ہے کہ وہ ''کتاب الایمان'' (لابن مندہ) میں ہے۔ اب آپ ''کتاب الایمان'' لابن مندہ کی پانچویں حدیث سے مسلم کی پہلی حدیث کے متن کا مقابلہ کر لیجیے۔ ابونعیم نے مستخرج میں یہی طریقہ اپنایا ہے۔ آپ نے ابونعیم کے جس جملہ سے یہ سمجھا ہے کہ یہ جملہ "و نؤمن به و نتوكل عليه" بقیہ دونوں سندوں میں نہیں ہے یعنی "لفظ جعفر أتم والسياق له" اس کے معاً بعد ابونعیم فرماتے ہیں "زاد إسحاق الخ" معلوم ہوا کہ زیر بحث جملہ اگر صرف جعفر ہی کے طریق سے ثابت ہوتا تو اس کی وضاحت کر دیتے، اور جب اس کی وضاحت موجود نہیں تو پھر محض انشائی انداز میں یہ باور کرانا کہ یہ جملہ صرف جعفر ہی کے طریق سے ثابت ہے، میرے نزدیک ابونعیم کی طرف ایک ایسی بات کو منسوب کرنے کے مترادف ہے جس کا وہ قائل نہیں۔

یہاں بطور فائدہ یہ بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ شاید کسی کو ابوخیثمہ زہیر بن حرب جو مسلم کی ''کتاب الایمان'' کی پہلی سند میں واقع ہیں اور ان کی روایت بعض کتب حدیث میں مختصر مروی ہے، اس سے دھوکا نہ ہو جائے۔ علوم حدیث کے ماہرین پر یہ مخفی نہیں کہ ایک محدث ایک ہی حدیث کے متن کو مختلف مجالس میں بیان کرتے وقت حسب ضرورت اختصار وتطویل کو اپناتا ہے۔

آیے! صحیح بخاری کی پہلی حدیث کو لیجیے! امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو اپنے شیخ حمیدی سے روایت کیا ہے اور بہت ہی مختصر بیان کیا ہے۔ درآنحالیکہ یہ روایت ''مسند حمیدی'' میں طویل ہے۔ شارحین حدیث نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب ان کے اجتہاد پر مبنی ہے، حقیقت کا علم تو اللہ ہی کو ہے، کسی کے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے۔

فائدہ......:

ایک اور مزید بات اس حدیث کے متن سے متعلق علمائے کرام اور طلبا کے فائدے کے لیے بیان کر دیتا ہوں۔ اس متن کے لیے میں نے شیخ البانی رحمہ اللہ کی کتاب "ارواء الغليل"(۵۹/۱) کا انتخاب کیا ہے تاکہ کسی صاحب علم کو میری نافہمی پر کوئی شکایت نہ ہو۔

((اِنَّمَا الأعمال بالنیات، و إنما لکل امرئ ما نوی، فمن کانت ھجرته إلی اللّٰه و رسوله فهجرته إلی و رسوله ، و من کانت ھجرته إلی دنیا یصیبھا أو امرأة ینکحھا ، فھجرته إلی ما ھاجر الیه .))

اس حدیث کے لیے شیخ البانی رحمہ اللہ بطور احالہ فرماتے ہیں:

"اخرجه الشیخان واصحاب السنن الاربعه و ابن الجارود فی "المنتقیٰ" (٦٤) و أحمد (رقم ١٦٨ ، ٣٠٠) من حدیث عمر بن الخطاب رضی اللّٰه عنه مرفوعاً به "

مزید فرماتے ہیں:" و ھو اوّل حدیث فی صحیح البخاری وأورده فی مواطن أخری منه"

قال أبو الأشبال : "روایة البخاری فی ھذا الموضع مختصرة ."

اب اگر ان محولہ مقامات پر ایک غائر نظر ڈال کر دیکھا جائے تو کہیں بھی ان کتب میں اس سیاق کے ساتھ یہ حدیث موجود نہیں۔ بلکہ الفاظ میں اختلاف موجود ہے، تقدیم و تاخیر اور نقص وزیادہ موجود ہے۔ اس کے باوجود علمائے کرام اور محققین اسے صحیحین بالخصوص صحیح بخاری کی پہلی حدیث باور کراتے ہیں جیسا کہ البانی صاحب رحمہ اللہ نے بھی صراحتہً لکھا ہے۔ طلبائے حدیث یاد رکھیں کہ اس سیاق کے ساتھ یہ حدیث ''مسند حمیدی'' (۱/۱۶ حدیث: ۲۸ تحقیق حبیب الرحمٰن الأعظمی) میں موجود ہے۔

اس فائدے کے ذکر کے بعد پھر اصل مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ حافظ صاحب موصوف نے سند اوّل کے ایک راوی ''یحیٰی بن عبد الحمید الحمانی'' کے بارے میں کتب معتبرہ سے کلماتِ جرح کا انتخاب کرکے اسے مجروح قرار دیا ہے اور نتیجتاً اس کی روایت کو مردود کے حکم میں گویا داخل کردیا ہے۔ حالانکہ یہ راوی اتنا گیا گزرا نہیں جتنا باور کرایا گیا ہے۔ کیوں کہ شیخ البانی صاحب رحمہ اللہ نے بھی "سلسلة الاحادیث الصحیحة" میں اس کی روایت کو بطور شاہد و متابع قبول کیا ہے۔ اس وقت میرے سامنے''صحیحہ'' نہیں کہ مکتبہ سے دور بیٹھے ہوئے لکھ رہا ہوں ، البتہ اس وقت ''تھذیب الکمال'' کا وہ جزو میرے سامنے ہے جس میں یحیٰی الحمانی کا ترجمہ ہے۔ حافظ مزی نے اس راوی کے بارے میں سارے اقوال نقل کرنے کے بعد بطور فص الخاتم، امام بخاری و امام احمد کے شیخ اور علی بن المدینی کے زمیل خاص، جرح وتعدیل کے معتبر امام یحیٰی بن معین کا قول اس طرح نقل کیا ہے:

" و یحییٰ بن معین حسن الثناء علیه و علی أبیه ، وذکر أن الذی تکلم فیه من حسد و لم أرفی " مسنده" و أحادیثه احادیث مناکیر ، وأرجو أنه لا بأس به."

علم واصول حدیث سے متصف حافظ مدنی صاحب جیسے حضرات تو کتب جرح وتعدیل کے طریقہ بیان سے واقف ہیں، میں نے اپنی کم مائیگی سے جو سمجھا ہے اسے قلم بند کردیا اور اسی پر قائم ہوں۔

تنبیہ: حافظ ذہبی نے جو یہ کہا ہے کہ "الجرح مقدم و أحمد والدارمی بریئان من الحسد" اس قول کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔احمد اور دارمی نے جو کچھ اس کے بارے میں فرمایا ہے وہ دوسروں کی شہادت پر، اور ابن معین نے جو کچھ فرمایا وہ اپنی تحقیق و تجربہ سے، اور جب جرح مفسر یا غیر مفسر کا ثبوت ہی مشکوک ہو تو مقدم کیسے ہوا؟

حافظ صاحب نے یحییٰ بن سعید کے شیوخ میں داؤد بن أبی ہند کے عدم ذکر سے یہ استنباط کیا ہے کہ یہ سند منقطع ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کے ترجمے " سیر اعلام النبلاء" وغیرہ میں دیکھ لیے جائیں تو داؤد بن أبی ہند کے آخذین میں چند اسماء کے ذکر کے بعد "و خلف" کا اضافہ نظر آتا ہے۔ موصوف نے غالباً یہ سمجھ رکھا ہے کہ کتب جرح و تعدیل میں راوی ومروی عنہ کا استیعاب ہے حالانکہ ایسا نہیں اگر یہی بات ہوتی تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والوں کی وہ تعداد جو امام بخاری رحمہ اللہ نے بیان کی ہے اس کا تتبع کرکے بتایا جائے کہ یہ کن کتابوں میں موجود ہے؟ نیز یحییٰ بن سعید سے " إنما الاعمال" کے راویوں کی تعداد جو بیان کی گئی ہے وہ کس کتاب میں موجود ہے؟ علم جرح وتعدیل اور علوم حدیث سے مرصع و مالا مال شخص کے لیے تو یہ بیان کردینا آسان ہے، میرے جیسے کے بس کی بات نہیں۔

محولہ مضمون میں "الإستیعاب" سے ایک معلق قول نقل کرکے انقطاع کو ثابت کیا گیا ہے۔ اگر صاحبِ مضمون اس معلق قول کا پتہ بتاتے تو یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ یہ قول بأصول محدثین صحیح ہے یا نہیں؟ اور معلوم ہونے پر میں علم اصول حدیث ورجال کے کسی ماہر کو تلاش کرکے اس کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کروں گا، سردست اپنی سمجھ سے لکھتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ یحییٰ نے پہلے اس حدیث کو بواسطہ ابن اسحاق سنا ہو۔ پھر بدون واسطہ ابن أبی ہند سے سنا ہو۔ لہٰذا ان کو اختیار حاصل ہے کہ وہ دونوں طرح بیان کریں۔(صحیح بخاری میں اس کی مثالیں بکثرت ہیں) دونوں ثقہ ہیں، امکانِ لقاء موجود ہے، ہم عصر ہیں، ایک بصرہ کا رہنے والا ہے تو دوسرا کوفہ کا، استاد کی موت کے وقت شاگرد کی عمر ۲۰ سال سے زائد ہے۔

''رقاشی'' کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سلسلے میں عرض ہے کہ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس سے روایت کرنے والا اسکے اختلاط کے بعد روایت کرتا ہے تب تک اس کی روایت مردود نہیں ہوسکتی بلکہ بطور شاہد و متابع بلاچون و چرا مقبول ہے۔ پس وہ ساری روایتیں جنھیں حافظ صاحب رد کررہے ہیں ان میں سے موضوع روایتوں کو چھوڑ کر بقیہ سب روایات میرے حق میں باصول محدثین مفید و مقبول ہیں اورمیری پیش کردہ روایت کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ درانحالیکہ میں نے انہیں پیش نہیں کیا ہے۔''

تنبیہ: مضمون نگار نے ''مستخرج أبي نعيم'' کی جن دونوں سندوں سے یہ سمجھا ہے کہ ان میں ''و نؤمن به و نتوكل عليه'' نہیں ہے اوراس سے اپنے دلائل میں اضافہ کیا ہے، یہ محض دعویٰ ہے حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ اگر یہی بات ہوتی تو پھر ابونعیم ان کو اس جگہ اس انداز میں ذکر نہ کرتے۔

اہل حدیث کے شہرۂ آفاق عالم شارح ترمذی مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ نے شرح ترمذی کے ابتداء میں جو خطبہ درج کیا ہے اس میں بھی ''و نؤمن به و نتوكل عليه'' موجود ہے۔

علم اصول حدیث کے ماہرین جانتے ہیں کہ جب متن میں اختلاف واقع ہو اور سندیں صحیح ہوں تو ان میں توفیق و تطبیق دی جاتی ہے انھیں ردّ نہیں کیا جاتا۔ اس کی ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ صحیح بخاری شریف ''كتاب الحيض'' کی پہلی حدیث: ((خرجنا لا نرى إلا الحج)) الحدیث کو لیجیے۔ خود امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح میں اس حدیث کو ۳۴ یا ۳۵ مقامات پر بیان کیا ہے، نیز کتب ستہ کے علاوہ احمد، دارمی، ابن خزیمہ اور ابن حبان وغیرہ میں بھی یہ حدیث موجود ہے اور حدیث پڑھنے پڑھانے والے جانتے ہیں کہ اس حدیث کے مختلف طرق میں تطویل و تقصیر کے علاوہ الفاظ میں بھی اختلاف اور کمی بیشی موجود ہے۔ لیکن کسی نے اس کی وجہ سے ان کے بعض طرق کو ردّ نہیں کیا۔ نیز علماے اہل حدیث پر مخفی نہیں کہ صحیحین کے بعض متون دوسری کتابوں میں ضعیف و موضوع اسناد سے بھی موجود ہیں جنھیں عقیلی کی ''ضعفاء'' وغیرہ کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ روایتیں ضعیف و موضوع ہیں اگرچہ صحیحین میں موجود ہیں۔

مضمون میں لفظ '' من يضلله'' پر بڑی طویل گفتگو ہوگئی ہے، سو اس سلسلے میں عرض ہے کہ کسی مخطوطہ یا مطبوع نسخے کے بارے میں یہ کہہ دینا کہ یہ ناسخ یا طابع کی غلطی ہے، میرے نزدیک ایک خطرناک دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔ آئندہ ہر من چلا جب کسی حدیث صحیح میں کوئی جملہ یا لفظ اپنی خواہش کے خلاف

پائے گا بآسانی یہ کہہ کر ''کہ یہ کسی طابع یا ناسخ کی زیادتی یا وہم ہے۔'' اس سے جان چھڑا لے گا۔ إنا للّٰه و إنا إليه راجعون .

حضرت جابر بن عبداللہ والی روایت کو ردّ کرنے کے لیے جو یہ دلیل دی گئی ہے کہ ابن خزیمہ نے اس سند سے اسے روایت کیا ہے لیکن اس میں " من يضلله" کے بجائے " من يضلل " ہے۔ کوئی دلیل قاطع نہیں ۔ ہم آپ کی ضیافت طبع کے لیے اس سلسلے میں کتب ستہ سے کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں ۔ سنن نسائی (۱۲۳/۴) اور سنن ابن ماجہ (۴۴۹/۱) میں أعرابي والی حدیث کو عیسیٰ بن حماد سے روایت کیا گیا ہے، سند دونوں کی ایک ہی ہے لیکن متن کے ایک جملے میں فرق ہے ۔ ایک میں " فأنشدك الله" ہے تو دوسرے میں "فأنشدك بالله" ہے۔

ایک اور مثال لیجیے، فتح الباری (۹۱/۵ حدیث ۲۴۳۶) ، سنن ترمذی (۶۵۵/۳ حدیث: ۱۳۷۲) اور سنن أبي داود (۳۳۱/۲ حدیث: ۱۷۰۴) تینوں میں حدیث " اللقطة" کو ایک ہی سند سے روایت کیا گیا ہے لیکن ان کے ایک جملہ میں اختلاف ہے۔ کسی میں "حتى يلقى ربها" ہے تو کسی میں " حتى يلقاها ربها" ہے نیز ترمذی میں ایک لفظ زائد ہے جو بقیہ کتابوں میں نہیں ہے، یعنی " ووعاءها"

ایک اور مثال آپ کے سامنے رکھتا ہوں ۔ نسائی (۲۴/۴) اور ابن ماجہ (۵۱۲/۱) میں یوسف بن حماد کی سند سے ایک حدیث مروی ہے جس کے متن میں فرق ہے۔ ایک میں " مامن مسلم يتوفى له ثلاثة من الولد" ہے تو دوسرے میں "ما من مسلمين يتوفى لهما ثلاثة من الولد" ہے دراں حالیکہ دونوں کی سندیں ایک ہیں۔ اس قسم کے اختلاف کتب ستہ میں بے شمار موجود ہیں۔

مدنی صاحب نے اپنے موقف کی تائید میں ایک دلیل یہ دی ہے کہ یہی روایت اسی سند سے سنن کبریٰ نسائی میں بھی ہے لیکن اس میں یہ جملہ "من يضلله" کے بجائے "من يضلل " ہے۔

اب میری بھی سنیے : مجھ جیسے طلبائے حدیث جانتے ہیں کہ امام نسائی نے '' مجتبیٰ '' بعد میں تالیف فرمائی ہے اور اس میں تنقیح و تصحیح و ترمیم واقع ہے، نیز دونوں کے راوی مصنف سے الگ الگ ہیں، لہٰذا دونوں میں فرق دیکھ کر کسی روایت کو وہم قرار دینا صحیح نہیں ۔ مزید سنیے کہ '' صغریٰ '' اور '' کبریٰ '' میں جو اختلاف ہے اسے چھوڑیے خود مجتبیٰ کے اندر بھی اس قسم کے اختلاف موجود ہیں۔ ایک دو مثالیں بیان کر دیتا ہوں۔

'' مجتبیٰ '' کے دو مقامات (۱۹۰/۳ اور ۲۲۳/۷) میں ایک حدیث قتیبہ سے مروی ہے، سند اوّل تا آخر ایک

ہے، متن بھی ایک ہے اِلا یہ کہ پہلی جگہ " قال: فإن عندي جذعة" ہے تو دوسری جگہ "قال : فإن عندي عناقا جذعة " ہے۔ شاید آپ اسے ناسخ یا طابع کا وہم قرار دیں گے لیکن میں کم از کم ایسا نہیں سوچ سکتا۔

ایک اور مثال لیجیے۔ نسائی میں ۱۷۷/۷ اور ۳۰۹ دونوں جگہوں میں ایک ہی سند سے ایک حدیث موجود ہے۔ لیکن ایک جگہ "لما حرم عليهم الشحوم" ہے تو دوسری جگہ " لما حرم عليهم شحومها" ہے۔

مدنی صاحب خود جانتے ہیں کہ اس قسم کے اختلافِ الفاظ کتب ستہ میں کثرت سے موجود ہیں، میرا عرض کرنا تو سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ سنن کبریٰ نسائی میں بھی اس قسم کے اختلاف موجود ہیں جنھیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد ابن مسعود والی روایت پر بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مختصراً عرض ہے کہ یہ حدیث سنن میں موجود ہے۔ سنن أبي داود کے بین الاقوامی شارح صاحب '' عون المعبود'' نے سنن أبي داود کے متن کا مختلف گیارہ قلمی نسخوں سے تصحیح و مقابلہ کیا ہے جیسا کہ اس کی آخری جلد کے آخر میں مرقوم ہے۔ اس عون المعبود کی دوسری جلد طبع ملتان کے صفحہ ۲۰۴ پر متن میں " من يضلل" ہے تو حاشیے میں نسخہ " من يضلله" موجود ہے۔ نیز ترمذی طبع ہند میں متن کے اندر ہی" من يضلله" ہے نیز میرے پاس جامع ترمذی کا مخطوطہ مصورہ موجود ہے، اس کے متن میں صاف " من يضلله" موجود ہے۔

علمائے کرام کے علاوہ طلبا بھی یہ جانتے ہیں کہ "أصح الكتب بعد كتاب الله الصحيح للبخاري" کے مطبوعہ نسخوں کے حاشیے میں مختلف نسخے اختلاف الفاظ و جمل کے موجود ہیں ان کو کسی ناسخ یا طابع کا وہم تو قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ ان کو مختلف روایتوں پر محمول کیا جاتا ہے اور کسی کو ردّ نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ہر ایک کی توضیح کرنے کے علاوہ علماء جانتے ہیں کہ سلف سے لے کر خلف تک کی تصنیفات میں ان مختلف نسخوں سے استدلال موجود ہیں۔ اس کو غلط اور وہم قرار دینا یا طابع و ناسخ کی طرف سے سہو وغیرہ کہنا قطعاً درست نہیں۔ ترجیح تو ممکن ہے لیکن کسی کو ایک قلم غلط و وہم کہنا میرے نزدیک بذات خود ایک غلطی ہے۔ البتہ علم اصول کے ماہرین کے نزدیک کیا ہے وہی جانیں۔

آخر میں کچھ اور مثالیں بھی ملاحظہ فرمائیں جو "فتح الباری (۳۰۹/۱۰ ح: ۵۸۵۵)اور سنن أبي داؤد (۳۷۶/٤، حديث:٤١٣٦) میں موجود ہیں، دونوں کی سندیں ایک ہیں لیکن ایک میں" لا يمشي احدكم في النعل الواحدة" ہے تو دوسری میں " لا يمشي في نعل واحدة" ہے۔ نیز دونوں کتابوں کو سامنے رکھیے ان میں تقدیم وتاخیر بھی ہے۔

نیز حدیث " إذا سمعتم صیاح الدیکة "کو بخاری "بدء الخلق" حدیث:۳۳۰۳، اور مسلم کتاب " الذکر والدعا "حدیث:۸۲ اور ترمذی "کتاب الدعوات" حدیث:۳٤٥۹، ابو داؤد "کتاب الأدب" حدیث: ۵۱۰۲ ، اور عمل الیوم واللیلة للنسائی، حدیث: ۹۵۰ میں سے نکال کر دیکھیے ان سارے محولہ مقامات پر یہ حدیث ایک ہی سند سے مروی وموجود ہے لیکن ان کتب میں ایک لفظ کے بیان میں اختلاف موجود ہے جب کہ ترمذی میں ایک لفظ زائد بھی ہے۔

میں نے اپنا مافی الضمیر اپنے علم کے مطابق بیان کردیا ہے۔

وما أرید إلا اتباع الحق و ما توفیقی إلا باللّٰہ علیه توکلت و إلیه أنیب ، والحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاة والسلام علی رحمة للعالمین ، و علی آله و صحبه و أتباعه إلی یوم الدین. آمین!

جواب تعاقب از حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ......(۳)

''الاعتصام'' ۳ جولائی ۲۰۰۳ میں مولانا ابوالأ شبال صاحب کا مضمون ''خطبے کے مسنون الفاظ'' کے عنوان سے زیرِنظر آیا جو کہ ''الاعتصام'' کے مئی ۲۰۰۳ میں چھپنے والے میرے مضمون کے جواب میں تحریر کیا گیا ہے۔

یہ مضمون میرے مضمون کا کس حد تک جواب ہے، اہل علم اور ذوقِ تحقیق رکھنے والے حضرات پر اس کی حقیقت مخفی نہ ہوگی تاہم عامۃ القراء ان کی ادھر اُدھر کی بیان کردہ مثالوں سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے چنانچہ اس موضوع پر ہمیں مزید کچھ تحریر کرنے کی ضرورت پیش آئی:

معلوم یوں ہوتا ہے کہ مولانا ابو الأ شبال صاحب نے اس مسئلے کو اپنی اَنا کا مسئلہ بنالیا ہے تاکہ ان کے معتقدین کے ہاں ان کا جو مرتبہ ومقام ہے اسے کسی قسم کا گزند نہ پہنچے۔

اہل علم کی تو یہ شان نہیں کہ واضح دلائل کے مقابلے میں محض اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جائے اور اس پر اِدھر اُدھر کے دلائل تلاش کئے جائیں ویسے بھی موصوف کی تحریروں میں سنجیدگی اور متانت کم ہی دکھائی دیتی ہے۔

ہم اپنے اس مضمون میں سب سے پہلے "نؤمن به و نتو کل علیه"

ان الفاظ کے بارے میں مولانا ابو الأ شبال صاحب نے ہمارے جواب میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا تفصیلی جائزہ لیں گے اور اس کے بعد "یضلله" میں "ہ"ضمیر کے اضافے پر گفتگو کریں گے۔

((نؤمن به و نتو کل علیه))

ان الفاظ کے بارے میں ہماری گفتگو قدرے طویل ہوگی کیونکہ موصوف حفظہ اللہ نے ان کے بارے میں قارئین کو مغالطہ دینے اور الجھانے کی کوشش کی ہے۔

ہماری طوالت کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی کہ ہم نے قارئین کو موصوف کے بارے میں یہ بھی بتانا ہے کہ وہ علم حدیث سے کس قدر آشنا ہیں اور یہ بتانے پر ہم اس لئے مجبور ہیں کہ موصوف کے اندر بہت تعلّی پائی جاتی ہے شاید کہ ہمارے اس بیان سے وہ اپنی حقیقت سمجھ پائیں اور ان کی اصلاح ہو جائے (إن أرید إلا الإصلاح)

موصوف لکھتے ہیں:

ثناء اللہ مدنی صاحب نے ابونعیم کے اس جملے "لفظ جعفر أتم والسیاق له" کا مفہوم یہ سمجھا اور بیان کیا ہے کہ دوسرے دونوں طرق میں جملہ "نؤمن به ونتوکل علیه" نہیں ہے۔

میرے نزدیک بوجوہ یہ فہم صحیح نہیں کیوں کہ اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے ابونعیم کے ان دونوں طرق کے متون ابونعیم ہی کی کسی کتاب سے تلاش کرکے پیش کرنا پڑیں گے تبھی یہ دعویٰ صحیح ہوگا بصورت دیگر یہ دعویٰ بے دلیل ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ جملہ "نؤمن به ونتوکل علیه" ان تینوں طرق میں موجود ہے اس کی تفصیل یہ ہے "الخ"۔

موصوف نے اپنے اس کلام میں جو کچھ کہا ہے اس کے بارے میں ہمارے درج ذیل جوابات ہیں:

① ہم نے ابونعیم کے کلام "لفظ جعفر أتم والسیاق له" سے جو سمجھا ہے اللہ کے فضل وکرم سے بالکل صحیح سمجھا ہے کہ "نؤمن به ونتوکل علیه" کے الفاظ جعفر ہی کے طریق میں ہیں دوسرے دوطریق میں نہیں اب اس کی تفصیل ملاحظہ کریں۔

علم حدیث کے کسی طالب علم سے ابونعیم کی مذکورہ عبارت کا مفہوم پوچھا جائے تو وہ یہ کہے گا کہ اس سے ابونعیم کی مراد یہ ہے کہ اس حدیث کا سیاق یا اس کے جو الفاظ ابونعیم نے ذکر کئے ہیں وہ سیاق یا الفاظ جعفر کے طریق کے ہیں اور جعفر کے دوسرے دوطرق کے الفاظ سے زیادہ ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ جعفر کے طریق میں یہی الفاظ کیوں زیادہ ہیں دوسرے الفاظ کیوں زیادہ نہیں ہو سکتے تو اس سوال کا جواب درج ذیل ہے:

ا۔ ابونعیم نے جس طریق سے یعنی جعفر کے طریق سے اس حدیث کو "المستخرج" میں روایت کیا ہے بعینہٖ اس طریق سے اسے "معرفة الصحابة" (ج ٤ رقم ١٢٥١٣) میں بھی روایت کیا ہے اور اس میں بھی مذکورہ الفاظ موجود ہیں۔

تنبیہ: "معرفۃ الصحابۃ" میں صرف یہی ایک سند ہے دوسری دونوں سندوں کا ذکر نہیں۔

ب۔ ابونعیم کی دوسری دوسندوں میں یہ الفاظ کیوں نہیں تو اس کی دلیل یہ ہے کہ ان دونوں سندوں سے یہ حدیث دوسری کتب میں بھی مروی ہے اور ان میں یہ الفاظ نہیں ہے اب اس کی تفصیل ملاحظہ کریں۔

پہلی سند: ان دوسندوں میں سے پہلی سند یہ ہے۔

"...... ثنا إسماعيل بن الخليل ثَنا يحىٰ بن أبى زائده ثنا داؤد ابن أبى هند عن عمروبن سعيد عن سعيد بن جبير عن ابن عباس."

اس حدیث کو اِسماعیل کی طرح یحییٰ بن آدم اور محمد بن عیسیٰ نے بھی یحییٰ بن اَبی زائدہ سے روایت کیا ہے۔ یحییٰ بن آدم کے طریق سے اسے اَحمد (۱/۳۵۰) اور محمد بن عیسیٰ کے طریق سے اسے نسائی (۶/۸۹۔۹۰) نے روایت کیا ہے اور ان کے یہاں یہ الفاظ نہیں ہیں۔

دوسری سند: ابونعیم کی دوسری سند یہ ہے:

"ثنا عبدالله بن محمد ثيرويه ثنا إسحاق بن ابراهيم أنبأ عبدالأعلى ثنا داؤد بن هند به."

اسحاق بن ابراہیم یہ ابن راھویہ سے معروف ہیں۔ ان کے طریق سے یہ حدیث درج ذیل کتب میں ہے:

" أخرجه مسلم (٨٦٨) والبيهقي في السنن(٣/ ٢١٤)وفى" الدلائل " (٢/ ٢٢٣) وابن منده في " كتاب الإيمان"(١/ ٢٧٦/ ١٣٢) من أربع طرق اسحاق بن ابراهيم به."

اور ان کتب میں بھی مذکورہ الفاظ نہیں ہیں۔

جس طرح اس حدیث کو اسحاق بن راھویہ نے عبد الاعلیٰ سے روایت کیا ہے اسی طرح محمد بن المثنی نے بھی اسے عبد الاعلیٰ سے روایت کیا ہے۔ ان کے طریق سے اس حدیث کو مسلم، ابن حبان (۸/۱۸۷/حدیث ۶۵۳۴)۔بیہقی نے ، سنن اور'' دلائل'' میں اور ابن مندہ نے کتاب الایمان'' میں روایت کیا ہے اور ان کے طریق میں بھی مذکورہ الفاظ نہیں ہیں۔

نیز اس کی داوَد بن اَبی ھند سے عبد الاعلیٰ کی سند کے علاوہ دیگر پانچ سندیں بھی ہیں اور ان میں بھی "نُؤْمِنُ بِه وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْه" نہیں ہے۔

ان پانچ سندوں میں سے ایک سند تو یحییٰ بن زکریا بن اَبی زائدہ کی سند ہے جس کا تھوڑی دیر قبل ذکر ہوا۔ اور بقیہ چار سندوں کی تفصیل کے لیے الاعتصام (جلد:۵۵، شمارہ ۱۷، ۲۰۰۳، ص:۱۵۔۱۶) دیکھا جائے۔

تنبیہ: یہ سندیں کن کتب میں ہیں ان میں ایک لالکائی کی کتاب "شرح اصول اعتقاد اھل السنة " بھی ہے لیکن کتابت کی غلطی سے اس کا جلد اور صفحہ وغیرہ نہیں لکھا گیا لہٰذا اسے اب نوٹ کر لیں (۴/:۶۴۹، نمبر ۱۱۷۹)

جس طرح اس حدیث کو داؤد بن اَبی ھند نے اپنے استاذ عمرو بن سعید سے روایت کیا ہے اسی طرح اسے

عبد اللہ بن عون اور یونس بن عبید نے بھی روایت کیا ہے ملاحظہ ہو حوالہ مذکور۔ اور ان کے طرق میں بھی مذکورہ الفاظ نہیں ہیں۔

اس تفصیل کے بعد بھی اگر مولانا ابو الأشبال صاحب اپنی بات پر مصر رہیں کہ نہیں یہ الفاظ ابو نعیم کی تینوں ہی سندوں میں ہیں تو پھر ہم یہی کہہ سکتے ہیں جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

لا يصح في الأذهان شيء

إذا احتاج النهار إلى دليل

② مولانا ابو الأشبال صاحب کا یہ کہنا کہ ''ان دونوں طریق کے متون ابو نعیم ہی کی کسی کتاب سے تلاش کر کے پیش کرنا پڑیں گے،'' بہت عجیب ہے کیونکہ علماء حدیث پر یہ بات مخفی نہیں کہ اگر کسی محدث کی سند میں کوئی جملہ یا ٹکڑا اضافی ہو تو اس پر صحت یا عدم صحت کا حکم لگانے کے لیے اس کی مفصل تخریج کی جاتی ہے لیکن یہ شرط آج تک ہمارے سننے میں نہیں آئی کہ اس حکم کے لیے اسی محدث کی کسی دوسری کتاب ہی سے اس کی تخریج کی جائے۔ ❶

موصوف ویسے تو اپنے آپ کو ماہرین فن میں شمار کرتے ہیں لیکن ان کی باتیں ہمیں ماہرین فن جیسی معلوم نہیں ہوتیں۔ واللہ اعلم.

اس مقام پر تو ہم سے ابو نعیم ہی کی کسی دوسری کتاب تلاش کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، لیکن "یضلله" میں لفظ ''ہ'' ضمیر پر بحث کرتے ہوئے ہم نے جب یہ کہا کہ ''ہ'' ضمیر کا اضافہ حدیث جابر میں ''نسائی صغریٰ'' میں ہے، جبکہ یہ حدیث جس سند سے ''سنن صغریٰ'' میں ہے بعینہ اس سند سے ''سنن کبریٰ'' میں بھی ہے اور اس میں یہ اضافہ نہیں تو موصوف نے اس کو قبول کرنے کی بجائے ایک دوسرا کھیل کھیلا جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ ان شاء اللہ.

دوسری بات یہ ہے مولانا ابو الأشبال صاحب جیسے ہم سے ابو نعیم کی کسی دوسری کتاب کا مطالبہ کر رہے ہیں اسی طرح ہم بھی ان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ الفاظ ابو نعیم کی دوسری دونوں سندوں میں بھی ہیں تو پھر اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیئے آپ کو بھی ابو نعیم ہی کی کسی دوسری کتاب سے ان الفاظ کو دکھانا پڑے گا ورنہ آپ کا دعویٰ بھی بے بنیاد، باطل اور بے دلیل ہو گا۔ اور یہ کہہ کر کہ ''جہاں تک میں

❶ موصوف کا اس بات پر خود بھی عمل نہیں کیونکہ انھوں نے صحیح مسلم کی ایک سند کے متن کو سمجھنے کے لیے مسلم کی کسی دوسری کتاب کی طرف نہیں بلکہ ابن مندہ کی ''کتاب الایمان'' کی طرف رجوع کیا ہے جیسا کہ عنقریب آ رہا ہے۔

سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ جملہ " نؤمن به و نتوكل عليه "ان تینوں طرق میں موجود ہے'' آپ کی جان نہیں چھوٹے گی بلکہ آپ کو اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے دلیل دینا ہوگی۔ (هاتوا برهانكم......).

تیسری بات! ہم آپ سے سوال کرتے ہیں کہ آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ اس کی وجہ کیا ہم یہ سمجھیں کہ آپ اختصار پسند ہیں طوالت سے گریز کرتے ہیں اگر واقعتاً ایسا ہے تو یہ مضمون تو آپ نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اس میں آپ نے یہ کام کیوں نہیں کیا یا کہ آپ کو صرف باتیں کرنے کی عادت ہے، آپ نے اس تفصیلی مضمون میں جو علم کے موتی بکھیرے ہیں ان کی حقیقت اہل علم اور ذوقِ تحقیق رکھنے والوں پر مخفی نہ ہوگی۔ ہمیں اس کی طوالت کی جو وجہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ کہیں آپ کے معتقدین آپ سے یہ نہ کہہ دیں کہ مدنی صاحب کا مضمون تو بڑا تحقیقی اور طویل تھا مگر آپ نے تو کچھ بھی نہیں لکھا۔

چوتھی بات! یہ کہ اگر اس مسئلہ کے لیے ابونعیم ہی کی کسی دوسری کتاب سے وضاحت ضروری تھی تو آپ نے اپنے مذکورہ کلام کے بعد اس کلام میں (اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ کتاب صحیح مسلم پر تخریج ہے......'') صحیح مسلم کی پہلی حدیث کی پہلی سند کے متن کے لیے ابن مندہ کی ''کتاب الایمان'' کی پانچویں حدیث کی طرف رجوع کیوں کیا؟ آپ کو یہ عقدہ کھولنے کے لیے امام مسلم رحمہ اللہ کی کوئی دوسری کتاب نظر نہیں آئی۔ ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ﴾ ...... ﴿ أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ .﴾

کیا ہم آپ سے یہاں یہ سوال کرنے کے مجاز نہیں کہ آپ نے امام مسلم کی کسی دوسری کتاب کی طرف رجوع کرنے کی بجائے ابن مندہ کی ''کتاب الایمان'' کی طرف رجوع کیوں کیا؟ " فَمَا جَوَابُكُمْ فَهُوَ جَوَابُنَا ."

موصوف کا یہ کہنا کہ ''ابونعیم کی " المستخرج" صحیح مسلم پر تخریج ہے اور مسلم یہ واضح کر دیتے ہیں کہ یہ فلاں کا بیان کردہ لفظ ہے اور اگر کسی راوی نے اصل متن میں کوئی لفظ یا جملہ زیادہ یا کم کیا ہوتا ہے تو اس کو بھی بیان کر دیتے ہیں جیسا کہ ابتداء ہی میں ''کتاب الایمان'' کی سب سے پہلی حدیث کو بیان کرتے ہوئے اوّل اسناد کے متن کو نہیں بیان کیا بلکہ اسناد ثانی کے متن کو بیان کیا......''

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ موصوف نے یہ ذکر کر کے خواہ مخواہ کا تکلف کیا ہے دراصل یہ طرز عمل ان لوگوں کا ہوتا ہے جن کے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہ ہو تو وہ ادھر ادھر کی باتیں لا کر اپنی کمزوری رفع کرنا چاہتے ہوں۔

اگر امام مسلم کا یہ انداز ہے کہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ فلاں کا بیان کردہ لفظ ہے تو حافظ ابونعیم نے بھی یہاں یہی اسلوب اختیار کیا ہے، چنانچہ لکھا ہے "لفظ جعفر أتم ، و السیاق له " بتایئے اب آپ مزید کیا چاہتے ہیں؟

آپ نے یہ تو لکھ دیا کہ "اور اگر کسی راوی نے اصل متن میں کوئی لفظ یا جملہ زیادہ یا کم کیا ہوتا ہے تو اس کو بھی بیان کردیتے ہیں" لیکن جو حدیث مثال کے طور پر پیش کی ہے وہ مثال نہیں بن سکتی کیوں کہ اس کے بعض طرق کے متن میں جو کمی یا اضافہ ہے امام مسلم نے اس کو بیان نہیں کیا بلکہ اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

چنانچہ امام مسلم کے ایک طریق کے بعد الفاظ یہ ہیں:

" وَ ساقوا الحدیث بمعنی حدیث کھمس و إسناده ، وفیه بعض زیادة و نقصان أحرف ."

اور ایک دوسرے طریق کے بعد یہ الفاظ ہیں:

" فاقتص الحدیث کنحو حدیثهم عن عمر رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم و فیه شیء من زیادة ، و قد نقص منه شیئاً "

معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس اصول سے ناآشنا ہیں۔ "پہلے تولو پھر بولو۔"

صحیح مسلم میں "کتاب الایمان" کی جو سب سے پہلی حدیث ہے وہ حدیث عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہے جو حدیث جبریل کے نام سے مشہور ہے۔ اس کو روایت کرتے ہوئے امام مسلم نے یوں کہا ہے:

" حدثنی أبو خیثمة زهیر بن حرب ، حدثنا وکیع عن کھمس عن عبد الله بن بریدة عن یحییٰ بن یعمر ، ح و حدثنا عبید الله بن معاذ العنبری وهذا حدیثه. حدثنا أبی حدثنا کھمس عن ابن بریدة عن یحییٰ بن یعمر قال" إلی آخره کلامه.

" و هذا حدیثه" سے امام مسلم کی مراد یہ ہے کہ وہ آگے چل کر حدیث کا جو سیاق یا لفظ بیان کریں گے وہ عبیداللہ العنبری کا سیاق یا لفظ ہوگا، وکیع کا نہیں۔

امام مسلم کی اس صراحت سے موصوف بڑے پریشان ہوگئے اور اس کو ایک بہت بڑا عقدہ سمجھ بیٹھے اور یہ کہہ کر کہ "حافظ ابن حجر نے "فتح الباری" میں کسی مقام پر ؟ سند اوّل کے متن کا پتہ بتایا ہے کہ وہ "کتاب الایمان" ابن مندہ میں ہے۔" قارئین کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ حافظ ابن حجر کے نزدیک بھی یہ ایک بہت

بڑا عقدہ تھا جب کہ اس میں کوئی عقدے والی بات ہی نہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن مندہ کا ذکر اس عقدہ کو حل کرنے کے لیے نہیں کیا بلکہ انھوں نے حدیث أبي ہریرۃ رضی اللہ عنہ جو حدیث عمر رضی اللہ عنہ ہی کی طرح ہے، کی شرح میں حدیث عمر رضی اللہ عنہ میں جو زیادات ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے کیا ہے ملاحظہ ہو: فتح الباری (۱/۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۵/ حدیث رقم: ۵)

وہ حدیث جس کا اصل موضوع سے کوئی تعلق نہیں اس کی پہلی سند کے سیاق کے بارے میں موصوف کو بڑی پریشانی لاحق ہوئی اور فوراً ''فتح الباری'' کی مدد سے ''کتاب الایمان'' لابن مندہ میں اس کو تلاش کیا، اور جس حدیث کا اصل موضوع سے تعلق ہے تو اس کے سیاق کے لیے انھیں ابونعیم ہی کی کوئی دوسری کتاب چاہیے ورنہ وہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔

اس کے بعد موصوف لکھتے ہیں:

''آپ نے ابونعیم کے جس جملہ سے یہ سمجھا ہے کہ یہ جملہ " نؤمن به و نتوكل عليه "یہ دونوں سندوں میں نہیں ہے یعنی لفظ "جعفر أتم و السياق له" اس کے معاً بعد ابونعیم فرماتے ہیں: " زاد إسحاق الخ." معلوم ہوا کہ زیر بحث جملہ اگر صرف جعفر ہی کے طریق سے ثابت ہوتا تو اس کی وضاحت کر دیتے اور جب اس کی وضاحت موجود نہیں تو پھر محض انشائی انداز میں یہ باور کرانا کہ یہ جملہ صرف جعفر ہی کے طریق سے ثابت ہے۔ ❶ میرے نزدیک ابونعیم کی طرف ایک ایسی بات کو منسوب کرنے کے مترادف ہے جس کا وہ قائل نہیں۔''

موصوف کا یہ کلام پڑھ کر ہمیں از حد افسوس ہوا کہ انھیں آج تک علمی اور انشائی انداز میں جو فرق ہے اس کا علم نہیں ہو سکا۔ ہمارا اللہ کے فضل و کرم سے خالص علمی انداز تھا اس میں انشاء والی تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔

موصوف کا یہ کہنا کہ'' زیر بحث جملہ اگر صرف جعفر ہی کے طریق سے ثابت ہوتا تو اس کی (ابونعیم) کی وضاحت کر دیتے'' انتہائی قابل تعجب ہے گویا کہ موصوف کے مطابق حافظ ابونعیم کو یوں کہنا چاہیے تھا:

" لفظ جعفر أتم والسياق له ، و زاد جعفر : نؤمن به و نتوكل عليه " (إنا لله و إنا إليه راجعون.)

---

❶ واضح رہے کہ ہم نے قطعاً یہ نہیں کہا کہ یہ جملہ صرف جعفر ہی کے طریق سے ثابت ہے ہم نے تو یہ کہا ہے کہ ابونعیم کے تین طرق میں سے یہ جملہ صرف جعفر کے طریق میں ہے، اس کے جعفر کے طریق میں ہونے اور اس کے ثابت ہونے میں بہت فرق ہے۔ شاید موصوف کے نزدیک کوئی فرق نہ ہو۔

کیا آپ حافظ ابونعیم سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ایسا لایعنی کلام کریں گے یا ایسا رکیک اسلوب اختیار کریں گے۔ حاشا وکلا.

شاید یہ اسلوب آپ کے ہاں رکیک نہ ہو یا آپ کو رکیک محسوس نہ ہو کیونکہ آپ کی عبارتوں میں اس قسم کا اسلوب پایا جاتا ہے۔ ہم یہاں آپ کی کتاب " اتحاف القاری بِسَدِّ بیاضات فتح الباری "اور آپ کی تحقیق سے طبع شدہ ''تقریب'' کے مقدمے سے اس کی ایک دو مثالیں بیان کرتے ہیں اور " الدین النصیحة" کے تحت آپ کو یہ مشورہ بھی دیں گے کہ ان کتب کی آئندہ طباعت سے قبل اپنی عبارتوں پر کسی عربی دان سے نظر ثانی کروالیں تو بہتر ہوگا، آیئے اب چند مثالیں ملاحظہ کرلیں۔

ا..... اتحاف القاری:

① صفحہ (۳) میں: " کلا الطبعتين " ہے، درست " کلتا الطبعتين " ہے۔

② صفحہ (۴) میں: "ھاکم "مثالان لذالك ہے، درست " ھاکم مثالين" ہے۔ یہ نحو کی غلطیاں ہیں اب ایک اسلوب کی مثال ملاحظہ کیجیے۔

③ صفحہ (۶) میں یہ عبارت ہے۔

" فإن معظمهم مثل الحافظ ابن حجر رحمه الله كانوا يكتبون من الذاكرة أحيانا بدون مصادر مكتوبة أمامه."

اس عبارت کو ہم عربی دانوں کے لیے بغیر تبصرہ کیے چھوڑتے ہیں:

ب۔ تقریب التھذیب:

① مقدمة المحقق (صفحه:۷) :ترجم لنفسه وَ تَرُجَمَ لَهُ عامة من اتى بعده ، و أفرده تلميذه الحافظ السخاوى بمصنف مستقل...... فاستغنيت بذالك .... عن تطويل المقدمة بسياق ترجمته ."

عربی دان حضرات خط کشیدہ الفاظ پر غور کریں۔

② مقدمۃ المحقق (صفحہ:۱۶)

موصوف ''تقریب'' کی دوسری طبعات میں جو کمیاں ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

③ نقص بعض التراجم للحوالة من حرف إلى آخر لِتَغَيُّرِ النسبةمثلاً :

اس عبارت پر بھی غور کریں اور سمجھیں کہ موصوف کیا کہنا چاہتے ہیں۔

موصوف دوسروں کو تو عجمی النسل کہیں گے لیکن ان کا اپنا حال یہ ہے۔

ان چند مثالوں کے ذکر کے بعد اب ہم اصل موضوع کی طرف پلٹتے ہیں۔

موصوف کا یہ کہنا کہ'' یہ باور کرانا کہ یہ جملہ صرف جعفر ہی کے طریق سے ثابت ہے میرے نزدیک ابونعیم کی طرف ایک ایسی بات کو منسوب کرنے کے مترادف ہے جس کا وہ قائل نہیں'' بڑا عجیب ہے، کیونکہ ہم نے اس حدیث کی تخریج کر کے آپ کو یہ بتلایا تھا کہ یہ جملہ جعفر ہی کے طریق میں ہے دوسرے دونوں طرق میں نہیں، اس کے باوجود اگر آپ اس بات پر مصر اور بضد ہیں کہ یہ جملہ ابونعیم کے تینوں طرق میں ہے تو آپ کو اس کا ثبوت مہیا کرنا ہوگا۔ ورنہ آپ ابونعیم کی طرف ایسی بات منسوب کر رہے ہیں جس کے وہ قائل نہیں نہ کہ ہم۔

نیز آپ ابونعیم کے اس قول: " لفظ جعفر أتم والسياق له " کی وضاحت کرتے ہوئے ہمیں یہ بھی بتائیں کہ جعفر کے طریق میں " نؤمن به و نتوكل عليه "کے الفاظ کی بجائے فلاں فلاں الفاظ یا فلاں جملہ زیادہ ہے۔

کیونکہ لفظ "جعفر أتم " کے معنی یہ ہیں کہ جعفر کے طریق میں دوسرے دونوں طرق سے کچھ الفاظ زیادہ ہیں۔

موصوف کا ابونعیم کے مذکورہ قول کے بعد اس قول سے " و زاد إسحاق قال : فبعث رسول الله ﷺ سرية فمروا بقوم ضماد......" یہ استنباط کرنا کہ'' معلوم ہوا کہ زیر بحث جملہ اگر صرف جعفر ہی کے طریق سے ثابت ہوتا تو اس کی وضاحت کر دیتے'' بالکل بے محل اور غیر معقول ہے کیونکہ یہ کہہ کر ابونعیم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اس قصے کا ذکر صرف اسحاق کے طریق میں ہے دوسرے دونوں طرق میں نہیں۔

اگر ابونعیم کی تینوں سندوں کے الفاظ ایک ہی ہوتے تو پھر وہ یوں نہ کہتے " لفظ جعفر أتم و السياق له" بلکہ یوں کہتے : " لفظهم واحد "۔ جیسا کہ وہ کئی مقامات پر ایسا کہتے ہیں، مثال کے طور پر''کتاب الجمعة " جس کتاب میں ابونعیم نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ ہی کی درج ذیل احادیث دیکھیں (۱۸۹۹، ۱۹۷۵، ۱۹۷۷، ۱۹۷۸)

مولانا ابو الأشبال صاحب نے اپنے مذکورہ کلام کے بعد کچھ باتیں کرتے ہوئے علماء و طلباء کے لیے ایک فائدہ ذکر کیا ہے اس فائدے کے بارے میں ہم بعد میں گفتگو کریں گے کہ علماء تو درکنار طلباء کے لیے بھی وہ فائدہ ہے یا نہیں، سب سے پہلے ہم موصوف سے اصل موضوع کے بارے میں نمٹ لیں۔

اس فائدے کے ذکر کرنے کے بعد موصوف لکھتے ہیں:

''اس فائدے کے ذکر کے بعد پھر اصل مسئلے کی طرف آتے ہیں حافظ صاحب موصوف (نے) سند اوّل کے ایک راوی، " يحيىٰ بن عبد الحميد الحمانی " کے بارے میں کتب معتبرہ سے کلمات جرح کا انتخاب کر کے اسے مجروح قرار دیا ہے اور نتیجتاً اس کی روایت کو مردود کے حکم میں گویا داخل کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ راوی اتنا گیا گذرا نہیں جتنا باور کرایا گیا ہے کیونکہ شیخ البانی صاحب نے بھی " سلسلة الأحاديث الصحيحة" میں اس کی روایت کو بطور شاھد و متابع قبول کیا ہے، اس وقت میرے سامنے " صحیحه"نہیں کہ مکتبہ سے دور بیٹھے لکھ رہا ہوں۔''

موصوف نے اپنے اس کلام میں جو کچھ کہا اس کے بارے میں ہم جو کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے۔

① موصوف نے یہ کہہ کر کہ'' حافظ صاحب موصوف نے سند اوّل کے ایک راوی "يحيىٰ بن عبد الحميد الحمانی" کے بارے میں کتب معتبرہ سے کلمات جرح کا انتخاب کر کے اسے مجروح قرار دیا ہے، خیانت علمی کا ارتکاب کیا ہے بلکہ ہم پر بھتان باندھا ہے کیونکہ ہم نے اپنے مضمون میں یہ کہنے کے بعد کہ "يحيىٰ بن عبد الحميد "یہ " الحمانی "ہے جو متکلم فیہ ہے۔'' علماء جرح و تعدیل کے دونوں قسم کے اقوال نقل کئے ہیں نہ کہ صرف کلمات جرح کا ذکر کیا ہے چنانچہ علامہ ذہبی کی ''میزان الاعتدال'' سے یہ قول بھی نقل کیا ہے" و ثقه يحيى بن معين وغيره " امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " كان يكذب جهاراً "

امام نسائی فرماتے ہیں: ضعیف ہے۔

امام بخاری فرماتے ہیں: "كان احمد و علی يتكلمان فيه۔"

محمد بن عبد اللہ بن نمیر نے کہا ہے:

" ابن الحمانی كذاب ، و قال مرة ، ثقة ، و قال ابن عدی : ليحيىٰ مسند صالح،

میزان(٤/ ٣٩٢)

اب قارئین خود فیصلہ کریں کہ مولانا ابو الأشبال کے اس قول :''کتب معتبرہ سے کلماتِ جرح کا انتخاب کر کے......'' میں کس حد تک صداقت ہے۔

ممکن ہے کہ انھوں نے جس طرح یہ جواب مکتبہ سے دور بیٹھے ہوئے تحریر کیا ہے۔ جیسا کہ موصوف نے

کہا ہے۔ اسی طرح یہ جواب لکھتے وقت ہمارا مضمون بھی ان کے سامنے نہ رہا ہو لہٰذا ہم انھیں معذور سمجھ لیتے ہیں۔

ابو الأشبال صاحب آپ نے ہم پر تو فوراً یہ الزام ٹھونس دیا کہ ہم نے کتب معتبرہ سے صرف کلماتِ جرح کا انتخاب کیا ہے مگر آپ نے اس سے پہلے والے مضمون میں جو لکھا وہ بھول گئے اگر واقعتاً آپ بھول چکے ہیں تو آیئے ہم آپ کو اس کی یاد تازہ کروا دیتے ہیں۔

اس مضمون میں آپ نے ''الحمانی'' کے بارے میں یہ لکھا ہے:

" يحيىٰ بن عبد الحميد المترجم فى " التقريب" قال الحافظ : حافظ إلا أَنَّهُمْ اتهموه بسرقة الحديث ."

مزی نے " تهذيب الكمال " میں ان کا طویل ترجمہ نقل کیا ہے صرف تہمت لگانے سے مجروح نہیں ہو سکتے اس کا ثبوت درکار ہے'' ملاحظہ ہو۔" صحيفة أهل الحديث:(ص:١٢۔٢١ دسمبر ٢٠٠٢ء)

موصوف کے اس کلام میں درج ذیل احتمالات ہیں:

① ''سرقۃ الحدیث'' کی تہمت کا ثبوت چاہیے.......... یہ احتمال زیادہ واضح ہے۔ کا ثبوت ہم عنقریب انھیں فراہم کریں گے۔

② ''سرقۃ الحدیث'' جرح نہیں اس کے جرح ہونے کا ثبوت چاہیے اس کا ثبوت بھی عنقریب آئے گا۔

③ موصوف کے کلام میں یہ احتمال بھی ہے کہ ''یحییٰ الحمانی'' پر سوائے ''سرقۃ الحدیث'' کی تہمت کے اور کوئی جرح نہیں، إنا للہ و إنا اليه راجعون .

آپ نے اگر صرف " تقريب " کا حوالہ دیا ہوتا تو ہم سمجھ لیتے کہ موصوف نے شاید ''تقریب'' کے علاوہ جرح و تعدیل کی کوئی دوسری کتاب نہیں دیکھی ہو گی اس لیے ان سے یہ لغزش ہو گئی مگر آپ نے ''تقریب'' کے بعد " تهذيب الكمال " کا حوالہ بھی دیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں مزی نے ان کا طویل ترجمہ نقل کیا ہے۔

اب ہمارا آپ سے سوال یہ ہے کہ مزی نے ان کے ترجمے میں جو کچھ نقل کیا ہے آپ نے اسے پڑھا ہے یا نہیں؟ اگر پڑھا ہے تو اس میں جرح کے وہ سب اقوال موجود ہیں جو ہم نے نقل کیے ہیں۔

مگر محسوس یوں ہوتا ہے کہ آپ نے اسے پڑھا نہیں بلکہ " الحمانی " کے ترجمے کے اوراق گن کر یہ کہہ دیا کہ مزی نے " تهذيب الكمال " میں ان کا طویل ترجمہ نقل کیا ہے۔ ہمارے خیال میں ہمارا یہ ظن آپ کے

حق میں بہتر ہے بجائے اس کے کہ آپ کے بارے میں خیانت علمی کے ارتکاب کا ظن رکھا جائے۔

چلتے چلتے ہم موصوف پر یہ بھی واضح کرتے جائیں کہ " الحمانی" کے بارے میں "سرقة الحدیث" کی تہمت کے علاوہ اگر کوئی قولِ جرح نہ بھی ہوتو پھر بھی یہ مجروح ہیں کیونکہ "سرقة الحدیث "کی تہمت جرح ہے ۔اگر موصوف اس کو جرح تسلیم نہیں کرتے تو ہم پوچھیں گے کیا یہ الفاظ تعدیل میں سے ہے اگر یہ الفاظ جرح اور نہ ہی الفاظ تعدیل میں سے ہے تو آخر ہے کیا؟ (بَيِّنُوا وَ تُوجَرُوا .)

آیئے! ہم آپ کو بتلاتے ہیں کہ یہ الفاظ جرح میں سے ہے ۔ حافظ سخاوی "مراتب التجریح "میں سب سے اعلیٰ مرتبہ سب سے سخت جرح ۔ پھر اس کے بعد والا مرتبہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

" و بعدها – ای المرتبة التالية بالنسبة لما ذكرته – و هی فلان يسرق الحديث فانها – كما قال الذهبی–اهون من وضعه و اختلاقه فی الإثم" فتح المغيث(۲/ ۱۲۱).

اسی طرح مولانا عبدالحی لکھنوی نے سخاوی کی مذکورہ کتاب اور سندھی کی " شرح النخبة" سے نقل کرتے ہوئے"سرقة الحدیث" کی تہمت کو"مراتب التجریح "کے اس مرتبہ میں ذکر کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو: "الرفع والتکمیل " (ص:۱۵۵، ۱۷۶۔ تحقیق أبی غدہ)

کتاب " الشرح والتعليل لألفاظ الجرح و التعديل" کے مؤلف محمد یوسف صدیق نے "سارق الحدیث" کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

" هٰذه العبارة جرح شديد جمع الموصوف بها بين أمور عديدة بعضها أقبح من بعض فأدى ذالك إلى جرح من فعل ذالك" (ص:٦١)

مذکورہ بالا نصوص سے معلوم ہوا کہ سرقۃ الحدیث کی تہمت جرح ہے۔

فان كنت لا تدری فتلك مصيبة
و ان كنت تدری فالمصيبة أعظم

ممکن ہے کہ موصوف کو حافظ ابن حجر کے کلام سے دھوکہ ہوا ہو۔ کیونکہ انھوں نے"حمانی "کے بارے میں" حافظ إلا أنهم اتهموه بسرقة الحديث" کہا ہے۔اس لیے ہم انھیں حافظ ابن حجر ہی کے کلام سے اس کا ضعیف ہونا ثابت کردیتے ہیں۔

حافظ ابن حجر"فتح الباری(۴۰۴/۳، حدیث: ۱۵۴۲) میں" حمانی" کی سند سے ایک حدیث ذکر کرنے

کے بعد اس کی سند پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں: " قلت : والحمانی ضعیف "

''حمانی'' کے بارے میں حافظ ابن حجر کے مزید اقوال بھی:

۞ موصوف کے اس مضمون میں ایک بات جو پسند آئی وہ یہ کہ انھوں نے اس میں ''یحیٰی حمانی'' کے ضعف کو تسلیم کرلیا ہے جیسا کہ ان کے اس کلام سے پتہ چلتا ہے: '' حالانکہ یہ راوی اتنا گیا گذرا نہیں جتنا باور کرایا گیا ہے۔''

ورنہ اس سے پہلے والے مضمون میں وہ اس بات کو سننے کے لیے تیار نہ تھے مگر انھیں جب اس کا ثبوت مہیا کیا گیا تو انھوں نے اس کے ضعف کا اعتراف کر لیا، اور یہ بڑی اچھی بات ہے کیونکہ حق واضح ہوجانے کے بعد اسے قبول کر لینا خوبی ہے عار نہیں، اللہ تعالیٰ انھیں اس کی مزید توفیق فرمائے!

۞ موصوف کا یہ کہنا کہ '' البانی صاحب نے بھی " سلسلة الأحاديث الصحيحة" میں اس کی روایت کو بطور شاہد و متابع قبول کیا ہے'' تو اس کا جواب یہ ہے کہ البانی رحمہ اللہ کا اس کی روایت کو بطور شاہد و متابع قبول کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ان کے نزدیک ضعیف ہے ورنہ وہ شاہد و متابع کے طور نہیں بلکہ مطلقاً اس کی روایت کو قبول کرتے۔ آیئے ! اب ہم البانی رحمہ اللہ کے کلام سے اس بات کا ثبوت مہیا کردیتے ہیں۔

الشیخ البانی رحمہ اللہ " سلسلة الأحاديث الصحيحة" میں ایک مقام پر لکھتے ہیں: " والحمانی ضعیف لسوء حفظه " ملاحظہ ہو (۱۰۶۴/۵۳/۳)

ایک مقام پر لکھتے ہیں:

" قال الذهبي في " المغني" ۔ أنظر (۷۳۹/۲) ۔ حافظ منكر الحديث ، و قد و ثقه ابن معين وغيره ، و قال أحمد بن حنبل : كان يكذب جهاراً ، و قال النسائي: ضعيف" دیکھیں (۱٤۰۹/۳/۷)

ایک تیسرے مقام پر لکھتے ہیں:

" قال الهيثمي في " المجمع" (۲٦٥/٦) رواه الطبراني ، و فيه يحيى بن عبد الحميد الحماني و هو ضعيف" ملاحظہ ہو (۱۷٥٥ /۳٤۹/٤)

حافظ ہیثمی نے ایک مقام پر نہیں بلکہ کئی مقامات پر ان کو ضعیف کہا ہے مثلاً ملاحظہ ہو: "مجمع الزوائد

"(۴/ ۹، ۹/ ۷، ۲۱۳، ۷/ ۳۰، ۱۶۰)

اور ایک مقام پر یوں کہا ہے :" ضعیف ، و قد وثق ، والکلام فیه کثیر ."(٤/ ١٧٦) اور ایک مقام پر یوں بھی کہا ہے :" ضعفه أحمد، و رماه بالکذب " (١/ ١٠٤)

مذکورہ تصریحات کی بناء پر ہم امید رکھتے ہیں کہ موصوف نے اپنے اس مضمون میں تو دبے لفظوں میں ''الحمانی'' کے ضعف کا اعتراف کیا ہے اور آئندہ وہ کھلے لفظوں میں اس بات کا اعتراف کریں گے۔ ان شاء اللہ!

تنبیہ: موصوف نے جو یہ کہا ہے کہ البانی صاحب نے اس کی روایت کو بطور شاہد و متابع قبول کیا ہے تو اس سے دراصل وہ ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ ''الحمانی'' کی روایت چونکہ شاھد اور متابع کے طور پر مقبول ہے، لہٰذا " نؤمن و نتوکل علیه" کی جو دوسری دو روایات ہیں۔ یحییٰ الأموی اور عبد الملک الرقاشی کی روایتیں۔ ان کے لیے اس کی روایت شاہد ہے، ان کے اس استدلال پر ہمارے دو جواب ہیں:

① ...... یہاں وہ قاعدہ نہیں چلے گا کہ دو تین ضعیف سندوں یا حدیثوں کو ملا لینے سے ان میں تقویت پیدا ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس حدیث کی جو ثقات کی روایات ہیں ان میں ان الفاظ کا اضافہ نہیں آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ اضافہ صرف ضعیف روایات میں پایا جاتا ہے صحیح روایات میں کیوں نہیں؟ اور ثقات کی روایت میں اس کا عدم وجود اس کے عدم ثبوت پر دلیل ہے کیونکہ اس اضافے کی اگر اس حدیث میں کوئی اصل ہوتی تو آخر کوئی ثقہ راوی بھی تو اس کو بیان کرتا۔

② ......اس سند کی علت صرف '' الحمانی'' نہیں بلکہ اس میں ایک دوسری علت بھی ہے وہ یہ ہے کہ ابونعیم کا شیخ '' جعفر بن محمد بن عمرو'' یہ قابل غور ہے۔ موصوف نے اپنے پہلے مضمون میں لکھا تھا کہ '' جعفر بن محمد'' کا ترجمہ مجھے جلدی میں مل نہ سکا۔''

ہم نے بھی اپنے وسائل کی حد تک اسے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا ترجمہ نہ مل سکا جیسا کہ ہم اپنے پہلے مضمون میں بھی ذکر کر چکے ہیں۔

موصوف اپنے پہلے مضمون میں تو جلدی میں تھے۔ لیکن اس مضمون کو تو انھوں نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے تو کم از کم اس میں ہی اس کا ترجمہ تلاش کر کے ذکر کر دیتے لیکن اس مضمون میں تو وہ اسے ویسے ہی بھولے ہوئے ہیں اور انھوں نے اپنی تمام تر کوشش " الحمانی " کو ثقہ ثابت کرنے پر ہی صرف کی ہوئی ہے تا کہ کوئی بات بن جائے مگر بات بنتی دکھائی نہیں دیتی۔

محسوس یوں ہوتا ہے کہ کتب رجال میں اس کا ترجمہ ہی نہیں کیونکہ "معرفة الصحابة" لابی نعیم کے محقق ڈاکٹر محمد راضی عثمان نے جہاں مذکورہ کتاب میں سب سے پہلی سند میں اس کا ذکر ہے وہاں حاشیہ میں اس کا ذکر کر کے آگے سوالیہ نشان (؟) دیا ہوا ہے جس کے معنے یہ ہوئے اس کا ترجمہ انھیں بھی نہیں مل پایا، ملاحظہ ہو، معرفة الصحابة (۱/ ۲۱٤، حاشیہ: ۳)

جب اس راوی کے بارے میں کچھ علم ہی نہیں تو یہ اس سند کی ایک دوسری علت ہے کیونکہ ممکن ہے کہ "جعفر" ثقہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ غیر ثقہ ہو، ہوسکتا ہے کہ موصوف یہ کہیں چونکہ یہ کتاب "صحیح مسلم" پر مستخرج ہے۔

لہٰذا جیسے مسلم کے راوی ثقہ ہیں ویسے ہی اس کے رواۃ بھی ثقات ہیں، ہم اس بات کا جواب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے درج ذیل کلام سے دیں گے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ "النكت على كتاب ابن الصلاح" (۱/ ۲۹۳) میں رقمطراز ہیں:

" ...... بل رأيت في مستخرج أبي نعيم وغيره الرواية عن جماعة من الضعفاء."

اسی طرح "مستخرج أبي عوانه على صحيح مسلم" اور "مستخرج الاسماعيلي على صحيح البخاري" پر بھی ان کا کلام (۱/۲۹۱۔۲۹۲) ملاحظہ کریں۔

موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں: "حافظ مزی نے اس راوی کے بارے میں سارے اقوال نقل کرنے کے بعد بطور فص الخاتم امام بخاری اور امام احمد رحمہما اللہ کے شیخ اور علی بن المدینی رحمہ اللہ کے زمیل خاص، جرح و تعدیل کے معتبر امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ کا قول اس طرح نقل کیا ہے:

" و يحيى بن معين حسن الثناء عليه و على ابيه، وذكران الذى تكلم فيه من حسد، و لم أرفي مسنده و احاديثه أحاديث مناكير، و أرجو أنه لا بأس به."

علم و اصول حدیث سے متصف حافظ مدنی صاحب جیسے حضرات تو کتب جرح و تعدیل کے طریقہ بیان سے واقف ہیں۔ میں نے اپنی کم مائیگی سے جو سمجھا ہے اسے قلمبند کر دیا ہے اور اس پر قائم ہوں۔"

یہ موصوف کا کلام ہے اور اس پر ہمارے درج ذیل ملاحظے ہیں:

① موصوف نے یہ بات تو بڑے پتے کی کی ہے المزی نے چونکہ سارے اقوال نقل کرنے کے بعد آخر میں ابن معین کا قول نقل کیا ہے تو یہ بطور فص الخاتم ہے لہٰذا "الحمانی" ثقہ ہیں یا کم از کم مزی کے نزدیک

تو ثقہ ہیں۔

دراصل انسانی فطرت ہے کہ اگر کوئی معمولی سی بات بھی آدمی کے ذہن کے مطابق ہو، یا اس میں اس کے ذہن کے ساتھ مطابقت کا ادنیٰ سا بھی احتمال پایا جاتا ہو تو وہ اسے بہت بڑی تصور کر بیٹھتا ہے۔

مزی نے اگر "الحمانی" کی اپنی طرف سے توثیق کے بعد ابن معین کا قول ذکر کیا ہوتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ انھوں نے اس قول کو بطور فصل الخاتم ذکر کیا ہے جب کہ ایسی کوئی بات ہی نہیں انھوں نے اس کے بارے میں جو اقوال تھے بس ان کا ذکر دیا ہے۔

اس کے باوجود موصوف اگر اپنی بات پر مصر ہیں تو پھر ان پر ضروری ہے کہ وہ مزی ہی کی کسی دوسری کتاب سے یہ ثابت کریں کہ انھوں نے اس قول کو فص الخاتم کے طور پر ذکر کیا ہے ورنہ یہ کہنا حافظ مزی کی طرف ایسی بات منسوب کرنے کے مترادف ہوگا جس کے وہ قائل نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مزی نے یحییٰ بن معین کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا ہے وہ ابن عدی کے حوالے سے ذکر کیا ہے، اور ابن عدی کا جو قول انھوں نے ذکر کیا ہے وہ ایک طویل قول ہے اور ابن معین کا مذکورہ قول اس کا آخری ٹکڑا ہے، موصوف نے اس کو جو "یحییٰ بن معین حسن الثناء" سے ذکر کیا ہے تو اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ وہ یہ فرق نہیں کر پائے کہ یہ بھی اس عدی کے قول کا ٹکڑا یا حصہ ہے یا کہ مزی کا کلام ہے اس لیے وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ قول مزی نے یحییٰ بن معین سے نقل کیا ہے۔ اب ہم قارئین کے لیے ابن عدی کا وہ قول جسے مزی نے نقل کیا ہے اس کو من وعن ذکر کرتے ہیں حافظ مزی لکھتے ہیں:

" وَ قال أبو أحمد بن عدی :" و یحییٰ الحمانی مسند صالح، و یقال إنه أوّل من صنف المسند بالکوفة ، و أوّل من صنف المسند بالبصرة مسدّدًا ، و أوّل من صنّف المسند ، بمصر "أسد السنة" و أسد قبلهما ، و أقدم موتاً ، ویحیٰ الحمانی یقال: إن عبد اللّٰه بن عبد الرحمن السمر قندی أو دعه کتباً لما خرج إلی مکة فلما انصرف وجد کتبه محلولاً ، فقال عبد اللّٰه إنه سرق من کتبه أحادیث لسلیمان بن بلال حدث بها الحمانی عن سلیمان نفسه ، و کان هذا أحد محسن الحمانی، و تکلم فیه أحمد، و علی ابن المدینی ، ویحییٰ بن معین حسن الثناء علیه و علی أبیه ، و ذکر أن الذی تکلم فیه [تکلم] [1] من حسدٍ ، و لم أری فی مسند و أحادیثه أحادیث

[1] یہ دونوں اضافے کامل ابن عدی سے کئے گئے ہیں۔، نیز کامل ابن عدی اور تھذیب الکمال کے چند الفاظ میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔

مناكير [فاذكرها] و أرجو أنه لا بأس به " ("تهذيب الكمال" (۳۱/ ۴۳۳-۴۳۴) ایضا "كامل ابن عدی" (۷/ ۲۶۹۴-۲۶۹۵)

یہ ہے ابن عدی کا وہ کلام جسے مزّی نے نقل کیا ہے۔ اب قارئین خود یہ فیصلہ کر لیں کہ ابو الأ شبال صاحب کا مدعا اس میں کہاں تک پایا جاتا ہے؟

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ مزی۔ درسنت ابن عدی۔ کے قول کے جس ٹکڑے سے ابو الأ شبال صاحب کا مقصد پورا ہوتا تھا اس کو ذکر کر دیا اور جو حصہ مقصد کے خلاف تھا اس کو حذف کر دیا۔

۲ موصوف کا یحییٰ بن معین کو امام أحمد بن حنبل کا شیخ قرار دینا محل نظر ہے کیونکہ وہ ان کے أقران میں سے ہیں ،شیوخ میں سے نہیں۔ ملاحظہ ہو : "سیر أعلام النبلاء " للذهبی (۱۱/ ۷۲،و أيضا ۸۲) ، "تهذیب الكمال" (۳۱/ ۵۴۶) اور "تهذیب التهذیب (۱۱/ ۲۴۷)

اسی طرح علی بن المدینی بھی امام أحمد بن حنبل کے أقران میں سے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ "تهذیب التهذیب "(۷/ ۳۰۶۔ ترجمه علی)

۳ موصوف ویسے تو خود کو ماہرین فن اور علماء حدیث ، اصول حدیث و رجال میں شمار کرتے ہیں جیسا کہ ان کی تحریر سے ظاہر ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ علماء کرام کے لیے فوائد بھی بیان کرتے ہیں مگر حال یہ ہے کہ وہ بعض عام سی باتوں کو بھی صحیح طرح سے سمجھ نہیں پاتے۔ انھوں نے جس قول کو ابن معین کا قول قرار دیا ہے یہ ان کا قول نہیں بلکہ ان کے بارے میں یہ بات ابن عدی نے کہی ہے۔ اس پر ادنیٰ سا بھی تامل کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ابن معین کا قول نہیں ہو سکتا کیونکہ کوئی شخص اپنے بارے میں یوں نہیں کہے گا مثلاً : کیا ابو الأ شبال صاحب اپنے بارے میں یہ کہیں گے؟

" ابو الأشبال حسن الثناء علی فلان " ابو الأ شبال نے فلاں شخص کی تعریف کی ہے یا اسے سراہا ہے۔
موصوف نے اگر کسی شخص کی تعریف کی ہو گی تو دوسرا آدمی ان سے بیان کرتے ہوئے یہ کہے تو معقول ہے لیکن ابو الأ شبال صاحب خود ایسے کہیں تو......

اس قول کو یحییٰ بن معین کا قول قرار دینے کے لیے اگر کوئی جواز پیدا کر لیں یا اس کی کوئی توجیہ کر لی جائے تو وہ جواز یا توجیہ " یحییٰ بن معین حسن الثناء علیه من حسد "کی حد تک ہو گی اس کے بعد والے کلام کے لیے نہیں کیونکہ " و لم أر فی مسنده لا بأس به" یہ ابن معین کا قول نہیں بلکہ ابن عدی کا اپنا قول ہے

اس لیے کہ رواۃ کے بارے میں کلام کا یہ انداز ابن عدی کا ہے یحییٰ بن معین کا نہیں جیسا کہ کتب جرح و تعدیل سے شغف رکھنے والے حضرات پر یہ مخفی نہ ہوگا، لیکن افسوس ہے کہ موصوف اس کو سمجھ نہیں پائے۔

ممکن ہے کہ موصوف یہ کہیں کہ میں تو اس کو ابن معین ہی کا قول سمجھتا ہوں اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ ابن عدی کا قول ہے؟

اس کی دلیل یہ ہے کہ علامہ ذہبی نے " میزان الاعتدال" (٤/٣٩٢) ، "دیوان الضعفاء والمتروکین" (٢/٤٥٠) اور " سیر أعلام النبلاء (١٠/٥٣٧) میں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "تہذیب التھذیب" (١١/٢١٧) میں اس قول کو ابن عدی ہی کی طرف منسوب کیا ہے۔

ممکن ہے کہ موصوف اس پر بھی مطمئن نہ ہوں اور یہ کہیں کہ مجھے تو ابن عدی کی کتاب ہی سے ثبوت چاہیے لہٰذا ہم ان کو ابن عدی کی کتاب سے بھی ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

''کامل ابن عدی'' میں کئی مقامات پر آپ درج ذیل یا اس سے ملتی جلتی عبارتی دیکھیں گے۔" و لم أر فی أحادیثه حدیثًا منکرا" مثلاً ملاحظہ ہو :(۱/۲۳۳، ۳۸۹) ،(۲/۸۶۱، ۵۳۱) ،(۱۳/۹۳۰، ۹۴۸، ۹۹۴)

اسی طرح درج ذیل عبارت آپ کو بکثرت ملے گی (و أرجو أنه لا بأس به) مثال کے لیے درج ذیل مقامات دیکھیں (۱/۲۸۳، ۲/۵۸۴، ۵۷۵، ۷۳۴، ۳/۹۶۱، ۹۹۴، ۱۱۵۴، ۱۲۷۶)

نیز موصوف اگر یحییٰ بن عبد الحمید کے بارے میں مزی کے حوالے سے تھوڑی دیر پہلے ابن عدی کا جو کلام گذرا ہے اس میں اس جملہ " و لم أر فی أحادیثه أحادیث مناکیر فأذکرها" پر غور کریں تو حقیقت اُن پر منکشف ہو جائے گی۔

موصوف نے اپنے مذکورہ کلام کے آخر میں یہ کہہ کر کہ ''میں نے اپنی کم مائیگی سے جو سمجھا ہے اسے قلمبند کر دیا ہے بہت اچھا کیا کیونکہ اس سے ان کا کچھ نہ کچھ بچاؤ ہو گیا۔

اس کے بعد ابو الأشبال صاحب کا یہ کہنا کہ ''اور اسی پر قائم ہوں'' تو یہ ایک قسم کی ہٹ دھرمی ہے، اپنے مقصد کی بات کو لے کر اس پہ ڈٹ جانا اہل علم کی شان نہیں، لیکن موصوف کے اندر ہمیں اہل علم کی صفات، تواضع ، وقار، دوسروں کا احترام وغیرہ کم ہی دکھائی دیتی ہیں۔

اس کے بعد ابو الأشبال لکھتے ہیں:

تنبیہ: حافظ ذہبی نے جو یہ کہا ہے کہ " الجرح مقدم ، و أحمد والدارمی بریئان من الحسد"

اس قول کو سمجھنے کی ضرورت ہے، احمد اور دارمی نے جو کچھ اس کے بارے میں فرمایا ہے وہ دوسروں کی شہادت پر اور ابن معین نے جو کچھ فرمایا وہ اپنی تحقیق و تجربہ سے، اور جب جرح مفسر یا غیر مفسر کا ثبوت ہی مشکوک ہو مقدم کیسے ہوا؟

موصوف آپ نے یہ بات بھی بڑے پتے کی کہی آپ ہی تو اس قول کو سمجھ سکے لیکن حافظ ذہبی جیسے نقاد کی سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی، آپ کا مقصد پورا ہونا چاہیے۔ امام احمد اور امام دارمی پر بے تحقیق بات کہنے کا الزام آئے تو آئے لیکن آپ نے جو کچھ فرما دیا اس پر کسی قسم کا حرف نہیں آنا چاہیے۔ اس موقع پر ہمیں ایک شاعر کا یہ شعر یاد آ گیا۔

إذا قالت حذام فصدقوها
فإن القول ما قالت حذام

اب موصوف سے ہمارا یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ امام احمد اور دارمی نے ''یحیٰی بن عبدالحمید'' کے بارے میں جن لوگوں کی شہادت کی بناء پر کلام کیا ہے ان کی شہادت آپ کے نزدیک کیسی ہے معتبر یا غیر معتبر؟ اگر آپ یہ کہیں وہ شہادت معتبر تھی تو پھر بات واضح ہے مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔

اور اگر یہ کہیں کہ وہ شہادت غیر معتبر تھی تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ان ائمہ نے غیر معتبر شہادت کو قبول کر کے اللہ عزوجل کے اس فرمان ﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِن جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓا۟ . ﴾ [الحجرات:٦] اور اس قسم کے دیگر دلائل کی مخالفت کی۔

ابو الأشبال صاحب شاید آپ کی سمجھ میں یہ بات نہ آ رہی ہو کہ آپ اپنی ان باتوں سے ائمہ کو مطعون کر رہے ہیں جو ایک انتہائی خطرناک اقدام ہے۔ اللہ عزوجل ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔

وہ شخص قطعاً امام نہیں ہو سکتا جو سنی سنائی بات پر اعتماد کرے اور پھر اسے آگے بھی بیان کرے چنانچہ امام عبدالرحمٰن بن مھدی کیا فرماتے ہیں؟ فرماتے ہیں:

" لا يكون إماماً في العلم من أخذ الشاذ من العلم ، و لا يكون إماماً في العلم من روى عن كل أحد . و لا يكون إماماً في العلم من روى كل ما سمع ." (جامع بيان العلم لابن عبد البر." (٤٨/٢) ❶

---

❶ اسی معنی کی وہ حدیث بھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ((كفىٰ بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بكل ما سَمِعَ)) أخرجه مسلم في المقدمة (رقم:٥) واللفظ له ، ابو داؤد (٤٩٩٢) وغيرهما مگر اس حدیث کے موصول اور مرسل ہونے میں اختلاف ہے۔ امام حاکم اور نووی نے موصول کو ترجیح دی ہے جب کہ امام دارقطنی نے مرسل کو صواب کہا ہے اور امام ابوداؤد کا رجحان اسی طرف ہے۔

آیئے! اب ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ امام احمد اور دارمی نے ''الحمانی'' میں جو کلام کیا ہے وہ محض دوسروں کی شہادت کی بناء پر ہے یا کہ انھوں نے اپنی تحقیق اور تجربے سے ان کے بارے میں کلام کیا ہے۔

چنانچہ اب ہم قارئین کے لیے ان کے اقوال ذکر کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ ان کا ''حمانی'' کے بارے میں جو کلام ہے اپنی تحقیق اور تجربے کی بناء پر ہے نہ کہ دوسروں کی شہادت پر۔

واضح رہے کہ خوفِ طوالت اور قلت وقت کی بناء پر ہم ان کے اقوال کو عربی میں بغیر ترجمہ کیے ذکر کریں گے۔

①...... امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ:

عبداللہ بن احمد بن حنبل بیان کرتے ہیں:

①......" قلت لأبي : إن ابني أبي شيبة ذكر أنهما يقدمان بغداد فما ترى فيهم ؟ فقال : قد جاء ابن الحماني إلى ههنا فاجتمع عليه الناس ، و كان يكذب جهاراً......

قلت لأبي : ابن الحماني حدث عنك عن إسحاق الأزرق عن شريك عن بيان عن قيس عن المغيرة بن شعبة عن النبي صلى الله عليه وسلم ((ابردوا بالصلاة)) فقال : كَذَب، ما حدَّثته به .

فقلت: إنَّهُم حكوا عنه أنه قال: سمعته منه في المذاكرة على باب إسماعيل بن علية ، فقال: كذب ، إنَّما سمعته بعد ذالك من إسحاق الأزرق ، و أنا لم أعلم تلك الأيام أن هذا الحديث غريب ، حتى سألُوني عنه بعد ذالك هؤلاءِ الشباب ، أو قال: هؤلاء الأحداث.

قال أبي: وقت التقينا على باب ابن عُلية إنما كنا نتذاكر الفقه والأبواب، لم نكن تلك الأيام نتذاكر المسند ، كنا نتذاكر الصغار ، و أحاديث الفقه و الأبواب، و قال أبي : كان وقع إلينا كتاب الأزرق عن شريك فانتخبت منه فوقع هذا الحديث فيها .

قلت له: أخبرني رجل أنه سمع ابن الحماني يحدث عن شريك عن منصور عن إبراهيم﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْىُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴾ الشورى :٣٩. قَال : كانوا يكرهون [أن] يستذلوا، فقال له رجل: هذا الحديث عندنا في كتب ابن المبارك عن شريك عن الحكم النصري عن منصور ، فقال ابن الحماني : حدثنا ه شريك عن

الحکم النصری عن منصور.

ثم قال أبی: ما کان أجراه ، هذه جرأة شدیدة ، و لم یعجبه ذالك، و قال ما زلنا نعرف أنه یسرق الأحادیث ، او یتلقطها ، أو یتلقفها"

ملاحظہ ہو " العلل و معرفة الرجال" للإمام أحمد روایة ابنه عبد اللّٰه(۳/ ۴۰ـ۴۱ ، فقرات ۴۰۷۶ـ۴۰۷۹) أیضا " الضعفاء الکبیر "للعقیلی (۴/ ۴۱۳) " الجرح والتعدیل (۹/ ۱۶۸ـ۱۶۹) " تاریخ بغداد (۱۴/ ۱۷۲) "تهذیب الکمال" (۳۱/ ۴۲۴ـ۴۲۵) اور "تهذیب التهذیب " (۱۱/ ۲۱۴ـ۲۱۵)

۲...... قال أبو بکر المروذی: ذکر أحمد بن حنبل الحمانی ، فقلت إنه روی عنك حدیث إسحاق الأزرق حدیث المغیرة بن شعبة " أَبْرِدُوا بِالصَّلَاة" و زعم أنه سمعه علی باب ابن علیة ، فأنکر أن یکون سمعه ، و قال : لیس من ذا شیء ؟ قلت : إنه ادعی أن هذا علی المذاکرة، فقال :و أنا علمت فی أیام إسماعیل أن هذا عندی. یعنی إنما أخرجته بآخرة. قال: قولوا لهارون الحمال یضرب علی حدیث الحمانی "تاریخ بغداد "(۱۴/ ۱۷۱) " سیر أعلام النبلاء" (۱۰/ ۵۲۹) اور " تهذیب التهذیب" (۱۱/ ۲۱۴)

۳......امام ابوداؤد بیان کرتے ہیں:

" حدث یحییٰ بن عبد الحمید عن أحمد بن حنبل بحدیث إسحاق الأزرق ، عن شریك عن بیان حدیث المغیرة بن شعبة فأنکره أحمد ، و قال : ما حدثته به ، فقال یحییٰ: حدثنا أحمد علی باب إسماعیل بن علیة، فقال أحمد : ما سمعناه من إسحاق إلا بعد موت إسماعیل ، یعنی حدیث المواقیت، تاریخ بغداد(۱۴/ ۱۷۱) "سیر أعلام النبلاء" للذهبی (۱۰/ ۵۲۹) اور " تهذیب التهذیب" (۱۱/ ۲۱۴)

۴......قال عبد اللّٰه أیضاً:قلت لأبی : بلغنی أن أسد الحمانی حدث عن شریك عن هشام بن عروة عن أبیه عن عائشة أن النبی ﷺ کان یعجبه النظر إلی الحمام ، فأنکروا علیه فرجع عن رفعه ، وقال عن عائشه مرسلاً ، فقال أبی : هذا کذب ،

إنّما كنا نعرف به حسين بن علوان ، و يقولون : إنّما وضعه على هشام" "العلل" (۲/ ٤٤/ ١٤٩٩) و أيضاً " الضعفاء " للعقيلي (٤/ ٤١٣) اور " تهذيب التهذيب (۱۱/ ۲۱۵) وغیرہ۔

۵...... قال ابو بكر الاثرم: قلت لأبى عبد الله : ما تقول فى ابن الحمانى فقال: ليس هو واحد و لا اثنين ولا ثلاثة ولا أربعة يحكون عنه ، ثُمَّ قَالَ : الْأمر فيه أعظم من ذاك و حمل عليه حملاً شديداً في أمر الحديث.

و قال الأثرم أيضاً: قال لى ابو عبد الله : الحديث الذى كان أبو الهيثم يرويه عن سفيان بن حسين عن يعلى بن مسلم عن سعيد بن جبير عن ابن عباس عن أبى ﴿للذين يؤلون من نسائهم .﴾ أرأيتَهُ فى كتب عبد الله بن موسىٰ؟ فقلت : لا فقال: قد رواه يحيىٰ بن إسماعيل ذاك الواسطى عن عباد و عن سفيان بن حسين فقال: قد رواه يحيىٰ بن إسماعيل ذاك الواسطى عن عباد و عن سفيان بن حسين ليس فيه أنى أوقفه على ابن عباس، قلت لأ بى عبد الله : فإن ابن الحمانى يرويه فنفض يده نفضة شديدة ثم قال: ابن الحمانى الآن ليس عليه قياس أمر ذالك عظيم أو كما قال: ثم قال: سبحان الذى يستر من يشاء ، و رأيته شديد الغيظ عليه" تاريخ بغداد "(١٤/ ١٧٣-١٧٤) اور "تهذيب الكمال"(۳۱) ٤٢٦) وغیرہ۔

۶......قال يعقوب بن سفيان : " و أما الحمانى فان أحمد بن حنبل سيّء الرأى فيه، و أبو عبد الله متحيِّرٌ فى مذهبه ، مذهبه أحمد من مذهب غيره" (تاريخ بغداد (١٤/ ١٧٤) ، تهذيب الكمال (٣١/ ٤٢٧) اور " تهذيب التهذيب"(١١/ ٢١٥)

۷......قال الحسن بن الربيع : قال أحمد : يحيىٰ ليس بمامون على الحديث "تهذيب التهذيب(١١/ ٢١٧)

۸...... علامہ ذہبی "سير أعلام النبلا " (١٠/ ٥٣٧) میں لکھتے ہیں:

" و قد تواتر توثيقه عن يحيىٰ بن معين كما قد تواتر تجريحه عن الإمام أحمد ."

اور" تاریخ الاسلام" (حوادث ووفیات ۲۲۱-۲۳۰ھ ،ص ۴۵۳) میں رقمطراز ہیں:

"و كان أحمد يضعفه و يتهمه"

علامہ ذہبی رحمہ اللہ کے ان اقوال سے بھی معلوم ہوا کہ "حمانی" کے بارے میں امام احمد کا اپنا کلام ہے نہ کہ دوسروں پر اعتماد کرتے ہوئے انھوں نے اس میں کلام کیا ہے۔

9 ......علامہ یوسف بن حسین بن عبد الہادی جو کہ ابن مُبرِد کے لقب سے معروف ہیں۔ نے "حمانی" کو اپنی کتاب "بحر الدم فيمن تكلم فيه الإمام أحمد بمدح أو ذم" (ترجمہ ۱۱۵۰) میں ذکر کیا ہے۔

اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ امام احمد کا "حمانی" کے بارے میں جو کلام ہے وہ اپنے تجربے اور تحقیق کی بناء پر ہے نہ کہ دوسروں کی شہادت کی بناء پر۔

کیونکہ انھوں نے دوسروں کی شہادت کی بناء پر اس میں کلام کیا ہوتا تو علامہ ذھبی یوں نہ کہتے:

"قد تواتر تجريحه عن الإمام أحمد، "و كان أحمد يضعفه و يتهمه،

اور نہ ہی علامہ ابن مَبُرِد اپنی مذکورہ کتاب میں اس کو ذکر کرتے۔

مذکورہ تمام اقوال سے معلوم یہ ہوا کہ امام احمد نے "الحمانی" کے بارے میں جو کلام کیا ہے وہ اپنی تحقیق اور تجربے کی بناء پر نہ کہ دوسروں کی شہادت پر اعتماد کرتے ہوئے۔

امام احمد کے بارے میں موصوف نے دوسروں کی شہادت پر اعتماد کا جو ذکر کیا ہے تو شاید وہ امام احمد کے اس قول کی بنا پر ہو۔

عبد الصمد بن سلیمان بلخی کا کہنا ہے کہ میں نے احمد بن حنبل سے "الحمانی" کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا:

"تركناه بقول عبد الله بن عبد الرحمن السمرقندي لأنه إمام" (تاریخ بغداد (۱۰/۳۱)، تهذيب الكمال (۱۵/۲۱۳-۲۱۴)

"ہم نے اسے عبد اللہ بن عبد الرحمٰن سمرقندی۔ یعنی امام دارمی صاحب المسند کے کلام کی وجہ سے ترک کر دیا ہے کیونکہ وہ امام ہیں۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ امام احمد نے "حمانی" کے بارے میں پہلے امام دارمی پر اعتماد کیا ہوگا لیکن جب آپ پر اس کا حال واضح ہوگیا تو پھر خود بھی اس کے بارے میں کلام کیا۔

اسی طرح امام احمد کے حمانی کے بارے میں بعض جو دوسرے اقوال ہیں مثلاً:

① محمد بن عبداللہ الحضرمی کہتے ہیں: کہ میں نے احمد بن حنبل سے ''حمانی'' کے بارے میں سوال کیا اور کہا کہ آپ اسے جانتے ہیں آپ کو اس کے بارے میں کچھ علم ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ میں اسے کیسے نہیں جانتا ہوں، تو میں نے کہا کہ وہ ثقہ ہے انھوں نے جواب دیا: " انتم أعرف بمَشَايخكم" تاریخ بغداد (۱۷۰/۱۴) وغیرہ۔

② محمد بن عبدالرحمٰن شامی کہتے ہیں: احمد بن حنبل سے حمانی کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ خاموش رہے اور کچھ نہیں کہا،(أيضاً تاريخ بغداد ، الضعفاء للعقيلي ٤١٣/٤ـ٤١٤)

③ میمونی کہتے ہیں کہ میں نے ان سے ''حمانی'' کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا " لا أدری، و نفض يده ." (تهذيب الكمال (٤٢٢/٣١) ، تهذيب التهذيب (٢١٤/١١)

تو ان اقوال کو بھی اسی پر محمول کیا جائے گا کہ ان کے یہ اقوال انھیں حمانی کے بارے میں معلومات ہونے سے پہلے کے ہیں۔

یہی بات دکتور وصی اللہ نے بھی " بحرم الدم" کے مقدمے میں ۔ ملاحظہ ہو،ص:۳۱۔ کہی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

" و الكتاب مفيد جدا في موضوعه حيث جمع روايات الإمام أحمد على اختلاف الرواة عليه، و هذا يعطي صورة واضحة عن رأى الإمام في الراوی فربما يكون لم يعلم الراوی في رواية بعض تلامذته ، ثم علمه و عرفه فيما بعد، كما قد يكون حسن رأيه في بعضهم أوّل الأمر ثم ظهر منه ما جعله يغير رأيه فيه ، فبهذا يسهل القول بالرای الراجح عند اختلاف قول الإمام في راوٍ واحد ."

④...... امام عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی رحمہ اللہ:

یحییٰ بن عبدالحمید الحمانی کے بارے میں امام احمد کے اقوال ذکر کرنے کے بعد اب ہم قارئین کے لیے ''حمانی'' کے بارے میں امام دارمی کے جو اقوال ہیں ان کا ذکر بھی کرتے ہیں تاکہ یہ بات واضح طور پر سامنے آسکے کہ اس کے بارے میں امام دارمی نے جو کلام کیا ہے وہ اپنی تحقیق اور تجربے کی بناء پر کیا ہے نہ کہ دوسروں کی شہادت پر اعتماد کرتے ہوئے جیسا کہ ہمارے موصوف ابو الأشبال صاحب کا دعویٰ ہے۔ ہمیں از حد

افسوس ہے کہ ابو الأشبال صاحب نے ہمارا اور قارئین کا قیمتی وقت ایسی باتوں پر صرف کروا دیا ہے جن پر صرفِ وقت کی ضرورت نہ تھی۔ عفا اللہ عنہ.

① امام احمد کے اقوال کے آخر میں۔ نمبر ۹ کے بعد۔ عبد الصمد بن سلیمان بلخی کا یہ قول ذکر ہوا کہ میں نے احمد بن حنبل سے ''حمانی'' کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا۔ " ترکناه بقول عبد الله بن عبد الرحمن السمر قندی لأنه إمام" ہم نے عبد اللہ بن عبد الرحمٰن سمرقندی کے قول کی وجہ سے ''حمانی'' کو ترک کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ امام ہیں۔

امام احمد کے اس قول سے معلوم ہوا کہ دارمی نے اپنی تحقیق اور تجربے کی بناء پر ''حمانی'' کے بارے میں کلام کیا ہے اسی لیے تو امام احمد نے یہ فرمایا: "لأنه إمام"

② سلیمان بن داؤد القطان کہتے ہیں:

" سمعت عبد الله بن عبدالرحمن السمرقندی، يقول: قدمت الكوفة حاجاً فأودعت يحيىٰ بن عبد الحميد الحمانی كتباً لی ، و خرجت إلى مكة ، فلما رجعت من الحج اتيته فَطَلَبْتُهَا فجحدنی ، و أنكر فوقفت به فلم ينفع ذالك . فصايحته ، واجتمع الناس علينا. فقام إلى ورّاقه فأخذ بيدَيَّ فَنَحَّانِی، و قال لی : أمسكت تخلصت لك الكتب فأمسكت فإذا الوراق قد جاء نی بالكتب ، و كان مشددة فی خرقة و بعد ، فإذا الشد متغير فنظر ت فی الأجزاء ، فإذا فيها علامات بالحمرة و لم يكن نظر فيها أحد ، وإذا أكثر العلامات على حديث مروان الطاطری عن سليمان ابن بلال ، و عبد العزيز بن محمد الدراوردی ، فافتقدت منها جزأين" (رواه العقيلی فی " الضعفاء" (٤/ ٤١٤) عن القطان، و من طريق العقيلی رواه الخطيب فی " تاريخه" (١٤/ ١٧٥) ، أنظر أيضاً " سير الذهبی" (١٠/ ٥٣٤) و " تهذيب المزی" (٣١/ ٤٣٠)

و فی رواية محمد بن يحيىٰ الذهلی عن الدارمی قال: أودعت يحيىٰ الحمانی كتبی، و كان فيها حديث خالد الواسطی عن عمرو بن عوف ، و فيها حديث سليمان ابن بلال عن يحيىٰ بن حسان، و كنت قد سمعت منه المسند ، و لم يكن فيه من حديث خالد و سليمان حديث واحد، فقدمت فإذا كتبی على خلاف ما

تركتها عنده ، و إذا قد نسخ حديث خالد و سليمان ، و وضعه في المسند ، قال محمد بن يحيى: ما أستحل الرواية عنه."

رواه الخطيب (١٤/ ١٧٤-١٧٥) ، أنظر أيضاً ،سير الذهبي (١٠/ ٥٣٣-٥٣٤) و "تهذيب المزى" (٣١/ ٤٢٩-٤٣٠) و "تهذيب الحافظ" (١١/ ٢١٦)

و في رواية سعيد بن مسعود المروزى يقول: سمعت عبد الله بن عبد الرحمن السمرقندى يقول: قدمت الكوفة فنزلت بالقرب من يحيىٰ الحمانى فذاكرته بأحاديث سمعتها بالبصرة من أحاديث سليمان بن بلال، و كان يستغربها ، و يقول : ما سمعت هذا من سليمان ، ثُمَّ أردت الخروج إلى الشام فأودعت كتبى و ختمت عليها، فلما انصرفت، و جدت الخواتيم قد كسرت، فقلت ما شأن هذه الكتب و هذه الخواتيم ؟ فقال: ما أدرى ، و وجدت تلك الأحاديث التى كنت ذاكرته بها عن سليمان بن بلال قد أدخلها فى مصنفاته ، فقلت له سمعت من سليمان بن بلال قال : نعم: "انظر المصادر المذكورة.

و فى رواية رواها ابن أبى حاتم عن على بن الحسين بن الجنيد قال حدثنى من سمع عبد الله بن عبد الرحمن السمر قندى يقول: خلفت عند يحيىٰ الحمانى كتباً فيها احاديث عن سليمان بن بلال وغيره فرأيته قد أخرج ذالك فى الزيادات. " (الجرح والتعديل (٩/ ١٦٩)

امام دارمی سے مذکورہ بالا روایات سے معلوم ہوا کہ یحییٰ الحمانی'' ان کے نزدیک ''سارق الحدیث'' تھے اور انھوں نے ان کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا اپنی تحقیق اور تجربے کی بناء پر ذکر کیا ہے نہ کہ کسی دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے انھوں نے یہ باتیں کہی ہیں۔

حمانی صرف دارمی کے نزدیک ''سارق الحدیث'' نہیں بلکہ دیگر ائمہ کے نزدیک بھی یہ ''سارق الحدیث'' ہیں۔ مثلاً

① امام دارمی کے اقوال سے قبل امام احمد کے جو اقوال گذرے ہیں ان میں سے قول نمبر(۱) کے آخر میں ہے ''ما زلنا نعرف أنه يسرق الحديث......''

۲ قال ابن أبی حاتم : حدثنا علی بن الحسین بن الجنید قال : سمعت إسماعیل بن موسیٰ نسیب السُّدِّی . و إسماعیل هو الفزاری من شیوخ أبی داؤد والترمذی و ابن ماجه یقول : جاء نی یحیٰ الحمانی ، وسألنی عن أحادیث عن شریك، فذهب فرواها عن شریك ، و قال: هو كذاب۔" الجرح والتعدیل(۹/ ۱۶۹)

۳ قال ابو طالب عن الحسن بن الربیع ، جاء نی یحییٰ الحمانی فسألنی عن حدیثین من حدیث ابن المبارك فأملیتهما علیه ثم بلغنی أنه حدث بهما عن ابن المبارك. (تهذیب التهذیب (۱۱/ ۲۱۷)

۴ یقول محمد بن عبید سمعت شیخاً یقال له: عیسی بن الجنید ❶ یقول خلفت عند ابن الحمانی كتباً من احادیث الواسطیین ، و خرجت إلى مكة فلما قد مت و جدته قد انتسخ من كتبی أحادیث و رواها ، أو كما قال:(تهذیب التهذیب(۱۱/ ۲۱۷)

۵ قال محمد بن یحییٰ الُذهلی النیسابوری : أخذت كتاب قیس من یحیٰ الحمانی فرأیت علی ظهره شیئاً مضروئیًا علیه، فبلغنی أنه كان كتاب محمد بن الصلت ، و أنه كان ضرب علی اسمه۔" (تاریخ بغداد (۱۴/ ۱۷۵) و أیضاً " تهذیب الكمال (۳۱/ ۴۲۸)

مذکورہ اقوال سے ''سرقۃ الحدیث'' کیا ہے اس کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے تاہم مزید وضاحت کے لیے یہاں ''سرقۃ الحدیث'' کی تعریف کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حافظ سخاوی، علامہ ذہبی سے نقل کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

" سرقة الحدیث أن یكون محدث ینفرد بحدیث فیجیء السارق و یدعی أنه سمعه أیضا من شیخ ذاك المحدث."

قلت :السخاوی: أو یكون الحدیث عرف براو فیضیفه لراو غیره ممن شاركه فی طبقته " فتح المغیث (۲/ ۱۲۱)

علامہ ذہبی" سیر أعلام النبلاء " (۱۱/ ۵۰۴) میں محمد بن حمید الرازی کے ترجمے میں لکھتے ہیں:

" قال أبو أحمد العسال : سمعت فضلك یقول : دخلت علی ابن حمید، و هو

---

❶ عیسیٰ بن الجنید کو ابن حبان نے الثقات (۸/ ۴۹۶) میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے " ابو أحمد الكشی ، یروی عن یعلی و أبی نعیم، روی عنه أهل بلده ."

یر کب الأسانید علی المتون ."

قلت-الذهبی: آفته هذا الفعل ، و إلا فما أعتقد فیه أنه یضع متنا، و هذا معنی قولهم: فلان یسرق الحدیث ."

قارئین ! آپ نے امام احمد بن حنبل اور امام دارمی ، اسی طرح بعض دیگر ائمہ کے اقوال بھی ملاحظہ کر لیے ہیں ، لہٰذا اب آپ خود فیصلہ کیجیے کہ ابو الأ شبال صاحب کے قول کہ'' أحمد اور دارمی نے جو کچھ اس کے بارے میں فرمایا ہے وہ دوسروں کی شہادت پر'' میں کس حد تک صداقت ہے ، کہیں ایسا تو نہیں کہ موصوف'' حمانی'' کا دفاع کرتے کرتے خود مجروح و مطعون ٹھہر رہے ہوں۔

ابو الأ شبال صاحب بات طریقے اور سلیقے کے ساتھ کیا کریں۔ ایسا نہیں کہ ابن معین کے قول سے اگر آپ کی حوصلہ افزائی ہوتی ہو تو دوسرے ائمہ کے اقوال کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھیں۔ عدل و انصاف کا تقاضا یہ نہیں ﴿ اِعۡدِلُوۡا هُوَ أَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی . ﴾

جو بات آپ نے سمجھی ہے وہ حافظ ذہبی جیسے نقاد کو تو سمجھ نہ آ سکی، ماشاء اللہ آپ تو قابل داد ہیں کہ آپ نے ایک ایسا نکتہ بیان کیا جو کہ ذہبی جیسے حافظ و نقاد کے خیال میں بھی نہیں رہا ہو گا۔

آیئے ! اب ہم آپ کو یہ بھی بتاتے جائیں کہ یحیٰی بن معین کے جس قول کی بناء پر آپ نے باقی ائمہ کے اقوال کو نظر انداز کر دیا ہے اس کے بارے میں علامہ ذہبی کی رائے کیا ہے۔

خطیب بغدادی نے احمد بن زہیر کی سند سے ابن معین کا یہ قول روایت کیا ہے:

" یحییٰ بن عبد الحمید الحمانی ثقة، و ما کان بالکوفة فی أیامه رجل یحفظ معه ، و هٰؤلاء یَحۡسُدُوۡنه " تاریخ بغداد:(۱۶۹/۱٤)

'' یحیٰی حمانی ثقہ ہے کوفہ میں اس کے ایام میں اس کے پلہ کا کوئی حافظ نہ تھا اور یہ لوگ اس سے حسد کرتے ہیں۔''

علامہ ذہبی اس قول کو ذکر کرنے کے بعد اس پر یوں تعلیق لگاتے ہیں:

" قلت بل ینصفونه ، و أنت فما أنصفت" السیر للذهبی (۵۳۵/۱۰)

'' میں کہتا ہوں کہ بلکہ وہ اس کے ساتھ انصاف سے کام لیتے ہیں لیکن آپ نے انصاف نہیں کیا۔''

اور علامہ ذہبی نے جو یہ کہا ہے: " قلت: الجرح مقدم، و أحمد والدارمی بریئان من الحسد " تو انھوں نے یہ بات احمد بن منصور رماوی کے اس قول" ھو عندی أوثق من أبی بکر بن أبی شیبة ، و ما یتکلمون فیه إلا من حسد" کے جواب میں کہی ہے۔ ملاحظہ ہو! حوالہ مذکور۔

علامہ ذہبی کے ان اقوال سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ ان ائمہ کے ساتھ ہیں جنھوں نے ''حمانی'' کی تجریح کی ہے۔

موصوف نے اپنے مضمون میں صرف امام احمد اور دارمی کا ذکر کر کے قارئین کو گویا یہ تأثر دیا ہے کہ ان کے علاوہ کسی اور نے حمانی پر کلام نہیں کیا اس لیے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ جن دیگر ائمہ نے اس پر کلام کیا ہے ان کا ذکر بھی یہاں کر دیا جائے ، ان میں سے بعض کا ذکر ہم اپنے پہلے مضمون میں بھی کر چکے ہیں لیکن اس تفصیل سے نہیں جس تفصیل سے اب کر رہے ہیں، اب تفصیل ملاحظہ فرمائیں!

[1]...... اسماعیل فزاری، [2]......حسن بن ربیع اور [3]......عیسیٰ بن جنید۔ ان تینوں کے اقوال کے مطابق ''حمانی'' سارق الحدیث ہے فزاری نے اسے کذاب بھی کہا ہے۔ ان کے اقوال تفصیل سے امام دارمی کے اقوال کے بعد گذر چکے ہیں۔

[4]......امام بخاری فرماتے ہیں:

① " یتکلمون فیه ، رماہ أحمد و ابن نمیر "تاریخ کبیر (۲۹۱/۸)

② "کان أحمد و علی یتکلمان فیه " تاریخ صغیر (۲/ ۳۲۸) أیضا " الضعفاء للعقیلی" (۴۱۲/۴۔۴۱۳) اور " کامل ابن عدی " (۲۹۹۳/۷)

③ "یتکلمون فیه عن شریك وغیرہ ، سکتوا عنه" ضعفاء الصغیر (ترجمہ:۳۹۸)

واضح رہے کہ امام بخاری جس راوی کے بارے میں " سکتوا عنه" کہیں تو اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ انتہائی گھٹیا درجے کا راوی ہے ۔ ملاحظہ ہو : "اختصار علوم الحدیث"لابن کثیر (ص:۱۰۶، الباعث الحثیث) اور " فتح المغیث ، للسخاوی(۱۲۲/۲)

④ امام نسائی نے ''الضعفاء والمتروکین" (ترجمہ:۶۲۵) میں کہا ہے:" ضعیف کوفی"

ایک اور مقام پر یہ بھی کہا ہے:" لیس بثقة " جیسا کہ حافظ مزی اور ابن حجر نے ذکر کیا ہے۔

⑤ جوزجانی کہتے ہیں:

" ساقط متلون ، ترك حديثه فلا ينبعث " (أحوال الرجال (ترجمه ١١٥)

⑥ عثمان بن سعید دارمی کہتے ہیں:

" و كان ابن الحمانى شيخاً فيه غفلة ، لم يكن يقدر أن يصون نفسه كما يفعل أصحاب الحديث" (تاريخ عثمان بن سعيد الدارمى (ترجمه: ٨٩٩)

⑦ قال أبو حاتم: لين " (الجرح و التعديل (٩/ ١٧٠) .

⑧ قال ابن أبى حاتم: ترك ابو زرعة الرواية عنه ، و كان أبى يروى عنه ـ (المصدر المذكور)

⑨ قال ابن أبى حاتم : سألت على بن الحسين بن الجنيد عن يحيىٰ الحمانى يكتب حديثه ؟ قال: لا " (المصدر نفسه) .

⑩ قال محمد بن يحيى الذهلى النيسابورى فى رواية ابن خراش: " ما أستحل الرواية عنه"

و قال فى رواية ابن خزيمة : " ذهب كالأمس الذاهب .

و قال فى رواية محمد بن المسيب: " اضربوا على حديث يحيىٰ بن عبد الحميد الحمانى ستة أقلام" (تاريخ بغداد(١٤/ ١٧٥،١٧٥-١٧٦) .

⑪ قال ابن عمار: قد سقط حديثه ، قيل: فما عليه؟ قال لم يكن لأهل الكوفة حديث جيد غريب، و لا لأهل المدينة ، و لا لأهل بلد حديث جيد غريب إلا رواه ، فهذا يكون هٰكذا ." (المصدر السابق (١٤/ ١٧٤) .

⑫ قال على بن المدينى:أدركت ثلاثة يحدثون بما لا يحفظون، يحيىٰ بن عبد الحميد و عبد الاعلى المسامى، والمعتمر بن سليمان" (المصدر نفسه (١٤/ ١٧٠) .

⑬ قالَ ابن نمير: كذاب. انظر كلام البخارى المتقدم برقم(٤) و أيضاً " الكامل " لابن عدى(٧/ ٢٦٩٣) **تنبيه** : "و قد جاء عن ابن نمير توثيقه ".(أيضاً) .

⑭ قال محمد بن عبد الرحيم كنا.إذا قعدنا إلى الحمانى تبين لنا منه بلايا. (المصدر المذكور) (١٤/ ١٧٦) .

⑮ ذكر ابن حزم فى " المحلّى" (٢/ ١٥٠) حديثا من طريق الحمانى عن عليلة عن أبيه عن جده عن الأسلع، و قال: فكل من ذكرنا فليسوا بشى و لا يحتج بهم.

و قال فى (٥/ ٣٧،١٠/ ٨٧) عن الحمانى:" و هو ضعيف" و قال فى (٩/ ٥٠٥) " و

هو ضعيف جداً."

⑯ ابن جوزی نے "حمانی" کو اپنی کتاب" الضعفاء والمتروكين" (۱۹۷/۳۔۱۹۸) میں ذکر کیا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ ان کے نزدیک ضعیف ہے۔

تنبیه: ابن جوزی نے اسے " المنتظم فی تاريخ الملوك والأمم" (۱۴۳/۱۱) میں بھی ذکر کیا ہے اور کہا ہے " و كان ثقة " اور اس کے بعد ابن معین کی توثیق کا ذکر کیا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ یہاں انھوں نے ابن معین کی توثیق پر اعتماد کیا ہے، جب کہ ان کی توثیق کے بعد انھوں نے امام احمد کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:" كان يكذب جهاراً."

ابن جوزی نے " الضعفاء والمتروكين" کے مقدمے میں جو قاعدہ ذکر کیا ہے اس کے مطابق "حمانی" کو ان کے نزدیک ضعیف ہی ہونا چاہیے اور وہ قاعدہ یہ ہے:" أن تقديم الجرح على التعديل متعين " ملاحظہ ہو(۷/۱)

⑰ علامہ ذہبی نے" تلخيص الموضوعات"(حدیث رقم ۹۶۹) میں "حمانی" کے بارے میں " تكلم فيه" اور " المغني في الضعفاء" (۲/ترجمة ۷۰۰۶) میں اسے "حافظ، منکر الحدیث" کہا ہے۔

اور" سير أعلام النبلاء" (۵۳۶/۱۰۔۵۳۷) میں کہا ہے:

" ربما كان يتلقط أحاديث ، و يدعي روايتها فيرويها على وجه التدليس و يوهم أنه سمعها. "

⑱ حافظ ابن حجر نے "فتح الباری" (۴۰۴/۳/حدیث۱۵۴۲) میں اسے ضعیف کہا ہے۔

اور ایک دوسرے مقام پر۔ ملاحظہ ہو (۲۳۵/۸/حدیث۴۵۶۹)۔ایک حدیث کی سند کے بارے میں کہا ہے " و رجاله ثقات ، إلا الحماني فإنه تكلم فيه ، و قد خالفه " اور تلخیص(۱۸۳/۱/۲۶۲) میں ایک حدیث کی سند کے بارے میں کہا ہے:

" و في اسناده يحيىٰ الحماني مختلف فيه."

اور ایک دوسرے مقام (۲۱۹/۳/۱۶۱۲) پر ایک دوسری حدیث کے بارے میں کہا ہے:

"و له طريق أخرى عند الطبراني في الكبير ، و فيه يحيىٰ الحماني."

اور ایک تیسرے مقام (۱۲۷/۴) پر کہا ہے:

" و أما يحيى الحماني فهو و إن كان ضعيفاً فلم ينفرد به."

⑲ حافظ ہیثمی نے " مجمع الزوائد" میں کئی مقامات پر "حمانی" کو ضعیف کہا ہے جیسا کہ اس مضمون کے شروع میں گذر چکا ہے۔

ان تصریحات کے بعد بھی اگر ابو الأشبال صاحب یہ کہیں کہ " اسی پر۔ "حمانی" کی توثیق پر۔ قائم ہوں" تو اسے سوائے ہٹ دھرمی اور عناد کے کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

اگر اب بھی موصوف کو جرح مفسر یا غیر مفسر کے ثبوت میں شک وشبہ ہو تو ہم سے بات کریں ہم ان شاء اللہ ان کے تمام قسم کے شکوک وشبہات دور کر دیں گے۔

اللہ کے اس بندے نے محض اپنی بات کو درست ثابت کرنے کے لیے کس قسم کے داؤ و پیچ لگائے ہیں اور کھیل کھیلے ہیں۔

"فنسأل اللّٰه سبحانه و تعالىٰ أن يجنبنا من مثل هٰذه الأمور و أن يرزقنا اتباع الحق و اجتناب الباطل."

تنبیہ: ابو الأشبال صاحب کے مضمون پر اپنے باقی ملاحظات پر عرض کرنے سے قبل ہم " حمانی" کے بارے میں ایک تنبیہ کرنا چاہیں گے جس کا نفس مضمون سے اگرچہ گہرا تعلق نہیں لیکن وہ فائدے سے خالی بھی نہیں۔

وہ تنبیہ یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے " تهذيب التهذيب" اور " تقريب التهذيب" میں "حمانی" کو مسلم کا راوی قرار دیا ہے جب کہ صحیح مسلم تو درکنار اُصول ستہ میں سے باقی اُصول خمسہ میں بھی اس کی روایت نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ ذہبی کی " الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة" میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

اسی طرح أبو بكر بن أحمد بن علي بن منجويه الأصبهاني(متوفى ٤٢٨ھ) نے بھی اپنی کتاب" رجال صحيح مسلم" میں اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

علامہ ذہبی نے" ميزان الإعتدال" ، " ديوان الضعفاء" اور " المغني في الضعفاء" میں اس کو ذکر کیا ہے لیکن اصول ستہ میں سے کسی کتاب میں بھی اس کی روایت کا ذکر نہیں کیا جب کہ وہ اپنی ان کتب میں جن راویوں کی اُصول ستہ میں سے جن کتب میں روایت ہوتی ہے ان کا ذکر کرتے ہیں ، اور اسی کی صراحت انھوں نے ان کتب کے مقدموں میں بھی کی ہے۔

بلکہ " سير أعلام النبلاء " (١٠/ ٥٣٧-٥٣٨) میں انھوں نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اُصول ستہ میں اس کی کوئی راویت نہیں چنانچہ رقمطراز ہیں:

" و لا رواية له في الكتب الستة ، تجنبوا حديثه عمداً ، لكن له ذكر في صحيح مسلم ، في ضبط اسم فقال: عقيب حديث سليمان بن بلال......"

اور ''تاریخ الاسلام'' (حوادث ووفیات ۲۲۱۔۲۳۰ھ ص:۴۵۵) میں لکھا ہے:

" ليحيى ذكر في القول عند دخول المسجد في صحيح مسلم" فإنه قال: بلغني أن يحيى الحماني يقول: و أبو أسيد ."

ذہبی کے اس کلام سے بھی معلوم ہوا کہ '' حمانی'' کی صحیح مسلم میں کوئی روایت نہیں۔ بس ایک قول کے ضمن میں اس کا ذکر ہے۔

اور وہ ذکر اس طرح سے ہے کہ امام مسلم نے مسجد میں داخل ہونے کے وقت پڑھی جانے والی دعا کو " عن أبي حميد، أو عن أبي أسيد" اس طرح سے شک کے ساتھ روایت کرنے کے بعد کہا ہے۔

" سمعت يحيىٰ بن يحيىٰ يقول : كتبت هذا الحديث من كتاب سليمان بن بلال قال: بلغني أن يحيى الحماني يقول: و أبي أسيد." (ملاحظہ ہو" صحيح مسلم"(حديث:۷۱۳)

حافظ مزی رحمہ اللہ نے " تهذيب الكمال" میں ''حمانی'' کا تفصیلی ترجمہ تو ذکر کیا ہے مگر اُصول ستہ میں سے کسی کتاب میں اس کی روایت کا ذکر نہیں کیا ہے اور ترجمے کے آخر میں امام مسلم رحمہ اللہ کا مذکورہ قول ہی نقل کیا ہے۔

نہ جانے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کو یہ وہم کیسے ہوا کہ اس کی روایت صحیح مسلم میں ہے جب کہ انھوں نے "تهذيب التهذيب" میں یہ کہا ہے:

" له ذكر في صحيح مسلم في حديث عبد الملك بن سعيد بن سويد عن أبي حميد أو أبي أسيد في القول عند دخول المسجد......."

اور چند سطروں کے بعد خلیلی کا یہ قول" يحيى بن عبد الحميد حافظ رضيه يحيىٰ بن معين ، وضعفه غيره و هو مخرج في الصحيح " ❶ نقل کرنے کے بعد یہ کہا ہے:" كذا قال! ." (تهذيب التهذيب (۲۱۷/۱۱)

---

❶ ''تہذیب'' میں اس طرح ہے جب کہ " الارشاد" للخليلي (۵۷۸/۲) میں " في الصحيحين " ہے۔ محقق کتاب ڈاکٹر محمد سعید نے حاشیہ میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی اس عبارت کو ''تہذیب'' میں لانے کا ذکر تو کیا ہے لیکن اس اختلاف کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔

كذا قال، کہہ کر وہ خلیلی کے اس قول " و هو مخرج في الصحيح" پر تعجب کررہے ہیں۔

''حمانی'' کے بارے میں حافظ ابن حجر سے جو وہم ہوا سو ہوا لیکن کتاب" موسوعة رجال الكتب الستة" کے مولّفین عبد الغفار سلیمان اور سید کروی کو بہت ہی عجیب قسم کا وہم ہوا ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے یحیٰ بن عبد الحمید بن عبد الرحمٰن الحمانی الکوفی اور یحیٰ بن عبد الحمید بن رافع الأنصاری کو ایک ہی راوی تصور کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

الاسم: يحييٰ بن عبدالحميد بن عبد الله ❶ بن ميمون بن عبد الرحمن .

الكنية : أبو زكريا، أبو بكر .

اللقب: الحماني، الكوفي ، العجلاني ❷ الأنصاري .

الوفاة: ٢٢٨هـ .

اس کے بعد انھوں نے ان کتب کا ذکر کیا ہے جن میں اس کا ترجمہ ہے اور پھر لکھا ہے۔

و يقال : يحيى بن عبد الحميد بن رافع بن خديج.

و يقال: يحييٰ بن عبد الحميد بن عبد الرحمن بن بشمين.

أخرج له مسلم، حافظ إلا أنهم اتهموه بسرقة الحديث. (موسوعةرجال الكتب التسعة(١٠١٥٩/٢١٩/٤)

یہ ہے ان کا کہنا جو کہ سراسر وہم ہے کیونکہ یحیٰ بن عبد الحمید بن عبد الرحمٰن الحمانی الکوفی اور ہے اور یحیٰ بن عبد الحمید بن رافع الأنصاری اور ہے اور یہ مسند احمد کے راویوں میں سے ہے اسی لیے " تعجيل المنفعة " (ترجمة ١١٦٨) اور "ذيل الكاشف" (ترجمة ١٦٧٣) میں اس کا ترجمہ ہے جب کہ ''يحييٰ الحمانی" جس طرح اُصول ستہ کے راویوں میں سے نہیں اسی طرح مسند احمد کے رواۃ میں سے بھی نہیں۔

---

❶ تراجم کی اکثر کتب میں'' یحیٰ بن عبد الحمید بن عبد الرحمٰن بن میمون ہے۔ مگر " تهذيب التهذيب" اور کتاب " بحر الدم" (ترجمة ١١٥٠) میں یحیٰ بن عبد الحمید بن عبد اللہ بن میمون'' ہے جب کہ "تقريب التهذيب " ، " تهذيب الكمال "اور دیگر کتب تراجم میں " عبد الحميد بن عبد الرحمن " ہے۔

❷ جن کتب تراجم کا مراجعہ ہم نے کیا ہے ان میں سے ''حمانی'' کی یہ نسبت صرف "الضعفاء والمتروكين" لابن الجوزی میں ہے جب کہ انھوں نے "المنتظم" (١٤٣/١١) یہ نسبت ذکر نہیں کی۔ ہاں ابن عدی نے اس کی نسبت " العكلي" ذکر کی ہے۔'' حمانی'' اور عکل یہ تمیم کے قبیلے ہیں جب کہ عجلان، انصار کا ایک قبیلہ ہے۔

واضح رہے کہ یحیٰی بن عبدالحمید نام کے تین راوی ہیں جو یہ ہیں:

1. يحييٰ بن عبد الحميد بن رافع .
2. يحييٰ بن عبد الحميد الحماني الكوفي.
3. يحييٰ بن عبد الحميد الوراق.

ملاحظہ ہو " مشتبه أسامي المحدثين. " (لِعُبيد الله الحروی(ص:٢٦٤)

ایک اور چیز جس کی وضاحت یہاں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ موصوف کی تحقیق سے " تقريب التهذيب" کا جو نسخہ چھپا ہے اس میں بھی یہی ہے کہ "حمانی" مسلم کے راویوں میں سے ہے مگر موصوف نے اس پر کسی قسم کی کوئی تنبیہ نہیں کی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں وہ اس بات کا خیال رکھیں گے۔

"یحیٰی بن عبد الحمید الحمانی" کے بارے میں اس طویل گفتگو کے بعد اب ہم موصوف کے مضمون پر ہمارے جو دیگر ملاحظات ہیں ان کی طرف لوٹتے ہیں۔

موصوف لکھتے ہیں: "حافظ صاحب نے یحیٰی بن سعید کے شیوخ میں داؤد بن أبی ھند کے عدم ذکر سے یہ استنباط کیا ہے کہ یہ سند منقطع ہے إلى آخر كلامه.

موصوف یا تو بات کو سمجھتے نہیں یا پھر انھیں ویسے باتیں بنانے کی عادت ہے، اس سے پہلے ہم پر یہ الزام ٹھونسا کہ ہم نے کتب معتبرہ سے صرف کلمات جرح کا انتخاب کر کے یحیٰی بن عبدالحمید کو مجروح قرار دیا ہے۔

اور اب دوسرا الزام یہ دھر دیا کہ یحیٰی بن سعید کے شیوخ میں داؤد بن أبی ہند کے عدم ذکر سے یہ استنباط کیا ہے کہ یہ سند منقطع ہے۔

قارئین پر ان کے اس الزام کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ہم نے اس سند پر جو کلام کیا ہے اسے یہاں نقل کرتے ہیں۔ ہم نے لکھا تھا:

"اس حدیث کی سند میں انقطاع کا خدشہ ہے کیونکہ علماء جرح و تعدیل نے یحیٰی بن سعید الأموی۔ جو ابن أبان الکوفی ہیں۔ کے شیوخ میں داؤد بن أبی ہند کا ذکر نہیں کیا۔"

اس سند میں انقطاع کا خدشہ نہیں بلکہ انقطاع ہے کیونکہ حافظ ابن عبدالبر نے "الاستیعاب" (٢/٢٠٩) (ترجمة ضماد) میں کہا ہے:

" ذکر حدیثه یحییٰ بن سعید الأموی عن ابن اسحاق عن داؤد بن أبی هند عن عمرو بن سعید عن سعید بن جبیر عن ابن عباس قال...... ."

حافظ ابن عبد البر کے اس کلام سے معلوم ہوا کہ یحییٰ بن سعید اور داؤد بن اَبی ہند کے درمیان ابن اسحاق کا واسطہ ہے، اور ابن اسحاق مدلس ہیں۔ حافظ ابن عبد البر نے جو سند ذکر کی ہے اس میں ان کی تحدیث یا سماع کی صراحت نہیں ہے۔ [1] واللہ اعلم.

اور حاشیے میں ہم نے یہ لکھا تھا کہ علماء جرح وتعدیل نے یحییٰ بن سعید کے شیوخ میں ابن اسحاق کا ذکر کیا ہے، داؤد بن اَبی ہند کا نہیں۔ ملاحظہ ہو: " الجرح و التعدیل" (۱۵۱/۹) تاریخ بغداد(۱۳۲/۱٤)، تهذیب الکمال(۸۵/۲-۸٦) اور الکاشف للذهبی(۲۲۵/۳) الاعتصام جلد:۵۵، شمارہ:۱۷، ص:۱۳

ہمارے اس کلام سے معلوم ہوا کہ ہم نے یحییٰ بن سعید کے شیوخ میں داؤد بن اَبی ھند کے عدم ذکر سے انقطاع کا خدشہ ظاہر کیا تھا نہ کہ سند کے منقطع ہونے کا استنباط کا تھا۔

ان دونوں عبارتوں میں جو فرق ہے وہ اولو الألباب پر مخفی نہیں۔ موصوف کو اگر ان میں فرق محسوس نہیں ہوتا تو محققین علماء سے جا کر پوچھیں وہ بہتر طریقے سے انھیں یہ فرق سمجھا دیں گے۔

اور سند کے منقطع ہونے کا جو استنباط کیا تھا تو وہ اس سند کی بناء پر جسے حافظ ابن عبد البر نے ذکر کیا ہے اور اس قسم کا استنباط یا استدلال علماء کرتے آئے ہیں۔ عنقریب اس کی چند مثالیں آئیں گی۔

یحییٰ بن سعید کے شیوخ میں داؤد بن اَبی ہند کی بجائے ابن اسحاق کا ذکر، اور پھر جو سند حافظ ابن عبد البر نے ذکر کی ہے اس میں یحییٰ اور داؤد بن اَبی ھند کے درمیان ابن اسحاق کا واسطہ یہ اس بات پر قرینۂ قویہ ہے کہ یحییٰ کا داؤد سے سماع نہیں یا یحییٰ نے اس حدیث کو داؤد سے بلا واسطہ نہیں سنا۔

موصوف نے کچھ آگے جا کر سند کے منقطع ہونے پر ہماری جو دلیل تھی اس کو ذکر کیا ہے لیکن یہاں کیوں نہیں ذکر کی شاید موصوف کو اعتراض کرنا یا بات بنانی تھی اور آگے چل کر اس کو اس لیے ذکر کر دیا تا کہ اگر کوئی مؤاخذہ ہو تو یہ کہا جا سکے کہ میں نے دلیل تو ذکر کی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب.

ہم نے اس سند کی علت صرف انقطاع ہی بیان نہیں کی تھی بلکہ کچھ دیگر علل کا ذکر بھی کیا تھا جس سے

---

[1] صرف سماع یا تحدیث کی صراحت کافی نہ ہوگی۔ بلکہ یحییٰ بن سعید سے نیچے والی سند کو بھی دیکھنا ہوگا اور یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اس سند میں " نؤمن به و نتوکل علیه" یہ الفاظ ہیں بھی یا نہیں ان امور پر ہم عنقریب گفتگو کریں گے۔ ان شاء اللہ.

موصوف نے تعرض تک نہیں کیا۔ لہٰذا موصوف انقطاع کا اگر کوئی معقول جواب دے بھی دیں۔ ابھی تو نہیں دے سکے۔ پھر بھی ان کی بات نہیں بنے گی جب تلک دوسری علل کا معقول جواب نہ دے پائیں۔

آگے چل کر ابو الأشبال صاحب لکھتے ہیں:

''محولہ مضمون میں ''الاستیعاب'' سے ایک معلق قول نقل کر کے انقطاع کو ثابت کیا گیا ہے، اگر صاحب مضمون اس معلق قول کا پتہ بتاتے تو معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ قول بأصول محدثین صحیح ہے یا نہیں؟ اور یہ معلوم ہونے پر میں علم اُصول حدیث و رجال سے کسی ماہر کو تلاش کروں گا۔ سردست اپنی سمجھ سے لکھتا ہوں۔''

سب سے پہلے ہمارا موصوف سے سوال ہے کہ وہ کونسا معلق قول ہے جسے ہم نے ''الاستیعاب'' سے نقل کیا ہے، ہم نے تو اس سے کوئی ایسا قول نقل نہیں کیا اور جو نقل کیا ہے وہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کی معلق سند ہے قول نہیں، افسوس صد ہا افسوس! کہ ایک ماہر فن اور عالم علم اُصول حدیث و رجال سند پر قول کا اطلاق کر رہا ہے۔ ﴿إِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ.﴾

موصوف اگر یہ کہیں کہ قول سے میری مراد ابن عبد البر کا قول ہے کیونکہ انھوں نے اس سند کو نقل کیا ہے تو اس صورت میں ہم موصوف سے یہ پوچھیں گے کیا ابن عبد البر کے قول کو معلق کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہ قول تو ان کی اپنی کتاب میں موجود ہے اگر کسی دوسرے مؤلف نے اپنی کتاب میں ان کا یہ قول نقل کیا ہوتا تو شاید اس کی کوئی گنجائش نکل آتی۔ ''فرّ من المطر قام تحت المیزاب.''

موصوف کے اس قول ''اگر صاحب مضمون اس معلق قول (درست سند) کا پتہ بتاتے.....'' کا جواب یہ ہے کہ حافظ ابن عبد البر نے مذکورہ سند اور اس کے کچھ متن کو ذکر کرنے کے بعد یہ کہا ہے: ''فذکر الحدیث، وقد کتبته فی غیر هذا الموضع.''

ہم نے اس کے لیے ''الاستیعاب'' کے محقق نسخے کا مراجعہ بھی کیا تھا کہ شاید محقق نے اس موضع کا کوئی پتہ دیا ہو لیکن وہ اس مقام پر بالکل خاموش ہے۔

اب ہم آپ سے سوال کرتے ہیں کہ ''الاستیعاب'' سے ایک سند ہم نے آپ کے سامنے رکھ دی آپ نے اس کا پتہ لگانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ جب کہ آپ کا یہ مضمون بھی تفصیلی ہے آپ اگر اس کا پتہ لگا لیتے تو خود بھی مستفید ہوتے اور ہمیں بھی مستفید کرتے اور یہ کوشش اور جدوجہد اس جدوجہد سے کہیں بہتر ہوتی جو

آپ نے اس مضمون کوطویل کرنے کے لیے ادھر ادھر کی مثالیں تلاش کی ہیں۔

موصوف کا یہ قول معلوم ہونے پر ''میں علم حدیث و رجال کے کسی ماہر کو تلاش کر کے اس کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کروں گا۔'' پڑھ کر ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ علمی دنیا میں رہنے کے باوجود انھیں ماہرین علم حدیث و رجال کا علم نہیں بلکہ ان کی تلاش کرنا ہوگی۔ ہمارے خیال میں انھوں نے درست کہا کیونکہ دورِ حاضر میں موصوف خود ہی کو سب سے بڑا ماہر علم حدیث و رجال تصور کرتے ہیں لہٰذا انھیں اپنے سے اَعلیٰ کوئی تلاش ہی کرنا ہوگا۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ وہ امام عصر شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہر شخصیت سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہمیں بھی شیخ رحمہ اللہ سے کئی مسائل پر اختلاف ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے اور ان کی لغزشوں کو ڈھونڈ کر اچھالا جائے اور ایسا اسلوب اپنایا جائے جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

"إن يسمعوا خيراً يخفوه ، و إن يسمعوا شرًّا يذيعوه ، و إن لم يسمعوا شيئاً يبحثوا."

کیا بہتر ہوتا کہ موصوف اپنے اس مضمون کو چھپنے کے لیے بھیجنے سے قبل بعض اہل علم پر پیش کر لیتے اگر وہ انھیں اس کے چھپنے کا مشورہ دیتے تو اس کو چھپواتے ورنہ......''

لیکن ہمیں امید ہے کہ وہ ان کو یہ مشورہ نہ دیتے ،ہم نے بعض اَفاضل کو انکا یہ مضمون دکھایا تو انھیں پڑھ کر بہت تعجب ہوا بلکہ ایک صاحب تو کہنے لگے اس میں تو انھوں نے اِدھر ادھر کی باتیں کی ہیں آپ کے مضمون کا جواب تو نہیں دیا۔

مگر موصوف پر ہمیں امید نہیں کہ وہ اس قسم کا کسی سے مشورہ لیں یا اپنے مضمون کو کسی کو دکھائیں کیونکہ ان کے اندر بہت تَعَلّی پائی جاتی ہے اسی لیے تو وہ صرف طلباء نہیں بلکہ علماء کے لیے بھی فوائد ذکر کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اس مضمون میں علمائے کرام اور طلباء کے لیے جو ایک فائدہ ذکر کیا ہے عنقریب ہم اس کا بھی جائزہ لیں گے کہ واقعتًا وہ علماء اور طلباء کے لیے فائدہ ہے یا نہیں۔ فی الحال یہاں ہم — انھوں نے اپنی سمجھ سے جو کچھ لکھا ہے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

موصوف لکھتے ہیں: ''ہوسکتا ہے کہ یحییٰ نے پہلے اس حدیث کو بواسطہ ابن اسحاق سنا ہو پھر بدون واسطہ ابن اَبی ھند سے سنا ہو، لہٰذا ان کو اختیار حاصل ہے کہ وہ دونوں طرح بیان کریں......''

موصوف سے ہماری گذارش ہے کہ اگر ''ہوسکتا ہے'' سے بات بننے لگے تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''ہوسکتا

ہے یحییٰ بن سعید نے اس حدیث کو داؤد بن أبي هند سے ابن اسحاق ہی کے واسطے سے سنا ہو۔'' فإذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال.

موصوف! آپ نے جو بات کہی یہ اس وقت کہی جاتی ہے کہ جب کسی راوی کا اپنے شیخ سے کسی حدیث کا بلا واسطہ اور بالواسطہ دونوں طرح سے سماع ثابت ہو جب کہ یہاں یہ صورت نہیں بلکہ یحییٰ کا داؤد بن أبي هند سے سرے سے سماع ہی محل نظر ہے۔ جیسا کہ وہ سند جس میں یحییٰ کی داؤد سے بلا واسطہ روایت ہے محل نظر ہے اس میں یحییٰ سے نیچے چند ایک علتیں ہیں جن کا ہم اپنے مضمون میں ذکر کر چکے ہیں اور ان کے جواب کی طرف آنے کے لیے موصوف بالکل تیار نہیں ہیں۔

ہم اگر علی سبیل الجدل یہ تسلیم بھی کر لیں کہ یحییٰ بن سعید کا داؤد بن أبي هند سے سماع ثابت ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آئے گا کہ انھوں نے اس حدیث کو داؤد سے سنا ہے کیونکہ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ بعض راویوں نے اپنے شیوخ سے سماع کے باوجود بعض احادیث کو ان سے نہیں سنا چنانچہ ہم آپ کی ضیافت طبع کے لیے یہاں چند مثالیں ذکر کرتے ہیں:

① ......عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما والی وہ حدیث جس میں ہے کہ میدان عرفہ میں ایک سوار اپنی اونٹنی سے گر کر مر گیا۔

اس حدیث کو بخاری اور مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے اس کی سند یوں ہے: ''سعید بن جبیر عن ابن عباس'' اور سعید سے اس کو تین چار راویوں نے روایت کیا ہے جن میں ایک منصور بن معتمر بھی ہیں، ان کی سند سے یہ حدیث صحیح مسلم (۱۰۳/۱۲۰۴) اور سنن بیہقی (۳۹۳/۳) میں ہے اور ان سے اس کو اسرائیل روایت کرتے ہیں، صحیح مسلم میں اس کی سند اس طرح سے ہے:

'' حدثنا عبد بن حميد أخبرنا عبيد الله بن موسىٰ حدثنا إسرائيل عن منصور عن سعيد بن جبير عن ابن عباس رضي الله عنهما .''

اور بیہقی نے اسے ایک دوسرے طریق سے عبید اللہ بن موسیٰ سے روایت کیا ہے۔

منصور، سعید بن جبیر سے روایت کرتے ہیں مگر اس حدیث کو انھوں نے سعید بن جبیر سے بلا واسطہ نہیں بلکہ الحکم بن عتیبۃ کے واسطے سے سنا ہے اور اس کی دلیل جریر بن عبد الحمید کی روایت ہے انھوں نے اسے منصور سے روایت کرتے ہوئے یوں روایت کیا ہے۔

'' قال البخاري (۱۸۳۹): حدثنا قتيبة حدثنا جرير عن منصور عن الحكم عن سعيد

بن جبیر عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہما۔"

اسے قتیبہ کے طریق سے بیہقی (۳۹۳/۳) نے بھی روایت کیا ہے۔ ابو داود (۳۲۴۱) اور نسائی (۱۹۶/۵) نے اسے دوسرے دو طرق سے جریر سے روایت کیا ہے۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ اپنی کتاب "الإلزامات والتتبع، (ص۲۳۸، ح۱۸۰) میں فرماتے ہیں:

" و أخرج مسلم عن عبد بن حمید عن عبید اللّٰہ بن موسیٰ عن إسرائیل عن منصور عن سعید بن جبیر عن ابن عباس قصة المحرم الذی و قصه بعیره ."

و إنما سمعه منصور عن الحکم ، وأخرجه البخاری عن قتیبة عن جریر عن منصور عن الحکم عن سعید ، و هو الصواب ، و قیل ، عن منصور عن سلمة ولا یصح ."

اور امام بیہقی رحمہ اللہ اسے " من طریق عبید اللّٰہ بن موسیٰ عن إسرائیل عن منصور " روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

" رواه مسلم فی الصحیح عن عبد بن حمید.عن عبید اللّٰہ بن موسیٰ هکذا ، و هو وهمٌ من بعض رواته فی الإسناد والمتن جمیعاً والصحیح ما اخبرنا ."

اس کے بعد انھوں نے اسے اسحاق بن ابراہیم اور قتیبۃ کے طریق سے جریر سے روایت کیا ہے اور کہا ہے:

" رواه البخاری فی الصحیح عن قتیبة ، و هذا هو الصحیح : منصور عن الحکم عن سعید ."

امام دارقطنی اور بیہقی نے جریر کی روایت کو ترجیح دی ہے حالانکہ منصور کا سعید بن جبیر سے سماع ہے لیکن انھوں نے ان دونوں روایتوں کو اس طرح سے جمع نہیں کیا کہ ہوسکتا ہے کہ منصور نے پہلے بالواسطہ اس حدیث کو سعید سے سنا ہو اور پھر بلا واسطہ سن لیا ہو، اس لیے کہ اس جمع کو اس وقت اپنایا جاتا ہے جب کسی روایت کو دونوں طرح سے سننے کا ثبوت موجود ہو۔ کچھ آگے چل کر ہم اس کی ایک مثال بھی ذکر کریں گے۔

④ ...... حدیث حذیفۃ رضی اللہ عنہ:

" إن ولیتموها أبا بکر فقوی......"الحدیث .

اس حدیث کو امام حاکم نے " معرفة علوم الحدیث"(ص ۲۸-۲۹) میں درج ذیل سند سے روایت کیا ہے۔

" حدثنا أبو النضر محمد بن محمد بن یوسف الفقیه ثنا محمد بن سلیمان

الحضرمی ثنا محمد بن سهل ثنا عبد الرزاق قال : ذکر الثوری عن أبی إسحاق عن زید ابن یتیع عن حذیفة."

امام حاکم رحمہ اللہ اسے روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

" هذا إسناد لا یتأمله متأمل إلا علم اتصاله و سنده فإن الحضرمی و محمد بن سهل ثقتان ، و سماع عبد الرزاق من سفیان الثوری ، و اشتهاره به معروف، و کذلك سماع الثوری من أبی أسحاق و اشتهاره به معروف ، و فیه انقطاع فی موضعین ، فان عبد الرزاق لم یسمعه من الثوری والثوری لم یسمعه من أبی اسحاق ."

امام حاکم کے اس کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ عبدالرزاق کا ثوری سے اور ثوری کا ابو اسحاق سے سماع معروف ہے لیکن اس حدیث کو عبدالرزاق نے ثوری سے اور نہ ثوری نے ابواسحاق سے سنا ہے۔

عبدالرزاق نے ثوری سے اور ثوری نے ابواسحاق سے اگر اس حدیث کو نہیں سنا ہے تو آخر انھوں نے کن سے اسے سنا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ عبدالرزاق نے اسے نعمان بن أبی شیبة کے واسطے سے ثوری سے سنا ہے۔

اس واسطے کے ساتھ اسے حاکم نے" معرفة علوم الحدیث" (۲۹) اور "مستدرك"(۳/ ۱۴۲) میں ، ابن عدی نے " کامل" (۵/ ۱۹۵۰) میں اور ابو نعیم نے "معرفة الصحابة" (۱/ ۲۱۴/ ۱۸۹) میں روایت کیا ہے۔

بعض روایات میں نعمان کے علاوہ دوسرے واسطوں کا ذکر ہے ملاحظہ ہو:"کامل ابن عدی"

اور سفیان ثوری نے اسے شریک کے واسطے سے ابواسحاق سے سنا ہے اور اس واسطے کے ساتھ اس کو حاکم نے " معرفة علوم الحدیث" میں اور خطیب نے " تاریخ بغداد (۱۱/ ۴۷) میں روایت کیا ہے۔

ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ موصوف نے جو فرمایا ہے وہ اس وقت ہے جب کہ کسی راوی کا اپنے شیخ سے کسی حدیث کو بالواسطہ اور بلا واسطہ دونوں طرح سے سننا ثابت ہو مگر یہاں صورت حال مختلف ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے، آیئے ! اب ہم آپ کو بالواسطہ اور بلا واسطہ حدیث سننے کی مثال دیتے ہیں۔

حکم بن عتیبہ کے مقسم مولی ابن عباس سے سماع کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے [1] امام احمد بن حنبل اور یحیٰ القطان نے وثوق کے ساتھ کہا ہے کہ حکم نے مقسم سے صرف پانچ احادیث سنی ہیں، ان میں سے ایک

[1] حکم اور مقسم دونوں معاصر ہیں، مقسم کی وفات (۱۰۱ھ) میں ہے اور حکم کی وفات (۱۱۳ھ اور ۱۱۵ھ) کے درمیان ہے۔ لقاء کا قوی امکان ہے لیکن اس کے باوجود حکم کے مقسم سے سماع میں اختلاف ہے۔

حدیث وہ ہے جس میں حالتِ حیض میں بیوی سے مجامعت پر کفارہ کا ذکر ہے۔ بعض روایات میں حکم نے اس حدیث کو مقسم سے بلا واسطہ روایت کیا ہے جب کہ اکثر روایات میں اسے عبدالحمید کے واسطے سے مقسم سے روایت کیا ہے۔

شیخ احمد شاکر اس حدیث کی اسانید پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" فيظهر أنه سمعه من مقسم و من عبد الحميد عن مقسم، فكان يرويه على الوجهين ."

امام بیہقی رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ حکم نے اس حدیث کو مقسم سے نہیں سنا بلکہ عبدالحمید کے واسطے سے سنا ہے۔ شیخ احمد شاکر ان کا قول نقل کرنے کے بعد رقمطراز ہیں:

" هكذا قال البيهقي ! و ليس ذالك بجيد ، بعد أن صرح أحمد و يحيىٰ بأن هذا الحديث مما سمع الحكم من مقسم، و لا مانع أن يرويه عنه مباشرة، و يرويه عنه بواسطة إذ كان سمعه منهما جميعاً"

(الترمذی بشرح الشيخ أحمد شاكر (١/ ٢٤٩)

آ گے چل کر موصوف لکھتے ہیں کہ: " رقاشی کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سلسلے میں عرض ہے کہ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس سے روایت کرنے والا اس کے اختلاط کے بعد روایت کرتا ہے تب تک اس کی روایت مردود نہیں ہو سکتی، بلکہ بطور شاہد و متابع بلا چون و چرا مقبول ہے۔"

موصوف نے صرف رقاشی [1] کے اختلاط کا ذکر کیا ہے جب کہ ہم نے اس کے بارے میں یوں لکھا تھا: " اس رقاشی کے بارے میں علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے " الکاشف" میں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے " التقریب" [2] میں کہا ہے: " صدوق يخطئ " حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مزید یہ بھی کہا ہے کہ: " تغير حفظه لما سكن بغداد"

"صدوق يخطئ" سے معلوم ہوا کہ رقاشی میں اختلاط سے پہلے بھی گڑ بڑ تھی، وہ کیا تھی امام دارقطنی رحمہ اللہ کے کلام سے سنیے فرماتے ہیں:

" صدوق كثير الخطأ في الأسانيد والمتون لا يحتج بما ينفرد به ، بلغني عن شيخنا أبي القاسم بن منيع أنه قال: عندي عن أبي قلابة- كنية الرقاشي- عشرة أجزاء ما

---

[1] مضمون میں " محمد بن عبد الله الرقاشي " چھپ گیا ہے جب کہ درست " عبدالملک بن محمد بن عبداللہ الرقاشی" ہے۔

[2] مضمون میں " تهذيب " چھپا ہوا ہے درست " تقریب " ہے۔

منها حديث سلم منه ، إما في الإسناد أو في المتن كأنه يحدث من حفظه فكثرت الأوهام منه ." (سؤالات الحاكم) للدارقطني (رقم ١٥٠) أيضاً تاريخ بغداد (١٠/٤٢٥) و تهذيب التهذيب (٦/٣٧٢)

جس راوی کا حال یہ ہو اس کے اضافے کو کیسے قبول کیا جا سکتا ہے:

''رقاشی'' والی حدیث کی سند اس طرح ہے:

" عبد الملك بن محمد الرقاشي قال: حدثنا أبي ، قال: حدثنا يزيد بن زريع قال : حدثنا داؤد بن أبي هند......" (دلائل النبوة للبيهقي (٢/٢٢٤) .

اس سند میں " نؤمن به و نتوكل عليه" کے اضافے کے عدم ثبوت پر مزید جو چیز دلالت کرتی ہے وہ یہ کہ اس کی یزید بن زریع سے جو صحیح سند ہے اس میں یہ اضافہ نہیں اور وہ ابو بشر بکر بن خلف کی سند ہے، اس سند سے ،اس کو ابن ماجہ (۱۸۹۳) نے روایت کیا ہے :قال ابن ماجة: حدثنا بكر بن خلف أبو بشر حدثنا يزيد بن زريع ."

بکر بن خلف کو ذہبی نے '' کاشف'' میں'' ثقہ'' کہا ہے اور حافظ ابن حجر نے ''تقریب'' میں ''صدوق'' کہا ہے۔

مولانا ابو الأشبال سے ہمارا یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ کیا وجہ ہے کہ " نؤمن به و نتوكل عليه"کا اضافہ غیر معتبر اسانید میں ہے اور جو اس حدیث کی معتبر سندیں ہیں ان میں کیوں نہیں ہے۔

کیا یہ ایک قوی دلیل نہیں کہ اس حدیث میں یہ اضافہ غیر ثابت ہے۔

''رقاشی'' کی سند کا حال ابھی آپ نے سن لیا جو ابو نعیم کی سند ہے اس میں ''حمانی'' ضعیف ہے اور اس میں ابو نعیم کے شیخ جعفر بن محمد کا ترجمہ ہی نہیں ملتا، اور جو یحیٰی بن سعید والی سند ہے وہ بھی چند علل کی بناء پر غیر صحیح ہے جیسا کہ ہم اس سے پہلے مضمون میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

اور ابن عباس کی حدیث کے علاوہ جن دوسری احادیث میں یہ اضافہ ہے ان کی سندیں انتہائی گھٹیا درجے کی ہیں بلکہ اکثر کی سندیں موضوع ہیں جیسا کہ پہلے مضمون میں تفصیل گزر چکی اور اختصار کے ساتھ نیچے ان کا دوبارہ ذکر ہو رہا ہے۔

اس کے بعد موصوف نے لکھا ہے: ''پس وہ ساری روایتیں جنھیں حافظ صاحب رد کر رہے ہیں ان میں

سے موضوع روایتوں کو چھوڑ کر بقیہ سب روایات میرے حق میں بأصول محدثین مفید و مقبول ہیں اور میری پیش کردہ روایت کو تقویت پہنچاتی ہیں دراں حالیکہ میں نے انھیں پیش نہیں کیا۔

موصوف کا یہ کلام پڑھ کر ہمیں بہت تعجب ہوا اور اس سے پہلے اونٹ کے منہ میں پھنسی بکری کا چلا چلا کر جیت جانے کی رٹ لگانے کا قصہ یاد آ گیا۔

موصوف کو شاید ہوائی باتیں کرنے کی عادت ہے۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ موضوع روایات کے علاوہ وہ کونسی روایات ہیں جو بأصول محدثین مفید و مقبول ہیں اور آپ کی پیش کردہ روایت کو تقویت پہنچاتی ہیں، یا کہ محض انشائی انداز میں آپ نے یہ بات کہہ دی ہے۔

ہم نے آپ کی پیش کردہ روایات کا اُصول محدثین کے مطابق علمی جائزہ لینے اور انھیں نا قابل اعتماد ثابت کرنے کے بعد جو روایات پیش کی تھیں ان کی تفصیل یہ ہے:

① ابونعیم کی "دلائل النبوۃ" سے عبدالرحمٰن بن زید العدوی کی معضل روایت۔

یہ روایت معضل ہونے کے ساتھ ساتھ موضوع بھی ہے کیونکہ اس کی سند میں واقدی ہے جو "متہم" ہے۔

نیز اس کی سند کے بارے میں ہم نے یہ بھی ذکر کیا تھا کہ اس میں محمد بن سلیط اور اس کا باپ سلیط دونوں کے حالات تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

غالباً یہ محمد بن سلیط وہی ہے جس کے بارے میں حافظ ابن حجر نے "اللسان" (۱۸۴/۵) میں یہ کہا:"صوابه" : محمد بن سليمان بن سليط."

اور یہ محمد بن سلیمان مجہول بالنقل ہے جیسا کہ عقیلی (۴/۸۴) نے کہا ہے۔ ملاحظہ ہو ایضاً "المیزان" (۵۷۳/۳) اور "اللسان" (۱۹۰/۵).

اور اس کا والد سلیمان بن سلیط بھی غالباً مجہول ہی ہے۔

طبرانی نے قصہ ام معبد والی حدیث کو درج ذیل سند سے روایت کیا ہے:

" عبد العزيز بن يحيىٰ المدني ثنا محمد بن سليمان بن سليط الأنصاري عن أبيه عن جده قال: لما خرج رسول الله ﷺ ...." (المعجم الكبير (۶۵۱۰/۱۳۲/۷).

حافظ ہیثمی رحمہ اللہ نے "مجمع الزوائد"(۲۸۲/۸) میں اس کی سند کے بارے میں یہ کہا ہے:

" فيه عبد العزيز بن يحيىٰ المدني و نسبه البخاري وغيره إلى الكذب، و قال الحاكم

صدوق ، فالعجب منه ، و فیه مجاهیل أیضاً ."

یہ ہے عبدالرحمٰن العدوی کی سند کا حال ، اس میں واقدی متہم ۔ محمد بن سلیمان اور اس کا باپ سلیمان بن سلیط دونوں مجہول ہیں اور ان علتوں کے ساتھ ساتھ وہ معضل بھی ہے۔

۲ تاریخ بغداد کے حوالے سے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کی حدیث جس کی سند میں عمرو بن سمر ہے جو کذاب اور وضاع ہے۔

۳ تاریخ ابن جریر کے حوالے سے سعید بن عبد الرحمن الجمحی کی حدیث پہلی دونوں حدیثیں موضوع ہیں اور جمحی والی حدیث کی سند معضل ہے۔ نیز اس میں" أؤمن به و لا أکفر" ہے۔

اب قارئین خود ہی فیصلہ کر لیں کہ ہماری وہ کونسی پیش کردہ روایات ہیں جو موصوف کی روایت کی تائید کرتی ہیں یا اسے تقویت پہنچاتی ہیں، محسوس ہوتا ہے کہ موصوف خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا

موصوف کا یہ کہنا کہ" دراں حالیکہ میں نے انھیں پیش نہیں کیا" تو غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہمارا مناظرہ ہو رہا ہے بلکہ ان کے اسلوب سے یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ مناظرہ کر رہے ہیں کیونکہ مناظرہ میں عام طور پر افہام و تفہیم مقصد نہیں ہوتا بلکہ فریق مخالف کو مغلوب اور خود کو غالب کرنا مقصود ہوتا ہے چنانچہ ہم آپ کی یہ غلط فہمی دور کر دیں کہ ہمارا مقصد مناظرہ نہیں ہے ہمارا مقصد صرف تحقیق ہے اور تحقیق سے جو چیز ثابت ہو اس پر عمل ہے۔

اس کے بعد موصوف کا یہ کہنا کہ" مضمون نگار نے مستخرج أبي نعیم کی جن دونوں سندوں سے یہ سمجھا ہے کہ ان میں " نؤمن و نتوکل علیه" نہیں ہے۔ تو اس کا جواب اس مضمون کے شروع میں دے چکے ہیں لہٰذا یہاں دوبارہ اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد موصوف لکھتے ہیں:" اہل حدیث کے شہرہ آفاق عالم شارح ترمذی مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے" شرح ترمذی" کے ابتداء میں جو خطبہ درج کیا ہے اس میں بھی " نؤمن به و نتوکل علیه" موجود ہے۔"

موصوف نے جو کچھ فرمایا اس کے بارے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ان کا مبارک پوری کے عمل کو بطور دلیل پیش کرنا یہ ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا لینے کے مترادف ہے۔

دوسری بات ہمارا فاضل مضمون نگار سے سوال یہ ہے کہ آپ نے مبارک پوری رحمہ اللہ کے عمل کو پیش کیا ہے کیا وہ آپ کے نبی ہیں۔

قارئین کرام! آپ اس بات کو ہماری طرف سے زیادتی تصور نہ کریں اس لیے کہ ہم نے اپنے سب سے پہلے مضمون میں یا سائل کے سوال کے جواب میں " نؤمن به و نتوكل عليه" اور'' يضلله '' میں ''ہ'' ضمیر کے اضافے کے بارے میں یہ کہا تھا۔

اور ہماری اس بات کا جواب موصوف نے ان الفاظ سے دیا تھا:

''آپ نے البانی صاحب کے عمل کو بھی دلیل میں پیش کیا ہے، یہ صفت تو صرف نبی کریم ﷺ کے ساتھ مختص ہے اس کے علاوہ کسی کا عمل دین میں حجت ہے نہ دلیل۔'' (صحیفہ اہل حدیث (۲۱ر دسمبر ۲۰۰۲ء صفحہ:۱۳)

چنانچہ اب ہمیں بھی حق حاصل ہے کہ ہم موصوف سے یہ دریافت کریں کہ کیا مبارک پوری صاحب آپ کے نبی ہیں جن کے عمل کو اپنے لیے حجت کے طور پر پیش کر رہے ہو؟

موصوف ہمیں اگر یہ جواب دیں کہ میں نے مبارک پوری رحمہ اللہ کے عمل کو ان کے محقق ہونے کی حیثیت سے پیش کیا ہے تو ہم پوچھیں گے کہ کیا ہم نے البانی رحمہ اللہ کے عمل کو ان کے نبی ہونے کی حیثیت سے پیش کیا تھا؟ (فما جوابكم فهو جوابنا) .

البانی صاحب کا حوالہ ہم نے صرف اس لیے دیا تھا کہ ان کا خطبہ مسنونہ کے بارے میں " خطبة الحاجة" کے نام سے ایک مستقل رسالہ ہے جس میں انھوں نے اس خطبہ کی تخریج و تحقیق کی ہے جب کہ مبارک پوری رحمہ اللہ نے ان الفاظ کا ذکر غالبًا ماحول سے متاثر ہو کر کیا ہوگا نہ کہ تحقیق کی بنا پر، کیونکہ ہمارے پاک و ہند میں عام طور پر علماء، خطباء اور وعاظ اس خطبہ میں ان الفاظ کو ذکر کرتے ہیں اب اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرما لیجیے:

① مولانا عبد السلام بستوی رحمہ اللہ نے '' اسلامی خطبات'' میں اس خطبہ میں ان الفاظ کو ذکر کیا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو (۱/۱۱، ۲۴، ۱۱۰، ۱۲۰، ۲۷۸)

② مولانا محمد صادق سیالکوٹی رحمہ اللہ نے اپنی تصانیف میں اس خطبہ میں ان الفاظ کا ذکر کیا ہے مثال کے طور پر " سبیل الرسول ﷺ" (ص:۲۵) اور "صلوٰۃ الرسول ﷺ (ص:۲۹) (ص ٦٤ القول المقبول)

دیکھیں۔

تنبیه : حافظ زبیر علی صاحب زئی کی تحقیق وتخریج سے ''صلوۃ الرسول'' کا جو نسخہ چھپا ہے اس میں اس خطبہ سے ان الفاظ کو نکال دیا گیا اور حاشیہ میں ان کے نکالے جانے پر کسی قسم کی وضاحت یا تنبیہ نہیں کی اور یہ طرز عمل امانت علمی کے خلاف ہے۔

③ علامہ محمد رئیس ندوی حفظہ اللہ نے اپنی کتاب میں اس خطبہ میں ان الفاظ کو ذکر کیا ہے۔ مثال کے لیے ملاحظہ ہو: " اللمحات إلى مافي أنوار البارى من الظلمات" (ج ۱/ ص:۷) اور ''ضمیر کا بحران'' (ص:۱)

④ ڈاکٹر وصی اللہ صاحب نے کتاب " يحرم الدم فيمن تكلم في الإمام أحمد بمدح أو ذم" کے مقدمہ تحقیق کے خطبے میں ان الفاظ کا ذکر کیا ہے، مگر "فضائل الصحابه " للإمام أحمد کے مندرجہ تحقیق کے خطبے میں ان الفاظ کو ذکر نہیں کیا، ملاحظہ ہو دونوں کتابوں کا (صفحہ:۵)

واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب اصلاً ہندوستانی ہیں چند برس قبل انھیں سعودیہ کی شہریت ملی ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہم نے پاک و ہند کے علماء کا ذکر اس لیے کیا ہے کیونکہ عرب علماء اس خطبہ میں ان الفاظ کا ذکر نہیں کرتے ہیں، اب اس کی بھی چند مثالیں ملاحظہ کر لیجیے!

۱ ...... شیخ محمد ابراہیم آل شیخ رحمہ اللہ سابق مفتی سعودی عرب ملاحظہ ہو ان کا رسالہ "فتوى في حكم أكل القات "(ص:۳)

۲ شیخ ابن باز رحمہ اللہ۔ ملاحظہ ہو ان کا رسالہ ''تحفۃ الاخیار'' (ص:۳)

۳ شیخ محمد بن صالح عثیمین رحمہ اللہ۔ مثال کے طور پر دیکھیں "مقدمة شرح العقيدة الواسطية" (ص:۱۱) اور ان کا رسالہ " الأصول من علم الأصول "(مقدمہ، ص:۵)

۴ شیخ مقبل بن ھادی (یمنی) رحمہ اللہ۔ مثال کے لیے :"الصحيح المسند من أسباب النزول "(ص:۱ مقدمہ) اور مقدمة التحقيق لإلزامات والتتبع للدارقطني (ص:۵) دیکھیں!

۵ ڈاکٹر محمد امان بن علی جامی رحمہ اللہ۔ ملاحظہ کریں ان کا رسالہ " منزلة السنة في التشريع الإسلامي" (ص:٦)

٦ ڈاکٹر ربیع بن ھادی مدخلی۔ یہ عام طور پر اپنی کتب کی ابتداء خطبہ حاجت سے ہی کرتے ہیں مثال کے طور پر ان کی درج ذیل کتابیں ملاحظہ کریں۔

① ......أهل الحديث هم الطائفة المنصورة الناجية (ص:٢٥)

② ......تقسيم الحديث إلى صحيح و حسن و ضعيف(ص:٥)

③ ......الحجة البيضاء في حماية السنة الغراء (ص:٥)

7 ڈاکٹر عبد اللہ بن عبد المحسن ترکی سابق وزیر وزارت أوقاف و دعوت و إرشاد سعودی عرب۔ ملاحظہ ہو ان کی کتاب "أصول مذهب الإمام أحمد" (ص:١٧) اور " مقدمة التحقيق للارشاد إلى سبيل الرشاد" للشريف الهاشمي (ص:٥)

8 ڈاکٹر بکر بن عبد اللہ ابو زید۔ ملاحظہ ہو ان کا رسالہ " تسمية المولود" (ص:٥)

9 شیخ حمدی عبد المجید (عراق)۔ مثال کے طور پر مقدمة تحقيق المعجم الكبير للطبراني (١/٢٣) اور "مقدمة تحقيق نتائج الأفكار" لا بن حجر (١/٧) ملاحظہ کریں۔

10 شیخ عبد القادر أرناؤوط اور شیخ شعیب أرناؤوط (یہ دونوں شامی ہیں)

ملاحظہ ہو۔" مقدمة تحقيق زاد المعاد " لابن القيم (١/٥) لعبد القادر و شعيب أيضاً "مقدمة تحقيق جامع الأصول" لابن الأثير لعبد القادر نقط (١/١)

بس انہی چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔(تلك عشرة كاملة)

تنبیہ: شیخ مقبل اور ڈاکٹر عبد اللہ ترکی نے " نستغفره" کے بعد " و نستهديه"بھی ذکر کیا ہے بلکہ اکثر علماء عرب اس کلمے کو ذکر کرتے ہیں جس کی غالبًا وجہ یہ ہے کہ اس کلمے کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے۔ ملاحظہ ہو۔ مجموع الفتاوی (۱۴/۲۲۹) اور ابن قیم نے بھی۔ ملاحظہ ہو جلاء الأفهام (ص:۶۳، تحقیق مشہور سلمان) اس خطبے میں ذکر کیا ہے۔ ❶ مگر یہ کلمہ کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں ہے اس کا ذکر عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کے ایک طریق میں ہے اور اس میں اس کے بعد " و نستنصره"بھی ہے مگر جس طریق میں یہ کلمات ہیں وہ انتہائی گھٹیا درجے کا طریق ہے کیونکہ اس میں ایک راوی متہم ہے۔

اس کلمے " نستهديه" کا ذکر سعید بن عبد الرحمٰن جمحی کی معضل روایت میں بھی ہے۔ جو کہ معضل ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے جیسا کہ اس سے پہلے والے مضمون میں ہم تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو! ''الاعتصام'' جلد:۵۵،شمارہ ۱۸ مئی ۹ تا ۱۵ ۲۰۰۳ء ص:۱۰)

---

❶ ابن قیم نے جو خطبہ ذکر کیا ہے اس میں " فلا هادي له" کی بجائے " فما له من هاد" ہے اور اس کے بعد " أشهد" کی بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام اور آپ کی بعض صفات کا ذکر ہے۔ شاید انھوں نے اسے خطبۂ حاجت سمجھ کر ذکر نہ کیا ہو واللہ اعلم۔

دوسری **تنبیہ**: حافظ ابن کثیر نے "تفسیر" (۲۷۹/۲۔ الاعراف: ۱۷۸) میں اس کلمے کا ذکر حدیث ابن مسعود میں کیا ہے جو کہ درست نہیں۔

تیسری **تنبیہ**: شیخ محمد بن ابراہیم آل شیخ نے اسی طرح شیخ ابن عثیمین نے بھی اپنے رسالے "حقوق الراعي والرعية" (ص: ۵) میں "نستغفرہ" کے بعد "نتوب إليه" کے الفاظ بھی ذکر کیے ہیں، مگر ہمارے علم کے مطابق ان الفاظ کی کوئی اصل نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ان کا استعمال بہت پہلے سے ہے کیونکہ ان کا ذکر ابن ملقن (متوفی ۸۰۴ھ) نے بھی کیا ہے ملاحظہ ہو "خلاصة البدر المنير" (۳/۱)

یہ دس حوالے ہم نے صرف مثال کے طور پر ذکر کیے ہیں، اور یہ دور حاضر کے علماء ہیں عنقریب بعض متقدمین علماء کے حوالے بھی ذکر کیے جائیں گے۔

بیان یہ ہو رہا تھا کہ ہم نے البانی صاحب کا حوالہ دیا تو موصوف چڑ گئے اور کہا کہ آپ نے البانی رحمہ اللہ کے عمل کو بھی دلیل میں پیش کیا ہے یہ صفت تو صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مختص ہے لیکن موصوف اگر مبارکپوری رحمہ اللہ کے عمل کو دلیل میں پیش کریں تو کوئی حرج نہیں۔

یہ بات ہماری سمجھ سے بعید ہے کہ ابو الأشبال صاحب کو البانی رحمہ اللہ سے اس قدر چڑ، عداوت اور نفرت کیوں ہے۔اہل علم کی یہ شان اور شیوا تو نہیں کہ کسی شخصیت کی اغلاط کی بنا پر اس کا استخفاف اور تنقیص کی جائے "قال رسول الله ﷺ: (بحسب امرئ من الشرّ أن يحقر أخاه المسلم......) رواه مسلم.

اہل علم کو اوھام ہوتے ہیں ان سے اغلاط بھی ہوتی ہیں لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ ان کے اوہام اور اغلاط کی وجہ سے ان کی تنقیص کی جائے اگر یہی طرز عمل اپنایا جائے تو پھر کوئی عالم بھی طعن سے محفوظ نہیں رہ سکے گا کیونکہ انسان ہونے کے ناطے ہر ایک سے غلطی ہو جاتی ہے اسی لئے علامہ ذہبی "میزان الاعتدال" (۱۴۰۰/۳) میں علی بن المدینی کے ترجمے میں حافظ عقیلی کو مخاطب کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

" أفمالك عقل يا عقيلي ، أ تدري فيمن تتكلم ، و انّما تبعناك في ذكر هذا النمط لنذب عنهم ولنزيف ما قيل فيهم كأنّك لا تدري أنّ كل واحد من هٰؤلاءِ أوثق منك بطبقات إلى أن قال...... و أنا اشتهي أن تعرفني من هو ثقة و ثبت الذي ما غلط و لا انفرد بما لا يتابع عليه."

البانی صاحب رحمہ اللہ کا عیب یا قصور یہ ہے کہ وہ معاصر ہیں اگر کچھ زمانہ پہلے کے ہوتے تو شاید موصوف

ان کے مداح ہوتے ،ایک شاعر کہتا ہے :

قل لمن لا یری المعاصر شیئاً
و یری للأوائل تقدیماً
إن ذاك القدیم كان جدیداً
و سیغدو هذا الجدید قدیماً

ابو الأشبال صاحب! اگر مبارکپوری کا عمل پیش کرتے ہیں تو ہم ان کے لئے ایک دوسرے محقق جن کے وہ بہت مداح ہیں اور وہ ان کا عمل پیش کرتے ہیں اور وہ محقق شیخ بکر بن عبداللہ ابو زید ہیں جن کا پہلے بھی حوالہ دیا جا چکا ہے انھوں نے اپنے رسالہ" تسمية المولود"(ص:٥) میں اس خطبہ کا ذکر کیا ہے لیکن اس میں" نؤمن به و نتوكل عليه" کے الفاظ نہیں ہیں۔

آگے چلیے! خطیب تبریزی نے مشکاۃ کے مقدمہ کی ابتداء اس خطبے سے کی ہے اور انھوں نے ان الفاظ کا ذکر نہیں کیا۔

شارح ''عقیدہ طحاویہ'' نے اس خطبہ میں ان کا ذکر نہیں کیا ملاحظہ ہو۔ (ص:١٧، تحقیق احمد شاکر) (ص:٦٩، تحقیق الالبانی)

حافظ ابن القیم نے" الطرق الحكمية" کے مقدمہ کی ابتداء اس خطبہ سے کی ہے اور انھوں نے بھی ان الفاظ کا ذکر نہیں کیا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے" مجموع الفتاوى"(١٤ / ٢٢٩) میں اس خطبہ کو ان الفاظ کے بغیر ذکر کیا ہے۔

امام طحاوی نے ''شرح مشکل الآثار'' (١/٣) کے شروع میں اس خطبہ کا ذکر کیا ہے لیکن ان الفاظ کو ذکر نہیں کیا۔

مزید سنیے! امیر المومنین عمر بن عبد العزیز خطبہ جمعہ دیتے ہیں اور خطبہ کی ابتداء اس خطبہ سے کرتے ہیں اور ان کے خطبہ میں بھی ان الفاظ کا ذکر نہیں ملتا۔

مزید اور سنیے! ابراہیم نخعی اصحاب عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ : مسروق علقمہ اور وائل وغیرہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ وہ نکاح کے وقت اور فریقین کے درمیان فیصلہ کے وقت اس خطبہ کو پسند کرتے ، پھر انھوں

نے الفاظ خطبہ ذکر کیے ہیں اور ان میں مذکور الفاظ نہیں۔

مذکورہ تمام پر مستزاد یہ کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی موصول حدیث زہری اور ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن کی مرسل احادیث میں بھی ان الفاظ کا ذکر نہیں ہے۔

ان احادیث اور مذکورہ آثار کی تخریج ہم اپنے پہلے مضمون میں کر چکے ہیں ملاحظہ ہو: ''الاعتصام'' (جلد:۵۵،شمارہ:۱۸/ مئی ۲۰۰۳ء)

موصوف نے بڑے شیخی کے انداز میں یہ بات کہی ہے کہ ''پس وہ ساری روایات جنھیں حافظ صاحب رد کر رہے ہیں ان میں سے موضوع روایتوں کو چھوڑ کر بقیہ سب روایات میرے حق میں باصول محدثین مفید و مقبول ہیں اور میری پیش کردہ روایت کو تقویت پہنچاتی ہیں۔''

جب کہ ہماری پیش کردہ روایات میں سے موضوع روایات کو نکال دینے کے بعد صرف سعید بن عبد الرحمٰن الجمحی کی روایت باقی رہ جاتی ہے جو کہ معضل ہے نیز اس میں "أؤمن به و لا أكفره" ہے۔

ہماری پیش کردہ معضل روایت اگر موصوف کی روایت کو تقویت پہنچا سکتی ہے تو کیا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مذکورہ صحیح حدیث زہری اور ابو سلمہ کی صحیح الاسانید مرسل احادیث ان کی روایت کا رد نہیں کرتیں، اگر نہیں تو آخر کیوں؟ (تلك إذًا قسمة ضيزى).

ایک اور بات نوٹ کر لیجیے! وہ یہ کہ موصوف کی تحقیق سے تقریب کا جو نسخہ چھپا ہے اس کے مقدمے کے شروع میں موصوف نے جو خطبہ ذکر کیا ہے اس میں بھی ان الفاظ کا ذکر نہیں، ملاحظہ ہو (ص:۷)

نیز "التعليقات السلفية على سنن النسائي" کا جو ایڈیشن موصوف کی تحقیق و تخریج سے شائع ہوا ہے اس میں ناشر کے پیش لفظ سے پہلے اس خطبہ کا ذکر ہے اور اس میں بھی یہ الفاظ نہیں۔

اگر موصوف مبارک پوری رحمہ اللہ کے عمل کو حجت مانتے ہیں اور اسے حجت کے طور پر پیش کرتے ہیں تو انھوں نے تو خطبے میں "يضلل" بغیر ضمیر ''ہ'' کے۔ ذکر کیا ہے پھر موصوف کو اس میں ''ہ'' ضمیر کے وجود پر اصرار کیوں ہے؟ کیا یہاں مبارک پوری صاحب غیر معتمد ہیں یا کہ انھوں نے اس لفظ کے بارے میں تحقیق سے کام نہیں لیا۔ بس ان کی تحقیق "نؤمن به و نتوكل عليه" کی حد تک تھی یا ان کا عمل ان الفاظ کی حد تک حجت تھا۔ اگر ایسے ہے تو کیوں؟ ﴿يؤمنون ببعض الكتاب و يكفرون ببعض﴾

موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں:

''علم اصول حدیث کے ماہرین جانتے ہیں کہ جب متن میں اختلاف واقع ہو اور سندیں صحیح

ہوں تو ان میں توثیق وتطبیق دی جاتی ہے انھیں رد نہیں کیا جاتا'' (الاعتصام،ص:۱۵، ۳ر جولائی ۲۰۰۳ء)

موصوف یہاں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ '' نؤمن به و نتوكل عليه'' اس جملے کو رد نہ کیا جائے بلکہ اس کے بارے میں توثیق اور تطبیق سے کام لیا جائے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ اس جملے کی کونسی سند صحیح ہے؟ نیز آپ نے توثیق اور تطبیق کیوں نہیں دی تا کہ ہمیں بھی کچھ فائدہ ہوتا۔

ابوالأشبال صاحب آپ پر صد ہا افسوس ہے بنتے تو ہو علم اصول حدیث کے ماہرین میں سے مگر آج تک آپ کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ اصول حدیث کی اصطلاح میں اس جملے کو ''اختلاف في المتن'' سے تعبیر نہیں کیا جاتا بلکہ ''زيادة في المتن'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آیئے ! آج ہم آپ کو ان میں سے ہر ایک کی اختصار کے پیش نظر صرف ایک ایک مثال دے کر مسئلہ بھی سمجھاتے ہیں۔

① ...... الاختلاف في المتن :

بخاری (۶۴۰۸) میں ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:

((مثل الذى يذكر ربه ، و الذى لا يذكر ربه مثل الحى والميت .))

جب کہ یہی حدیث صحیح مسلم (۷۷۹) ، صحیح ابن حبان (۸۵۱) اور مسند ابو یعلی (۷۳۰۶) اور ''شعب'' (۲/۴۳۲/۵۳۲) اور '' دعوات بیہقی (۸) میں ان الفاظ سے ہے:

((مثل البيت الذى يذكر الله فيه ، والبيت الذى لا يذكر الله فيه مثل الحى والميت.))

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا رجحان انہی الفاظ کی ترجیح کی طرف ہے اگر چہ انھوں نے دونوں الفاظ میں توثیق اور تطبیق کی کوشش بھی کی ہے۔ ملاحظہ ہو! فتح الباری (۱۱/۲۱۰)

② ...... الزيادة في المتن:

حدیث عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جسے ان سے طلحہ بن عبداللہ بن عوف روایت کرتے ہیں کہتے ہیں:

''صليت خلف ابن عباس رضى الله عنهما على جنازة فقرأ بفاتحة الكتاب ، و قال:

"لتعلموا أنها سنة."

اسے بخاری (۱۳۷۰) ابوداود (۳۱۹۸) اور ترمذی (۱۰۷۷) وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

اسی طرح اسے نسائی (۴/۷۴۔۷۵) (ابن الجارود (۵۳۷) اور ابویعلی (۲۶۶۱) نے بھی روایت کیا ہے اسے ''زیادۃ فی المتن'' کہا جاتا ہے اور اردو میں متن میں اضافہ اور یہ اضافہ صحیح ثابت ہے ایسا نہیں جیسا کہ بیہقی نے اسے غیر محفوظ کہا ہے۔ ابن الجارود کے ہاں ابن لمبارک سے زید بن طلحہ الیتمی کے طریق میں بھی یہ اضافہ ہے اور یہ سند بھی صحیح ہے۔

امید ہے کہ ابھی آپ ان دونوں میں جو فرق ہے وہ سمجھ گئے ہوں گے۔ ان شاء اللہ.

اور ان دونوں میں جو فرق ہے اسے ماہرین علم اصول حدیث ہی نہیں بلکہ علم اصول حدیث کے ساتھ ادنی سا درک یا تعلق رکھنے والے بھی جانتے ہیں۔

قارئین کرام! شیخ البانی رحمہ اللہ نے علم حدیث کے میدان میں بہت وسیع کام کیا ہے چنانچہ ان سے اوھام اور اغلاط کا سرزد ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں کیوں کہ مثل مشہور ہے "لکل جواد کبوۃ " جیسے ہماری زبان میں کہا جاتا ہے ''گھوڑ سوار ہی گرتا ہے'' یا دوسرے لفظوں میں'' تیرنے والا ہی ڈوبتا ہے۔''

اور ابوالأ شبال صاحب کے ان چند صفحات پر مشتمل مضمون میں جو اُغلاط ہیں آپ نے ان کو بھی ملاحظہ کر لیا اور کچھ اُغلاط پر مزید نشاندہی آئے گی۔ اب آپ موصوف سے سوال کریں کیا ہم آپ کی تحقیقات پر اعتماد کریں یا نہ کریں؟ اگر اعتماد کریں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ہمیشہ دھوکے میں رہیں۔ موصوف نے اپنے مذکورہ کلام کے بعد'' اختلاف فی المتن'' کی صحیح بخاری سے جو مثال دی ہے اسے پڑھ کر ہمیں بہت حیرت ہوئی۔ محسوس یوں ہوتا ہے کہ موصوف ہمارا مضمون پڑھنے کے بعد گھبرا گئے ہیں چنانچہ انہوں نے اِدھر اُدھر کی مثالیں بیان کر کے ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا لینے والا طریقہ اپنایا ہے۔

ہم کچھ بیان کر رہے ہیں اور وہ ہمیں کچھ اور ہی بتا رہے ہیں اس حدیث کے الفاظ میں اختلاف اور تطویل وتقصیر کوئی انوکھی بات نہیں کیونکہ صحیح بخاری میں یہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے تقریباً چھ یا سات سندوں سے مروی ہے بلکہ ایک ہی سند سے مروی حدیث ایک راوی کے کچھ شاگرد اسے مطولاً اور کچھ دوسرے شاگرد اسے مختصراً بیان کرتے ہیں۔ اور بیان کرتے وقت الفاظ میں بھی اختلاف ہوتا ہے جب معنی مختلف نہ ہو تو لفظی اختلاف مضر نہیں۔

اگر کوئی راوی کسی روایت کو دوسرے راوی کی نسبت مطولاً یا اضافے کے ساتھ بیان کرے تو اگر وہ ثقہ ہے تو اس کا اضافہ قابل قبول ہوتا ہے۔(علی تفصیل عند المحدثین)

" نؤمن به و نتوکل علیه" کے جملے سے متن میں اختلاف واقع نہیں ہوا بلکہ یہ متن میں اضافہ ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا چنانچہ اس حدیث کو ابو الأشبال صاحب کا متن میں الفاظ کے اختلاف کے لیے مثال کے طور پر پیش کرنا بے محل ہے۔

اور یہ اضافہ یا جملہ کسی ثقہ راوی نے بیان نہیں کیا بلکہ ثقات راویوں کی روایات میں یہ جملہ نہیں ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے۔

مذکورہ مثال کے بعد موصوف نے جو یہ کہا ہے :" نیز علماء اہل حدیث پر مخفی نہیں کہ "صحیحین" کے بعض متون دوسری کتابوں میں ضعیف و موضوع اسناد سے بھی موجود ہیں جنھیں عقیلی کی "ضعفاء" وغیرہ کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ روایتیں ضعیف و موضوع ہیں اگر چہ صحیحین میں موجود ہیں۔"

ابو الأشبال صاحب کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعتاً گھبرائے ہوئے ہیں یا پھر سٹھیا گئے ہیں، کیسی بے تکی باتیں کر رہے ہیں؟ یہ کس نے کہا ہے کہ اگر کوئی حدیث صحیح سند سے ثابت ہو یا صحیحین یا دونوں میں سے ایک میں ہو اور پھر وہی حدیث ضعیف یا موضوع سند سے مروی ہو تو وہ ضعیف یا موضوع قرار پائے گی یہ بات تو کوئی جاہل بلکہ جاہل مرکب ہی کہے گا۔ اس قسم کی باتیں اگر آپ نہ کرتے تو کیا ہی بہتر ہوتا مگر کریں کیا ہم نے تفصیلی جواب بھی تو لکھنا تھا۔

آپ کو کیا رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان معلوم نہیں :((من کان یومن باللہ و الیوم الآخر فلیقل خیراً أو لیصمت .)) (متفق علیه)

جملہ " نؤمن به و نتوکل علیه"کو ہم نے کیا اس لیے ضعیف قرار دیا ہے کہ یہ صحیح سندوں میں موجود ہونے کے ساتھ ساتھ ضعیف سندوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

انہی الفاظ پر جملہ" نؤمن به و نتوکل علیه" کے بارے میں اپنی بحث کو ختم کرتے ہیں اور اب اس فائدہ کی طرف آتے ہیں جسے موصوف نے بڑے فخر و شیخی کے ساتھ علماء کرام اور طلباء کے لیے ذکر کیا ہے کیونکہ ہم اپنے مضمون کے دوران اس کا جائزہ لینے کا قارئین سے وعدہ کر چکے ہیں۔

موصوف لکھتے ہیں:

"**فائدہ:** ایک اور مزید بات اس حدیث ((إنما الأعمال بالنیات)) کے متن سے متعلق علمائے کرام اور طلباء کے فائدے کے لیے بیان کر دیتا ہوں، اس متن کے لیے میں نے شیخ البانی کی کتاب " إرواء الغلیل (۱/ ۵۹) کا انتخاب کیا ہے تا کہ کسی صاحب علم کو میری نافہمی پر کوئی شکایت نہ ہو۔

((إنما الأعمال بالنيات، و إنما لكل امرئ ما نوىٰ فمن كانت هجرته إلى الله و رسوله فهجرته إلى الله و رسوله و من كانت هجرته إلى دنيا يصيبها او امرأة ينكحها فهجرته إلى ما هاجر إليه .))

اس حدیث کے لیے شیخ البانی رحمہ اللہ بطور احالہ فرماتے ہیں:

" أخرجه الشيخان و أصحاب السنن الأربعة و ابن الجارود في المنتقى، (٦٤) و أحمد (رقم ١٦٨، ٣٠٠) من حديث عمر بن الخطاب رضي الله عنه مرفوعاً به ."

مزید فرماتے ہیں:

" و هو أوّل حديث في صحيح البخاري و أورده في مواطن أخرىٰ منه ."

قال أبو الأشبال: رواية البخاري في هٰذا الموضع مختصرة ."

اب اگر ان محولہ مقامات پر ایک غائر نظر ڈال کر دیکھا جائے تو کہیں بھی ان کتب میں اس سیاق کے ساتھ یہ حدیث موجود نہیں ، بلکہ الفاظ میں اختلاف موجود ہے ، تقدیم و تأخیر اور نقص و زیادہ موجود ہے، اس کے باوجود علمائے کرام اور محققین اسے صحیحین بالخصوص بخاری کی پہلی حدیث باور کراتے ہیں جیسا کہ البانی صاحب نے بھی صراحتاً لکھا ہے۔ طلباء حدیث یاد رکھیں کہ اس سیاق کے ساتھ یہ حدیث مسند حمیدی (۱/۱۶، حدیث:۲۸) تحقیق حبیب الرحمٰن الاعظمی) میں موجود ہے۔"

یہ ہے ابو الأشبال صاحب کا کلام اور اس پر ہمارے درج ذیل ملاحظات ہیں:

۱۔ ان کا یہ کہنا کہ " علماء کرام اور طلباء کے فائدے کے لیے" گویا کہ اس زمانے میں سب سے بڑے عالم موصوف ہی ہیں اور جس چیز کا علم انھیں ہے عالم اسلام میں اس کا کسی دوسرے عالم کو علم نہیں ، غالباً عبداللہ بن مبارک یا کسی دوسرے عالم کا قول ہے:"لا يزال الرجل عالماً ما طلب العلم ، فإذا ظن أنه علم فقد جهل ."

شاید ابوالأ شبال صاحب نے سورۃ یوسف آیت (۷۶) میں اللہ عزوجل کا یہ فرمان نہیں پڑھا ﴿ و فَوْقَ كُلِ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیم﴾ یا ان کی نظر سے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث: ((و ما تواضع أحد لله إلا رفعه الله)). (رواہ مسلم) نہیں گذری۔

آدمی خود کو سب سے بڑا عالم تصور کرے یہ بات تو اللہ عزوجل کو اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی پسند نہیں آئی جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی طویل حدیث میں ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث سے مستنبط مسائل کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: " و لزوم التواضع فی کل حال" (ہر حال میں تواضع اختیار کی جائے۔)

حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے " جامع بیان العلم" (۱/۱۳۱) میں بعض علماء کا ایک قول یوں نقل کیا ہے: "لَیس هی من العلم إلا أنی أعلم أنی لست أعلم ."

اس کے بعد ایک شاعر کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے۔

أتم الناس أعرفهم بنقصه
و أقمعهم لشهوته و حرصه

ب: مولانا ابو الأ شبال صاحب کے بارے میں ہمارا بڑا حسن ظن تھا مگر ان کا یہ مضمون پڑھ کر ہمارے اس ظن کو بہت ٹھیس لگی ہے۔

محسوس یوں ہوتا ہے کہ ابو الأ شبال صاحب علمی دنیا میں نہیں بلکہ کسی دوسری دنیا میں آباد ہیں۔ کیونکہ جو فائدہ وہ علماء کرام اور طلباء کے لیے بیان کر رہے ہیں اس سے علماء تو درکنار طلباء علم حدیث بھی واقف ہیں۔

اب ہم اس فائدے کے متعلق کچھ وضاحت کرنا چاہیں گے وہ یہ کہ محدثین ، اصحاب مستخرجات اور اصحاب اطراف جب کسی ایک حدیث کو جن کتب کی طرف منسوب کرتے ہیں تو ضروری نہیں کہ وہ حدیث من و عن ان کتب میں موجود ہو ، بلکہ اصل حدیث کا وجود کافی ہوتا ہے محولہ کتب کے الفاظ میں اختلاف ہو یا ان میں اس کے متن میں کچھ اضافات ہو اس سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

فی زمانہ عام کتب کی تخریج کا انداز بھی یہی ہے ، اگر مخرجہ کتب کا تعلق فقہ سے ہو یا کسی خاص موضوع سے تو اس صورت میں مخرج کے لیے ضروری ہے کہ وہ جن کتب سے حدیث کی تخریج کر رہا ہے ان میں محل شاہد موجود ہو ورنہ اس کی تخریج ناقص اور معیوب متصور ہوگی اگر محل شاہد کے ساتھ ساتھ متن میں کچھ زیادات (اضافے) پائے جائیں یا الفاظ میں کمی بیشی ہو تو اس سے تخریج پر کسی قسم کا حرف نہیں آئے گا۔ اب اس سلسلے

میں بعض علماء کے اقوال ملاحظہ کرتے جائیں۔

① حافظ سخاوی لکھتے ہیں:

” ثمّ إنّ أصحاب المستخرجات غيرمنفردين بصنيعهم ،بل أكثر المخرجين للمستخرات والمعاجم ،وكذا للأبواب يوردون الحديث بأسانيدهم ثم يصرحون بعد انتهاء سياقه غالباً بعزوه إلي البخارى أو مسلم، أو إليهما مع اختلاف الألفاظ وغيرها ، يريدون أصله .“ (فتح المغيث(١/٤٧).

② حافظ عراقی رقمطراز ہیں:

” و هكذا ما أخرجه المؤلفون فى تصانيفهم المستقلة كالسنن الكبير للبيهقى و شرح السنة لأبى محمد البغوى و غيرهما مما قالوا فيه أخرجه البخارى و مسلم فلا يستفاد بذالك أكثر من أن البخارى أو مسلماً أخرج أصل ذالك الحديث مع احتمال أن يكون بينهما تفاوت فى اللفظ و ربّما كان تفاوتاً فى بعض المعنى ، فقد و جدت فى ذالك ما فيه بعض التفاوت من حيث المعنى.“ (التقييد والإيضاح شرح مقدمة ابن الصلاح(ص:٣١).

حافظ عراقی ہی اپنی ” إحياء علوم الدين“ للغزالی کی تخریج ” المغنى عن حمل الأسفار فى الأسفار فى تخريج ما فى الإحياء من الأخبار “(١/٩) کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

” و حيث عزوت الحديث لمن خرجه من الأئمة فلا أريد ذالك اللفظ بعينه، بل قد يكون بلفظه ، و قد يكون بمعناه أو باختلاف علی قاعدة المستخرجات .“

یہی بات انھوں نے اپنی کتاب” تقريب الأسانيد و ترتيب المسانيد“(ص:۴) میں بھی کہی ہے۔

③ علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

” مهمة : ما تقدم عن البيهقی و نحوه من عزو الحديث إلى الصحيح ، والمراد أصله، لا شك أن الأحسن خلافه ، و الاعتناء بالبيان حذرًا من إيقاع من لا يعرف الاصطلاح فی اللبس.

و لابن دقيق العيد فی ذالك تفصيل حسن ، و هو أنك إذا كنت فی مقام الرواية فلك

العزو ولوخالف، لأنه عرف أن جلّ قصد المحدث السند والعثور على أصل الحديث دون ما إذا كنت فى مقام الاحتجاج فمن روى فى المعاجم والمشيخات و نحوها فلا حرج عليه فى الاطلاق ، بخلاف من أورد ذالك فى الكتب المبوبَةِ لاسيما إن كان الصالح للترجمة قطعة زائدة على ما فى الصحيح." (تدريب الراوی(۱/ ۸۷-۸۸)

۴ متقدمین اور متاخرین میں سے کئی علماء نے اس حدیث کو" ايما إهاب دبغ فقد طهر "کومسلم کی طرف منسوب کیا ہے، حافظ زیلعی اس نسبت پر اعتراض کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

" واعلم أن كثيرا من أهل العلم المتقدمين والمتأخرين عزوا هذا الحديث فى كتبهم إلى " مسلم" و هو وهم ، و ممن فعل ذالك البيهقى فى " سننه" و إنما رواه مسلم للفظ: "إذا دبغ الإهاب فقد طهر" واعتذر عنه الشيخ تقى الدين فى كتاب " الإمام " فقال: والبيهقى و قع له مثله فى كتابه كثيراً و يريد به أصل الحديث، لا كل لفظة لفظة منه.

قال: و ذالك عندنا معيب جداً إذا قصد الاحتجاج بلفظة معينة ، لأن فيه ايهام أن اللفظ المذكور أخرجه مسلم مع أن المحدثين أعذر فى هذا من الفقهاء لأن مقصود المحدثين الإسناد و معرفة المخرج ، و على هذا الأسلوب ألّفوا كتب الأطراف ، فأمّا الفقيه الذى يختلف نظره باختلاف اللفظ فلا ينبغى له أن يحتج بأحد المخرجين إلا إذا كانت اللفظة فيه." (نصب الراية (۱/ ۱۱٦)

۵ حدیث " توضئ وصلّى، و إن قطر الدم على الحصير" کی تخریج کرنے کے بعدحافظ زیلعی لکھتے ہیں:

" و وهم شيخنا علاء الدين فى عزوه هذا الحديث لأبى داؤد مقلدًا لغيره فى ذالك ، و أبو داؤد وإن كان أخرجه لكن لم يقل فيه: " و إن قطر الدم على الحصير۔ فليس هو حديث الكتاب ، والذى أوقعه فى ذالك أن أصحاب "الأطراف" عزوه لأبى داؤد و ابن ماجه ، و مثل هذا لا ينكر على أصحاب " الأطراف" و لا غيرهم من أهل الحديث لأن وظيفة المحدث أن يبحث عن أصل الحديث فينظر من خرجه و لا يضره تغير بعض ألفاظه ، و لا الزيادة فيه أو النقص ، و أما الفقيه ، فلا يليق به ذالك لأنه يقصد أن يستدل على حكم مسألة، و لا يتم هذا إلا بمطابقة الحديث لمقصوده

، والله أعلم." (نصب الراية(۱/ ۲۰۰) أنظر أيضاً (۳/ ٥٤).

یہ وہ موصوف کا فائدہ ہے جو کتب اصول حدیث وغیرہ میں موجود ہے مگر موصوف نے اس کو اس انداز سے پیش کیا ہے گویا کہ انھوں نے اسے اپنی فن حدیث میں طویل ممارست اور تجربے سے حاصل کیا ہے، طلباء تو درکنار علماء کو بھی اس کا علم نہیں جب کہ یہ فائدہ کتب میں موجود ہے۔ مثل مشہور ہے۔ ''غرور کا سر نیچا۔''

اور ایک شاعر کہتا ہے:

حباب بحر کو دیکھو وہ کیسے سر اٹھاتا ہے
تکبر وہ بری شی ہے کہ فوراً ٹوٹ جاتا ہے

ج: موصوف کا یہ کہنا کہ اس سیاق سے یہ حدیث مسند حمیدی میں ہے محل نظر ہے کیونکہ شیخ البانی نے جن الفاظ سے اس حدیث کو ذکر کیا ہے وہ من وعن بخاری کے پہلے مقام کے الفاظ ہیں مگر اس مقام پر یہ جملہ " فمن كانت هجرته إلى الله و رسوله فهجرته إلى الله و رسوله" نہیں ہے۔

جب کہ باقی چھ مقامات میں یہ جملہ موجود ہے لہٰذا یہ کہنا کہ اس سیاق سے یہ حدیث بخاری میں نہیں بلکہ مسند حمیدی میں ہے ہمارے نزدیک محل نظر ہے۔

رہا یہ سوال کہ بخاری نے اس مقام پر اس حدیث کو اپنے استاد حمیدی سے روایت کیا ہے اور وہ اس جملہ کو یہاں کیوں نہیں لائے؟ تو یہ دوسری بحث ہے جو ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

تنبیہ: موصوف نے فائدہ کے ذکر کرنے سے قبل ایک بات یہ کہی ہے کہ بخاری نے پہلے مقام پر اس حدیث کو بہت ہی مختصر بیان کیا ہے اور ان کا یہ کہنا بھی محل نظر ہے کیونکہ بہت ہی مختصر کا مطلب یہ ہوگا کہ اس حدیث کا پیشتر حصہ ذکر نہیں ہوا جب کہ ایسی بات ہرگز نہیں کیونکہ مذکورہ جملے کے علاوہ باقی پوری حدیث موجود ہے۔

د: موصوف نے یہ کہہ کر '' بلکہ الفاظ میں اختلاف موجود ہے، تقدیم و تاخیر اور نقص و زیادہ موجود ہے'' یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ کوئی بہت بڑا اختلاف ہے جب کہ ایسی بات نہیں چنانچہ ہم یہاں حدیث کے جو الفاظ ذکر ہوئے ہیں ان کے ساتھ مسلم اور سنن اربعہ کے الفاظ کا تقابل کرتے ہیں:

① مسلم(۱۹۰۷)۔اس کے یہاں " النيات" کی بجائے " النية" ...... " لكل امرئ " کی بجائے "لأمرى" ...... " إلى دنيا" کی بجائے " لدنيا" اور " ينكحها " کی بجائے " يتزوجها" ہے۔

اور بالکل یہی فرق نسائی (۶/۱۵۸۔۱۵۹، ۷/۱۳) کے ہاں ہے نیز یہی فرق ترمذی کے ہاں بھی ہے مگر اس میں " إلی دنیا" ہے " لدنیا" نہیں۔

② ابوداؤد(۲۲۰۱)۔اس کے ہاں " لدنیا" اور "یتزوجها" ہے باقی الفاظ وہی ہیں جو شیخ نے ذکر کیے ہیں۔

③ ترمذی(۱۶۴۷)۔اس کے الفاظ کا مسلم کے الفاظ کے ساتھ ذکر ہو چکا ہے۔

④ نسائی کے ہاں(۱/۵۸۔۶۰)" النية" اور" و إنما لامرئ" ہے باقی الفاظ وہی ہیں جو حمیدی کے ہیں۔

⑤ ابن ماجہ(۴۲۲۷) اس کے ہاں " لکل امرئ" سے پہلے " إنما "نہیں اور " لدنیا " ، "یتزوجها " ہے باقی الفاظ وہی ہیں جو حمیدی کے ہیں یا جو شیخ نے ذکر کیے ہیں۔

تنبیہ :نسائی (۱/۵۸۔۶۰) اور ابن ماجہ کے ہاں دونوں جگہ " و رسوله"کی بجائے " و إلی رسوله" ہے،لفظ " إلی" کا اضافہ ہے۔ پہلے مقام پر ترمذی کے ہاں بھی یہ اضافہ ہے۔

اب قارئین خود فیصلہ کرلیں کہ ان کتب کے الفاظ کا حمیدی کے الفاظ سے کتنا بڑا فرق ہے۔

اگر ابو الأشبال صاحب کی بات کو لیا جائے تو پھر شیخ البانی کے سیاق سے یہ حدیث ''مسند حمیدی'' میں بھی نہیں ہے کیونکہ حمیدی کے ہاں " أو إلی امرأة " ہے جب کہ شیخ نے "أو امرأة " ذکر کیا ہے۔

اور جس تقدیم و تأخیر کی طرف ابو الأشبال صاحب نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ بخاری کی ایک روایت میں ۔ ملاحظہ ہو حدیث ۳۸۹۸۔ ((فَمَنْ كانت هجرته لدنيا ......)) ......((فمن كانت هجرته إلى الله و رسوله......)) سے پہلے ہے جب کہ باقی مقامات پر اسی طرح مذکورہ کتب میں یہ جملہ ((فمن كانت هجرته إلى الله و رسوله)) کے بعد ہی ہے۔

اور جہاں تک نقص و زیادہ والا مسئلہ ہے تو کہیں " إنما "نہیں اور کہیں لفظ " لکل امرئ" میں لفظ"کل" نہیں اور بخاری کی ایک روایت میں (۳۹۹۸) ((و إنما لكل امرئ ما نوى)) نہیں اور بخاری کی ایک روایت میں (۶۹۵۳) اس حدیث کے شروع میں ((يا أيها الناس)) کا اضافہ ہے۔

واضح رہے کہ اس قسم کا اختلاف ہمارے نزدیک قابل اعتناء نہیں لیکن مؤلف نے اس کو اس انداز سے ذکر کیا ہے کہ جس سے قارئین کو اس حدیث کے بارے میں شک و شبہ ہو سکتا ہے اس لیے ہم نے اس اختلاف کی مختصر سی وضاحت کردی ہے۔

تنبیہ: موصوف کی تحقیق سے " تقريب التهذيب" کا جو نسخہ چھپا ہے اس کے "مقدمة التحقيق" (ص:۴) میں مذکورہ حدیث کو بخاری اور مسلم کی بجائے صرف بخاری کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور یہ چیز

اہل فن تخریج کے نزدیک معیوب ہے کہ جب ایک حدیث ان دونوں کتب میں ہو تو اسے صرف بخاری یا مسلم کی طرف منسوب کیا جائے۔

ابو الأشبال صاحب نے اپنے اس مضمون میں کئی لا یعنی چیزیں ذکر کرکے اپنا وقت تو صرف کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمارا اور قارئین کا بھی قیمتی وقت صرف کروا دیا ہے۔ "سامحه الله".

کاش ! وہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کو ملحوظ رکھتے :((من حسن اسلام المرء تر که ما لا یعنیه.))

(رواہ الترمذی وغیرہ).

ب: یضلله :

" نؤمن به و نتوكل علیه" کے الفاظ پر گفتگو کے بعد مولانا ابو الأشبال صاحب نے لفظ " یضلله" کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

موصوف لکھتے ہیں:

"مضمون میں لفظ "یضلله" پر بڑی طویل گفتگو ہوگئی ہے سو اس سلسلے میں عرض ہے کہ کسی مخطوط یا مطبوع نسخے کے بارے میں یہ کہہ دینا کہ یہ ناسخ یا طابع کی غلطی ہے میرے نزدیک ایک خطرناک دروازہ کھولنے کے مترادف ہے، آئندہ ہر من چلا جب کسی حدیث صحیح میں کوئی جملہ یا لفظ اپنی خواہش کے خلاف پائے گا بآسانی یہ کہہ کر " کہ یہ کسی طابع یا ناسخ کی زیادتی یا وہم ہے" اس سے جان چھڑائے گا ، إنا للہ و إنا الیہ راجعون."

موصوف کا یہ کلام بہت عجیب ہے گویا کہ ہم نے بغیر کسی دلیل ہی کے "ہ" ضمیر کے اضافے کو ناسخ یا طابع کی غلطی قرار دے دیا ہے ہم نے تو طویل بحث کے بعد اسے ناسخ یا طابع کی غلطی قرار دیا ہے اور اس طویل بحث کا موصوف نے بھی اعتراف کیا ہے چنانچہ ان کا مذکورہ کلام انتہائی قابل افسوس ہے لہذا (إنا لله و إنا اليه راجعون) تو ان کے طرز عمل پر پڑھنا چاہیے نہ کہ ہماری علمی گفتگو پر۔

رہا ابو الأشبال صاب کا یہ کہنا " یہ کہہ دینا کہ یہ ناسخ یا طابع کی غلطی ہے میرے نزدیک ایک خطرناک دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔"

تو یہ ان کی بات بالکل درست ہے لیکن اس وقت کہ جب یہ حکم بغیر کسی دلیل کے لگایا جائے مگر جب یہ حکم کسی واضح اور ٹھوس دلیل پر مبنی ہو تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ محدثین نے بعض متون کو غیر

محفوظ کہا اور ان پر شذوذ کا حکم لگایا جس طرح انھوں نے بعض متون کے اندر بعض زیادات کو ضعیف یا غیر صحیح قرار دیا۔

ہمارا مضمون پہلے سے کافی طویل ہو چکا ہے اس لیے یہاں صرف آخر الذکر صورت کی ایک مثال ذکر کر دیتے ہیں۔

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی "صفة الصلاة" سے متعلق حدیث کی ایک سند میں یہ اضافہ ہے: ((و إذا قرأ فأنصتوا......)) ملاحظہ ہو: مسلم (٤٠٤ / ٦٣)

اس اضافے کو کئی محدثین نے غیر صحیح کہا ہے چنانچہ موصوف اس کے بارے میں لکھتے ہیں: "اکثر حفاظ اس زیادہ کو تسلیم نہیں کرتے دیکھو زیلعی حنفی نے تخریج ہدایہ (۲۳۳/۱) پر امام بیہقی ❶ کے حوالے سے ان حفاظ کا نام ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: "صراط مستقیم" اور اختلاف امت جواب وتنقید اختلاف امت اور صراط مستقیم (ص:٦٥)

حافظ زیلعی نے اس اضافے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے:

" و قد أخرجه مسلم هذه الزيادة في "صحيحه" في حديث أبي موسى الاشعرى من حديث سليمان التيمي عن قتادة ، وضعفها ابو داؤد والدار قطني ، والبيهقي وغيرهم لتفرد سليمان التيمي بها ، قال الدار قطني : وقد رواه أصحاب قتادة الحفاظ عنه ، منهم هشام الدستوائي ، و سعيد ، وشعبة ، و همام ، و أبو عوانة ، وأبان ، و عدى بن أبي عمارة فلم يقل أحد منهم: "وإذا قرأ فأنصتوا" قال : و إجماعهم يدل على وهمه " انتهى . (نصب الراية (٢/ ١٦)

دارقطنی کا یہ کلام ان کی کتاب " الالزامات والتتبع" (ص:۱۷۱، نمبر۴۳) میں ہے اور اس میں مذکورین کے ساتھ معمر کا ذکر بھی ہے۔

ممکن ہے کہ موصوف ان محدثین کے بارے میں بھی یہ کہہ دیں کہ انھیں اس اضافے کو سلیمان تیمی کا وہم قرار نہیں دینا چاہیے تھا کیونکہ یہ کہہ دینا میرے نزدیک ایک خطرناک دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔ آئندہ ہر من چلا جب کسی حدیث صحیح میں کوئی جملہ یا لفظ اپنی خواہش کے خلاف پائے گا با آسانی یہ کہہ کر "کہ یہ کسی

❶ موصوف کے ہاں ایسے ہی ہے جب کہ "بیہقی" کی بجائے " دارقطنی" ہونا چاہیے، عنقریب حافظ زیلعی کا آنے والا کلام دیکھیں۔

طابع یا ناسخ کی زیادتی یا وہم ہے اس سے جان چھڑا لے گا۔"

مولانا ابو الأشبال صاحب کو یہ فکر تو بڑی شدت سے لاحق ہوئی کہ کسی راوی کی زیادتی کو وہم یا غلطی قرار دینے سے کہیں یہ خطرناک دروازہ نہ کھل جائے کہ ہر من چلا جو چاہے سو کہے، جب کہ انھوں نے اپنے اس مضمون میں جو طرز عمل اپنایا ہے اس سے عوام الناس کے اذہان میں حدیث کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہو جانے کا خدشہ ہے کیونکہ ان کے اس مضمون میں گفتگو کا اصل محور یہی ایک بات ہے کہ فلاں حدیث کے الفاظ میں اختلاف ہے فلاں حدیث میں تقدیم و تأخیر، اور تطویل و تقصیر ہے، فلاں حدیث کی ایک روایت میں یوں ہے اور دوسری روایت میں یوں ہے، فلاں حدیث بخاری میں ۳۴ یا ۳۵ مقامات پر ہے، اور اس کے مختلف طرق میں تطویل و تقصیر اور الفاظ میں بھی اختلاف ہے اور کمی بیشی ہے۔

کیا اس قسم کی باتوں سے عوام الناس کے اُذہان میں حدیث کے سلسلے میں شکوک وشبہات پیدا ہونے کا امکان نہیں۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ ان کے مضمون کا انحصار اسی ایک بات پر ہے، اپنے خیال میں تو شاید انھوں نے علم کے انمول موتی بکھیرے ہوں، مگر یہی انمول موتی بعض لوگوں کے لیے زہر کی گولیاں ثابت ہو سکتے ہیں۔﴿ و یحسبون أنهم یحسنون صنعاً .﴾

عربی کا مشہور مقولہ ہے: "رمتنی بدائها و انسلت"

اس کے بعد موصوف نے لکھا ہے:

"حضرت جابر بن عبد اللہ والی روایت کو رد کرنے کے لیے جو یہ دلیل دی گئی ہے کہ ابن خزیمہ نے اس سند سے اسے روایت کیا ہے لیکن اس میں "من یضلله" کی بجائے "من یضلل" ہے کوئی دلیل قاطع نہیں۔"

سب سے پہلی بات ہے کہ ہم ابو الأشبال صاحب سے پوچھتے ہیں کہ آپ کے نزدیک دلیل قاطع کیا ہے؟ اس کی ذرا تعریف کیجیے!

نیز کیا آپ ہر مسئلے پر دلیل قاطع ہی دیتے ہیں جیسا کہ اس مضمون میں ادلہ قاطعہ ذکر کیے گئے ہیں۔ اگر آپ کے پاس دلیل قاطع نہ ہو تو خاموشی اختیار کرتے ہیں کاش! آپ اگر ایسا کریں تو آپ کے لیے بہت بہتر ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ ابو الأشبال صاحب کا یہ کلام پڑھ کر ہمیں از حد دکھ اور افسوس بھی ہوا، محسوس یوں ہوتا ہے کہ انھیں امانت علمی اور عدل و انصاف کا کوئی خیال نہیں جب کہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے:

﴿ اِعۡدِلُوۡا هُوَ أَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی﴾ ......﴿ یٰٓأَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوۡ عَلٰٓی اَنۡفُسِكُمۡ﴾......﴿ وَ إِذَا قُلۡتُمۡ فَاعۡدِلُوۡا.﴾

ابو الأشبال صاحب نے قارئین کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ہم نے صرف ابن خزیمہ کی روایت کی بنا پر نسائی کے ہاں "یضلله" میں "ہ" ضمیر کے اضافے کو غیر صحیح قرار دیا ہے جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ ہم نے صرف ابن خزیمہ کی روایت کی بنا پر نہیں بلکہ متعدد دلائل سے اِس اضافے کو غیر صحیح کہا تھا۔

اب ہم ان دلائل کو قارئین کے لیے دوبارہ ذکر کر دیتے ہیں تا کہ ابوالأشبال صاحب نے جو کچھ کہا اس کی حقیقت ان کے سامنے واضح ہو جائے ہمارے دلائل یہ تھے۔

① ...... حدیث جابر رضی اللہ عنہ:

اس میں نسائی کے ہاں "و من یضلله" ہے جب کہ میرے نزدیک یہ اضافہ کسی ناسخ کی غلطی کی وجہ سے ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

" قَال النسائی(۱۸۸/۳) : أخبرنا عتبة بن عبد الله قال: أنبأنا ابن المبارك عن سفیان عن جعفر بن محمد عن ابیه عن جابر بن عبد الله قال: كان رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول فی خطبته ، یحمد الله یثنی علیه بما هو أهله ثم یقول: ((من یهده الله فلا مضل له و من یضلله فلا هادی له.......))

یہ اس حدیث کی نسائی کے ہاں سند اور متن ہے، اس حدیث کو سفیان سے عبد اللہ بن مبارک اور وکیع نے روایت کیا ہے۔

امام نسائی کے ہاں عبد اللہ بن مبارک سے اس حدیث کو عتبۃ بن عبد اللہ نے روایت کیا ہے اور یہ ابو عبد اللہ مروزی ہیں۔ امام نسائی نے ان کی توثیق کی ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے انھیں "صدوق" کہا ہے جیسے یہ امام نسائی کے استاد ہیں ویسے ہی امام ابن خزیمہ کے بھی استاد ہیں۔ اس حدیث کو انھوں نے بھی اپنی "صحیح" (صحیح ابن خزیمہ:۱۷۸۵) میں عتبۃ بن عبد اللہ ہی سے روایت کیا ہے اور ان کے یہاں "یضلل" ہے یعنی

لفظ ''ہ'' کا اضافہ نہیں ہے۔

اسی طرح ابونعیم نے ''حلیۃ الأولیا (۱۸۹/۳) میں بھی اس حدیث کو عقبۃ بن عبد اللہ کے طریق سے ابن مبارک سے روایت کیا ہے اور ان کے ہاں بھی ضمیر کا اضافہ نہیں اور ان کے ہاں " یضلل اللّٰہ" ہے یعنی "یضلل" کی بجائے، نیز جس سند سے یہ حدیث " مجتبیٰ نسائی" میں ہے بعینہ اس سند سے نسائی نے اسے " السنن الکبریٰ" (۵۸۹۲/۴۴۹/۳) میں بھی روایت کیا ہے اور اس میں " یضلل " ہے ''یضللہ نہیں ہے۔

اس حدیث کو عبد اللہ بن مبارک سے حبان بن موسیٰ نے بھی روایت کیا ہے اور اس طریق میں بھی صرف "یضلل " ہے " ہ" کا اضافہ نہیں ہے۔

حبان بن موسیٰ کے طریق سے اسے " الآجری" نے " الشریعۃ" (ص:۴۵۔۴۶،۱۹۶) تحقیق محمد الفقی، (۳۹۸/۱، ح:۸۴،) (۸۲۵/۲، ح:۴۰۸) تحقیق الدکتور عبد اللّٰہ الدمیجی میں اور بیہقی نے " الاسماء والصفات" (حدیث ۱۳۷ تحقیق عبد اللہ الحاشدی) اور ''الاعتقاد'' (ص:۱۸۴۔۱۸۵)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نسائی کے ہاں ''یضللہ" میں '' ہ'' کا جو اضافہ ہے یہ کسی ناسخ کی غلطی یا وہم کی بنا پر ہوا ہے۔

اس پر مستزاد یہ کہ اس حدیث کو سفیان ثوری سے ابن المبارک کی طرح وکیع نے بھی روایت کیا ہے اور ان کے طریق سے اس حدیث کو احمد (۳۷۱/۳)، مسلم (۱۵۶/۲) ابونعیم نے ''المستخرج علی صحیح مسلم" (۱۹۵۳/۴۵۵/۲) میں، ابن أبی عاصم نے " السنۃ " (رقم:۲۴،۲۵۹) میں اور بیہقی نے " السنن" (۲۱۴/۳) اور " الأسماء والصفات" (رقم:۱۳۷) میں روایت کیا ہے اور اس طریق میں بھی " یضللہ" نہیں بلکہ " یضلل " ہی ہے۔

اس حدیث کو خطیب بغدادی نے ''تاریخ بغداد'' (۴۴۰/۱۴۔۴۴۱) میں من طریق عمرو بن شمر عن أبی جعفر محمد بن علی عن علی بن الحسین عن جابر رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے۔ گویا یہ سند عمرو بن شمر کی وجہ سے گھٹیا درجے کی ہے لیکن اس میں بھی " یضلل " ہی ہے۔ ''یضللہ" نہیں۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ مجتبیٰ میں ''یضللہ" میں '' ہ'' کا اضافہ ناسخ کا وہم یا غلطی ہے۔

یہ تھے نسائی کے یہاں حدیث جابر میں ''یضللہ" میں '' ہ '' ضمیر کے اضافے کو ناسخ کا وہم یا غلطی قرار دینے پر ہمارے دلائل، مگر اس کے باوجود ابو الأشبال صاحب لکھتے ہیں کہ ''کوئی دلیل قاطع نہیں'' اس موقع پر

شاعر کا یہ شعر یاد آ گیا۔

لا یصح فی الأذهان شیئ
إذا احتاج النهار إلی دلیل

قارئین کرام! آپ نے ہمارے دلائل ملاحظہ کر لیے لہٰذا ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتے بلکہ اس بات کا فیصلہ آپ پر چھوڑتے ہیں کہ ابو الأشبال صاحب نے ہمارے دلائل نقل کرنے میں خیانت علمی سے کام لیا ہے یا نہیں؟

یہ تھے پہلے مضمون میں ہمارے دلائل، موصوف کی ضیافت طبع کے لیے اب ہم یہاں دو مزید دلیلیں بھی ذکر کرتے ہیں:

ل ہماری دلیل اگر دلیل قاطع نہیں تو ابو الأشبال صاحب کی دلیل بھی کوئی دلیل قاطع نہیں ہے کیونکہ نسائی کے نسخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے کچھ نسخوں میں "یضلله" ہے اور کچھ دوسرے نسخوں میں "یضلل" بغیر "ہ" ضمیر کے ہے۔ اگر سب نسخوں کا "ہ" ضمیر کے ذکر پر اتفاق ہوتا تو ہم سمجھ لیتے کہ ابو الأشبال صاحب کی دلیل، دلیل قاطع ہے، اب ہم نسخوں کا اختلاف ذکر کرتے ہیں جن کا ہم مراجعہ کر سکے ہیں یا جو نسخے ہمیں میسر آئے ہیں۔

① نسائی کا دار الکتاب العربی سے چھپنے والا نسخہ جس پر سیوطی اور سندھی کا حاشیہ بھی ہے اس میں "یضلله" ہے۔ ملاحظہ ہو (۳/۱۸۸۔۱۸۹)

② مکتبہ سلفیہ لاہور سے "التعلیقات السلفیه" کے ساتھ موصوف اور احمد مجتبیٰ سلفی کی تحقیق سے چھپنے والے نسخے میں بھی "یضلله" ہی ہے مگر اس کے محققین نے حاشیے میں یہ صراحت کی ہے۔
"وفی بعض النسخ" "یضلل" ملاحظہ ہو: (۱۵۷۹/۲۴۵/۲)

مکتبہ دار السلام سے نسائی کا جو نسخہ چھپا ہے اس میں بھی "یضلله" ہے مگر یہ مستقل کوئی نسخہ نہیں بلکہ اس نسخے کا اصل مکتبہ سلفیہ والا نسخہ ہی ہے جیسا کہ ناشر نے اپنے پیش لفظ میں صراحت کی ہے لہٰذا یہ دونوں نسخے ایک ہی نسخہ ہے۔

③ مصطفیٰ البابی الحلبی کے نسخے میں بھی "یضلله" ہی ہے، ملاحظہ ہو (۳/۱۵۳)

یہ وہ نسخے ہیں جن میں "یضلله" ہے اب ان نسخوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں صرف "یضلل" ہے۔

① المطبعة الميمنية کے نسخے میں۔ جو (۱۳۰۶ھ) میں چھپا اور جس پر سیوطی اور سندھی کا حاشیہ بھی ہے۔ صرف "يضلل" ہے "ہ" ضمیر کا ذکر نہیں۔ ملاحظہ ہو (۲۳۴/۱)

② دار ابن حزم بیروت سے چھپنے والے نسخے میں بھی "يضلل" بغیر "ہ" کے ہے۔ ملاحظہ ہو (حدیث: ۱۵۸۰)

ب: ابن اثیر نے "جامع الاصول (۶۷۹/۵۔۲۹۷/۴) میں حدیث جابر کو مسلم اور نسائی کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور دونوں کے سیاق کو الگ الگ ذکر کیا ہے اور دونوں کے سیاق میں "يضلل" ہے "يضلله" نہیں۔

اور امام ابن اثیر نے اس کتاب کے مقدمے میں بخاری، مسلم اور سنن اربعہ وغیرہ کے مؤلفین تک اپنی سندیں ذکر کی ہیں چنانچہ نسائی کی سند کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" و أما كتاب السنن النسائی فأخبرنا بجميعه الشيخ الإمام إلى ان قال: أخبرنا الشيخ الإمام الحافظ أبو بكر أحمد بن محمد بن إسحاق السنی الدينوری قراء ة عليه فی داره بالدينور فی جمادی الأولى من سنة ثلاث و ستين و ثلاثمائة قال: حدثنا الإمام الحافظ ابو عبد الرحمن أحمد بن شعيب النسائی رحمه الله بكتاب السنن بجميعه (۲۰۳/۱۔۲۰۴)

اور ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

" و أما باقی الكتب الأربعة فانی نقلتها من الأصول التی قرأتها و سمعتها، و جمعت بينها و بين نسخ أخرى منها، إلى أن قال: و تتبعت الزيادات من جميع الامهات و أضفتها إلى مواضعها ." (مقدمة جامع الاصول (۵۵/۱).

ابن اثیر کے اس کلام سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنی اس کتاب میں اصول ستہ کی احادیث کے ذکر کرنے میں کس قدر دقت اور احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے۔ ابن اثیر کی نسائی تک سند اور اس کے مذکور کلام کو ہم نے اس لیے نقل کیا ہے کہ کہیں ابو الأشبال صاحب یہ نہ کہہ دیں کہ ممکن ہے۔ ابن اثیر نے نسائی کے جس نسخہ سے حدیث لی ہو وہ نسخہ غیر معتمد و غیر معتبر ہو چونکہ موصوف کے لیے ایسے باتیں کہہ دینا کوئی مشکل نہیں۔ مگر جو احادیث أذکار وغیرہ سے متعلق ہیں تو ان کے بیان کرنے میں الفاظ کا خیال رکھا گیا ہے چنانچہ شیخ احمد شاکر

لکھتے ہیں:

موصوف نے اپنے مذکورہ کلام کے بعد حسب عادت پھر وہی مثالیں بیان کرنا شروع کردی ہیں کہ ایک روایت میں " فأنشدك اللّٰه" ہے تو دوسری میں " فانشدك باللّٰه" ہے اور ایک میں " حتی یلقی ربھا" ہے تو دوسری میں " حتی یلقاھا ربھا" ہے وغیرہ وغیرہ۔

جیسا کہ ہم نے تھوڑی دیر پہلے بھی یہ بیان کیا کہ موصوف نے اپنے پورے مضمون میں اس قسم کی مثالیں ہی ذکر کر کے ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا لینے والا طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔

ابو الأشبال صاحب! ہم آپ سے ایک مختصر سی بات کرتے ہیں شاید کہ وہ آپ کی سمجھ میں آ جائے۔

وہ بات یہ ہے کہ رواۃ نے اکثر احادیث کو بیان کرتے وقت الفاظ کا اہتمام نہیں کیا بلکہ معنی کا خیال رکھا ہے چنانچہ الفاظ میں اختلاف ایک طبعی چیز ہے اور اس کے بارے میں رواۃ احادیث ہی کے بعض اقوال بھی ملاحظہ کر لیجیے۔

" قال ابن سیرین: کنت أسمع الحدیث من عشرة اللفظ مختلف، والمعنی واحد.

و قال سفیان الثوری: إن قلت إنی أحدثکم کما سمعت فلا تصدقونی فإنما ھوا المعنی.

و قال وکیع: إن لم یکن المعنی واسعاً فقد ھلك الناس. " أنظر (توجیه النظر للجزائری (ص: ۳۱۱-۳۱۲) ❶

اور ابن الصلاح لکھتے ہیں:

" ذالك – روایة الحدیث بالمعنی – ھو الذی تشھد به أحوال الصحابة ❷ والسلف الاوّلین، وکثیرا ما کانوا ینقلون معنی واحداً فی أمر واحد بألفاظ مختلفة، و ما ذالك إلا لأن معولھم کان علی المعنی دون اللفظ ." (مقدمة ابن الصلاح (ص: ۲۲۶- شرح العراقی).

مذکورہ اَقوال سے معلوم ہوا کہ رواۃ حدیث نے عام طور پر احادیث کو بیان کرتے وقت الفاظ کا اہتمام

❶ روایۃ الحدیث بالمعنی کے موضوع پر علامہ طاہر جزائری نے بڑی طویل بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو (ص: ۲۹۸، ۲۱۴)

❷ مثال کے طور پر مسند احمد (۱/۳۵۲، ۳۸۷، ۳/۲۰۵، ۲۳۵) ابن ماجہ (رقم ۲۳، ۲۴) اور دارمی (۱/۸۳، ۸۴) میں ابن مسعود، انس اور ابو الدرداء رضی اللہ عنہم کے آثار دیکھیں۔

نہیں کیا بلکہ معنی کو ملحوظ رکھا ہے۔

اور زیر بحث حدیث کو عام احادیث پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے خطبۂ حاجت (خطبہ مسنونہ) کو عام احادیث کی طرح بیان نہیں کیا بلکہ اس کی خصوصی طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تعلیم دی ہے چنانچہ عبداللہ بن مسعود کی حدیث میں ہے۔

"علمنا رسول الله ﷺ خطبة الحاجة "(ابو داؤد (٢١١٨) اور نسائی (٣/١٠٤ ـ ١٠٥)

اور ایک دوسری روایت میں ہے:

" علمنا رسول اللهﷺ التشهد فی الصلاة والتشهد فی الحاجة" (ترمذی (١١٠٥)، نسائی(٦/٨٩)

اور ایک تیسری روایت میں ہے:

" أوتی رسول الله ﷺ جوامع الكلم ، و خواتمه ، أو قال: فواتح الخير ، فَعَلَّمَنَا 'خطبة الصلاة ، خطبة الحاجة" (ابن ماجه:١٨٩٢)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس خطبہ کی خصوصی تعلیم دی ہے، جب آپ نے اس کی خصوصی تعلیم دی ہے تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد اس خطبہ کو روایت کرنے والے راویوں نے اس کے الفاظ کا اہتمام نہ کیا ہو۔

اب ہم نے دیکھنا یہ ہے خطبۂ حاجت والی حدیث جس کی رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو خصوصی طور پر تعلیم دی ہے اس میں کونسے الفاظ ثابت ہیں اور کونسے ثابت نہیں ہیں کیونکہ وہ دوسری عام احادیث کی طرح نہیں ہے۔ یہی وہ فرق ہے جسے شاید موصوف سمجھ نہیں پائے چنانچہ انھوں نے احادیث کے متون میں الفاظ کے اختلاف کی مثالیں دے دے کر تین چار صفحات صرف کر دیے۔ إنا للہ و إنا الیہ راجعون.

چند مثالیں ذکر کرنے کے بعد ابو الأشبال صاحب ہماری اس دلیل کہ جس سند سے یہ حدیث مجتبیٰ ''نسائی'' میں ہے بعینہ اسی سند سے یہ ''سنن کبریٰ'' نسائی میں بھی ہے اور اس میں ''یضلله'' کی بجائے "یضلل" بغیر ''ہ'' کے ہے، کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اب میری بھی سنیے! مجھ جیسے طلبائے حدیث جانتے ہیں کہ امام نسائی نے ''مجتبیٰ'' بعد میں تالیف فرمائی

ہے۔❶ اور اس میں تنقیح وتصحیح وترمیم واقع ہے نیز دونوں کے راوی مصنف سے الگ الگ ہیں، لہٰذا دونوں میں فرق دیکھ کر کسی روایت کو وہم قرار دینا صحیح نہیں۔

مولانا صاحب نے یہاں کیا ہی خوب بات کہی، پیچھے ہم سے یہ مطالبہ کیا کہ آپ نے جو کچھ کہا اس کے لیے ابونعیم ہی کی دوسری کتاب سے ثبوت پیش کرنا پڑے گا تبھی دعویٰ صحیح ہوگا بصورت دیگر دعوی بے دلیل ہے مگر ہم نے جب ''یضلله'' میں ''ہ'' ضمیر کے عدم ثبوت پر امام نسائی ہی کی دوسری کتاب کا حوالہ دیا تو دوسری چال چل دی، یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا وہ مطالبہ حافظ ابونعیم ہی کے ساتھ خاص ہو، امام نسائی یا دیگر محدثین اس مطالبہ میں داخل نہ ہوں۔﴿ تلك إذاً قِسمَةٌ ضِيزَى . ﴾

ابوالأشبال صاحب! ہم نے آپ کی بات سن لی اب آپ ہماری بھی سنیے! لیکن ذرا سنجیدگی اور غور کے

❶ مجتبیٰ نسائی (مجتنی بھی۔ یعنی ن کے ساتھ پڑھا گیا ہے) کس کی تالیف ہے حافظ ابن اثیر کے بقول بعض امراء۔ بعض نے امیر رملہ کا ذکر کیا ہے کے کہنے پر انھوں نے کبریٰ سے اس کا انتخاب کیا، ملاحظہ ہو (مقدمہ جامع الاصول(۱/۱۹۷) ...... جب کہ علامہ ذہبی نے ان سے اتفاق نہیں کیا چنانچہ وہ ابن اثیر کا قول ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:" قلتُ:هذا لم يصح، بل المجتنىٰ اختيار ابن السني، سیر(۱۴/۱۳۱) اور ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے (قلت) والذى ابن السنى ـ اختصر سنن النسائى واقتصر على رواية المختصر ، و سماه المجتنى سمعناه عالياً من طريقه (۱۶/۲۵۶)
اسی طرح ذہبی نے " تاريخ الاسلام"(وفيات و حوادث ۳۵۱ـ۳۸۰،ص:۳۱۹) اور"تذكر الحفاظ" (۳/۹۴۰) میں بھی یہی کہا ہے کہ یہ ابن سنی کا اختصار ہے، ذہبی کی اتباع میں سبکی اور ابن ناصر الدین کی بھی یہی رائے ہے۔
مگر محقق " السنن الكبرىٰ" شیخ عبدالصمد شرف الدین نے ان کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا بلکہ اسے ان کا وہم قرار دیا ہے اور لکھا ہے۔
" هكذا ذكر ابن الأثير هذه الواقعة المزعومة بين امير مجهول و بين إمام حفاظ الحديث النبوى و حامليه فى عصر بدون اى اسناد فى إثباتها...... و أغرب من ذالك رَدَّ الذهبى قول ابن الأثير هذا لا شدّة غرابته بل لما يعتقد من كون المجتبى ليس من صنع مصنفه بل هو من تأليف تلميذ له...... اور آگے چل کر لکھا ہے:" و مما لا شك فيه ان الحافظ بن السنى هو الراوى عن النسائى فى كتابه المختصر " المجتبىٰ"
پھر اور آگے چل کر لکھا ہے:"فما لا مراء فيه أن الإمام ابا عبد الرحمن النسائى هو الذى انتخب من سننه الكبرىٰ ما هو أقل حجماً منها ، و سماه " المجتبى." مقدمة السنن الكبرىٰ (۱/۱۷ـ۲۱،۲۴طبعة الدار القيمة بهيونڈى بمبئى ، هند.)
تنبیہ: یہ موصوف کی بعد کی رائے ہے جب کہ اس سے پہلے اس کے بارے میں متردد تھے کہ یہ نسائی کا اپنا اختصار ہے یا کہ ان کے کسی شاگرد کا، ملاحظہ ہو" مقدمة لمصحح لتحفة الأشراف"(۱/۱۹)
واضح رہے کہ بمبئی سے چھپنے والا، ''سنن کبریٰ'' کا نسخہ جو ہم نے دیکھا ہے وہ صرف ''کتاب الطهارة'' پر مشتمل ہے، اور اس کی طباعت(۱۳۹۱ھ ـ۱۹۷۲م) میں ہوئی۔
اور اس وقت بازار میں اس کا مکمل نسخہ جو فہرست سمیت سات جلدوں میں پایا جاتا ہے وہ ڈاکٹر عبدالغفار اور سید کسروی کی تحقیق سے پہلی بار ۱۹۹۱ء میں دار الکتب العلمیة، بیروت سے چھپا تھا۔)

ساتھ۔ وہ بات یہ ہے کہ ''مجتبیٰ نسائی'' کے نسخوں میں اختلاف ہے کچھ میں ''یضلله'' اور کچھ میں صرف ''یضلل'' بغیر ''ہ'' ضمیر کے ہے۔

اب ہمیں ان دونوں روایتوں میں سے ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کے لیے کیا کرنا ہوگا، اس کے لیے ہمیں سب سے پہلے امام نسائی ہی کی کتاب دیکھنا ہوگی اس کے بعد ان کتب کو دیکھنا ہوگا جن میں نسائی کے حوالے سے یہ حدیث ہے اور پھر ان ائمہ کی کتب کو دیکھنا ہوگا جنھوں نے اپنی اسانید سے اس حدیث کو اپنی کتب میں روایت کیا ہے۔

چنانچہ سب سے پہلے ہم نے امام نسائی کی ''سنن کبریٰ'' کو دیکھا ہے۔ اس میں ہمیں "یضلل" ہی ملا اس کے بعد ''جامع الاصول'' کو دیکھا جس میں نسائی کے حوالے سے یہ حدیث ہے اس میں بھی "یضلل" پایا۔ پھر ہم نے دیگر ائمہ کی کتب کو دیکھا تو ان میں بھی "یضلل" ہی نظر آیا لہٰذا صحیح بھی یہی ہے۔

موصوف کا یہ کہنا '' امام نسائی نے ''مجتبیٰ'' بعد میں تالیف فرمائی ہے۔ اس وقت قابل غور تھا جب کہ ''مجتبیٰ'' کے سب نسخوں میں ''یضلله'' ہی ہوتا جب کہ ایسے نہیں کیونکہ اس کے نسخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔

اور موصوف کا یہ کہنا کہ دونوں میں فرق دیکھ کر کسی روایت کو وہم قرار دینا صحیح نہیں ہیں تو اس کے بارے میں ہماری گزارش یہ ہے کہ ہم نے صرف دونوں میں اختلاف دیکھ کر یہ حکم نہیں لگایا بلکہ دوسرے دلائل ذکر کیے ہیں شاید موصوف نے ان پر توجہ نہیں دی۔

موصوف نے اپنے مذکورہ کلام کے بعد پھر اختلاف الفاظ کی دو مثالیں ذکر کی ہیں، ان مثالوں کے بعد چند اور باتیں جن کا عنقریب ہم جائزہ لے رہے ہیں۔ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں'' آخر میں کچھ اور مثالیں بھی ملاحظہ فرمائیں!

سارے مضمون میں ان کی پونجی بس یہی مثالیں ہیں ان کے علاوہ دوسری کوئی چیز ان کے پلے میں ہمیں نظر نہیں آتی۔

بار بار ان کی اس قسم کی مثالیں دیکھ اور پڑھ کر ہمیں تعجب بھی ہو رہا تھا اور ہنسی بھی آ رہی تھی اور ذہن میں یہ سوال بھی ابھر رہا تھا کہ موصوف ایسے کیوں کر رہے ہیں؟ آخر اس کی وجہ جو ہمیں سمجھ آئی وہ یہ کہ موصوف اس مضمون کے شروع میں یہ کہہ بیٹھے ہیں۔ ''اب میں بھی قدرے تفصیل سے لکھ رہا ہوں اگرچہ میں ہمیشہ اختصار

پسند ہوں طوالت سے پرہیز کرتا ہوں' چنانچہ انہوں نے اپنی اس بات کو بھی پورا کرنا تھا جب تھوڑا سا لکھنے کے بعد دیکھتے ہیں تو انہیں محسوس یہ ہوتا ہے کہ اب قدرے تفصیل نہیں ہوئی تو مزید مثالیں ذکر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح کرتے کرتے ان کا یہ مضمون مثالوں سے بھر گیا، اگر ان مثالوں کو نکال کر دیا جائے تو مضمون میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا۔ بہر حال مولانا کو تو اس سے یہ فائدہ ہوا ہوگا کہ وہ اسے دیکھ کر خوش ہو گئے ہوں گے کہ اب میں نے بھی قدرے تفصیل سے مضمون لکھ مارا ہے۔

آگے چل کر موصوف نے لکھا ہے، ''اس کے بعد ابن مسعود رضی اللہ عنہ والی روایت پر بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے، اس سلسلے میں مختصراً عرض ہے کہ یہ حدیث ''سنن'' میں موجود ہے۔ سنن أبي داؤد کے بین الاقوامی شارح صاحب ''عون المعبود'' نے ''سنن أبي داؤد'' کے متن کا مختلف گیارہ قلمی نسخوں سے تصحیح و مقابلہ کیا ہے جیسا کہ اس کی آخری جلد کے آخر میں مرقوم ہے، اس ''عون المعبود'' کی دوسری جلد طبع ملتان کے صفحہ (۲۰۴) پر متن میں ''من یضلل'' ہے تو حاشیے میں نسخہ '' من یضلله''موجود ہے۔

نیز ''ترمذی'' طبع ھٰذا میں متن کے اندر ہی'' من یضلله'' ہے، نیز میرے پاس جامع ترمذی کا مخطوطہ مصورہ موجود ہے، اس کے متن میں صاف'' من یضلله'' موجود ہے۔

یہ ہے موصوف کا کلام اور اس پر ہم درج ذیل گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

نمبر۱: سنن ابو داؤد:

ا۔ سنن ابو داؤد کے بارے میں موصوف نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے اس لیے کہ صاحب '' عون المعبود'' نے ابو داؤد کی شرح لکھتے وقت اس کے گیارہ قلمی نسخوں سے تصحیح اور ان کا آپس میں مقابلہ کیا اور جس نسخے پر انھوں نے اپنی شرح لکھی اس میں ''یضلله'' نہیں بلکہ ''یضلل''ثبت کیا کیونکہ ان کی شرح میں ''یضلل'' ہے ''یضلله'' نہیں بلکہ انھوں نے بڑے واضح الفاظ سے یہ لکھا ہے:

'' بحذف ضمیر المفعول ، و فی بعض النسخ بإثبات الضمیر . ''

ان کے اس کلام سے درج ذیل باتیں سامنے آئیں۔

1 ......جن گیارہ نسخوں کو انھوں نے اپنے سامنے رکھا ان میں سے اکثر نسخوں میں ''یضلل'' بحذف ضمیر المفعول ہی ہے اور چند یا بعض نسخوں میں باثبات الضمیر ہے یعنی '' یضلله'' ہے۔

2 ......ان کے نزدیک وہی نسخے معتبر یا باعتماد تھے جن میں ''یضلل'' بغیر ضمیر مفعول کے تھا کیونکہ ان کے

نزدیک اگر وہ نسخے باعتماد ہوتے جن میں "یضلله" ضمیر مفعول کے ساتھ تھا تو وہ متن اور شرح میں بھی "یضلله" لکھتے اور شرح میں ان نسخوں کی طرف اشارہ کر دیتے۔

مثلاً یوں کہتے:

" (یضلله) بإثبات ضمیر المفعول ، و فی أکثر النسخ بحذف ضمیر المفعول ."

"عون المعبود" کی ملتان کی طبع کے حاشیے میں اگر "یضلله" لکھ کر کسی ایک نسخے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تو اس سے کیا ہوا کیونکہ اکثر نسخوں میں تو "یضلل" بغیر ضمیر مفعول کے ہی ہے۔

ملتان کی طبع میں تو یہ اسلوب اپنایا گیا ہے جب کہ بیروت وغیرہ کی طبعات کے متن میں یہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔

یضلل[یضلله] ، یعنی متن ہی میں ایسے لکھا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو: مکتبہ ابن تیمیہ ، وطبع دار الفکر(٦/١٥٣/٤/١٠٤/٢) اور طبع دار الکتب العلمیة (٦/١٠٨/١١٨/٢)

غالباً ان سب نے صاحب "عون المعبود" کے کلام پر ہی اعتماد کرتے ہوئے ایسا کیا ہو گا ، ملتان والوں نے اس کو حاشیے میں ذکر کر دیا اور دوسروں نے متن میں بین القوسین ذکر کر دیا۔ واللہ اعلم.

ب: سہار نپوری نے "بذل المجهود" کی شرح لکھتے وقت ابو داؤد کے چھ نسخوں کو سامنے رکھا جیسا کہ انھوں نے مقدمے (۱/۴۳-۴۴) میں ذکر کیا ہے ، اور ان کے متن میں بھی "یضلل" بغیر ضمیر مفعول کے ہے ، اور شرح میں انھوں نے اس طرح کوئی اشارہ نہیں کیا کہ جن نسخوں پر ان کا اعتماد ہے ان میں سے کسی میں "یضلله" بھی ہے جس کے معنے یہ ہوئے کہ ان کے پیش نظر جو چھ نسخے تھے ان میں سے کسی میں بھی "یضلله" نہیں۔ واللہ اعلم.

اور " من یهده الله " میں چونکہ ضمیر مفعول مذکور ہے اس لیے وہ لکھتے ہیں:"بإثبات الضمیر أی من یوفقه للهدایة" جب کہ "یضلل" کے بارے میں انھوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی۔ ملاحظہ ہو، " بذل المجهود"(١٠/١٤٨)

ج: مختصر سنن أبی داؤد للحافظ المنذری(٣/٥٤/٢٠٢٣) میں بھی "یضلل" بغیر "ہ" کے ہے۔

د: حافظ ابن اثیر نے "جامع الأصول(١١/٤٣٦/٨٩٦٩) میں اس حدیث کو ابو داؤد کے سیاق سے ذکر کیا ہے۔ اور اس میں "یضلل" بغیر ضمیر مفعول کے ہے، اسی طرح (۵/۶۸۰/۳۹۷۵) بھی دیکھیں۔

اور ابن اُثیر نے احادیث کے متون کو ذکر کرنے میں جو دقت اور احتیاط ملحوظ رکھی ہے چند صفحات پہلے ہم اس کا ذکر کر آئے ہیں۔

امام نووی نے شرح مسلم (۳/۴۲۷، حدیث: ۸۷۰) کتاب الجمعۃ، میں اس حدیث کو ابو داؤد کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور انھوں نے ''یھلل'' کو بغیر ضمیر مفعول ہی کے ذکر کیا ہے۔

نووی نے ''اُذکار'' (۲۵۰) میں بھی اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور اس میں بھی ''یھلل'' ہی ہے ''اُذکار'' میں انھوں نے ابو داؤد کے علاوہ اس کو دیگر سنن کی طرف بھی منسوب کیا ہے مگر جو اُلفاظ انھوں نے ذکر کیے ہیں وہ اُبو داؤد ہی کے ذکر کیے ہیں جیسا کہ انھوں نے اس کی خود صراحت کی ہے۔ اسی طرح دیگر جن ائمہ و حفاظ نے اس حدیث کو سنن کے حوالے سے ذکر کیا ہے تو انھوں نے ''یھلل'' کو بغیر ''ہ'' ہی کے ذکر کیا ہے اور ان کے ناموں کی تفصیل عنقریب آ رہی ہے۔

۹ : ابو داؤد کی اکثر طبعات میں ''یھلل'' ہی ہے ''یضلله'' نہیں اب ان طبعات کی۔ جو ہماری نظر سے گذری ہیں۔ تفصیل ملاحظہ کر لیں۔

① طبعة دار الحیل، ② دار الحدیث بیروت
③ دار الحدیث القاھرۃ، و دار الریان للتراث ④ دار الجنان
⑤ دار ابن حزم ⑥ دار السلام

⑦ طبعة المنشی '' نول کشور، مگر اس کے حاشیے میں یوں لکھا گیا ہے ''یضلله'' یعنی ایک نسخے میں ''یضلله'' بھی ہے، ملاحظہ ہو (۱/۲۹۰)

جب کہ طبعة مصطفیٰ البابی الحلبی کے متن ہی میں ''یضلله'' ہے۔ دیکھیں (۱/۴۸۹)

اور پہلی چھ طبعات کی حدیث (۲۱۱۸) ملاحظہ کریں۔

نمبر:۲ سنن ترمذی:

موصوف نے لکھا ہے کہ ترمذی طبع ہند میں متن کے اندر ہی'' من یضلله'' ہے۔

شاید اس سے مراد ان کی مطبع مجتبائی دہلی کی طبع جس کے ساتھ شرح "نفع قوت المغتذی" ہے وہ ہو کیونکہ اس میں ''یضلله'' ہے ملاحظہ ہو۔ (۱/۱۳۱)

آیئے! اب ہم آپ کے لیے ان طبعات کا ذکر کرتے ہیں جن میں صرف "یضلل"، ''ہ'' ضمیر کے اضافے کے بغیر ہے۔

١ طبعة سعادة حسین بک جو کہ اوائل شعبان (١٢٩٢ھ) کی طبعہ ہے ملاحظہ ہو (٢٠٥/١)

٢ طبعة مكتبة الرياض الحديثة (حديث: ١١١١)

٣ طبعة مطابع الفجر الحديثة حمص شام

٤ طبعة دار السلام۔ الرياض

ان دونوں طبعات میں (حدیث ١١٠٥) دیکھیں

٥ ترمذی کے ابن عربی کی شرح "عارضة الأحوذی" کے نسخے میں بھی "یضلل" ہے۔ ملاحظہ ہو (٢٠/٥)

٦ اسی طرح "تحفة الأحوذی" والا نسخہ جو دار الفکر بیروت میں چھپا ہے۔ اس میں بھی ''یضلل'' بغیر ''ہ'' ضمیر مفعول کے ہی ہے۔ ملاحظہ ہو (٢٣٨/٤)

لیکن "تحفة الأحوذی" کی جو ہندوستانی طبع ہے جس کی تصویر لے کر اسے دار الکتاب العربی نے بھی شائع کیا ہے اس میں ''یضلله'' ہے۔

اس طبع میں غالبًا کسی نسخے کی بنا پر ''ہ'' ضمیر کا بعد میں اضافہ کیا گیا ہے نہ کہ جس نسخے پر علامہ مبارک پوری نے شرح لکھی تھی اس میں ''یضلله'' تھا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر اس میں ''یضلله'' ہوتا تو شرح میں بھی علامہ مبارک پوری ''یضلله'' ذکر کرتے جب کہ انھوں نے " یضلل" ذکر کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ شرح لکھتے وقت علامہ مبارک پوری علیہ الرحمۃ کے پیش نظر ''ترمذی'' کے جو نسخے تھے ان میں سے کسی میں بھی ''یضلله'' نہیں تھا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے شرح لکھتے وقت جس نسخے پر اعتماد کیا اس میں ''من یھد اللہ'' بحذف ضمیر المفعول تھا کیونکہ شرح میں اس طرح ہی مذکور ہے چنانچہ وہ اس کی شرح میں رقمطراز ہیں:

" (من يهد الله) و في بعض النسخ : "من يهده الله " بإثبات الضمير، وكذالك في رواية أبي داؤد و النسائي وابن ماجه. " ملاحظہ ہو: (تحفة الأحوذی (٢٣٩/٤، دار الفكر ١٧٨/٢ طبع هند)

علامہ مبارک پوری کے اس کلام سے معلوم ہوا کہ اگر کسی نسخے میں ''یضلله'' ہوتا تو وہ اس کی طرف اشارہ کر دیتے جیسا کہ انھوں نے "یهده الله" کے بارے میں اشار کر دیا ہے۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے سامنے ابو داؤد کا جو نسخہ تھا اس مین "یضلل" ہی تھا اس لیے اگر اس میں ''یضلله'' ہوتا تو وہ اس کی طرف بھی اشارہ کر دیتے جیسا کہ انھوں نے (من یهده الله) کے بارے میں

اشارہ کر دیا ہے، جب کہ انھوں نے شرح میں صرف یہی کہا ہے:

"(و من يضلل) بخلق الضلالة فيه"

7 صاحب ''منتقی الاخبار'' نے اس حدیث کو ترمذی کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور انھوں نے ''يضلل'' ذکر کیا ہے ''يضلله'' نہیں۔ ملاحظہ ہو (۱۳/۶۔ نیل الأوطار)

موصوف کا یہ کہنا کہ نیز میرے پاس جامع ترمذی کا مخطوطہ مصورۃ موجود ہے اس کے متن میں صاف ''من يضلله'' موجود ہے تو اس کے بارے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ دیکھنا ہو گا کہ اس مخطوطہ کی حیثیت کیسی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی مخطوط یا مطبوع میں ''يضلله'' ہے بھی تو مذکورہ تفصیل کی بنا پر انہی مخطوطات اور مطبوعات کا اعتبار کیا جائے گا جن میں ''يضلل'' بغیر ضمیر مفعول کے ہے۔

آیئے! اب ہم آپ کے سامنے ان ائمہ وحفاظ کے نام رکھتے ہیں جنھوں نے اپنی کتب میں اس حدیث کو ''سنن'' وغیرہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور لفظ ''يضلل'' کو ''ہ'' ضمیر مفعول کے بغیر ذکر کیا ہے۔

1. امام بغوی (متوفی ۵۱۶ھ) نے ''مصابیح السنۃ (۲۳۴۰/۴۱۵/۲) میں اس حدیث کو سنن کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور اس میں ''يضلل'' کے بعد لفظ جلالہ کا اضافہ تو ہے یعنی ''يضلل الله'' ہے مگر اس میں ''ہ'' ضمیر کا ذکر نہیں یعنی ''يضلله'' نہیں۔

2. امام ابن قدامہ (متوفی ۶۲۰ھ) نے ''مغنی'' (۴۶۵/۹۔ طبعۃ هجر) میں اس حدیث کو ابو داؤد اور ترمذی کے حوالے سے نقل کیا ہے اور اس میں بھی ''يضلل'' بغیر ضمیر مفعول کے ہے۔

3. خطیب تبریزی (متوفی ۷۳۷ھ) نے ''مشکاۃ المصابیح (۹۴۲/۲)، المکتب الاسلامی) میں اس حدیث میں لفظ ''يضلل'' یعنی بغیر ''ہ'' ہی کے ذکر کیا ہے اور کہا ہے۔

رواه أحمد والترمذي و ابو داؤد و النسائي وابن ماجه والدارمي اس کے بعد انھوں نے اس میں ابن ماجہ اور دارمی کے ہاں بعض اضافوں کا ذکر بھی کیا ہے لیکن یہ ذکر نہیں کیا کہ کسی کے ہاں ''يضلل'' میں ''ہ'' ضمیر مفعول کا اضافہ بھی ہے۔

طیبی کی "شرح المشكاة" (۲۸۸۹/۷) اور ملا علی قاری کی "مرقاة المفاتيح" (۳۰۹/۶) میں بھی "يضلل" ہی ہے۔

④ حافظ ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) نے ''تفسیر'' (۲۷۹/۲) الاعراف آیت:۱۷۸) میں اس حدیث کو لفظ "یضلل اللّٰہ" بغیر "ہ" کے ساتھ ذکر کیا ہے اور کہا ہے:

"رواہ الإمام أحمد و أھل السنن وغیرھم." انھوں نے اس میں لفظ "نستھدیہ" زیادہ ذکر کیا۔ ہے جب کہ یہ لفظ اس حدیث میں نہیں بلکہ دوسری حدیث میں ہے لیکن ثابت نہیں ہے جیسا کہ تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے۔

⑤ علامہ جزری (متوفی ۸۳۳ھ) نے "عدۃ الحصن الحصین" (ص:۲۱۴۔ تحفۃ الذاکرین) میں اس حدیث کو ''سنن أربعۃ'' کے حوالے سے نقل کیا ہے اس میں بھی ''یضلل'' ہی ہے یعنی ضمیر کا اضافہ نہیں۔

علامہ شوکانی نے اس کی شرح ''تحفۃ الذاکرین'' میں ''الحمد'' سے پہلے لفظ "اِنَّ" کے اثبات یا عدم اثبات سے متعلق کلام تو کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

"إن الحمد للہ، وھکذا فی بعض الروایات بإثبات "إن" و فی بعضھا بحذفھا، و فی روایۃ بحذفھا أو اثباتھا علی الشك."

مگر انھوں نے ''یضلل'' کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہی کہ کسی روایت میں ''یضلل'' بھی ہے، انھوں نے اس حدیث کو حاکم، ابوعوانہ اور بیہقی کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔

لفظ ''اِنّ'' کے بارے میں یہی کلام علامہ شوکانی نے ''نیل الأوطار'' (۱۳۱/۶) میں بھی کیا ہے، لیکن "یضلل" کے بارے میں انھوں نے اس میں بھی کوئی بات نہیں کی۔

⑥ حافظ ابن حجر (متوفی ۸۵۲ھ) نے ''بلوغ المرام'' (حدیث ۹۹۹) (۹۷۸/۲۔ سبل السلام) میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور اس میں بھی ''یضلل'' ہی ہے یعنی ضمیر مفعول کے بغیر اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد انھوں نے اس کی تخریج یوں کی ہے: "رواہ أحمد والأربعۃ، وحسنہ الترمذی والحاکم."

⑦ علامہ جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) نے ''در منثور'' (۴۲۵/۲ تفسیر سورۃ النساء آیت:۱) میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور اسے ذکر کرنے سے قبل اس کے مصادر کا ذکر یوں کیا ہے۔

" و أخرج ابن أبی شیبۃ و ابو داؤد والترمذی۔ و حسنہ۔ والنسائی و ابن ماجۃ عن ابن مسعود قال: علمنا رسول اللہ ﷺ خطبۃ الصلاۃ، و خطبۃ الحاجۃ......"

اور انھوں نے جو سیاق ذکر کیا ہے وہ ابن ابی شیبہ کا سیاق ہے سوائے چند کلمات کے جو کہ ابن أبی شیبہ کے مطبوعہ نسخے میں نہیں اور سیوطی کے ہاں بھی اس حدیث میں ''یضلل'' ہے ''یضللہ'' نہیں۔

ہم نے اس سے پہلے والے اپنے مضمون میں کہا تھا کہ مصنف ابن أبی شیبۃ'' میں ''یضلله'' ہے مگر اس میں ''ہ'' ضمیر کا اضافہ کسی ناسخ یا راوی کی غلطی ہے اور اس پر ہم نے اپنے دلائل بھی دیے تھے اور ابھی ایک نئی دلیل یہ بھی ملاحظہ کر لیجیے کہ سیوطی نے جس نسخے سے اس حدیث کو نقل کیا ہے اس میں ''یضلل'' ہے ''یضلله'' نہیں کیونکہ اس میں اگر ''یضلله'' ہوتا تو سیوطی اسے اسی طرح نقل کرتے۔

یہ واضح رہے کہ جب مطلق طور پر یہ کہا جائے کہ فلاں حدیث کو ابن أبی شیبہ نے روایت کیا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ انھوں نے اسے اپنی کتاب ''مصنف'' میں روایت کیا ہے جس طرح مطلق طور پر ''نسائی'' کہنے سے ان کی کتاب ''سنن صغریٰ'' بیہقی کہنے سے ان کی کتاب ''سنن کبریٰ'' اور ''طبرانی'' کہنے سے ان کی کتاب ''معجم کبیر'' مراد ہوتی ہے۔

⑧ متقی ہندی (متوفی ۹۷۵ھ) نے ''کنز العمال (۱۵/۹۴۱/۴۳۶۱۸) میں اس حدیث کو مسند احمد اور سنن اربعہ وغیرہ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور اس میں "یضلل اللّٰہ" ہے یعنی "یضلل" کے ساتھ لفظ جلالہ کا اضافہ تو ہے لیکن ''یضلله'' نہیں۔

تنبیہ: حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما جو ان سے ان کے مولیٰ کریب کی سند سے مروی ہے جس کی تخریج ہم نے اس سے پہلے والے مضمون میں شافعی کی "امّ" اور بیہقی کی "معرفة السنن" سے کی ہے۔صاحب "کنز العمال" نے بھی اسے شافعی اور "معرفة السنن للبیهقی" کے حوالے سے ذکر کیا ہے مگر انھوں نے اس میں ''یضلله'' ذکر کیا ہے ملاحظہ ہو کنز العمال (۱۵/۹۴۲/۴۳۶۲۱)

جب کہ امّ، مسند اور معرفۃ میں "یضلل" بغیر ضمیر ''ہ'' ہے۔''یضلله'' نہیں۔

اس حدیث کے بعد انھوں نے حدیث ابن مسعود کو اس سیاق سے ذکر کیا ہے جس کے آخر میں "أرسله بالحق بشیراً و نذیراً......" ہے۔اور اسے بیہقی کی طرف منسوب کیا ہے اس میں بھی انھوں نے ''یضلله'' ہی ذکر کیا ہے جب کہ بیہقی کے ہاں "یضلل" ہی ہے صرف بیہقی نہیں بلکہ جن دوسرے مصادر۔سنن ابو داؤد وغیرہ۔میں بھی یہ حدیث ہے ان میں بھی "یضلل" بغیر ''ہ'' ضمیر کے ہے۔تفصیل کے لیے ''الاعتصام'' ،جلد:۵۵،شمارہ ۱۸، ۹، تا ۱۵ مئی ۲۰۰۳ء ملاحظہ کریں۔

⑨ زبیدی (متوفی ۱۲۰۵ھ) نے ''اتحاف السادة المتقین'' (۶/۹۶) میں اس حدیث کو طیالسی، سنن اربعہ، حاکم اور بیہقی کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور اس میں ''یضلل'' ذکر کیا ہے ''یضلله'' نہیں۔

انھی چند جید ائمہ وحفاظ کے حوالوں پر اکتفاء کرتے ہیں۔

فائدہ: " من يهده الله " میں " ہ "ضمیر مفعول کا ذکر اور "من يضلل " میں "ہ"ضمیر مفعول کا حذف، یہ کیوں؟

بعض علماء نے اس کی ایک حکمت بیان کی ہے چنانچہ ابن علان "الفتوحات الربانية على الأذكار لنواوية"(٦/ ٦٩) میں اس حکمت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" و في الاتيان بضمير المفعول في جانب الهداية، و تركه في جانب الضلالة نكتة تشير إلى العناية."

آ گے چل کر موصوف نے لکھا ہے کہ بخاری کے مطبوعہ نسخوں کے حاشیے میں مختلف نسخے اختلاف الفاظ و جمل موجود ہیں ان کو کسی ناسخ یا طابع کا وہم تو قرار نہیں دیا گیا۔ الخ

شروع سے یہاں تک تو موصوف متن میں الفاظ اختلاف کا سہارا لیتے آئے اور یہاں پہنچ کر انھیں ایک دوسرا سہارا بھی مل گیا کہ ''بخاری'' کے مطبوعہ نسخوں کے حاشیے میں مختلف نسخے اختلاف الفاظ و جمل کے موجود ہیں۔''

یہ ان کا دوسرا اور آخری سہارا ہے، ان کا یہ کہنا کہ ان کو کسی ناسخ یا طابع کا وہم تو قرار نہیں دیا گیا تو ہم ان کی ضیافت طبع کے لیے ایک مختصر سی مثال بیان کر دیتے ہیں کیونکہ ہم مزید تفصیل میں نہیں جانا چاہتے اس لیے کہ مضمون پہلے ہی بہت طویل ہو چکا ہے۔

وہ مثال یہ ہے کہ صحیح بخاری کے بہت سے نسخوں میں " دعاؤكم إيمانكم" سے پہلے لفظ ''باب'' کا اضافہ ہے یعنی اس طرح ہے " باب دعاؤكم إيمانكم."

اور امام نووی کے نزدیک لفظ ''باب'' کا یہاں اضافہ فاش غلطی ہے۔ چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:

" يقع في كثير من النسخ هنا باب ، و هو غلط فاحش، و صوابه بحذفه ، و لا يصح إدخال باب هنا إذ لا تعلق له هنا."

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ، امام نووی رحمہ اللہ کا یہ کلام ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

" قلت: ثبت " باب" في كثير من الروايات المتصلة، منها رواية أبي ذر، ويمكن توجيهه، ليكن قال الكرماني: أنه وقف على نسخة مسموعة على الفربري بحذفه "

[فتح الباري (١/ ٤٩)]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے آخری کلام ''لیکن قال الکرمانی'' سے معلوم ہوا کہ امام نووی نے لفظ ''باب'' کے بارے میں جو کہا وہ ان سے اس پر متفق ہیں۔

ہم نے لفظ ''یضلله" میں ''ہ'' کے اضافے کو جو وہم یا غلطی قرار دیا تھا تو وہ بعض نسخوں پر اعتماد کر کے نہیں بلکہ دیگر دلائل کی بنا پر یہ کہا تھا، جنھیں اس سے پہلے والے مضمون میں دیکھا جا سکتا ہے۔

موصوف کے آخر میں کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نتیجے میں تو ہمارے ساتھ متفق ہیں انھیں جو اختلاف ہے وہ طریقہ کار سے ہے۔

چنانچہ لکھتے ہیں: ''تابع و ناسخ کی طرف سے سہو وغیرہ کہنا قطعاً درست نہیں بلکہ ترجیح تو ممکن ہے۔''

ہم مولانا ابو الأشبال صاحب سے پوچھتے ہیں کہ آپ یہاں ترجیح کس کو دیں گے "یضلل" کو یا ''یضلله'' کو؟ (أفیدونا جزاکم اللّٰہ خیرا)

مضمون خلاف توقع بہت لمبا ہو چکا ہے چنانچہ اب انہی الفاظ پر اکتفا کرتے ہیں اور اسے اللہ عزوجل کے اس فرمان پر ختم کرتے ہیں۔

﴿إن فی ذالك لذکری لمن کان له قلب أو ألقی السمع و هو شهید.﴾ [ق:٣٧]

احادیث بیان کرنے کے اصول (علم المصطلح)

اسماء الرجال اور علم جرح و تعدیل تو محدثین کرام کی مساعی جمیلہ کا عظیم امتیاز ہے۔ فرق باطلہ چونکہ ان کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا ان کا معترض ہونا کوئی انوکھی بات نہیں کیونکہ مقولہ مشہور ہے کہ آدمی ہمیشہ اس چیز کا دشمن ہوتا ہے جس سے وہ ناواقف ہو۔ رب العزت ہم سب کی رہنمائی فرمائے۔

(آمین!)

۱۳ کتب احادیث اور ان کے متعلقات

سوال: صحیح بخاری کے ایک ثقہ راوی ابن شہاب زہری ہیں کیا وہ شیعہ ہیں؟

جواب: امام زُہری رحمہ اللہ کی طرف تشیع کا انتساب من گھڑت افسانہ ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''تقریب التھذیب'' میں فرماتے ہیں:

" اَلْفِقِيْهُ الْحَافِظُ مُتَّفَقٌ عَلٰى جَلَالَتِهٖ وَإِتْقَانِهٖ ." [1]

''زہری فقیہ حافظ ہیں، ان کی جلالت و اتقان پر اہل علم کا اتفاق ہے۔''

سوال: بخاری شریف امام بخاری رحمہ اللہ کی زندگی میں مکمل نہیں ہوئی۔ بلکہ بعد میں ان کے شاگردوں نے اس کو مکمل کیا۔ لہٰذا انہوں نے ہر حدیث خواہ وہ جیسی بھی ہے صحیح ہے یا ضعیف یا کسی شیعہ راوی نے اس کو روایت کیا ہے، لکھ دی۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے کہ صحیح بخاری کی تکمیل موصوف مصنف کی زندگی کے بعد ہوئی بلکہ واقعات سے یہ بات عیاں ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کی وفات سے تیئس سال قبل صحیح بخاری مکمل ہو چکی تھی۔ کیونکہ تاریخی طور پر یہ امر ثابت شدہ ہے کہ کتاب ہذا کو تالیف کے بعد امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن معین پر پیش کیا گیا تھا اور ان کا انتقال ۲۲۳ ہجری میں ہے جب کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا سن وفات ۲۵۶ ہجری ہے۔ صحیح بخاری میں کسی غالی مذہبی کی روایت نہیں۔ جملہ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سیرۃ البخاری مؤلفہ علامہ عبدالسلام مبارکپوری۔

سوال: صحیح بخاری ایک دور میں ایرانیوں کے پاس بھی رہی جس میں انہوں نے اپنی مرضی کی احادیث شامل کیں جو ان کے شیعہ مذہب کو سچ ثابت کرتی ہیں۔ لہٰذا یہ بات کہاں تک درست ہے؟

جواب: حقائق اور واقعات سے ثابت نہیں کہ صحیح بخاری پر ایرانیوں نے قبضہ کیا ہو بلکہ شیعہ مسلک کے کمزور

---

[1] (۱۵۹) محمد بن مسلم ابن شہاب القرشي الزهري رقم (٦٢٩٦).

مسائل کی اس میں تردید کی گئی ہے۔ مثلاً چار سے زیادہ عورتوں کو عقد میں رکھنا ناجائز ہے اور متعہ کی حرمت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے ❶ جب کہ چار بیویوں والا مسلک امام زین العابدین رحمہ اللہ سے ماثور ہے۔❷ ان کے مسلمہ ائمہ کے اقوال سے شیعہ مسلک کی تردید کی گئی ہے تو پھر اس میں شیعیت کا شائبہ کہاں ہے؟ (بخاری مع فتح الباری :٦/٢٠٢)

سوال: اسی طرح وہ چند ایک احادیث بھی پیش کرتے ہیں مثلاً صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں اور ان سے اپنے والد کی جائداد کا حصہ طلب کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جائداد تو صرف مساکین اور غرباء کے لیے ہوتی ہے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ناراض ہو گئیں۔ ❸ اس کو دلیل بنا کر پھر وہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''جس نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ناراض کیا اس نے مجھ کو ناراض کیا۔'' تو ایسی باتوں کا جواب کیا ہوگا؟

جواب: فتح الباری میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بعد میں فاطمہ رضی اللہ عنہا کو راضی کر لیا تھا اور جہاں تک میراث کا تعلق ہے، سو یہ بات ثابت شدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی میراث جاری نہیں ہوتی۔ ❹ اگر اس کا کوئی وجود ہوتا تو پھر حضرت علی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما کو اپنے زمانۂ خلافت میں اپنا حق ضرور وصول کر لینا چاہیے تھا جبکہ واقعاتی طور پر یہ بات ثابت نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا موقف حق پر مبنی تھا جسے بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لیے اُسوۂ حسنہ سمجھا۔

سوال: ہمارے مولوی صاحب کا یہ کہنا کہ ''مشکوۃ شریف'' کی کتاب مجموعہ حدیث ہے۔ اس کا حوالہ دیتے وقت جس اصل کتاب کا صاحب مشکوٰۃ نے حوالہ دیا ہے، اس کتاب کا حوالہ دینا چاہیے۔ یہ کتاب تو گیارہ کتابوں سے حدیثیں لے کر جمع کی گئی ہے۔ اس کی وضاحت فرمائیں۔ آیا موصوف کا کہنا درست ہے یا غلط؟

---

❶(١٦٠) صحیح البخاری، کتاب النکاح فی ترجمة الباب: لا یتزوج من أربع لقوله تعالی:﴿مثنی وثلث وربع﴾رقم الباب:(٢٠).

❷(١٦١) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة خیبر (٤٢١٦)والنکاح، باب نهی النبی ﷺ عن نکاح المتعة أخیرا (٥١١٥)،صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب نکاح المتعة(٣٤٣١-٣٤٣٥).

❸(١٦٢) صحیح البخاری، کتاب فرض الخمس، باب فرض الخمس (٣٠٩٣) والفرائض ،باب قول النبی ﷺ : «لا نورث ما ترکنا صدقة.»(٦٧٢٦).

❹(١٦٣) انظر قبل هذا .

جواب: بلاشبہ مشکوۃ کئی کتابوں سے مأخوذ احادیث کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا حوالہ دینا چاہیے۔ اگر نہ بھی دیا جائے تو پھر بھی مفہوم یہی ہوتا ہے کہ ''مشکوۃ'' اصل نہیں۔ اس کے بیان کردہ حوالہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

سوال: احادیث کی مختلف کتابوں کی شرح لکھتے وقت آخر میں ''۱۲ منہ'' لکھا ہوتا ہے یہ کس بات کا مخفف ہے؟

جواب: ''۱۲ منہ'' کا مطلب یہ ہے کہ یہاں تک مصنف کی طرف سے عبارت کی حد ہے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (المنجد فِی اللّغَةِ وَالْاَدَبِ وَالْعُلُوم ، حروف أبجد.)

❀❀❀❀❀❀❀

﴿ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ...... ﴾

یعنی رسول اللہ ﷺ کا خواب عمرہ کرنے کے متعلق۔ چنانچہ آپ ﷺ اسی ارادہ سے نکلے مگر مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کو واپس کر دیا۔ دونوں باتیں متضاد ہیں۔ یعنی قرآن بھی درست ہے۔ آپ کا خواب بھی سچا۔ مگر اس سال آپ ﷺ عمرہ نہ کر سکے۔ وضاحت وتشریح مطلوب ہے؟

تطبیق وتوضیح:

خواب میں آپ ﷺ کو عمرہ کی صرف بشارت دی گئی تھی، وقت کا تعین نہیں تھا۔ اس صداقت کا اظہار ۷ھ کو ہو گیا۔ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ۔

⑭ بعض آیات اور احادیث کی تطبیق وتوضیح

سوال: ① ......قرآن حکیم عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث، عقیدہ ابن اللہ کی وجہ سے ان کو کافر قرار دیتا ہے اور ان سے دوستی سے منع کرتا ہے لیکن سورۃ المائدۃ آیت نمبر ۶۹ کہ یہودی، عیسائی جو بھی اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو وہ غمگین نہ ہوں گے۔ اسی طرح سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر۶۲ میں ہے کہ وہ اللہ کے ہاں اجر پائیں گے۔

② ......کیا حضرت محمد ﷺ پر ایمان لائے بغیر ان کو اجر ملے گا؟

③ ......آج کل عیسائی رفاہ عامہ کے یا دوسرے اچھے کام کرتے ہیں تو کیا انہیں اُجر ملے گا یانہیں؟

اگر قرآن میں اس وقت کے یہودی، عیسائی مراد ہیں تو وہ پہلے ہی سے اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہیں؟

جواب: (ا) اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے چار قسم کے لوگوں کا ذکر فرمایا ہے۔

- پہلے وہ لوگ جو ایمان لائے ان سے مراد شریعت محمدیہ ﷺ کے ماننے والے ہیں۔
- دوسری قسم یہودی ہیں: یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کی امت ہیں۔
- تیسری قسم عیسائی: یہ عیسیٰ علیہ السلام کی امت ہیں۔
- چوتھی قسم بے دین لوگ ہیں: ان سے مراد معبودان باطلہ کے پجاری ہیں۔ خواہ فرشتوں کو پوجیں یا بتوں کو یا آگ وغیرہ کو، ان کے متعلق سلف کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ بعض ان میں سے زبور بھی پڑھتے ہیں۔

ان چاروں کا نام لے کر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالحہ کیے۔ صرف ان کے لیے خوشخبری ہے:

﴿ فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ. ﴾ (البقرة:٦٢)

ان لوگوں کا اپنے اپنے زمانہ میں ایمان اور عمل معتبر تھا مثلاً جب تک عیسیٰ علیہ السلام نہیں آئے اس وقت تک موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر پوری طرح عامل رہے۔ ان کے لیے یہ خوشخبری ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد پہلی شریعت منسوخ ہوگئی۔ اب عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر جو پوری طرح عامل رہا۔ وہ اس خوشخبری کا حقدار ہے۔ اس کے بعد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ اب پہلی تمام شریعتیں منسوخ ہوگئیں۔ اب نجات کا دارومدار شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے۔

یہاں ایک شبہ ہوتا ہے کہ پہلی شریعتیں جو منسوخ ہو چکی ہیں۔ صرف ان تینوں کا ذکر کافی تھا۔ یہودی، عیسائی اور بے دین چوتھا فرقہ جو اس شریعت پر ایمان لایا اس کا ذکر یہاں بے محل ہے۔ کیونکہ کہ اس شریعت پر جو ایمان لا چکے ان کے پھر ایمان لانے کا کوئی مطلب نہیں۔

(ب) اس کے دو جواب ہیں:

① ایک یہ کہ ان کے ایمان لانے کا مطلب ایمان پر ہمیشگی اور ثابت قدمی ہے کیونکہ دارو مدار خاتمہ پر ہے۔ خاتمہ سے پہلے ایمان لایا ہوا کافی نہیں جب تک خاتمہ ایمان پر نہ ہو۔

② دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں ایمان لانے والے سے مراد وہ ہے جو مدعی ایمان ہو۔ جیسے منافق یا کمزور ایمان والے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ اس امت میں سے جن کا دعویٰ ایمان کا ہے وہ اس خوشخبری کے اس صورت میں مستحق ہوں گے کہ وہ حقیقی معنی میں ایمان لائیں اور عمل نیک کریں۔

تنبیہ:

ایک لفظ کا معنی حقیقی اور مجازی دونوں کا ایک وقت میں مراد ہونا یہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک جائز ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ منع کے قائل ہیں۔ اس آیت سے امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب کو تائید ملتی ہے کیوں کہ «مَنْ آمَنَ.» کے دو معنی ہوں گے۔ پہلے فرقے کے حق میں اس کے معنی ہوں گے جو ایمان پر ثابت قدم رہے۔ یہ ''آمَنَ'' کے مجازی معنی ہیں اور باقی فرقوں کے حق میں ہوں گے جو ایمان لائے اور یہ ''آمَنَ'' کے حقیقی معنی ہیں تو گویا اس میں حقیقی اور مجازی دونوں مراد ہوئے۔

شان نزول:

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی عمر مجوسی مذہب پر گزری۔ کچھ عیسائیت پر، پھر اللہ تعالیٰ نے

ایمان نصیب کر دیا۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنے ساتھیوں کا ذکر کر رہے تھے کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے اور آپ ﷺ پر ایمان بھی لاتے تھے۔ اور اس بات کی شہادت دیتے تھے کہ آپ ﷺ آخری نبی ہوں گے ان کا کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ جہنمی ہیں (کیونکہ وہ یہ کام کسی شریعت کے تحت نہیں کرتے تھے۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سخت غمگین ہوئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔ جس سے اس طرف اشارہ کیا۔ جس نبی کا زمانہ ہو اس نبی کی شریعت کے تحت رہ کر جو ایمان لائے اور عمل نیک کرے اس کے لیے یہ خوشخبری ہے نہ کہ اپنے طور پر کسی کام کو اچھا سمجھ کر کرنے لگ جائے۔ اس بنا پر نبی کریم ﷺ کے آنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ. ﴾

(آل عمران:۸۵)

"جو شخص اسلام کے سوا کوئی دین ڈھونڈے پس ہرگز نہیں قبول کیا جائے گا اس سے اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہے۔"

الفاظ کی تشریح:

چونکہ یہاں ایمان کا معاملہ اعمال سے ہے۔ اس لیے ایمان سے مراد اعتقاد ہے۔ لیکن صرف اعتقاد نجات کے لیے کافی نہیں اس لیے ساتھ اعمال کا بھی ذکر کیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایمان سے مراد عام ہو۔ جس میں اعمال بھی داخل ہوں۔ اور اعمال کا الگ ذکر یہ ان کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِيْنَ. ﴾ (البقرة:۹۸)

یعنی "جو شخص اللہ کا، فرشتوں کا اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہو پس بے شک اللہ تعالیٰ دشمن ہے واسطے کافروں کے۔"

اس آیت میں فرشتوں کا ذکر کرنے کے بعد جبرئیل اور میکائیل کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ یہ صرف ان کی بزرگی اور بڑائی کے لیے ہے۔ اسی طرح اعمال کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی، اعتقاد کو ہی کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ عمل صالح کی تین شرطیں ہیں۔ ایک اعتقاد کا صحیح ہونا، دوسرے شریعت کے موافق ہونا، تیسرے اصلاح نیت۔

اعتقاد کے صحیح ہونے کا مطلب ہے کہ توحید کا قائل ہو اور شریعت کے موافق ہونے کا مطلب بدعت نہ ہو۔ شریعت میں اس عمل کا ثبوت ہو۔ اخلاص نیت کا یہ مطلب ہے کہ محض اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ کسی کے دباؤ یا لحاظ یا دکھاوے کے لیے نہ ہو۔

حزن، خوف اور غم میں فرق یہ ہے کہ حزن اس چیز پر ہوتا ہے جو چھن گئی ہو۔ خوف آئندہ چیز کا ہوتا ہے جیسے تجارت میں کہیں نقصان نہ ہو جائے اور غم عام ہے گزشتہ چیز پر بھی ہوتا ہے جیسے کسی کا کوئی مر جائے اور آئندہ کا بھی جیسے امتحان میں کہیں ناکام نہ ہو جاؤں۔

"یَحزَنُونَ" کا باب دو طرح سے آتا ہے۔ ایک حَزَنَ یَحزُنُ بروزن نَصَرَ یَنصُرُ اس کے مصدر حزن کے معنی ہیں دوسرے کو غمگین کرنا چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ . ﴾ (آل عمران:۱۷۶)

یعنی "نہ غمگین کریں تجھے وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں۔"

دوسرا باب حَزِنَ یَحزَنُ بروزن سَمِعَ یَسمَعُ یہ لازم ہے۔ اس کے معنی غمگین ہونے کے ہیں۔ اس آیت میں یہی مراد ہے۔ اس ساری بحث سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کو خاتم النبیین تسلیم کئے بغیر کوئی عمل قابل قبول نہیں اور عیسائیوں کے اعمال بھی قابل قبول نہیں۔ جب تک آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار نہیں کرتے۔

کتاب و سنت کے نصوص اس امر پر واضح شواہد ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿ وَوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰهُ حِسَابَهٗ . ﴾ (النور:۳۹)

صحیح مسلم میں ہے: "کافر کے لیے اعمال خیر کی صرف دنیا میں جزا ہے، آخرت میں نہیں۔" واللہ أعلم بالصواب

سوال: قرآن میں ہے کہ:

﴿ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ...... ﴾

یعنی رسول اللہ ﷺ کا خواب عمرہ کرنے کے متعلق۔ چنانچہ آپ ﷺ اسی ارادہ سے نکلے مگر مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کو واپس کر دیا۔ دونوں باتیں متضاد ہیں۔ یعنی قرآن بھی درست ہے۔ آپ کا خواب بھی سچا۔ مگر اس سال آپ ﷺ عمرہ نہ کر سکے۔ وضاحت و تشریح مطلوب ہے؟

جواب: خواب میں آپ ﷺ کو عمرہ کی صرف بشارت دی گئی تھی، وقت کا تعین نہیں تھا۔ اس صداقت کا

اظہار ے ھ کو ہو گیا۔ یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ۔

سوال: حدیث شریف میں دنیا کو ملعون کہا گیا ❶ بلکہ مردار اور اس کو چاہنے والے کتے۔ ❷ مگر اس عالم اسباب میں اس کے بغیر گزارہ بھی نہیں۔ دور رسالت ﷺ سے لے کر آج تک مسلمانوں سے چندہ صدقات و خیرات کی اپیل کی جاتی رہی ہے۔ بلکہ آج کل تو مذہب کے نام پر مانگنے کی خوب دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اس تضاد کی تشریح یا تاویل کیسے ممکن ہے؟

جواب: دنیا قابل مذمت اس وقت بنتی ہے جب اللہ سے دوری کا سبب بنے اور جب اس کو راہِ للہ صرف کرکے قرب الٰہی کی سعی کی جائے تو یہ باعث افتخار ہے جس طرح کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعدد واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ مثلاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ عمر رضی اللہ عنہ سے انفاق میں سبقت لے گئے ❸ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر مال خرچ کر کے "الدرجاتُ العُلٰی" کے وارث بنے۔ ❹

سوال: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ بعض جگہ فرماتا ہے: "ہر جاندار کی پیدائش پانی کے ذریعے ہوئی۔" (الأنبیاء:۳۰، النور:۴۵) انسان بھی جاندار ہے۔ اس لیے اس کی تخلیق بھی پانی سے ہوئی۔ جب کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔" (المؤمنون:۱۲، السجدۃ:۷)

جواب: ان نصوص کا مفہوم یہ ہے کہ اصلاً آدمی مٹی سے بنا ہے۔ بعد میں منوی مادہ میں منتقل ہو گیا۔ ❺

---

❶(١٦٤) حسنه الترمذی و الألبانی، صحیح الترمذی، أبواب الزهد، باب ما جاء فی هوان الدنیا علی الله (٢٤٣٨)، ابن ماجه (٤١١٢).

❷(١٦٥) کشف الخفا (١٣١٣) و قال: قال الصنعانی موضوع أقول و ان کان معناه صحیحا لکنه لیس بحدیث و قال النجم لیس بهذا اللفظ فی المرفوع (٤٩/١) و موضوعات الصنعانی (٣٦)، المشتهر (٣٠) الجد الحثیث (١٤٦) الإتقان (٧٨٩) تحذیر المسلمین (١٣٦) للتهانوی (٣٥) کما فی موسوعة الاحادیث و الآثار الضعیفة (٥٤٠/٤)، رقم (١٠٧٣٩).

❸(١٦٦) کتاب السنة لابن أبی عاصم، رقم (١٢٤٠) بتحقیق الألبانی.

❹(١٦٧) حسنه الترمذی و الألبانی، المشکاة (٦٠٦٤)، صحیح الترمذی، أبواب المناقب، باب فی مناقب عِثمان (٣٩٦٧)، عن عبدالرحمٰن بن سمرة.

❺(١٦٨) انسان کی پیدائش جس مٹی سے ہوئی تھی وہ مٹی بھی پانی سے خالی نہیں تھی کیونکہ قرآن مجید میں اس کے لیے کہیں طین "بھیگی ہوئی مٹی" اور کہیں: ﴿حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ (الحجر:٢٦) "گوندھی ہوئی بدبودار مٹی" وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ (قاری نعیم الحق نعیم رحمہ اللہ)

سوال: اللہ شریعت نافذ کرتے ہیں۔ کیا رسول ﷺ کو بھی اختیار ہے؟ جب کہ قرآن میں ہے:﴿ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ.﴾ یعنی ایسا کرنا شرک ہے۔ جب کہ دوسری آیات و احادیث میں ہے کہ اللہ اور رسول نے فرض فرمایا۔ یا اگر مجھ کو لوگوں کی مشقت کا ڈر نہ ہوتا تو مسواک کرنا فرض قرار دیتا۔[1] اسی طرح تراویح کے متعلق بھی فرمایا، احادیث صحیح ہیں اور تضاد ظاہر ہے۔ وضاحت فرما کر ممنون فرماویں؟

جواب: ''رسول'' بمعنی ''مرسل'' اس کو کہا جاتا ہے جو دوسرے کے حکم کا پابند ہو لہٰذا نبی یا رسول عام حالات میں جو کچھ وضاحت کرتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى .﴾ (النجم:۳)

شریعت مقرر کرنا صرف اللہ کا اختیار ہے۔ مخلوق اس کے حکم کی پابند ہے۔

سوال: ﴿ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ .﴾ میں خیر تفضیل کا صیغہ ہے۔ کیا اور بھی کوئی رازق ہے کہ اللہ سب سے بہتر رازق ہے؟

جواب: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں مجازاً جو بھی رزق رسانی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ان سب سے بہتر رازق اللہ تعالیٰ ہے۔(تفہیم القرآن ۵/۵۰۰) اور تفسیر قرطبی میں ہے:

" أَیْ خَيْرُ مَنْ رَزَقَ وَ أَعْطٰی فَمِنْهُ فَاطْلُبُوْا وَاسْتَعِيْنُوْا بِطَاعَةٍ عَلٰی نَيْلِ مَا عِنْدَهٗ مِنْ خَيْرَیِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ." (۱۸/۱۲۰)

❀❀❀❀❀❀❀

[1] (۱٦۹) صحیح البخاری کتاب الجمعة باب السواك یوم الجمعة (۸۸۷)، (۷۲٤۰).

﴿۱۵﴾ الأدیان والفِرَق اورعقائدوغیرہ

سوال: خان گل پہلے مسلمان تھا، کچھ قادیانی دوستوں کے ورغلانے سے قادیانی بن گیا اور ان کی عبادت گاہوں میں ان کے طریقے پر عبادت بھی کی۔ اب الحمد للہ دوبارہ مسلمان ہو گیا اور توبہ کر لی ہے۔ لیکن کچھ علماء کہتے ہیں کہ ایسا کرنے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور تجدید نکاح کرنی چاہیے؟

جواب: واضح رہے کہ صورت مسئولہ میں رسول اللہ ﷺ کے ان فیصلہ جات سے راہنمائی حاصل کی جائے۔

« عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ : رَدَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ ابْنَتَهُ زَيْنَبَ عَلَى أَبِى الْعَاصِ بِالنِّكَاحِ الْأَوَّلِ وَلَمْ يُحْدِثْ شَيْئًا.»[1] (أبو داؤد شریف: ۳۰۴/۱)

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

« إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَدَّ ابْنَتَهٗ عَلَى أَبِى الْعَاصِ بَعْدَ سَنَتَيْنِ بِنِكَاحِهَا الْأَوَّلِ. »[2] (السننُ الکُبریٰ لِلْبَیْهَقِي: ۱۸۷/۷)

یعنی "آپ ﷺ نے اپنی بیٹی زینب "ابوالعاص" کو دو سال بعد پہلے نکاح پر ہی واپس کر دی۔"

حالانکہ اسی دوران جنگ بدر ہوئی۔ اور ابوالعاص نے مشرکین مکہ کا ساتھ دیا۔ بالآخر قید بھی ہوا اور زینب رضی اللہ عنہا بھی مکہ میں تھیں۔ جنہوں نے ابوالعاص کی رہائی کے لیے اپنا ہار بھیجا۔

" لَمَّا أَسْلَمَ أَبُو سُفْيَانَ بْنُ حَرْبٍ وَامْرَأَتُهُ هِنْدٌ بِنْتُ عُتْبَةَ كَافِرَةٌ بِمَكَّةَ ، وَ مَكَّةُ يَوْمَئِذٍ دَارُ حَرْبٍ ، ثُمَّ قَدِمَ عَلَيْهَا يَدْعُوْهَا إِلَى الْإِسْلَامِ ، فَأَخَذَتْ بِلِحْيَتِهٖ وَقَالَتْ:اُقْتُلُوْا

[1] (۱۷۰) صححه الألبانی،صحیح أبی داؤد، کتاب الطلاق، باب إلی متی ترد علیه امرأته إذا أسلم بعدها(۲۲۴۰).

[2] (۱۷۱) صححه الألبانی وقال الترمذی: لیس بإسناده بأس .وقال أحمد شاکر: إسناده صحیح ،صحیح أبی داؤد(۲۲۴۰)الترمذی (۱۱۴۳) أحمد (۲۱۷/۱) (۱۸۷۶-شاکر)ابن ماجه(۲۰۰۹).

الشَّيُخَ الضَّالَّ ." (بيهقي:٧/ ١٨٦)

''جب ابوسفیان رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو اس کی بیوی مکہ میں تھی اور مکہ اس وقت دارالحرب تھا۔ جب ابوسفیان رضی اللہ عنہ مکہ پہنچا اور اس نے اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی تو اس کی بیوی نے اس کی داڑھی پکڑ کر کہا: ''اس پاگل بوڑھے کو قتل کر دو۔''

یادرہے کہ ابوسفیان کی بیوی بھی مسلمان ہوگئی تو پہلا نکاح ہی برقرار رہا۔

« اِبْنَةُ الْوَلِيْدِ بْنِ الْمُغِيْرَةِ كَانَتْ تَحْتَ صَفُوَانَ بْنِ أُمَيَّةَ وَأَسْلَمَتْ يَوْمَ الْفَتْحِ وَ هَرَبَ زَوْجُهَا صَفُوَانُ بْنُ أُمَيَّةَ مِنَ الْإِسْلَامِ .... وَشَهِدَ حُنَيْنًا وَالطَّائِفَ وَ هُوَ كَافِرٌ وَامْرَأَتُهُ مُسْلِمَةٌ وَلَمْ يُفَرِّقْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ بَيْنَه وَ بَيْنَ امْرَأَتِهِ حَتّٰى أَسْلَمَ صَفُوَانُ وَاسْتَقَرَّتْ عِنْدَهُ امْرَأَتُهُ بِذٰلِكَ النِّكَاحِ .»

(بيهقي:٧/١٨٦، ١٨٧)

''ولید بن مغیرہ کی بیٹی کا نکاح صفوان بن امیہ سے ہوا تھا۔ وہ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوگئی اور صفوان فرار ہوگیا......... پھر وہ غزوہ حنین اور طائف میں کفار کے لشکر میں شامل تھا۔ آپ نے دونوں میں تفریق نہیں کی تھی۔ جب صفوان مسلمان ہوا تو آپ نے پہلا نکاح ہی برقرار رکھا۔''

گزشتہ اور اس کے علاوہ ام حکیم بنت حارث اور اس کے شوہر عکرمہ بن ابی جہل کا واقعہ [1] بھی اس بات کی دلیل ہے کہ تجدید نکاح کی ضرورت نہیں۔ اگر کہا جائے کہ سائل پہلے مسلمان تھا پھر مرتد ہوا اور ان واقعات میں جو مذکور ہیں پہلے کافر تھے پھر اسلام لائے تو جوابًا عرض ہے کہ علت فسخ نکاح کی چونکہ کفر ہے اس لیے فرق نہیں۔ پھر گزارش ہے کہ تجدید نکاح کے لیے بیّن دلیل کی ضرورت ہے۔

سوال: میں قادیانیوں (احمدیوں) کے متعلق جاننا چاہتا ہوں کہ انہیں کافر کیوں قرار دیا گیا ہے؟ اور کیا ہم ایسے ہی کسی کلمہ گو کو کافر کہہ سکتے ہیں؟ مانا کہ وہ ''خاتم'' کے معنی ''مہر'' اور ''انگوٹھی'' کے لیتے ہیں اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں مانتے مگر یہ بھی کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل ہیں۔

---

[1] (۱۷۲) السنن الكبرى (٧/١٨٧) للبيهقي.

جواب: میرے عزیز اصل بات یہ ہے کہ مسلّم نصوصِ شریعت پر ایمان لانا واجب ہے۔ دلائل قطعیہ سے یہ بات ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد دعویٰ نبوت کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ کیونکہ ایسے شخص نے اسلام کی بنیاد کو منہدم کر دیا ہے۔ اسی بناء پر خلیفۂ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مدعیان نبوت کا ایسا قلع قمع کیا جو بعد والوں کے لیے قیامت تک نشان عبرت ہے۔ ہمارے فاضل دوست مولانا فضل الرحمٰن صاحب الازہری حفظہ اللہ اپنی کتاب ''قادیانی، لاہوری، مرزائی دائرۂ اسلام سے خارج کیوں ہیں؟'' میں صفحہ ۳۰ پر رقمطراز ہیں:

''بات تو صرف اتنی ہے کہ قادیانی اور لاہوری مرزائیوں کو اس لیے غیر مسلم قرار دیا گیا ہے کہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ مرزا غلام احمد نبی تھے۔ ان کو اللہ سے ہمکلام ہونے، اللہ سے وحی اور الہامات پانے کا شرف حاصل تھا۔ ظلی بروزی اور غیر تشریعی کے الفاظ بڑھانے سے حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔ اسلامی تعلیم کی رو سے سلسلۂ نبوت و وحی ختم ہو چکا ہے۔ جو کوئی دعویٰ کرے گا کہ اس پر وحی کا نزول ہوتا ہے وہ دجال، کذاب، مفتری ہوگا۔ امت محمدیہ اسے ہرگز مسلمان نہیں سمجھے گی۔ یہ امت محمدیہ کا خود ساختہ فیصلہ نہیں بلکہ شفیع امت محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم ہے۔ جس کا ذکر پہلے ہو چکا۔ رہی یہ بات کہ ''اگر آپ ان کو مسلمان ماننے کو تیار نہیں تو نہ مانیں لیکن ان کی مساجد میں اذان بند کروانے، مسجد کا نام تبدیل کروانے اور دوسری اسلامی اصطلاحات کے استعمال سے رکوانے والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔'' رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں منافقین کا جو انداز تھا وہ عرض کیا جا چکا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی مسجد کو برداشت نہ کیا۔ اپنے پیارے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ اس میں کھڑے بھی نہیں ہونا۔ ان کو اس کی اجازت نہ ملی جو بظاہر آپ کے نبی ہونے پر گواہی دیتے تھے، آپ کے ساتھ نماز پڑھتے، زکوٰۃ دیتے اور جہاد پر جاتے تھے تو ان کو کیسے اجازت دی جا سکتی ہے جو اپنی الگ جماعت بنائیں، جماعت کے امام کو نبی مانیں۔ نہ ماننے والوں کو کنجریوں کی اولاد کہیں، کسی مسلمان کے جنازے میں شریک نہ ہوں۔ اگر حقیقی طور پر قرآنی تعلیم پر عمل کیا جائے تو وہ مسجد بنا ہی نہیں سکتے۔ اگر اس پر عمل نہ کیا جائے تو ایک عام مسلمان کو کیسے تمیز ہوگی کہ یہ قادیانیوں کی مسجد ہے یا عام مسلمانوں کی؟ جب قانونی طور پر ان کو غیر مسلم

قرار دیا جا چکا ہے تو اسلامی اصطلاحات استعمال کرنے اور مسلمانوں جیسی عبادت گاہیں بنانے کی اجازت دینا اپنے اندر تضاد پیدا کرنا ہے۔ قولی طور پر غیر مسلم مگر عملی طور پر مسلمان، اللہ تعالیٰ اس تضاد سے ہمیں محفوظ رکھے۔'' (انتھی)

اب بات تو کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ کن وجوہ کی بناء پر مرزائیوں کو کافر قرار دیا گیا ہے۔ امید ہے تشفی کے لیے درج بالا گفتگو کافی ہو گی۔ اس موضوع پر سیر حاصل بحث کے لیے مولانا موصوف کا مشار الیہ کتابچہ ملاحظہ فرمائیں بازار میں عام دستیاب ہے۔

سوال: کیا ہر زندہ انسان پر نماز فرض ہے؟

اگر فرض ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تو زندہ آسمانوں پر اٹھائے گئے ہیں۔ وہاں وہ کھاتے پیتے اور زندہ ہیں۔ کیا وہ وہاں نماز پڑھتے ہیں تو کونسی؟ محمدی یا اپنی نبوت والی؟

جواب: قرآن مجید میں سورہ آل عمران میں ہے:

﴿ وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّيْنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُم مِّنْ كِتَابٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ أَ أَقْرَرْتُمْ وَ أَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ إِصْرِيْ قَالُوْٓا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ أَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشَّاهِدِيْنَ . ﴾ (آل عمران:۸۱)

''اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے وعدہ لیا کہ جو کچھ میں تم کو کتاب و حکمت سے عطا کروں۔ پھر تمہارے پاس رسول آ جائے جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ رسول اس کی تصدیق کرے البتہ تم ضرور اس کے ساتھ ایمان لاؤ گے اور البتہ ضرور اس کی مدد کرو گے۔ فرمایا: کیا تم نے اقرار کیا اور کیا تم نے اس شرط پر میرے عہد کا بوجھ اٹھایا؟ انہوں نے کہا: ہم نے اقرار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب تم گواہ رہو، اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہی دینے والوں سے ہوں۔''

یہ وعدہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی شامل تھے جیسے دیگر انبیاء علیہم السلام پر اس عہد کی پیروی ضروری تھی۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی اس عہد کی پابندی ضروری ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے نفاذ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جملہ امور اسی شرع کے تابع ہیں۔ چاہے وہ زمین پر ہوں یا آسمان پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ شریعت محمدی کا نفاذ ہر جگہ ہے۔

ایک روایت میں ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا۔ ❶ (مشکوۃ، بَابُ الْاِعْتِصَام بِالْکِتَاب والسُّنَّة) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر آپ ﷺ کی اتباع ضروری ہے تو حضرت عیسیٰ بن مریم پر بطریق اولیٰ ضروری ہوگی۔

''بلاشک حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی امت کے لیے رسول برحق تھے۔ لیکن ان نصوص کی بناء پر وہ ہمارے نبی ﷺ کے امتی بھی ہیں۔ لہٰذا ان کی نماز کا طریقہ ہم جیسا ہے۔ بعض متعصب مقلدین حنفیہ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جب وہ نازل ہوں گے تو حنفی فقہ کے پیروکار ہوں گے۔ نہیں میرے بھائی ان کا مسلک تو خالصتاً کتاب وسنت پر مبنی ہوگا۔''

سوال: کیا شیعہ کافر ہیں اور ان سے رشتہ کرنا جائز ہے؟

جواب: شیعہ کے کئی ایک گروہ ہیں ہر ایک پر فتویٰ اس کے عقائد ونظریات کے مطابق ہی لگ سکتا ہے۔ عَلَی الْاِطْلَاق سب کو کفر کی طرف منسوب کرنا مشکل امر ہے۔ تاہم کچھ ایسے ہیں جن کی کفریات کسی پر مخفی نہیں۔ مثلاً وہ لوگ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کے قائل ہیں یا جو کہتے ہیں جبریل غلطی سے وحی علی رضی اللہ عنہ کی بجائے محمد ﷺ کے پاس لے آیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

سوال: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا تھا: ''میری آل میں میرا دشمن ہوگا۔'' کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: میری نظر سے ایسی کوئی نص صریح نہیں گزری۔

سوال: آج کل ایک جماعت غزوۂ ہند کانفرنس منعقد کر رہی ہے۔ ہمارے مولوی صاحب کا کہنا ہے کہ غزوہ ہند کانفرنس نام رکھنا غلط ہے۔ غزوہ وہ ہوتا ہے جس میں رسول اکرم ﷺ شامل ہوں؟

جواب: اصحاب مغازی کے نزدیک مغازیٔ رسول اللہ کا مفہوم یہ ہے۔

'' مَاوَقَعَ مِنْ قَصْدِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْکُفَّارَ بِنَفْسِه اَوْ بِجَیْشٍ مِنْ قِبَلِه'' (فتح الباری ۷/۳۷۹)

یعنی ''نبی ﷺ کا بذاتہ کفار کا قصد کرنا یا آپ کا اپنی طرف سے ان کے مقابلہ میں لشکر روانہ کرنا''

---

❶ (۱۷۳) المشکوٰۃ، الاعتصام بالکتاب والسنة، الفصل الثانی، للألبانی رحمه اللّٰه وقال: ورواه الدارمی أیضاً بأتم منه سیأتی وفیه مجالد بن سعید وفیه ضعف ولکن الحدیث حسن عندی لأن له طرقا کثیرة عند اللالکائی والهروی وغیرهما.

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ غزوہ کے لیے نبی ﷺ کا بنفس نفیس شریک ہونا ضروری نہیں۔ لفظ ''غزوہ'' کا اصل معنیٰ ''قصد الشیئ'' ہے۔ (تفسیر قرطبی ٤/ ٢٤٦) اور (فتح الباری ٧/٢٧٩) میں ہے:

'' أَصْلُ الْغَزْوِ الْقَصْدُ وَ مَغْزَی الْکَلَامِ مَقْصَدُہ.''

یعنی ''کسی شی کا قصد کرنا لغوی معنی کے اعتبار سے اس کا اطلاق غزوۂ ہند پر ہوسکتا ہے۔''

قرآن میں ہے:

﴿ أَوْ کَانُوْا غُزًّی ﴾ ''یا جہاد کو نکلیں۔'' (آل عمران:١٥٦)

سوال: ہمارے مولوی صاحب یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کو رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کیا یزید کے لیے سیدنا یزید اور رحمۃ اللہ علیہ کہنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: یزید کے بارے میں تین طرح کے لوگ ہیں۔ کچھ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور کچھ تکفیر و تفسیق کے قائل ہیں۔ اور تیسرا نظریہ ہے: ''لَا نُحِبُّہ وَلَا نُبْغِضُہ.'' ہمیں نہ اس سے پیار ہے اور نہ بغض، معاملہ اللہ پر چھوڑتے ہیں۔ میرے خیال میں زیادہ سلامتی والا مسلک یہی ہے۔

سوال: ان دنوں تعلیمی اداروں میں عیسائی طلبہ کو اسلامیات کے تبادلہ میں اخلاقیات یا سوکس پڑھنے کی سہولت ہے۔ عیسائیوں کو شکایت ہے کہ یہ مضامین خشک ہیں طلبہ ان میں تھوڑے نمبر حاصل کرتے ہیں اور نتیجتاً میرٹ سے رہ جاتے ہیں۔

آئینی طور پر ہر شہری کو برابر کا حق حاصل ہے اور حکومت اقلیتوں کے مفادات کی پابند ہے۔

اندریں حالات عیسائیوں نے لاہور ہائی کورٹ میں رٹ دائر کی ہے کہ ان کی مقدس کتاب بائبل کو نصاب تعلیم میں داخل کیا جائے۔ عیسائی طلبہ اس مضمون میں ٨٠ تا ٩٥ فی صد نمبر حاصل کر کے میرٹ پر پورے اتر سکیں گے۔ بائبل پڑھانے کے لیے ایک لاکھ عیسائی اساتذہ رکھے جائیں گے۔ اس سے یہ ''روحانی'' فائدہ بھی ہوگا کہ متواتر دس سال بائبل پڑھنے کے بعد طالب علم مکمل مسیحی ہو کر نکلے گا۔

① جناب کی خدمت میں اس موضوع پر اسلامی موقف واضح فرمانے کی درخواست ہے؟

② کیا اسلامی شریعت میں، اسلامی پاکستان کے اندر عیسائی، ہندو، بدھ، سکھ، پارسی، قادیانی اقلیتوں کے طلبہ کو سرکاری خرچہ پر اور باقاعدہ نصاب تعلیم کے طور پر ان کی مذہبی کتب کی کفر و شرک بھری اور خلاف اسلام تعلیم دینے کی اجازت ہے؟

۞ کیا اسلامی مملکت میں مذہبی اقلیتوں کا یہ حق مسلم ہے؟

جواب: ۞..... زمانۂ نبوی ﷺ اور خلافت راشدہ کے ادوار پر غور و خوض کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ یہود و نصاریٰ اور دیگر غیر مسلم اقوام کا دینی مناہج تعلیم و تدریس کے ساتھ کسی قسم کا تعلق یا واسطہ نہ تھا بلکہ مختلف ادوار میں ان کے تعلیمی ادارے مدارس و معاہد وغیرہ جداگانہ حیثیت کے حامل تھے نہ غیر مسلم طلبہ کا مسلم طلبہ سے اختلاط تھا۔ اور نہ ہی غیر مسلم اساتذہ کبھی اسلامی مدارس میں بطور معلم مقرر ہوئے۔

امتیازی تہذیب و تمدن اور عقائدی افتراق کا تقاضا یہی ہے، لیکن بعد میں مرور زمانہ سے ہوا یہ کہ استعماری عناصر اور اس کے پروردہ اور زرخرید ملحدانہ نظریات کے پرچار کرنے والے اشخاص نے باقاعدہ منظم سازش کے تحت اسلام کے نام پر اسلامی ثقافت کا حلیہ بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس کے نتیجہ میں سادہ لوح مسلمان صراط مستقیم سے بھٹک کر منزل مقصود اور جادۂ حق سے کوسوں دور ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ واپسی کی راہیں مسدود نظر آنے لگیں۔

اہل دانش کے ہاں مقولہ معروف ہے کہ انگریز پاک و ہند کو چھوڑ کر چلا گیا لیکن تعلیم و تعلم اور تہذیب و ثقافت کی صورت میں ذہنی غلامی ورثہ میں چھوڑ گیا۔ اس سے نجات حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اس کے گماشتے نصف صدی سے نظام تعلیم پر قابض ہیں جس کسی نے ان کے آڑے آنے کی کوشش کی اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

آج کے انحطاطی دور میں اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ کوئی مرد مجاہد آگے بڑھ کر موجودہ سیکولر نظام میں انقلاب برپا کر کے اس کا رخ مکہ اور مدینہ کی صاف شفاف فضا کی طرف موڑے۔ تاکہ بندگان اللہ دنیاوی و اخروی سعادتوں سے بہرہ ور ہو سکیں۔

لہٰذا بنیادی طور پر جد و جہد اس امر کی ہونی چاہیے کہ معصوم مسلم بچے کو کفر کی مقاربت سے دور رکھنے کی سعی کی جائے تاکہ غیر مرئی جراثیم سے محفوظ و مأمون رہ سکے اس لیے کہ انسانی فطرت میں یہ شیٔ مرکوز ہے کہ بیرونی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حدیث: «لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ......» [1] میں اسی

---

[1] (١٧٤) صحيح البخاري، كتاب أحاديث الأنبيآء، باب ما ذكر عن بني إسرائيل (٣٤٥٦)و(٧٣٢٠). صحيح مسلم، كتاب العلم، باب اتباع سنن اليهود والنصارى (٦٧٨١).

بات کی طرف اشارہ ہے۔

اس بناء پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ: "رَاسِخِیْنَ فِی الْعِلْمِ" کے ماسوا عامۃ الناس کے لیے یہود ونصاریٰ کی محرف ومبدل کتابوں کا مطالعہ کرنا ممنوع ہے۔(فتح الباری :۱۳/ ۵۲۵) چہ جائیکہ اسلامی ماحول میں بائبل کی تدریس کی اجازت مرحمت کر کے مخالفین اسلام کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ میرے خیال میں اصلاً ارباب اقتدار سے یہ مطالبہ ہونا چاہیے کہ قطع نظر آئین سے اقلیتوں کی شہری آزادی اور حقوق اسی طرح متعین کئے جائیں جس طرح کہ اوائل اسلام میں حاصل تھے۔"اَلْخَیْرُ کُلُّ الْخَیْرِ فِی الْاِتِّبَاعِ وَالشَّرُّ کُلُّ الشَّرِّ فِی الْاِبْتِدَاعِ" اس طریق سے موجودہ الجھن اور بگاڑ کا حل خود بخود نکل آتا ہے۔ اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں میں فہم وبصیرت پیدا فرمائے تاکہ وہ کما حقہ اپنی ذمہ داری کا احساس وادراک کر سکیں۔ وَاللّٰہُ وَلِیُّ التَّوْفِیْق۔

۲..... نیز اسلامی نقطۂ نظر سے کسی فرد کو ہرگز اس بات کی اجازت نہیں کہ اسلامی بیت المال کو کفریہ افکار کی ترویج وتشہیر میں ضائع کرے۔ قیامت کے روز ایسے لوگ اللہ کے ہاں جوابدہ ہیں۔ صحیح حدیث میں ہے:

« کُلُّکُمْ رَاعٍ وَ کُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ ،اَلْإِمَامُ رَاعٍ وَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ .» [1]

(صحیح بخاری، بَابُ الْجُمُعَۃِ فِی الْقُرٰی وَالْمُدُنِ)

وائے افسوس! ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اسلامی خزانہ غلبۂ دین کے مصارف میں خرچ ہوتا لیکن غلط کار لوگوں کے ہاتھ چڑھنے کی وجہ سے الٹا چکر چل رہا ہے، اپنے جوتے اپنے سر والا حساب بنا ہوا ہے۔ اللہ عزوجل اربابِ حل وعقد کو اپنے فریضے کا فہم عطا فرمائے۔ آمین!

۳......اسلامی مملکت میں اس قسم کے حقوق کا تصور تک موجود نہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کے خلاف کفر وشرک کو مسلح کرے۔ اسلام نے تو اس بات سے سختی سے روکا ہے کہ کفار کے ہاتھ اسلحہ مت فروخت کیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل کو یہی اہل اسلام کیخلاف استعمال ہونے لگے۔ رب العزت ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ آمین!

سوال: کیا یہ بات درست ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کو زندہ کر کے کلمہ پڑھایا گیا اور پھر ان کی روح قبض کر لی گئی؟

---

[1] (۱۷۵) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة فی القری والمدن (۸۹۳)، مسلم کتاب الإمارة، باب فضیلة الأمیر العادل وعقوبة الجائر (۴۷۲۴).

جواب: علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ”مسالک الحنفاء“ میں ایسی روایات نقل کی ہیں۔لیکن وہ سخت ضعیف بلکہ موضوع (من گھڑت) ہیں۔ سیوطی نے ہر ممکن طریقہ سے کوشش کی ہے کہ ان کا ایمان ثابت کیا جائے۔لیکن علامہ ملاعلی قاری حنفی رحمہ اللہ نے اس کے برعکس ایک رسالہ بنام ”اِعْتِقَادُ أَصْحَابِ أَبِیْ حَنِیْفَةَ فِیْ أَبَوَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ“ لکھا ہے۔ [1] اس امر کی تشریح ”فقہ اکبر“ [2] میں موجود ہے اور یہی بات حق ہے۔

سوال: ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ انسان بار بار اس دنیا میں آتا ہے۔ اس عقیدہ کو آواگون کہتے ہیں۔کیا یہ غلط ہے یا صحیح؟

جواب: ہندوؤں کا عقیدہ ’تناسخ ارواح‘‘ اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔کتاب وسنت کی تعلیمات سے یہ بات عیاں ہے کہ موت کے بعد آدمی کا کلی طور پر دنیا سے سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔کسی بھی صورت میں دوبارہ واپسی نہیں۔ چنانچہ ”سورۃ الانبیاء“ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَحَرَامٌ عَلٰی قَرْیَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ . ﴾ (الانبیاء:۹۵)

”اور جس بستی (والوں) کو ہم نے ہلاک کر دیا محال ہے کہ (وہ دنیا کی طرف رجوع کریں) وہ رجوع نہیں کریں گے۔“

عقیدہ ہذا عقلاً بھی محال ہے کیونکہ اگر کوئی شخص نیک ہے تو اس نیکی کے صلہ میں اس کی روح کو اپنے سے بہتر جون میں منتقل ہونا چاہیے جب کہ یہ بات پہلے سے مسلمہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔فرمایا:

﴿ أُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ . ﴾ (البینة:۷)

”وہ لوگ تمام مخلوق سے بہتر ہیں۔“

گویا انسان کی دوسری جون میں تبدیلی کا عقیدہ رکھنا انسانیت کی توہین ہے۔ اللہ رب العزت فہم و فراست سے نوازے۔ آمین!

---

[1] (۱۷۶) انظر فی هذه الرسالة ص۶۲ بتحقیق مشهور بن حسن ط . مكتبة الغرباء الأثرية المدينة المنورة.

[2] (۱۷۷) وقال محقق اعتقاد أصحاب أبی حنیفة......الخ مشهور بن حسن :......الفقه الأكبر صـ۱۳۰ مع شرح المصنف له طبعة دهلی ۱۳۱٤ھ . فیه قول أبی حنیفة وعلیه شرح ملا علی قاری.وانظر أقوال بعض العلماء فی أبوی النبی صلی الله علیه وسلم. الأول : الإمام البیهقی رحمه الله تعالیٰ فی دلائل النبوة (۱/۱۹۲،۱۹۳) والسنن الكبری (۷/ ۱۹۰)الثانی : الإمام الطبری المفسرالمؤرخ المحدث فی تفسیر هذه الآیة:﴿ولا تسأل عن أصحاب الجحیم ﴾ البقرة (۱۱۹)'(جامع البیان للطبری)الثالث: الإمام النووی صاحب ریاض الصالحین .شرح النووی علی صحیح مسلم علی هذا الحدیث رقم : [۲۲۵۸-۲۲۶۰] .

سوال: اہلحدیث علماء یہ فرماتے ہیں کہ اہلحدیث تو نبی ﷺ کے وقت سے دنیا میں ہیں تو پھر فقہائے کرام کو اس وقت کے اہل حدیث علماء نے الگ الگ فقہ کی تشکیل سے کیوں نہیں روکا؟

جواب: "فِقْهُ الْحَدِيْث" قابل تعریف شئ ہے۔ اسی بناء پر امام بخاری رحمہ اللہ کے بارے میں مشہور ہے: "فقه البخاری فی تراجمه" یعنی بخاری کی فقاہت اس کی صحیح کے تراجم میں ہے اور فقہائے کرام کی کدو کاوش فی الجملہ قابل ستائش ہے لیکن ان کے کمزور پہلو سے موافقت نہیں ہوسکتی۔ اس کی نمایاں جھلک کے لیے ملاحظہ ہو: کتاب "التعصب المذهبی" تالیف محمدعید العباسی.

سوال: کسی عقیدہ، نظریہ، مسلک یا قانون کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینے کا متعین یا متفق علیہ معیار کیا ہے؟

جواب: کسی بھی عقیدہ، نظریہ، مسلک یا قانون کو پرکھنے کے لیے کہ آیا اسلامی ہے یا غیر اسلامی، اصل معیار کتاب وسنت ہے۔

سوال: فرقہ واریت کی وجہ کیا ہے اور اس کی طرف مسلمانوں کا رجحان کیسے ختم کیا جا سکتا ہے؟

جواب: دیگر عوامل کے علاوہ فرقہ واریت کی بڑی وجہ شخصیت پرستی ہے۔ یہی وہ مہلک مرض ہے جس کے ناسور سے یہود و نصاریٰ برباد ہوئے اور آج تک سیدھی راہ پانے سے بھٹکے ہوئے ہیں:

﴿فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ .﴾ (البقرة:١٥)

اس کو ختم کرنے کا واحد ذریعہ کتاب وسنت کے ساتھ صحیح معنوں میں تَمَسُّک ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے: «تَرَكْتُ فِيْكُمْ أَمْرَيْنِ ......» [1] الحدیث

سوال: غیر مسلم کا پسینہ کیا ناپاک ہوتا ہے۔ گاڑیوں کی سیٹ پر وہ بیٹھتے ہیں۔ پھر ہم بیٹھتے ہیں۔ کیا کیا جائے؟

جواب: جمہور اہل علم کے نزدیک کافر کا پسینہ ناپاک نہیں۔ (فتح الباری:١/٣٩٠) لہٰذا غیر مسلم کی سیٹ پر بیٹھنے کا کوئی حرج نہیں۔

سوال: تصوف کے بارے میں اختصار سے بتائیے کہ یہ کیا ہے؟

جواب: تصوف دراصل فلسفہ ہی کی ایک شکل ہے۔ اور ایسے عقیدے کا نام ہے جس سے امور غیبیہ کا دل پر کشف ہوتا ہے۔ اس کا تعلق حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے بالکل نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں صوفیاء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہم براہ راست اللہ سے یا براہ راست اللہ کے رسول سے بصورت کشف علوم حاصل کرتے ہیں۔

---

[1] (١٧٨) انظر الرقم المسلسل (٣٦) .

اور ہم اس حقیقت کو چھپانا گناہ سمجھتے ہیں کہ کائنات میں صرف اللہ کا وجود ہے۔ اس لحاظ سے ہر انسان اللہ ہے۔ اور اللہ انسان ہے۔ بلکہ حقیقت میں تمام ایک ہیں۔ البتہ صورتوں کے لحاظ سے فرق ہے۔ وہ برملا اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ غیبی علم کے حصول کے لیے کشف ہی ایک راستہ ہے جس میں مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ مجاہدہ کی بے شمار صورتیں ہیں جو بلحاظ وقت، جگہ، اشخاص کے تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ البتہ نفس کو اذیتوں سے ہمکنار رکھنا معینہ ورد و وظائف کا بار بار کرنا لوگوں سے اختلاط نہ کرنا، بالکل الگ تھلگ رہنا اور پاکیزگی کا خیال نہ کرنا لازمی امور ہیں۔ البتہ اتنی بات ذہن نشین کر لیجیے، ضروری نہیں کہ جو انسان تصوف کی طرف منسوب ہے۔ اس کا عقیدہ بعینہ وہی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا۔ ہاں وہ شخص جو تصوف کے آخری مرحلہ پر پہنچ چکا ہے۔ اس کا عقیدہ واقعی یہی ہوتا ہے اور جو صوفی ابھی تصوف کے مراحل طے کر رہا ہے اور آخری مرحلہ تک رسائی حاصل نہیں کر سکا ہے تو وہ جہاں تک پہنچا ہے، اسے بس اتنی ہی خبر ہے وہ آخری مراحل سے بے خبر ہے۔ اگر وہ ہمارے بیان کردہ عقیدے کا انکار کر رہا ہے تو ہم اسے معذور سمجھتے ہیں، اس لیے کہ ابھی وہ اس مقام سے ناآشنا ہے جہاں صوفی کی آخری منزل ہے۔ (افکار صوفیہ مترجم ص ۱۸)

سوال: کیا یہ متفقہ طور پر طے کرنا ضروری نہیں کہ فقہی قوانین کی دینی حیثیت کیا ہے؟ اور آیا یہ ضروری ہے یا کہ نہیں کہ شق (ا) کے مطابق انہیں پرکھ کر دیکھ لیا جائے کہ وہ اسلامی ہونے کے معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں؟

جواب: فقہی قوانین کی حیثیت امت مسلمہ میں پہلے سے مسلمہ ہے کہ یہ کتاب و سنت سے مستنبط چند اجتہادی مسائل کا نام ہے جس کو اَقْرَبُ اِلَی الصَّوَاب کی حیثیت سے جانچنے کا واحد معیار کتاب و سنت ہیں۔ اس سلسلہ میں ''رَاسِخِیْنَ فِی الْعِلْم'' کی خدمات نمایاں ہیں جو تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ متاخرین میں سے علامہ شوکانی، صنعانی اور نواب صاحب رحمہ اللہ کی کتابوں [1] کا مطالعہ کیجیے۔ یہ شئ واضح طور پر نظر آئے گی۔

سوال: (ا) کیا دیو بندیوں، بریلویوں وغیرہ کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

جواب: غیر اللہ کو حاجت روا، مشکل کشا سمجھنے والے مشرک بریلوی امام کی اقتداء میں نماز پڑھنا ناجائز ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿ إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ . ﴾ (التوبة:۲۸)

---

[1] (۱۷۹) متاخرین (إرشاد الفحول للشوكاني،إجا بة السائل للصنعاني،حصول المأمول للنواب(اختصار إرشاد الفحول). (شوكاني۔ ارشاد الفحول،) (صنعاني۔إجابة السائل) (نواب ۔حصول المأمول (اختصار إرشاد الفحول)

اور دیوبندی غیر متعصب امام کے پیچھے بوقت ضرورت نماز پڑھی جا سکتی ہے تاہم مستقلاً اپنا علیحدہ بندوبست کرنا چاہیے کسی بھی مخصوص مقام کو مسجد قرار دیا جا سکتا ہے۔ حدیث میں ہے:

« جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا.» ❶

سوال: (۲) اگر ان کے پیچھے نماز نہیں ہوتی تو کیا ہم ان کے پیچھے نماز پڑھ کر اپنی نماز دوبارہ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: اس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔

سوال: کیا قرآن وحدیث چھوڑ کر کسی کی تقلید کرنا شرک ہے یا نہیں؟

جواب: قرآن وحدیث کے واضح احکام ومسائل اور ہدایات کے بالمقابل کسی امتی کے قول کو تھامے رکھنا واقعی شرک فی الرسالت ہے۔ ایسے شخص کی اقتداء سے بھی بچنا چاہیے۔

سوال: یہاں ایک مرزائی وکیل ''یوسف قمر نامی'' کی شادی ہوئی۔ بارات قصور سے ربوہ گئی۔ قصور کے بعض مسلمان وکلاء اور بعض دیگر معززین نے بارات میں شرکت کی۔ ربوہ پہنچ کر باقاعدہ تقریب نکاح منعقد ہوئی۔ جس میں ایک نوجوان مرزائی نے اعلان کیا کہ ''ہمارے وہ بزرگ ابھی نہیں پہنچے جنھوں نے نکاح پڑھانا تھا اس لیے ان کی نیابت میں میں یہ فریضہ انجام دے رہا ہوں۔'' یہ اعلان کر کے اس نے خطبہ نکاح پڑھا اور اعلان کیا کہ میں فلاں ولد فلاں کا فلانہ بنت فلاں کے ساتھ اتنے ہزار روپے حق مہر کے عوض نکاح کرتا ہوں۔ اس طرح اس نے دو نکاحوں کا اعلان کیا جو کہ ''یوسف قمر'' مذکور نے خود (اِصالتاً) اور دوسرے لڑکے کی طرف سے ایک شخص (غالبًا اس کے والد) نے کھڑے ہو کر قبول کرنے کا اقرار کیا۔ اس کے بعد ایک بوڑھے مرزائی نے دعا کرائی جس کی اقتداء میں تمام حاضرین (مسلمان ومرزائی) نے دعا مانگی۔

دوسرے روز ''یوسف'' مذکور نے قصور میں دعوت ولیمہ دی۔ اس دعوت میں بھی بعض مسلمان وکلاء اور بعض دیگر معززین نے شرکت کی۔ شریکِ تقریب کچھ صاحبان سے استفسار کیا گیا کہ آپ نے ایک مرزائی کی شادی میں شرکت کی اور دعوت ولیمہ کھائی۔ تو ان میں سے بعض حضرات نے تو ''رواداری'' اور ''مروت'' جیسے الفاظ کا سہارا لیا اور بعض نے کہا کہ وہاں کام تو مسلمانوں کی طرح ہوئے ہیں۔ یہی کلمہ، یہی خطبۂ نکاح، یہی

❶ (۱۸۰) صحیح البخاری کتاب التیمم رقم الباب(۱)، (ح:۳۳۵) والصلاۃ (۴۳۸)، صحیح مسلم، کتاب و باب المساجد و مواضع الصلاۃ(۱۱۶۷).

حق مہر وغیرہ۔ آخر اس تقریب میں شرکت کس طرح ناجائز ہوگئی؟

براہ کرم! ان مسلمانوں کے متعلق شرعی حکم تحریر فرمائیں؛ نیز بالخصوص مرزائیوں کی شادی غمی کی تقریبات میں شمولیت اگر منع ہے تو کیوں؟

جواب : امت مرزائیہ بلا شبہ کافر اور خارج از اسلام ہے۔ اس سے تعلقات قائم کرنا اور اس کی خوشی غمی میں شریک ہو کر اُلفت و محبت کا اظہار کرنا قطعاً ممنوع ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَ عَدُوَّكُمْ أَوْلِيَآءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوا بِمَا جَآءَكُم مِّنَ الْحَقِّ . ﴾ (سورۃ الممتحنہ:۱)

''میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔ تم تو ان کو دوستی کے پیغام بھیجتے ہو اور وہ (دین) حق سے جو تمہارے پاس آیا ہے منکر ہیں۔''

واضح ہو کہ دیگر مسائل کے علاوہ ''عقیدۂ ختم نبوت'' اسلام میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اس پر علم و عمل کے بغیر کسی بھی فرد کے لیے اسلام کی طرف انتساب ممکن نہیں۔ جب کہ یہ بات قادیانی گروہ میں مفقود ہے۔ بلکہ انہوں نے اس کے بالمقابل غلام احمد کی خود ساختہ نبوت کا ڈھونگ رچایا جو سراسر اسلام کے خلاف بغاوت و ارتداد ہے۔ آہ! آج اس کی بیخ کنی کے لیے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسی بلند ہمت و عزیمت شخصیت کی ضرورت ہے جو عالم اسلام کے اکناف و اطراف سے فتنہ ہذا کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکے۔

﴿ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا ﴾ (الطلاق:۱)

اسی طرح مسند احمد میں حدیث ہے: جب تم متشابہ آیتوں کے پیچھے جانے والوں کو دیکھو تو ان سے بچو۔ اور مشکوٰۃ میں بحوالہ بخاری و مسلم الفاظ یوں ہیں کہ:

« فَاِذَا رَأَيْتَ .» وَ عِنْدَ مُسْلِمٍ « رَأَيْتُمُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ فَأُولٰٓئِكَ الَّذِينَ سَمَّاهُمُ اللّٰهُ فَاحْذَرُوهُمْ .»[1] (صـ ۱۵۰ مع المرعاۃ)

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اہل زیغ، اہل بدعت اور وہ شخص جو فتنہ برپا کرنے کے لیے مشکلات (متشابہ) کی پیروی کرتا ہے ان کی میل ملاقات سے منع کیا گیا ہے۔ اور اگر کوئی مشکل مسئلہ

---

[1] (۱۸۱) صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب (منه آیات محکمت...... ﴾، صحیح مسلم، کتاب العلم، باب النهی عن اتباع متشابه القرآن...... (۶۷۷۵)

سنجیدگی سے حل کرانا چاہتا ہو تو اس کا جواب اور ممکنہ حد تک تشفی واجب ہے۔ جہاں تک پہلے گروہ کا تعلق ہے اس کی طرف التفات کی ضرورت نہیں بلکہ یہ مستوجب سزا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مرزائیوں وغیرہ سے رشتہ ناطہ اور ہر قسم کا میل ملاپ رکھنا ناجائز اور غیر درست فعل ہے۔

نیز اس بات سے دھوکا نہیں لگنا چاہیے کہ ان لوگوں کے عقد زواج کا طور طریقہ مسلمانوں جیسا ہے لہٰذا یہ مسلمان ہیں ہرگز نہیں۔ جہاں بنیاد نہ ہو وہاں شاخ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ هٰذِهِ الْفِتْنَةِ!

اور جو مسلمان اس عقد میں شریک ہوئے انہیں ناصحانہ انداز میں وعظ ونصیحت ہونی چاہیے۔

﴿ وَ ذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ . ﴾ (الذاریات:۵۵)

اس کے باوجود اگر وہ پھر بھی حرکات شنیعہ سے باز نہ آئیں تو ان کا بائیکاٹ کیا جائے۔

﴿ وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ . ﴾

سوال: ایڈیٹر ہفت روزہ الاعتصام لاہور:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! مزاج اقدس۔ ما بخیر وشما بسلامت!

عرض خدمت ہے کہ جناب سید محمد متین ہاشمی صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والا موقر جریدہ سہ ماہی ''منہاج'' راقم کے زیر مطالعہ ہے جو شمارہ ۱-۲، ج۹، نفاذ شریعت نمبر کے ص ۱۰۹ میں پارلیمنٹ اور اجتہاد کے مقالہ نگار محترم ڈاکٹر محمود الحسن عارف صاحب رقمطراز ہیں:

''ہندوستان'' میں اہل حدیث حضرات نے بھی ''اجتہاد'' کو اپنانے اور اس کے مطابق فیصلہ کرنے کی کاوشیں کی ہیں لیکن ان کی یہ کاوشیں بھی بالآخر ایک خاص مسلک اور نقطۂ نظر تک محدود ہو کر رہ گئیں اور اجتہاد و قیاس کے اصول وقواعد اور دیگر مجتہدین کی کتب سے کم علمی اور کسی قدر تعصب کی بنا پر ان کا بھی ایک خاص حلقہ یا مسلک بن گیا ہے جو نسلاً بعد نسل آگے متوارث ہو رہا ہے اور ''تقلید'' کی شدومد سے تردید بلکہ خدمت کے باوجود وہ خود بھی عملاً مقلد ہو کر رہ گئے ہیں۔''

اس میں مقالہ نگار موصوف نے چند الزامات عائد کئے ہیں:

① اہل حدیث حضرات کی اجتہادی کاوشیں ایک خاص مسلک اور ایک خاص نقطۂ نظر تک محدود ہیں۔

② اہل حدیث حضرات قیاس واجتہاد کے مسلمہ اصول وضوابط کو تعصبانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔

③ اہل حدیث دیگر مجتہدین کی کتب سے کم ہی استفادہ کرتے ہیں لیکن وہ بھی بربنائے تعصب۔
④ مزید برآں اہل حدیث حضرات تقلید کی شدید مخالفت کے باوجود درحقیقت عملاً مقلد ہو کر رہ گئے ہیں۔
محترمی! دیئے گئے الزامات کس حد تک درست ہیں؟

جواب : واضح ہو کہ اہل حدیث کا انتساب کسی خاص فرد یا بستی وغیرہ کی طرف نہیں کہ ان کی اجتہادی کاوشوں اور جملہ جدوجہد کو محدود قرار دیا جا سکے بلکہ ان کی مساعی جمیلہ کا محور اور زندگی کا مشن ہی کتاب وسنت کی ترویج واشاعت اور رب کے دین کی سربلندی ہے جس میں مسلمانانِ عالم کا ایک ایک فرد شریک وسہیم ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اصلاً اہل حدیث ایک تحریک کا نام ہے مخصوص گروہ بندی کا نہیں اس مسلک کا یہ خاصہ ہے کہ بلا امتیاز رنگ ونسل اور قبائلی عصبیت کے ہر ایک صاحب جذبہ و ہمت کی مثالی وصحیح تربیت گاہ اور انسانیت کی معراج کا زینہ ہے جس سے وابستہ مرد وزن بآسانی اپنے رب سے قرب حاصل کرنے کا اہل بن جاتا ہے۔
اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ.

سوال: کیا طریقت اور تصوف کے الفاظ کہیں قرآن یا حدیث میں آیا ہے، اگر آیا تو اس کے کیا معنی ہیں؟

جواب: کتاب وسنت میں طریقت اور تصوف وغیرہ الفاظ کا استعمال نہیں ہوا۔ بعد کے ادوار میں تارک الدنیا لوگوں نے مخصوص معانی کے لیے ان الفاظ کو ایجاد کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتاویٰ اھل حدیث :۱/٤٤تا٥٤ لشیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ .

سوال: اگر کوئی مسلمان سستی و کاہلی سے نماز نہیں پڑھتا جیسا کہ اکثر لوگوں کا شیوہ بن چکا ہے تو اس پر مسلمان کا اطلاق ہو گا یا کافر کا۔ اگر وہ کافر ہو گیا تو اس کے ساتھ معاملہ کافروں جیسا ہو گا، یا اس پر مسلمانوں کے احکام جاری ہوں گے؟ نماز نہ پڑھنے سے نمازی بیوی سے اس کا نکاح باقی رہتا ہے یا نہیں؟ ایسے ہی نمازی شخص کی بیوی نماز نہیں پڑھتی تو اس کا نمازی شوہر سے نکاح قائم رہتا ہے؟

جواب : راجح مسلک کے مطابق بے نماز کافر ہے۔ [1] لیکن اس کا کفر ظنی ہے قطعی نہیں اس لیے کہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اس بناء پر اگر کوئی بے نماز کو کافر کہنے کے بجائے صرف فاسق و فاجر سمجھتا ہے تو وہ خود کافر نہیں ہو گا۔

---

[1] (۱۸۲) (أ) بین الرجل و بین الشرك والکفر ترك الصلاۃ ۔ صحیح مسلم (۲٤٧، ۲٤٦)(ب) بین العبد و بین الکفر والایمان الصلاۃ فاذا ترکھا فقد اشرك ۔ھبة اللہ الطبری باسناد صحیح و صححه الالبانی انظر صحیح الترغیب للالبانی(۱/۳٦٦ تا ۳٦٧) (ج) کان اصحاب محمد ﷺ لا یرون شیئًا من الاعمال ترکه کفراً غیر الصلاۃ ۔ الترمذی (۲٦۲۲) والحاکم (۱/۱) صححه و قال الذھبی اسنادہ صالح و صححه الالبانی فی الترغیب۔

لیکن اگر کوئی یہودی، عیسائی، ہندو، سکھ کو کافر نہ سمجھے تو وہ خود کافر ہے اس لیے کہ ان لوگوں کا کفر قطعی ہے۔ اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ عام کفر اور بے نماز کے کفر میں فرق ہے اس بنا پر بے نماز کی نمازی بیوی یا نمازی خاوند کی بے نماز بیوی کی علیحدگی کا فیصلہ مشکل امر ہے۔ بہر صورت خطرہ سے خالی نہیں۔ البتہ ایسے لوگوں سے سلوک کافروں جیسا ہونا چاہیے مثلاً اس کا نکاح نہ پڑھا جائے اور اگر وہ مر جائے تو اس کی نماز جنازہ سے بھی علیحدگی اختیار کر لی جائے بالخصوص باا ثر افراد کو تاکہ باقی لوگوں کو تنبیہ ہو، نماز میں سستی و کاہلی ترک کر دیں۔

وَالتَّوفِيقُ بِيَدِ اللّٰهِ !

سوال: ''سورۃ الضحیٰ'' میں ہے کہ (سائل کو نہ جھڑکیں) کچھ سائل تو گھنٹی بجاتے ہیں کچھ زور زور سے دروازے پر دستک دیتے ہیں اور کچھ خاص دن جمعرات کو آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کی صدا ہوتی ہے۔ ''جمعرات دی روٹی دا سوال اے بابا۔'' دوسرے دنوں میں کچھ کی صدا ہوتی ہے۔ ''مولا علی رنگ لاوے دوارے وسدے رہن'' کچھ کی صدا ہوتی ہے۔ ''حسن حسین دے ناں دا سوال اے پتر۔''

الغرض پورا ہفتہ اسی قسم کے گداگروں کی ریل پیل رہتی ہے۔ ایسوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے جو ایسے طریقے سے پیٹ پالتے ہیں۔ میں نے حدیث میں پڑھا ہے کہ ''تیرا کھانا پرہیزگار ہی کھائے''[1] کیا ایسے لوگوں کو خیرات دینی چاہیے۔ جواز کی صورت میں انہیں صدقۃ الفطر اور قربانی کا گوشت دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: اسلامی آداب سے ناواقف اور غلط عقیدے کے حامل شخص کو بطریق احسن سمجھانا چاہیے۔[2]

﴿ لَعَلَّهُ يَزَّكَّى ○ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَى ○ ﴾ (سورۃ عبس:۳-۴)

---

[1] (۱۸۳) (لا یاکل طعامك الا تقی) صححه الحاکم و الذهبی و حسنه الألبانی صحیح ابی داؤد، کتاب الادب، باب من یؤمر ان یجالس (۴۸۳۲)، الترمذی (۲۵۱۹)، الحاکم (۱۲۸/۴)، المشکاۃ (۵۰۱۸)

[2] (۱۸۴) اور جو سمجھانے سے بھی باز نہ آئے ایسے غیر اللہ کے نام پر مانگنے والوں کو ہرگز نہیں دینا چاہیے؛ رہا معاملہ فطرانہ (زکوۃ الفطر) کا تو یہ تو فرض ہے اس میں صرف کوشش نہیں کرنی چاہیے بلکہ دوسروں کو دینا جائز ہی نہیں کہ « تُؤخَذُ مِنْ أَغْنِيَاءِ هِمْ وَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَاءِ هِمْ.» (زکوۃ مسلمان اغنیاء سے لے کر مسلمان فقراء کو دی جاتی ہے) (صحیح البخاری کتاب الزکاۃ باب وجوب الزکاۃ (۱۳۹۵)، انظر (۱۴۵۸، ۱۴۹۶، ۳۴۴۸) لہٰذا سوال کرنے والا اگر عقیدہ توحید والا نہیں اور نمازی نہیں تو اسے فطرانہ نہیں دینا چاہیے؛ خواہ وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، اس لیے کہ یہ خاص طور پر مسلمانوں کا حق ہے، ہاں زکوۃ کے علاوہ ان کا تعاون کیا جا سکتا ہے۔ هٰذا، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ. (خالد بن بشیر مرجالوی عفی عنہما).

''شاید وہ پاکیزگی اختیار کر لے یا نصیحت قبول کرے تو اسے نصیحت نفع دے۔''

عام حالات میں اچھے لوگوں کو ہی کھانا کھلانا چاہیے۔ البتہ سوال کی صورت میں وسعت ہے۔ اس کے باوجود کوشش ہونی چاہیے کہ قربانی کا گوشت اور فطرانہ وغیرہ نیکوکار لوگوں کو ہی دیا جائے۔

سوال: ایک کلمہ گو مسلمان زندگی بھر شرک و بدعات کے کام کرتا رہا اور مرتے وقت اس کی زبان پر کلمہ طیبہ جاری ہو جاتا ہے۔ کیا ایسے آدمی پر بھی: «دَخَلَ الْجَنَّةَ .» والی حدیث صادق آتی ہے؟

جواب: «دَخَلَ الْجَنَّةَ .» [1] والی حدیث اس پر صادق آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ توبہ کی توفیق کے بغیر کلمہ کا نطق محال ہے۔ ملاحظہ ہو: مرعاة المفاتیح ۴۴۹/۲ و فتح الباری ۱۰۹/۳-۱۱۰

سوال: کلمہ گو مسلمان مشرک کا جنازہ پڑھنا صحیح ہے یا نہیں، جب کہ آخری وقت اس کی زبان پر کلمہ بھی جاری ہو؟

جواب: آخری وقت میں کلمہ پڑھنے والے مشرک آدمی کی نماز جنازہ پڑھ لینی چاہیے۔ کیونکہ نطق کلمہ اس کے گناہوں سے درگزر اور معافی کی علامت ہے۔

سوال: اکثر اہل حدیث حضرات بریلوی ائمہ کی اقتدا میں نماز نہیں پڑھتے بلکہ کئی دیوبندی حضرات کے پیچھے بھی۔ حالانکہ دوسری طرف یہ کہتے ہیں کہ مقتدی کی نماز کا امام کی نماز پر انحصار نہیں۔ کیا قبر میں، حشر میں کہیں حنفی، وہابی کا سوال ہوگا؟ کیا مولویوں نے عوام کو گورکھ دھندے میں نہیں ڈال رکھا ہے؟

جواب: شرعی اصطلاع میں مقتدی اسی کو کہا جاتا ہے جو امام کی اقتدا میں ہو۔ البتہ نیت کے اعتبار سے بعض امور میں اختلاف ظاہری اقتدا کے منافی نہیں، آپ کی یہ بات درست ہے کہ حشر میں نسبتوں کے بارے میں سوال نہیں ہوگا لیکن اتنی بات ضرورر ہے کہ ہر عمل کی قبولیت کے لیے عقیدے کی درستی اولین شرط ہے۔ علماء پر کلی انحصار کے بجائے بہتر ہے کہ تلاش حق کے لیے خود جدوجہد کریں۔ رب کریم کا وعدہ ہے:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا .﴾ (العنکبوت:۶۹)

''اور جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں۔ ہم انہیں اپنے راستے ضرور دکھاتے ہیں۔''

---

[1] (۱۸۵) « من کان آخر کلامه لا اله الا الله دخل الجنة » صححه الالبانی صحیح ابی داود و کتاب الجنائز، باب فی التلقین (۳۱۱۶) الحاکم (۱/۳۵۱) صححه و وافقه الذهبی والمشکاة بتحقیق الثانی للألبانی (۱۵۶۴) عن ابی هریرة رضی الله عنه

سوال: نبی آخرالزماں جناب محمد ﷺ کے والد اور والدہ ماجدہ کا کس مذہب سے تعلق تھا؟

جواب: صحیح مسلم (۱/۱۱۴) میں حدیث ہے:

إِنَّ رَجُلًا قَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! أَيْنَ أَبِيْ؟ قَالَ:« فِي النَّارِ .» قَالَ :فَلَمَّا قَفٰى دَعَاهُ ،فَقَالَ:« إِنَّ أَبِيْ وَ أَبَاكَ فِي النَّارِ.»❶

''ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرا باپ کہاں ہے؟ فرمایا: آگ میں، جب وہ جانے لگا تو آپ ﷺ نے اس کو بلا کر فرمایا: میرا اور تیرا باپ آگ میں ہیں۔''

" بَابُ بَيَانِ أَنَّ مَنْ مَاتَ عَلَى الْكُفْرِفَهُوَ فِي النَّارِ، وَلَا تَنَالُهُ شَفَاعَةٌ وَلَا تَنْفَعُهُ قَرَابَةُ الْمُقَرَّبِيْنَ"

نیز صحیح مسلم میں ایک اور حدیث (۱/۳۱۴) میں ہے:

« زَارَ النَّبِيُّ ﷺ قَبْرَ أُمِّهِ فَبَكٰى وَ أَبْكٰى مَنْ حَوْلَهُ، فَقَالَ ﷺ:اسْتَأْذَنْتُ رَبِّيْ لِيْ أَنْ أَسْتَغْفِرَ لَهَا فَلَمْ يُؤْذَنْ لِيْ ......»الخ ❷

''نبی ﷺ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی، خود روئے اور ہمراہ ساتھیوں کو رلایا۔ پھر فرمایا: ''میں نے اپنے رب سے اجازت چاہی کہ والدہ کے لیے بخشش کی دعا کروں مگر مجھے اجازت نہیں ملی۔''

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے "مسالك الحنفا فى والدى المصطفى" میں اس کے برعکس مسلک اختیار کیا ہے۔ لیکن کوئی قابل اطمینان دلیل نہیں پیش کر سکے۔ ملاحظہ ہو: (الحاوی للفتاوی۲/۳۵۳-۴۰۴) واضح ہو کہ علامہ ملا علی قاری حنفی کا مسلک عدم نجاۃ کا ہے۔ ''شرح الفقہ الاکبر'' اور ان کی کتاب "اِعْتِقَادُ أَصْحَابِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ فِيْ أَبَوَيِ الرَّسُوْلِ" میں اس امر کی وضاحت ہے۔

اور تیسرا مسلک توقف کا ہے۔ میرے خیال میں صحیح نصوص کے ماوراء اس میں خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ نصوص سے ظاہر ہے کہ ان کا مسلک ملت ابراہیمی سے ہٹ کر تھا جس کی بنا پر سابقہ وعید سنائی گئی ہے۔

---

❶(۱۸۶) صحیح مسلم كتاب الایمان باب بيان أن من مات على الكفر فهو فى النار......(۵۰۰).

❷(۱۸۷) صحیح مسلم، كتاب استئذان النبى ﷺ ربه-عزوجل-فى زيارة قبرأمه (۲۲۶۰)، الترمذی، (۱۰۵۴)، ابن ماجه، (۱۵۷۲)، وانظر: بلوغ المرام، كتاب الجنائز.

سوال: قرآن کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر تھا۔مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ آزر چچا کا نام تھا۔حقیقت سے آگاہ فرمائیں؟

جواب: قرآن وسنت میں ''أَبٌ'' کا اصل معنیٰ ''باپ'' ہے۔ چنانچہ مولوی صاحب احمد رضا بریلوی نے قرآنی آیت:﴿ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ . ﴾ (الأنعام:٧٤) کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''اور یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا۔''

اس اعتبار سے رضائی اور سلفی ترجمہ ایک ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

پھر قرآن میں بے شمار مقامات پر لفظ ''اَب'' کا اطلاق حقیقی باپ پر ہوا ہے۔ البتہ قرینہ صارفہ کی بنا پر عربی زبان میں بعض دفعہ اس کا اطلاق حقیقی چچا یا مجازی چچا پر بھی ہوا ہے اور حقیقت کو مجاز کی طرف پھیرنے کے لیے ٹھوس دلیل کی ضرورت ہوتی ہے جو یہاں موجود نہیں۔ اس مقام پر رضا خانی ترجمہ کے حاشیے پر لکھا ہے۔

''قاموس میں ہے کہ آزر ابراہیم علیہ السلام کے چچا کا نام ہے۔''

آپ قاموس کی اصل عبارت ملاحظہ فرمائیں:

" فِيْ بَعْضِ اللُّغَاتِ وَ اسْمُ عَمِّ إِبْرَاهِيْمَ ،وَأَمَّا أَبُوْهُ فَإِنَّهُ تَارِحٌ، أَوْ هُمَا وَاحِدٌ."

''بعض لغات میں ہے کہ آزر،ابراہیم علیہ السلام کے چچا کا نام ہے اور ان کے باپ کا نام تارح ہے۔ یا آزر اور تارح سے مقصود ایک ہی شخصیت ہے۔''

ظاہر ہے قاموس نے صرف دو احتمال بیان کئے ہیں فیصلہ نہیں دیا۔ مُحشّی کی دیانت وامانت کا تقاضا یہ تھا کہ دونوں اقوال نقل کرتے ،افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا۔

جب قرآنی آیت:

﴿ قَالُوْا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيْمَ وَ إِسْمَاعِيْلَ وَإِسْحٰقَ إِلٰهًا وَّاحِدًا. ﴾(البقرة:١٣٢)

سے بھی حاشیہ پر تمسک کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ اسماعیل علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے چچا تھے۔جس میں ذرہ برابر شک کی گنجائش نہیں۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے آزر کو بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا قرار دینا قیاس مع الفارق ہے۔حقیقت کو چھوڑ کر بلا قرینہ مجاز مراد لینا غیر درست عمل ہے۔

مشہور مفسر ابن جریر رحمہ اللہ کا خیال یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے باپ کے دو نام تھے۔ آزر اور تارح۔

یا دونوں میں سے ایک لقب اور دوسرا نام۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی بات کو پسند فرمایا ہے: وَھٰذَا الَّذِیْ قَالَہٗ جَیِّدٌ قَوِیٌّ. وَاللّٰہُ أَعْلَمُ.

صحیح بخاری میں حدیث ہے:

« إِنَّ إِبْرَاهِيمَ يَلْقَى أَبَاهُ آزَرَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ؟ فَيَقُوْلُ لَهُ آزَرُ: يَا بُنَيَّ اَلْيَوْمَ لَا أَعْصِيكَ.» ❶

''ابراہیم علیہ السلام کی قیامت کے روز اپنے باپ آزر سے ملاقات ہوگی۔ آزر ان سے کہے گا: اے میرے بیٹے آج کے دن میں تیری نافرمانی نہیں کروں گا۔''

اس سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ آزر باپ اور ابراہیم علیہ السلام بیٹا ہے جس طرح کہ نفس روایت میں تصریح ہے۔ علامہ رازی فرماتے ہیں: آیت کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر تھا۔ پھر فرماتے ہیں، ممکن ہے تارح اس کا لقب ہو۔ (تفسیر کبیر:۷/۳۱)

سوال: شیعہ نے اعتراض کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ''فاروق'' کا لقب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں دیا بلکہ یہودیوں نے دیا تھا۔ ہمارے یہاں شیعہ حضرات چیلنج کرتے ہیں کہ سنی اپنی کتابوں سے دکھائیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے حضرت عمر رضی اللہ کو فاروق کا لقب عطا فرمایا ہو؟

جواب: شیعہ کا اعتراض سراسر غلط و بے بنیاد اور بغض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر مبنی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا لقب ''فاروق'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رکھا ہوا ہے، چنانچہ حسب ذیل دلائل بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:

حافظ احمد بن علی عسقلانی المعروف بابن حجر رحمہ اللہ اپنی بلند پایہ کتاب: (الإصابة فی تمییز الصحابة جزو ۲، ص ۵۱۲ طبع مصر) میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ترجمہ و احوال میں تاریخ محمد بن عثمان بن ابی شیبہ سے رقم طراز ہیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

" فَسَمَّانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَئِذٍ الْفَارُوْقَ. " ❷

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اسلام قبول کرنے کے دن میرا نام فاروق رکھا ہے۔''

---

❶ (۱۸۸) صحیح البخاری کتاب الانبیاء رقم الباب (۸) واتخذ اللہ ابراهیم خلیلاً (۳۳۵۰).

❷ (۱۸۹) تاریخ المدینة المنورة (۶۶۲/۱) لابن شبه ابی زید عمر بن شبه (۱۷۳ھ۔۲۶۲ھ) والطبقات لابن سعد (۲۷۰/۳) عن عائشة رضی اللہ عنها والکامل لابن اثیر (۱۵۱/۴).

امام محمد بن عبدالکریم المعروف بابن الأثیر رحمہ اللہ اپنی شہرہ آفاق کتاب ''تاریخ الکامل'' میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

"" سَمَّاهُ النَّبِيّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْفَارُوْقَ." ❶

''نبی ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا لقب ''فاروق'' منتخب فرمایا تھا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ "فتح الباری جز ۷، ص ۳۳" میں فرماتے ہیں:

" وَأَمَّا لَقَبُهُ الْفَارُوْقُ بِالْاِتِّفَاقِ. "

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لقب ''فاروق'' پر علماء کا اتفاق ہے۔''

علامہ بدر الدین عینی رحمہ اللہ نے بھی "عمدة القاری شرح صحیح البخاری جز ۱۶" میں لقب ''فاروق'' پر علماء کا اتفاق ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"وَلَقَبُهُ الْفَارُوْقُ بِالْاِتِّفَاقِ"

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لقب فاروق پر علماء کرام کا اتفاق ہے۔''

علامہ قسطلانی رحمہ اللہ ''ارشاد الساری جز ۶، ص ۹۸'' میں یوں بیان فرماتے ہیں:

" وَ لَقَبُهُ الْفَارُوْقُ لَقَّبَهُ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا رَوَاهُ ابْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ فِيْ تَارِيْخِهِ."

باقی رہا مولوی صاحب کا یہ دعوٰی کہ یہ لقب یہودیوں کا خود ساختہ ہے۔ یہ بھی غلط اور ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ اس قول کو بصیغۂ تمریض ذکر کیا جاتا ہے جس سے محدثین کے نزدیک ضعف کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔

چنانچہ امام ابن الاثیر رحمہ اللہ ''الکامل'' میں فرماتے ہیں:

" وَ قِيْلَ بَلْ سَمَّاهُ أَهْلُ الْكِتَابِ. "

''یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فاروق لقب اہل کتاب (یہود و نصاری) نے رکھا تھا۔''

علاوہ ازیں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''فتح الباری'' میں علامہ بدر الدین عینی رحمہ اللہ عمدة القاری میں، علامہ عسقلانی ''ارشاد الساری'' میں، سب نے اس قول کو بلفظ تمریض ہی بیان فرمایا ہے۔

---

❶ (۱۹۰) الکامل (۱/٤٥٤)

میں کہتا ہوں عَلٰی سَبِیْلِ التَّنَزُّل اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ یہ لقب یہود نے رکھا تھا تو یہ کس لیے؟ یہ تو شان فاروقی کا کمال ہے کہ دشمنان اسلام بھی اس کو تسلیم کرتے تھے جب کہ دوسری طرف خود سرور کائنات ﷺ سے بھی ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ راہ راست پر چلنے اور حق گوئی کی توفیق بخشے۔ آمین!

سوال: تورات، زبور، انجیل اور قرآن کریم کے درمیان تقابلی جائزہ مطلوب ہے کیونکہ عیسائی اور یہودی آج کل قرآن کریم میں تشکیک پیدا کر کے اپنا مخصوص مطلب حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

جواب: بلاشبہ تورات، زبور، انجیل اور قرآن مجید چاروں الہامی و آسمانی کتابیں ہیں۔ خالق کائنات نے انہیں مختلف زمانوں میں اپنے جلیل القدر اور عظیم المرتبت پیغمبروں، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر بالترتیب نازل فرمائیں۔ ان کی آمد کا اولیں مقصد بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود، رشد و ہدایت اور مالک الملک سے تعلق کی استواری، دین اور دنیا میں طریق حق اور راہ نجات کی راہنمائی، ان پر عامل کے لیے دنیوی و اخروی نعمتوں کی فراوانی کی بشارتیں اور اس کے برعکس پر سخت عذاب الٰہی کی وعید تھا۔ اسی حیثیت سے ان پر یقین و اعتقاد رکھنا ہر ذی روح بشر پر واجب ہے۔ اگر کوئی شخص جملہ کتب میں سے کسی ایک کا بھی انکاری ہے یا اس کے مُنَزَّل مِنَ اللہِ ہونے میں اس کو تردد لاحق ہے تو بلاشبہ وہ کافر ہے۔ روز محشر اس کی نجات ناممکن اور محال ہے۔

مشہور حدیث مسمّٰی ''حدیث جبریل'' ❶ میں ایمان بالرسل و الکتب کو ایمانیات کا ایک اہم جز قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ ان کے علاوہ بھی بہت سارے صحیفے اور کتابیں مختلف اوقات میں دیگر نبیوں اور رسولوں پر اترے اور ان کی تصدیق کرنا اور برحق سمجھنا فی الجملہ واجب ہے چونکہ وہ اس وقت ہمارے موضوع بحث سے خارج ہیں۔ اس لیے ان سے صرف نظر کرتا ہوا، اس فرصت میں مذکورہ بالا کتب اربعہ پر توجہ مرکوز کرتا ہوں۔

واضح ہو کہ یہودی لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماسوا دیگر دونوں نبیوں کی نبوت کے انکاری ہیں۔ اور عیسائی قوم حضرت محمد ﷺ کی رسالت اور قرآن مجید کو الہامی کتاب تسلیم کرنے سے باغی ہے۔ لہٰذا دونوں گروہ مذکور حکم

---

❶ (۱۹۱) صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب سؤال جبریل إلی النبی ﷺ (۵۰، ۴۷۷۷)، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الإیمان ما هو (۹۷).

کی زد میں ہیں۔ جبکہ قرآن حکیم میں تصریح موجود ہے کہ آپ ﷺ کا پیغام عام اور آپ ﷺ کی رسالت تمام اہل زمین کی طرف ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا . ﴾ (الأعراف:۱۵۸)

یعنی (اے محمد ﷺ) کہہ دو کہ لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔"

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَ مَآ أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَّ نَذِيرًا . ﴾ (سورة سبا:۲۸)

"اے محمد! ہم نے تم کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبری بتانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔"

یہ وہ عظیم بشارت ہے کہ ختم الرسل ﷺ کی آمد سے قبل کسی بھی نبی کے حصہ میں نہ آ سکی بلکہ جملہ انبیاء کرام سے وعدہ لیا گیا تھا:

﴿ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ . ﴾ (آل عمران:۸۱)

"اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی۔"

لطف یہ ہے کہ اللہ جل جلالہ نے روئے زمین پر دیگر اقوام کی نسبت صرف امت مسلمہ ہی کو یہ اعزاز و اکرام بخشا ہے کہ اس نے ہر نبی کی عزت وتوقیر کو پورے خلوص اور صمیم قلب سے فرض اولین سمجھا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے نبی اکرم ﷺ نے اپنے مناقب ومحاسن مقابلۃً بیان کرنے سے منع فرمایا ہے۔ جس سے کسی نبی کی توہین وتنقیص کا پہلو نکلتا ہو فرمایا:

« لَا تُخَيِّرُونِي بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ .» [1]

اس مسلمہ امر کے باوجود کہ آپ ﷺ کا رتبہ ومقام جملہ کائنات سے اعلیٰ وارفع ہے۔

اس بنا پر آج کے دور میں اگر کسی کو سابقہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے امتیوں کے صحیح واقعات وحوادث تک رہنمائی ورسائی مقصود ہو تو اس کا واحد ذریعہ رسول الثقلین ﷺ کی تعلیمات ہیں جو کتاب وسنت کی صورت میں ہمارے ہاں محفوظ ہیں۔

[1] (۱۹۲) صحيح البخاري، كتاب الخصومات، باب ما يذكر في الأشخاص (۶۱۵۳) والخصومة (۲۴۱۲). صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب من فضائل موسى (۶۱۵۶).

اسناد کی اہمیت:

پھر تدوین حدیث وتحفظ تاریخ کے سلسلہ میں مسلمانوں کی گرانقدر خدمات رہتی دنیا تک روز روشن کی طرح عیاں رہیں گی۔ دراصل مسلمانوں کی عظمت وترقی وعروج کا راز صرف اس بات میں مضمر تھا کہ خالقِ کون ومکان کو سند جیسی نعمت سے بہرہ ور اور اس کی افادیت سے نوازتا، یہ وہ شیٔ ہے جس بنا پر مسلمان جملہ اقوام عالم میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ ❶ مقدمہ ''صحیح مسلم'' میں مشہور محدث عبداللہ بن المبارک کا قول ہے۔ یعنی اسناد دین کا جز ہے "الاسناد من الدین الخ." ❷ پرکھنے کی خاطر محدثین عظام کی کاوشیں بے حد قابل قدر ہیں، انہوں نے تراجم ورجال کے موضوع پر مستقل کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں لاکھوں راویوں کے حالات مدون ہیں جو کرامت سے کم نہیں، پھر تعجب خیز بات یہ ہے کہ محدثین کو اسانید ومتونِ حدیث سب ازبر تھے۔ بعض محدث تو اس زمانے میں کتابت حدیث کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ❸ کہیں ایسا نہ ہو کہ کتابوں کی وجہ سے لوگوں کے حافظے میں کمی پیدا ہو جائے۔ یعنی کتابوں پر اعتماد کر کے حفظ کرنا ترک کر دیں۔ ایسی بھی مثالیں موجود ہیں کہ بسا اوقات ان کے حافظے اور کتاب میں بھی تعارض پیدا ہو جاتا تھا جس پر ان کو کہنا پڑتا: فلاں بات کتاب میں یوں ہے اور میرے حافظے میں اس طرح، اس کی مثال سنن ابوداؤد کی "كِتَابُ الطَّهَارَة" ❹ میں موجود ہے "إِنْ شِئْتَ فَرَاجِعْهَا" علامہ صنعانی نے "سُبُلُ السَّلَام" کے اوائل میں صراحت کی ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ کو اتنی کتابیں زبانی یاد تھیں کہ انہیں بارہ اونٹ بمشکل اٹھا سکتے تھے۔ ❺

الغرض محدثین نے اپنی اپنی تصانیف میں ہر راوی کے بارے میں حتی المقدور وافر معلومات جمع کرنے کی سعی کا التزام کیا تاکہ مجموعی صورت حال سے نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ یہ راوی کس درجہ کا ہے اسی اعتبار سے حدیث میں صحت وضعف کا حکم لگایا جاتا ہے۔

---

❶(١٩٣) الملل والنحل(٢٢١/٢)رقم(٣٢)كيف تم نقل القرآن لابن حزم،اختصار علوم الحديث لابن كثير،النوع التاسع والعشرون.

❷(١٩٤) صحيح مسلم في المقدمة(٣٢).

❸(١٩٥) المحدث الفاصل للإمام البغدادى(صـ ٣٨٠ إلى ٣٨١).

❹(١٩٦) المثال الأول:أبوداؤد،باب في الغسل من الجنابة(٢٤٥).والمثال الثاني: باب إذا أقبلت الحيضة تدع الصلاة(٢٨٢).

❺(١٩٧) (١١/١)وانظر:تاريخ بغداد(٩٤/٦).في ترجمة إبراهيم بن سعيد الجوهرى مثالا جيداً عجيباً.

مزید آنکہ علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ متاخرین کو کسی حدیث کے صحیح یا ضعیف کہنے کا اختیار ہے یا نہیں؟ امام ابن الصلاح رحمہ اللہ نے ''علوم الحدیث'' ❶ کے شروع میں صراحت کی ہے اسی پر اکتفاء کیا جائے گا۔ البتہ امام نووی رحمہ اللہ ❷ اور ان کے ہم خیال اصحاب نے اس بات کی تردید کی ہے،اسی بناء پر امام نووی رحمہ اللہ اور ان کے ہم خیال اصحاب جیسے قطان، ضیاء مقدسی، حافظ منذری اور دمیاطی رحمہم اللہ وغیرہ نے احادیث پر صحت اور ضعف کا حکم لگایا ہے۔

استاذی المکرّم محدث روپڑی فرماتے ہیں: ''لیکن اس مقام پر تھوڑی سی تفصیل وہ یہ کہ جس حدیث کے متعلق ائمہ محدثین نے تصریح کر دی ہے اس میں متاخرین کو دخل نہیں ہوسکتا اور جس حدیث کے صحت وضعف میں ائمہ محدثین کا اختلاف ہے اس میں متاخرین کو اصول حدیث کے تحت ترجیح کا حق حاصل ہے اور اگر کسی حدیث کے متعلق ائمہ محدثین سے کوئی حکم نہیں ملا تو وہاں متاخرین کو اصول حدیث کے تحت تصحیح وتضعیف کا پورا حق حاصل ہے۔'' (مَظهرالنِكات شَرحُ الْمِشْكوةِ، قلمی)

راقم الحروف یہ کہتا ہے کہ ائمہ محدثین کی شروط معتبرہ کے تحت اگر آج بھی کوئی محدث احادیث کی اسانید کی تحقیق کرتا ہے تو اس میں آخر کیا حرج ہے بشرطیکہ اس میں ابتداع کی بجائے اتباع کا پہلو ملحوظ خاطر ہو، آج کے دور میں شیخنا المکرّم علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ محدث العصر کی مؤلفات میں ایسی امثلہ موجود ہیں ان میں سے ایک مثال حدیث :''أَتَعْجِبِيْنَ'' ہے(ملاحظہ ہو: إرواء الغليل،كتاب الصلوة) جبکہ محقق العصر علامہ عبیداللہ مبارکپوری حفظہ اللہ کی مایہ ناز ''شرح مرعاة المفاتيح'' میں بھی اس کی جھلک موجود ہے۔

نیز علامہ ملاعلی قاری ''مرقاۃ'' میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ ایسے ہی ہے جیسے بعض نے متاخر زمانہ میں اجتہاد کی اجازت نہیں دی۔ تاکہ نااہل لوگ کتاب وسنت کو کھیل نہ بنالیں۔

لیکن مصنف ''مرقاۃ'' کا یہ قول محل نظر ہے۔ کیونکہ حدیث پر صحت وضعف کی بحث روایات کی قبیل سے ہے جو تاریخ کا حصہ ہے بخلاف اجتہاد کے کہ یہ درایت کی قسم ہے۔

---

❶(۱۹۸) (النوع الأول بعد أصح الأسانيد.الفائدة الثانية).

❷(۱۹۹) تدريب الراوی(۸۰/۱)ط.قديمی كتب خانه.

اسی شے کے پیش نظر ابوالمؤرخین امام طبری رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق تاریخ میں ہر واقعہ مع اس کی سند کے بیان کیا ہے۔ اور اَسانید کی تحقیق کو قاری پر چھوڑ دیا ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ کا مشہور قول ہے:

" مَنْ أَسْنَدَ لَكَ فَقَدْ بَرِئَ."

یعنی "جو کسی شیٔ کی سند ذکر کر دیتا ہے وہ بری الذِّمّہ ہے۔"

افسوس صد افسوس! آج کے پرفتن دور میں بعض لوگوں نے حدیث کی چھان بین کے سلسلے میں اس کی اِسنادی حیثیت سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف اپنے ذوق ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ وہ لوگ سخت غلطی اور توہمات میں مبتلا ہیں اسی بے راہروی کا نتیجہ ہے کہ ان حضرات کے ہاں بسا اوقات موضوع ومن گھڑت روایات بھی صحت کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ !

المختصر واقعات وحوادث کی اِسنادی حیثیت کو محفوظ رکھنا اہل اسلام کا عظیم کارنامہ ہے۔ جبکہ یہود و نصاریٰ کی بے بضاعتی اس سلسلہ میں أَظْهَرُ مِنَ الشَّمْسِ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ اپنی تواریخ کا ضبط تو کجا اپنی آسمانی کتابوں کو بھی اصل شکل وصورت میں محفوظ نہ رکھ سکے۔ ان لوگوں کے لیے اپنے صحیح واقعات تک پہنچنے کا اگر کوئی قابل اعتماد واسطہ باقی ہے تو وہ صرف مسلم مؤرخین کی گراں قدر خدمات ہیں۔ اللہ قبول فرمائے۔ آمین!

لفظ تورات پر بحث:

تورات: عبرانی زبان کا لفظ ہے اس کا اصلی معنی شریعت یا ناموس یعنی پوشیدہ یا پنہاں چیز ہے۔ یہود کی اصطلاح میں یہ پانچ چھوٹی کتابوں سے عبارت ہے:

① سفر التكوين ② سفر الْخُرُوْج ③ سفر الْأَوِّيِيْنَ وَالْأَحْبَار

④ سفر الْعَدَد ⑤ سفر التثنية

اور نصاریٰ کی اصطلاح میں قدیم عہد ناموس کا اطلاق قبل از مسیح علیہ السلام انبیاء کی کتابوں، ان کے فیصلہ جات مصنفین کی تواریخ اور ان کے بادشاہوں کی خبروں پر موجود ہے، ان خبروں کے مصنف کا چاہے علم ہو یا نہ ہو اور بعض اوقات ان کے ہاں انجیل بھی سابقہ مجموعہ میں شامل کر لی جاتی ہے۔ ان سب کا نام تورات رکھتے ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کے ہاں تورات سے مراد وہ کتاب ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا اور وہ لوگوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت تھی۔ اور اللہ کی طرف سے تختیوں پر تحریر شدہ ملی تھی۔ البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے

ہاں اس کا اطلاق مجموعۂ عہد قدیم پر بھی ہوتا ہے۔ سید عبدالدائم الحلالی ''لغات القرآن'' میں فرماتے ہیں:
تورات اور انجیل دونوں عجمی لفظ تکلف سے کام لے کر ان کا اشتقاق ''ورى'' اور ''نجل'' سے بتانا اور ان کا وزن تَفْعِلَةٌ اور اِفْعِيل بیان کرنا اس وقت صحیح ہوسکتا ہے جبکہ دونوں لفظ عربی ہوں۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے اس کی قراءت انجیل کی ہے جس میں ہمزہ پر فتح ہے یہ اس کے عجمی ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ افعیل کے ہمزہ کا مفتوح ہونا سرے سے اوزان عرب میں موجود ہی نہیں ہے۔(انتهى بحواله كشاف)

''تفسیر کشاف'' کی عبارت یوں ہے:

" وَقَرَأَ الْحَسَنُ الْأَنْجِيلَ بِفَتْحِ الْهَمْزَةِ ، فَإِنْ صَحَّ عَنْهُ فَلِأَنَّهُ أَعْجَمِيٌّ خَرَجَ لِعَجَمِيَّتِهِ عَنْ زِنَاتِ الْعَرَبِيَّةِ كَمَا خَرَجَ هَابِيلُ وَآجُرُ . "(كشاف:١/٤٦٣)

لفظ انجیل پر بحث:

انجیل یونانی کلمہ ہے اس کا معنی بشارت ہے اور اصطلاح میں اس سے مراد وہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی، قرآن مجید میں اس کی صفت یوں بیان کی ہے:

﴿ وَ قَفَّيْنَا عَلٰى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰةِ وَ اٰتَيْنٰهُ الْإِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ وَّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰةِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ . ﴾ (٥/٤٦)

''اور ان پیغمبروں کے بعد انہیں کے قدموں پر ہم نے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا جو اپنے سے پہلے کی کتاب تورات کی تصدیق کرتے تھے۔ اور ان کو انجیل عنایت کی جس میں ہدایت اور نور ہے۔ اور تورات کی جو اس سے پہلی (کتاب) ہے تصدیق کرتی ہے، اور پرہیزگاروں کو راہ بتاتی اور نصیحت کرتی ہے۔''

بحث اناجیل:

واضح رہے کہ عیسائیوں کی اصطلاح میں جو چار کتابیں اناجیل کے نام سے موسوم ہیں یہ سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کے لوگوں کی تصنیفات ہیں۔ جن میں آپ کے اقوال و احوال کو صحیح اور غلط طور پر مرتب کر دیا گیا۔ گو ان میں اصل انجیل کے بھی کچھ مضامین موجود ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی مکمل طور پر حضرت عیسیٰ پر

نازل شدہ انجیل نہیں ہے۔ بلکہ یہ چاروں کتابیں متّی، مرقس، یوحنا، لوقا نامی چار مختلف اشخاص کی تصنیفات ہیں جو اپنے اپنے مصنف کے نام سے مشہور ہیں اور اناجیل کی کتابت کب عمل میں آئی اس کے تعین میں عیسائیوں کا سخت اختلاف ہے۔ اسی طرح یہ امر بھی زیر بحث ہے کہ آیا جن کے نام سے یہ کتابیں مشہور ہیں درحقیقت ان ہی کی جمع کردہ ہیں یا بعد کے لوگوں کی تصنیف ہیں؟ تاہم اس بات پر ہمارا اور عیسائیوں کا اتفاق ہے کہ یہ چاروں کتب نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصنیفات میں سے ہیں اور نہ ان کے عہد میں لکھی گئی ہیں۔

بہرحال قرآن مجید میں جس انجیل کا ذکر ہے اس سے مراد وہی اصلی انجیل ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ (لغات القرآن)

مسئلہ ہذا کی مزید وضاحت یوں ہوتی ہے کہ مروجہ چار اناجیل جو آج مشہور اور موجود ہیں۔ ۳۲۵ کو نیقیہ میں قسطنطین کے زیر اہتمام اجتماع میں بڑی بحث وتمحیص کے بعد سرکاری سطح پر ان کے وجود کو تسلیم کر لیا گیا۔ جبکہ باقی تمام کتابوں کی حیثیت کو ختم کر دیا گیا تاکہ دیانت نصاریٰ کی شکل وصورت اور ہیئت قائم رہ سکے چونکہ یہ اجتماع مخصوص مقاصد کے پیش نظر منعقد ہوا تھا اور پولس (شاؤل) کے ذہنی اثرات اس پر اثر انداز تھے۔ جو درحقیقت یہودی تھا اور اپنے مذموم مقاصد کے حصول کی خاطر مسیحیت میں بڑے ڈرامائی انداز میں داخل ہوا تھا۔

نیز قسطنطین کے مشرکانہ ذہن کا بھی ان اناجیل کے تسلیم کرانے اور اسی اجتماع میں ''تثلیث'' کو مذہبی عقیدہ قرار دینے میں خاصہ دخل تھا۔ چونکہ وہ اپنی رعایا کے مشرکانہ عقائد پر اچھی طرح کار بند تھا۔ اسی لیے اس نے اس اجتماع میں اساقفہ کی واضح اکثریت (۱۶۵۲) کو نظر انداز کر کے چند لوگوں (۳۱۸) کی خواہش پر مذہب کی شکل بگاڑ دی اور اس وقت سے اب تک نصرانیت آسمانی کتابوں اور ایک جلیل القدر رسول اللہ ﷺ کے نام پر تمام انبیاء کے متفقہ اصل الاصول توحید کی بجائے مشرکانہ دعوت کی علمبردار چلی آ رہی ہے۔

ہر وہ فرد جس کو سابقہ تاریخ امم سے تھوڑا سا لگاؤ ہے اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ ان اناجیل کا آپس میں شکلی اور موضوعی اختلاف اس قدر زیادہ ہے جو ان کی صداقت تو درکنار ان کے وجود کو بھی موہوم مشکوک اور مبہم بنا دیتا ہے۔

ہم ذیل میں ان چاروں اناجیل میں تحریف پر چند شواہد پیش کرتے ہیں۔

ان کے الفاظ اور موضوعات میں باہمی اختلاف ہے۔ مثلاً شروع کے الفاظ ہی آپس میں مختلف ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں:

۱- انجیل متی کی ابتداء:

۱...... كِتَابُ مِيلَادِ يَسُوعَ الْمَسِيحِ بْنِ دَاوُدَ بْنِ إِبْرَاهِيمَ.

۲...... وَإِبْرَاهِيمُ وَلَدُ إِسْحٰقَ وَ إِسْحٰقُ وَلَدُ يَعْقُوبَ وَ يَعْقُوبُ وَلَدُ يَهُوذَهَ وَ إِخْوَتِه...... الخ

۲- انجیل میں مرقس کی ابتداء:

۱...... بِدَاءُ إِنْجِيلِ يَسُوعَ الْمَسِيحِ ابْنِ اللّٰهِ.

۲...... كَمَا هُوَ مَكْتُوبٌ.

۳- انجیل لوقا کی ابتداء:

إِذَا كَانَ كَثِيرُونَ قَدْ أَخَذُوا بِتَالِيفِ قِصَّتِهِ فِي الْأُمُورِ الْمُتَّفَقَةِ عِنْدَنَا۔

۴- انجیل یوحنا کی ابتداء:

فِي الْبَدْءِ كَانَ الْكَلِمَةُ عِنْدَ اللّٰهِ.

ان شواہد کی روشنی میں بلا خوف و تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقی دعوت اور عیسائیت کی صحیح صورت معلوم کرنے کے لیے قابل اعتماد مأخذ صرف اور صرف قرآن حکیم ہی ہے جو ہر قسم کی تحریف وتغیر سے مبرا ہے۔ اور ان اناجیل کا شکلی اختلاف یوں ہے کہ کسی ایک کا حجم دوسری سے نہیں ملتا۔

۱...... انجیل متی: ۲۸۔ اصحاح (فصول)

۲...... مرقس: ۱۶۔ اصحاح

۳...... لوقا: ۱۴۔ اصحاح

۴...... یوحنا: ۲۱۔ اصحاح

یہ باہمی اختلاف ان اناجیل کے محرف ہونے کی داخلی شہادتیں ہیں اور سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ موجودہ تورات میں ذات باری تعالیٰ اور انبیاء کرام کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے چنانچہ سفر تکوین کے اصحاح اول میں ہے:

قَالَ اللّٰہُ تعالٰی: " نَجْعَلُ الْإِنْسَانَ عَلٰی صُوْرَتِنَا کَشَبَهِنَا."

"اللہ نے فرمایا ہم انسان کو اپنی شکل وصورت پر بناتے ہیں۔"

اور سفر تکوین کے اصحاح ثانی میں ہے:

" فَأُکْمِلَتُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَ کُلَّ جُزْءِ هَا، وَ فَرَغَ اللّٰهُ فِی الْیَوْمِ السَّابِعِ مِنْ عَمَلِهِ الَّذِیْ عَمِلَ ،فَاسْتَرَاحَ فِی الْیَوْمِ السَّابِعِ مِنْ جَمِیْعِ عَمَلِهِ الَّذِیْ عَمِلَ، وَ بَارَكَ اللّٰهُ الْیَوْمَ السَّابِعَ وَ قَدَّسَهُ لِأَنَّهُ اسْتَرَاحَ فِیْهِ مِنْ جَمِیْعِ عَمَلِهِ الَّذِیْ عَمِلَ اللّٰهُ خَالِقًا."

اس کے برعکس دین فطرت میں اسلامی عقیدہ کی وضاحت وصراحت قرآن مجید میں یوں ہے:

﴿ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ. ﴾ (۴۲/۱۱)

"یعنی اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ دیکھتا سنتا ہے۔"

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ أَیَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ. ﴾(۵۰/۳۸)

"اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو (مخلوقات) ان میں ہے سب کو چھ دن میں بنا دیا اور ہم کو ذرا بھی تھکان نہیں ہوا۔"

جمہور اہل علم کا نظریہ ہے کہ ان سابقہ کتب اور صحف میں لفظی ومعنوی دونوں قسم کی تحریف ہوئی ہے۔ اگر چہ بعض اہل علم صرف تحریف معنوی کے قائل ہیں لیکن کتاب وسنت سے دلائل و براہین پہلے مسلک کے مؤید۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ أَفَتَطْمَعُوْنَ أَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ وَقَدْ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ . ﴾ (۲/۷۵)

آیت ہذا کے حاشیہ پر مولانا فتح محمد جالندھری فرماتے ہیں:

"تحریف میں اختلاف ہے کہ کس قسم کی تھی بعض کہتے ہیں کہ لفظی تھی یعنی الفاظ بدل دیتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ معنوی تھی یعنی بگاڑ دیتے تھے۔ امام فخرالدین رازی رحمہ اللہ مؤخر الذکر کے قائل ہیں۔ بعض کہتے ہیں لفظی اور معنوی دونوں طرح کی تھی۔ بہرکیف جمہور اہل اسلام کتب یہود و نصاریٰ میں تحریف وتبدل کے قائل ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کو اس بات پر ناز ہے کہ ان کی آسمانی

کتاب میں تحریف نہیں ہوئی اور ہوسکتی بھی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت خود اپنے ذمے لی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ . ﴾ (الحجر:٩)

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِاللّٰهِ . ﴾ (البقرة:٧٩)

نیز فرمایا:

﴿ وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَّلْوُنَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ . ﴾ (آل عمران:٧٨)

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

﴿ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِه . ﴾ (النساء:٤٦)

اسفار خمسہ میں بھی اس پر کئی ایک شواہد موجود ہیں۔ جن کا انکار یہود کے لیے بھی ناممکن ہے۔

چنانچہ ان میں سے بعض اسفار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موت کی کیفیت اور تفصیل بھی بیان کی گئی ہے۔ جس کا کوئی عاقل اور دانش مند دعویٰ نہیں کر سکتا کہ موسیٰ علیہ السلام نے خود اپنے دست مبارک سے لکھا ہوگا اسی طرح یہود کا قول: ﴿ الْعُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ . ﴾ اور ﴿ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ . ﴾ (آل عمران:٧٥) تحریفات کی قبیل سے ہیں نیز ان میں انبیاء علیہم السلام پر بھی اتہامات اور الزامات کی ایک لمبی فہرست ہے۔ بالاختصار یہ کہ مثلاً حضرت یعقوب علیہ السلام نے کشتی میں اللہ تعالیٰ کو گرا لیا۔

حضرت لوط علیہ السلام نے شراب پی اور اپنی دونوں بچیوں سے جبل صغر میں جفتی کی۔

حضرت داوٗد علیہ السلام کا اللہ کے ہاں رتبہ اور مقام کم ہوگیا۔ یہ سب ان کتب میں تحریفات کے واضح شواہد ہیں۔

مزید آنکہ...... حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی تصنیف "إِغَاثَةُ اللَّهْفَانِ" میں تحریف تورات کے موضوع پر بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ مسئلہ ہٰذا میں تین اقوال ہیں:

① کل تورات یا اس کا اکثر حصہ محرف ومبدل ہے۔ حتیٰ کہ بعض نے غلو سے کام لیتے ہوئے اس کے اوراق کو ہی ردی قرار دیا ہے۔

② فقہاء ومحدثین اور متکلمین کی رائے ہے کہ تبدیلی صرف تاویل میں ہوئی، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ "کتاب التوحید" کے آخر میں اپنی صحیح میں فرماتے ہیں:

"يُحَرِّفُونَ يُزِيلُونَ، لَيْسَ أَحَدٌ يُزِيلُ لَفْظَ كِتَابٍ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ لٰكِنَّهُمْ يَتَأَوَّلُونَهُ عَلٰى تَأْوِيلِهِ." [1] (بخاری کتاب التوحید)

یعنی "کسی کو قدرت حاصل نہیں کہ کتاب اللہ سے ایک لفظ بھی تبدیل کر سکے۔ البتہ وہ لوگ اس کی غلط تفسیر کرتے تھے۔ اس قول کا ابتدائی حصہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔"

امام رازی رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتح الباری: ۱۳/ ۵۲۳-۵۲۶)

④ تورات میں ہلکی سی کمی بیشی ہوئی ہے۔ امام موصوف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہمارے شیخ یعنی امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے "اَلْجَوَابُ الصَّحِيْحُ لِمَنْ بَدَّلَ دِيْنَ الْمَسِيْحِ" میں اسی اصول کو پسند کیا ہے۔

راقم السطور کہتا ہے: مسئلہ ہذا پر مذکور کتاب میں درج ذیل عناوین قائم کیے گئے ہیں۔ جس سے بخوبی امام موصوف کے رجحان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

1 ...... فَصْلٌ فِي أَنَّ الْغَلَطَ إِنَّمَا وَقَعَ فِي التَّرْجَمَةِ. (الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جز ۲، ص ۱۶)

2 ...... فَصْلٌ فِيمَا حَدَثَ فِي التَّوْرَاةِ مِنْ تَغْيِيرٍ. (أیضا ۲/۱۸)

3 ...... فَصْلٌ فِيمَا حَدَثَ فِي الْإِنْجِيلِ مِنْ تَبْدِيلٍ. (أیضا: ۲/۲۰)

4 ...... فُصُلٌ فِي كَيْفِيَّةِ التَّغْيِيرِ الَّذِي حَدَثَ فِي الْإِنْجِيلِ. (أیضا: ۲/۱۶)

انجیل برنابا:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑا سا ذکر "برنابا" کا بھی ہو جائے۔ تاکہ مسیحی علماء کی "دیانت" اور آسمانی کتب کے ساتھ ان کے "حسن سلوک" کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے۔ "صحیفۂ اعمال" جو لوقا کی تصنیف بتایا جاتا ہے، کی متعدد نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ "برنابا" اولیں مسیحیت کے خاص ارکان و اعیان میں سے تھے۔ اس لیے مسیحیوں کا اس پر اجماع ہے کہ وہ مقدس بزرگ اور رسول تھے۔ اور ان پر روح القدس نازل ہوا تھا البتہ وہ انہیں حواری تسلیم نہیں کرتے اگرچہ ان کی انجیل انہیں حواری ثابت کرتی ہے۔ بہر حال وہ مرقس کے استاد اور پولس کے راہنما تھے۔ (ملاحظہ ہو: "اعمال" ۴، ۹، ۱۱ کی متعدد آیات)

---

[1] (۲۰۰) صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿ بل هو قرآن مجيد . في لوح محفوظ ﴾...... ﴿ يحرفون ﴾.

سولہویں صدی کے آخر میں ''برنابا'' کی انجیل دریافت ہوئی ، ہوا یوں کہ ایک لاطینی راہب کو اریانوس کے ایک خط کا پتہ چلا۔ جس میں پولس کی ان تحریروں کے بارے میں ناراضگی درج تھی جو اس نے برنابا کے حوالے سے لکھی تھیں۔ اس واقعہ نے انہیں انجیل ''برنابا'' کی کھوج میں لگا دیا۔ بالآخر پوپ اسا کاٹس پنجم کے کتب خانہ میں اس کا سراغ مل گیا۔ اس نے خفیہ طور پر اس کے مطالعہ کے بعد اسلام قبول کرلیا۔ یہ انجیل ایک علمی حقیقت ہے۔ اور اس کا ظہور و خفاء اور ترجمہ تاریخی طور پر ہوتا ہے۔ ۴۹۲ء میں بقول ڈاکٹر سعادت بک الأزھری اصحاب کلیسا نے اسے اپنے مقصد کے خلاف پا کر اس پر پابندی لگا دی تھی۔ اور اس کا مطالعہ ممنوع قرار دیا تھا۔

انجیل ''برنابا'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دیگر ''اناجیل اربعہ'' میں کس قدر تحریف کی گئی ہے، اس کی تعلیمات میں اللہ کو رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ اور خالق ارض و سما کہا گیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا نبی کہہ کر پولس کی تحریفات پر افسوس کا اظہار بھی کیا گیا ہے، وغیرہ۔

لفظ قرآن پر بحث:

لفظ قرآن : مصدر ہے۔ جس کا معنی ہے ''پڑھنا'' یہ اللہ عزوجل کی کتاب کا خاص نام ہے جو محمد ﷺ پر نازل کی گئی ، جبکہ کسی دوسری آسمانی کتاب کا بطور معروف نام قرآن نہیں ہے۔ نیز اس کا اطلاق قرآن کریم کے جز و کل سب پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔

وجہ تسمیہ:

قرآن کی وجہ تسمیہ کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں: کسی نے ''قرآن'' کا معنی ''جمع کرنا'' کیا ہے، چونکہ قرآن سابقہ کتب الٰہیہ کا حاصل اور مجموعہ ہے چنانچہ ''صحیح بخاری'' کے ''ترجمۃ الباب'' میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے:

" اَلْمُهَيْمِنُ الْأَمِيْنُ: اَلْقُرْاٰنُ أَمِيْنٌ عَلَى كُلِّ كِتَابٍ قَبْلَهُ. "[1]

یعنی'' قرآن ہر اس کتاب پر امین ہے جو اس سے پہلے تھی۔''

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے ''فتح الباری'' میں اس قول کی توجیہ یوں بیان کی ہے:

---

[1] (۲۰۱) صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، فی ترجمة الباب: کیف نزل الوحی و أول ما نزل.

" إِنَّ الْقُرْاٰنَ تَضَمَّنَ تَصْدِيْقَ جَمِيْعِ مَآ أُنْزِلَ قَبْلَهٗ إِلَّا أَنَّ الْأَحْكَامَ الَّتِيْ فِيْهِ إِمَّا مُقَرِّرَةٌ لِّمَا سَبَقَ وَ إِمَّا نَاسِخَةٌ ، وَ ذٰلِكَ يَسْتَدْعِي إِثْبَاتَ الْمَنْسُوْخِ وَ إِمَّا مُجَدِّدَةٌ ، وَ كُلُّ ذٰلِكَ دَالٌّ عَلٰى تَفْضِيْلِ الْمُجَدِّدِ ." (فتح الباری:۹/۴)

امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ نے مزید یوں اضافہ کیا ہے کہ قرآن تمام علوم کا مجموعہ ہے جبکہ ابوعبیدہ رقمطراز ہیں کہ سورتوں کا مجموعہ ہے۔

نزول قرآن:

قرآن کریم کا نزول اور اس کی تکمیل، رفتہ رفتہ ۲۳ سالوں میں ہوئی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنَاهُ تَنْزِيْلًا. ﴾ (بنی إسرائیل:۱۰۶)

" اور ہم نے قرآن کو جزو جزو کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سناؤ اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا ہے۔"

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيْلًا . ﴾ (الفرقان:۳۲)

" اور کافر کہتے ہیں کہ اس قرآن کو ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اتارا گیا اس طرح (آہستہ آہستہ) اس لیے (اتارا گیا) کہ اس سے تمہارے دل کو قائم رکھیں اور (اسی واسطے) ہم اس کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے رہے ہیں۔"

آیت ہذا کے تحت بعض مفسرین نے لکھا ہے: اس آیت میں دلیل ہے کہ دیگر آسمانی کتب یکمشت نازل ہوئیں تھیں۔ (أحکامُ الْقُرْاٰن لِأبی بکر ابن العربی)

قرآن مجید کے اس طرح تدریجاً اترنے کی علماء نے کئی حکمتیں بیان کی ہیں اور خود قرآن حکیم میں بعض کی طرف اشارات ملتے ہیں مثلاً:

۱) تاکہ لوگوں کو اچھی طرح یاد ہو جائے:﴿وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنَاهُ تَنْزِيْلًا﴾ (الإسراء:۱۰۶)

② تحدّی اور چیلنج کے لیے مثلاً پہلے اس جیسا قرآن لانے کا پھر دس سورتیں اور آخر میں اس جیسی صرف ایک سورت لانے کا چیلنج کیا۔ اور سورت سے مراد ہے وہ نظم قرآنی جس کی کم از کم تین آیات ہوں۔

③ آنحضرت ﷺ کے حفظ وفہم کی سہولت کے لیے:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ . إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَ قُرْآنَهُ .﴾ (سورۃ القیامۃ:۱۷)

''اور اے محمد! وحی کے پڑھنے کے لیے اپنی زبان نہ چلایا کرو کہ اس کو جلد یاد کرلو۔ اس کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمے ہے۔''

④ تاکہ واقعات وحوادث زمانہ کے ساتھ مطابقت ہو سکے۔

⑤ تاکہ شریعت کا بیک وقت بوجھ ڈالنے کی بجائے تدریجاً احکام نازل ہوں جن کو قبول کرنا آسان ہو۔

قرآن مجید کا نزول لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر رمضان المبارک میں شب قدر کو ہوا تھا۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ .﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''(روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ (ہے) جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا۔''

﴿ إِنَّآ أَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ .﴾ (الدخان:۳)

''کہ ہم نے اس (کتاب) کو مبارک رات میں نازل فرمایا۔''

﴿ إِنَّآ أَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ .﴾ (القدر:۱)

''ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل (کرنا شروع) کیا۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«أُنْزِلَ الْقُرْآنُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ إِلَى سَمَآءِ الدُّنْيَا جُمْلَةً وَاحِدَةً ثُمَّ أُنْزِلَ نُجُومًا.» (طبرانی)

رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر قرآنی وحی کا آغاز غار حراء میں ''سورۃ العلق'' کی ان ابتدائی آیات کے نزول کے ساتھ ہوا:

﴿ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ . خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ . اِقْرَأْ وَ رَبُّكَ الْأَكْرَمُ . الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ . عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ .﴾ (العلق:۱-۵)

''(اے محمد ﷺ) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو! جس نے (عالم کو) پیدا کیا۔ جس نے انسان

کوخون کی پھٹکی سے بنایا۔ پڑھو! اورتمہارارب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا اورانسان کووہ باتیں سکھائیں جس کا اس کوعلم نہ تھا۔''

بعدازاں تقریباً اڑھائی سال وحی منقطع رہی پھرسورہ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں اوروحی کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ملاحظہ ہو:(صحیح بخاری، باب بدء الوحی)

جمع وتدوین قرآن:

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جمع وتدوین قرآن کا کام دوطرح سے ہوتا تھا۔

حفظ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

" كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَالِجُ مِنَ التَّنْزِيْلِ شِدَّةً فَكَانَ يُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَهُ وَ شَفَتَيْهِ مَخَافَةَ أَنْ يَّنْفَلِتَ مِنْهُ يُرِيْدُ أَنْ يَّحْفَظَهُ ......أَنْزَلَ اللّٰهُ:﴿ لَاتُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ . إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَ قُرْآنَهُ ...... ﴾ أَنْ نَجْمَعَهُ فِيْ صَدْرِكَ." [1]

یعنی'' آنحضرت ﷺ قرآن اترتے وقت مشقت میں پڑ جاتے تھے پس جب بھی وحی اترتی تو آپ ﷺ اپنے لب ہلاتے رہتے اس لیے آپ ﷺ کوحکم ہوا کہ (وحی اترتے وقت) اس ڈر سے کہ مبادا بھول نہ جاؤ زبان نہ ہلایا کرو،اس کا تمہارے دل میں جما دینا اوراس کا پڑھا دینا ہمارے ذمے ہے۔ جب ہم اس کو پڑھا کریں (یعنی جبریل آپ ﷺ کو پڑھائے) تو جیسے جبریل پڑھ کر سنائے تم بھی اسی طرح پڑھا کرو، پھر یہ بھی ہمارا ہی کام ہے کہ ہم تمہاری زبان سے اس کو پڑھوا دیں گے یا اس کے معنی اورمطالب تجھ پرکھول دیں گے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کی اقتداء میں بصدشوق آیات قرآنیہ حفظ کرتے تھے حدیث میں ہے:

« إِنِّي لَأَعْرِفُ رُفْقَةَ الْأَشْعَرِيِّيْنَ بِالَّيْلِ حِيْنَ يَدْخُلُوْنَ وَأَعْرِفُ مَنَازِلَهُمْ مِنْ أَصْوَاتِهِمْ بِالْقُرْآنِ بِالَّيْلِ وَإِنْ كُنْتُ لَمْ أَرَ مَنَازِلَهُمْ حِيْنَ نَزَلُوْا بِالنَّهَارِ.» [2]

---

[1] (۲۰۲) صحيح البخاري، كتاب بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله ﷺ...... (٥) والتوحيد ﴿لاتحرك به لسانك﴾ (٧٥٢٤).

[2] (۲۰۳) صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب غزوة خيبر (٤٢٣٢) عن أبي موسى الأشعري. صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل الأشعريين رضي الله عنهم. (٦٤٠٧).

دوسری روایت میں ہے:

«خُذُوا الْقُرْآنَ مِنْ أَرْبَعَةٍ : عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ وَعَنْ سَالِمٍ وَمُعَاذٍ وَأُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ.» [1] (رواه البخاری)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طمع وحرص اور ممارست کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے معلم قرآن کا اہتمام فرماتے۔ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

«كَانَ الرَّجُلُ إِذَا هَاجَرَ دَفَعَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلٰى رَجُلٍ مِّنَّا لِيُعَلِّمَهُ الْقُرْآنَ بِمَكَانٍ يَسْتَمِعُ لِمَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ضَجَّةٌ بِتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ حَتّٰى أَمَرَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَخْفِضُوا أَصْوَاتَهُمْ لِئَلَّا يَتَغَالَطُوا.» [2] (بحواله مَنَاهِلُ الْعِرْفَان للزرقانی رحمه الله)

پھر وہ لوگ جو بئر معونہ میں شہید کر دیے گئے۔ ان کی تعداد ستر تھی اور وہ سب کے سب قراء تھے۔ [3] نیز علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" قُتِلَ يَوْمَ الْيَمَامَةِ سَبْعُوْنَ مِنَ الْقُرَّاءِ ." [4]

یعنی "جنگ یمامہ میں ستر قاری شہید ہوئے تھے۔"

کتابت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فریضہ کی اہمیت کے پیش نظر چند ایک جلیل القدر صحابہ کرام مثلاً حضرت

---

[1] (٢٠٤) صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب القراء من أصحاب النبی صلی اللّٰه علیه وسلم (٤٩٩٩) و (٣٨٠٨)، (٣٧٥٨).

[2] (٢٠٥) کان الرجل اذا هاجر...... الخ (الحاکم فی المستدرك ٣٥٦/٣ و قال الذهبی صحیح .

[3] (٢٠٦) بخاری کتاب المغازی باب غزوة الرجیع و رعل ...... و بئر معونة (٤٠٨٨)

[4] (٢٠٧) خلیفہ بن خیاط اپنی تاریخ (ص:١١٥) میں فرماتے ہیں کہ مہاجرین اور انصار میں سے کل (٥٨) آدمی شہید ہوئے۔ جمیع من استشهد من الانصار أربعة و ثلاثون رجلاً فجمیع ذلك من المهاجرین و الانصار ثمانیة و خمسون رجلاً ۔ اس کو امام ذہبی نے تاریخ اسلام (عہد خلفاء الراشدین ص:١٠٣ میں اور ابن کثیر نے البدایہ (٣٤٥/٦) میں نقل کیا اور ابن کثیر نے اتنا زیادہ کہا کہ بقیہ (٤٥٠) شہداء ان (صحابہ) کے علاوہ تھے۔ یعنی بقیة الاربع مائة والخمسین من غیرهم واللّٰه اعلم .

علی، معاویہ، ابی بن کعب، زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کو کاتب وحی مقرر کیا ہوا تھا۔ روایات شاہد ہیں کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم زید رضی اللہ عنہ کو حکم فرماتے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں جگہ رکھ دو۔ ❶

سور اور آیات کی ترتیب:

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں صرف آیات کی ترتیب تھی لیکن سورتوں کی ترتیب کا صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں اہتمام کیا گیا۔ شیخ مَنَّاعُ القَطَّان فرماتے ہیں:

" وَ قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْقُرْاٰنُ مَحْفُوْظٌ فِي الصُّدُوْرِ أَوْ مَكْتُوْبٌ فِي الصُّحُفِ عَلَى نَحْوِمَا سَبَقَ مُفَرَّقُ الْاٰيَاتِ وَالسُّوَرِ أَوْ مُرَتَّبُ الْاٰيَاتِ فَقَطْ وَ كُلُّ سُوْرَةٍ فِيْ صَحِيْفَتِهٖ عَلٰى حِدَةٍ۔" ملاحظہ ہو: مَبَاحِثُ فِي عُلُوْمِ الْقُرْآن ص ١٢٤)

علامہ بیہقی اور سیوطی رحمہما اللہ کا خیال یہ ہے: کہ "سورة البراءة" اور "سورة الانفال" کے علاوہ باقی سب سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَاب. یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور حیات میں قرآن مجید کو یکجا کرنے میں کیا امر مانع تھا؟ تو اس کے جواب میں امام ابوسلیمان خطابی رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں:

" يَحْتَمِلُ أَنْ يَكُوْنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّمَا لَمْ يَجْمَعِ الْقُرْاٰنَ فِي الْمُصْحَفِ لِمَا كَانَ يَتَرَقَّبُهٗ مِنْ وُرُوْدِ نَاسِخٍ لِبَعْضِ أَحْكَامِهٖ أَوْ تِلَاوَتِهٖ لَمَّا انْقَضٰى نُزُوْلُهٗ بِوَفَاتِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلْهَمَ اللّٰهُ الْخُلَفَاءَ الرَّاشِدِيْنَ ذٰلِكَ وَفَاءً لِوَعْدِ الصَّادِقِ بِضَمَانِ حِفْظِهٖ عَلٰى هٰذِهِ الْأُمَّةِ الْمُحَمَّدِيَّةِ زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا فَكَانَ ابْتِدَاءُ ذٰلِكَ عَلٰى يَدِ الصِّدِّيْقِ رضی الله عنه بِمَشُوْرَةِ عُمَرَ رضی الله عنه۔" ملاحظہ ہو: فتح الباری شرح صحیح البخاری للحافظ ابن حجر ١٢/٩)

یعنی "ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو اس لیے جمع نہ کیا ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آیات کی تلاوت یا احکام میں کسی بھی وقت نسخ کے منتظر رہتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا تھا خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ کے مشورے سے حضرت

---

❶ (٢٠٨) لم أجده؛لكن معناه في مسند الإمام أحمد ٢١٨/٤ (١٧٨٤٢)وقال محققه حمزة: إسناده حسن ،وهكذا قال الهيثمي(٤٨/٧). مجمع والسيوطي(٨٠/١-الإتقان)عن عثمان بن أبي العاص رضي الله عنه.

ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دست مبارک پر ہوا۔'' ❶

جمع قرآن عہد صدیق رضی اللہ عنہ اور عہد عثمان رضی اللہ عنہ میں :

قرآن مجید کے صحف میں جمع کرنے کا عمل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوا، چنانچہ انہوں نے کچھ تردد کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اشارہ پر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ انصاری کو اس کے جمع کرنے کا حکم دیا۔ ❷ یہ صحیفے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا کی تحویل میں چلے گئے۔ ❸ اس کے بعد حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی شکایت پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ۲۵ھ میں قرآن مجید کو یک جا کرنے کا فیصلہ کیا۔ ❹

حضرات ابوبکر اور عثمان رضی اللہ عنہما کے جمع میں فرق امام اِبن التِّین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" إِنَّ جَمْعَ أَبِیْ بَکْرٍ کَانَ لِخَشْیَةِ أَنْ یَذْهَبَ مِنَ الْقُرْاٰنِ شَیْئٌ بِذِهَابِ حَمَلَتِهٖ لِأَنَّهٗ لَمْ یَکُنْ مَجْمُوْعًا فِیْ مَوْضِعٍ وَاحِدٍ فَجَمَعَه فِیْ صَحَائِفَ مُرَتَّبًا لِاٰیَاتِ سُوَرِهٖ عَلٰی مَا وَقَّفَهُمْ عَلَیْهِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَ جَمْعُ عُثْمَانَ کَانَ لَمَّا کَثُرَ الْاِخْتِلَافُ فِیْ وُجُوْهِ الْقُرْاٰنِ حِیْنَ قَرَأُوْهُ بِلُغَاتِهِمْ عَلٰی اتِّسَاعِ اللُّغَاتِ فَأَدّٰی ذٰلِكَ بِبَعْضِهِمْ إِلٰی تَخْطِئَةِ بَعْضٍ فَخَشِیَ مِنْ تَفَاقُمِ الْأَمْرِ فِیْ ذٰلِكَ ،فَنَسَخَ تِلْكَ الصُّحُفَ فِیْ مُصْحَفٍ وَاحِدٍ مُرَتَّبًا سُوَرُهٗ ، وَاقْتَصَرَ مِنْ سَائِرِ اللُّغَاتِ عَلٰی لُغَةِ قُرَیْشٍ مُحْتَجًّا بِأَنَّهٗ نَزَلَ بِلُغَتِهِمْ إِنْ کَانَ قَدْ وُسِّعَ فِیْ قِرَائَتِهٖ بِلُغَةِ غَیْرِهِمْ رَفْعًا لِلْحَرَجِ وَالْمُشَقَّةِ فِیْ ابْتِدَاءِ الْأَمْرِ فَرَاٰی أَنَّ الْحَاجَةَ إِلٰی ذٰلِكَ انْتَهَتْ فَاقْتَصَرَ عَلٰی لُغَةٍ وَاحِدَةٍ وَ کَانَتْ لُغَةُ قُرَیْشٍ أَرْجَحَ اللُّغَاتِ فَاقْتَصَرَ عَلَیْهَا."

(فتح الباری ۱۲/۹)

" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قرآن کو جمع کرنا اس خوف سے تھا کہ کہیں حاملین قرآن کے دنیا سے اٹھ

---

❶(۲۰۹) صحیح البخاری ، کتاب فضائل القرآن ، باب جمع القرآن(۴۹۸۶).

❷(۲۱۰) ایضاً.

❸(۲۱۱) صحیح البخاری (۴۹۸۶).

❹(۲۱۲) ایضاً.

جانے کی وجہ سے اس کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو جائے۔ اس لیے کہ پہلے سے قرآن ایک جگہ جمع نہیں تھا۔ انہوں نے اس کو نبی اکرم ﷺ کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق آیات کی ترتیب کے ساتھ صحیفوں میں جمع کر دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جمع کرنا اس وقت تھا جب وجوہ قراءت میں زبانوں کی وسعت سے بہت سارا اختلاف پیدا ہوا۔ اس بنا پر بعض لوگ بعض کو غلطی پر قرار دینے لگے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خوف لاحق ہوا کہ کہیں معاملہ بڑھ نہ جائے۔ بنا بریں انہوں نے قرآن کو متعدد صحف کی بجائے سورتوں کی ترتیب کے ساتھ ایک مصحف میں جمع کر دیا اور سب زبانوں کی بجائے صرف لغت قریش کو کافی سمجھا کیونکہ قرآن کا نزول اسی زبان میں ہوا تھا۔ اگرچہ ابتداء میں (آسانی کے لیے) اور تنگی و مشقت کے رفع کی بنا پر دیگر زبانوں میں قرات کو روا رکھا گیا تھا۔ جب انہوں نے یقین کر لیا کہ اب چونکہ ضرورت پوری ہو چکی ہے اور سب سے اچھی زبان لغت قریش ہی ہے لہٰذا اسی پر ہی اکتفاء کر لیا۔‘‘

صحف اور مصحف میں فرق:

’’إِنَّ الصُّحُفَ : الْأَوْرَاقُ الْمُجَرَّدَةُ الَّتِیْ جُمِعَ فِیهَا الْقُرْآنُ فِیْ عَهْدِ أَبِیْ بَکْرٍ وَ کَانَتْ سُوَرًا مُفَرَّقَةً وَ کُلُّ سُوْرَةٍ مُرَتَّبَةٍ بِآیَاتِهَا عَلٰی حِدَةٍ لٰکِنْ لَمْ یُرَتَّبْ بَعْضُهَا اَثَرَ بَعْضٍ فَلَمَّا نُسِخَتْ رُتِّبَ بَعْضُهَا أَثَرَ بَعْضٍ صَارَتْ مُصْحَفًا.‘‘ (فتح الباری:۱۸/۹)

’’صحف‘‘: خالی اوراق کا نام ہے جن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں قرآن جمع کیا گیا تھا۔ یہ صرف آیات کی باہمی ترتیب کے ساتھ علیحدہ علیحدہ سورتیں تھیں لیکن سورتوں کی آگے پیچھے (موجودہ) ترتیب نہ تھی۔ جب ان کو نقل کر کے (موجودہ صورت میں) ترتیب دیا گیا تو وہ مصحف بن گیا۔‘‘

چنانچہ حضرت عثمان نے زید بن ثابت انصاری اور عبداللہ بن زبیر قریشی، سعید بن عاص اور عبدالرحمٰن بن حارث بن ہاشم (رضی اللہ عنہم) کو اس منصوبہ کی تکمیل پر مامور فرمایا اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر دی کہ اگر تمہارے اور زید کے درمیان رسم الخط میں اختلاف پیدا ہو جائے تو لغت قریش کو اختیار کیا جائے۔ اسی اثناء میں ایک مرتبہ لفظ ’’التابوت‘‘ کی ’’تا‘‘ کے بارے میں باہم اختلاف پیدا ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لہجہ قریش کے مطابق تائے مطولہ لکھنے کا حکم دیا:

" قَالَ ابْنُ شَهَابٍ:فَاخْتَلَفُوْا يَوْمَئِذٍ فِي التَّابُوْتِ وَالتَّابُوْهِ ،فَقَالَ الْقُرَشِيُّوْنَ: اَلتَّابُوْتُ، وَ قَالَ زَيْدٌ :اَلتَّابُوْهُ، فَرُفِعَ اخْتِلَافُهُمْ إِلَى عُثْمَانَ ،فَقَالَ:اُكْتُبُوْهُ التَّابُوْت، فَإِنَّهٗ نُزِّلَ بِلِسَانِ قُرَيْشٍ."❶ (فتح الباری : ۲۰/۹)

الغرض حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کے کئی ایک نسخے تحریر کروائے اور انہیں مختلف شہروں میں بھیجنے کا اہتمام کیا اور ایک نسخہ خاص طور پر اپنے لیے مخصوص رکھ لیا جسے "الامام" کہا جاتا ہے۔ مگر اب تک جو جدو جہد ہوئی تھی وہ قرآن کی صحت کی ضامن نہ تھی کیونکہ عجم کے اختلاط کی وجہ سے اس میں لحن پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے ضرورت تھی کہ قرآن کو لحن، تصحیف اور تحریف سے محفوظ کرنے کے لیے مزید اقدامات کئے جائیں، چنانچہ زیاد بن ابیہ نے ابواسود دُوَلی کو قرآن پر اعراب لگانے کا حکم دیا۔ تو انہوں نے انتہائی اہتمام سے اعراب کی تصحیح کی۔ ان کے بعد حجاج بن یوسف ثقفی نے قرآن پر نقط لگانے کی خدمت نصر بن عاصم کے سپرد کی جو اپنے وقت کے بہت بڑے نحوی اور قاری تھے۔ مگر اعراب اور نُقَطْ میں فرق کرنا مشکل تھا۔ کیونکہ اس وقت اعراب نقطوں کی صورت پر دیئے جاتے تھے۔ اس لیے اعراب کو سرخ سیاہی کے ساتھ ممتاز کیا گیا پھر بعد ازاں خلیل بن احمر نے اعراب اور نُقَطْ کو موجودہ شکل میں ترتیب دیا جس کے بعد سرخ سیاہی کے ذریعہ امتیاز کی ضرورت باقی نہ رہی۔ نیز حفاظت قرآن کا یہ سارا کام حکومت کے ذریعے انجام پایا۔ ارباب حکومت نے علمائے وقت کو اس کی دعوت دی تو انہوں نے بخوشی اس کام کو سرانجام دیا۔ مگر علماء نے صرف اس پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ بعد میں بھی حفاظت قرآن کے کام کو جاری و ساری رکھا۔ کلمات کی تصحیح کے لیے قواعد مرتب کئے، فقہی احکامات کا استنباط کیا اور مخارج حروف متعین کئے۔ جن علماء نے استنباط احکام پر زور دیا اور اس کے لیے کام کیا انہیں فقہاء کے لفظ سے پکارا گیا۔ اور جنھوں نے اعراب کی تصحیح کا اہتمام کیا انہیں نحوی کہا گیا اور جن علماء نے الفاظ کی تصحیح کا ذمہ لیا انہیں قُرّاء کہا گیا۔

چونکہ باری تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی اور قرآن کو آخری کتاب کے شرف سے نوازا۔ اس لیے حکمت و مصلحت کا تقاضا تھا کہ قرآن کریم تا قیامت محفوظ و مامون رہے۔ انسانی ہاتھ اس میں کسی قسم کی تغییر و تحریف پر جرأت نہ کرسکیں۔ اسی بنا پر اللہ رب العزت نے قرآن مجید کی حفاظت و صیانت خود اپنے ذمہ لی ہے۔ ارشاد ہے:

❶ (۲۱۳) تحفة الاخیار بترتیب شرح مشکل الآثار للطحاوی (۱۵۹/۸) (۵۸۰۴) و قال محققه اسناده صحیح.

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ إِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ .﴾ (الحجر:۹)

’’بیشک یہ (کتاب) نصیحت ہم نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی اعانت اور اس کے فضل و کرم سے اس میں روز قیامت تک زبر، زیر کا بھی فرق واقع نہیں ہو سکتا:

﴿ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ.﴾ (فصلت:۴۲)

’’اس (کتاب) پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے (اور) دانا (اور) خوبیوں والے (اللہ) کی اتاری ہوئی ہے۔‘‘

مقدمہ تفسیر ابن کثیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

" وَالَّذِىْ لَا إِلٰهَ غَيْرُهُ مَا نَزَلَتْ مِنْ آيَةٍ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ إِلَّا وَ أَنَا أَعْلَمُ فِيْمَنْ نَزَلَتْ وَ أَيْنَ نَزَلَتْ، وَلَوْ أَعْلَمُ بِكِتَابِ اللّٰهِ مِنِّىْ تَنَالُهُ الْمَطَايَا لَأَتَيْتُهُ ." ❶

یعنی ’’اللہ کی قسم جس کے سواء کوئی معبود برحق نہیں، میں ہر آیت کے بارے میں بخوبی جانتا ہوں کہاں نازل ہوئی اور کس بارے میں نازل ہوئی۔ اگر مجھے معلوم ہو کہ کتاب اللہ کا مجھ سے بڑا کوئی جاننے والا ہے تو میں رخت سفر باندھ کر اس کے پاس جانے کے لیے تیار ہوں۔‘‘

امام ابوعبدالرحمن السلمی رحمہ اللہ کا بیان ہے:

" حَدَّثَنَا الَّذِيْنَ كَانُوْا يُقْرِؤُوْنَنَا الْقُرْآنَ ، كَعُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ وَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا وَ غَيْرِهِمَا أَنَّهُمْ كَانُوْا إِذَا تَعَلَّمُوْا مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ عَشَرَ آيَاتٍ لَمْ يُجَاوِزُوْهَا حَتّٰى يَتَعَلَّمُوْا مَا فِيْهَا مِنَ الْعِلْمِ وَالْعَمَلِ، قَالُوْا: فَتَعَلَّمْنَا الْقُرْآنَ وَالْعِلْمَ وَالْعَمَلَ جَمِيْعًا." ❷

’’ہم سے ان لوگوں نے بیان کیا جو ہمیں قرآن پڑھاتے رہے ہیں، مثل عثمان بن عفان اور عبداللہ بن مسعود اور ان جیسے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے، کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جب قرآن کی دس

---

❶ (۲۱۴) صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب القراء من أصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (۵۰۰۲).

❷ (۲۱۵) ھکذا قال عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، انظر: الحاکم (۵۵۷/۱) (۲۰۴۷). وصححه ووافقه الذهبی وشعب الإیمان (۱۹۵۳) للبیهقی.

آیتیں سیکھ لیتے تو ساتھ ہی علم وعمل کی تعلیم بھی حاصل کر لیتے، کہتے ہیں کہ: اس طرح ہم نے قرآن اور علم وعمل سب کچھ ایک ساتھ سیکھ لیا۔''

پھر اس کتاب مطہرّ کو صرف کاغذوں کا محتاج نہیں رکھا بلکہ اس کو لوگوں کے دلوں میں استقرار بخشا جو کسی بھی الہامی کتاب کو نصیب نہ ہو سکا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ . ﴾ (العنكبوت:٤٩)

قرآن مجید کی کل آیات (قطع نظر از اختلاف روایات:٦٢٣٦)

کل الفاظ: ٧٧٤٤٠ اور کل حروف: ٣٢٣٦٧١ ہیں۔

جبکہ دوسری طرف علمائے یہود و نصاریٰ اپنی اصلی کتب کی نشاندہی سے بھی عاجز اور بے بس ہیں بلکہ اہل کتاب خود بھی اس بات کے معترف ہیں کہ اصل کتابیں ناپید ہیں۔

مذکورہ بالا بحث میں تین مشہور ومعروف الہامی کتابوں کا مفصل ذکر ہو چکا ہے۔ اب میں چاہوں گا کہ اختصار کے ساتھ ''زبور'' کا کچھ تذکرہ ہو جائے کیونکہ قرآن پاک میں ''زبور'' کا ذکر صراحت کے ساتھ متعدد مقامات پر موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ آتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا. ﴾ (بنی إسرائیل:٥٥) پھر یہ چار معروف آسمانی کتابوں میں سے ایک ہے۔

''زبور'' زبور وہ آسمانی کتاب ہے جو اللہ کے پیامبر حضرت داوٗد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔

لفظ ''زبور'' زبر سے ہے جس کے معنی لکھنے کے ہیں اور فَعُوْل کے وزن پر آتا ہے جو مفعول کے معنی میں ہے یعنی ''مَکْتُوب'' نیز یہ مفرد ہے اس کی جمع ''زُبُر'' ہے جیسے رسول کی جمع ''رُسُل'' ہے۔

امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''زبور'' وہ کتاب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت داوٗد علیہ السلام کو تعلیم فرمایا تھا۔ یہ ایک سو پچاس سورتوں پر مشتمل ہے جو تمام تر دعا وتحمید وتمجید اور حق تعالیٰ کی ثناء میں ہیں، ان میں حلال و حرام اور فرائض حدود مذکور نہیں۔ (تفسیر معالم التنزیل ٣/ ١٩٦، طبع بمبئی ١٢٧٦ء)

واضح رہے کہ موجودہ ''زبور'' کے بھی ایک سو پچاس ہی حصے ہیں جن کو اہل کتاب کی اصطلاح میں ''زبور'' کہا جاتا ہے۔ مگر یہ وہ اصلی ''زبور'' نہیں ہے جو حضرت داوٗد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی بلکہ محرّبین اہل کتاب نے اس کو بہت بدل ڈالا ہے چنانچہ موجودہ ''زبور'' خود اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ یہ سب ''مزبور'' حضرت داوٗد علیہ السلام کے نہیں ہیں کیونکہ ان میں اگر بعض پر حضرت داوٗد کا نام مذکور ہے تو بعض پر ''قورح'' کا جو نغمہ

سراؤں کا استاد تھا، اور بعض پر ''شوشینم کیسروں پر آصف'' کا، اور بعض پر ''گیتت'' کا اور بعض پر کسی کا نام نہیں ہے۔ نیز بعض مزبوروں میں ایسے واقعات کا تذکرہ ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام کے صدیوں بعد پیش آئے۔ (لغات القرآن)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "اَلْجَوَابُ الصَّحِيحُ لِمَنْ بَدَّلَ دِيْنَ الْمَسِيحِ" میں رقم طراز ہیں:

"وَ قَدْ رَأَيْتُ أَنَا مِنْ نُسَخِ الزَّبُوْرِ فِيْهِ تَصْرِيْحٌ بِنُبُوَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاسْمِهِ وَرَأَيْتُ نُسْخَتَهٗ أُخْرٰى بِالزَّبُوْرِ فَلَمْ أَرَ ذٰلِكَ فِيْهَا وَ حِيْنَئِذٍ فَلَا يَمْنَعُ أَنْ يَكُوْنَ فِيْ بَعْضِ النُّسَخِ مِنْ صِفَاتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لَيْسَ فِيْ أُخْرٰى ."

یعنی ''میں نے زبور کے چند نسخے دیکھے ہیں جن میں حضرت محمد ﷺ کے نام کے ساتھ نبوت کی تصریح موجود ہے اور زبور کا دوسرا نسخہ بھی دیکھا ہے جس میں یہ شی موجود نہیں، تو ممکن ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی صفات حمیدہ کا تذکرہ بعض نسخوں میں ہو اور بعض دوسرے نسخے اس سے خالی ہوں۔''

سوال: شیعہ کی نظر میں قرآن کریم کی کیا حیثیت ہے محرف ہے یا غیر محرف؟

جواب: اسلام کے زریں عہد اول سے لے کر آج تک ہر دور اور ہر زمانہ میں نسل درنسل مسلمانوں کا متفقہ طور پر اجماعی عقیدہ چلا آیا ہے کہ کتاب الٰہی ہر قسم کے حوادثات وتغیرات اور تبدیلیوں کے شائبوں سے محفوظ و مامون ہے۔

روئے زمین پر صرف شیعہ ایک ایسی مبہوت قوم ہے جس کے زعم باطل کے مطابق قرآن کریم اپنی اصلی شکل وصورت میں ہمارے درمیان موجود نہیں بلکہ اس کا کثیر حصہ دست برد زمانہ ہو چکا ہے۔ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذِهِ الْعَقِيْدَةِ الْفَاسِدَةِ.

درحقیقت شیعہ کوئی مستقل مذہب نہیں بلکہ انتقامی جذبہ پر مبنی ایک منفی تحریک کا نام ہے جس کی بنا شمع رسالت کے جانثاروں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے عداوت و دشمنی پر قائم ہے۔ یہ وہی عظیم ہستیاں ہیں جنہوں نے غلبۂ اسلام کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے شرق وغرب میں اسلامی پرچم کو لہرایا۔ ان کے ہاتھوں دشمنان اسلام کو شدید ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ بالخصوص یہود و نصاریٰ نے بری طرح ذلت آمیز شکستیں

کھائیں۔ عیسائیوں نے صلیبی جنگیں لڑ کر انتقامی جذبہ کو ٹھنڈا کیا مگر یہودیوں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میدان کارزار میں مسلم مجاہدین کا مقابلہ کر سکتے اس لیے انہوں نے زیر زمین سازشوں کے جال پھیلانے شروع کر دیئے جس کے نتیجہ میں ابتداءً سبائی ٹولہ نمودار ہوا۔

ان لوگوں نے عمائدین اسلام کے بارے میں عوام کے اذہان میں طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا کرنے کی مہم شروع کر دی۔ کاتبین وحی، حفاظ قرآن اور اس کی نشر واشاعت اور حفاظت کرنے والوں کے اعتماد کو مجروح کرنے کی سازش کی۔

اس سے ان کا اولیں مقصد اسلام کے بنیادی ماخذ قرآن مجید سے لوگوں کا اعتماد مجروح کرنا تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک پر اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کے لیے مثالی کردار کے حامل راویوں پر جرح وقدح کی مذموم اور ناکام سعی کرنا تھا تاکہ اس کے در پردہ متلاشیان حق کی راہیں مسدود ہو سکیں۔ جب اصلی ہیئت میں نہ کتاب وہی ہے اور نہ سنت، تو صحیح راہنمائی کہاں سے حاصل ہو؟

رفتہ رفتہ اس سازشی ٹولے نے ذخیرۂ احادیث کے مقابلے میں اقوال ائمہ کے نام سے کتابیں مرتب کیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو بدنام کرنے کے لیے خانوادۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم شخصیتوں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اختلاف، ان پر مظالم اور حق تلفیوں کے افسانے اس طریقے سے مشہور کیے کہ سادہ لوح مسلمان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

المختصر روافض کا یہ عقیدہ ہے کہ صحیح قرآن اس وقت ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ امام مہدی اسے لے کر غار میں چھپ گئے ہیں۔ (وہ مہدی جس کا وجود فی الواقع موہوم ہے) بقول شخصے ان کا ظہور اس وقت ہوگا جب ساری دنیا میں تین سو تیرہ ۳۱۳ پکے سچے شیعہ موجود ہوئے، چنانچہ شیعہ کی معتبر کتاب ''احتجاج طبرسی'' میں ہے:

" يَجْتَمِعُ إِلَيْهِ مِنْ أَصْحَابِهِ عِدَّةُ أَهْلِ بَدْرٍ ثَلٰثُ مِائَةٍ وَ ثَلٰثَةَ عَشَرَ رَجُلًا مِنْ أَقَاصِي الْأَرْضِ، أَنْ قَالَ: فَإِذَا اجْتَمَعَتْ لَهُ هٰذِهِ الْعِدَّةُ مِنْ أَهْلِ الْإِخْلَاصِ أَظْهَرَ اللّٰهُ أَمْرَهُ."

(ص ۱۲۳، طبع إیران)

یعنی ''امام مہدی رحمہ اللہ کے پاس اصحاب بدر کی گنتی برابر تین سو تیرہ مرد دنیا کے اطراف واکناف سے جمع ہو جائیں گے۔ جب مخلصین کی تعداد ہذا جمع ہو گی تو اس وقت اللہ تعالیٰ ان کی دعوت کو

غلبہ بخشے گا۔“

اب شیعہ حضرات کے لیے مقام غور ہے کہ صدیاں گزرنے کے باوجود آج تک اپنے میں مخلصین کی مذکورہ تعداد پیدا نہ کر سکے۔ جبکہ سید لطف اللہ صافی ایک شیعی عالم شیعہ کی تعداد دس ملین سے زائد کا دعویدار ہے۔ اس سے ہر ذی شعور انسان اندازہ کرسکتا ہے کہ آخراتنی کثرت کا شمار کس پلڑے میں ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان و اخلاص کو بھی تسلیم کیا گیا ہے جسے ان لوگوں نے خواہ مخواہ متنازع فیہ بنا چھوڑا ہے کیونکہ یہاں تین سو تیرہ کا عدد محض مدح وارد ہوا ہے۔

امام ابن حزم اندلسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

” وَ مِنْ قَوْلِ الْإِمَامِيَّةِ كُلِّهَا قَدِيمًا وَ حَدِيثًا أَنَّ الْقُرْآنَ مُبَدَّلٌ زِيدَ فِيهِ مَا لَيْسَ مِنْهُ وَ نُقِصَ مِنْهُ كَثِيرٌ وَبُدِّلَ مِنْهُ كَثِيرٌ. “ (اَلْمِلَلُ وَالنِّحَلُ ۱۲۸/٤ ،مکتبة المثنى بغداد)

”ہر دور میں سب امامیہ کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ قرآن میں ردو بدل ہوا ہے اس میں کچھ اضافے ہیں جو اصل میں نہیں اور بہت ساری کمی وبیشی اور تبدیلی ہوئی ہے۔“

اسی طرح عیسائیوں نے جب قرآن کی تبدیلی پر شیعہ کے قول سے دلیل و حجت لینے کی کوشش کی تو امام موصوف نے ان سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

” إِنَّ دَعْوَى الشِّيعَةِ لَيْسَتْ حُجَّةً عَلَى الْقُرْآنِ وَلَا عَلَى الْمُسْلِمِينَ لِأَنَّهُمْ لَيْسُوا مِنَّا وَلَسْنَا مِنْهُمْ. “ (الملل والنحل ۲/ ۷۸)

”شیعہ کے دعوٰی کو دلیل کے طور پر قرآن اور مسلمانوں کے خلاف پیش نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ان کا تعلق نہ ہمارے ساتھ ہے اور نہ ہمارا تعلق ان سے ہے۔ یعنی شیعہ مسلمان نہیں۔“

پھر یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس کا تذکرہ تمام شیعی کتب امہات المراجع: تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد وغیرہ میں باقاعدہ دلائل و براہین سے موجود ہے۔ کمال یہ ہے کہ موضوع ہذا پر مستقل ایک شیعی معتبر تصنیف موجود ہے جس کا نام ہی مسمّٰی پر واضح برہان ہے۔ نام ملاحظہ فرمائیں: (فَصْلُ الْخِطَابِ فِيْ إِثْبَاتِ تَحْرِيفِ كِتَابِ رَبِّ الْأَرْبَابِ لِنُوْرِيِّ الطَّبَرَسِيِّ)

علامہ محب الدین الخطیب اپنی شہرۂ آفاق کتاب ”الخطوط العريضة“ میں رقمطراز ہیں:

”حتی کہ وہ قرآن جو ہم اہل سنت کو اور ان کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا ایک جامع مرجع

ہے۔ ان شیعہ کے نزدیک اصول دین سرتا پا اس کی آیات کی تاویل پر اور ان معانی کے افکار پر قائم ہیں جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے نبی کریم ﷺ سے سمجھے اور ائمہ اسلام نے اس نسل سے سمجھے جس پر قرآن نازل ہوا۔ بلکہ ایک بڑے نجفی عالم نے اور وہ الحاج مرزا حسین بن محمد تقی نوری طبرسی ہے جس کی ۱۳۲۰ء میں وفات کے وقت شیعہ حضرات نے اتنی تعظیم وتکریم کی کہ اس کو نجف میں مشہد مرتضوی کی عمارت ''ایوان جوہ بانوں عظمی بنت سلطان ناصر دین اللہ'' میں دفن کیا اور یہ ''دیوان جوہ قبلیعہ'' نجف اشرف میں (باب قبلہ سے صحن مرتضوی کی طرف اندر دائیں جانب جوان کے نزدیک بہت مقدس جگہ ہے) اس نجفی عالم نے ۱۲۹۳ء کو نجف میں اس قبر کے پاس جو امام علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے ایک کتاب تالیف کی جس کا نام اس نے ''فَصْلُ الْخِطَابِ فِيْ إِثْبَاتِ تَحْرِيْفِ كِتَابِ رَبِّ الْأَرْبَابِ'' رکھا۔ جس میں اس نے مختلف زمانوں کے علماء شیعہ اور ان کے مجتہدین کی سینکڑوں نصوص جمع کیں کہ قرآن میں کمی بیشی کی گئی ہے۔ طبرسی کی یہ کتاب ایران میں ۱۲۸۹ء میں طبع ہوئی۔ اس کی طباعت کے وقت اس کے گرد ایک شور مچ گیا۔ کیونکہ شیعہ چاہتے تھے کہ قرآن کے بارے میں تشکیک ان کے خواص ہی تک محدود رہے اور ان کی سینکڑوں معتبر کتب میں ہی بکھری رہے۔ اور یہ سب کچھ ایک ہی کتاب میں جمع نہ ہو جس کے ہزاروں نسخے شائع ہوں اور ان کے مخالفین اس سے آگاہ ہوں۔ اور تمام لوگوں کی نظروں کے سامنے یہ ان کے خلاف حجت ثابت ہو۔ جب ان کے عقلاء نے یہ اعتراضات اور ملاحظات ظاہر کئے تو اس کتاب کے مؤلف نے اس بارے میں ان کی مخالفت کی۔ اور اس نے ایک اور کتاب تالیف کی جس کا نام اس نے ''رد بعض الشبهات عن فصل الخطاب في إثبات تحريف رب الأرباب'' رکھا۔ اور یہ دفاع اس نے اپنی آخری زندگی میں اپنی موت سے تقریباً دو سال پہلے لکھا۔ اور شیعہ حضرات نے اس کے یہ ثابت کرنے کی کوشش پر کہ قرآن محرف ہے۔ اسے یہ بدلہ دیا کہ نجف میں مشہد علوی رضی اللہ عنہ کی ایک ممتاز جگہ میں اسے دفن کیا۔ اور یہ نجفی عالم قرآن میں نقص وارد ہونے کے متعلق جو استشہاد کرتا ہے اور اقتباس لاتا ہے اس کا ذکر اس نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۸۰ پر ایک سورت سے کیا ہے جسے شیعہ ''سورۃ الولایۃ'' کہتے ہیں، جس میں ولایت علی رضی اللہ عنہ مذکور ہے:

" يَـٰأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا بِالنَّبِيِّ وَالْوَلِيِّ بَعَثْنَاهُمَا يَهْدِيَانِكُمْ إِلَى الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِيمِ."

چند سطور بعد فرماتے ہیں:

''جس طرح اس نجفی عالم نے ''سورۃ الولایۃ'' سے یہ استشہاد کیا ہے کہ قرآن محرف ہے۔ اسی طرح کتاب (الکافی) جو شیعہ کے نزدیک وہی درجہ رکھتی ہے جو مسلمانوں کے نزدیک ''صحیح البخاری'' کا ہے، اس کی ایرانی طبع ۱۲۷۸ھ کے صفحہ ۲۸۹ پر درج ذیل عبارت سے استشہاد کیا ہے۔''

" رَوٰى عِدَّةٌ مِّنْ أَصْحَابِنَا عَنْ سَهْلِ بْنِ زِيَادَةَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سُلَيْمَانَ عَنْ بَعْضِ أَصْحَابِهِ عَنْ أَبِي الْحَسَنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ (أَيْ أَبُوالْحَسَنِ الثَّانِيّ عَلِيُّ بْنُ مُوسَى الرِّضَا الْمُتَوَفَّى سَنَةَ ٢٠٦ھـ ،قَالَ: قُلْتُ لَهُ: جَعَلْتُ فِدَاكَ أَنَّا نَسْمَعُ الْآيَاتِ فِي الْقُرْآنِ لَيْسَ هِيَ عِنْدَنَا كَمَا نَسْمَعُهَا وَلَا نَحْنُ أَنْ نَقْرَأَهَا كَمَا بَلَغَنَا عَنْكُمْ فَهَلْ نَأْثَمُ؟ فَقَالَ: لَا، اِقْرَأُوا كَمَا تَعَلَّمْتُمْ فَسَيَجِيئُكُمْ مَنْ يُعَلِّمُكُمْ."

''ہمارے متعدد اصحاب نے سہل بن زیاد سے اس نے محمد بن سلیمان سے اس نے اپنے بعض اصحاب سے اس نے ابوالحسن (یعنی ابوالحسن ثانی علی بن موسیٰ رضا متوفی ۲۰۶ھ) سے روایت کیا۔ کہا میں نے اس سے کہا میں آپ پر قربان، ہم قرآن میں آیات سنتے ہیں جو ہمارے ہاں (قرآن میں) ایسی نہیں جیسی کہ ہم سنتے ہیں اور نہ ہم ان کی اچھی طرح سے تلاوت ہی کر سکتے ہیں جس طرح کہ آپ سے ہمیں پہنچی ہیں تو کیا ہم گناہ کا کام کرتے ہیں؟ تو اس نے کہا: نہیں، جس طرح تم نے سیکھا ہے پڑھتے رہو۔ جلد ہی تمہارے پاس وہ آئے گا جو تمہیں تعلیم دے گا۔''

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ یہ کلام شیعہ نے علی بن موسیٰ رضا کے بارے میں گھڑا ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے ہاں یہ فتویٰ ہے کہ جو اس طرح قرآن پڑھے کہ جس طرح لوگ مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں سیکھتے ہیں وہ گنہگار نہیں ہوتا۔ ویسے شیعہ کے خاص لوگ مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں سیکھتے ہیں وہ گنہگار نہیں ہوتے۔ لیکن شیعہ کے خاص لوگ مصحف عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک دوسرے کو بتاتے رہتے ہیں کہ اصل قرآن یہ نہیں بلکہ وہ اور ہے جو موجود ہے یا ان کے ائمہ اہل بیت کے پاس موجود تھا۔ ان

کے اس مزعومہ قرآن کے درمیان جسے وہ راز داری سے ایک دوسرے کو بتاتے ہیں اور تقیہ کے عقیدہ پر عمل کرتے ہوئے اس کا برملا اظہار نہیں کرتے اور اس مصحف عثمانی کے درمیان وہی تقابل ہے جسے حسین بن محمد تقی نوری طبرسی نے اپنی کتاب: "فَصْلُ الْخِطَابِ فِی إِثْبَاتِ تَحْرِیْفِ کِتَابِ رَبِّ الْأَرْبَابِ" میں جمع کیا ہے۔

یہ کتاب ان کے علماء کی سینکڑوں نصوص پر مشتمل ہے جو ان کی معتبر کتب میں موجود ہیں۔جن سے ثابت ہوتا ہے کہ شیعہ قرآن میں تحریف پر پختہ ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں چاہتے کہ قرآن کے بارے میں ان کے اس عقیدہ پر کوئی شورش و ہنگامہ برپا ہو۔

نوری طبرسی نے "مسئلہ امامت" پر بحث کرتے ہوئے فصل الخطاب ۲۱۶ طبع ایران میں امام جعفر صادق رحمہ اللہ کا فرمان تحریر کیا ہے:

"لَوْ تُرِكَ الْقُرْاٰنُ كَمَا أُنْزِلَ لَأَلْفَيْتَنَا فِيْهِ مُسَمَّيْن."

یعنی "اگر قرآن اس طرح چھوڑا جاتا جیسے نازل کیا گیا تھا تو اے مخاطب !تو ہمیں اس میں نام بنام پاتا۔"

نیز تفسیر "صافی" میں مقدمہ سادسہ کے تحت ص ۲۵ پر ہے:

"لَوْلَا زِيْدَ فِي الْقُرْاٰنِ وَ نُقِصَ مَا خَفِيَ حَقُّنَا عَلٰى ذِيْ حِجٰى."

امام باقر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر قرآن میں بڑھایا اورگھٹایا نہ گیا ہوتا تو ہمارا حق (یعنی امامت) کسی ذی عقل پر پوشیدہ نہ رہتا۔"

کلینی نے اپنی "الکافی" میں اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے:

" إِنَّ الْقُرْاٰنَ الَّذِيْ جَاءَ بِهٖ جِبْرَائِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِلٰى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَبْعَةَ عَشَرَ أَلْفَ آيَةٍ." (كِتَابُ فَضْلِ الْقُرْاٰنِ: ۶۳۴/۲)

"یعنی وہ قرآن جسے لے کر جبرائیل علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے وہ سترہ ہزار آیات پر مشتمل تھا۔"

جبکہ یہ بات معروف ہے کہ قرآن کریم کی کل ۶۶۶۶ آیات ہیں۔اس کا معنی یہ ہے کہ دو تہائی قرآن پاک ہوا کی نذر ہو گیا اور موجودہ صرف ایک تہائی ہے۔کلینی نے باقاعدہ اپنی "کافی" میں اس بات کی

صراحت کی ہے اور اس کے اثبات کے لیے ایک مستقل تبویب قائم کی ہے:

''بَابُ ذِكْرِ الصَّحِيفَةِ وَالْجَفْرِ وَالْجَامِعَةِ وَ مُصْحَفِ فَاطِمَةَ عَلَيْهَا السَّلَامُ''

اس کے تحت جو روایت بیان ہوئی ہے کافی تفصیلی ہے۔ چند فقروں کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''پھر امام نے فرمایا: ہمارے پاس مصحف فاطمہ ہے۔ اور لوگوں کو کیا معلوم کہ مصحف فاطمہ کیا چیز ہے! فرمایا وہ مصحف ہے جو تمہارے قرآن سے تین گنا زیادہ ہے اور اللہ کی قسم تمہارے اس قرآن کا ایک حرف بھی اس میں نہیں ہے۔ بلکہ عبارت ہذا تو اس بات کی مؤید ہے کہ موجودہ مصحف کلی طور پر مصحف فاطمہ سے مختلف ہے جس کا حجم مؤلف ''کافی'' نے ستر ہاتھ لمبا بیان کیا ہے۔''

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ روافض کا موجودہ قرآن پر کس حد تک یقین و ایمان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیعہ کے نزدیک موجودہ قرآن کی شرعی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر کوئی بات بادل نخواستہ مسلّمہ یا قابل اعتراف ہے تو وہ صرف تقیہ کے طور پر جو دراصل جھوٹ سے تعبیر ہے۔

شاید کسی کو تردد لاحق ہو جب تمام مسلمانوں کا ایمان ہے کہ قرآن غیر محرف ہے۔ آخر شیعہ کو کیا تکلیف ہے اسے غیر محرف کیوں تسلیم نہیں کرتے۔ اصلاً اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ امر مسلّمہ ہے کہ جامع قرآن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں، جب یہ لوگ حضرات شیخین کے ایمان کی حقیقت کو تسلیم کرنے سے قاصر ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کے جمع شدہ قرآن پر ایمان لے آئیں، اگر اسے تسلیم کریں تو حضرات موصوفین کی دیانت و امانت بھی تسلیم کرنی پڑتی ہے، جو ان کی عقول نحیفہ سے بالا ترشے ہے۔(أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِي لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَ أَتُوبُ إِلَيْهِ وَ أَنْ يُلْهِمَنَا حُبَّ الرَّسُولِ وَ أَهْلِ بَيْتِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ، اٰمِيْنَ يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ!)

سوال: شرعی اعتبار سے نبی اور رسول میں کیا فرق ہے؟

جواب: رب العزت نے اشرف المخلوقات میں سے جس برگزیدہ کو منتخب فرما کر کائنات کی راہنمائی اور رشد و ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا۔ شرعی اصطلاح میں وہ ''انبیاء ورسل اللہ'' کے القاب سے موسوم ہیں۔

نبی اور رسول میں فرق کی وضاحت:

نبی اور رسول کے مابین کیا نسبت ہے۔ اس بارے میں اہل علم کی مختلف آراء ہیں:

① یہ دونوں مساوی ہیں۔ یعنی ''ہر نبی رسول ہے اور ہر رسول نبی ہے۔''

② یہ دونوں مُتَبَایِنَیْن ہیں۔ یعنی ''رسول وہ ہے جو جدید شرع لے کر آئے اور نبی وہ ہے جو جدید شرع لے کر نہ آئے۔ پس کوئی رسول نبی نہیں اور کوئی نبی رسول نہیں لیکن یہ قول غیر درست ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق صاف تصریح ہے:

﴿ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا . ﴾ (مریم:٥٤)

''اور وہ رسول نبی تھا۔''

اور اس طرح اس سے پہلے ''سورۃ مریم'' میں ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں بھی یہی الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

③ ان دونوں کے مابین عموم خصوص مطلق ہے۔ اکثر علماء کی یہی رائے ہے۔

لیکن بعض کے نزدیک رسول ''اعم'' ہے اور نبی ''اخص'' کیونکہ رسول فرشتہ بھی ہوتا ہے اور انسان بھی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ . ﴾ (الحج:٧٥)

''اللہ تعالیٰ فرشتوں اور انسانوں میں پیغام رساں چن لیتے ہیں۔''

اور نبی صرف انسان ہی ہوتا ہے۔ فرشتہ نہیں، پس ہر رسول نبی ہوا، لیکن ہر نبی رسول نہیں۔ کیونکہ بعض رسول فرشتے ہیں۔

اور جمہور کا یہ قول ہے کہ ''نبی اعم اور رسول اخص'' پس ہر رسول نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں، مگر اس صورت میں نبی اور رسول میں کیا فرق ہوگا۔ اور ان کی شرعی تعریف کیا ہوگی؟ اس سلسلہ میں اقوال مختلف ہیں:

حضرت شاہ عبدالقادر نے ''موضح القرآن'' میں ''سورۃ مریم'' کی تفسیر میں جمہور کی ترجمانی یوں کی ہے۔''

جن کو اللہ کی طرف سے وحی آئے وہ نبی ہیں اور ان میں جو خاص امت یا کتاب رکھتے ہیں وہ رسول ہیں۔

علامہ بیضاوی اپنی معروف تفسیر ''انوار التنزیل'' (٢/٢١٠) میں رقمطراز ہیں:

''رسول وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے شریعت جدیدہ دے کر مبعوث فرمایا ہو کہ وہ لوگوں کو اس کی دعوت دے اور نبی اس کو بھی عام ہے اور اس کو بھی جس کو شرع سابق برقرار رکھنے کے

لیے بھیجا گیا ہو۔ جیسے وہ انبیاء بنی اسرائیل جو حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مابین ہوئے ہیں۔"

شرح فقہ اکبر میں منقول ہے:

"زیادہ مشہور فرق، جو ان دونوں کے مابین ہے وہ یہ کہ نبی رسول سے اعم ہے، کیونکہ رسول وہ ہے، جو تبلیغ پر مامور ہو اور نبی وہ ہے جس کی طرف وحی کی جائے، خواہ وہ تبلیغ پر مامور ہو یا نہ ہو۔" ❶

مسئلہ ہذا پر شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے "كتابُ النُّبُوَّات" ❷ میں بڑی عمدہ اور نفیس بحث کی ہے۔ قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں۔ فرماتے ہیں:

"نبی وہ ہے جس کو اللہ بتلاتا ہے اور جو کچھ اللہ بتلاتا ہے اس کو ہی بتلاتا ہے اب اگر اسی کے ساتھ وہ ایسے شخص کی طرف بھیجا گیا، جو کہ حکم الٰہی کا مخالف ہے تاکہ اس کو اللہ تعالیٰ کے پیغام کی تبلیغ کرے، تو وہ رسول ہے، لیکن اگر اس صورت میں کہ وہ پہلی ہی شریعت پر عامل ہے اور کسی کی طرف اس کو بھیجا نہیں گیا۔ جسے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام پہنچائے، تو وہ نبی ہوگا۔ رسول نہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن قَبۡلِكَ مِن رَّسُولٖ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّآ إِذَا تَمَنَّىٰٓ أَلۡقَى ٱلشَّيۡطَٰنُ فِيٓ أُمۡنِيَّتِهِۦ ﴾ (الحج:٥٢)

"اور نہیں بھیجا ہم نے پہلے تجھ سے کوئی رسول اور نہ نبی مگر جس وقت کہ آرزو کرتا تھا، ڈال دیتا تھا، شیطان اس کی آرزو میں۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ارسال کا ذکر فرما کر جو ہر دو نوع کو عام ہے۔ ان میں سے ایک کو بایں طور پر خاص کیا ہے کہ وہ رسول ہے اور یہی وہ رسول مطلق ہے جو اللہ کے مخالفوں کی طرف تبلیغ رسالت پر مامور ہے۔ جیسے حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ وہ پہلے رسول ہیں، جو اہل زمین کی طرف مبعوث ہوئے ❸ اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تھے وہ انبیاء تھے جیسے حضرت

---

❶ (٢١٦) شرح فقہ اکبر ص ٦٠ ط. قدیمی کتب خانہ کراچی.

❷ (٢١٧) رقم الفصل (١٧)، النبوة والرسالة (٢٨١ إلى ٢٨٣).

❸ (٢١٨) صحيح البخاري، كتاب أحاديث الأنبياء، باب قول الله عزوجل ﴿ولقد أرسلنا نوحا إلى قومه﴾ (٣٣٤٠).

شیث علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام اور ان دونوں سے بھی پہلے حضرت آدم علیہ السلام، جو نبی مکلّم تھے (یعنی ان سے حق تعالیٰ نے کلام فرمایا تھا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے مابین دس قرن گزرے ہیں۔ ❶ جو سب کے سب اسلام پر تھے۔ ان انبیاء پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی تھی جس پر یہ خود بھی عمل پیرا ہوتے تھے اور ان مومنوں کو بھی حکم فرماتے تھے جو ان کے پاس تھے کیونکہ وہ سب ان پر ایمان رکھتے تھے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ ایک شریعت والے ان تمام باتوں کو مانتے ہیں جن کی علماء رسول کی طرف سے تبلیغ کرتے ہیں اور یہی حال انبیاء بنی اسرائیل کا ہے کہ یہ شریعت تورات کے مطابق حکم کرتے تھے۔ گو ان میں سے کسی کی طرف ایک معین واقعہ میں خاص وحی بھی کی جاتی تھی تاہم شریعت تورات میں ان کی مثال اس عالم کی سی ہے جس کو اللہ عزوجل کسی قضیہ میں ایسے معنی سمجھا دیں، جو مطابق قرآن ہوں۔

جیسے کہ اللہ جل شانہٗ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو قضیہ کا حکم سمجھایا جس پر انہوں نے اور حضرت داوٗد علیہ السلام نے فیصلہ کیا تھا۔ پس انبیاء علیہم السلام کو تو اللہ تعالے بتلاتا اور ان پر امر و نہی اور خبر سے ان کو مطلع فرماتا ہے او وہ ان لوگوں کو، جو ان پر ایمان لاتے ہیں اللہ عزوجل کی طرف سے جو کچھ نازل ہوتا ہے، پہنچاتے ہیں۔ پھر اگر کفار کی طرف بھی رسول مبعوث ہوئے، تو وہ ان کو بھی توحید الٰہی اور اس وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں۔ نیز یہ ضروری ہے کہ رسولوں کی ایک قوم تکذیب کرے۔ اللہ عزوجل فرماتے ہیں:

﴿كَذَٰلِكَ مَآ أَتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ﴾

(الذاریات:٥٢)

”اسی طرح اس سے پہلے لوگوں کے پاس جو رسول آیا، تو انہوں نے یہی کہا کہ جادوگر ہے یا دیوانہ۔“

نیز یہ بھی ارشاد ہے:

﴿مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِن قَبْلِكَ .﴾ (حم السجدة:٤٣)

”تجھ سے وہی کہیں گے، جو سب رسولوں سے تجھ سے پہلے کہہ دیا ہے۔“

وجہ یہ ہے کہ رسول مخالفوں ہی کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔ اسی لیے ان کی ایک جماعت ان کو جھٹلاتی

---

❶ (٢١٩) تاريخ الأمم والملوك (١/١١١) للطبری عن ابن عباس، وإسناده صحيح. وعن قتادة هكذا.

ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِيٓ إِلَيْهِم مِّنْ أَهْلِ الْقُرَىٰٓ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ اتَّقَوْا أَفَلَا تَعْقِلُونَ . حَتَّىٰٓ إِذَا اسْتَيْأَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوٓا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَن نَّشَآءُ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ . ﴾ (یوسف:۱۱۰)

''اور ہم نے جتنے بھیجے تجھ سے پہلے یہی مرد تھے بستیوں کے رہنے والوں سے۔ سو کیا یہ لوگ نہیں پھرے ملک میں کہ دیکھ لیتے کیسا ہوا انجام ان کا، جو ان سے پہلے تھے اور پرہیز گاروں کے لیے تو پچھلا گھر بہتر ہے۔ کیا اب بھی تم نہیں سمجھتے۔ یہاں تک کہ جب نا امید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا۔ پہنچی ان کو مدد ہماری پھر جس کو چاہا ہم نے بچا لیا اور نہیں پھیری جاتی گنہگار قوم سے آفت ہماری۔''

اور فرمایا:

﴿ إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ﴾ (غافر:۵۱)

''ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگانی میں اور جس دن کھڑے ہوں گے گواہ۔''

اور ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ . ﴾ (الحج:۵۲)

میں اس امر کی دلیل ہے کہ نبی بھی مرسل ہی ہوتا ہے، لیکن اطلاق کے وقت وہ رسول سے موسوم نہیں ہوگا، کیونکہ وہ کسی قوم کی طرف ایسی باتیں لے کر نہیں بھیجا گیا کہ جن سے وہ واقف نہ ہو، بلکہ اہل ایمان کو ان باتوں کا حکم دیتا ہے، جن کے حق ہونے کو وہ جانتے ہیں اور نبی کی یہ نوعیت ایک عالم کی سی ہے اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

« اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ.» [1]

---

[1] (۲۲۰) صححه ابن حبان والألباني. صحيح أبي داؤد، كتاب العلم، باب فضل العلم (۳٦٤۱). الترمذي (۲۸۳۵). ابن ماجه (۲۲۳). ابن حبان (۸۸)، وقال محققه - الأرناؤوط -: " حسن "، وهكذا قال حمزة، انظر: أحمد (۱۹٦/۵).

''علماء انبیاء کے وارث ہیں۔''

نیز رسول کے لیے یہ شرط بھی نہیں کہ وہ شریعت لے کر آئے۔ کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام باوجود رسول ہونے کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر تھے نیز حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام دونوں ہی رسول تھے اور شریعت تورات پر تھے۔ حق تعالیٰ مؤمنِ آل فرعون کی زبانی فرماتے ہیں:

﴿ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهِ حَتَّى إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا . ﴾ (غافر:٣٤)

''اور تحقیق آ چکا ہے تمہارے پاس یوسف علیہ السلام اس سے پہلے کھلی باتیں لے کر۔ پھر تم دھوکے ہی میں رہے ان چیزوں سے جو وہ لایا۔ یہاں تک کہ جب مر گیا، تو تم کہنے لگے اللہ اس کے بعد ہرگز کوئی رسول نہ بھیجے گا۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ إِنَّآ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَى نُوحٍ وَّالنَّبِيِّيْنَ مِنْ بَعْدِهِ وَ أَوْحَيْنَآ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَ إِسْمٰعِيلَ وَ إِسْحٰقَ وَ يَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَ عِيسٰى وَ أَيُّوبَ وَ يُونُسَ وَ هَارُونَ وَ سُلَيْمَانَ وَ آتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا . وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَ كَلَّمَ اللَّهُ مُوسٰى تَكْلِيمًا . ﴾ (النساء:١٦٣-١٦٤)

''ہم نے وحی بھیجی تیری طرف جیسے وحی کی نوح علیہ السلام پر اور ان نبیوں پر، جو اس کے بعد ہوئے۔ اور وحی نازل کی ابراہیم اور اسماعیل پر اور اسحاق اور یعقوب پر اور اس کی اولاد پر اور عیسیٰ پر اور ایوب پر اور یونس پر اور ہارون پر اور سلیمان پر اور ہم نے دی داؤد کو زبور، (علیہم السلام) اور بھیجے ایسے رسول جن کے احوال ہم نے سنائے تجھ کو اس سے پہلے اور ایسے رسول جن کے احوال تجھ کو نہیں سنائے۔ اور باتیں کیں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے بول کر۔''

اور ''ارسال'' اسم عام ہے، جو ارسالِ ملائکہ، ارسالِ ریاح، ارسالِ شیاطین اور ارسالِ نار سب پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ ﴾ (الرحمٰن:٣٥)

''بھیجے جاتے ہیں تم پر آگ کے شعلے اور تانبا پگھلا ہوا۔''

اور ارشاد ہے:

﴿ جَاعِلِ الْمَلَائِکَةِ رُسُلًا أُولِیْٓ أَجْنِحَةٍ . ﴾ (فاطر:۱)

''جس نے ٹھہرائے فرشتے پیغام لانے والے جن کے ''پر'' ہیں۔''

یہاں سب فرشتوں کو رسول قرار دیا گیا ہے۔ اور لغت میں اس کو کہتے ہیں جو رسالت کا حامل ہو۔ اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلَائِکَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ . ﴾ (الحج:۷۵)

''اللہ تعالیٰ چھانٹ لیتے ہیں فرشتوں اور آدمیوں میں پیغام پہنچانے والے۔''

اور یہ وہ ہیں جن کو وحی دے کے بھیجتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ أَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْیًا أَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ أَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِإِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ . ﴾ (الشوریٰ:۵۱)

''اور کسی آدمی کے بس کی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے سوائے اشارے کے، یا پردے کے پیچھے سے، یا بھیج دے کوئی پیغام لانے والا۔ پھر پہنچا دے اس کو جو وہ چاہے۔''

اور فرمایا:

﴿ وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیَاحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ . ﴾ (الأعراف:۵۷)

''اور وہی ذات ہے کہ چلاتی ہے ہوائیں، خوشخبری لانے والی مینہ سے پہلے۔''

اور فرمایا:

﴿ إِنَّـآ أَرْسَلْنَا الشَّیَاطِیْنَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا . ﴾ (مریم:۸۳)

''اور چھوڑ رکھے ہیں ہم نے شیطان منکروں پر، اچھالتے ہیں ان کو ابھار کر۔''

لیکن جب لفظ ''رسول'' اللہ کی طرف مضاف ہو، اور ''رسول اللہ'' کہا جائے، تو اس سے یہی مراد ہو گا۔ جو اللہ کی طرف سے پیغام لے کر آئے، خواہ وہ فرشتہ ہو، خواہ بشر، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلَائِکَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ . ﴾ (الحج:۷۵)

اور فرشتے کہتے ہیں:

﴿ یَا لُوْطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنْ یَّصِلُوْٓا إِلَیْکَ . ﴾ (هود:۸۱)

''اے لوط! ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں، وہ تجھ تک ہرگز نہ پہنچ سکیں گے۔''

جب کہ فرشتوں، ہواؤں اور جنوں کا ارسال کسی فعل کی انجام دہی کے لیے ہوتا ہے۔ تبلیغ رسالت کے لیے نہیں، اللہ فرماتا ہے:

﴿ اُذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا . ﴾ (الأحزاب:۹)

''یاد کرو اللہ کا احسان، جب تم پر فوجیں چڑھ آئیں۔ پس بھیج دی ہم نے ان پر ہوا اور وہ فوجیں، جو تم نے نہیں دیکھیں اور اللہ دیکھنے والا ہے، جو کچھ تم کرتے ہو۔

پس اللہ کے جو رسول اس کی طرف سے امرونہی کی تبلیغ کرتے ہیں عندالاطلاق یہی اللہ کے رسول ہیں۔

الغرض! امام موصوف کے نزدیک، جس کو اللہ کی طرف سے وحی آئے اور وہ مؤمنین ہی کو احکام الٰہی کی تعلیم دے وہ نبی ہے اور جس کی دعوت کافروں کے لیے بھی عام ہو، تو وہ رسول ہے۔

نبوت وہبی شے ہے:

یہ بھی یاد رہے کہ نبوت کا معنائے حقیقی شریعت میں یہ ہے کہ: مَنْ حصلَتْ لَهُ النُّبُوَّةُ جسے (اللہ کی طرف سے) نبوت مل جائے۔

نبوت کا حقیقی تعلق نہ تو نبی کے جسم سے وابستہ ہوتا ہے اور نہ اس کی حالتوں میں سے کسی حالت کے ساتھ بلکہ نبی ہونے کی حیثیت سے اس کا تعلق اس کے علم سے بھی نہیں ہوتا۔

اصلاً نبوت کا کلی تعلق اس بات سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے مطلع فرماتے ہیں کہ میں نے تجھے نبوت عطا کر دی ہے۔ اس بنا پر نبی کی موت سے نبوت کا بطلان لازم نہیں آتا۔ جس طرح کہ نیند اور غفلت کے باوجود بھی نبوت قائم و دائم رہتی ہے۔(فتح الباری : ٦/٣٦١)

قرآن مجید میں اس کی صراحت یوں ہے:

﴿ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ . ﴾ (النحل:۲)

مختصر یہ کہ اللہ کے نبیوں اور پیغمبروں نے لِإعلاءِ كَلِمَةِ اللّٰه دین کی نصرت وعظمت اور سربلندی کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دی اور دنیا و آخرت میں سرخرو ہوئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ . ﴾ (المجادله : ٢١)

پھر وقتی تقاضوں کے مطابق ہر ایک کو منجانب اللہ صحائف و کتب کی شکل میں کچھ احکام اور مواعظ ملے، جو اقوام عالم کے لیے تقرب و حب الٰہی کا پیغام اور جنت میں تَنَعُّم اور جہنم سے تَبَاعُدُ کا ذریعہ بن سکتے تھے لیکن ''یَا لَلاَسَفُ! ان کی حالت وہی تھی جس کی تصویر کشی فرمان باری تعالیٰ میں یوں ہے:

﴿وَمَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ . ﴾ (الحجر:۱۱)

بہت کم باسعادت اور خوش نصیب تھے، جو حیات مستعار اور زندگی کے مقصد اعلیٰ کو سامنے رکھ کر پیغمبروں کی اِطاعت اور اتباع میں راہِ نجات کی تلاش میں نکلے اور صراط مستقیم پر گامزن رہ کر جنت کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوئے اور اکثریت اس اطاعت الٰہی اور نصرت و اتباع انبیاء سے محروم رہی بلکہ انہوں نے عداوت، مخالفت، بے جا ضد اور ہٹ دھرمی کا راستہ اختیار کیا۔ دوسری طرف کتب سماویہ کی محافظ و نگران بھی یہی اُمم قرار پائیں۔ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللهِ. جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کتب تحریف و تبدیل اور تغیر سے سلامت نہ رہ سکیں۔

سوال: لفظ ''خلق'' کی اضافت عابد و معبود دونوں کی طرف ہے، دونوں میں کیا فرق ہے؟

مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ! ''تنظیم اہل حدیث'' میرا پسندیدہ ہفت روزہ ہے۔ میں بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کرتا ہوں اور آپ کے علمی نکات سے مستفید ہوتا ہوں۔ اس ضمن میں چند اشکال ذہن میں ہیں۔ براہ کرم ان کی وضاحت یا تو ہفت روزہ کے ذریعے فرماویں یا مجھے براہِ راست لکھیں بہرحال جس طرح آپ خود مناسب سمجھیں۔

''خلق کرنا'' بمعنی پیدا کرنا صرف ذات باری کا خاصہ قرار دیا گیا ہے۔ خواہ وہ خلق مادر سے ہو یا بغیر مادر کے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿ أَفَمَن يَخْلُقُ كَمَن لَّا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ . ﴾ (النحل:۱۷) تو کیا جو خلق کرتا ہے وہ اس جیسا ہوسکتا ہے جو خلق نہیں کرتا۔ سو تم کیوں نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ اور مزید یہ کہ: ﴿أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ . ﴾ (الرعد:۱٦) یعنی کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کے کچھ شریک ٹھہرا رکھے ہیں کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ ہی کی سی مخلوق پیدا کر رکھی ہے جن کے سبب مخلوقات ان پر مشتبہ ہوگئی ہے۔ (اور ان کی خدائی کے قائل ہو گئے ہیں) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی یکتا اور سب پر غالب ہے۔

مگر حضرت مسیح کے بارے میں فرمان ہے کہ (سورہ آل عمران، آیت نمبر:۴۹) وہ مٹی سے پرندے خلق

کرتے تھے، تو پھر حضرت مسیح علیہ السلام: مَنۡ یَخۡلُقُ ہونے کی وجہ سے انسانوں جیسے تو نہ ہوئے بلکہ اللہ تعالیٰ جیسے ہوئے اور پھر عیسائیوں کے عقیدۂ الوہیت کی تائید ہوگئی! کیا یہ محکمات قرآنی کے خلاف نہیں؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ بِإِذۡنِ اللّٰهِ خَلۡق کرتے تھے تو کیا اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے خلاف اِذن دیتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو جب فعل خلق کو اس نے اپنی صفت خاص میں بیان فرمایا ہے جس میں مخلوق کسی صورت میں شریک نہیں ہوسکتی تو کیا اس کے خلاف اذن دینا گویا اپنی صفت کو خود ہی باطل کرنے کے مترادف نہ ہوا؟ وضاحت فرمائیں!

جواب: واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء وصفات جو کتاب اللہ اور احادیث صحیحہ میں ثابت ہیں بلا تعطیل، بلا تکییف، بلا تمثیل ان پر ایمان لانا ہر مرد عورت پر واجب ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَ لِلّٰهِ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی فَادۡعُوۡهُ بِهَا وَ ذَرُوا الَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ فِیۡۤ اَسۡمَآئِهٖ . ﴾

(الأعراف:۱۷۹)

''اور اللہ کے نام اچھے ہی اچھے ہیں تو اس کو اس کے ناموں سے پکارو! اور جو لوگ اس کے ناموں میں کجی (اختیار) کرتے ہیں ان کو چھوڑ دو!''

اور صحیح حدیث میں ہے:

« إِنَّ لِلّٰهِ تِسۡعَةً وَّ تِسۡعِیۡنَ اسۡمًا مَنۡ أَحۡصَاهَا دَخَلَ الۡجَنَّةَ . »[1]

''یعنی اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جس نے ان کا ورد کیا جنت میں داخل ہوا۔''

سورۃ مریم میں ہے:

﴿ هَلۡ تَعۡلَمُ لَهٗ سَمِیًّا . ﴾ (مریم:٦٤)

''بھلا تم کوئی اس کا ہم نام جانتے ہو؟''

صفات الٰہیہ میں سے بعض ایسی بھی ہیں جو بندوں اور خالق کے درمیان مشترک نظر آتی ہیں۔ مثلاً علم، سمع، بصر، رؤیت، ید وغیرہ وغیرہ لیکن یہ اشتراک صرف ظاہری اور لفظی ہے ورنہ بندے کی طرف ان کی اضافت اس کے مناسب حال عجز کے اعتبار سے ہے اور خالق کائنات کی طرف ان کی نسبت اس کے کمال کے اعتبار سے ہے قرآن کریم میں ہے:

---

[1] (۲۲۱) صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب إن لله مائة اسم إلا واحدا(۷۳۹۲)و(۲۷۳٦). صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فی أسماء الله تعالیٰ وفضل من أحصاها(٦٨٠٩).

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ . ﴾ (الشوریٰ:۱۰)

''اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ دیکھتا سنتا ہے۔''

انسان کے بارے میں ہے:

﴿ جَعَلْنٰهُ سَمِيعًا بَصِيرًا . ﴾ (الدھر:۲)

''تو ہم نے اس کو سنتا دیکھتا بنایا۔''

شرح عقیدہ طحاویہ ص: ۵۸ پر بحوالہ ''اَلْفِقْهُ الْأَكْبَرُ''

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے: نہ اللہ تعالیٰ مخلوق میں کسی کے مشابہ اور نہ مخلوق میں سے کوئی اس کے مشابہ ہے اور اس کی تمام صفات مخلوق کی صفات کے خلاف ہیں اس کا علم، قدرت، رؤیت بندوں کی طرح نہیں۔

امام نعیم بن حماد شیخ البخاری رحمہ اللہ کا قول: ''جس نے اللہ تعالیٰ کو مخلوق میں سے کسی کے ساتھ تشبیہ دی وہ کافر ہے۔''

اب آیے اس مشکل کی طرف جو آپ کو لاحق ہے خلق (پیدا کرنا) اللہ عزوجل کی صفت ہے جس طرح کہ متعدد آیات واحادیث اس پر دال ہیں تو اس کی نسبت مخلوق (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی طرف جو قرآن میں ہوئی ہے اس سے عیسائیوں کے عقیدہ الوہیت مسیح علیہ السلام کا اثبات اور صفت اللہ کا تعطل لازم آتا ہے؟

آپ کے اس اشکال کا حل یوں ہے کہ عربی زبان میں لفظ ''خلق'' کے کئی معانی ہیں:

بِمَعنٰی أَوْجَدَ (وجود میں لانا)، إِنْشَاء (پیدا کرنا)، أَبْدَعَ (نئی شے بنانا)۔

اصل میں تو ''خلق'' کے معنی ''تقدیر مستقیم'' یعنی صحیح اندازہ ٹھہرانے کے ہیں اور اس کا استعمال کسی چیز کے بغیر نمونہ اور پیروی کے ایجاد کرنے کے لئے بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ . ﴾ نیز ایک شے کے دوسری شے سے بنانے اور ایجاد کرنے کے لئے بھی مستعمل ہے، جیسے: ﴿ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ . ﴾ اور ﴿ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ . ﴾ (آل عمران:۴۹)

اور عام لوگوں کے لیے جو خلق کا استعمال ہوتا ہے تو صرف دو معنی کے لیے ہوتا ہے:

1. بمعنی اندازہ کرنا: ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ . ﴾ (سورۃ المؤمنون:۸)

۴ جھوٹ گھڑنا: ﴿ وَ تَخْلُقُوْنَ إِفْكًا . ﴾ (سورة العنكبوت)

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ''المفردات'' امام راغب اور لغات القرآن نعمانی جلد۲، ص ۳۱۹ نیز ''فرقان القرآن'' کے ص ۸۳ میں ہے۔ خالقیت (بمعنی پیدا کرنا) ایک ایسی صفت ہے جو اسی کے لائق ہے جس کا وجود ذاتی ہو (وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے)۔

"الاعتقاد للبیہقی" میں ہے:

" اَلْخَالِقُ هُوَ الْمُبْدِعُ الْمُخْتَرِعُ لِلْخَلْقِ عَلٰى غَيْرِ مِثَالٍ سَابِقٍ."

اندریں صورت مفسّرین ومترجمین کا اتفاق ہے کہ قصۂ مسیح علیہ السلام میں ''خلق'' بمعنی ایجاد نہیں ہے یہ رب العزت کا خاصہ ہے اس سے الوہیت مسیح علیہ السلام کا عقیدہ باطل ہو جاتا ہے۔

تفسیر ''فتح القدیر'' میں ہے:

"أَخْلُقُ أَیْ أُصَوِّرُ وَ أُقَدِّرُ" (فتح القدير: ۳٤۱/۱)

یعنی ''میں تصویر بناتا اور اندازہ کرتا ہوں۔''

اور تفسیر بیضاوی میں ہے:

" وَالْمَعْنٰى أُقَدِّرُ لَكُمْ وَأُصَوِّرُ شَيْئًا مِّثْلَ صُوْرَةِ الطَّيْرِ. "

یعنی ''پرند کی شکل جیسی میں تمہارے لیے تصویر بناتا ہوں کسی شئ کی اور اندازہ کرتا ہوں۔''

نیز فرماتے ہیں: ﴿ وَ أُحْيِ الْمَوْتٰى بِإِذْنِ اللّٰهِ . ﴾ قرآن میں باذن اللہ کا تکرار لایا گیا ہے کیونکہ صفت احیاء (زندہ کرنا) بشری افعال کی جنس سے نہیں۔

تفسیر ''مواہب الرحمٰن'' میں سید امیر علی فرماتے ہیں: "أَخْلُقُ أُصَوِّرُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ." میں تصویر بناتا ہوں تمہارے لئے مٹی سے اور ''خلق'' کی تفسیر ایجاد کے ساتھ جائز نہیں ہے کیونکہ وہ مخصوص بخالق عزوجل ہے۔

اور مولانا اشرف علی زیر بحث آیت کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں: گارے سے ایسی شکل بناتا ہوں جیسے پرندے کی شکل ہوتی ہے۔

یاد رہے! اس زمانے میں ذی روح شے کی تصویر بنانا جائز تھا لیکن شریعت محمدی میں یہ منسوخ ہے بلکہ اس فعل کا ارتکاب کرنا حرام ہے۔ (سورۃ سبا، وتماثیل وجفان تفہیم القرآن میں دیکھیں)

حدیث میں ہے:

« فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذَهَبَ يَخْلُقُ كَخَلْقِي .»[1] الْحَدِيث

یعنی ''اس سے بڑا ظالم کون ہے جو مجھ جیسی تخلیق کی سعی کرتا ہے۔''

ماحاصل اسکا یہ ہے کہ ''خلق'' بمعنی ایجاد خاصہ رب ذوالجلال کا ہے اور اس کی نسبت بندے کی طرف جب ہوگی تو اسے دیگر معانی پر محمول کیا جائے گا۔

سوال: میں ایک پولیس مین ہوں، ہمارے شعبے میں عیسائی اور مرزائی بہت ہیں۔ ہمارا سارا دن ان سے اختلاف رہتا ہے۔آپ ان کے بارے میں وضاحت فرمائیں کہ مرزائی اور عیسائی میں کیا فرق ہے؟ ان میں سے کس کے ساتھ زیادہ تعلقات رکھنے چاہیں۔کیا ان کے ساتھ مل کر کھانا جائز ہے کہ نہیں؟

جواب: مرزائی وہ لوگ ہیں جو ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ''خاتم النبیین'' تسلیم کرنے سے انکاری ہیں بلکہ اس کے بالمقابل متنبّی مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا ڈھونگ رچایا ہے اس بنا پر جملہ اہل اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ یہ لوگ مرتد اور دین اسلام سے خارج ہیں ان سے میل ملاقات اور راہ و رسم رکھنا غیرت اسلامی کے منافی ہے۔قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَآءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَآءَكُم مِّنَ الْحَقِّ . ﴾ (الممتحنة:١)

''میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ،تم تو ان کو دوستی کے پیغام بھیجتے ہو اور وہ (دین) حق کے جو تمہارے پاس آیا ہے منکر ہیں۔''

اور عیسائی وہ لوگ ہیں جو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی پیروی کے دعویدار ہیں۔ جب کہ فی الواقع انہوں نے تعلیمات مسیح علیہ السلام کو پس پشت ڈال کر ان کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ عقیدہ الوہیت مسیحؑ کے قائل ہیں جس کی تردید قرآن کے متعدد مقامات پر موجود ہے،مثلاً فرمایا:

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ . ﴾ (المائده:٧٢)

''وہ لوگ بلاشبہ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ مریم علیہا السلام کے بیٹے (عیسیٰ) مسیح اللہ ہیں۔''

---

[1] (٢٢٢) صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب نقض الصور(٥٩٥٣)عن أبي هريرة، والتوحيد(٧٥٥٩). صحيح مسلم، كتاب اللباس، باب تحريم التصوير(٥٥٤٣)عنه.

نیز فرمایا:

﴿ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ . ﴾ (التوبۃ:۳۰)

''اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں۔''

ان لوگوں کے عقائد اگرچہ محرف ہیں لیکن اس کے باوجود قرآن نے ان کے ساتھ قربت کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ اٰمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ اٰمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصٰرَى . ﴾ (المائدہ:۸۲)

''(اے پیغمبر) تم دیکھو گے کہ مومنوں کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہودی اور مشرک ہیں اور دوستی کے لحاظ سے مومنوں کے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔''

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ مرزائیوں کی نسبت عیسائیوں سے ہمدردی اَنسب ہے۔ پھر مرزائیوں کے ہمراہ کھانا تو قطعاً ناجائز ہے۔ کیونکہ وہ مرتد غیر مسلم ہیں جب کہ عیسائیوں کے ساتھ کھانے کی اگرچہ گنجائش موجود ہے بشرطیکہ موجود حلال ہو۔ تاہم بہتر یہ ہے کہ موجودہ حالات میں اس سے بھی پرہیز کیا جائے۔ حدیث میں ہے:

« اَلْإِسْلَامُ يَعْلُوا وَلَا يُعْلٰى عَلَيْهِ .» [1]

سوال: سالانہ اجتماع عام رائے ونڈ سال ۱۹۹۲ء کے موقعہ پر حسب سابق بیعت عام منعقد ہوئی۔ اس کے اختتامی الفاظ تھے۔

''بیعت کی ہم نے حضرت مولانا محمد الیاس کے ہاتھ پر انعام کے واسطے سے۔''

(واضح رہے کہ یہ بیعت تبلیغی جماعت کے موجودہ امیر حضرت مولانا انعام الحسن صاحب نے لی)

دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا اس نوع کی بیعت جس میں فوت شدہ شخص کے ہاتھ پر بالواسطہ یا

[1] (۲۲۳) انظر الرقم المسلسل (۱۲).

بلاواسطہ بیعت ہو،قرآن وسنت میں اس کی کیا حیثیت ہے؟

جواب: اس قسم کی بیعت امر محدث ہے شریعت اسلامی میں اس کا کوئی وجود نہیں اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمۂ دین سے اس کی سند دستیاب ہے لہٰذا اس سے اجتناب ضروری ہے۔ صحیح حدیث میں ارشاد نبوی ہے:

« مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ .» ❶

یعنی ''جو کوئی دین میں اضافہ کرتا ہے وہ مردود ہے۔''

سوال: آغا خانیوں، قادیانیوں، شیعوں اور عیسائیوں کے ساتھ تعلق رکھنے کے بارے میں کہ کیا ان کے ساتھ کاروبار کرنا، لین دین کا سلسلہ کرنا، ان کی دعوتوں پر جانا، ان کو اپنے گھر یا ہوٹل پر بلوانا جائز ہے کہ ناجائز؟ بعض احباب ان کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ آپ بتائیں کہ ہم ان کو کونسی کتب دیں؟ کہ وہ ان سے قطع تعلق کریں۔

جواب: ①...... سوال میں مذکور لوگوں سے تجارتی تعلقات، خرید و فروخت یا لین دین کرنے کا کوئی حرج نہیں، بعض احادیث میں ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے غیر مسلموں سے کاروبار کو روا رکھا ہے بلکہ بذات خود ان سے معاملہ کیا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اشْتَرٰى طَعَامًا مِّنْ يَّهُوْدِيٍّ إِلٰى أَجَلٍ وَرَهَنَه دِرْعًا مِّنْ حَدِيْدٍ .» ❷ (باب من اشترى بالدين ...... و بَابُ مَنْ رَهَنَ دِرْعَهٗ)

لیکن اس میں بنیادی شرط یہ ہے کہ ان کے حرام کاروبار کو تقویت پہنچانا مقصود نہ ہو۔ ''بلوغ المرام'' میں بحوالہ طبرانی اوسط بسند حسن حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص انگور کاٹنے کے دنوں میں انگور بند رکھے، یہاں تک کہ شراب بیچنے والے کے پاس فروخت کرے تو وہ دیدہ دانستہ آگ میں گھسا۔ ❸ (کتاب البیوع)

---

❶(٢٢٤) انظر الرقم المسلسل (٢).

❷(٢٢٥) صحيح البخاري، كتاب الجهاد، باب ما قيل في درع النبي ﷺ (٢٩١٦) والمغازي، رقم الباب (٨٧) ح (٤٤٦٦) عن عائشة رضي الله عنها.

❸(٢٢٦) بلوغ المرام، رقم (٨٠٤)، الطبراني (١٧١،١٧٠/٦) (٥٣٥٢) الأوسط، مجمع البحرين (١٩٨٤)، الضعيفة (١٢٦٩) فيه الحسن ابن مسلم المروزي، التاجر. قال الألباني:" باطل ". وقال الذهبي: " أتى بخبر موضوع في الخمر ". ثم ذكر هذا الحديث. ميزان الاعتدال (٥٢٣/١).

اور "سُبُلُ السَّلَام" میں بحوالہ "شعب الایمان" روایت یوں نقل کی ہے: "جو شخص انگوروں کو بند رکھے یہاں تک کہ کسی یہودی، نصرانی کے پاس فروخت کرے جس کی بابت اس کو علم ہے کہ وہ اس کی شراب بنائے گا تو اس نے دیدہ دانستہ آگ دوزخ کی طرف پیش قدمی کی۔"❶

البتہ عمومی تجارت حلت اور حرمت کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے جو مسلمانوں کے لیے نفع بخش ثابت ہو اس کا جواز ہے اور اگر کسی صورت مسلمانوں پر ضرر کا اندیشہ ہو تو اس سے بچنا چاہیے۔ جیسے غیر مسلموں کو اسلحہ وغیرہ کی فروخت ہے۔ اس کے باوجود احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ حتی المقدور ایک مسلم کو چاہیے کہ مسلم سے ترجیحی بنیادوں پر کاروبار کو وسعت دے جب کہ غیر مسلم کا معاملہ ثانوی حیثیت میں رکھے اور جہاں تک دعوتوں وغیرہ کی صورت میں ان لوگوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی بات ہے سو یہ کسی صورت بھی جائز نہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَ عَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ کَفَرُوْا بِمَا جَآءَکُمْ مِّنَ الْحَقِّ . ﴾ (الممتحنة:١)

"میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ تم تو دوستی کے پیغام بھیجتے ہو اور وہ (دین) حق کے جو تمہارے پاس آیا ہے منکر ہیں۔"

موضوع ہذا پر تفصیلی گفتگو اس سے پہلے "الاعتصام" میں شائع ہو چکی ہے۔ ان لوگوں کے لیے موضوع سے متعلق جملہ اہل اسلام کی کتابیں مفید ہیں۔ بالخصوص تصانیف مولانا ثناء اللہ امرتسری اور علامہ ظہیر اور علامہ رحمت اللہ ہندی کیرانوی بازار میں بہ آسانی دستیاب ہیں۔

② ...... ہر وہ کاروبار جو منشاء شریعت کے منافی ہو اس کو اختیار کرنا حرام ہے۔ عام طور پر اصول فساد چار بیان کیے جاتے ہیں۔

① ہر وہ شے جو بذاتہ حرام ہو جیسے فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے۔❷

---

❶(٢٢٧) شعب الإيمان(١٧/٥)(٥٦١٨)للبيهقي.

❷(٢٢٨) صحيح البخاری كتاب البيوع، باب بيع الميتة والاصنام (٢٢٣٦)، صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب تحريم بيع الخمر والميتة والخنزير والأصنام (٤٠٤٨).

۲ بیاج کی تمام شکلیں حرام ہیں، ان کا تعلق قرض سے ہو یا بیوع وغیرہ سے۔

۳ غَرَر کی بے شمار ایسی صورتیں ہیں جن کو محض دھوکے کی بنا پر شریعت نے حرام کیا ہے۔ مثلاً دوڑے ہوئے غلام کی بیع ❶ یا ہوا میں اڑتے ہوئے پرندوں کی بیع ❷ وغیرہ وغیرہ۔

۴ ہر وہ شرط جس کا تعلق ربا اور غرر دونوں سے ہے یا دونوں میں سے کسی ایک سے ہے۔

ان امور کی جملہ تفاصیل معلوم کرنے کے لیے ''کتب احادیث'' میں ''فرامین رسول اللہ ﷺ و کتب فقہ'' میں اقوال و آثار فقہائے کرام کی طرف رجوع فرمائیں۔

سوال: آج کل جو مسئلہ چلا ہوا ہے شیعہ کافر ہیں یا مسلمان؟ اہل حدیث حضرات کا کیا نظریہ ہے؟ اگر کافر ہیں تو آپ سے گذارش ہے کہ ان کے عقائد قرآن و حدیث سے بیان فرمائیں۔

جواب : دراصل شیعہ کے کئی گروہ ہیں۔ ان کے مختلف عقائد کے اعتبار سے حکم لگانا چاہیے۔ واضح رہے کہ غالی شیعہ تو قطعًا کافر ہیں جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وغیرہم کو مرتد سمجھتے ہیں اور ''فرقہ زیدیہ'' کافر نہیں جن کا اعتقاد ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امامت خطا نہیں ہے لیکن علی رضی اللہ عنہ افضل ہیں۔ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں ساکت ہیں۔ آج کے دور میں شمالی یمن میں ان لوگوں کی اکثریت ہے۔ جملہ تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہو: کِتَابُ الْفَصْلِ بَیْنَ الْمِلَلِ وَالنِّحَلِ لِلْإِمَامِ ابْنِ حَزْم وغیرہ وغیرہ۔❸

سوال: ''الاعتصام'' شمارہ نمبر ۲۷ میں آپ نے علامہ وحید الزمان کا حوالہ دیا اس کے بارے میں وضاحت فرمائیں کہ یہ کون ہیں؟ حنفی ہیں یا اہل حدیث؟ یا شیعہ؟ بندہ کی رائے یہ ہے کہ یہ اہل حدیث ہیں کیونکہ ہم اہل حدیث حضرات کو جو صحاح ستہ کا ترجمہ دیا جاتا ہے وہ ان کا ہے اور آپ نے بھی حوالہ دیا ہے۔ نیز نُزُلُ الْأَبْرَارِ کس فن کی کتاب ہے؟ اور کس کی ہے؟ کیا اس کا ترجمہ اردو میں مل سکتا ہے؟ یہ عوام کے مطالعہ کے لیے مفید رہے گی یا نہیں؟

جواب: علامہ وحید الزمان زندگی کے ابتدائی دور میں حنفی المسلک تھے۔ بعض مسائل میں شیعہ کی طرف بھی

---

❶(۲۲۹) هذا من قول الشافعي انظر الترمذي (۱۲۳۰).

❷(۲۳۰) ابن ماجه(۲۱۹۶)،دارقطني(۱۵/۳)وقال ابن حجر في بلوغ المرام:(۸۰۸)" فيه شهر بن حوشب، ضعيف الحديث ". وضعيف ابن ماجه،(۴۷۷)للألباني،والإرواء(۱۲۹۳).

❸(۲۳۱) اس بارے میں علامہ إحسان إلٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ کی کتب خصوصًا " الشيعة والسنة " کا مطالعہ بے حد مفید اور ضروری ہے۔ إن شاء الله تعالى. (حافظ ثناء اللہ مدنی)

رجحان رکھتے ہیں۔ ''تیسیر الباری شرح البخاری'' میں جا بجا اپنے کو حنبلی ظاہر کرتے ہیں۔ میں نے بعض احباب کی معاونت سے اس کی تصحیح و تنقیح اور اضافہ کا عمل شروع کر رکھا ہے۔ درمیانی انقطاع کے باوجود کام کتاب الحج والعمرہ کے اختتامی مراحل میں ہے۔ اللہ رب العزت تکمیل کی توفیق بخشے۔ آمین!

اور کتاب ''نُزُلُ الْأَبْرَارِ فِیْ فِقْهِ النَّبِیِّ الْمُخْتَارِ" علامہ موصوف کی فقہ کے موضوع پر معروف کتاب ہے۔ غالب مسائل احادیث سے مستنبط ہیں۔ اصل کتاب کئی اجزاء میں عربی زبان میں ہے۔ اس کے اردو ترجمہ کا مجھے علم نہیں فی الجملہ کتاب نہایت مفید ہے۔

سوال: مودودی صاحب کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے؟ ان کا مضمون بہت پسند آیا۔

جواب: مولانا مودودی مرحوم ایک عظیم مصلح انسان تھے۔ ان کی بہت ساری خدمات کو بنظرِ اِسْتِحْسَان دیکھا گیا ہے۔ جب کہ دوسری طرف ان سے واضح غلطیوں کا بھی ارتکاب ہوا۔ جن میں کئی ایک احادیث صحیحہ کا انکار سرفہرست ہے۔ ملاحظہ ہو شیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ کی تصانیف ''مودودیت اور احادیث نبویہ ﷺ'' ''مودودیت اور اسلامی ڈاڑھی''۔ (فتاویٰ اہل حدیث ۱۲-۱۳)

سوال: اہل حدیث حضرات کا عورت کی حکمرانی کے متعلق نظریہ کیا ہے؟ جب کہ بندہ نے علامہ روپڑی کے رسالہ میں پڑھا ہے کہ حکمرانی ناجائز ہے؟

جواب: اسلام میں عورت کی حکمرانی کا کوئی تصور نہیں۔ حدیث میں ہے:

« لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً .» ❶

اس موضوع پر ہمارے فاضل دوست مولانا فضل الرحمٰن صاحب خطیب مسجد مبارک لاہور کی کتاب عظیم شاہکار ہے جو لائق مطالعہ ہے۔

سوال: کیا ولی اللہ ہونا کوئی عہدہ یا مرتبہ ہے؟ یا ہر مسلمان اللہ کا ولی ہے۔ کیوں کہ مسلمان کے علاوہ سب عدو اللہ ہیں۔ اگر اللہ کے دوست اور دشمنوں کے درمیان کوئی لوگ ہیں تو ان کی کیا حیثیت ہے؟

جواب: ولی اللہ ہونا کوئی عہدہ یا منصب نہیں جو مخصوص لوگوں کے لیے ہو قرآن کی نظر میں ہر متقی ولی اللہ ہے۔ فرمایا:

---

❶ (۲۳۲) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب کتاب النبی ﷺ إلی کسری وقیصر (۴۴۲۵)، وکتاب الفتن رقم الباب (۱۸) ح(۷۰۹۹)، أحمد (۳۸/۵، ۴۷)، النسائی (۵۳۹۰).

﴿ إِنْ أَوْلِيَآءُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ . ﴾ (الأنفال:٣٤)

البتہ بعض کبائر کے ارتکاب کی وجہ سے درمیانہ درجہ مومن ناقص الایمان ہوسکتا ہے۔

سوال: بعض اوقات میرا ذہن سفیر حضرات کے ایک فقرہ جوکہ تقریباً زبان زد عام ہے، سے بہت الجھتا ہے۔ یہ فقرہ ادا کرنے والے حضرات بعض اوقات بڑے محترم اور صاحب علم ہوتے ہیں، مجھے حیرانگی ہوتی ہے، اگر یہ مناسب ہے تو میں اپنی اصلاح کروں، یہ فقرہ درج ذیل ہے:

سفیر حضرات مسجد یا مدرسہ کے لیے چندہ کی اپیل فرماتے ہوئے کہتے ہیں:

(ا) دوستو! اللہ کا آسرا ہے یا تمہارا آسرا ہے، (ماحصل)۔

(ب) دوستو! اللہ کا سہارا ہے اور تمہارا سہارا ہے، (یعنی تمہارا بھی اور اللہ کا بھی دونوں کا سہارا ہے)۔

یا تو میں مطلب غلط لیتا ہوں اور یا پھر سائل حضرات غلط کہہ جاتے ہیں۔

(ج) ''یہ مدرسہ اللہ کے سہارے اور تمہارے تعاون سے چل رہا ہے، (گویا کہ اللہ کے سہارے کے بعد بھی تعاون کی ضرورت ہے۔) کیا اس طرح بہتر نہیں کہ کہا جائے: اللہ کی توفیق سے آپ کا تعاون حاصل ہے؟

جواب: سفراء کے فقرات میں اگر لفظ ''پھر'' کا اضافہ کرلیا جائے تو جائز ہے۔ ورنہ ناجائز حدیث میں ہے:

ایک شخص نے آپ ﷺ سے کہا تھا:

«مَا شَاءَ اللّٰهُ وَ شِئْتَ.»

یعنی ''جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں۔''

تو آپ ﷺ نے اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا:

« أَجَعَلْتَنِي لِلّٰهِ نِدًّا .» پھر اس کو لفظ ثُمَّ (پھر) کے ساتھ تعلیم دی:

« مَا شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ شِئْتَ.» [1]

[1] (٢٣٣) صححه الألباني وأحمد شاكر والطحاوي، الأدب المفرد (٧٨٣) أحمد (٢١٤/١، ٢٢٤، ٢٨٣۔ شاكر) عن ابن عباس. تحفة الأخيار......مشكل الآثار(٥/٧)(٤٨٥٧إلى ٤٨٦١)للطحاوي وقال: روينا في هذا الباب عن رسول الله ﷺ نهيه أمته أن يقولوا ؛ "ما شاء الله وشئت "وأمره إياهم أن يقولوا مكان ذلك:" ما شاء الله ثم شئت "عنه وعن حذيفة وجابربن سمرة، ابن ماجه(٢١١٧)، الصحيحة (١٣٩)، عبدالرزاق (١٩٨١٣).

یعنی ''جو اللہ چاہے پھر آپ چاہیں۔'' نیز اللہ کی توفیق سے کہنا بھی درست ہے۔

سوال: حرمین شریفین کے ائمہ کیا مقلد ہیں؟ کیونکہ مقلدین اپنے دلائل میں یہ بھی ذکر کرتے ہیں؟

جواب: حرمین شریفین کے بعض ائمہ کا مخصوص مذہب کی طرف انتساب ان معنوں میں قطعاً نہیں کہ وہ کتاب وسنت کے نصوص کے مقابلہ میں اقوال ائمہ کو ترجیح دیتے ہوں جبکہ تقلید کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کے قول کو بلا دلیل قبول کر لینا۔ سعودی عرب کی فضا کا بالعموم امتیازی پہلو یہ ہے کہ وہاں فقہ کو تقابلی انداز میں پڑھایا جاتا ہے جو محدثین کا طرۂ امتیاز ہے جب کہ ہمارے ہاں کے متعصّبانہ حنفی ماحول میں اس بات کا تصور مشکل امر ہے، بلکہ یہاں نصوص شرعی کو توڑ مروڑ کر امام کے قول کے مطابق ڈھالنا باعث افتخار سمجھا جاتا ہے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ إِلَّا بِاللّٰہِ.

سوال: ایک شخص مسلمان ہونے کا پکا ارادہ کر چکا ہو۔ اور اسی دوران اس پر موت آ جائے جبکہ اس نے کلمہ شہادت نہ پڑھا ہو تو کیا وہ مسلم مرا ہے یا غیر مسلم؟

جواب: ایسا شخص غیر مسلم مرا ہے۔ کیوں کہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لیے نطق بالشہادتین شرط ہے۔ صرف اس کی صداقت کا یقین رکھنا کافی نہیں۔

سوال: اگر کوئی شخص کسی مذہبی جماعت سے تعلق عقیدت کی حد تک رکھتا ہو۔ اس کے جماعت کے امیر یا دو ایک کے علاوہ دوسرے ارکان جماعت سے حسن ظن نہ رکھتا ہو تو جماعت سے الگ رہنے سے گنہگار تو نہ ہوگا؟

جواب: جماعت کے بعض افراد سے حسن ظن نہ رکھنے کی وجہ اگر شرعی ہے تو یہ شخص ماجور ہے اور اگر محض دنیاوی غرض ہے تو یہ شخص اللہ کے ہاں جوابدہ ہے۔

سوال: ایک مسئلہ کے اندر ایک ہی مسلک سے تعلق رکھنے والے کچھ علماء کا فتویٰ مختلف اور آپس میں اختلافی ہو تو عوام کے لیے کیا حکم ہوگا؟ جس کے قول پر چاہیں عمل کریں؟

جواب: شرعی دلیل کے اعتبار سے جس فتویٰ پر دل زیادہ مطمئن ہو۔ اس پر عمل کر لیا جائے۔

سوال: اہل تشیع کے بارے میں اجمالی طور پر ہمارا عقیدہ کیا ہونا چاہیے؟

جواب: شیعہ سیدھی راہ سے برگشتہ ایک قوم ہے جو غالی اور غیر غالی افراد کا مجموعہ ہے۔ اسی اعتبار سے ان سے اظہار بغض ہونا چاہیے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: "تحفہ اثنا عشریۃ" لشاہ عبدالعزیز، "الخطوط العریضۃ" لمحب الدین الخطیب، "منہاج السنہ" لابن تیمیہ وغیرہ۔

سوال: کیا اپنے آپ کو اہل حدیث کہلانا درست ہے؟ جب کہ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ .﴾

جواب: کتاب وسنت کے ساتھ مخلصانہ وابستگی کی بناء پر اہل حدیث نام کے اطلاق کا جواز ہے۔

"لَا مَشَاحَةَ فِي الْاِصْطِلَاحِ ."

کئی ایک محدثین عمل بالحدیث کی بنا پر اہل بدعت کے بالمقابل اس لقب سے موسوم تھے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (كِتَاب شَرَف أَصْحَابِ الْحَدِيْثِ)

قرآن مجید میں ''المسلمین'' بطور تسمیہ صفت بیان ہوا ہے جس سے الحمدللہ جملہ مسلمان متصف ہیں۔ ورنہ تو لازم آئے گا ''حافظ عبدالغفور'' نام رکھنا بھی ناجائز ہو جس کا کوئی بھی قائل نہیں۔

سوال: کیا ''رضی اللہ تعالیٰ عنہ'' کے الفاظ صحابی کے نام کے علاوہ کسی ولی اللہ کے نام کے ساتھ استعمال کیے جا سکتے ہیں؟ کیونکہ علامہ سید رشید الدین شاہ المعروف بِصَاحِبِ اللِّوَاءِ الثالث مرحوم کی ملفوظات جو ان کے خاص جماعتی (مرید) قاضی فتح محمد نظامانی مرحوم نے بنام "تحفة المحبين" (قلمی) میں ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ (یاد رہے کہ اس کا قلمی نسخہ سعید آباد سندھ میں سید بدیع الدین شاہ راشدی کی لائبریری میں موجود ہے) اس کی نقل نمبر ۶۰ میں درج ہے کہ ''حضرت مرشد کریم رضی اللہ عنہ کے پاس عرب ملک سے شہد کے دو ڈبے لائے گئے۔ ان ڈبوں میں سے ایک میں مرا ہوا چوہا نکلا۔ پھر آپ کریم نے فقہی روایت کے موجب شہد میں پانی ڈلوایا اور اس کو آگ پر ابالا گیا۔ یہ عمل دو تین مرتبہ کیا گیا۔ شاید پاکی کے ارادے سے کیا ہو۔ پھر فتح محمد صاحب لکھتے ہیں کہ اچانک میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آپ اس شہد کے شربت میں سے ایک گھونٹ پی چکے ہیں۔ میں نے حضور سے عرض کیا یہ شہد کسی حالت میں بھی پاک نہیں ہو گا اور رسول اللہ ﷺ کی حدیث پیش کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر جمے ہوئے گھی میں چوہا گر کر مر جائے تو وہ پلیدی والی جگہ کاٹ کر پھینک دی جائے۔ اگر گھی جما ہوا نہ ہو بلکہ پانی کی صورت میں ہو تو اس کے قریب نہ جاؤ۔[1] مگر دیا جلانے یا کسی دوسرے کام میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ پھر آپ نے احادیث کی کتب منگا کر، حدیث

---

[1] (۲۳٤) و قال الترمذي هنا حديث غير محفوظ و قال البخاري هذا خطأ أَخْطَأَ فيه معمر (الترمذي، ۱۷۹۸) علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ''شاذ'' کہا (شاذ ضعیف کی ایک قسم ہے وہ روایت جس میں ثقہ اوثق کی مخالفت کرے) الضعيفة (۱۵۳۲) والمشكاة (٤۰۵۳) بتحقيق الثاني للالباني رحمه الله وانظر صحيح البخاري (۵۵۳۸ تا ۵۵٤۰).

شریف کے الفاظ دیکھ کر شہد کا پورا ڈبہ پھینک دیا اور جو گھونٹ پی لیا تھا اس کے متعلق افسوس کا اظہار کیا۔''
(بدیع التفاسیر، مصنف سید بدیع الدین شاہ راشدی: ۳/۴۴۵)

جواب: ارشاد باری تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ . ﴾

''اور جنھوں نے نیکو کاری کے ساتھ ان کی پیروی کی اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں۔''

سورۃ التوبہ: آیت نمبر۱۰۰ کے پیش نظر غیر صحابی پر بھی ''رضی اللہ عنہ'' کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

سوال: (ا) بیعت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (ب) کیا کسی عالم دین کے ہاتھ پر بیعت ضروری ہے کہ مسائل دین و دنیا سے واقفیت رہے؟ (ج) بیعت کو تقلید سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟

جواب: (ا) بیعت حاکم وقت خلیفہ سے شریعت کی پیروی کے عہد کا نام ہے جو ہاتھ پر ہاتھ رکھنے اور زبانی کلامی عہد و پیمان سے بھی ہوسکتی ہے۔

(ب) کسی عالم دین کے ہاتھ پر شریعت میں بیعت کا تصور نہیں کیونکہ بیعت کا تعلق نبی ﷺ کی ذات سے ہوتا ہے یا جو نبی ﷺ کے قائم مقام ہو۔ جیسے خلیفہ، حاکم دین و دنیا کے مسائل میں کسی بھی صاحب علم سے راہنمائی حاصل ہوسکتی ہے، بیعت شرط نہیں۔

(ج) بیعت کو تقلید سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بیعت اطاعت شریعت کے عہد کا نام ہے جب کہ تقلید کا مفہوم یہ ہے کہ غیر کے قول کو بلا دلیل قبول کر لینا۔

سوال: اہل تشیع بخاری کی اس حدیث ❶ کو عموماً اپنے حق میں پیش کرتے ہیں کہ جس میں آپ ﷺ کا بیماری کے دوران یہ فرمانا کہ میرے پاس قلم دوات لے کر آؤ کہ میں آپ کو لکھ دوں مگر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہمیں قرآن کافی ہے آپ ﷺ تو ہذیان میں ایسا کہہ رہے ہیں۔ اس سے اہل تشیع درج ذیل مسائل ثابت کرتے ہیں۔

① حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا کہنا نہ مان کر گستاخی کی۔

② حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو ہذیان میں مبتلا کہہ کر گستاخی کی۔ آپ ﷺ کا ہذیان میں ہونا شان کے خلاف ہے۔

---

❶ (۲۳۵) صحیح البخاری، کتاب العلم، باب کتابة العلم، (۱۱٤) والمغازی (٤٤٣۲).

③ آپ ﷺ اپنے بعد خلافت کے بارے میں لکھنا چاہتے تھے۔

④ آپ ﷺ تو امی تھے۔آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ لاؤ میں لکھ دوں؟لہٰذا حدیث عقل ونقل کے خلاف ہے۔

جواب: ①...... حضرت عمرؓ نے بطور شفقت صرف آپ ﷺ پر بیماری کے غلبہ کی وجہ سے روکا تھا۔ لہٰذا یہ گستاخی نہیں۔ عَلٰی سَبِیْلِ التَّنَزُّل اگر اس کو گستاخی تسلیم کر لیا جائے تو اس میں عمرؓ منفرد نہیں تھے بلکہ وہاں کئی ایک صحابہ واہل بیت موجود تھے۔ وہ سب اس میں شریک ہوں گے نیز تنہا عمر رضی اللہ عنہ پر الزام لگانا بے انصافی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیوں نہ تحریر کروایا۔ جب کہ ان کو قرب دامادی حاصل تھا۔ ''فتح الباری'' وغیرہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے۔ مجھے نبی ﷺ نے حکم دیا تھا کہ کوئی کاغذ لاؤ جو لکھا جائے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے روکنے سے آپ ﷺ کا رک جانا منصب رسالت کے منافی ہے۔ جب کہ آپ پر تبلیغ فرض ہے۔

اس واقعہ کے بعد بھی چند روز تک آپ زندہ رہے۔ اگر کوئی ضروری تحریر ہوتی تو ضرور لکھوا دیتے۔

②......پہلی بات یہ ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقولہ نہیں۔ حدیث کی کسی کتاب میں اس امر کی تصریح موجود نہیں۔

✿ دوسرا ''ہجر'' بمعنی ہذیان لینا غیر متبادر ہے۔ یہ لفظ جدائی کے معنی میں کثیرالاستعمال ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے: ﴿وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا .﴾ دوسری آیت میں ہے: ﴿وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ .﴾

✿ تیسری بات یہ ہے ''ہجر'' کے بعد اِسْتَفْهِمُوْهُ کا لفظ موجود ہے جس کے معنی یہ ہیں آپ سے پوچھو تو سہی کیا ارشاد فرماتے ہیں اگر ''ہجر'' کے معنی ہذیان کے لئے جائیں تو اِسْتَفْهِمُوْهُ سے بے ربط اور بے کار ہو جاتا ہے جس کو ہذیان ہو گیا اس سے پوچھنا خلاف عقل ہے۔ ثابت ہوا هجر و يهجر کے معنی جدائی کے ہیں نہ کہ ہذیان۔ (فیصلہ حدیث قرطاس ٦٩)

③......''قصہ قرطاس'' جمعرات کو پیش آیا۔ بروز سوموار آپ ﷺ کا انتقال ہوا۔ اس اثناء میں اگر خلافت کے بارے میں کوئی ضروری تحریر ہوتی تو آپ لکھوا سکتے تھے یا فاتح خیبر حضرت علی رضی اللہ عنہ جرأت مندانہ اقدام کر کے لکھوا لیتے۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ امت کی مصلحت کے پیش نظر رضا کارانہ طور پر امور خلافت سے مستعفی ہو گئے تھے۔ یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ استحقاق خلافت اہل بیت کے لئے متعین نہیں۔

④......کتاب کی نسبت آپ کی طرف بلحاظ آمر کے تھی قصہ صلح حدیبیہ میں بھی ایسے الفاظ موجود ہیں۔ وہ نسبت بھی حکم کے اعتبار سے ہے جب کہ فی الواقع کاتب حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ اسی طرح معاملہ یہاں

بھی سمجھ لینا چاہیے۔ اس میں ایسی کوئی شے نہیں جو عقل ونقل کے منافی ہو۔

سوال: اہل حدیث کا نام قرآن وحدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

جواب: لفظ ''اہل الحدیث'' بطور صفت ان لوگوں پر مستعمل ہے جنہوں نے علمی اور عملی میدان میں قرآن و حدیث کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ بعد کے ادوار میں محض قرآن وحدیث سے تعلق رکھنے کی بنا پر بھی ''اہل الحدیث'' کہا گیا۔ قاعدہ معروف ہے: " لَا مَشَاحَةَ فِي الْإِصْطِلَاحِ ."جس طرح کہ کسی پیشہ کو اختیار کرنے یا اہل پیشہ سے تعلق کی بنا پر اس کی طرف نسبت ہو جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں چند تصریحات ائمہ کرام بھی ملاحظہ فرمائیں:

1. « لَا يَزَالُ نَاسٌ مِّنْ أُمَّتِي مَنْصُورِيْنَ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ.» [1] قَالَ عَلِيٌّ بْنُ الْمَدِيْنِيِّ :" هُمْ أَهْلُ الْحَدِيْثِ ." [2] قَالَ يَزِيْدُ بْنُ هَارُوْنَ :" إِنْ لَّمْ يَكُوْنُوْا أَصْحَابَ الْحَدِيْثِ فَلَآ أَدْرِيْ مَنْ هُمْ ." [3] قَالَ ابْنُ الْمُبَارِكِ :"هُمْ عِنْدِيْ أَصْحَابُ الْحَدِيْثِ ." [4] قَالَ الْبُخَارِيُّ :" يَعْنِيْ أَصْحَابَ الْحَدِيْثِ." [5]

2. « طُوْبٰى لِلْغُرَبَآءِ الَّذِيْنَ يُحْيُوْنَ سُنَّتِيْ مِنْ بَعْدِيْ وَ يُعَلِّمُوْنَهَا عِبَادَاللّٰهِ.» [6] وَ قَالَ عَبْدَانُ،أَحَدُ رُوَاةِ الْحَدِيْثِ الْمَذْكُوْرِ:" هُمْ أَصْحَابُ الْحَدِيْثِ الْأَوَائِلُ ."

3. « أَنَّ بَنِيْ إِسْرَآئِيْلَ افْتَرَقَتْ عَلٰى إِحْدٰى وَ سَبْعِيْنَ فِرْقَةً ---- كُلُّهَا فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً ، وَهِيَ الْجَمَاعَةُ .» [7] قَالَ الْإِمَامُ :"إِنْ لَّمْ يَكُوْنُوْا أَصْحَابَ الْحَدِيْثِ فَلَا أَدْرِيْ مَنْ هُمْ ." [8]

---

[1] (٢٣٦) ابن حبان (١٥/٢٤٨،٢٤٩) رقم (٦٨٣٤)عن قرة رضی الله عنه .بتحقيق الأرنؤوط . وقال :" حديث صحيح " ،ومعناه فی أحمد (٥/٣٤،٣٥) صحح إسناده محققه.

[2] (٢٣٧) الترمذی، كتاب الفتن، باب ما جاء فی أهل الشام (٢١٩٢) ط . دارالسلام . وشرف أصحاب الحديث رقم(١٢،٥٠).

[3] (٢٣٨) شرف أصحاب الحديث رقم (٤٦) فتح الباری (١٣/٢٩٣).

[4] (٢٣٩) معناه فی شرف أصحاب الحديث رقم (١١٧).

[5] (٢٤٠) شرف أصحاب الحديث (٥١).

[6] (٢٤١) صححه أحمد شاكر والألبانی.الترمذی،أبواب الإيمان، باب ما جاء أن الإسلام بدأ غريبا ...... (٢٧٧٠)، المشكاة (١٧٠) ،أحمد (١/١٨٤)، ابن ماجه (٣٩٨٨).

[7] (٢٤٢) صححه الألبانی، أبو داؤد (٤٥٩٧) ،الترمذی (٢٧٩١) والصحيحة (١٣٩٢،٢٠٣).

[8] (٢٤٣) قاله الإمام أحمد رحمه الله . شرف أصحاب الحديث (١٠١) وفتح الباری (١٣/٢٩٣).

۴ قَالَ يَزِيْدُ بْنُ هَارُوْنَ :قُلْتُ لِحَمَّادِ بْنِ زَيْدٍ :" هَلْ ذَكَرَ اللّٰهُ أَهْلَ الْحَدِيْثِ فِي الْقُرْآنِ؟" قَالَ لِيْ :أَلَمْ تَسْمَعْ إِلٰى قَوْلِهِ :﴿ لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ .﴾ ❶ قَالَ عَبْدُالرَّزَّاقِ صَاحِبُ الْمُصَنَّفِ:" هُمْ أَصْحَابُ الْحَدِيْثِ ." ❷

مزید آنکہ علامہ ناصر الدین البانی حفظہ اللہ سے دریافت کیا گیا کہ خود کو اہل حدیث یا سلفی کہلانا بدعت ہے؟ اس کے جواب میں فرماتے ہیں بھائیو! جن بدعات سے ہمیں رسول اللہ ﷺ نے روکا ہے، ہمیں ڈرایا گیا ہے کہ دین میں بدعات کو داخل نہ ہونے دیں۔ لوگوں کے خیال میں بدعات کے ساتھ تقرب الٰہی حاصل کیا جاتا ہے اس لحاظ سے بدعات کا تعلق وسائل سے نہیں ہے بلکہ ''مقاصد شرعیہ'' کے ساتھ ہے۔ یعنی ان کے نزدیک بدعت سے اللہ کے قرب میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور یہ بات رسول اللہ ﷺ کی مشہور حدیث کے خلاف ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

« مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ .»

''جس شخص نے بھی ہمارے دین میں کسی نئے کام کو داخل کیا تو وہ نیا کام مردود ہے۔''

اس مضمون کی دوسری احادیث بھی معروف ہیں۔ البتہ وسائل جن کو حقیقی مقام حاصل نہیں ہے اور وہ بعد میں دین میں آئے ہیں اگر نص صریح کے خلاف نہیں تو کچھ حرج نہیں جیسا کہ بعض ملکوں میں ہم اپنا نام ''اہل حدیث'' رکھتے ہیں جب کہ یہ نام رکھنے سے مقصود دوسروں پر طعن کرنا نہیں ہے، جو خود کو اہل حدیث نہیں کہتے اس لحاظ سے اس نام کے رکھنے میں ہرگز بدعت کا شائبہ نہیں ہے۔ یہ لقب تو دوسری اصطلاحات کی طرح ایک اصطلاح ہے جیسا کہ علماء نے اصطلاحات وضع کی ہیں اور وہ بات بلاشبہ درست ہے کہ یہ نام بدعات میں سے ہیں لیکن ان بدعات سے نہیں کہ جن کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کیا جاتا ہے چنانچہ کچھ لوگ اپنا نام ''اہلحدیث'' رکھتے ہیں۔ جبکہ بعض لوگ ''سلفی'' کہلاتے ہیں اور بعض ''انصار السنۃ'' کہلاتے ہیں۔ یہ صرف ایک اصطلاح ہے اور اصطلاحات میں کچھ رکاوٹ نہیں ہے لیکن ان لوگوں کا (جماعت المسلمین) اہل حدیث کے نام کو بدعت قرار دینا ان کی جہالت پر دلالت کرتا ہے۔ بدعات سے اصل مقصود اللہ کے قرب میں اضافہ کرنا ہے اور مطلقاً اصطلاحات کے لحاظ سے اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ اعتراضات کرنے والے ان

❶ (۲٤٤) شرف أصحاب الحديث رقم (۱۱۹).

❷ (۲٤٥) شرف أصحاب الحديث رقم (۱۲۰).

اصطلاحات کو اپنے اعتراض کا ہدف بناتے ہیں۔ جو درست نہیں اس سے ان کا مقصد مخصوص وسائل کے ذریعے پھیلنا اوراپنی شہرت چاہنے کے سوا کچھ نہیں۔ (بحواله الفرقة الجديدة :۱۹۱-۱۹۲)

سوال: ایک اہل حدیث عالم بریلویوں کو مشرک قرار دیتے ہیں جب کہ دوسرے کا کہنا تھا کہ ان کو مشرک یا کافر نہیں کہنا چاہیے۔ اب ہم ان کے بارے میں کیا عقیدہ رکھیں کہ اگر ان کو کافر سمجھیں اور واقعتاً یہ مسلمان ہوں تو یہ کفر ہمارے اوپر لوٹے گا (کفر اصغر) اور اگر ان کو مسلمان سمجھیں اور واقعتاً عند اللہ یہ مسلمان نہ ہوں تو اس صورت میں ایک کافر کی تکفیر نہ کرنا بذات خود (کفر اصغر) ہے۔ جب کہ ایک اعتدال کی راہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ ہی بہتر جاننے والا ہے۔ ہم ان کے کافر یا مسلمان ہونے کے بارے کوئی اقرار یا انکار نہیں کرتے۔ اس کے بارے میں راہنمائی فرمائیں؟

جواب : اصل یہ ہے کہ ہر گروہ کو بلا تعصب کتاب و سنت کے بیان کردہ عقیدہ کی بنیاد پر پرکھنا چاہیے جو اس سے بھٹکا ہوا نظر آئے اس کے مناسب حال اس پر فتویٰ لگے گا چاہے کوئی بریلوی ہو یا اس کا غیر۔ غور فرمایئے! جب ان لوگوں کے مشرکانہ، بدعیہ، کفریہ عقائد باطلہ بلا بحث وتکرار سب کے ہاں معروف ہیں تو یقیناً اس کے مطابق ہی ان کو صلہ ملنا چاہیے۔ سعودی عرب کی بحث وفتویٰ کی دائمی کمیٹی سے کسی نے بریلوی عقائد کے متعلق سوال کیا تو جواباً انہوں نے کہا اکثر و بیشتر یہ کفریہ و بدعی صفات ہیں جو توحید اللہ اور منزل من اللہ کتب کے متناقض ہیں۔ ایسی صفات سے متصف امام کی اقتداء میں نماز پڑھنی جائز نہیں۔ ملاحظہ ہو: (مجلة البحوث الاسلامیه شماره ٣٦)۔

حتمی غلط و باطل عقائد پر سکوت کرنا اہل حق کا شیوہ نہیں۔ ہاں البتہ یہ ضروری ہے کہ انداز حکیمانہ ہو۔ جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ اس بات کے مامور من اللہ تھے:

﴿ اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ . ﴾ (سورة النحل:١٢٥)

سوال: بعض حضرات اپنے مذہب کو سچا ثابت کرنے کے لیے کہ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ خدا سے منوا سکتے ہیں۔ بخاری شریف کی حدیث کہ جس میں یہ ہے کہ بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے کرم پر بھروسہ کر کے قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم سچ کر دیتا ہے۔ (بخاری، تفسیر سورۃ البقرۃ آیت: ﴿ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ...... ﴾ (البقرة:١٧٨) پیش کرتے ہیں جب کہ اللہ کے

نبی ﷺ اپنے چچا کی ہدایت کے لیے دعاء مانگ رہے ہیں؟ مگر وہ ایمان نہ لائے۔ جب کہ آپ کا بھروسہ یقیناً کامل تھا!!

جواب: کتاب وسنت میں بے شمار نصوص ایسی موجود ہیں جو اس بات پر دال ہیں کہ مختار کل صرف اللہ ہے اس کی مخلوق میں سے کسی کو اس کے اعمال وافعال میں دخل نہیں۔ فرمایا:

﴿ وَ رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ تَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ (القصص: ٦٨)

''اور تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) برگزیدہ کر لیتا ہے۔ ان کو اس کا اختیار نہیں ہے۔ یہ جو شرک کرتے ہیں اللہ اس سے پاک و بالاتر ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ ﴾ (المؤمنون: ٨٨)

اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابل کوئی پناہ نہیں دے سکتا اور ''قصہ ابوطالب'' جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے یہ بھی اس امر کی واضح دلیل ہے۔ اور جہاں تک تعلق ہے بعض لوگوں کی قسموں کو پورا کرنے کا سو یہ صرف اللہ کی طرف سے بطور اعزاز و اکرام کے ہے نہ کہ بندے کا اللہ پر کوئی حق واجب ہے ماسوائے معتزلہ کے، جملہ اہل سنت اس بات پر متفق ہیں کہ بندے کی طرف سے اللہ پر کوئی شے واجب نہیں۔ ملاحظہ ہو شرح عقیدہ طحاویہ وغیرہ۔

سوال: ایک جماعت کی شوریٰ کمیٹی کے ممبران کی کیا خصوصیات ہونی چاہئیں؟ اور شوریٰ کے ممبران منتخب کرنے کے لیے شرعی طریقہ کیا ہے؟ آج کل کی جماعتوں کی حالت کا تو آپ کو بھی علم ہے۔ کیا ان جماعتوں کے ہوتے ہوئے اگر ہم دیکھیں کہ یہ جماعتیں کتاب وسنت کے مطابق کام نہیں کر رہی ہیں تو کیا دوسری جماعت بنا سکتے ہیں؟

جواب: ارکان شوریٰ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اہل علم اور امین ہوں۔ شیخین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ ان اوصاف کے حاملین سے مشورہ کرتے تھے۔

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَكَانَتِ الْأَئِمَّةُ بَعْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَشِيْرُوْنَ الْأُمَنَاءَ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ

فِي الْأُمُورِ الْمُبَاحَةِ لِيَأْخُذُوْ بِأَسْهَلِهَا۔۔۔۔۔۔۔وَكَانَ الْقُرَّاءُ أَصْحَابَ مَشُورَةِ عُمَرَ كُهُوْلًا كَانُوا أَوْ شُبَّانًا وَكَانَ وَقَّافًا عِنْدَ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ ." (بَابُ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَ أَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ) ❶

جن کے علم وتقویٰ پر خلیفہ وقت کو اعتماد ہو۔ بوقت ضرورت ان سے مشورہ لے سکتا ہے۔ اور اپنی صوابدید سے ان کو منتخب بھی کرسکتا ہے۔ موجودہ حالات میں کوشش کرنی چاہیے کہ اقرب الصواب جماعت کا انتخاب کر لیا جائے۔

یا پھر بلا قید افعال خیر میں سب کا تعاون جاری رکھا جائے اور ان کے شر سے بچنے کی کوشش کی جائے۔

نئی جماعت کھڑی کرنے سے ممکن ہے مزید فتنے جنم لیں۔ حتی المقدور اس سے احتراز کرنا چاہیے اور موجود جماعتوں کی اصلاح کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔ وَالتَّوْفِيْقُ بِيَدِاللّٰهِ. اور اگر یہ بھی ناممکن ہوتو پھر سب سے علیحدگی کی صورت میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جیسا کردار ادا کرنا چاہیے ❷ یہاں تک کہ سب کے سب کلمۂ واحد پر جمع ہو جائیں۔ تعجب خیز بات یہ ہے کہ مدعیان کتاب وسنت بذات خود ان کی تعلیمات و دعوت سے عملی زندگی میں کوسوں دور نظر آتے ہیں۔ جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ ابھی تک کوئی مصلح مؤثر نظر نہیں آ رہا جو اقتدار کے لالچی اور پجاری طبقہ کو یکجا کر سکے۔

﴿ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا . ﴾ (الطلاق:۱)

سوال: تنظیم سازی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ تنظیم سازی کرنا عین اسلام کی خدمت ہے یا گناہ کبیرہ؟ یا بدعت ہے؟ واضح رہے کہ ایک ہی عقیدہ ونظریہ کے حامل قرآن وسنت کے پیروکاروں نے مختلف ناموں سے بے شمار تنظیمیں بنا ڈالی ہیں۔ اوروہ سرگرم عمل ہیں لیکن متحد نہیں اور ایک امیر نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کی مخالفت کرتی ہیں۔ الغرض آج کل تنظیم ہی کو معیار حب وبغض تصور کرلیا گیا ہے۔

اب اس صورت حال میں ایک عام مسلمان کا کیا رویہ ہونا چاہیے؟ نیز شرعی خلافت اور امارت کی غیر موجودگی میں ایک مسلمان اپنی زندگی کس طرح بسر کرے؟

---

❶(۲٤٦) صحیح البخاری ،کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة ،باب قول الله تعالٰی :﴿وأمرهم شورٰی بینهم ﴾ باب ۲۸.

❷(۲٤۷) فی خلافة امیر المومنین علی بن ابی طالب و معاویة رضی الله عنهما.

جواب: امام وقت اگر محسوس کرے تو ''تنظیم سازی'' کا جواز ہے۔ ''صحیح بخاری'' میں حدیث ہے:

«اُكْتُبُوا لِيْ مَنْ تَلَفَّظَ بِالْإِسْلَامِ مِنَ النَّاسِ .»❶ (بَابُ كِتَابَةِ الْإِمَامِ النَّاسَ)

یعنی ''مجھے ان لوگوں کے نام لکھ کر دو جو مسلمان ہو چکے ہیں۔''

لیکن یہ ''تنظیم سازی'' کفر کے مقابلے میں ہے آپس میں نہیں۔ ہم مسلک اور ہم مشرب مختلف گروہوں اور جماعتوں کی ''تنظیم سازی'' اتفاق کے بجائے افتراق کا سبب بنے گی۔ اس سے بچاؤ ضروری ہے۔

امت مسلمہ کے ذمہ سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ خلافت و امارت کے قیام کے لیے سعی کریں۔ جملہ امور شریعت ایک نظم و نسق کے تحت آنے سے ہی ملی وحدت کا خواب پورا ہوسکتا ہے۔ ورنہ انجام کار تشتت و تفرق اور انتشار کے ماسوا کچھ نہ ہوگا۔ قرآنی تعلیمات میں اس سے ہمیں باز رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

﴿وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ .﴾ (الانفال:٤٦)

اور امام المحدثین بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے: ''مَا يُكْرَهُ مِنَ التَّنَازُعِ وَالْاِخْتِلَافِ فِي الْحَرْبِ وَ عُقُوْبَةِ مَنْ عَصٰى إِمَامَهُ.'' ❷ پھر آیت بالا سے استدلال کیا ہے۔

انتہائی دکھ درد اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج سیکولر ملحدانہ اور بے دین نظریات کے حامل افراد اور تنظیمیں پوری ہمت اور قوت کے ساتھ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف اپنی ریشہ دوانیوں اور توانائیوں کو استعمال کر رہے ہیں۔ کسی حد تک وہ اپنی کامیابی و کامرانی کے خواب پورے ہوتے بھی دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اسلام کے علمبردار اور مدعیان کتاب و سنت بالخصوص سلفی یا اہل حدیث حضرات بری طرح افتراق و انتشار کا شکار ہیں۔ جس سے واپسی کی راہ بظاہر کوئی نظر نہیں آتی۔ '' إِلَّا أَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْئٍ عِلْمًا .''

دراصل بات یہ ہے کہ قریباً ہر جماعت اور ہر تنظیم کے ذمہ داران اور قائدین حضرات کے ذاتی نوعیت کے کچھ مفادات اور اغراض و مقاصد ہیں جن سے وابستگی ان کے نزدیک جزو ایمان ہے۔ عوام کالانعام کو دجل و فریب کے ذریعہ سبز باغ دکھا کر انہی کی تکمیل و ترویج میں شب و روز مصروف کار ہیں۔ اسی کے نتیجہ میں جگہ

---

❶(٢٤٨) صحيح البخاري، كتاب الجهاد، باب كتابة الإمام الناس(٣٠٦٠).

❷(٢٤٩) صحيح البخاري، كتاب الجهاد، رقم الباب(١٦٤).

جگہ لڑائی جھگڑے اور ریاکاری اور قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ اور تکفیری توپوں کے رخ غیروں کی بجائے اپنوں کی طرف زیادہ ہیں۔ اندریں حالات خیر و سلامتی کی راہ مجھے تو صرف اس میں نظر آتی ہے کہ جماعتی سیاست سے گوشہ نشینی اختیار کر کے مخلصین احباب کو ساتھ ملا کر یا انفرادی طور پر جیسے بھی ممکن ہو، شہر شہر، قریہ قریہ دعوتی و تبلیغی کام پورے انہاک سے شروع کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ خیر و برکت فرما کر شرف قبولیت سے نوازے گا۔ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ.

سوال: ہمارے علاقہ (شہداد کوٹ سندھ) میں ایک تنظیم عرصہ سے کام کر رہی ہے۔ تقریباً ۴۰ یا ۵۰ برس سے۔ اب اس کے بعد یہاں ایک اور تنظیم نے جنم لیا ہے پہلی تنظیم کا کہنا یہ ہے کہ دوسری تنظیم نے یہاں اختلاف و افتراق پیدا کیا ہے۔ جب کہ دوسری تنظیم کہتی ہے کہ ہم دین کا کام کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہمیں یہاں کام سے نہ روکا جائے۔ الغرض ایسی صورت حال میں ہمیں شرعی طور پر کیا کرنا چاہیے؟ کس کا ساتھ دینا چاہیے؟ یا پھر علیحدگی اختیار کی جائے؟ نیز ان کے دینی پروگرامز کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب: بلا امتیاز جن لوگوں میں خیر کا پہلو غالب نظر آئے ان کا ساتھ دیں، لیکن پارٹی بازی کی ضرر رسانی سے احتراز کریں۔

سوال: حدیث: «مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَمَاتَ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً.»(بخاری و مسلم) [1]

کیا یہ حدیث موجودہ دور کی تنظیموں کے متعلق اللہ کے نبی ﷺ نے بیان فرمائی ہے؟ کیوں کہ آج کل ہر "امیر" اسے اپنی تنظیم اور "اطاعت" کے لیے بطور دلیل پیش کرتا ہے۔ اس حدیث کا صحیح مطلب کیا ہے؟

جواب: حدیث ہذا اپنی جگہ برحق ہے۔ لیکن اس کا تعلق امامت کبریٰ سے ہے۔ جاہلیت کی موت کی وعید اس صورت میں ہے، جب بااختیار امام موجود ہو۔ اب چونکہ امام نہیں اس لیے وعید بھی نہیں۔

سوال: موجودہ دور کی جہادی تنظیمیں اور ان کا جہاد آپ کے سامنے ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ ہر ایک تنظیم کا اپنا نظم اور وسائل الگ الگ ہیں۔ نیز تعاون و فنڈ حاصل کرنے کے لیے ہر تنظیم اپنے کارناموں کو اپنے اپنے جرائد میں بڑھ چڑھ کر بیان کرتے ہیں اور اپنی تنظیم کی پبلسٹی کرتے ہیں۔ اور ان تنظیموں کے کارکنوں کو اللہ کی

---

[1] (٢٥٠) صحيح البخاری، كتاب الفتن، باب قول النبیﷺ «سترون بعدی أمورا» (٧٠٥٤)، صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب وجوب ملازمة جماعة المسلمين (٤٧٨٦ إلى ٤٧٩٣) والصحيحة (٩٨٣).

قسم میں نے خود ایک دوسرے کی مخالفت کرتے سنا ہے۔ اب ایسی صورت حال میں ایک مسلمان اپنے خون پسینے کی کمائی کس تنظیم کی نذر کرے؟

جواب: موجودہ جہادی تنظیمیں اگر واقعتاً اپنے اعمال واقوال میں مخلص ہیں تو کم ازکم ان کو کلمۃ واحدۃ پر جمع ہو جانا چاہیے تاکہ ثمرات و غایات کا حصول آسانی سے ممکن ہو سکے۔ ان کے آپس کے نزاع کو بھی ختم کرنے کا یہ آسان ترین نسخہ ہے کہ کسی ایک کی قیادت پر مجتمع ہو جائیں، ایک عام مسلمان اپنی حلال کی کمائی سے بلاامتیاز ان مجاہدین کی امداد کرے جن کو وہ أَقْرَبُ إِلَى الصَّوَاب سمجھتا ہے۔

سوال: تقلید ائمہ کو بعض لوگ واجب کہتے ہیں اور غیر مقلد کو بدمذہب۔ لہٰذا تقلید ائمہ پر تفصیل سے روشنی ڈالیں؟

جواب: کسی کا قول بغیر دلیل لینے کا نام تقلید ہے اور یہ حرام ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ . ﴾ (الأعراف:۳)

"(لوگو!) جو کتاب تم پر تمہارے پروردگار کے ہاں سے نازل ہوئی ہے، اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا اور رفیقوں کی پیروی نہ کرو۔"

اسی بناء پر بے شمار نصوص میں ائمۂ عظام نے اپنی تقلید سے روکا ہے۔ تقلید کو واجب قرار دینا دراصل اپنے کو "شرک فی الرسالت" کا مرتکب ٹھہرانا ہے، جب کہ بقول شاہ ولی اللہ عہد رسالت سے یہ صدیوں بعد کی پیداوار ہے تو پھر واجب کیسے ہو گی۔ بعض حنفی فقہاء نے تصریح کی ہے کہ کوئی چیز واجب نہیں ہوتی مگر وہ چیز جس کو اللہ واجب کرے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی پر واجب نہیں کیا ہے کہ وہ اماموں میں سے کسی امام کا مذہب پکڑے۔ پس اس کو اپنے اوپر واجب ٹھہرانا اپنی طرف سے نئی شرع ایجاد کرنا ہے۔ ملاحظہ ہو :مُسَلَّمُ الثُّبُوت مع شرح بحر العلوم.

علامہ ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ نے بھی تسلیم کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان کو حنفی شافعی وغیرہ بننے کا حکم نہیں دیا۔ امام شعرانی رحمہ اللہ "میزان الکبریٰ" میں فرماتے ہیں جو شخص ولی کامل ہے وہ کسی کا مقلد نہیں ہوتا بلکہ وہ علم اس چشمہ سے حاصل کرتا ہے جس سے مجتہدین نے کیا ہے۔

شیخ کردی اپنے رسالہ میں فرماتے ہیں یعنی "طریقہ مشائخ صوفیہ" کا عموماً اور "طریقہ اکابر نقشبندیہ" کا خصوصاً اتباع سنت ہے اور وہ کسی متعین مذہب کے مقلد نہ تھے۔

ردالمحتار میں ہے:

" لَيْسَ عَلَى الْإِنْسَانِ الْتِزَامُ مَذْهَبٍ مُعَيَّنٍ . "

یعنی ''انسان پر واجب نہیں کہ کسی معین مذہب کو اختیار کرے۔''

کتاب وسنت پر عامل انسان کو بے مذہب کہنا اصلاً شرعی نصوص سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔

اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں کو فہم وبصیرت عطا فرمائے۔ آمین!

❀❀❀❀❀❀❀

فرمانِ باری تعالیٰ

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ . ﴾ (النساء:٤٨)

﴿ وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً أَوْظَلَمُوْٓا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوْا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ . ﴾

(آل عمران:١٣٥)

﴿۱۶﴾ کفر، شرک اور مشرکین

سوال: کیا مشرک سے مراد صرف بت پرست یا آتش پرست ہیں؟ یا اس میں کتابی مشرک بھی شامل ہیں؟

جواب: ''سورۃ بقرۃ'' کی آیت :﴿ وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ . ﴾ (۲۲۱) کتابیہ عورت کے علاوہ سب مشرکات کو شامل ہے۔ کتابیہ عورت سے نکاح سورۂ مائدہ کی آیت : ﴿ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ . ﴾ کی بناء پر جائز ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فَقَالَتْ طَائِفَةٌ :حَرَّمَ اللّٰهُ نِكَاحَ الْمُشْرِكَاتِ فِيْ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ ثُمَّ نَسَخَ مِنْ هٰذِهِ الْجُمْلَةِ نِسَاءَ أَهْلِ الْكِتَابِ فَأَحَلَّهُنَّ فِيْ سُوْرَةِ الْمَائِدَةِ ." (أحكام القرآن ۳/۶۷)

''سورہ بقرہ'' مدینہ میں نزول کے اعتبار سے اوائل احکام سے ہے جبکہ مائدہ اواخر سے ہے۔ جس کی بناء پر آیت بقرہ کے حکم کو عام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سابقہ دلیل کی بناء پر کتابیہ عورت کے علاوہ ''سورہ بقرہ'' کی آیت کا اطلاق تمام قسم کی مشرکات پر ہے۔

سوال: اہل کتاب کے عقیدہ وعمل سے یہ واضح ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں شرک کرتے ہیں تو کیا پھر وہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۲۱ کے ذیل میں نہیں آتے؟

جبکہ قرآن میں متعدد مقامات پر یہود ونصاریٰ کو ان کے شرک کی وجہ سے ملامت کی گئی ہے اور ان کا ٹھکانہ جہنم بتایا گیا ہے (مثلاً سورۃ البینۃ، سورۃ مریم وغیرھا)

اسی طرح کئی مقامات پر یہود ونصاریٰ سے دوستی لگانے سے منع کیا گیا ہے بلکہ اپنے بہن بھائی، ماں باپ اور رشتہ داروں سے بھی قطع تعلق کرنے کا حکم ہے۔ جب وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کو پسند کریں۔ (سورۃ التوبۃ: ۲۳،۲۴)

ازدواجی تعلق ایک معاشرے کی تشکیل میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ اب اگر ہم (سورۂ مائدہ:۵) کی

رو سے یہود و نصاریٰ سے ازدواجی تعلق قائم کرتے ہیں تو قرآن میں متعدد آیات جو یہود و نصاریٰ کے متعلق نازل ہوئی ہیں، انہیں سمجھنے میں پریشانی اور الجھن ہوتی ہے۔

جواب: کتابیات (اہل کتاب کی عورتیں) ''سورۂ بقرہ'' کی آیت سے سابقہ دلیل کی بناء پر جو کہ سوال میں مذکور ہے، مستثنیٰ ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے کتابیہ کو غلط عقیدہ، نظریہ بنوت (عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا ماننے) کے باوجود مستثنیٰ قرار دیا ہے تو ہم بھی اسے عام مشرکات سے مستثنیٰ کریں گے اس لیے کہ تشریع کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ بندوں کو نہیں۔ بندے کا کام اطاعت و فرمانبرداری کرنا ہے۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے متعدد قرآنی آیات میں یہود و نصاریٰ کو شرک کی وجہ سے ملامت کی ہے لیکن اس نے اپنی حکمت کاملہ کی بنا پر ان کی عورتوں سے ازدواجی تعلق ہمارے لیے جائز رکھا ہے جسے حرام کرنے کے ہم قطعاً مجاز نہیں۔ مفسر قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَقَالَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ:وَأَمَّا الْآيَتَانِ فَلَا تَعَارُضَ بَيْنَهُمَا فَإِنَّ ظَاهِرَ لَفْظِ الشِّرْكِ لَا يَتَنَاوَلُ أَهْلَ الْكِتَابِ لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿ مَايَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ . ﴾ وَقَالَ: ﴿ لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ . ﴾ فَفَرَّقَ بَيْنَهُمْ فِي اللَّفْظِ،وَ ظَاهِرُ الْعَطْفِ يَقْتَضِي مُغَايَرَةً بَيْنَ الْمَعْطُوفِ وَالْمَعْطُوفِ عَلَيْهِ وَأَيْضًا فَاسْمُ الشِّرْكِ عُمُومٌ وَ لَيْسَ بِنَصٍّ ." (أحكام القرآن ٣/٦٩)

یعنی ''بعض علماء نے کہا دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ظاہراً لفظ شرک اہل کتاب کو متناول نہیں کیونکہ مشارالیہ قرآنی آیات میں اہل کتاب اور مشرکین کا حرف عطف سے جداگانہ ذکر ہے جو تغایر کا متقاضی ہے اور اسی طرح اسم شرک عام ہے، موضوع میں نص نہیں۔''

واضح ہو کہ دیگر قرآنی آیات کا تعلق ازدواجی زندگی سے نہیں بلکہ اہل کتاب کے غلط عقائد و نظریات سے ہے جس کی تردید بہر صورت ضروری ہے۔

سوال: کیا لفظ ''داتا'' کہنا یا حضور ﷺ کو عالم الغیب ماننا شرک ہے؟ ایک بریلوی نے جواب دیا ہے کہ شرک اسے کہتے ہیں کہ اللہ کی ذات اور صفات اور افعال میں کسی کو حصہ دار مانا جائے۔

جواب: یاد رہے ''داتا'' (مافوق الاسباب دینے والا) ہونا اور علم غیب صفات اللہ عزوجل کے ساتھ مخصوص

ہیں تو مخلوق میں ان کو تسلیم کرنا اسی کا نام شرک ہے۔

سوال: راجیو گاندھی کے قتل کی خبر سن کر ایک تعلیم یافتہ شخص کے منہ سے بے ساختہ "إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّآ إِلَيْهِ رَاجِعُوْن" نکلا۔ خبر سنانے والے نے اعتراض کیا کسی غیر مسلم کی موت پر یہ قرآنی جملہ نہیں پڑھنا چاہئے۔ محلے کے خطیب سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن میری تسلی نہیں ہوئی۔ کیوں کہ قرآن پاک میں جہاں یہ جملہ آیا ہے اس کے سیاق وسباق میں صابروں اور ہدایت یافتہ لوگوں کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ صبر اور ہدایت یافتگی ایک مسلم ہی کا شعار ہوسکتا ہے۔ بہرحال آپ جواب دیتے وقت صرف منطقی اور قرآنی دلائل ہی نہ دیں بلکہ یہ بھی فرمائیں کہ ہمارے ہادی برحق ﷺ اور دیگر اسلاف گرامی کی اس سلسلے میں کیا روش تھی؟

جواب: ایک کافر، مشرک کی موت پر "اِنَّا لِلّٰهِ" یا افسوس کا اظہار نہیں ہونا چاہیے تھا، سبقت لسانی سے خطا ہو گئی ہے۔ تو "أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ" پڑھنا چاہیے۔ محلّہ کے خطیب صاحب سے سہو ہوا ہے۔ قرآن مجید نے فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت کا تناظر بیان فرمایا ہے:

﴿ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ . ﴾ (الدخان: ۲۹)

"پھر اُن پر نہ تو آسمان اور زمین کو رونا آیا اور نہ ان کو مہلت ہی دی گئی۔"

پھر مومن کے لیے لائق ہے کہ کافر کی موت پر افسوس کا اظہار کرے: ہرگز نہیں۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

" قَالَ أَبُوْلَهَبٍ (عَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ) لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ ، فَنَزَلَتْ:﴿ تَبَّتْ يَدَآ أَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ . ﴾

یعنی "ابولہب نے (اس پر اللہ کی لعنت ہو) نبی ﷺ کو کہا تھا: " تَبًّالَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ ." (بخاری، باب شِرَارِ الْمَوْتٰی) ❶

اس سے معلوم ہوا کہ کافر کے فقدان پر افسوس کی بجائے اظہار ناراضی ہونا چاہیے۔ دوسری روایت میں ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے نبی ﷺ سے عرض کی: آپ کا گمراہ چچا ابوطالب مر گیا۔ فرمایا: جا

❶ (۲۵۱) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب ذکر شرارا لموتی (۱۳۹٤).

اسے دفن کر دے۔ کوئی نیا کام مت کرنا حتی کہ تو میرے پاس آئے۔ پس میں گیا اس کو دفن کر کے واپس آیا تو آپ ﷺ نے مجھے غسل کا حکم دیا اور میرے لیے دعا کی۔ ❶

(بَابُ الرَّجُلِ يَمُوتُ لَه قَرَابَةٌ مُشْرِكٌ ، سنن أبي داؤد)

اگر کافر کی موت پر اظہار افسوس روا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ خواہ ادنیٰ سے ادنیٰ الفاظ میں کرتے، یہاں ضرور کرتے کیونکہ ابوطالب نے دنیاوی زندگی میں رسول اللہ ﷺ کا بھر پور ساتھ دیا تھا، ابوطالب ہی نے رسول اللہ ﷺ کو کہا تھا:

فَاصْدَعْ بِأَمْرِكَ مَا عَلَيْكَ غَضَاضَةٌ
حَتّٰى أُوَسَّدَ فِي التُّرَابِ دَفِيْنًا ❷

یعنی "جب تک قبر کی مٹی میرا تکیہ نہیں بن جاتی لوگوں تک اپنا پیغام دل کھول کر پہنچا دیجیے۔"

اس وقت کلمہ خیر کے نطق سے رسول اللہ ﷺ کی مکمل خاموشی عدم جواز کی دلیل ہے۔ وَاللّٰهُ وَلِيُّ التَّوْفِيْق.

سوال: ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ جب کسی کے ماں باپ ناراض ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے والدین کے پیر پکڑ کر ان کو راضی کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ پاؤں پکڑنے کے لیے اس کو جھکنا پڑتا ہے اور جھکنا صرف اللہ کے آگے جائز ہے لیکن ایک بات ہے کہ اس کی نیت عبادت کے طور پر جھکنا نہیں ہوتی۔ کیا یہ جائز ہے یا نہیں، اگر نمازی کے آگے آگ ہو تو وہ نماز پڑھ سکتا ہے۔ اگر نیت اس کو پوجنے کی نہ ہو تو اس طرح کیا جھکنا درست ہے یا نہیں؟

جواب: (ا) بلانیت عبادت طبعی حالت میں جھکنے کا کوئی حرج نہیں۔ بطور تعظیم جھکنا ناجائز ہے۔

(ب) نمازی کے آگے آگ ہو اور نیت محض اللہ کی عبادت اور اس کی رضا مقصود ہو تو نماز درست ہے۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ بحالت نماز نبی ﷺ کے سامنے دوزخ کا منظر پیش کیا گیا تھا۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«عُرِضَتْ عَلَيَّ النَّارُ وَأَنَا أُصَلِّيْ .» ❸

---

❶(٢٥٢) صححه الألباني،صحيح أبي داؤد، باب الرجل يموت له قرابة مشرك (٣٢١٤) للألباني، والنسائي، كتاب الطهارة، باب الغسل من موالاة مشرك (١٨٤) والجنائز (١٨٩٥).

❷(٢٥٣) ابن هشام (١/٢٦٥،٢٦٦) بحواله الرحيق المختوم ص١٣٩.

❸(٢٥٤) صحيح البخاري ،كتاب الصلاة ،باب (٤٣١) تعليقاً.

یعنی ''نماز کی حالت میں مجھ پر آگ پیش کی گئی۔''

اس مسئلہ پر امام بخاری رحمہ اللہ نے بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

'' مَنْ صَلّٰی وَ قُدَّامَهُ تَنُّورٌ أَوْ نَارٌ أَوْ شَيْئٌ مِمَّا يُعْبَدُ فَأَرَادَ بِهِ وَجْهَ اللّٰهِ .''

سوال: ایک انسان نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، حج، زکوۃ اور صدقہ و خیرات کرتا ہے۔ لوگوں کی نظروں میں متقی ہے۔ لیکن اس کا عقیدہ توحید ٹھیک نہیں۔ جیسا کہ بعض حضرات نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب دان اور مختارکل وغیرہ جانتے ہیں تو کیا ایسے انسان کی عبادات اللہ کے ہاں قبول ہوں گی؟

جواب: غلط عقیدے کے حامل آدمی کے ساتھ معاملہ اس کے اعمال کے مطابق ہوگا۔ سوال میں مذکور عقائد، اسلامی تعلیمات سے متصادم ہیں، جن کی اصلاح از بس ضروری ہے۔ بصورت دیگر شرک کے ساتھ کسی عمل کے قبول ہونے کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهِ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ . ﴾ (النساء:٤٨)

''اللہ (یہ گناہ) نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے علاوہ دوسرے گناہ جسے چاہے معاف کر دے گا۔''

سوال: آیا حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویاں غیر مسلم تھیں؟ اگر غیر مسلم تھیں تو پھر مشرک اور موحد کا نکاح کیسے ہوسکتا ہے؟ نیز واضح کریں کہ دونوں بیویوں کو عذاب کس بناء پر ہوا؟

جواب: ''سورۃُ التَّحرِیم'' میں ان عورتوں کی خیانت کا ذکر ہے شرک کا نہیں۔ ان کو عذاب کا سبب نفاق کی صورت میں کفار سے گہرا رابطہ اور اظہار ہمدردی کی بناء پر ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

'' كَانَتِ امْرَأَةُ نُوحٍ تَقُوْلُ لِلنَّاسِ: إِنَّهُ مَجْنُوْنٌ وَ كَانَتِ امْرَأَةُ لُوْطٍ تُخْبِرُ بِأَضْيَافِهِ'' (تفسیر قرطبی ٣٠٢/٢٠)

یعنی ''نوح علیہ السلام کی بیوی لوگوں سے کہتی کہ یہ پاگل ہے اور لوط علیہ السلام کی بیوی لوگوں کو مہمانوں سے آگاہ کرتی۔''

سوال: بعض لوگ مشکل وقت میں ''یا علی مدد'' اور ''یا رسول اللہ مدد'' قسم کے کلمات ادا کرتے ہیں، کیا یہ کہنا درست ہے؟

جواب: مصائب و مشکلات میں اس طرح کے الفاظ کہنا شرک ہے۔ متعدد قرآنی آیات میں ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی مشکل کشا نہیں۔

سوال: زید نے کہا کہ اگر میں فلاں کام کروں تو کافر ہو جاؤں پھر وہ یہ کام کر بھی لیتا ہے تو کیا وہ کافر ہو جائے گا؟

جواب: ایسے شخص کو اپنے فعل سے تائب ہونا چاہیے۔ اور اگر وہ اس پر مصر ہو اور توبہ کے لیے تیار نہ ہو تو اس کا عود الی الکفر ہوگا۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوْٓا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ . ﴾ (آل عمران:۱۳۵)

''اور وہ کہ جب کوئی کھلا گناہ یا اپنے حق میں کوئی اور برائی کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے۔ اور جان بوجھ کر اپنے افعال پر اڑے نہیں رہتے۔''

سوال: کفر کی کل کتنی اقسام ہیں؟ ہر قسم تفصیل سے واضح فرمائیں؟

جواب: کفر کی چار قسمیں ہیں:

① ...... کُفرِ اِنکار

② ...... کُفرِ عِناد

③ ...... کُفرِ جُحُود

④ ...... کُفرِ نِفَاق

① کفر انکار: عام لوگوں کا کفر ہے، جو عام طور پر جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے۔

② کفر عناد: حق معلوم ہونے کے باوجود صرف ضد کی وجہ سے ہوتا ہے، جیسے ابو طالب کا کفر![1] وہ اس بات پر اڑ گیا تھا کہ قوم مجھے طعن نہ کرے کہ یہ اپنے آباء و اجداد کا دین چھوڑ کر بھتیجے کے پیچھے لگ گیا ہے۔

③ کفر جحود: وہ کفر ہے جو دیدہ و دانستہ مخالفت کی وجہ سے ہو۔ جیسا کہ ابوجہل اور فرعون وغیرہ کا کفر تھا۔

---

[1] (۲۵۵) صحيح البخاري، كتاب مناقب الأنصار، باب قصة أبي طالب (۳۸۸٤).

قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا. ﴾ (النمل:١٤)

④ **کفر نفاق:** یہ ہے کہ بظاہر ایمان ہو اور اندرونی طور پر کفر...... اس کی دو صورتیں ہیں:

1 ...... مصمم ❶ 2 ...... مشکوک ❷

ان کی امثلہ: ﴿ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا. ﴾ (البقرة:١٧) اور ﴿ أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ. ﴾ (البقرة: ١٩) ہیں۔

❀❀❀❀❀❀❀

❶ (٢٥٦) جیسے عبداللہ بن اُبی ابن سلول کا نفاق۔

❷ (٢٥٧) مثلاً: اچھائی فائدہ نظر آئے تو اسلام کا اظہار، ورنہ تذبذب کا شکار۔

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ

''حجۃ اللہ البالغہ'' میں لکھتے ہیں:

''صحیح بخاری اور صحیح مسلم پر تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ ان دونوں اماموں کی مرفوع متصل حدیثیں قطعی طور پر صحیح ہیں یہی وجہ ہے کہ محدثین صحیح بخاری کی کسی حدیث کے بارے میں اسماء الرجال کی کتابیں نکال کر راویوں پر تعدیل و جرح کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ کیوں کہ بخاری میں کسی حدیث کا آنا صرف رواۃ کے معیار پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ اس کی صحت کی دوسری صورتیں بھی ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔''

﴿۱۷﴾ منکرینِ حدیث وسنت

عورت کی سربراہی کے متعلق منکرین حدیث کا شیخ ابن باز کے فتویٰ پر تعاقب اور جواب میں حافظ ثناء اللہ صاحب کا ان کے شکوک وشبہات کا ازالہ

پاکستان جو دور حاضر میں اسلام کا عملی نمونہ پیش کرنے کے لیے معرض وجود میں آیا تھا۔ جب حالیہ انتخابات کے نتیجے میں ایک عورت حکومت کی سربراہ بنی تو عالم اسلام میں بے چینی قدرتی بات تھی۔ کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی سینتالیس ریاستوں میں صرف پاکستان ہی ایسی اسلامی ریاست ہے۔ جس میں حکومت کی سربراہ ایک نوجوان عورت ہے۔ چنانچہ یہ مسئلہ پاکستان اور بیرونِ پاکستان علمی حلقوں میں موضوع بحث بنا کہ عورت کی سربراہی اسلام میں جائز نہیں اور اس سلسلے میں قرآنی آیات کے علاوہ احادیث میں رسول اکرم ﷺ کی طرف سے عورت کی سربراہی کے بارے میں جو مذمتیں اور وعیدیں وارد ہوئی ہیں وہ بھی پیش کی گئیں۔ مغربی اِلحاد کے علمبرداروں کو اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ ایک عرصہ کے بعد ان کی اقتدار تک رسائی ہوئی ہے۔ اس لیے انہیں علمائے دین کی ان تحریکوں اور فتووں کی بڑی تکلیف پہنچی ہے کہ وہ کتاب وسنت کو اپنی دلیل کیوں بناتے ہیں۔ کیوں کہ سیکولرازم میں دین وشریعت مسلمانوں کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ اس کا اجتماعی امور اور سیاست میں کوئی دخل نہیں۔ لہٰذا انہوں نے علمائے دین کے فتووں کو یوں بے حیثیت کرنے کی کوشش کی کہ فتویٰ تو ایک سرکاری منصب ہے۔ ان علماء کی سرکاری حیثیت کچھ نہیں۔ لیکن جب عالم اسلام کے مسلمہ دینی قائد اور حرمین شریفین سمیت عرب دنیا کے مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ جنہیں بلاشبہ دور حاضر کا شیخ الاسلام کہا جا سکتا ہے، نے بعض اہل علم کے سوال کے جواب میں اسلامی ملک کی سربراہی کے لیے عورت کے نااہل ہونے کا فتویٰ صادر کیا تو یہ سرکاری فتویٰ کی رٹ لگانے والے بڑے پریشان ہوئے۔ واضح رہے کہ شیخ ابن باز حفظہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان میں بے نظیر کے وزیراعظم بننے سے پہلے بھی کویت کے ہفت روزہ

"الجتمع" کے سوال پر عورت کی سربراہی کے بارے میں اپنے اسی طرح کے فتویٰ کی تفصیل مع دلائل بیان کر دی تھی۔ ملت اسلامیہ کی ایسی نامور شخصیت اور عالم اسلام کے معتمد دیگر مفتیان کے فتاویٰ کا یہ اتفاق اسلام میں اجماع کی حیثیت رکھتا ہے۔

پاکستان میں مغربی اِلحاد کے ترجمانوں نے جب قرآنی آیات کی تفسیر احادیث رسول اللہ ﷺ سے متعین ہو جانے کے بعد خود کو بے بس پایا تو احادیث کو ضعیف قرار دینے کی بھونڈی صورت اختیار کی۔ حالانکہ کہاں فن حدیث کی مہارت کا شرف اور کہاں ان کی بے بصیرتی، فن حدیث امت مسلمہ کا وہ امتیاز ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے دائمی اور ابدی ہونے کا زندہ جاوید معجزہ ہونا ثابت کرتا ہے۔ اس فن کے اندر قدم رکھتے ہی ایسے دانشوروں کی کیفیت یوں نظر آتی ہے جیسے کوئی پاگل ڈاکٹر کی کرسی پر بیٹھ کر تشخیص و علاج کے سلسلے میں اپنی ''بیلیاں مارنا'' شروع کر دے۔ ان لوگوں کا صحیح بخاری کی مشہور حدیث: «لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً .»[1] کی تحقیق کے سلسلے میں خیال آرائی پر ہنسنے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے؟ لیکن جب ملک کی ثقافت کے ترجمان اخبار روزنامے بھی ایسی لایعنی تحریریں شائع کرنا شروع کر دیں تو پھر ایسی ''بڑھکوں'' کا سنجیدہ جائزہ لینے کی ضرورت بھی پڑ جاتی ہے، عوام کالانعام اس بات سے بھی بسا اوقات دھوکا کھا جاتے ہیں، اس حدیث پر تنقید کا جواب کیوں نہیں دیا گیا؟

اگرچہ قبل ازیں بعض جرائد نے عوامی انداز میں اس حدیث کی تضعیف کا جواب دینے پر خامہ فرسائی کی تاہم حدیث کا صحت وضعف ایک فنی مسئلہ ہے۔ اس پر تبصرۂ فن اور اس کی اصطلاحات کی روشنی میں ہونا ہی مناسب ہے۔ ہم سطور ذیل میں مذکورہ بالا حدیث بخاری کے بارے میں اسی انداز پر کچھ گذارشات پیش کرتے ہیں۔ و باللہ التوفیق.

محدثین کے ہاں احادیث و روایات کے جانچنے کے لیے بنیادی چیز وہ سلسلۂ سند ہے جس کی بنا پر حدیث کی صحت وضعف کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے منکرین سنت نے حدیث پر جرح کے لیے اسماء الرجال کی کتب نکال کر اس میں سے ان چیزوں کا انتخاب کیا ہے جس سے حدیث کے راوی مجروح قرار دیئے جاسکیں۔ حالانکہ سلسلۂ سند صرف راویوں کا نام نہیں ہوتا، بلکہ روایت کرنے والا اور جس سے روایت کی جائے، اور ان کی روایت سے متعلقہ احوال اور روایت کی ہر درجے میں حفاظت کی متعلقہ تفصیلات اس میں

---

[1] (۲۵۸) انظر الرقم المسلسل (۲۳۲).

شامل ہوتی ہیں، جیسے کوئی شخص طب کی کتابیں اٹھا کر بیماریوں کے تحت پیش کردہ علامات سے بیماریوں کی تشخیص کرنے سے ماہر طبیب نہیں بن سکتا۔ اسی طرح راویوں کے حالات کا مطالعہ کر کے ان کا معتبر یا غیر معتبر قرار دینا بھی ہر شخص کا کام نہیں، بالخصوص فن حدیث کی کتابوں میں ''احوال رواۃ'' کے سلسلے میں محدثین جو گفتگو کرتے ہیں وہ فنی زبان میں ہوتی ہے۔ اس سے صحیح مراد وہی شخص سمجھ سکتا ہے جسے ان کی اصطلاحات سے بھرپور واقفیت ہو جیسے ہم کسی بچے کو اگر یہ کہیں کہ یہ بچہ بڑا شیطان ہے تو اس کے معنی ہمیشہ یہ نہیں ہوتے کہ ہم نے اسے بڑا جرائم پیشہ قرار دے دیا ہے۔ کیوں کہ کلام کی نزاکتیں اس کلام کے پس منظر سے واضح ہوتی ہیں لہٰذا ہر کام کا مفہوم موقع ومحل کے مطابق ہی سمجھ میں آ سکتا ہے۔

محدثین کے ہاں کسی راوی کے بارے میں ''ثِقَةٌ وَ لَيْسَ بِحُجَّة'' کا مفہوم ایک شخص فن حدیث سے نابلد یہ سمجھے گا کہ ''وَ لَيْسَ بِحُجَّة .'' جرح کے مفہوم میں ہے حالانکہ محدثین کے ہاں یہ کلام جرح کے لیے نہیں تعدیل کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ان کی مراد لفظ ''ثقہ'' سے اعتماد ظاہر کرنے کے بعد ''وَلَيْسَ بِحُجَّة'' سے یہ ہوتی ہے کہ روایت کرنے والا روایت میں معتبر ہونے کے باوصف فن حدیث میں اتھارٹی نہیں۔ جیسے احمد بن حنبل وغیرہ ائمہ راویان حدیث بھی ہیں اور فن حدیث کے مانے ہوئے ماہرین بھی۔ اسی لیے ان کے بارے میں ''ثِقَةٌ حُجَّةٌ'' کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ راویان حدیث کے طبقات کے سلسلے میں اگرچہ ''اصول حدیث'' اور ''اسماء الرجال'' کی کتب میں طبقات کی تفصیلات ملتی ہیں۔ لیکن چونکہ مذکورہ حدیث بخاری کے بارے میں ناقدین نے حافظ ابن حجر کی کتب اسماء الرجال کو مدار بنایا ہے۔ اس لیے ہم بھی حدیث ہذا کے راویان کی جرح وتعدیل کی بحث میں ان کے الفاظ اور اصطلاحات کا وہی مفہوم پیش نظر رکھیں گے جو انہوں نے اپنی اسماء الرجال کی مشہور تصنیف ''تَقْرِيْبُ التَّهْذِيْب'' کے مقدمہ میں ذکر کئے ہیں۔

انہوں نے ''رواۃ حدیث'' کے بارہ طبقے بنانے کے بعد ابتدائی چھ طبقات کی حدیث کو معتبر قرار دیا ہے جب کہ اگلے چھ طبقات ضعیف راوی شمار ہوتے ہیں:

صحیح بخاری کی حدیث: «لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً .» کی سند یوں ہے:

'' حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ الْهَيْثَمِ حَدَّثَنَا عَوْفٌ عَنِ الْحَسَنِ عَنْ أَبِي بَكْرَةَ ......''

سلسلۂ سند میں عثمان بن الہیثم، عوف، حسن اور ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ چار راوی ہیں۔ اس سلسلے میں ناقدین کی جہالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں حسن کے ذکر سے اس بات کا بھی علم نہیں کہ یہ حسن نامی

تابعی کون ہیں؟

طلوع اسلام جس نے شیخ ابن باز رحمہ اللہ کی دلیل کے طور پر پیش کردہ اس حدیث پر دسمبر ۱۹۸۹ء کے شمارے میں جاہلانہ گفتگو کی ہے، وہ اپنی اشاعت جنوری، فروری ۱۹۸۹ء میں اسی تابعی حسن کے بارے میں جب دیکھتا ہے کہ اس نام کے ایک سو انسٹھ (۱۵۹) راوی ہیں تو اس راوی کو ''مجہول'' قرار دیتا ہے۔ حالانکہ جس راوی کا تعین نہ ہو۔ اس کو علم حدیث کی اصطلاح میں ''مبہم'' کہتے ہیں ''مجہول'' تو وہ ہوتا ہے جس کا شخصی تعین ہو کر اسکے احوال سے بے خبری ہو۔

واضح ہو کہ یہ تابعی مشہور امام حضرت حسن بصری رحمہ اللہ ہیں، لیکن چونکہ محدثین کے ہاں مشہور ترین لوگوں کو نسبت کے بغیر ان کے صرف نام سے یا صرف کنیت سے شہرت کی بناء پر ذکر کرنا کافی ہوتا ہے۔ لہٰذا کوئی اسماء الرجال کی کتابوں میں بہت سے ناموں کو دیکھ کر مغالطہ کھا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے کتب اسماء الرجال میں محدثین نے راوی کے ساتھ اس کے شیوخ اور تلامذہ کے ذکر کرنے کا طریقہ بھی اختیار کیا ہے۔ آپ کو کسی راوی کے پہچاننے کے لیے جب بھی کوئی مشکل پیش آئے گی تو انہی کتب سے اس کے شیوخ اور تلامذہ کی فہرست سے راوی کا تعین ہو جائے گا۔ لیکن یہ طریقہ ''مبہم'' راویوں کے بارے میں مفید ہوتا ہے۔ حضرت حسن بصری جیسے مشہور ائمہ کے ذکر کے لیے ''حسن'' نام کا مطلق ذکر ہی کافی ہے۔ ہماری رائے میں طلوع اسلام کا ''حسن'' کو منکر بتانا صرف مقصد براری کے لیے تجاہل عارفانہ ہے۔

طلوع اسلام کا حضرت حسن بصری رحمہ اللہ جیسے مشہور امام کو ''مجہول'' کہنا اس کی اپنی جہالت ہے۔ لیکن جرأت دیکھیے کہ اسے طلوع اسلام محدثین کا فیصلہ قرار دیتا ہے۔ حالانکہ یہ سفید جھوٹ ہے۔ البتہ یہاں ہم حضرت حسن بصری کے بارے میں ایک اور پہلو کا ذکر مناسب سمجھتے ہیں جس کی بناء پر محدثین ان کی ان روایات کی تحقیق ضروری سمجھتے ہیں جو وہ ابوہریرہ، جابر، ابن عباس اور ابوسعید خدری (رضی اللہ عنہم) وغیرہ سے کرتے ہیں کیونکہ ان کا سماع ان سے ثابت نہیں، لیکن ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ سے ان کی نہ صرف ملاقات ثابت ہے بلکہ حضرت حسن بصری نے ان سے سماع بھی کیا ہے جیسا کہ صحیح بخاری کتاب الفتن (بحوالہ فتح الباری: ۶۱/۱۳) میں خود حسن بصری کی صراحت موجود ہے:

'' وَلَقَدْ سَمِعْتُ أَبَابَكْرَةَ . '' [1]

---

[1] (۲۵۹) صحیح البخاری، کتاب الفتن، التقریب (۱۲۳۷)، التھذیب (۲۶۳/۲)(۴۸۸).

یعنی ''بلاشک میں نے ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ سے خود سماع کیا ہے۔''

اسی لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ زیر بحث حدیث کے بارے میں ''فتح الباری'' میں وضاحت کرتے ہیں کہ چونکہ حسن بصری کا سماع ابی بکرۃ رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے اس لیے ''عَنْ أَبِیْ بَکْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ'' کے الفاظ (جن میں سماع کی صراحت نہیں) کا کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں امام بخاری رحمہ اللہ کے استاد علی بن المدینی کی صراحت خود صحیح بخاری (بحوالہ فتح الباری، ۵/ ۳۵۷) میں موجود ہے۔

باقی رہا مسئلہ تقدیر کے بارے میں حضرت حسن بصری پر اعتراض تو وہ بعض اشخاص کی غلط فہمی تھی جو حضرت حسن بصری کے کلام سے ہوئی۔ اسی لیے (مِیْزَانُ الْاِعْتِدَال ۱/ ۲۲٤) میں ذکر ہے کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے اس غلطی سے رجوع کر لیا تھا۔ اس لیے اسے لغزش زبان بھی کہا گیا ہے۔

اسی طرح تبع تابعی ''عوف'' کے بارے میں بھی طلوع اسلام کا یہی رویہ ہے لیکن اس نے عوف کو مجروح قرار دینے کے لیے کچھ اور کمزوریاں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض لوگ ان کے اوپر تشیع اور قدری ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ یہ دو الزام محدثین کے ہاں ایک قسم کی جرح ہیں جسے وہ بدعت کی اصطلاح سے پیش کرتے ہیں، لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان سب الزامات کے باوجود ان کے لیے (عوف الصدوق) (۱) کا لقب ذکر کیا ہے اسی طرح احمد بن حنبل رحمہ اللہ انہیں ''صالح الحدیث'' قرار دیتے ہیں۔ ابو حاتم ''صدوق'' اور ''صالح'' کہتے ہیں۔ ابن معین اسے ثقہ قرار دیتے ہیں۔ ابن حبان نے بھی ثقات میں سے شمار کیا ہے۔

ص ۱۶۷ میں امام نسائی رحمہ اللہ کی طرف سے ''ثِقَةٌ ثَبْتٌ'' کے الفاظ بھی مذکور ہیں جو بہت بڑی توثیق ہے۔ ''ثبت'' کے الفاظ معتبر رواۃ کے اعلیٰ ترین طبقوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں لیکن اگر ''صدوق'' اور ''صالح الحدیث'' کے الفاظ کی طرف بھی نظر کریں۔ تو بھی حافظ ابن حجر کے مذکورہ بالا معتبر رواۃ کے ذکر کردہ چھ طبقوں میں سے عوف پانچویں طبقے کا راوی ہے جو بہرصورت ثقہ ہے۔ اس کے تشیع وغیرہ بدعت کے بارے میں محدثین کا صحیح ترین مسلک یہ ہے کہ اگر کسی کی کوئی حدیث اس کی بدعت کی مؤید نہ ہو۔ تو پھر ایسی بدعت کا موجد قادح نہیں ہوتا۔ جہاں تک تشیع کا مسئلہ ہے عورت کے مقام کے سلسلے میں شیعہ سنیوں کی نسبت زیادہ اہمیت کے قائل ہیں کیوں کہ ان کی بنیاد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے عقیدت اور محبت کا دعویٰ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ وراثت میں پوتوں کے ساتھ نواسوں کو برابر رکھتے ہیں۔ مگر اس بحث میں طوالت کی اس لیے ضرورت نہیں کہ ''عوف'' پر غالی شیعہ ہونے کا الزام کسی نے نہیں لگایا۔ بلکہ لفظ تشیع ان لوگوں کے لیے

بھی استعمال کیا گیا ہے جو اہل بیت سے زیادہ ہمدردی رکھتے تھے۔ لہٰذا محدثین کا انہیں نہ صرف معتبر راویوں میں شمار کرنا بلکہ حافظ ابن حجر وغیرہ کا اس معمولی جرح کے باوجود اس حدیث کو صحیح (۱) قرار دینا خود اس بات کی دلیل ہے کہ ایسی معمولی جرح قادح نہیں ہوسکتی۔

طلوع اسلام میں امام بخاری رحمہ اللہ کے شیخ عثمان بن الہیثم پر جرح کرتے ہوئے اس کی سچائی کے اعتراف کے ساتھ اس کا غلطیاں کرنا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ دراصل جرح و تعدیل کے سلسلے میں اصطلاحات کا ترجمہ اپنے مطلب کا بیان کرنے کی بجائے محدثین کی اصطلاحات کو انہی کے الفاظ میں پیش کرنا درست ہوتا ہے۔ کیوں کہ محدثین کے الفاظ صحت وضعف میں راویوں کے طبقات کا بھی تعین کرتے ہیں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ لیکن ان کا ترجمہ اپنے من پسند الفاظ میں غلط فہمی کا باعث ہوتا ہے۔ عثمان بن الہیثم کے بارے میں محدثین نے ''ثقہ'' کہنے کے علاوہ ''صدوق'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جن کا ترجمہ بہت سچ بولنے والا ہے اگرچہ محدثین نے اس کے ساتھ اس کی بعض غلطیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ (۲) لیکن ابوحاتم نے واضح کیا ہے کہ عثمان اپنی آخری عمر میں اپنی روایت کے لیے دوسروں کو صحیح قبول کر لیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے ابن حبان نے اسے ''ثقات'' میں شمار کیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اس سے براہ راست اور بالواسطہ روایت کی ہے امام احمد رحمہ اللہ کے پاس اس کا ذکر ہوا تو انہوں نے اس کے بڑے طبقہ رواۃ کی بجائے چھوٹے طبقہ رواۃ سے ہونے کی طرف اشارہ کیا یعنی ''لَيْسَ بِثَبْتٍ'' کے الفاظ استعمال کیے۔

واضح رہے کہ طبقات رواۃ میں (ثبت) کا دوسرا یا تیسرا طبقہ ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ اس کا درجہ اس سے کم تر یعنی چوتھا یا پانچواں طبقہ ہے تاہم یہ طبقہ معتبر راویوں کا ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

مذکورہ بالا دونوں راوی عثمان بن الہیثم اور عوف کے بارے میں ہم نے محدثین کے فنی تبصرے کی روشنی میں ان کا شمار رواۃ کے معتبر طبقوں میں سے ہونے کا جو پہلو ذکر کیا ہے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان دونوں راویوں سے روایت کرنے والے بے شمار ثقہ لوگ ہیں جن میں بڑے بڑے ائمہ حدیث بھی شامل ہیں۔

''تہذیب التہذیب : ۷/۱۵۷'' میں عثمان بن الہیثم سے روایت کرنے والوں میں امام نسائی، ابوحاتم رازی، امام ذہلی، امام محمد بن عبدالرحیم البزار، امام محمد بن خزیمہ البصری، اسماعیل سمویہ، اسید بن عاصم، محمد بن غالب تمتام، یعقوب بن سفیان، ابراہیم بن مرزوق، ابومسلم الکشی الکدیمی، ابوخلیفہ فضل بن الحباب رحمہم اللہ اور

دیگر بہت سارے مذکور ہیں۔

اسی طرح عوف الاعرابی سے امام شعبہ، امام ثوری، امام عبداللہ بن مبارک، امام یحییٰ بن سعید القطان، ابن علیہ، اسحاق الازرق، ہیثم، عیسیٰ بن یونس، غندر، مروان بن معاویہ، معتمر بن سلیمان وغیرہ رحمہم اللہ ایک کثیر تعداد کے ناموں کا ذکر ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''تہذیب التہذیب: ۱۶۶/۸'' میں ذکر کیا ہے۔

محدثین کے ہاں کسی کی توثیق کا ایک طریقہ جہاں الفاظ ہیں وہاں ان سے روایت کرنے والوں کی تعداد ان کی شخصیت کی توثیق کے لیے بطور دلیل استعمال ہوتی ہے۔ جیسا کہ مجہول و مستور وغیرہ کے مباحث میں معروف ہے۔ علاوہ ازیں رواۃ کو تقویت دینے کے لیے فن حدیث کا ایک اہم طریقہ تابع ❶ اور شاہد کی موجودگی بھی ہے۔

اس طریق کو اصطلاح میں اعتبار کہتے ہیں۔ چنانچہ امام حسن بصری رحمہ اللہ سے روای عوف کی متابعت حمید الطّویل اور دوسرے رواۃ کی ایک جماعت سے ثابت ہے۔ جن کا ذکر مسند احمد اور بزار میں ملتا ہے۔ اسی طرح حسن بصری کی متابعت عبدالرحمٰن بن جوشن سے ثابت ہے۔ ❷ جب کہ عثمان بن الہیثم کی متابعت سنن نسائی جلد (۲/۳۰۱) اور جامع ترمذی (۶۱/۳) اور مسند احمد (۳۸/۵) میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اس حدیث کے سارے راویوں کی تائید دوسرے رواۃ نے بھی کی ہے۔ ❸ لہٰذا حدیث کا معیار ثبوت کے اعتبار سے بلند تر ہو گیا۔

اسی طرح ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ صحابی کے علاوہ ایسی حدیث جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ صحابی سے بھی موجود ہے۔ ❹ جیسے

---

❶ (۲۶۰) تابع یا متابع کسی صحابی رضی اللہ عنہ کی حدیث کی روایت کے لیے کسی دوسری تائید کرنے والی روایت کو کہتے ہیں۔ اگر اس حدیث کا روایت کنندہ صحابی رضی اللہ عنہ بھی دوسرا ہو تو محدثین کے ہاں یہ دوسری حدیث شمار ہوتی ہے اس لیے وہ اسے شاہد سے تعبیر کرتے ہیں چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا اصل مدار صحابہ رضی اللہ عنہم ہوتے ہیں اس لیے ان کی گنتی بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت سے کی جاتی ہے۔ (حافظ ثناء اللہ مدنی)

❷ (۲۶۱) مسند احمد (۱۲۷/۵) اسے شیخ البانی نے "إِرْوَاءُ الْغَلِيْلِ فِيْ تَخْرِيْجِ أَحَادِيْثِ مَنَارِ السَّبِيْلِ "(۱۰۹/۸) میں "وَ إِسْنَادَهٗ جَيِّدٌ" کہا ہے گویا متابعت بھی صحیح ہے۔ (حافظ ثناء اللہ مدنی)

❸ (۲۶۲) ابن ابی شیبة حدثنا ابو داؤد عن عیینة بن عبد الرحمن عن ابیه عن ابی بکرة...... الخ ، ابن ابی شیبة (۳۷۷۸۷)، مسند طیالسی رقم(۸۷۸) ابو داؤد الطیالسی حدثنا عیینة ...... الخ حدثنا عبد الله حدثنی ابی ثنا یحییٰ و محمد بن بکر عن عیینة حدثنی ابی ...... الخ (احمد (۹۲۰٤۱۸، (۳۷،۳۸/۵)، والنسائی (۵۳۹۰) .

❹ (۲٦۳) المعجم الاوسط(٤۸۵۲) للطبرانی ۔ فیه ضعف شدید لاجل عبد الرحمن بن عمرو بن جبلة .

مجمع الزوائد (۲۰۹/۵) میں طبرانی کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ شاہد کے طور پر تائید کی مثال ہے۔

حدیث کے رواۃ پر مذکورہ بالا اطمینان کے بعد ابوبکرۃ صحابی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کسی تحقیق کی ضرورت تو نہ تھی کہ "الصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ." کا اصول معروف ہے لیکن ناقدین کو تو حدیث ہذا کو کسی طرح ضعیف ثابت کرنا ہے۔ اس لیے انہوں نے ابوبکرۃ صحابی رضی اللہ عنہ کو بھی نہیں چھوڑا۔ حالانکہ صحابہ میں ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کے علاوہ دیگر حضرات سے بھی یہ حدیث مروی ہے۔ حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔

اگرچہ الفاظ کا تھوڑا بہت فرق ہے لیکن مفہوم وہی ہے۔

« لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ يَمْلِكُ رَأْيَهُمُ امْرَأَةٌ .»

''وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس کے فیصلوں کا اختیار عورت کے ہاتھ میں ہو۔''

تاہم دور حاضر میں مستشرقین کے پھیلائے ہوئے شکوک کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اب اسی طرح کا سیاست دان شمار کیا جانے لگا ہے۔ جس طرح کی گندی سیاست ہمارے ہاں چلتی ہے حالانکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اختلافات میں جو چیز نظر آتی ہے وہ اس سے بہت مختلف ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب خلافت کے بارے میں انصار کے موقف کو رد کرنے کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حدیث: « اَلْأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ.» ❶ پیش کی تو کسی نے حدیث پر اس وجہ سے جرح نہیں کی کہ اس سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے موقف کی تائید ہوتی تھی۔ بلکہ اس حدیث کے پیش کرنے پر صحابہ رضی اللہ عنہم بشمول انصار و مہاجرین ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر مطمئن بھی ہو گئے۔ لہٰذا ناقدین کا ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ پر یہ طعن کہ انہوں نے ''جنگ جمل'' میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مخالفت کے لیے یہ حدیث پیش کی تھی۔ ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ پر وضّاع ہونے کی تہمت لگانا ہے جو صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غلیظ گالی دینے کے مترادف ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ایسا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ صحابہ میں ایسے لوگوں کا ذکر تو ملتا ہے جس سے بعض کبائر کا ارتکاب ہوا اور ان پر حد بھی جاری کی گئی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حدیث گھڑ کے پیش کرنا بقول امام الحرمین کفر و ارتداد ہے جو کسی کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمرہ سے خارج کر دیتا ہے لہٰذا صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعض گناہوں کے ذکر سے یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ مرتد بھی ہو سکتے ہیں۔ تاریخ میں جن مرتدین کا ذکر ہے۔ ان میں ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ قطعاً شامل نہیں۔

❶ (٢٦٤) أحمد (١٢٩/٣، ١٨٣) السنة لأبي بكر الخلال ص٩٦ عن أنس مرفوعاً . ابن ابي عاصم في السنة (٥٣١/٢، ٥٣٣) بتحقيق الألباني وصححه. الإرواء (٢٩٨/٢) مجمع الزوائد (١٩٢/٥) وقال : رواة أحمد ثقات . ومعناه في البخاري (٧١٣٩، ٧١٤٠) وصحيح مسلم (٤٧٠١ إلى ٤٧١٢).

ارتداد اور فسق کا یہی فرق حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک دوسرے واقعہ کے متعلق محدثین کے اس موقف کی تائید کرتا ہے کہ وہ ان صحابہ کی روایت کو کیوں معتبر جانتے ہیں جو قذف کے جرم میں ملوث ہوئے یا ان پر قذف کی حد بھی جاری ہوئی۔ جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے والوں میں مشہور شاعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسان بن ثابت نبی علیہ السلام کی سالی حمنہ بنت جحش اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بھانجے مسطح کا معاملہ ہے ❶ جن کی روایت محدثین کے ہاں بالاتفاق معتبر ہے۔ اسی طرح حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ پر زنا کی گواہی دینے والوں میں ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے جو چوتھے گواہ زیاد کے تذبذب کی وجہ سے صرف اس لیے حد قذف کے مستحق بنے کہ حتمی طور پر چار گواہوں کا بیان یکساں نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شہادتیں گزرنے کے بعد مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جب یہ کہا کہ مجھے ان غلاموں سے بچائیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ چپ رہو۔ اگر چوتھی بھی مکمل ہو جاتی تو اللہ کی قسم ہم تمہیں سنگسار کر دیتے۔ ❷ مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ پر گواہی دینے والوں پر جو حد قذف جاری کی گئی اس سے یہ بات واضح ہے کہ ان پر حد کا جاری کرنا صرف اس بناء پر تھا کہ وہ چار گواہ پورے نہ ہو سکے۔ ورنہ ان گواہوں کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے کوئی دیگر کارروائی عمل میں نہ لائی گئی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زیاد کو چھوڑ کر نافع بن الحارث شبل رضی اللہ عنہ بن معبد اور ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ پر حد جاری کی تو اس کے بعد تینوں سے فرمایا کہ تم اپنے اس فعل کی توبہ کرلو تاکہ آئندہ تمہاری گواہی قابل قبول ہو تو ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے توبہ کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں صرف اس لیے توبہ کروں گا کہ میری شہادت قبول کی جائے۔ میں تو اب کبھی بھی فریقین کے جھگڑے میں گواہی نہیں دوں گا۔ ❸

اس سے معلوم ہوا کہ طلوع اسلام کا یہ سفید جھوٹ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ چھوٹے چھوٹے دنیاوی معاملات تک میں ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کی گواہی قبول نہیں کرتے تھے بلکہ ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کے بعد گواہی دی ہی نہیں کہ ان کی گواہی قبول کرنے یا نہ کرنے کا سوال اٹھے بلکہ ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ ہمیشہ گواہ بننے سے بچتے تھے۔

علماء نے جرم قذف کے مرتکب کے بارے میں بحث کرتے ہوئے اس بات کو بھی واضح کیا ہے کہ صرف

---

❶(۲٦۵) صحیح البخاری کتاب التفسیر باب ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشة (٤٧٥٧) .

❷(۲٦٦) ملاحظہ ہو: تاریخ الکامل جلد ۳۷۸، ص ۳۷۹،تاریخ طبری جلد کا حصہ چار ص ۳۰۷-۳۰۸،البدایة والنهایة (۸۱/۷ تا ۸۲) .

❸(۲٦۷) اسد الغابہ جلد ٦، ص ۲۸

حد جاری ہونا بھی کفارۂ گناہ ہے کیوں کہ حد جاری ہونا بھی توبہ کی ایک شکل ہے۔ لہٰذا ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ ﴿إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا﴾ کی استثناء میں آ جاتے ہیں کئی فقہاء حد جاری ہونے کو توبہ کی جگہ دیتے ہیں۔ ابن قیم رحمہ اللہ کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں فرمان رسول ﷺ: «فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ.»❶ (بخاری) بطور دلیل پیش نظر رہے۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے «اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ.» ❷ حدیث پیش کی ہے۔

علاوہ ازیں مقدمات میں گواہی دینا اور رسول اکرم ﷺ کی سنت کی روایت کرنا ان دونوں کے لیے اشخاص کی صفات کا فرق اصول فقہ میں معروف ہے۔ مثلاً روایت میں عورت و مرد کی روایت کا کوئی فرق نہیں۔ جب کہ شہادت میں عورت و مرد کا فرق نص قرآنی سے ثابت ہے۔ لہٰذا روایت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کے مسئلہ کو ان کی شہادت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت کے قبول کرنے پر امت مسلمہ کا اجماع ہے۔ جس کی صراحت حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں کی ہے:

"فَقَدْ اَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى قُبُوْلِ رِوَايَةِ أَبِيْ بَكْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ." ❸

اسی بناء پر امام بخاری رحمہ اللہ نے قصۂ ابی بکرۃ رضی اللہ عنہ پر اظہار اعتماد کے باوجود اپنی صحیح میں ان کی متعدد روایات ذکر کی ہیں۔ ہم نے ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں جن دلائل کا ذکر کیا ہے، وہ ناقدین کے مغالطوں کے ازالہ کے لیے ہے۔ ورنہ جابر بن سمرۃ کی دیگر مستقل حدیث کی تائید کی وجہ سے ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو جو تقویت ملتی ہے مندرجہ بالا سطور میں ہم پیش کر چکے ہیں۔ اسی طرح یہ صرف ایک حدیث نہیں، دو حدیثیں ہوئیں جن کے طرق متعدد ہونے کی وجہ سے ان کی بے شمار روایات بنتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حدیث ''مسانید'' اور ''سنن'' قسم کی کتابوں کے علاوہ صحیح بخاری میں بھی موجود ہے۔ اور یہ بخاری میں دو جگہ روایت کی گئی ہے۔

''مرویات صحیح بخاری'' کے سلسلے میں محدثین کا اتفاق ہے کہ وہ صحت کے اعلیٰ درجے پر ہیں۔ کیونکہ ان کے لیے صرف یہی بات کافی نہیں کہ وہ امام بخاری رحمہ اللہ کی دقیق ترین تحقیق پر پوری اتری ہیں۔ بلکہ صحیح بخاری کے منظر عام پر آنے کے بعد اس کی ایک ایک روایت کی پرکھ کے لیے محدثین معرکہ آرائی کرتے

---

❶ (٢٦٨) صحیح البخاری کتاب الحدود باب الحدود کفارة (٦٧٨٤).

❷ (٢٦٩) صحیح ابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر التوبة (٤٢٥٠) والضعیفة ٨٣/٢ (٦١٥) حسنه الألبانی وقال...... حسنه ابن حجر.

❸ (٢٧٠) اعلام الموقعین (١٣٧/١).

رہے۔ جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ روایات دیگر محدثین کی تائید سے قبولیت ❶ کا اعلیٰ مقام حاصل کر گئیں بلکہ محدثین نے صحیح بخاری کو "أَصَحُّ الْكُتُبِ بَعْدَ كِتَابِ اللهِ" قرار دیا۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھتے ہیں ❷ کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم پر تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ ان دونوں اماموں کی مرفوع متصل حدیثیں قطعی طور پر صحیح ہیں یہی وجہ ہے کہ محدثین صحیح بخاری کی کسی حدیث کے بارے میں اسماء الرجال کی کتابیں نکال کر راویوں پر تعدیل و جرح کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ کیوں کہ بخاری میں کسی حدیث کا آنا صرف رواۃ کے معیار پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ اس کی صحت کی دوسری صورتیں بھی ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ جیسے زیر بحث حدیث کے بارے میں یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے جملہ راوی بصری ہیں۔ جب کہ ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ نے جب حدیث سنائی تو اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بصرہ میں ہی موجود تھیں اور حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قتل عثمان کے بارے میں موقف (یعنی قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے کا مطالبہ) کے مؤید ہونے کے باوجود صرف اس حدیث کی بنا پر جنگ جمل میں عملاً شریک نہ ہوئے۔

بخاری کے وہ الفاظ جو "جنگ جمل" کے پس منظر میں "کتاب المغازی" کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ نے ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت میں نقل کیے ہیں وہ خصوصاً قابل غور ہیں:

"لَقَدْ نَفَعَنِي اللّٰهُ بِكَلِمَةٍ سَمِعْتُهَا مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيَّامَ الْجَمَلِ بَعْدَ مَا كِدْتُ أَنْ أَلْحَقَ بِأَصْحَابِ الْجَمَلِ فَأُقَاتِلَ مَعَهُمْ." ❸

یعنی "ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے یقیناً جنگ جمل کے موقعہ پر جب کہ میں قریب تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھیوں میں شامل ہو کر لڑائی میں شرکت کروں۔"

اس کلام نے بڑا فائدہ دیا جو میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔ پھر آپ نے مذکورہ حدیث بیان کی۔ حاصل یہ ہے کہ ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مخالفت کے لیے نہیں بلکہ وہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

---

❶ (۲۷۱) اسے اصطلاح میں تَلَقِّي بِالْقَبُول کہتے ہیں۔

❷ (۲۷۲) اما الصحيحان فقد اتفق المحدثون على ان جميع ما فيهما من المتصل المرفوع صحيح بالقطع و أنهما متواتران الى مصنفيهما و انه كل من يهون أمرهما فهو مبتدع متبع غير سبيل المومنين (حجة الله البالغة باب طبقة كتب الحديث (۱/۱۳٤).

❸ (۲۷۳) صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب كتاب النبي ﷺ إلى كسرى وقيصر(٤٤٢٥).

کے موقف میں ان کے ساتھ شامل ہو کر لڑنے کے لیے آمادہ تھے کہ یہ حدیث ان کو یاد آ گئی اور وہ اس حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے رک گئے۔

لہٰذا یہ حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ پر بہت بڑا بہتان ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مخالفت کے لیے یہ حدیث گھڑی تھی نیز اگر صرف مخالفت ہی پیش نظر ہوتو ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کو کیا ضرورت تھی کہ وہ نہ صرف خالص الفاظ حدیث: «لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً.» [1] بیان کرتے بلکہ انہوں نے تو یہ بھی فرمایا کہ یہ الفاظ انہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت سنے جب اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا حاکم بنالیا۔

درحقیقت منکرین حدیث جہاں ''فن حدیث'' سے ناواقف ہیں وہاں وہ احادیث [2] کو سمجھنے سے بھی عاری ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرۃ سے مروی ایک دوسری حدیث سے وہ یہ استنباط فرما رہے ہیں کہ حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ ''جنگ جمل'' کے سب شرکاء کو جہنمی قرار دیتے تھے۔ حالانکہ حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ نے: «إِذَا تَوَاجَهَ الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَكِلَاهُمَا مِنْ أَهْلِ النَّارِ.» [3] الحدیث جو حدیث بیان کی ہے اس سے قطعاً یہ ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کا فتویٰ نہیں بنتا کہ جنگ جمل کے جملہ شرکاء جہنمی تھے۔ کسی موقعہ پر نصیحت کے لیے کوئی بات کرنے کا اگر یہی مفہوم لے لیا جائے تو قرآن وسنت میں جتنی عمومی باتیں انبیاء، صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے سامنے پیش آمدہ واقعات کے بارے میں بطور نصیحت کہتے تھے وہ سب کے سب ان پر فتویٰ بن جائیں گے حالانکہ فقہاء نے استنباط کے اصولوں میں یہ صراحت کی ہے کہ عمومی بات سے کسی خاص چیز کا اقرار و اعتراف ثابت نہیں ہوتا۔ جیسے کوئی شخص استغفار پڑھے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مجرم ہے۔ اسی طرح جو شخص آیت کریمہ: ﴿ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴾ کا ورد کرے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس پر اس کے ظالم ہونے کا فتویٰ لگا دیا جائے۔ اس طرح کی احادیث کا اصل تعلق روز قیامت کے حساب وکتاب سے ہوتا ہے کہ اس روز اللہ تعالیٰ دلوں کا بھی حساب وکتاب فرمائیں گے۔ لہٰذا اگر یہ ثابت ہوا کہ کسی شخص نے اپنے دفاع کا قصد کئے بغیر دوسرے کو کسی متعلقہ جرم کے بغیر قتل کیا ہوگا تو اس کو

---

[1] (٢٧٤) انظر الرقم المسلسل (٢٣٢).

[2] (٢٧٥) احادیث کیا خود قرآن بلکہ اس لغت عرب کو بھی سمجھنے سے قاصر ہیں جس کی بنیاد پر قرآن کی تفسیر کو بازیچۂ اطفال بناتے رہتے ہیں۔ هَدَاهُمُ اللّٰهُ إِلَى الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِيم. (نعیم الحق نعیم) .

[3] (٢٧٦) صحيح البخاری، كتاب الفتن، باب اذا التقى المسلمان بسيفهما (٧٠٨٣) والايمان (٣١)، صحيح مسلم، كتاب الفتن، باب اذا تواجه المسلمان (٧٢٥٢) .

جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ کیونکہ مسلمان کا عمداً قتل جہنم میں لے جانے والا کام ہے لیکن دنیا میں چونکہ دلوں کا فیصلہ نہیں کیا جاتا اس لیے دنیا میں ایسی نصیحت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی لڑائی کے شرکاء کہیں قتل عمد کے جرم کے مرتکب نہ ہو جائیں۔

ظاہر ہے کہ جب مسلمان تلواریں لیکر آمنے سامنے ہوں گے تو یہ گمان بڑھ جاتا ہے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے دونوں کو جہنمی ہونے کی وعید سنائی۔ اسی حدیث میں حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ سے سوال بھی کیا گیا کہ قاتل کا جہنمی ہونا تو سمجھ میں آتا ہے مقتول کیسے جہنمی ہو سکتا ہے؟ تو ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ وہ بھی اپنے قاتل کے قتل کے لیے کوشاں تھا۔

لہٰذا حدیث ہذا کا مقصد مسلمانوں کو آپس کے قتل عمد سے بچانا ہے جو قرآن مجید کی اس آیت کے مطابق ہے:

﴿ وَ مَنۡ یَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُہٗ جَہَنَّمُ ۔﴾ (النساء:۹۳)

یعنی ”جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے اس کا بدلہ جہنم ہے۔“

ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ اس بات کا فتویٰ کبھی نہیں دے سکتے کہ جملہ شرکاء جنگ جمل جہنمی ہیں جب کہ اس جنگ جمل میں حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم جیسے وہ حضرات بھی موجود تھے جن کو دنیا میں جنت کی بشارت دی گئی۔ یعنی وہ عشرہ مبشرہ [1] میں سے ہیں۔

بہر صورت منکرین حدیث کو کسی اصول کی پرواہ تو ہوتی نہیں۔ ان کا مقصد صرف ان عوام کو دھوکہ دینا ہوتا ہے، جو اسلام کی تعلیمات، فن حدیث اور اُصول اِجتہاد سے ناواقف ہیں۔

چنانچہ بے پر کی اڑانا ہی ان کی کامیابی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ان کے سامنے کوئی بھی علمی شخصیت ہو، اس پر اعتراض تمام علمی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر جہالت کی بنیاد پر کرنے سے نہیں چوکتے۔ ظاہر ہے کہ جن کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی کوئی اہمیت نہیں، ان کے ہاں مفتی اعظم سعودی عرب کے سرکاری فتویٰ کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔

---

[1] (۲۷۷) صحیح ابی داؤد کتاب السنة باب فی الخلفاء(۴۶۴۸، ۴۶۴۹)، الترمذی(۴۰۱۲ تا ۴۰۱۴، ۴۰۲۴) ابن ماجه (۱۳۳) للألبانی وانظر الصحیحة (۸۷۵) (۵۲۰/۲ تا ۵۳۴)، المشکاة تحقیق الثانی للألبانی (۶۰۶۴) ابن ابی عاصم فی السنة ۱۴۲۵ تا ۱۴۳۶) .

ہم اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کر سکتے ہیں کہ ان کو ہدایت دے اور امت مسلمہ کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین!

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس شخص کی جزا اور سزا کی بابت؟

① جو یہ کہے کہ نمازوں کا قرآن میں کوئی وجود نہیں۔ (رکعات والی نمازیں) اس لیے رکعتوں والی نمازوں کا پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ اور یہ کہ اس کا اپنے ایک عزیز کو نماز پڑھنے (باجماعت) کے بارے میں پیٹنا بھی ثابت ہو چکا ہے۔

② اور یہ کہ پردہ کے بارے میں اسلامی احکامات کی نفی اور مذاق کرتا ہے۔

③ منکر حدیث ہے۔ جب کہ صرف قرآن کو ماننے کا دعویٰ کرتا ہے۔ قرآن کے احکامات کی مختلف تاویلات کرتا ہے پس منظر میں قرآن کا منکر بھی معلوم ہوتا ہے۔

جواب: مذکورہ صفات کا حامل انسان مرتد اور خارج از اسلام ہے اور ارتداد کی سزا کتاب وسنت میں معروف ہے۔ فرمایا:

« مَنْ بَدَّلَ دِيْنَه فَاقْتُلُوْهُ .» [1]

حدود کا نفاذ اسلامی حکومت کے اہم ترین فرائض میں سے ایک فریضہ ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

« اَلْإِمَامُ رَاعٍ وَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ .» [2]

یعنی ''امام، حاکم، خلیفہ ذمہ دار ہے اور روز جزا اللہ کے حضور رعیت کے بارے میں جواب دہ ہوگا۔''

واضح ہو کہ جو شخص منکر حدیث ہے۔ وہ لازماً ساتھ منکر قرآن بھی ہے۔ کیونکہ دونوں کا آپس میں تلازم ہے۔ ایک کا انکار دوسرے کے انکار کو مستلزم ہے۔

سوال: ایک شخص ذخیرہ حدیث رسول اللہ ﷺ بطریق محدثین کرام کا صریحاً منکر ہے اور کئی دفعہ ایک مسجد میں کھڑے، بیٹھے نمازیوں کے سامنے وہ ''بخاری شریف'' کو گندگی اور گند کہہ دیتا ہے۔

① کیا وہ بالعموم مسلمان اور بالخصوص اہل حدیث رہتا ہے؟

② کیا وہ کسی مسجد اہل حدیث کا منتظم بنے رہنے کا اہل ہو سکتا ہے؟

---

[1] (۲۷۸) انظر الرقم المسلسل (۳۷).

[2] (۲۷۹) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة فی القری والمدن، (۸۹۳)، (۲۴۰۹، ۲۵۵۴، ۲۵۵۸، ۲۷۵۱، ۷۱۳۸)، صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب فضیلة الأمیر العادل......(۴۷۲۴ ـ ۴۷۲۹).

③ کیا جس انتظامیہ نے اسے منتظم یا کیشئر برائے مسجد اہل حدیث بنا رکھا ہے وہ مسجد اہل حدیث کی انتظامی کمیٹی کے اہل باقی رہتے ہیں؟

④ اور کیا خطیب یا امام جو اس سے تنخواہ وصول کرتے ہیں اور مکمل طور پر اس کے زیر انتظام رہتے ہیں اور اس کے ''بخاری شریف'' کو گندگی کہنے پر بھی غیرت ایمانی کا کوئی مظاہرہ نہیں کرتے، وہ اس کے اہل ہیں کہ وہ مسجد اہل حدیث کے خطیب یا امام برقرار رکھے جائیں؟

⑤ اور کیا ایسے حالات میں شرعاً خالص اہل حدیث نمازیوں پر مشتمل، مسجد اہل الحدیث کی نئی انتظامی کمیٹی برائے فروغ تعلیم حدیث رسول اللہ ﷺ قائم کی جا سکتی ہے؟

جواب: ذخیرۂ حدیث کے منکر انسان کا مسلمانی اور اہل حدیث سے دور کا بھی تعلق یا واسطہ نہیں ہو سکتا۔ ایسے شخص کو مسجد اہل حدیث کی جملہ ذمہ داریوں سے فوراً فارغ کر کے کسی صحیح العقیدہ مسلمان کو مقرر کیا جائے۔ اس سے میل جول باہمی تعلق یا راہ و رسم رکھنا اپنے دین کو خطرے میں ڈالنا ہے جو ایک سچے مسلمان کی شان سے بعید ہے اور اگر کوئی غافل ایسے بدعقیدہ شخص کا حمایتی ہے یا اس کی حمایت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں، تو اس سے بھی قطع تعلق کر لینی چاہیے کیونکہ یہ بھی مریض القلب ہے جن کی صحت یابی کے لیے رب کے حضور دعا گو ہونا چاہیے اور صحیح العقیدہ لوگوں کو چاہیے کہ اپنی علیحدہ کمیٹی تشکیل دے کر دین اسلام کے فروغ کا سبب بنیں۔

❀❀❀❀❀❀❀

فرمان رسول ﷺ

«كُلُّ مُصَوِّرٍ فِي النَّارِ .» (بخاری و مسلم)

''ہر مصور جہنم رسید ہوگا۔"

«أَنَّ أَصْحَابَ هٰذِهِ الصُّوَرِ يُعَذَّبُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيُقَالُ لَهُمْ أَحْيُوْا مَا خَلَقْتُمْ .» وَقَالَ: «إِنَّ الْبَيْتَ الَّذِي فِيهِ الصُّوْرَةُ لَا تَدْخُلُهُ الْمَلَائِكَةُ .»

﴿۱۸﴾ تصاویر وتماثیل وغیرہ

سوال: یادداشت کے لیے اپنی تصویر بنا کر گھر رکھنا یا پھر والدین کی؟ اور کتابوں کی تصاویر کے بارے میں وضاحت فرمائیں؟

جواب: تصویر خواہ اپنی ہو یا والدین وغیرہ کی بطور یادگار اپنے پاس رکھنا حرام ہے۔ صحیح حدیث میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: جو بھی تصویر یا مجسمہ دیکھو اسے مٹا دو اور جو قبر اونچی دیکھو اُسے برابر کر دو اور دوسری روایت میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن سب سے سخت عذاب مصوروں کو ہوگا۔ (مسلم)

سوال: تصویر کے بارے میں شریعت نے سختی سے روکا ہے۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس جدید دور میں جو تصویر کیمرہ کے ساتھ لی جاتی ہے وہ اس ضمن میں نہیں آتی بلکہ یہ ممانعت ان تصاویر کے بارہ میں ہے جو ہاتھ سے بنائی جاتی ہیں اور کیمرہ کی تصویر تو ایک عکس ہے۔ لہٰذا یہ جائز ہے؟

جواب: اسلام میں بلا استثناء ہر ذی روح کی تصویر حرام ہے۔ چاہے جونسی صورت میں تصویر کشی کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: جو بھی تصویر یا مجسمہ دیکھو اسے مٹا دو۔ اور جو قبر اونچی دیکھو اسے برابر کر دو۔[1] نیز فرمایا: قیامت کے دن سب سے سخت عذاب مصوروں کو ہوگا۔[2] اسی بنا پر آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں پردے پر بنی ہوئی تصویر کا سختی سے انکار فرمایا۔[3] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سائے دار یا غیر سائے دار ہر طرح کی تصویر حرام ہے۔ کیمرہ سے بنی ہو یا غیر کیمرہ سے۔ علامہ

---

[1] (۲۸۰) صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب الأمر بتسویة القبر(۲۲۴۳).

[2] (۲۸۱) صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینة، باب تحریم التصویر (۵۵۳۷). بخاری (۵۹۵۴، ۵۹۵۰).

[3] (۲۸۲) صحیح مسلم (۵۵۲۰،۵۵۲۵)، بخاری(۵۵۹۴).

البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَالثَّانِيَةُ تَحْرِيمُهُ تَصْوِيرُهَا سَوَاءٌ كَانَتْ مُجَسَّمَةً أَوْغَيْرَ مُجَسَّمَةٍ وَ بِعِبَارَةٍ أُخْرٰى لَهَا ظِلٌّ أَوْلَا ظِلَّ لَهَا وَهٰذَا مَذْهَبُ الْجُمْهُوْرِ قَالَ النَّوَوِيُّ : ذَهَبَ بَعْضُ السَّلَفِ إِلٰى أَنَّ الْمَمْنُوْعَ مَاكَانَ لَه ظِلٌّ وَ مَالَا ظِلَّ لَه فَلَا بَأْسَ بِاتِّخَاذِه مُطْلَقًا وَ هُوَ مَذْهَبٌ بَاطِلٌ فَإِنَّ السِّتْرَالَّذِىْ أَنْكَرَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتِ الصُّوْرَةُ فِيْهِ بِلَا ظِلٍّ وَ مَعَ ذٰلِكَ فَأَمَرَ بِنَزْعِه ." (آدابُ الزِّفاف ص۔۹۹، طبع ۳).

سوال: قرآن و حدیث کی روشنی میں تصویر کھینچنا اور کھنچوانا کیسا ہے؟ اگر تصویر کھنچوانا غلط ہے تو مفتیانِ عظام، علمائے کرام اور علامہ حضرات تصویریں کس بنا پر کھنچواتے ہیں؟

جواب: تصویر کشی مطلقاً حرام ہے۔ صحیح حدیث میں ہے ان مصوروں کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا اور انہیں کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا تھا۔ اب اس میں جان بھی ڈالو۔ [1] شرع کی خلاف ورزی کرنے والے کو بلا امتیاز روز جزاء اپنا حساب عدالت باری تعالیٰ میں خود دینا ہوگا۔ مرتکب سوء کو دیکھ کر برائی پر دلیر ہونا خسارے کا سودا ہے۔ قرآن مجید نے یہود کے بگڑے ہوئے معاشرہ کی تصویر کشی یوں کی ہے:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَايَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ . ﴾(الجمعة:٥)

"جن لوگوں کے سر پر توراۃ لدوائی گئی پھر انہوں نے اس کے بار تعمیل کو نہ اٹھایا، ان کی مثال گدھے کی سی ہے۔ جس پر بڑی بڑی کتب لدی ہوں۔ جو لوگ اللہ کی کتابوں کی تکذیب کرتے ہیں ان کی مثال بری ہے اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

آج ہمارا ماحول بھی کچھ اس سے مختلف نہیں۔ اس حمام میں سب ننگے نظر آتے ہیں۔ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبِّىْ اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں کو فہم بصیرت سے نوازے۔ آمین!

سوال: دوران مطالعہ فوٹو کے جواز کے متعلق کچھ ضعیف وغریب روایات نظر سے گذریں کہ جن کے حوالے میں فی الوقت نہیں دے سکتا۔ دوسرے یہ کہ علمائے حنابلہ نے تصویر کے جواز کا فتویٰ دیا تھا۔ اسی طرح سعودی عرب کے علماء نے کرنسی نوٹوں پر تصویر کے جواز کی بنیاد کن دلائل پر رکھی ہے؟ یہ سوال تو پراگندہ سا ہے مگر

---

[1] (۲۸۳) انظر الرقم المسلسل (۲۸۸)

درست رہنمائی تو آپ جیسے اہل نظر عبقری صلاحیتوں کے مالک شیوخ ہی کر سکتے ہیں۔

ازراہ مہربانی یہ ارشاد فرمائیں۔فوٹو کے جواز کے بارے میں یہ روایات کہیں یکجا مل سکیں گی۔ دوسرے یہ کہ اگر ذخیرۂ احادیث میں ان کا کسی نہ کسی حد تک وجود بھی ملتا ہو اور موجودہ دنیا کا نظام بھی اسی ''غیر شرعی'' فتنے پر چل رہا ہو۔تو اس معاملے میں اس حد تک شدت روا رکھنا کیونکر مناسب ہے؟

جواب:اسلامی شریعت میں بے شمار نصوص ایسی ہیں جو تصویر کشی کی حرمت پر دال ہیں۔ چند ایک ملاحظہ فرمائیں:

① «كُلُّ مُصَوِّرٍ فِي النَّارِ .» [1] ''ہر مصور جہنم رسید ہوگا۔ (بخاری و مسلم)

② حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: اس سے بڑا ظالم کون ہو گا جو میری طرح تخلیق کرنی چاہتا ہے۔ (اگر ان میں طاقت ہے) تو ایک ذرہ پیدا کر کے دکھائیں یا ایک دانہ بنا کر دکھائیں یا ایک بال پیدا کر کے دکھائیں۔ [2] (بخاری و مسلم)

③ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، میں نے آنحضرت ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے دنیا میں کوئی تصویر بنائی اسے قیامت کے دن یہ حکم دیا جائے گا کہ وہ اس میں روح پھونکے حالانکہ وہ اس میں روح نہیں پھونک سکے گا۔ [3] (بخاری)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ہر قسم کی تصویر بنانا حرام ہے خواہ اس کا سایہ ہو یا نہ ہو، ہاتھ سے بنائی گئی ہو یا کیمرہ سے بنائی گئی ہو نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا کہ وہ جس تصویر کو یا بت کو بھی دیکھیں اسے مٹا ڈالیں۔ [4] (مسلم) اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ اگر کوئی دوبارہ ان میں سے کسی چیز کا ارتکاب کرے۔ اس نے دین و شریعت کا انکار کیا۔ جسے حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا گیا ہے۔ (فتح الباری ۵۰۷/۱۲ طبع حلبی)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا......:

« أَنَّ أَصْحَابَ هٰذِهِ الصُّوَرِ يُعَذَّبُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ يُقَالُ لَهُمْ أَحْيُوْا مَا خَلَقْتُمْ.» وَ قَالَ:«إِنَّ الْبَيْتَ الَّذِیْ فِيْهِ الصُّوْرَةُ لَا تَدْخُلُهُ الْمَلَائِكَةُ .» [5]

---

[1] (۲۸۴) صحیح مسلم(۵۵۴۰) .

[2] (۲۸۵) بخاری کتاب اللباس(۵۹۵۲)، (۷۵۵۹)، مسلم کتاب اللباس والزينة باب تحريم التصوير (۵۵۴۳، ۵۵۴۴)

[3] (۲۸۶) بخاری (۵۹۶۳) ، مسلم (۵۵۴۱)

[4] (۲۸۷) انظر الرقم المسلسل (۲۸۰)

[5] (۲۸۸) صحیح البخاری(۵۹۵۷)،صحیح مسلم(۵۵۳۳،۵۵۳۵).

یعنی ”اصحاب صُور قیامت کے دن عذاب دیے جائیں گے اور ان کو کہا جائے گا: جو کچھ تم نے بنایا، اس کو زندہ کرو۔اور فرمایا: جس گھر میں تصویر ہو فرشتے داخل نہیں ہوتے۔“

کی تشریح کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ: اس سے معلوم ہوا کہ سب تصویریں حرام ہیں اور اس اعتبار سے قطعاً کوئی فرق نہیں کہ ان کا سایہ ہے یا نہیں وہ پینٹ سے بنائی گئی ہیں یا تراشی گئی ہیں یا کرید کر بنائی گئی ہیں یا بن کر بنائی گئی ہیں۔ (فتح الباری ۵۱۳/۱۱) آج کے دور میں کچھ علماء فوٹو گرافی کی تصویروں کو جائز قرار دیتے ہیں لیکن ان کے پاس واضح کوئی دلیل نہیں۔

شیخ مصطفیٰ جامعی نے ان کی تردید میں خوب لکھا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ فوٹو گرافی کی تصاویر جائز ہیں۔ دوسری طرف علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں وہ تصویر جائز ہے جس میں کوئی خاص فائدہ ہو یا جسے کسی ناگزیر ضرورت کے لیے بنایا جائے چنانچہ فرماتے ہیں میں قارئین کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں ،کہ اگرچہ ہم بڑے وثوق کے ساتھ ہر قسم کی تصویر کی حرمت کے قائل ہیں لیکن ہم اس تصویر کی ممانعت کے قائل نہیں جس میں فائدہ متحققہ ہو اور اس کے ساتھ نقصان کا کوئی پہلو ثابت نہ ہو اور یہ فائدہ تصویر کے بغیر ممکن نہ ہو۔ مثلاً وہ تصویریں جن کی طب اور ڈاکٹری کے سلسلہ میں یا جغرافیہ میں یا مجرموں کی شناخت کے لیے ضرورت ہوتی ہے تاکہ انہیں پکڑا جا سکے یا لوگوں کو ان سے مطلع کیا جا سکے تو اس قسم کی تصویریں جائز ہوں گی۔ بلکہ شاید بعض مخصوص اوقات میں واجب بھی ہوں، اس کی دلیل دو درج ذیل حدیثیں ہیں۔

1 حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ گڑیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میری سہیلیوں کو میرے پاس لے آیا کرتے تھے تاکہ وہ میرے ساتھ کھیلیں۔ [1]

اس حدیث کو (بخاری ۴۲۳/۱۰)،(مسلم ۱۲۵/۷)،(احمد ۱۶۶/۶،۲۳۳-۲۳۴) الفاظ بھی امام احمد رحمہ اللہ ہی کی روایت کے ہیں۔اور (ابن سعد ۶۶/۸) نے روایت کیا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ کے پاس گڑیاں تھیں اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لاتے تو ان سے کپڑے کے ساتھ پردہ کر لیتے۔ محدث ابوعوانہ اس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ اس لیے کرتے تاکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے کھیل کو ختم نہ کریں۔

---

[1] (۲۸۹) صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب الانبساط إلى الناس(۶۱۳۰). صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب فضل عائشة(۶۲۸۷)(۶۲۸۸).

اس حدیث کو ابن سعد نے روایت کیا ہے اور اس کی سند بھی صحیح ہے۔ ❶ اس حدیث سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ بچیوں کے لیے گڑیاں بنانا جائز ہے۔

آنحضرت ﷺ نے تصویروں کی بابت جو ممانعت فرمائی ہے یہ صورت اس سے مستثنیٰ ہے۔ قاضی عیاض نے بھی بڑے وثوق کے ساتھ یہ بیان فرمایا ہے اور اسے جمہور کا مذہب بتایا ہے۔ بچیوں کے لیے گڑیوں کی خرید و فروخت کو جائز قرار دیا ہے تاکہ انہیں بچپن ہی سے اُمور خانہ داری کی تربیت دی جا سکے۔ ❷

۲ حضرت ربیع بنت معوذ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عاشوراء کی صبح بستیوں (جو مدینہ منورہ کے گرد و پیش تھیں) کی طرف پیغام بھجوایا کہ جس نے روزہ نہ رکھا ہو وہ دن کا باقی حصہ بھی اسی حالت میں گزارے، اور جس نے روزہ رکھا ہو وہ روزے کو برقرار رکھے، حضرت ربیع بیان فرماتی ہیں کہ اس کے بعد ہم ہمیشہ روزے رکھتے تھے اور چھوٹے بچوں کو بھی روزہ رکھواتے تھے اور انہیں اپنے ساتھ مسجد میں بھی لے جایا کرتے تھے۔ ہم بچوں کو روئی کی گڑیاں بنا کر دیا کرتے وہ انہیں اپنے ساتھ مسجد میں بھی لے جایا کرتے تھے۔ جب کوئی بچہ کھانے کی وجہ سے روتا تو دل (بہلانے کے لیے) ہم اسے گڑیا دے دیتے۔ حتیٰ کہ افطار کا وقت ہو جاتا۔ ایک روایت میں ہے کہ چھوٹے بچے جب ہم سے کھانا مانگتے تو ہم انہیں گڑیاں دے دیتے تاکہ وہ ان سے کھیلتے رہیں اور اپنے روزے کو پورا کر لیں۔ ❸

اسے بخاری (۱۶۳/۴) نے روایت کیا ہے الفاظ بخاری ہی کے ہیں۔ مسلم (۱۰۲/۳) نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں کچھ زائد الفاظ بھی آئے ہیں۔ یہ دونوں حدیثیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ تصویر اس وقت جائز ہے جب اس سے مصلحت یا تربیت کا کوئی پہلو وابستہ ہو جو تہذیب نفوس، ثقافت یا تعلیم کے لیے مفید ہو لہٰذا ایسی تمام تصویریں جن میں اسلام یا مسلمان کا کوئی فائدہ ہو جائز ہوں گی۔ البتہ مشائخ، بزرگوں اور دوستوں کی تصویریں جن میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ کافروں اور بتوں کے پجاریوں سے مشابہت کا باعث بنتی ہیں، حرام ہیں۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ. (دعوة الى الله، ص ۷)

---

❶ (۲۹۰) ابن سعد، فی طبقات النساء، ذكر أزواج رسول الله صلى الله عليه وسلم (٤٦/٦) ط. دار الفكر-بيروت.

❷ (۲۹۱) (٤٤٨،٤٤٧/٧) شرح صحيح مسلم للقاضي عياض.

❸ (۲۹۲) صحيح مسلم، كتاب الصيام، باب صوم يوم عاشوراء

بعض دیگر روایات میں بھی جواز کے اشارے موجود ہیں لیکن وہ سب مخصوص حالات میں ہے۔ عام نہیں۔

سعودی عرب کے علماء محققین نے علی الاطلاق فوٹو کے جواز کا فتویٰ قطعاً نہیں دیا بلکہ علامہ البانی رحمہ اللہ کی طرح وہ بھی مخصوص حالات میں جواز کے قائل ہیں۔ چنانچہ ہیئت کبار علماء کی دائمی کمیٹی برائے بحث اور فتویٰ نے فتویٰ صادر کیا ہے کہ زندہ چیزوں کی فوٹو لینی حرام ہے مگر جہاں کوئی انتہائی ضرورت ہو، جس طرح کہ تابعیہ (رہائشی اجازت نامہ) پاسپورٹ اور فاسق و فاجر اور لٹیروں کی تصویریں ہیں تاکہ ان پر کڑی نگاہ رکھ کر جرائم پر قابو پایا جائے اس کے علاوہ اسی طرح کی اور تصویریں لینے کا جواز ہے جس کے بغیر چارہ کار نہیں۔ (مجلۃ البحوث الإسلامیۃ الریاض عدد ۱۹۔ صـ ۱۳۸)

سعودی کرنسی نوٹوں پر بھی تصویر طبع کرنے کی اجازت اہل علم نے ناگزیر ضرورت کے پیش نظر دی ہے۔ عام حالات میں وہ بھی ممانعت کے قائل ہیں۔ ہمارے شیخ محدث روپڑی ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں۔ تصویر کا بنانا تو کسی صورت درست نہیں اور بنی ہوئی کا استعمال دو شرطوں سے درست ہے۔ ایک یہ کہ مستقل نہ ہو۔ کپڑے وغیرہ میں نقش ہو۔ دوم نیچے رہے۔ بلند نہ لٹکائی جائے۔ پھر چند ایک احادیث سے اس نظریہ کا اثبات کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: (فتاویٰ اہل حدیث جلد سوم ۳۴۵-۳۴۶)

واضح ہو کہ مسئلہ ہذا میں تہدید و وعید کی چونکہ کئی ایک روایات وارد ہیں جن کی صحت و حجیت میں ذرہ برابر شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا مجھے تو اپنے ناقص علم کی حد تک واللہ اعلم۔ احتیاط اس میں نظر آتی ہے کہ بعض احادیث سے اجازت کا پہلو جس انداز میں نکلتا ہے۔ معاملہ صرف انہی صورتوں پر محصور رکھا جائے۔ اور اس میں توسع سے احتراز کرتے ہوئے ظاہری نصوص سے تجاوز نہ کیا جائے۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَ عِلْمُهٗ أَتَمُّ.

دوران تعلیم حضرت الشیخ محدث روپڑی نے بھی فرمایا تھا کہ گڑیا بنانے اور اس سے کھیلنے کی رخصت صرف بچیوں کے لیے ہے، یہ اجازت عام نہیں۔

جناب والا فوٹو کی اجازت کی احادیث کو تلاش کرنے کی بجائے آپ کو ممانعت کی حدیثوں پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ جن کے کتب احادیث میں انبار لگے ہوئے ہیں۔

جب یہ بات مسلمہ ہے کہ احکام الٰہی ابدی ہیں تو پھر خود کو شریعت کے مطابق ڈھالنے کی سعی کرنی چاہیے۔ فتنہ و فسادات کے زمانہ میں دین میں ترمیم کی سوچ خطرناک نظریہ ہے، جس سے بچاؤ ہر صورت

ضروری ہے۔

اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں کو دین حنیف پر استقامت کی توفیق بخشے۔ آمین!

سوال: ذی روح کی تصویر بنانے کا کیا حکم ہے؟

جواب: اسلام میں ذی روح کی تصویریں بنانا حرام ہے۔ حدیث میں ہے تصویروں والے عذاب دیئے جائیں گے اور ان کو کہا جائے گا جو کچھ تم نے بنایا اس میں روح ڈالو! اور فرمایا: جس گھر میں تصویر ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔[1] (متفق علیه) غیر جاندار کی تصویر بنانے کا جواز ہے۔[2] (مشکوٰۃ)

سوال: ہمارے گاؤں ''خورد کے'' جامع مسجد کے خطیب امام صاحب نے مسجد میں ٹی وی لگا کر وی سی آر پر ایک مولانا کی تقریر سننا چاہی کہ تحقیق کروں کہ اس نے کیا کیا باتیں کی ہیں۔ میں نے مولانا صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ ٹی وی مسجد میں بنے ہوئے حجرہ میں نہ لگائیں اگر لگانا ہی ہے تو ٹی وی کا کلر والا بٹن آف کر دینا تاکہ تصویر نہ آئے۔ مسجد میں تو تصویر آنا بہت ہی ناجائز ہے۔ پھر میں نے انہیں تیسرا مشورہ دیا کہ اگر آپ نے ان کی تقریر تحقیق کے لیے سننا ہی ہے تو میں کل آڈیو کیسٹ لے آؤں گا آپ ٹیپ ریکارڈ پر لگا کر تقریر سن لینا، مگر انہوں نے مجھے کہا کہ تم پاگل ہو میں تحقیق کے لیے تقریر مسجد میں بنے ہوئے حجرہ میں لگا کر دیکھوں گا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا بڑے بڑے عالم دین ٹی وی، وی سی آر پر تقاریر سنتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہم کسی عالم کو نہیں مانتے ہم کو تو نبی اکرم ﷺ کی بات ماننی ہے اگر ہم ان عالموں کی غلط باتوں پر عمل کرنے لگ جائیں تو ہم بھی غلط بن گئے۔ مگر خطیب صاحب اپنی بات پر ڈٹے رہے اور دوسرے دن انہوں نے اپنے حجرہ میں وی سی آر لگا کر تقریر سنی میں نے پھر سمجھایا تو جواب ملا کہ تم پاگل ہو۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔

یاد رہے کہ اس سے قبل ماہ رمضان کے ۲۶ ویں روزے مولانا صاحب سے میری بحث ٹی وی پر ہوئی تھی جس میں مولانا صاحب نے کہا تھا کہ ٹی وی والی تصویر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نبی اکرم ﷺ نے جس تصویر سے منع کیا تھا وہ دوسری تصویر تھی یہ چلتی پھرتی تصویر ہے یہ جائز ہے میں نے انہیں کہا تھا کہ اگر ٹی وی پر امام خانہ کعبہ کی تصویر ہو پھر ریما کنجری کی تصویر ہو دونوں تصویریں ناجائز ہیں کیونکہ اسلام تصویر سے منع فرماتا ہے۔

---

[1] (۲۹۳) انظر الرقم المسلسل (۲۸۸) .

[2] (۲۹٤) مسلم (٥٥٤٠) .

اس لیے میں مولانا صاحب سے ۹ اگست سے ناراض ہوں اور ان سے بات چیت کرنا ختم کر دی ہے اور ان کے پیچھے ۹ اگست سے نماز بھی نہیں پڑھ رہا۔ میرے مندرجہ بالا سوال کا جواب دیں اور یہ بھی جواب دیں کہ میں نے ان سے جو ناراضگی قائم کی ہے یہ صحیح ہے یا کہ غلط؟

جواب: تصویروں کی جملہ اقسام حرام ہیں خواہ ان کا سایہ ہو یا نہ ہو۔ وہ ہاتھ سے بنائی گئی ہوں یا کیمرہ سے۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ وہ جس تصویر کو دیکھیں اسے مٹا ڈالیں۔ ❶ (مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے: میں نے الماری پر ایک پردہ ڈال رکھا تھا جس میں تصویریں تھیں۔ آپ نے انہیں دیکھا تو پھاڑ دیا۔ آپ کے چہرۂ اقدس کا رنگ بدل گیا۔ فرمایا اے عائشہ! قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو تخلیق میں اللہ کی مشابہت اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ ہم نے اس پردے کو پھاڑ کر اس سے ایک یا دو تکیہ بنا لیے تھے۔ ❷ (بخاری و مسلم)

دوسری روایت کے الفاظ یوں ہیں:

«كُلُّ مُصَوِّرٍ فِي النَّارِ .» ❸

''ہر مصور جہنم رسید ہوگا ہر اس تصویر کے بدلے جو اس نے بنائی ہے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث: « إِنَّ أَصْحَابَ هٰذِهِ الصُّوَرِ يُعَذَّبُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ .» ❹ کی تشریح و توضیح میں رقمطراز ہیں اس سے معلوم ہوا کہ سب تصویریں حرام ہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ان کا سایہ ہو یا نہ ہو وہ پینٹ سے بنائی گئی ہوں یا تراشی گئی ہوں یا کرید کر بنائی گئی ہوں یا بُن کر۔ آج کل علم کی طرف منسوب بعض لوگ جو فوٹو گرافی کی تصویروں کو جائز قرار دیتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس گھر میں تصویریں ہیں اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔ ❺

---

❶(۲۹۵) انظر الرقم المسلسل (۲۸۰) .

❷(۲۹٦) صحيح البخاری، كتاب اللباس، باب ما وطئ من التصاوير (٥٩٥٤). صحيح مسلم، كتاب اللباس، باب تحريم تصوير صورة الحيوان...... (٥٥٢٨).

❸(۲۹۷) انظر الرقم المسلسل (٢٨٤).

❹(۲۹۸) انظر الرقم المسلسل (٢٨٨) .

❺(۲۹۹) ايضاً .

فرمان نبوی ﷺ میں مطلق تصویر کا ذکر ہے کسی معین قسم کی تخصیص نہیں۔

شیخ مصطفی حمامی نے ان لوگوں کی تردید میں خوب لکھا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ فوٹو گرافی کی تصاویر جائز ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ ان تصویروں سے منع کیا گیا تھا جو ہاتھ سے بنائی جاتی ہیں۔ شیخ فرماتے ہیں: اس کی مثال تو یہ ہے جیسے کوئی کسی شیر کو کھلا چھوڑ دے اور وہ جس کو چاہے چیرے پھاڑے یا بجلی کی ننگی تاریں بچھا دے جو گزرنے والے کے لیے پیغام اجل ثابت ہوں یا کھانے میں زہر ملا دے اور کھانے والے جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور جب اس پر قتل کا الزام لگایا جائے تو یہ کہے کہ ان لوگوں کو میں نے قتل نہیں کیا بلکہ ان کو تو زہر، بجلی اور شیر نے قتل کیا ہے اور دلیل یہ دے کہ قتل تو صرف وہ ہوتا ہے جو ہاتھ کے ساتھ ہو اور میں نے ان مقتولین کی طرف اپنا ہاتھ دراز نہیں کیا، لہٰذا ان کا قتل میری طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا تو جو بات اس کے جواب میں کہی جائے گی کہ قتل کا معنی روح کو نکال دینا ہے، خواہ اسے اسباب قتل میں کسی سبب کو بروئے کار لا کر نکال دیا جائے وہ زہر ہلاہل ہو، بجلی ہو یا درندہ ہو جو بھی ان اسباب میں سے کسی کو اختیار کرے گا اسے قتل کے جرم میں مورد الزام ٹھہرایا جائے گا خواہ اس نے اپنے ہاتھ سے قتل نہ بھی کیا ہو۔ اس طرح تصویر ہے کہ اس سے مراد تصویر بنانا ہے اور ساری فتنہ سامانی تصویر بنانے میں ہے۔

مزید فرماتے ہیں: کہ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کیمرہ کے ساتھ تصویر بنانے والے کو ہاتھ کے ساتھ تصویر بنانے والے کی نسبت کئی گناہ زیادہ عذاب ہو گا کیونکہ کیمرہ ایک لمحہ میں جس قدر تصویریں بنا سکتا ہے، ہاتھ سے بنانے کے لیے تو کئی سال لگ جائیں گے اور کوئی جس قدر زیادہ تصویریں بنائے گا اسی قدر اسے عذاب بھی زیادہ ہو گا۔ (بحوالہ کتاب "دعوت إلى الله")

اس بنا پر آپ کا موقف مبنی برحق ہے اس پر ڈٹے رہنا چاہیے۔ باقی مولانا صاحب سے ناراضی کا اظہار بائیکاٹ کی صورت میں نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح دعوتی مشن کو نقصان کا اندیشہ ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

﴿ فَذَكِّرْ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ . لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ . ﴾ (الغاشية: ٢١-٢٢)

"تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو۔ تم ان پر داروغہ نہیں ہو۔"

ممکن ہے دور ابتلاء کے بعد کسی وقت اللہ رب العزت آپ کی محنت شاقہ کو ثمر آور بنا دے:

﴿ وَلَا تَيْأَسُوا مِن رَّوْحِ اللَّهِ إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِن رَّوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَٰفِرُونَ . ﴾ (يوسف: ٨٧)

''اور اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو کہ اللہ کی رحمت سے بے ایمان ہی لوگ نا امید ہوا کرتے ہیں۔''

سوال: بچوں کے اکثر کھلونے اصل کی شکل کے ہوتے ہیں۔ مثلاً بلی۔ کتا وغیرہ۔ کیا ایسے کھلونے رکھنا درست ہے؟

جواب: بخاری، مسلم، مسند احمد کی مشہور روایت میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا گڑیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ ❶ اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ بچیوں کے کھیلنے کے لیے گڑیاں بنانا جائز ہے تاکہ انہیں بچپن ہی سے امور خانہ داری کی تربیت دی جا سکے۔ میرے خیال میں محض کھیل کے لیے حرام جانوروں کی تصویروں سے بالخصوص احتراز کرنا چاہیے۔ لیکن شے کا اصل کے مشابہ ہونا کوئی عیب کی بات نہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (عون المعبود: ٤/٤٣٩)

سوال: شادی کے موقع پر میاں بیوی کی تصویریں بنانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: تصویریں لینا حرام ہے۔ ❷

سوال: یہ کہ ہم نے اپنی مسجد میں اسلامی کتب کی لائبریری بنائی ہوئی ہے اور اس میں آڈیو اور ویڈیو کیسٹیں بھی ہیں جس میں جید علماء کرام کی کیسٹیں ہیں۔ جس کو بعض سلفی بھائی بت فروشی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ بیان فرمائیں کیا وہ علمائے کرام جنہوں نے اپنی ویڈیو کیسٹیں بنوائی ہیں جب کہ وہ بھی صاحب علم وفضل ہیں۔

اگر یہ شرعی طور پر جائز یا ناجائز ہیں تو کتاب وسنت کی روشنی میں دلائل کے ساتھ جواب ارسال فرمائیں؟

جواب: اسلام میں تصویر مطلقاً حرام ہے۔ گناہ بہر صورت گناہ ہے۔ اس کا مرتکب جو بھی ہو وہ عدالت عالیہ میں جوابدہ ہے۔ یہ حتمی اور یقینی بات ہے کہ سند کی حیثیت صرف کتاب وسنت کو حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن سب سے سخت عذاب مصوروں کو ہوگا ❸ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو بھی تصویر یا مجسمہ دیکھو، اسے مٹا دو اور جو قبر اونچی دیکھو اسے برابر کر دو۔'' ❹ (مسلم)

---

❶ (٣٠٠) انظر الرقم المسلسل (٢٨٩).

❷ (٣٠١) علاوہ ازیں موجودہ دور میں ان تصاویر کو بطور یادگار یا بیٹھکوں اور گھروں میں بطور ڈیکوریشن پیس جو آویزاں کیا جاتا ہے بے غیرتی اور بے شرمی ہے جو کسی بھی غیور مسلمان کو زیب نہیں دیتی۔ (عبدالشکور مدنی عفا اللہ عنہ).

❸ (٣٠٢) انظر الرقم المسلسل (٢٨١).

❹ (٣٠٣) انظر الرقم المسلسل (٢٨٠).

نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے صحن کے سامنے ایک پردہ لٹکایا، جس میں تصاویر تھیں جب انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو کھینچ کر پردہ پھاڑ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہو گیا اور فرمایا اے عائشہ رضی اللہ عنہا ان مصوروں کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا اور انہیں کہا جائے گا جو کچھ تم نے بنایا تھا۔ اب اس میں جان بھی ڈالو۔ ❶

❀❀❀❀❀❀❀

❶ (٣٠٤) انظر الرقم المسلسل (٢٨٨).

فرمانِ باری تعالیٰ

﴿ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ . ﴾ (الطلاق:۳)

فرمانِ رسول ﷺ

« اِنَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَه حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَ الْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيْرِ وَالْاَصْنَامِ .» (بَابُ بَيْعِ الْمَيْتَةِ وَالْاَصْنَامِ)

« لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰكِلَ الرِّبٰوا وَ مُوْكِلَهٗ وَكَاتِبَهٗ وَ شَاهِدَيْهِ وَقَالَ:« هُمْ سَوَاءٌ .»

﴿۱۹﴾ حلال وحرام اور ان کے متعلقات

سوال: جولوگ واضح طور پر رشوت لیتے ہیں۔کیا ان کے گھر سے دعوت کھائی جاسکتی ہے کہ نہیں؟

جواب: رشوت خور کی دعوت قبول کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ یہ بھی ''نہی عن المنکر'' کی ایک شکل ہے۔

سوال: کیا مردہ جانور کی خرید وفروخت جائز ہے؟ مردہ جانور کی کھال بیچی جاسکتی ہے کہ نہیں؟ علمائے دین سے سنا ہے کہ کھال کو رنگ دے کر بیچا جاسکتا ہے۔اگر کسی آدمی کے پاس رنگ کرنے کا انتظام نہ ہوتو وہ کسی بیوپاری جس کے پاس رنگنے کا انتظام ہے کو بیچ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: مردہ جانور کی خرید وفروخت ناجائز ہے، صحیح بخاری میں ایک طویل حدیث کے ضمن میں ہے:

« إِنَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَه حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَ الْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيْرِ وَالْاَصْنَامِ .»[1] (بَابُ بَيْعِ الْمَيْتَةِ وَالْاَصْنَامِ)

''بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی بیع کو حرام قرار دیا ہے۔''

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَ نَقَلَ ابْنُ الْمُنْذِرِ وَغَيْرُه الْإِجْمَاعَ عَلٰى تَحْرِيْمِ بَيْعِ الْمَيْتَةِ وَ يُسْتَثْنٰى مِنْ ذَالِكَ السَّمَكُ وَ الْجَرَادُ .'' (فتح الباری:٤/٤٢٤)

یعنی'' ابن منذر وغیرہ نے مردار کی بیع کی حرمت پر اجماع نقل کیا ہے، البتہ اس حکم سے مچھلی اور مکڑی مستثنیٰ ہے۔''

مردہ جانور کا چمڑہ اور کھال وغیرہ دباغت کے بعد فروخت کرنی چاہیے۔ دلائل کے اعتبار سے راجح اور

---

[1] (٣٠٥) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب المیتة والأصنام (٢٢٣٦)،صحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب تحریم بیع الخمر والمیتة والخنزیر والأصنام (٤٠٤٨).

محقق مسلک یہی ہے۔ جمہور اہل علم نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور اگر کسی کے پاس رنگنے کا انتظام نہ ہو تو وہ دوسرے سے عمل دباغت کے بعد فروخت کرے اور مزدوری اس کو ادا کرنی ہوگی۔

صاحب مرعاۃ فرماتے ہیں:

”وَ اَمَا قَبْلَ الدِّبَاغِ فَلَا یَجُوْزُ الْاِنْتِفَاعُ کَالْبَیْعِ وَغَیْرِہٖ وَ ھُوَ الْقَوْلُ الرَّاجِحُ الْمُعَوَّلُ عَلَیْهِ وَلَمْ یَقَعْ فِیْ رِوَایَةِ الْبُخَارِیِّ وَالنَّسَائِیِّ ذِکْرُ الدِّبَاغِ وَھِیَ مَحْمُوْلَةٌ عَلَی الرِّوَایَةِ الْمُقَیَّدَةِ بِالدِّبَاغِ .“ (ج ۱، ص ۳۲۰)

سوال: جوئے کی ایک نشانی یہ ہے کہ اس میں اصل زر تلف ہو جاتا ہے جب کہ انعامی بانڈ میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ پھر علمائے کرام اسے کیوں جوا سمجھتے ہیں حالانکہ انعامی بانڈ کسی بھی وقت واپس کر کے رقم وصول کی جا سکتی ہے؟

جواب: انعامی بانڈ میں جوا اور سود کی دونوں صورتیں موجود ہیں، جوا اس لیے کہ کھاتہ میں جمع شدہ رقم اس انعام کا ذریعہ بنی ہے جو کسی کارنامہ کا صلہ نہیں بلکہ بلا محنت بخت و اتفاق سے ہاتھ لگ گئی ہے۔ یہی جوا کی تعریف ہے۔ دوسری طرف جس ادارہ میں یہ رقم جمع ہوتی ہے وہ اسے سودی کاروبار پر صرف کرتا ہے۔ قرعہ کی مدت کے دوران وہ بہت ساری رقم جمع کر لیتا ہے، جس کی معمولی سودی نسبت بجائے سب حصہ داروں پر تقسیم کرنے کے چند افراد کی جھولی میں انعام کے طور پر ڈال دی جاتی ہے اس میں سود کی شرح بھی متعین ہوتی ہے، جب کہ افراد کا تَعَیُّنُ عَلٰی سَبِیْلِ الْبَدَل ذہنی ہوتا ہے اور مخصوص رقم جمع کرانے والا چونکہ سودی کاروبار میں معاونت کا سبب بنا ہے لہٰذا وہ بھی مجرم ٹھہرا۔ باقی رہا جوئے کی علامات میں سے اصل زر کا تلف ہونا، سو یہ صرف ایک مفروضہ ہے اس کا واقعات و حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔

سوال: کیا گھوڑا حلال جانور ہے؟ نیز علمائے کرام کے بیان کے مطابق جو جانور اپنے پاؤں سے شکار کرتے ہیں وہ حرام ہوتے ہیں اور جو اپنے پاؤں سے شکار نہیں کرتے ہیں وہ حلال ہوتے ہیں، چونکہ ہر آدمی کو تمام جانوروں کے بارے میں اتنی معلومات نہیں ہوتیں اس لیے اسے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: مؤید بالدلائل مسلک کے مطابق گھوڑا حلال ہے۔ حدیث میں ہے:

« نَحَرْنَا فَرَسًا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَكَلْنَاهُ .» [1]

اور دوسری روایت میں ہے:

« وَ رَخَّصَ فِي لُحُوْمِ الْخَيْلِ .» (بخاری بَابُ لُحُوْمِ الْخَيْلِ)

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتح الباری :۔ ۱۰/۔ ۶۴۹ تا ۶۵۳)

اور اگر کوئی حلال اور حرام جانوروں میں امتیاز نہ کر سکے تو اسے اہل علم سے دریافت کرنا چاہیے۔ قرآن میں ہے:

﴿ فَاسْئَلُوْٓا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ .﴾ (الأنبياء:۷)

''اگر تم نہیں جانتے تو جو یاد رکھتے ہیں ان سے پوچھ لو۔''

یا ان مؤلفات کا مطالعہ کرنا چاہیے جو موضوع ہذا پر علماء کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں مثلاً : حَيَاةُ الْحَيَوَان الْكُبْرىٰ لِلدُّمَيْرِىْ، وغیرہ وغیرہ۔

سوال: ۱۱ رجب ۱۴۱۲ھ ۱۷ جنوری ۱۹۹۲ء شمارہ ۳ مؤید بالدلائل مسلک کے مطابق گھوڑا حلال ہے۔ اس مسلک کا مجھے علم نہیں۔ اچھی طرح تشریح کریں؟

جواب: فرمان رسول اللہ ﷺ سے گھوڑے کی حلت ثابت ہے۔ حدیث جابر رضی اللہ عنہ میں ہے:

« وَأَذِنَ فِيْ لُحُوْمِ الْخَيْلِ .» [2] (متفق علیه)

یعنی ''رسول اللہ ﷺ نے گھوڑے کا گوشت کھانے کی اجازت دی ہے۔''

البتہ بخاری میں لفظ اَذِنَ کی بجائے '' رَخَّصَ ''وارد ہے۔ ملاحظہ ہو: (بخاری ۱۶/۴، مسلم ۶۶/۶)

ارشاد نبوی مزید تشریح کا محتاج نہیں بات نصف النہار کی طرح بالکل واضح ہے۔ ایک مومن کے لیے بلا تردد فرمان نبوی ﷺ پر ایمان لانا واجب ہے۔ قرآن میں ہے :

﴿ وَإِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا .﴾ (النور:۵۴)

''اور اگر تم ان کے فرمان پر چلو گے تو سیدھا رستہ پالو گے۔''

سوال: میرے والد صاحب کی کمائی میں حرام کی آمیزش ہے۔ اور وہ خود بھی اس کا علم رکھتے ہیں لیکن

---

[1] (۳۰۶) صحیح البخاری، کتاب الذبائح والصید ،باب النحر والذبح (۵۵۱۲) عن أسماء بنت أبی بکر رضی الله عنهما،صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب إباحة اكل لحم الخيل (۵۰۲۵).

[2] (۳۰۷) صحیح مسلم (۵۰۲۲) ولفظ "اذن" رواه مسلم .

دنیاداری ان پر چھائی ہوئی ہے، کیا میں ان سے خرچہ لے کر استعمال کرسکتا ہوں۔ اگر نہیں تو پھر کیا ان سے خرچہ لے کر میں خود کوئی کام کرسکتا ہوں۔ یہ تو صورت حال گھر سے باہر کی ہے۔ اس سلسلے میں گھر کے اندر رہتے ہوئے کیا صورت حال اختیار کرنی چاہیے؟

جواب: موجودہ صورت میں آپ کو خود ہی اپنا حلال و مباح ذرائع آمدن تلاش کرنا چاہیے۔ اگرچہ تعلیمی سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بظاہر اس میں دقت ضرور ہے لیکن قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

﴿ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ . ﴾ (الطلاق:۳)

''اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے (رنج محن سے) مخلصی (کی صورت) پیدا کر دے گا۔ اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے اسے وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔ اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے گا تو وہ اس کو کفایت کرے گا۔'' ہر صورت حرام مال کے اثرات سے محفوظ رہنا ضروری ہے۔ گذر اوقات کے لیے خود محنت کرو۔

سوال: کیا عند الذبح جانور کو قبلے رخ لٹانا ضروری ہے؟

جواب: سماحۃ المفتی محمد ابراہیم آل الشیخ رحمہ اللہ ذبح کی سنتیں ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''نمبر۵ یہ ہے کہ جانور کو قبلہ رخ کیا جائے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جب کوئی جانور ذبح کیا، یا کسی ہدی کو نحر کیا تو اسے قبلہ رخ کیا۔ اونٹ کا کھڑے کھڑے بایاں گھٹنا باندھنا چاہیے۔ بکری اور گائے کو بائیں طرف لٹانا چاہیے۔'' (فتاوی إسلامیه ۳/۴۳۱)

واضح ہو کہ جانور کو قبلہ رخ لٹانے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ اگر کسی وقت نہ بھی ہو سکے تو ذبیحہ درست ہوگا۔ ان شاء اللہ فعل ہذا ضروری نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت نے بے قابو دوڑے ہوئے اونٹ کے نحر کو ہر ممکن صورت میں جائز رکھا ہے۔

سوال: محترم جناب حافظ صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ! درج ذیل تحریر پڑھ لیں۔ اس تنظیم کے قیام کی وجہ یہ بنی کہ ہمارے ایک ساتھی کی بچی فوت ہوگئی جو رزق حلال کماتا اور کھاتا ہے۔ عدالت سے رشوت وغیرہ نہیں لیتا اور تنگدستی کی زندگی گزارتا ہے۔ بچی کی وفات پر کفن و دفن وغیرہ کے اخراجات کے لیے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ ہم جنازہ پڑھنے گئے تو پتہ چلا سب اہلکاروں نے مل کر کچھ رقم جمع کر دی۔ بعد میں ہمارے کچھ ملازم

بھائیوں نے سوچا کہ ایک ملازم اپنی تنخواہ سے بمشکل گھر چلاتا ہے۔ ایسے موقع پر کچھ تعاون کی تدبیر کی جائے، اس طرح انہوں نے میرا نام بھی ممبران میں لکھ دیا کیونکہ دوسرے ساتھی مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ:

❁ کیا یہ ''بیمہ زندگی'' کی مشابہت ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں بتائیں کہ یہ کام جائز ہے یانہیں؟

❁ عزیز ساتھیو! تیزی سے بدلتے ہوئے معاشی حالات کے پیش نظر ہم نے ایک فلاحی تنظیم بنانے کا فیصلہ کیا ہے جس کے اغراض ومقاصد اور شرائط درج ذیل ہیں:

① فلاحی تنظیم خالصتاً انسانی ہمدردی اور رضائے الٰہی کے جذبے سے کام کرے گی۔

② تنظیم کا مقصد ممبران کے ہاں وفات پر مالی معاونت کرنا ہے جو''اپنی مدد آپ'' کے اصول کے تحت عمل میں لائی جارہی ہے۔

③ بصورت وفات (جس میں ممبر کے حقیقی والدین،ممبر کی بیوی اور بچے اس میں حقدار ہوں گے۔ ان کے علاوہ اور کوئی رشتہ شامل نہ ہوگا) جس بچے کی عمر ۴۰ ایام سے زیادہ ہوگی وہ حقدار ہوگا،۴۰ روز سے کم عمر والا حقدار نہ ہوگا۔ وفات کے موقع پر تنظیم مبلغ ۵۰۰۰/ روپے کی معاونت کرے گی۔

④ خود ممبر کی وفات کی صورت میں تنظیم اس کے ورثاء کو مبلغ ۱۰۰۰۰ روپے ادا کرے گی۔

⑤ سول وسیشن کورٹس ضلع رحیم یار خان کے جملہ ملازمین (نائب قاصد، پیادے، کاپی کلرک، اہلمد، ریڈر، سٹینوگرافر، سی اوسی، ناظر، ریکارڈ لفٹر ممبر شپ اختیار کرسکتے ہیں۔

⑥ ممبر بننے کے بعد ہر ممبر کو پہلی مرتبہ مبلغ ۵۰ روپے اور آئندہ ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے مبلغ ۳۰ روپے بحق تنظیم جمع کرانے ہوں گے۔

⑦ اگر کوئی ممبر محکمہ سے ریٹائرڈ ہو جانے کے بعد بھی چندہ ادا کرتا رہے تو وہ باقاعدہ ممبر شمار ہوگا۔

⑧ اگر کوئی ممبر مسلسل دو ماہ تک چندہ متذکرہ ادانہیں کرے گا تو تیسرے مہینے کی یکم سے وہ خارج متصور ہوگا اور آئندہ وہ ذمہ دار اراکین تنظیم کو درخواست دے کر منظوری لیے بغیر دوبارہ ممبر نہیں بن سکتا۔

⑨ وفات کی صورتمیں ممبر کی جانب سے کسی بھی ذریعہ سے تنظیم کو اطلاع موصول ہونے پر رقم کی ادائیگی فی الفور کردی جائے گی۔ بینک بند ہونے کی صورت میں بینک کھلتے ہی ادائیگی کردی جائے گی جب کہ باقی ضابطہ کی کاروائی تنظیم کے ذمہ دار ممبران بعد میں خود کریں گے۔

⑩ وفات کے علاوہ کسی بھی صورت میں یہ جمع شدہ رقم استعمال نہ ہو گی اور ہر ممبر کو یہ اختیار حاصل ہو گا کہ جس وقت چاہے بینک اکاؤنٹ چیک کر سکتا ہے۔

⑪ آپ کی طرف سے بھیجی گئی تجاویز کی روشنی میں ہر سال یکم جنوری کو ذمہ دار اہلکار اجلاس بلا کر ترمیم کے مجاز ہوں گے۔ ہنگامی حالات میں قبل از وقت بھی اجلاس طلب کیا جا سکتا ہے۔

جواب: مذکورہ اہداف و مقاصد کے تحت بنائی گئی تنظیم کے بعض امور اصلاح طلب ہیں۔ بالخصوص نمبر ۳،۴،۸ جائز بیمہ پالیسی کی اصل شکل یوں ہے کہ کچھ لوگ، ایک مشترکہ سرمایہ (فنڈ) قائم کریں۔ جس میں (ماہانہ یا جس مدت پر اتفاق ہو جائے) ایک مخصوص شرح سے رقم جمع کریں، جس میں بنیادی غرض یہ ہو کہ اگر مشارکت کے کاروبار میں اتفاقیہ کوئی حادثہ ہو جائے مثلاً آگ لگنا، جہاز کا ڈوبنا، گاڑیوں کا ٹکرانا وغیرہ تو پالیسی میں شریک شخص اتنی رقم لے سکے جس سے وہ نقصان پورا کر لے (اگر اپنی جمع کردہ سے زیادہ لے رہا ہے تو زائد حصہ قرض ہو گا جس کی ادائیگی اس کے ذمہ ہو گی) البتہ اس میں درج ذیل باتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

① حصہ داری میں اصل غرض اللہ کی رضا ہونی چاہیے۔ تاکہ اس پر اسے اجر وثواب ملے۔

② مصیبت زدہ حصہ داروں کو مساویانہ انداز پر رقوم دی جائیں گی جس کا تعین اس پالیسی میں کر دیا جائے جس پر یہ متفق ہوئے تھے۔

③ حصہ داروں کی جمع شدہ دولت کو مضاربت کی شکل میں تجارت، تعمیرات اور صنعت کے اداروں میں منافع حاصل کرنے کے لیے لگانا جائز ہے اور اس میں کوئی امر مانع نہیں۔ (منهاج المسلم، ص ۳۳۶-۳۳۷)

سوال: میں نے الحمدللہ اتنی تعلیم کے باوجود بینک کی نوکری نہیں کی اور جنرل ضیاء شہید کے دور تک کرنٹ اکاؤنٹ (جاری حساب) میں ہی رقم اور تنخواہ جمع کراتا تھا، کیونکہ اس اکاؤنٹ پر سود نہیں لگتا۔ لیکن جنرل صاحب نے بغیر سود کے منافع نقصان پر مبنی (bls aic) شروع کیے۔ جن پر منافع یا سود واقعی شروع سال میں متعین نہیں ہوتا اور ان سے ہر نصاب کے اوپر ہونے پر زکوۃ بھی کٹتی ہے۔ لہٰذا میں نے بچت کے حساب (سیونگ اکاؤنٹ) میں جمع کرانے شروع کر دیئے اور دل میں کہا کہ اب یہ حکومت کی ذمہ داری ہے۔ لیکن اب مجھے سخت کراہت ہو رہی ہے کہ کیا سابقہ کی معافی اور آئندہ کی تلافی ممکن ہے؟ میں اکثر سودی رقم غربا کو دے دیتا ہوں۔

جواب: جنرل ضیاء الحق کے عہد سے لے کر آج تک سودی معیشت کی اصلاح نہیں ہو سکی جو قابل افسوس ہے۔ اس زمانے میں صرف کھاتے میں نفع نقصان کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ درحقیقت شرح منافع متعین تھی۔

اس زمانے میں مجھے یہ بات بڑے قریب سے پرکھنے کا موقع ملا تھا۔ واقعۃً معاملہ اسی طرح تھا۔

سیونگ اکاؤنٹ میں لازماً سود لگتا ہے۔ آپ اسے فوراً تبدیل کرلیں۔ اور سابقہ کوتاہی کی اللہ کے حضور معافی کی درخواست کریں۔ ہو سکے تو کرنٹ اکاؤنٹ سے بھی بچاؤ کی کوئی صورت اختیار کریں۔ کیونکہ یہ بھی گناہ پر تعاون کی ایک شکل ہے۔

سوال: ایک شخص ہیروئین کا کاروبار کرتا ہے، معلوم ہونے کے باوجود مولوی صاحب نے اس سے پیسے لے کر مسجد کی تعمیر پر لگائے، جسے لوگوں نے ناپسند کیا۔

١ مولوی صاحب کا یہ فعل شریعت کی نظر میں کیسا ہے؟

٢ کیا اس مسجد میں نماز ہو جائے گی؟

٣ کیا اس فعل کا ازالہ ممکن ہے؟

جواب: ناجائز کاروبار کے پیسے مسجد کی تعمیر پر نہیں لگانے چاہیں۔ ایسے فعل کا ارتکاب کرنا شریعت کی نگاہ میں درست نہیں۔ ایسی مسجد میں نماز پڑھنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ ہاں البتہ اگر حرام کمائی کی رقم مسجد کے حسابات سے خارج کر دی جائے تو وجہ جواز ممکن ہے۔

سوال: بیمہ کمپنی، پرائز بانڈ، بولی کی کمیٹی، نیلای کی کمیٹی، بینک کی ملازمت، گورنمنٹ ملازمت، ریٹائرمنٹ کے وقت ملنے والی رقم اور بعد میں ملنے والی پنشن اور P-G فنڈ، P.L : کم سکیم، ٹھیکے، دلالی، قیمت پہلے ایڈوانس بقایا بالاقساط، ادھار کی صورت میں قیمت زیادہ یکمشت ادائیگی میں کم۔ ان سب صورتوں کی شرعی حیثیت واضح فرمائیں؟

جواب: ٹھیکے اور دلالی کا جواز واضح طور پر احادیث میں موجود ہے۔ صرف «لَا یَبِیعَ حَاضِرٌ لِبَادٍ .»[1] کی استثناء ہے۔ یعنی شہری جنگلی کا دلال نہ بنے۔ ملاحظہ ہو: (کتاب البیوع صحیح بخاری اور نیل الأوطار وغیرہ)

موجود شے کی قیمت پہلے ادا کی جائے یا بالاقساط دونوں طرح درست ہے یا کچھ پہلے اور باقی بالاقساط اس کا بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ قیمت کا پہلے سے تعین ہو چکا ہو۔ نیز ادھار اور نقد کی قیمت میں کمی و بیشی کا کوئی حرج نہیں، جائز ہے۔ کیوں کہ چیزوں کے بھاؤ گھٹتے بڑھتے ہیں۔ اس لیے سود کا شبہ نہیں۔ البتہ حتمی قیمت ادھار یا نقد کا تعین پہلے ہونا ضروری ہے۔ P-G فنڈ S-L-P سکیم، (جی - پی) (پی۔ ایل۔ ایس)

---

[1] (٣٠٨) صحیح البخاری، کتاب الشروط، باب ما لا یجوز من الشروط فی النکاح (٢٧٢٣) واللفظ له، والبیوع (٢١٤٠)، صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب تحریم بیع الحاضر للبادی (٣٨٢٤).

G-P فنڈ کی صورت میں اصل رقم کٹوتی کا حصول درست ہے اور زائد سود ہے۔ کَمَا سَبَقَ. P-L-S سکیم کی صورت میں چونکہ شرح منافع متعین ہوتی ہے اس لیے یہ بھی ناجائز ہے۔

سوال: احناف کی طرف سے یہ اعتراض ہوا ہے کہ قرآن و حدیث میں کہیں بھی یہ نہیں کہ چیونٹی حلال ہے یا حرام، یہ صرف امتی کی فقہ میں ہے۔ برائے مہربانی اس بارے میں ہماری رہنمائی فرمائیں کہ چیونٹی کی حلت یا حرمت کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث وارد ہے؟

جواب: حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ایک نبی کو چیونٹی نے کاٹ دیا تو اس نے چیونٹیوں کی ساری بستی کو جلا دیا۔ اللہ عزوجل نے اس کی طرف وحی کی تجھے تو صرف ایک چیونٹی نے کاٹا اور تو نے گروہوں میں سے ایک ایسے گروہ کو جلا دیا جو تسبیح و تقدیس کرتا ہے۔''[1] (متفق علیه، بحواله مشکوة، بَابُ مَا يَحِلُّ أُكْلُهُ وَمَا يَحْرُمُ)

اور سنن ابی داؤد میں حدیث ہے کہ آپ نے چار چیزوں کے قتل سے منع فرمایا ان میں سے ایک چیونٹی ہے۔[2]

پہلی حدیث سے معلوم ہوا عام حالات میں چیونٹیوں کو مارنا نہیں چاہیے البتہ نقصان کی صورت میں مارنے کا جواز ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''چیونٹیوں کو مارنا مکروہ ہے الا یہ کہ وہ نقصان کریں اور قتل کے بغیر چارہ کار نہ ہو تو اس صورت میں جواز ہے۔'' (تفسیر قرطبی ۱۷٤/۱۳)

اور دوسری حدیث میں واضح طور پر اس کے قتل سے روکا گیا ہے۔

علامہ دمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' چیونٹی کا کھانا حرام ہے کیونکہ اس کے قتل سے منع کیا گیا ہے بلکہ جو چیز یہ اپنے منہ میں اٹھائے اس کے کھانے سے بھی منع کیا گیا ہے۔'' ملاحظہ ہو: (حیاة الحیوان)

سوال: کسی دوا میں مینڈک یا چیونٹی کے اجزا شامل کرنے ہوں تو کیا مینڈک اور چیونٹی کو اس مقصد کے لئے مارنا جائز ہے؟

---

[1] (۳۰۹) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، رقم الباب (۱۵۳)، ح:۳۰۱۹۔ صحیح مسلم، کتاب السلام باب النهی عن قتل النمل(٥٨٤٩) تا (٥٨٥١) عن ابی هریرة رضی الله عنه.

[2] (۳۱۰) ابو داؤد (٥٢٦٧) عن ابن عباس رضی الله عنهما.

جواب: احادیث میں چونکہ مینڈک اور چیونٹی کو مارنے سے روکا گیا ہے۔ لہٰذا ان کو دواؤں میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ صحیح حدیث میں ہے:

« نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَنِ الدَّوَاءِ الْخَبِيْثِ .» ❶ (ابو داود)

سنن ابی داؤد میں حدیث ہے کہ ایک ڈاکٹر نے نبی ﷺ سے مینڈک کو دوا میں ڈالنے کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے منع کر دیا۔ علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کی سند صحیح ہے۔ (مشکوۃ:۲/۲۸۳)

سوال: تمباکو نوشی (حقہ، سگریٹ) کا استعمال شریعت کی رو سے کیسا ہے؟

جواب: حقہ، سگریٹ، درج ذیل وجوہات کی بنا پر حرام ہیں۔

① اس سے دماغ میں فتور پیدا ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نشہ والی شے اور جس سے دماغ میں فتور پیدا ہو منع فرمایا ہے۔ (ابو دائود) ❷

② بلا فائدہ اسراف ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا إِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ . ﴾ (الاسراء:۲۷)

''یعنی اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں''۔

③ ان کی بدبو سخت ہے۔ حدیث میں ہے: ''جس شی سے بنی آدم ایذا محسوس کرتے ہیں، اس سے فرشتے کو بھی ایذا پہنچتی ہے۔'' ❸ فعل ہذا کو کار ثواب قرار دینا دین سے ناواقفیت اور جہالت ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاوی اہل حدیث ۳/۳۱۸-۳۱۹)

سوال: ہمارے ایک دوست اخبار کا کاروبار کرتے ہیں۔ مہینے کے بعد جب اخبار والوں کو کل اخبارات کی رقم ادا کرنی ہوتی ہے تو اخبارات والے کل رقم پر ۳۳ فیصد کمیشن دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں بتائیں کیا یہ کمیشن وصول کرنا درست ہے؟

جواب: کمیشن کی صورت میں محنت کا معاوضہ وصول کرنا درست ہے۔ ملاحظہ ہو: (فتح الباری، کتاب البیوع)

---

❶ (۳۱۱) صححه الحاكم والذهبى على شرط الشيخين (۴/۴۱۰) (۸۲۶۰) و صححه الألبانى و احمد شاكر۔ صحيح ابى داؤد، كتاب الطب، باب فى الادوية المكروهة (۳۸۷۰)، احمد (۲/۳۰۵)، الترمذى (۲۰۴۵)، ابن ماجة (۳۴۵۹) .

❷ (۳۱۲) ضعفه الألبانى بالمشكاة (۳۶۵۰)، الضعيفة (۴۷۳۲)، أبو داؤد (۳۶۸۲).

❸ (۳۱۳) صحيح مسلم، كتاب المساجد، باب نهى من اكل ثوماً (۱۲۵۱ تا ۱۲۵۴)

سوال: کیا اخبارات کا کاروبار کرنا حرام ہے؟ کیونکہ اخبارات پر فحش تصاویر ہوتی ہیں۔ جس سے فحاشی پھیلتی ہے۔

جواب: تصاویر کی وجہ سے معاملہ واقعی مشکوک ہے لیکن ان کی عزت واحترام مقصود نہ ہو تو جواز کی صورت ممکن ہے۔ البتہ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کاروبار سے بچا جائے۔

سوال: میرے ایک بھائی بنک میں مینجر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ وہ اس ملازمت کو چھوڑنا چاہ رہے ہیں چونکہ ان کا خیال ہے کہ یہ ملازمت غیر شرعی ہے۔ بنک کا زیادہ تر کاروبار سودی کاروبار ہے۔ اگرچہ کچھ کام تجارت، لین دین پر معاوضہ، لوگوں کی امانتوں کو رکھنا اور بحفاظت واپس کرنا زکوٰۃ اکٹھا کرنا۔ دیگر گورنمنٹ کے ٹیکس وغیرہ کا اکٹھا کرنا۔ طلبا، ضرورت مند لوگوں کو اُدھار دینا وظائف اور دیگر سہولتیں دینا وغیرہ کام بھی بنک کرتا ہے۔

۱...... آیا شرعی طور پر اس قسم کے ادارہ میں ایمانداری سے اپنے فرائض بہ احسن طریق ادا کرنے کی صورت میں تنخواہ اور دیگر سہولتیں جائز ہیں؟

۲...... آیا ان امور کی انجام دہی میں اس شخص کا کردار سودی کام کرنے والوں کا کردار ہے؟

جواب: سودی لین دین کرنے والے بینکوں میں ملازمت کرنا حرام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ. ﴾(المائدۃ:۲)

''نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو! کچھ شک نہیں کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔''

بینک میں ملازمت اختیار کرنا چونکہ برائی اور سرکشی میں دست تعاون بڑھانا ہے۔ اس لیے حرام ہے۔ اور صحیح مسلم میں حدیث ہے:

« لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آكِلَ الرِّبٰوا وَ مُوْكِلَهٗ وَكَاتِبَهٗ وَ شَاهِدَيْهِ وَقَالَ:« هُمْ سَوَاءٌ .» »[1]

یعنی ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیاج لینے والے اور دینے والے اور لکھنے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت فرمائی۔ اور فرمایا: وہ (سب) برابر ہیں یعنی گناہ میں۔''

---

[1] (۱۵۹۸/۱۰۶) صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب لعن آکل الربا وموکلہ......(۴۰۹۳).

مذکورہ حدیث کی رو سے رِبوی (سودی) کاروبار سے متعلق سب لوگ ملعون ہیں۔ لہٰذا بینک کی ملازمت کو فوراً خیر باد کہہ کر رب کی زمین میں اپنے اور اہل و عیال کے لیے لقمۂ حلال کی تلاش میں لگ جانا چاہیے۔ آسمانوں اور زمین کے خزانے اسی کے ہاتھ میں ہے۔ کیڑوں مکوڑوں کو پتھروں میں روزی پہنچانے والا آپ کے لیے بھی روزی کا بندوبست ضرور کرے گا:

﴿ وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ . ﴾

یاد رہے جملہ عبادات کی قبولیت کا انحصار اکل حلال پر ہے۔ فرمان نبوی ہے: حرام سے نشو و نما پانے والے بدن پر رب کی بہشت حرام ہے۔[1] کہیں ایسا نہ ہو خواب غفلت میں ہی موت آ جائے تو پھر أَحْكَمُ الْحَاكِمِيْنَ کی عدالت عالیہ میں سوائے شرمندگی اور ندامت کے کوئی جواب نہ بن پائے۔

عقلمندی یہ ہے کہ آنے والے وقت سے پہلے اسی دنیا فانی میں اپنے آپ کا محاسبہ کر لیا جائے تاکہ آنے والی گھڑی میں سدا باغ و بہار کے وارث بن سکیں۔

« قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ .» [2]

سوال: عدم علم کی وجہ سے کہیں سے سود کے پیسے آ جائیں اور بعد میں پتہ چلے کہ یہ پیسے ناجائز ہیں یہ سود ہے تو آدمی خود استعمال کرنے کی بجائے چاہتا ہے کہ کسی اور جگہ استعمال ہو جائیں تو آپ فرمائیں کہ ان سودی پیسوں کا مصرف کیا ہوگا؟

جواب: سودی پیسہ جو اچانک ہاتھ لگ جاتا ہے اس کا مصرف یہ ہے کہ اگر کسی نے بیاج کا پیسہ دینا ہے تو

---

[1] (۳۱۵) الأول:إسناده ضعيف.قاله الأستاذ إرشاد الحق الأثرى حفظه الله تعالى،أبويعلى بتحقيق الأثرى(۸۵/۱)(۷۹،۷۸)ومختصر زوائد مسند البزار لابن حجر(۵۱۴/۲)(۲۳۲۲)وقال ابن حجر:فيه عبد الواحد " ضعيف جدا ".الثاني:معناه صحيح ثابت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم،انظر:بهذا اللفظ: « لايدخل الجنة لحم نبت من سحت،النار أولى به......» أحمد،(۳۲۱/۳)وقال حمزة:إسناده صحيح. عبدالرزاق (۳۴۶/۱۱) (۲۰۷۱۹)، ابن حبان(۹/۵)(۱۷۲۳۔الإحسان)،الدارمى(۲۸۱۸)بتحقيق حسين سليم، وقال: "قوى". وقال شعيب الأرناؤوط "صحيح ".والطبرانى فى الأوسط(۴۴۷۷،۲۷۵۱)عن كعب و(۶۶۷۱)عن حذيفة ،والمشكاة(۲۷۷۲)عن جابر.

[2] (۳۱۶) صحيح مسلم،كتاب الجنة،باب صفة الجنة(۷۱۳۲).

اسے بتا کراس کے سپرد کر دیا جائے تا کہ سودا تار سکے یا کسی پر حرام کا تاوان ہے تو اسے دے کراس کی خلاصی کرائی جائے غرض یہ کہ حرام کا پیسہ حرام رستے ہی لگنا چاہیے صورت چاہے جونسی ہو۔

سوال: عورتوں کے لیے سونے کے استعمال کا کیا حکم ہے؟

" بَابُ الْخَاتِمِ اَلْفَصْلُ الثَّانِيُ (مشکوۃ المصابیح) عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ:«أَيُّمَا امْرَأَةٍ تَقَلَّدَتْ قَلَادَةً مِّنْ ذَهَبٍ قُلِّدَتْ فِيْ عُنُقِهَا مِثْلُها مِنَ النَّارِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ أَيُّمَا امْرَأَةٍ جَعَلَتْ فِيْ أُذُنِهَا خَرْصًا مِّنْ ذَهَبٍ جَعَلَ اللّٰهُ فِيْ أُذُنِهَا مِثْلَه مِنَ النَّارِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ .» [1]

(رواه أبو داؤد و النسائی)

شیخ الحدیث مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب سے گزارش ہے کہ ''الاعتصام'' میں احکام و مسائل کے تحت اس حدیث کے متعلق وضاحت فرمائیں۔

اگر یہ حدیث بالکل صحیح ہے تو کوئی عورت اپنے کانوں اور گلے میں آگ برداشت نہیں کر سکتی۔ وضاحت کر کے امت مسلمہ کی خواتین کو آگ سے بچایئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر سے نوازے۔ آمین!

جواب: صورت سوال میں مذکور روایت امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں '' بَابُ مَا جَاءَ فِي الذَّهَبِ لِلنِّسَاءِ" [2] کے تحت نقل کی ہے۔

❁ اور امام نسائی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں اس پر بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے: " الْكَرَاهِيَةُ لِلنِّسَاءِ فِيْ إِظْهَارِ الْحُلِيِّ وَالذَّهَبِ ." [3]

امام ابوداؤد رحمہ اللہ کا مقصود محض سونا پہننے یا نہ پہننے کے بارے میں وارد روایات کو جمع کرنا ہے۔

البتہ عنوان کے آغاز میں جواز کی روایت کو لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی ترجیح جواز کو ہے۔ بصورت دیگر حرمت کا عنوان بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور امام نسائی رحمہ اللہ نے مختلف روایات میں تطبیق و توفیق کی صورت پیدا کی ہے۔ اس عنوان سے بتانا یہ چاہتے ہیں کہ سونا یا زیورات پہننا منع صرف اس صورت میں ہے جب کہ عام لوگوں کے سامنے اظہار زینت مقصود ہو۔

---

[1] (٣١٧) المشكاة(٤٤٠٢) كتاب اللباس .

[2] (٣١٨) ابو داؤد كتاب الزينة رقم الباب (٣٨) (٤٢٣٨) ضعفه الألباني ، ضعيف أبي داؤد (٩١١)

[3] (٣١٩) النسائی (٥١٣٧، ٥١٣٨) ضعفه الألباني ضعيف النسائی (٣٩١) .

✿ اس سے پہلے امام دارمی رحمہ اللہ نے بھی اپنی مسند میں اس طرح کا باب قائم کیا ہے۔

" بَابُ كَرَاهِيَةِ إِظْهَارِ الزِّينَةِ . " ❶

منع کی روایات میں توجیہات کے بارے میں اہل علم کے مختلف مسالک ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

① ......ایک گروہ نے کہا منع کی تمام روایات معلول اور کمزور ہیں۔ زیرنظر روایت کے بارے میں ابن القطان نے کہا اس حدیث کی علت یہ ہے کہ اس میں اسماء بنت یزید سے راوی محمود بن عمرو مجہول الحال ہے۔ اگرچہ ایک جماعت نے اس سے روایت کی ہے۔ اس کے باوجود بعض ائمہ کے ہاں بعض راویوں سے جہالت رفع نہیں ہوتی۔ چنانچہ امام ذہبی رحمہ اللہ نے داؤد بن یزید ثقفی کے ترجمہ میں ابو حاتم سے بیان کیا ہے کہ یہ مجہول ہے اس کے باوجود کہ اہل علم کی ایک جماعت نے اس سے روایت کی ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" هٰذَا الْقَوْلُ لَوْوَضَحَ لَكَ اَنَّ الرَّجُلَ قَدْ يَكُوْنُ مَجْهُوْلًا عِنْدَاَبِيْ حَاتِمٍ وَلَوْ رَوٰى عَنْهُ جَمَاعَةٌ ثِقَاتٍ. يعنى: " أَنَّهٗ مَجْهُوْلُ الْحَالِ. "

امام ابن حزم رحمہ اللہ نے " المحلّٰی " ❷ میں اور امام "الجرح والتعدیل" ذہبی رحمہ اللہ نے "المیزان" میں ابوالمحاسن یوسف الحنفی نے "المعتصر" کے ص ۳۶۱ میں روایت ہذا کو ضعیف قرار دیا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام منذری رحمہ اللہ کا "الترغیب والترھیب" ❸ میں اس کی سند کو جید کہنا محل نظر ہے۔

یاد رہے کہ اسماء بنت یزید بن السکن سے ایک دوسری روایت بھی اسی مفہوم کی مروی ہے لیکن اس میں دو راوی لیث بن ابی سلیم اور اس کے شیخ شہر بن حوشب دونوں ضعیف ہیں۔ ملاحظہ ہو: المحلّٰی لابن حزم۔ ❹ ایک تیسری روایت بھی ان سے وارد ہے۔ اس میں بھی شہر بن حوشب ضعیف ہے۔ ❺ پھر مسند احمد کی ایک چوتھی روایت میں بھی شہر بن حوشب ہے۔ ❻

---

❶(٣٢٠) سنن الدارمي (٣٦٢/٢)(٢٦٤٥)، و بتحقيق حسين سليم (١٧٢٩/٣)، (ح:٢٦٨٧).

❷(٣٢١) المحلى لابن حزم (٢٤١/٩).

❸(٣٢٢) (٥٥٧/١)حديث الباب(٣١). وضعيف الترغيب للالباني (٢٤٢/١)،(ح:٤٧٣).

❹(٣٢٣) (٢٤١/٩).

❺(٣٢٤) (٢٤١/٩).

❻(٣٢٥) (٤٥٣/٦، ٤٥٤)فيه شهر بن حوشب.(٤٥٧/٦)،(٢٧٤٥٦)فيه محمود بن عمرو.

۲..... منع کی روایات کا تعلق اسلام کے ابتدائی دور سے ہے پھر منسوخ ہوگئیں۔ ان کا استدلال ابوموسیٰ کی اس مرفوع روایت سے ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لیے حلال اور مردوں پر حرام ہے۔''

ترمذی رحمہ اللہ نے کہا یہ حدیث صحیح ہے۔ ابن ماجہ رحمہ اللہ نے بھی اپنی سنن میں اس کو علی اور عبداللہ بن عمرو سے مرفوع بیان کیا ہے۔ ❶ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے اس کے دو اور طریق بھی بیان کئے ہیں:

حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ عَنْ عُبَيْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ بِإِسْنَادِهِ .''

اس طرح سعید بن ابی عروبہ اور معمر سے، وہ دونوں ایوب سختیانی سے وہ نافع سے باسنادہ اس میں ریشم اور سونے کا ذکر ہے۔ ابن حزم رحمہ اللہ نے کہا: '' هُوَ أَثَرٌ صَحِيحٌ .'' کہ یہ اثر صحیح ہے۔ ❷ کیونکہ سعید بن ابی ہند ثقہ مشہور ہے۔ اس سے بیان کرنے والا نافع اور موسیٰ بن میسرہ ہے۔ بعد ازاں ابن حزم رحمہ اللہ نے جواز کے لیے سنن ابوداؤد میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع۔ روایت ❸ (جس میں حالت احرام میں عورتوں کو زیورات استعمال کرنے سے منع کیا گیا ہے) سے استدلال کیا ہے۔ پھر ابن حزم رحمہ اللہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے تمام زیورات کا عام تذکرہ فرمایا ہے۔ اگر عورتوں پر سونا حرام ہوتا تو آپ ﷺ وضاحت فرما دیتے۔ جب منع نہیں فرمایا تو معلوم ہوا حلال ہے۔ انہوں نے کہا کہ سلف کی ایک جماعت کا یہی مسلک ہے۔

ابوبکر الجصاص نے ''احکام القرآن'' میں قرآنی آیت: ﴿ أَوَ مَنْ يُنَشَّأُ فِي الْحِلْيَةِ .... ﴾ (الزخرف: ۱۸) کی تفسیر میں کچھ وعیدی نصوص ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ جن روایات میں عورتوں کے لیے سونے کی اباحت ہے وہ زیادہ واضح اور عدم جواز کی روایت سے زیادہ نمایاں اور مشہور ہیں۔ اور آیت مذکورہ بالا بھی اس کے جواز پر دلالت کر رہی ہے۔ پھر امت کا عمل بھی نبی ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے سے ہمارے زمانے (یعنی چوتھی صدی کے آخری دور) تک یہی رہا ہے۔ بغیر اس کے کہ کسی نے اس پر اعتراض کیا ہو۔

امام منذری رحمہ اللہ نے ''مختصر'' میں مذکورہ حدیث کے بارے میں کہا ہے: بعض اہل علم نے اس کو (اسلام کے)

---

❶ (۳۲۶) عن علی (۳۵۹۵). وعن عبد الله بن عمرو (۳۵۹۷).

❷ (۳۲۷) المحلی (۱۷۷۷) (۹/۲۴۵) وقال: صحیح .

❸ (۳۲۸) سنن ابی داؤد، کتاب المناسك، باب ما يلبس المحرم (۱۸۲۷) قال الألبانی " حسن صحیح ".

ابتدائی دور پر محمول کیا ہے۔ پھر وعید منسوخ ہو گئی۔ اور عورتوں کے لیے سونے کے زیورات مباح ہو گئے۔ نبی ﷺ کے اس فرمان کی بناء پر کہ:

« هٰذَانِ حَرَامٌ عَلٰی ذُکُورِ أُمَّتِیْ حِلٌّ لِإِنَاثِهَا .»

اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ وعید کا تعلق اس سے ہے جو زکوۃ ادا نہ کرے۔ امام خطابی رحمہ اللہ نے یہی دو جوابات دیے ہیں۔ ملاحظہ ہو: (مختصر و معالم و تهذيب ١٢٥/٦،١٢٦) ❶ ابن شاہین بھی اپنی کتاب "ناسخ" ❷ میں نسخ کا قائل ہے۔ سیوطی رحمہ اللہ نے بھی "اَلْمُجْتَبٰی" ❸ کے حاشیہ پر اس کو برقرار رکھا ہے۔

سوال: چاندی کی انگوٹھی کتنے وزن کی بنوانی چاہیے۔ کیا اس پر اپنا نام کندہ کروایا جا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: قریباً چھ ماشے چاندی، کسی مصلحت کی بنا پر اگر اس میں نام وغیرہ لکھ دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

سوال: پیپسی کولا، کوکا کولا کے بارے میں کیا تحقیق ہے؟ عبدالسلام کیلانی صاحب کی کتاب "منشیات اور اسلام" میں ان کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

جواب: پیپسی کولا اور کوکا کولا کی فیکٹریوں میں جو حضرات ذمہ دار ہیں یا وہاں کام کرتے ہیں براہ راست ان سے صحیح صحیح معلومات اخذ کرنی چاہئیں۔ اگر فی الواقع یہ بات ثابت ہو جائے کہ ان میں نشہ آور اشیاء کی آمیزش ہے تو اس صورت میں ان بوتلوں سے احتراز لازمی ہے ورنہ بلا وجہ شکوک و شبہات میں پڑنے کی ضرورت نہیں، موصوف کیلانی صاحب کی معلومات کی حدود کا بھی جائزہ لینا چاہیے کہ ان کو کس حد تک بلاواسطہ معلومات تک رسائی ہے۔ آپ آج کل ایک افریقی ملک کینیا کے شہر "ممباسا" میں تبلیغی و دعوتی مشن پر مامور ہیں۔ زَادَهُ اللّٰهُ عِلْمًا وَ عَمَلًا.

امید ہے اس بارے میں اگر کسی قاری الاعتصام کو محققہ و مصدقہ معلومات حاصل ہوں تو وہ ہمیں آگاہ کرنے میں بخل سے کام نہیں لے گا۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

« اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَة .» ❹ یعنی "دین خیر خواہی کا نام ہے۔"

---

❶ (٣٢٩) معالم السنن(٤٣٧/٤).

❷ (٣٣٠) رقم(٥٧٤ إلى ٥٧٧)بتحقيق كريمة بنت على۔العلمية.

❸ (٣٣١) شرح الحديث(٥١٤٣)(١٥٧/٨).

❹ (٣٣٢) صحيح البخارى، كتاب الايمان ، باب قول النبى ﷺ الدين النصحية...... تعليقاً، صحيح مسلم ، الايمان، باب بيان الدين النصيحة ......(١٩٦، ١٩٧) عن تميم الدارى رضى الله عنه .

سوال: کیا دست شناسی غیر اسلامی علم ہے؟ جو ہاتھ دکھاتے ہیں اور جو دیکھتے ہیں ان کے بارے میں قرآن و سنت میں کیا حکم ہے؟

جواب: دست شناسی کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں بلکہ عراف (ماضی اور مستقبل کی خبریں دینے والا) کے پاس آمد سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: جو شخص عراف یا کاہن کے پاس آیا اور اس کی باتوں کی تصدیق کی تو اس نے شریعت سے کفر کیا۔ ❶ (مسند احمد بحوالہ شرح العقیدۃ الطحاویۃ:ص٥١٦)

سو جہاں تک ڈاکٹری یا حکیمانہ تجربات و دست شناسی کا تعلق ہے۔ سو اس کا غیبی امور سے کوئی تعلق نہیں یہ تو محض انسانی جسم میں عادات کے متعلق جاری و ساری نظام و کیفیت سے آگاہی حاصل کرنے سے عبارت ہے جو عہد نبوت سے لے کر آج تک معمول رہا ہے۔

عامل اور معمول بہ کی چالیس روز تک عبادت قبول نہیں ہوتی۔ ❷ (مسلم و مسند أحمد) اور مذکورہ روایت میں ہے کہ ایسا شخص جس نے کاہن کی بات کی تصدیق کی اس نے شریعت سے کفر کیا۔

سوال: اگر مرغی اذان دے تو اس کو ذبح کر دینا چاہیے۔ یہ رجحان عام ہے۔ کیا قرآن و سنت سے ثابت ہے؟

جواب: اذان دینے والی مرغی کو ذبح کر دینے کا رجحان غلط اور جاہلانہ توہم پرستی پر مبنی ہے۔ ضرورت ہو تو سے ذبح کرنا بلا تردد جائز ہے۔ ممانعت کی کوئی دلیل نہیں۔ محض اذان کی وجہ سے اسے ذبح کر دینا جاہلانہ فعل ہے شریعت میں اس کا کوئی اصل نہیں۔ پھر جانوروں کی مخصوص اوقات میں بولی پر اذان کا اطلاق عرف عام میں مجازی ہے۔ حقیقتاً نہیں۔ جس طرح کہ جمعرات کو عامۃ الناس شیاطین سے موسوم کرتے ہیں۔

سوال: سورۃ جمعہ میں آتا ہے کہ جمعہ کے دن اذان سن کر تمام لوگ کاروبار چھوڑ کر مسجد میں آ جائیں اور لوگ تو کام چھوڑ کر آ گئے مگر مولوی صاحبان کا کام شروع ہو جاتا ہے یعنی کہ تنخواہ لیتے ہیں اور ان کی تنخواہ طے شدہ ہوتی ہے۔ کیا یہ جائز ہے؟ کیا مولوی صاحب کا کاروبار نہیں ہے؟ وضاحت فرمائیں؟

---

❶(٣٣٣) صحيح مسلم، كتاب الطب، باب تحريم الكهانة وإتيان الكهان (٥٨٢١)، المشكاة (٤٥٩٥)، أحمد (٦٨/٤).

❷(٣٣٤) صححه ابن كثير و احمد شاكر والألباني والحاكم والذهبي، صحيح الترمذي، كتاب الطهارة، باب ما جاء في كراهية إتيان الحائض (١٣٥) وابن ماجه (٦٣٩) و احمد(٤٢٩/٢، ٤٧٦)، التفسير (١٩٠/١، ١٩٢) لابن كثير، والحاكم (٨/١) (١٥) والارواء (٦٨ تا ٧٠).

جواب: خطیب جمعہ اہل مسجد سے جو کچھ وصول کرتا ہے۔ وہ صرف پابندی وقت کا حقیر سا معاوضہ ہوتا ہے۔ جمعہ کا بدلہ نہ کوئی دے سکتا ہے اور نہ مطالبہ کرنا چاہیے۔ اور وہ ہے تکفیر ذنوب (گناہوں کی معافی) اس کے باوجود اصحاب وسعت خطباء کو چاہیے کہ مفت اقامت جمعہ کا اہتمام کریں۔

سوال: یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ کا کیا حکم ہے؟ کیا اس کا گوشت کھانا جائز ہے؟

جواب: یہود و نصاریٰ کا ذبیحہ حلال ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ . ﴾ (المائدة:٥)

بہت سارے اہل علم نے لفظ ''طعام'' کو یہاں ذبائح کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَالطَّعَامُ اسْمٌ لِمَا يُؤْكَلُ وَالذَّبَائِحُ مِنْهُ وَهُوَهُنَا لَفْظٌ خَاصٌّ هُنَا بِالذَّبَائِحِ عِنْدَ كَثِيْرٍ مِّنْ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالتَّأْوِيْلِ." (الجامع لأحكام القرآن ٦/٧٦)

بخاری کے ترجمۃ الباب میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے: "طَعَامُهُمْ ذَبَائِحُهُمْ ."[1] اس سے پہلے امام زہری رحمہ اللہ کا قول منقول ہے: نصاریٰ عرب کے ذبیحہ کا کوئی حرج نہیں، اگر تو سنے کہ وہ غیر اللہ کا نام لے رہا ہے مت کھا، اور اگر تو اس سے یہ نہ سنے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے کفر کے علم کے باوجود اس کے ذبیحہ کو حلال کیا ہے۔ اس طرح کی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کی گئی ہے۔ جب ان لوگوں کا جانور ذبح کرنا جائز ہو گیا تو اس کے بالتبع گوشت کھانے کا جواز خود بخود ثابت ہو گیا۔

سوال: یہود و نصاریٰ کے برتنوں میں کھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب: یہود و نصاریٰ کے برتنوں کے علاوہ اگر دستیاب نہ ہو سکیں۔ تو ان ہی کو دھو کر استعمال میں لانا درست ہے صحیح مسلم میں ابوثعلبہ خشنی کی روایت ہے:

« فَإِنْ وَجَدْتُمْ غَيْرَآنِيَتِهِمْ فَلَا تَأْكُلُوْا فِيْهَا وَإِنْ لَمْ تَجِدُوْا فَاغْسِلُوْهَا ثُمَّ كُلُوْا فِيْهَا .»[2]

سوال: کیا مرد سونے کا دانت لگوا سکتا ہے؟ حالانکہ سونا مردوں کو حرام ہے؟

جواب: بوقت شدید ضرورت سونے کا دانت لگوایا جا سکتا ہے۔ حدیث میں ہے: ''یوم کلاب'' میں ایک شخص

---

[1] (٣٣٥) صحيح البخاری ، كتاب الذبائح و الصيد، باب ذبائح أهل الكتاب، فی ترجمة باب.

[2] (٣٣٦) صحيح البخاری، كتاب الذبائح و الصيد، باب آنية المجوس والميتة (٥٤٩٦).

کی ناک کٹ گئی تو اس نے چاندی کی لگوا لی۔ بعد میں اس میں بدبو پڑ گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''سونے کا لگوا لے۔'' (سنن أبو داؤد، بَابُ مَا جَآءَ فِي رَبْطِ الْأَسْنَانِ بِالذَّهَبِ) ❶

امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فِيهِ اسْتِبَاحَةُ اسْتِعْمَالِ الْيَسِيرِ مِنَ الذَّهَبِ لِلرِّجَالِ عِنْدَ الضُّرُورَةِ كَرَبْطِ الْأَسْنَانِ بِهِ وَ مَا جَرَى مَجْرَاهُ مِمَّا لَا يَجْرِىْ غَيْرُه فِيهِ مَجْرَاهُ اِنْتَهٰى" (عون المعبود ١٨٤/٤)

اس کے باوجود تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ حتی المقدور سونے کا دانت لگوانے سے احتراز کیا جائے کیوں کہ مرد کے لیے اصلاً سونا حرام ہے۔ منصوص کے سوا حرمت کا پہلو غالب ہونا چاہیے بالخصوص اس وقت جب کہ سونے کے دانت کا بدل بآسانی دستیاب ہو سکے۔

سوال: کیا چاندی کی انگوٹھی کے علاوہ لوہے یا پیتل وغیرہ کی انگوٹھی پہننے کا جواز مرد وزن کو ہے؟

جواب: لوہے یا پیتل وغیرہ کی انگوٹھی پہننا بعض روایات میں منع آیا ہے اگرچہ روایت میں کلام ہے: (بَابُ مَا جَاءَ فِيْ خَاتِمِ الْحَدِيْدِ سنن ابوداؤد.) ❷

صاحب عون المعبود فرماتے ہیں:

" وَالْحَدِيْثُ يَدُلُّ عَلٰى كَرَاهَةِ لُبْسِ خَاتَمِ الْحَدِيْد ." (١٤٤/٤)

انگوٹھی میں موتی یا ہیرا وغیرہ جڑوانا بظاہر جائز ہے۔ حدیث میں ہے:

«كَانَ خَاتَمُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ وَّرِقٍ فَصُّهٗ حَبَشِيٌّ .» ❸

(سنن أبی داود، بَابُ مَا جَاء فِيْ اتِّخَاذِ الْخَاتِمِ)

یعنی ''نبی ﷺ کی چاندی کی انگوٹھی میں نگینہ حبشی تھا۔''

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

" أَىْ كَانَ حَجَرًا مِّنْ بِلَادِ الْحَبْشَة أَوْ عَلٰى لَوْنِ الْحَبْشَةِ أَوْ كَانَ جَزْعًا أَوْ عَقِيْقًا لِأَنَّ

---

❶ (٣٣٧) حسنه الألبانی ،صحیح أبی داؤد ،کتاب الخاتم ،باب هذا (٤٢٣٢) ، والترمذی أبواب اللباس ،باب ما جاء فی شد الأسنان بالذهب (١٨٤٢) والمشکاة (٤٤٠٠) التحقیق الثانی.

❷ (٣٣٨) صححه الألبانی،صحیح أبی داؤد ،کتاب الخاتم ،باب ما جاء فی خاتم الحدید (٤٢٢٥) والنسائی (٥٢١٠،٥٢١٢).

❸ (٣٣٩) صحیح مسلم ،کتاب اللباس ،باب فی خاتم الورق فصه حبشی (٥٤٨٧) ،أبوداؤد (٤٢١٦) والمشکاة (٤٣٨٨).

ذٰلِكَ قَدْ يُؤْتٰى مِنْ بِلَادِ الْحَبْشَةَ ." (فتح الباری ۱۰/۳۲۲)

یعنی "نگینہ ملک حبشہ کے پتھر یا حبشی رنگ یا منکے یا عقیق پتھر کا تھا کیونکہ اسے ملک حبشہ سے برآمد کیا جاتا تھا۔"

سوال: چاندی کی انگوٹھی میں موتی یا ہیرا (لعل یاقوت) وغیرہ جڑوانا جائز ہے؟ نیز آیا ان ہیروں یا موتیوں میں تاثیر ماننا درست ہے؟

جواب: ہیروں یا موتیوں میں بذاتہ تاثیر ماننا ناجائز ہے۔ مؤثر صرف اللہ تعالیٰ ہے حتی کہ معجزات یا کرامات میں بھی تاثیر اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہی مختار کل اور مالک کل ہے قصہ موسیٰ علیہ السلام اس امر کی واضح دلیل ہے۔ لاٹھی کو سانپ بنانا اگر ان کا اپنا فعل ہوتا تو دوڑنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

سوال: کیا گورنمنٹ ملازم کی آمدنی حلال نہیں؟ اب گورنمنٹ ملازمین کو ادائیگی بنک کے ذریعے کرتی ہے، میں نے سنا ہے کہ یہ آمدنی صحیح نہیں کیونکہ بنک میں سودی کاروبار ہوتا ہے جب کہ میرا خیال ہے کہ جو انسان محنت سے کام کر کے تنخواہ وصول کرے اس کی آمدنی حلال ہو گی؟

جواب: گورنمنٹ ملازم حکومت سے اپنا استحقاق وصول کرے چاہے وہ بذریعہ بینک کیوں نہ ہو۔ جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مختار ثقفی جیسے حرام خور کے تحفے تحائف قبول کر لیتے تھے۔ اس بنا پر کہ مسلمانوں کے بیت المال میں ان کا بھی حق ہے۔ اسی طرح ایک ملازم بھی حکومت سے حق خدمت بطریق اولیٰ وصول کر سکتا ہے۔ مجرم وہ لوگ ہیں جو سودی معاملات میں ملوث ہیں اور اس کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ.

سوال: ایک آدمی ہے اس نے ۳۰ ہزار روپے بینک میں جمع کروائے ہیں اور اب ساٹھ ہزار ہو گئے ہیں یعنی تیس ہزار سود کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ اب اگر وہ آدمی صرف ۳۰ ہزار وصول کر کے کسی طہارت خانے یا کسی خراب رستے وغیرہ میں لگا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: ابتداءً سودی کھاتہ میں بذات خود رقم جمع کرانا ایک جرم ہے جس سے توبہ کرنا ضروری ہے موجودہ سود کا مصرف یہ ہے کہ اگر کسی نے سودی پیسہ دینا یا حرام چٹی کا تاوان اس کے ذمہ ہے تو بتا کر اس کو یہ رقم دے دی جائے تاکہ حرام پیسہ حرام رستہ میں صرف ہو۔ غرض یہ کہ کسی مباح کام میں اس کو قطعاً خرچ نہیں کرنا چاہیے۔ طہارت خانے میں ہی کیوں نہ ہو۔

سوال: تمام سرکاری یا غیر سرکاری اداروں یا کمپنیوں میں کام کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جن میں سودی کاروبار یا

لین دین ہوتا ہے جب کہ ہم صرف کام سے تعلق رکھتے ہیں۔

جواب: سرکاری یا غیر سرکاری وہ ادارے جن کی بنیاد سود پر ہو ان میں ملازمت اختیار کرنا ناجائز ہے، کیوں کہ اس جرم میں ملازم بھی شریک کار سمجھا جائے گا۔

سوال: ایک لڑکی کی شادی شدہ ہمشیرہ امریکہ میں مقیم ہے۔ ان کا اپنا سٹور ہے جہاں پر لاٹری نکالی جاتی ہے، جب اس کی ہمشیرہ آئی تو اس کے لیے اشیائے ضرورت اور نقدی لے کر آئی۔ یہ لڑکی دینی علوم سے بہرہ ور ہے۔ لہٰذا اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور چیزیں اور نقدی لینے سے انکار کیا لیکن اس کی ہمشیرہ زبردستی اسے یہ اشیاء دے گئی، اس کا دل یہ چیزیں اور نقدی وغیرہ استعمال کرنے کو نہیں مانتا۔ وہ ان اشیاء کا کیا کرے؟ کیا کسی مستحق کو دے دے؟

جواب: جوئے کا کاروبار کرنا چونکہ شرعًا حرام ہے۔ لہٰذا اس مال کے تحائف بھی قبول نہیں کرنے چاہئیں۔ صحیح حدیث میں ہے:

« إِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا .» [1]

یعنی ''اللہ پاک ہے پاک ہی کو قبول کرتا ہے۔''

دوسری روایت میں ہے:

« لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ إِلَّا الطَّيِّبَ .» [2]

یعنی ''اللہ پاک ہی قبول کرتا ہے۔''

جب یہ مال بامر مجبوری آپ کے ہاتھ لگ گیا ہے تو اسے اپنے استعمال میں مت لائیں اور نہ کسی مباح مصرف میں اس کو خرچ کریں۔ ہاں البتہ اگر کسی پر ظلم کی چٹی پڑ گئی ہو یا کوئی سودی رقم کا مقروض ہو تو یہ اشیاء اس کو دیں شاید کہ اس ذریعہ سے مظلوم کو ظالم کے ظلم سے نجات مل جائے۔

❀❀❀❀❀❀❀

[1] (٣٤٠) صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب قبول الصدقة من الکسب الطیب وتربیتها (٢٣٤٦) عن أبی هریرة رضی الله عنه ط/دار السلام، المشكاة (٢٧٦٠) فی البیوع، باب الکسب وطلب الحلال.

[2] (٣٤١) ایضاً.

﴿۲۰﴾ نذر و نیاز، صدقہ خیرات، ایصالِ ثواب اور حصولِ برکت کے اعمال

سوال: اگر گھر بیٹھ کر میت کے لیے قرآن خوانی کی جائے تو کیا میت کو اس کا ثواب ملے گا؟ (بعض لوگ گھروں میں سیپارے تقسیم کرتے ہیں کہ قرآن خوانی کی جائے میت کو ثواب پہنچانے کے لیے کیا یہ جائز ہے؟

جواب: میت کی طرف سے قرآن خوانی کرنے یا کرانے کا کوئی ثبوت نہیں بلکہ میت کے لیے دعائے خیر کرنی چاہیے۔ جس کی تعلیم قرآن میں بایں الفاظ دی گئی ہے:

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَآ إِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ . ﴾ (الحشر: ۱۰)

سوال: ایک آدمی نے ایک مرغی خدا کے نام پر پال رکھی ہے اور جب وہ بڑی ہوتی ہے تو وہ اس کو خود ذبح کر کے کھا جاتا ہے اور اس کی قیمت مسجد میں دے دیتا ہے۔ کیا درست ہے؟

جواب: بہ نیت نفلی صدقہ جانور بہتر ہے کہ اسے ذبح کر کے یا زندہ صدقہ کر دیا جائے۔ اگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکے تو قیمت دینے میں بھی بظاہر کوئی حرج نہیں۔

سوال: ایک مفتی صاحب کا ارشاد ہے کہ "یہ تو صحیح ہے نبی کریم ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کا موجود طریقہ نہیں اپنایا، لیکن وہ لوگ عامل قرآن تھے اور کثرت سے تلاوت کا اہتمام کرتے تھے اور یوں اپنے مرحومین کو ایصال ثواب کر دیا کرتے تھے۔ لیکن موجودہ دور کے مسلمان قرآن سے دور ہیں اور الا ما شاء اللہ تلاوت کا اہتمام کرتے ہیں لہٰذا اگر وہ [1]...... بلا معاوضہ [2]...... بغیر ریا کاری کے قرآن خوانی کا اہتمام کریں تو جائز ہے؟"

جواب: قرآن خوانی کی صورت میں ایصال ثواب کا موجودہ طریق کار بدعت ہے۔ کتاب وسنت اور سلف صالحین کے عمل سے قطعاً ثابت نہیں۔

«اَلْخَيْرُ فِي الْاِتِّبَاعِ وَالشَّرُّ كُلُّ الشَّرِّ فِي الْاِبْتِدَاعِ .»

''ساری بھلائی پیروی میں ہے اور ساری برائی بدعت کی ایجاد میں ہے۔''

دین اسلام ہماری فکر اور سوچ کا محتاج نہیں بلکہ ہمیں خود اپنے قلوب و اذہان کو اس کے تابع کرنا ہوگا۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو شے عہد رسالت میں دین تھی وہ آج بھی دین اور جو اس وقت دین نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں بن سکتی'' ❶ اور جو شخص بدعت کا موجب ہے وہ گویا یہ سمجھتا ہے کہ محمد ﷺ نے نعوذ باللہ پیغام رسانی میں خیانت کی ہے۔ جب کہ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ .... ﴾ (المائدہ:٣)

لہٰذا مولوی صاحب کا خیال محض توہم پرستہ ہے۔ اس سے اجتناب ضروری ہے۔

سوال: کیا ڈھول، آلات موسیقی بجانے والے کی مدد کی جائے۔ ان کو خیرات وغیرہ دینا جائز ہے؟

جواب: حتی المقدور صدقہ خیرات متشرع لوگوں کو دینا چاہیے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾ (المائدۃ:٢)

''(دیکھو) نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ لیا کرو۔''

اور حدیث میں ہے:

« لَا يَأْكُلْ طَعَامَكَ إِلَّا تَقِيٌّ .» ❷

''تیرا کھانا پرہیزگار ہی کھائے۔''

سوال: آپ ﷺ کے بیٹے ابراہیم جب فوت ہوئے تو آپ ﷺ نے تیسرے دن کھجوریں تقسیم کیں۔

(ا) ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا باپ فوت ہوا تو اس نے کھجوریں تقسیم کیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس صحابی رضی اللہ عنہ کے باپ کے ایصال ثواب کے لیے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے کھائیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں تقسیم

---

❶(٣٤٢) الاعتصام فی ذم البدع(٣٣/١) للشاطبی .

❷(٣٤٣) صححه الحاكم و وافقه الذهبي وحسنه الألباني صحيح ابي داؤد ، كتاب الأدب، باب من يؤمر ان يجالس(٤٨٣٢)، الترمذي(٢٥١٩)، الحاكم(١٢٨/٤)، المشكوة(٥٠١٨).

بھی کی تھیں۔

(ب) کیا یہ سب کچھ صحیح ہے یا غلط؟

جواب: مذکورہ دونوں واقعات من گھڑت ہیں۔ شریعت میں ان کا کوئی ثبوت نہیں۔

سوال: ایک شخص کی کچھ زمین ہے، اس نے نیت کی تھی کہ جب یہ زمین فروخت ہو گی تو حاصل شدہ رقم کا مسجد پر خرچ کروں گا۔ (خرچ کی صورت یہ ہے کہ دریاں اور پنکھے وغیرہ خرید کر مسجد میں رکھنے ہوں گے) اب اس شخص کو ایک دوسرے شخص نے کہا ہے کہ تمہارا حقیقی بھانجا مقروض ہے اور اس کا کوئی کاروبار نہیں۔ عیالدار بھی ہے جس کا تجھے بخوبی علم ہے تم یہ رقم مسجد پر خرچ کرنے کی بجائے اپنے بھانجے کو دے دو۔ تاکہ وہ اس سے اپنا کاروبار کر سکے۔ اب مسئلہ دریافت طلب یہ ہے کہ کیا وہ یہ رقم مسجد پر خرچ کر دے یا اپنے بھانجے کو دے دے؟ اور یہ بات ذہن میں رکھیں کہ مسجد کو رقم دینے کی اس نے زمین فروخت کرنے سے پہلے نیت کی تھی۔

جواب: چیزوں کی اہمیت کے پیش نظر نیت میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ایک شخص فتح مکہ کے دن کھڑا ہوا اور کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے شک میں نے اللہ عزوجل کے واسطے نذر مانی ہے کہ اگر تم پر اللہ فتح مکہ کر دے تو میں بیت المقدس میں دو رکعت نماز پڑھوں گا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس جگہ نماز پڑھ لے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس نے دوبارہ وہی بات پوچھی پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس جگہ نماز پڑھ لے، پھر سہ بارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہی بات پوچھی پس آپ نے فرمایا: تو اس وقت مختار ہے۔" [1] (رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَالدَّارِمِيُّ بحواله مشكوة بَابٌ فِي النُّذُوْرِ)

یہاں چونکہ دو چیزیں قرابت اور صدقہ جمع ہو گئی ہیں بخلاف پہلے مصرف کے کہ وہاں صرف صدقہ ہی ہے تو اس بنا پر طے شدہ نسبت مال مقروضہ بھانجے کو دے دینی چاہیے۔ واللہ أعلم بالصواب.

سوال: جب کوئی نئی دکان لیتا ہے یا نیا مکان تعمیر کرواتا ہے تو رہائش سے پہلے قرآن مجید پڑھواتا ہے اس مکان میں اعزہ واقارب اکٹھے ہو کر قرآن مجید پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح نئے مکان میں اللہ کا کلام

---

[1] (٣٤٤) صححه الألباني ،صحيح ابى داود ، كتاب الايمان ، باب من نذر ان يصلى فى بيت المقدس (٣٣٠٥)، السنن الكبرىٰ(٨٢/١٠)، للبيهقى۔ الإرواء رقم (٢٥٩٧) و قال رحمهُ الله الالبانى ۔صححه ابن دقيق العيد كما فى التخليص۔

پڑھنے سے برکت و رحمت نازل ہو گی۔ کیا یہ طریقہ بدعت ہے؟ نئے مکان میں حصول برکت کا درست طریقہ بتائیں؟

جواب: یہ طریقہ کار سلف سے ثابت نہیں، بدعت ہے، مومن کے نیک اعمال تو سدا ہی اس کے لیے باعث برکت و رحمت بنے رہتے ہیں۔ حدیث میں ہے: ''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔'' ❶

سوال: قرآن خوانی، ایصال ثواب کے لیے کروانا اس کی شریعت میں کیا حیثیت ہے۔ میت کے لیے قرآن پڑھ کر اسے بخشنا کیا یہ نبی ﷺ کا طریقہ ہے؟ اگر نہیں تو یہ کیا بدعت ہے؟

جواب: برائے ایصال ثواب قرآن خوانی کرانے کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں لہٰذا یہ بدعت ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ .» (بخاری و مسلم)

یعنی ''جس نے دین اسلام میں اضافہ کیا وہ مردود ہے۔''

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی ''زاد المعاد'' میں اس کو ناجائز کہا ہے۔

صاحب المرعاۃ فرماتے ہیں:

''میت کے لیے قران کا ایصال ثواب میرے نزدیک صراحتًا کسی مرفوع صحیح حدیث سے ثابت نہیں نیز صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ سے بھی ثابت نہیں اس لیے مجھے اس کی مشروعیت میں تامل ہے۔''

اور علامہ علی متقی رحمہ اللہ صاحب ''كَنْزُ الْعُمَّال'' فرماتے ہیں:

" اَلْأَوْلُ الِاجْتِمَاعُ لِقِرَاءَةِ بِالْقُرْآنِ عَلَى الْمَيِّتِ بِالتَّخْصِيصِ فِي الْمَقْبُرَةِ وَالْمَسْجِدِ أَوِ الْبَيْتِ بِدْعَةٌ مَذْمُوْمَةٌ ." (فتاویٰ علمائے حدیث ۵/۳۵۲)

یعنی ''میت کے لیے قرآن خوانی بالخصوص قبرستان، مسجد، گھر میں مذموم بدعت ہے۔''

بطور برکت گھر میں بچوں کو جمع کر کے قرآن پڑھانا بھی شریعت مطہرہ سے ثابت نہیں۔ لہٰذا فعل ھٰذا سے بھی احتراز ضروری ہے۔

سوال: گیارہویں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب: جو چیز ماسوا اللہ کے لیے نامزد کی جائے وہ حرام ہے۔

---

❶ (۳٤۵) انظر الرقم المسلسل (۲) .

قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ . ﴾ (البقرة:۱۷۲)

''اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے حرام کر دیا۔''

حاشیہ جالندھری ہے۔ یہ ترجمہ لغوی معنوں کی بنا پر کیا گیا ہے لغت میں ''اہلال'' کے معنی آواز بلند کرنے کے ہیں۔ مفسرین جو اس لفظ کے معنوں میں ذبح کا لفظ شامل کرتے ہیں۔ وہ شان نزول کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ کیوں کہ جاہلیت میں جو جانور غیر اللہ کے لیے مقرر کیا جاتا تھا۔ ذبح کرنے کے وقت بھی اس غیر کا نام لیا جاتا تھا، ورنہ حقیقت میں جو چیز غیر اللہ کے لیے مقرر کی جائے خواہ وہ جانور ہو یا اور کچھ حرام ہے۔ اس لیے کہ آیت میں حرف ''ما'' استعمال فرمایا گیا ہے۔ جس کے معنے ہیں جو چیز اور وہ عام ہے۔ ذبح حیوان اور دیگر چیزوں کو خواہ کھانے کی ہو یا پہننے کی یا اور طرح استعمال کرنے کی سب کو شامل ہے۔ حرمت و حلت میں نیت کو بڑا دخل ہے مثلاً جو جانور غیر اللہ کے لیے مقرر کیا گیا ہو۔ اس پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے یا غیر اللہ کا حرمت کے لحاظ سے برابر ہے۔ اللہ کا نام لینے سے وہ حلال نہ ہو گا۔ علمائے کرام نے لکھا ہے کہ اگر کسی مسلمان نے کوئی جانور غیر اللہ کے تقرب کے لیے ذبح کیا وہ اسلام سے خارج ہو گیا اور وہ جانور ایسا ہو گیا جیسے مرتد کا ذبح کیا ہوا۔ [1] بہر حال نذر کی نیت اللہ کے لیے ہی کرنی چاہیے۔ اور ذبح کرنے کے وقت اس پر اسی وحدہٗ لاشریک کا نام لینا چاہیے۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرانا چاہتا۔ گیارہویں بھی چونکہ

---

[1] (۳۴۶) نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «لا عقر في الإسلام». امام ابوداؤد نے اس مسئلہ پر ان الفاظ کے ساتھ باب قائم کیا ہے: " باب كراهية الذبح عند القبر "، پھر اوپر والی حدیث بیان کی ،وقال عبد الرزاق: كانوا يعقرون عند القبر بقرة ،أو شاة. صحيح أبي داؤد(۶۲۰/۲)(۳۲۲۲) للألباني. وہ (یعنی مشرک) قبر کے پاس گائے یا بکری کو ذبح کرتے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں: ''اور یہ لوگ بزرگوں کے لئے جو حیوانات (مرغوں، بکروں وغیرہ) کی نذر مانتے ہیں اور پھر ان کو قبروں پر لے جا کر ذبح کرتے ہیں تو فقہی روایات میں اس فعل کو بھی شرک میں داخل کیا گیا ہے''۔ (مکتوب امام ربانی، دفتر سوم، مکتوب: ۴۱) بحواله: تفسير أحسن البيان (صـ۸۴۸). فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''درمختار'' میں ہے: "واعلم أن النذر الذى يقع للأموات من أكثر العوام إلى ضريح الأولياء الكرام تقربا إليهم فهو بالإجماع باطل وحرام ".(آخر كتاب الصوم). اسی درمختار کی شرح فتاوی شامی (۱۳۹/۲ ـ مطلب في النذر) میں اس کے باطل اور حرام ہونے کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے کہ: " والنذر لمخلوق لا يجوز ؛ لأنه عبادة، والعبادة لاتكون لمخلوق ". اور یہی فتوی فتاوی عالمگیری میں دیکھیے (۲۱۶/۱)، باب الاعتكاف ،بحواله: تفسير أحسن البيان (صـ ۸۵۰). امام نووی شارح صحیح مسلم فرماتے ہیں: ''ایسے جانور سے جو غیر اللہ کی تعظیم کے لئے کاٹا گیا ہو مطلقا پرہیز کرے گو اس پر کاٹے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا جاوے۔ (شرح صحیح مسلم، کتاب الأضاحی، باب تحریم الذبح لغیر اللہ تعالیٰ) (حافظ ثناء اللہ مدنی)

جہلاء قوم باسم شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ دیتے ہیں لہٰذا وہ بھی حرام ہے۔ اس کا کھانا ناجائز ہے۔

سوال: مردہ کے لیے قرآن خوانی کی جاتی ہے قرآن خوانی کا ثواب مرجانے والے کے نام کر دیا جاتا ہے۔ یعنی قرآن پڑھ کر اسے بخش دیا جاتا ہے۔ ایصال ثواب کا یہ طریقہ صحیح ہے؟

جواب: میت کے لیے قرآن خوانی کرانا چونکہ کتاب و سنت اور سلف صالحین کے عمل سے ثابت نہیں اس لیے فعل ہذا سے اجتناب ضروری ہے۔ حدیث میں ہے:

« مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ .»[1] (بخاری و مسلم)

یعنی ''جس نے دین میں اضافہ کیا وہ مردود ہے۔''

سوال: بعض حضرات دعا میں یہ الفاظ کہتے ہیں: ''اے خدا! مجھے دیار حبیب ﷺ جانے کی توفیق عطا فرما۔''

① اس سلسلہ میں قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرما دیں کیا اس کا تعلق نیت سے ہے؟

② ایصال ثواب کی شریعت میں کیا حیثیت ہے؟ خصوصی طور پر کیا قرآن مجید پڑھ کر ثواب پہنچایا جا سکتا ہے؟

جواب: ١- ظاہر ہے کہ ایک مومن مسلمان کا اس دعا سے مقصود اور مطمح نظر حج، عمرہ، بیت اللہ اور مسجد نبوی ﷺ میں عبادت کی لذتوں سے محظوظ ہونا ہی ہوگا۔ مسجد نبوی ﷺ کے بالتبع اگر روضہ اطہر کی زیارت کی نیت بھی ہو تو کوئی حرج نہیں۔ البتہ مستقلاً بالارادۃ صرف اس کے لیے رخت سفر باندھنا غیر درست فعل ہے۔ حدیث میں ہے:

« لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلٰى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ .»[2] الحدیث (متفق علیه بحواله مشکوٰة مع المرعاة ٤٠٤/١)

٢- میت کو ثواب پہنچانے کا بہترین طریقہ مسنون ہے یہ دعائے مغفرت ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ.﴾ (الحشر:١٠)

یا پھر صدقہ خیرات اور قربانی وغیرہ کرنا یا اسکی طرف سے حج بدل ہے باختلاف المذاہب، اور جہاں تک تعلق ہے زیر نظر مسئلہ کا اس میں مروجہ طریق سے اجتماعی شکل میں قراءت قرآن ناجائز ہے کیونکہ کتاب و سنت

---

[1] (٣٤٧) انظر الرقم المسلسل (٢).

[2] (٣٤٨) انظر الرقم المسلسل (٥).

اور اقوال سلف میں اس کا ثبوت ناپید ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ.» ❶

یعنی ''جو دین میں نیا کام کرتا ہے وہ مردود ہے۔''

البتہ کوئی قریبی عزیز دوست یا اولاد وغیرہ پڑھے یا کوئی اور کار خیر کرے۔ اس میں مرحوم (ان شاء اللہ) حصہ دار ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى. ﴾ (النجم:٣٩)

آیت ہذا سے وجہ استدلال یہ ہے کہ مکسوب اس کی کاوش اور محنت کا ثمر ہے۔

سوال: آج کل بعض اہل حدیث بھی فوت ہونے کے بعد وارثان میت ایک دن مقرر کر کے عوام کو اطلاع دے کر بلا کر دیگیں وغیرہ کھانا پکا کر ایصال ثواب کر لیا کرتے ہیں کیا یہ وہی بدعتی ٹولہ کے عمل کے مطابق نہیں جو چالیسواں وغیرہ کہہ کر کرتے ہیں؟

جواب: میت کو ایصال ثواب کا یہ طریقہ درست نہیں۔ اس لیے کہ کتاب و سنت اور سلف صالحین کے عمل سے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ.» ❷

یعنی ''جو دین میں اضافہ کرے، وہ مردود ہے۔''

سوال: اگر کوئی آدمی اپنے گھر میں صدقہ کا جانور ذبح کرتا ہے اور یہ صدقہ مطلق ہے، نذر، کفارہ وغیرہ کا صدقہ نہیں یا بطور صدقہ کھانا تیار کرتا ہے۔ کیا وہ صدقہ کے اس گوشت یا کھانے کو اپنے استعمال میں لاسکتا ہے یا نہیں؟ یعنی اس گوشت یا کھانے میں سے اپنے اہل و عیال کو کھلا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: جو جانور بطور صدقہ متعین کر دیا جائے اس کا گوشت مُتَصَدِّق اپنے گھر استعمال میں نہ لائے وہ صرف فقراء و مساکین وغیرہ کا حق ہے اگرچہ عام صدقہ ہی کیوں نہ ہو اس لیے کہ صدقہ کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اللہ کی رضا کی خاطر اس کی قربت کے حصول اور نیکی کی بنا پر اپنا استحقاق ترک کر دے۔

---

❶ (٣٤٩) انظر الرقم المسلسل (٢).

❷ (٣٥٠) انظر الرقم المسلسل (٢).

سوال: زید نے اللہ کے لیے نذر مانی تھی کہ میرا یہ کام ہو گیا تو راہ للہ دو دیگ چاول زردہ پکوا کر اپنے گاؤں میں تقسیم کروں گا۔ اس کا کام ہو گیا اور وہ نذر پوری کرنا چاہتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ میرا علاقہ چولستانی ہے۔ سلفی یا اچھے عقیدے والے لوگ یہاں عنقا ہیں۔ بدعتیوں کو وہ کھانا نہیں کھلانا چاہتا۔ اس کے قریب کوئی مدرسہ بھی اہل توحید کا نہیں۔ اگر وہ یہ کھانا اپنے علاقہ کے علاوہ کسی اور جگہ خیرات کرے کسی مدرسہ میں، تو اس کی نذر صحیح ہو گی؟ زردہ کی جگہ پلاؤ پکا سکتا ہے؟ یا پھر ایک علاقہ جہاں پر صرف ۵ اہل حدیث ہیں۔ جماعت کے پاس وسائل بالکل نہیں۔ اس علاقہ میں درس کا کمرہ ہے جس کی وائرنگ ہونی باقی ہے۔ اگر شخص مذکور نذر کی رقم سے درس کے کمرہ کی وائرنگ کرا دے تو اس کی نذر ادا ہو جائے گی؟ یا نہیں؟

جواب: صورت مسئولہ میں مال منذور مدرسہ کے کمرہ کی وائرنگ وغیرہ پر صرف کر دینا چاہیے۔ بجائے اس کے کہ اہل بدعت اور بدعقیدہ لوگوں کے پیٹ بھر کر اپنے لیے دوزخ کا گھر بنایا جائے۔ نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«لَا تُصَاحِبْ إِلَّا مُؤْمِنًا وَ لَا يَأْكُلْ طَعَامَكَ إِلَّا تَقِيٌّ .» [1]

یعنی ''رفاقت صرف مومن کی اختیار کر اور تیرا کھانا صرف متقی پرہیز گار کھائے۔''

نذر پوری کرنے کے لیے بہتر مصرف کی تلاش اور اختیار ایک مستحسن اور قابل تعریف فعل ہے چنانچہ ایک روایت میں ہے:

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا جَاءَ يَوْمَ الْفَتْحِ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! إِنِّي نَذَرْتُ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ إِنْ فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكَ مَكَّةَ أَنْ أُصَلِّيَ فِي بَيْتِ الْمَقْدِسِ رَكْعَتَيْنِ، قَالَ:« صَلِّ هٰهُنَا .» ثُمَّ أَعَادَ عَلَيْهِ ،فَقَالَ:« صَلِّ هٰهُنَا .» ثُمَّ أَعَادَ عَلَيْهِ، فَقَالَ: « شَأْنُكَ إِذًا .» [2] (رواه أبوداود،بَابُ مَنْ نَذَرَ أَنْ يُصَلِّيَ فِي بَيْتِ الْمُقَدَّسِ وَالدَّارِمِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ وَالْحَاكِمُ وَ صَحَّحَهُ أَيْضًا الْحَافِظُ ابْنُ دَقِيْقِ الْعِيْدِ، اور منذری نے اس پر سکوت اختیار فرمایا ہے۔)

یعنی ''حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے، فتح مکہ کے دن ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں

---

[1] (۳۵۱) صححه الحاكم ووافقه الذهبي وحسنه الألباني . صحيح أبي داؤد، كتاب الأدب، باب من يؤ مر أن يجالس (۴۸۳۲) ،الترمذي (۲۵۱۹)،الحاكم (۴/ ۱۲۸)، المشكوٰة(۵۰۱۸).

[2] (۳۵۲) صححه الألباني.صحيح أبي داؤد،كتاب الإيمان،باب من نذر أن يصلي في بيت المقدس (۳۳۰۵). السنن الكبرى (۸۲/۱۰) للبيهقي- الإرواء (۲۵۹۷)، وقال:صححه ابن دقيق العيد كما في التلخيص.

حاضر ہوا کہ میں نے راہ اللہ نذر مانی تھی اگر اللہ نے آپ کے ہاتھ پر مکہ فتح کر دیا تو میں بیت المقدس میں دو رکعتیں پڑھوں گا، آپ ﷺ نے فرمایا: یہیں یعنی بیت اللہ میں پڑھ لو۔ اس نے پھر بات کو دہرایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہاں پڑھ لو۔ اس نے پھر اسی بات کا اعادہ کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اب تیری مرضی۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو نذر شرعاً قابل اعتبار اور صحیح ہو اس کو بھی اولیٰ صورت میں تبدیل کرنا مستحسن اقدام ہے۔

بنابریں مسئولہ صورت میں جس نذر کا بیان ہے، اس کا تبدیل کرنا ایک حتمی اور یقینی امر ہے۔

مزید صاحب العون فرماتے ہیں:

" وَفِيْهِ دِلِيْلٌ عَلٰى أَنَّ مَنْ نَذَرَ بِصَلٰوةٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نَحْوِهِمَا فِيْ مَكَانٍ لَيْسَ بِأَفْضَلَ مِنْ مَكَانِ النَّاذِرِ فَإِنَّهٗ لَا يَجِبُ عَلَيْهِ الْوَفَاءُ بِإِيْقَاعِ الْمَنْذُوْرِ بِهٖ فِيْ ذٰلِكَ الْمَكَانِ بَلْ يَكُوْنُ الْوَفَاءُ بِالْفِعْلِ فِيْ مَكَانِ النَّاذِرِ. "(۲۳۳/۳)

اس طرح حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک عورت بیمار پڑ گئی اس نے نذر مانی اگر اللہ نے شفا دی تو بیت المقدس میں جا کر نماز پڑھے گی۔ جب اسے صحت یابی ہوئی تو بالفعل اس نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا مسجد الرسول ﷺ میں ہی نماز پڑھ لے کیوں کہ یہاں ایک نماز ہزار کا درجہ رکھتی ہے۔[1] (رواہ أحمد و مسلم)

صاحب العون فرماتے ہیں:

" فَفِيْ حَدِيْثِ مَيْمُوْنَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا مِنْ تَعْلِيْلِ مَا أَفْتَتْ بِهٖ بِبَيَانِ أَفْضَلِيَّةِ الْمَكَانِ الَّذِيْ فِيْهِ النَّاذِرُ فِي الشَّيْئِ الْمَنْذُوْرِ بِهٖ وَ هُوَ الصَّلٰوةُ. " (۲۳٤/۳)

رقم مدرسہ پر لگانے سے ناذر (نذر ماننے والا) اس سے محفوظ و مصئون ہو جاتا ہے۔ (وَاللّٰهُ أَعْلَمُ)

سوال: اہل میت کے گھر مروجہ فاتحہ خوانی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ بدلائل تحریر کریں۔ نیز مسلم شریف جلد:۲ کتاب الجنائز میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ آپ ﷺ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے تو آپ ﷺ نے مردے کی آنکھیں بند کیں تو فرمایا: جب روح نکلتی ہے تو آنکھیں پیچھا کرتی ہیں۔ گھر

[1] (۳۵۳) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل الصلاۃ بمسجدی مکة و المدینة(۳۳۸۳).

والوں نے رونا شروع کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: دعا کرو فرشتے آمین کہتے ہیں، پھر آپ ﷺ نے دعا کی۔
دوسری روایت مسلم شریف :۲/۳۰۳ پر ہے کہ نبی ﷺ نے پانی منگوا کر وضو کیا پھر ہاتھ اٹھا کر دعا کی:

« اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِعُبَيْدٍ أَبِيْ عَامِرٍ .» حَتّٰى رَأَيْتُ بَيَاضَ إِبِطَيْهِ ثُمَّ قَالَ:« اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَوْقَ كَثِيْرٍ مِّنْ خَلْقِكَ .» ❶

کیا ان دونوں روایتوں سے فاتحہ خوانی کا ثبوت ملتا ہے یا نہیں؟

جواب: سوال میں ذکر کردہ احادیث میں مروجہ فاتحہ خوانی کا نام و نشان تک موجود نہیں۔ حُقہ کی مجلس سجی ہو لوگ ادھر ادھر کی باتیں ہانک رہے ہوں۔ ہر آنے والا التماس کرتا ہے پڑھو فاتحہ۔ منٹوں سیکنڈوں میں سب کو فارغ کر کے بلا انقطاع حقے کا دور جاری رکھا جاتا ہے۔ احادیث سے تو معلوم ہوتا ہے جس منہ سے پیاز وغیرہ کی بد بو آ رہی ہو، فرشتے قریب نہیں پھٹکتے پھر کیا خیال ہے ایسی بدبودار مجلس میں رحمت کے فرشتوں کی آمد ممکن ہے؟ جواب یقیناً نفی میں ہے۔ پھر اصل اختلاف موجود مجلس کی ہیئت ترکیبی پر ہے۔ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے کسی عزیز کی وفات پر تین دن کا جلسہ دعائیہ جما کر بیٹھا کرتے تھے۔ جب کہ بعض روایات میں اس کو نوحہ قرار دیا گیا ہے جہاں تک میت کے لیے دعائے مغفرت کا تعلق ہے۔ سو یہ غیر متنازع امر ہے۔ سبھی اس بات کے قائل ہیں کہ دعا ہونی چاہیے۔ جس طرح کہ کئی ایک احادیث اور قرآنی آیت: ﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ .﴾ (الحشر:۱۰) میں مصرح ہے۔ اور تعزیت بھی مسنون ہے جس کے لیے جگہ اور وقت کی کوئی حد بندی نہیں۔ لیکن محل نظر صرف مروجہ طریقہ ہے جو درست نہیں۔

سوال: کیا جو لوگ قرآن مجید کے پارے گھروں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور پڑھنے کے بدلے میں پڑھنے والوں کو چاول کی ایک پلیٹ یا چنے وغیرہ تقسیم کر دیتے ہیں۔ یہ پڑھنا اور ثواب ان کے نام کرنا جائز ہے؟

جواب: قرآن مجید کو پڑھوا کر ایصال ثواب کا طریقہ کار کتاب و سنت اور سلف صالحین کے عمل سے ثابت نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

« مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ .» ❶

یعنی ”جس کسی نے دین اسلام میں اضافہ کیا وہ مردود ہے۔“

---

❶ (٣٥٤) صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب في إغماض الميت والدعاء له(٢١٣٠)، المشكاة(١٦١٩).

❶ (٣٥٥) انظر الرقم المسلسل (٢) .

فقہاء شافعیہ اور حنفیہ نے بھی عمل ہذا کو مکروہ بدعت لکھا ہے۔ مولانا عبدالحق حنفی دہلوی فرماتے ہیں: وَ عادت بنود کہ برائے میت شوند قرآن خوانند و ختمات خوانند نہ بر سوگور نہ غیر آں ایں مجموعہ بدعت است۔

''(سلف کی) یہ عادت نہ تھی کہ وہ میت کے لیے قرآنی اور دیگر ختموں کا اہتمام کریں، نہ قبر پر نہ کسی اور جگہ۔ یہ تمام چیزیں بدعت ہیں۔''

اور الشیخ علی المتقی حنفی صاحب ''کنز العمال'' نے کہا ہے:

" اَلِاجْتِمَاعُ لِلْقِرَاءَةِ بِالْقُرْآنِ عَلَى الْمَيِّتِ بِالتَّخْصِيصِ فِي الْمَقْبَرَةِ أَوِالْمَسْجِدِ أَوِ الْبَيْتِ بِدْعَةٌ مَذْمُومَةٌ."

یعنی ''میت پر قرآن خوانی کے لیے بالخصوص قبرستان یا مسجد یا گھر میں اجتماع قابل مذمت بدعت ہے۔''

المجد د نے ''سفر السعادۃ'' میں کہا ہے:

" وَلَمْ تَكُنِ الْعَادَةُ أَنْ يَجْتَمِعُوا لِلْمَيِّتِ وَ يُقْرَأُ لَهُ الْقُرْآنُ وَ يَخْتِمُوْهُ عِنْدَ قَبْرِهِ وَلَا فِي مَكَانٍ اٰخَرَ وَ هٰذَا الْمَجْمُوْعُ بِدْعَةٌ مَكْرُوْهَةٌ ."

یعنی ''سلف کی عادت نہیں تھی کہ جمع ہو کر میت کے لیے قرآن خوانی کر کے قرآن ختم کرتے ہوں۔ نہ قبر کے پاس اور نہ کسی دوسری جگہ۔ یہ اجتماع مکروہ بدعت ہے۔''

سوال: کیا مردوں کو قرآن پاک کا ثواب پہنچتا ہے یا نہیں، اگر میں اپنے دادا، چچا، تایا یا کسی رشتہ دار کے لیے ماں باپ کے علاوہ قرآن پڑھوں تو کیا ان کو ثواب پہنچے گا یا نہیں؟

جواب : اس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔ شیخ علی متقی حنفی صاحب ''کنز العمال'' فرماتے ہیں:

" اَلْاَوَّلُ الْاِجْتِمَاعُ لِلْقِرَاءَةِ بِالْقُرْآنِ عَلَى الْمَيِّتِ بِالتَّخْصِيصِ فِي الْمَقْبُرَةِ اَوِ الْمَسْجِدِ اَوِالْبَيْتِ بِدْعَةٌ مَذْمُومَةٌ ."

''یعنی میت پر قرآن خوانی کے لیے جمع ہونا بالخصوص قبرستان یا مسجد یا گھر میں مذموم بدعت ہے۔''

اور صاحب ''سفر السعادۃ'' کا کہنا ہے:

" وَلَمْ تَكُنِ الْعَادَةُ أَنْ يَجْتَمِعُوا لِلْمَيِّتِ وَ يَقْرأُوا لَهُ الْقُرْآنَ ."

یعنی ''سلف کی عادت نہیں تھی کہ جمع ہو کر میت کے لیے قرآن خوانی کرتے ہوں۔''

سوال: اگر مروجہ طریقے سے قرآن خوانی نہ کی جائے بلکہ کوئی شخص اپنے گھر میں اکیلا ہی قرآن کا کچھ حصہ پڑھ کر ایصال ثواب کرنا چاہے یا روزانہ چند سورتیں پڑھ کر ایصال ثواب کا معمول بنا لے تو اس کا یہ عمل شرعی اعتبار سے کیسا ہے؟

جواب: قرآن خوانی کی صورت میں ایصال ثواب کا طریقہ کتاب و سنت سے ثابت نہیں بلکہ میت کے لیے دعا کرنی چاہیے جس کی تاکید قرآن میں بایں الفاظ ہے:

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَؤُوْفٌ رَّحِيْمٌ . ﴾ (الحشر: ۱۰)

سوال: گھر والوں نے صدقہ کا جانور ذبح کیا۔ کیا اس میں سے لے کر اپنے لیے پکایا اور کھایا جا سکتا ہے؟

جواب: عام صدقہ سے مقصود چونکہ اللہ کا قرب ہوتا ہے اس لیے اصل یہ ہے کہ صاحب بیت خود کچھ نہ کھائے ورنہ صدقہ وہی حصہ ہو گا جو عملاً صدقہ کر دیا ہے۔

❀❀❀❀❀❀❀

﴿۲۱﴾ دم، جادو، تعویذات اور توہمات وخیالات

سوال: ہمارے بوڑھے آنکھوں کی پلکوں کے پٹھوں کے پھڑکنے کے متعلق عجیب باتیں بتاتے ہیں جب ڈاکٹر اسے آنکھ کی کمزوری لا علاج اور مولوی دم درود والے اس کا دم بھی نہیں بتاتے کیا اس میں کوئی عمیق اشارہ حالات آدم کے متعلق بھی ہے؟

جواب: آنکھوں کی پلکوں کے پٹھوں کے پھڑکنے کا سب سے بہتر دم ''سورہ فاتحہ'' پڑھ کر دم کر دیا جائے۔ باذن اللہ درست ہو جائے گا۔ دراصل یہ کمزوری جسمانی تغیرات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا سب سے بہتر علاج خلوص نیت سے اللہ کی طرف رجوع ہے۔ اور ''سورہ فاتحہ'' قرآن کے جملہ مضامین کا خلاصہ ہے جو اللہ سے لگاؤ کا بہترین ذریعہ ہے۔

سوال: اگر مردہ خواب میں کوئی چیز مانگے تو لوگ اس چیز کو استعمال کرنا اچھا نہیں سمجھتے کسی اور کو دے دیتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا محض وہم ہے یا وہ چیز خیرات کر دینی چاہیے؟

جواب: یہ محض توہم پرستی ہے میت کی طرف سے صدقہ کرنا ہر حالت میں مسنون ہے چاہے اس شے کا صدقہ کیا جائے یا کسی اور کا۔

امام المعبرین ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بحالت خواب مردوں سے کوئی شے لینی محبوب ہے لیکن دینی غیر محبوب۔ ''صاحب الاشارات'' فرماتے ہیں: بشرطیکہ اَخذ کی صورت میں زہریلی شے نہ ہو اور اِعطاء کی جملہ وجوہات غیر محمود ہیں۔ اِلا یہ کہ مکروہ گزشتہ جنس سے ہو۔ اس سے مقصود زوال ہم وغم ہے۔''

(بر ھَوَامِش تَعطِیرُ الأَنَام صـ: ۲۷۸)

سوال: کیا خاص مصیبت میں انسان تعویذ لے سکتا ہے؟ اور شرکیہ دم جھاڑا کر سکتا ہے یا کروا سکتا ہے؟ بعض علماء کا بھی فتویٰ ہے کہ اگر جان کا خطرہ ہو اور جان بچانا مقصود ہو تو انسان شرکیہ دم جھاڑا کروا سکتا ہے۔ حالانکہ

اللہ نے فرمایا کہ میں چاہوں تو ہر گناہ کو معاف کر دوں گا لیکن شرک کو معاف نہیں کروں گا۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا انسان تو قتل ہو جائے، زندہ جل جائے لیکن ﴿ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ﴾ "اللہ کے ساتھ شرک نہیں کرنا۔"❶

جواب: مسنون دم کے لئے اہل علم نے بعض شرطیں بیان کی ہیں۔ یعنی دم اللہ کے کلام یا اس کے اسماء و صفات اور عربی زبان میں ہو۔ دم معروف المعنی ہو اور یہ اعتقاد رکھا جائے کہ دم جھاڑا بذاتہ مؤثر نہیں بلکہ اس کی تاثیر اللہ عزوجل کی قضاء وقدر سے ہے۔(عون المعبود ٤/ ٢١)

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ پریشانی کے موقعہ پر شرکیہ دم جھاڑا کرنا ناجائز ہے۔ پھر بعض روایات میں تصریح موجود ہے:

((لَابَأْسَ بِالرُّقٰى مَا لَمْ تَكُنْ شِرْكًا .)) ❷

یعنی "دم کا کوئی حرج نہیں جب تک وہ شرکیات پر مشتمل نہ ہو" (سنن أبي داؤد ، باب في الرقى)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شرکیہ دم جھاڑا بالکل ناجائز ہے۔ اس طرح تعویذات سے بھی احتراز کرنا چاہیے۔ صرف ثابت شدہ دم پر اکتفا کیا جائے اسی میں خیر و برکت ہے۔

سوال: کیا تمام اقسام کے تعویذات ناجائز ہیں؟

جواب: احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ تعویذات کی جملہ اقسام سے احتراز کیا جائے۔

سوال: ہمارے گاؤں کا ایک آدمی جو بے اولاد ہے اس کی ماں نے اس کو شک میں ڈال دیا ہے کہ تجھ پر کسی نے جادو کیا ہے۔ میں نے اس کو بتایا ہے کہ جادو برحق ہے یعنی نبی علیہ السلام پر بھی کسی نے جادو کر دیا تھا تو نبی علیہ السلام کو بذریعہ وحی مطلع کر دیا گیا تھا تو وہ کہنے لگا کہ نبی علیہ السلام کو تو بذریعہ وحی مطلع کر دیا گیا تھا تو کیا آج کل کے بزرگوں کو یا ولیوں کو بھی جادو کا پتہ چل جاتا ہے۔ یا نہیں؟ کیا صحابہ کرام کے واقعات میں سے بھی کوئی واقعہ ایسا ملتا ہے یا نہیں جس میں ان کو جادو کا پتہ چل گیا ہو؟ اس کے پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ کیا کسی صحیح العقیدہ بزرگ وغیرہ کے پاس مذکورہ معاملہ کے بارے میں جانا چاہیے یا نہیں؟

جواب: جادو کا اثر برحق ہے اس سلسلہ میں ماہر عملیات پابند شریعت کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ تاکہ روحانی

---

❶(٣٥٦) ابن ماجه، كتاب الفتن، باب الصبر على البلاء (٤٠٣٤)، المشكوة(٥٨٠)، حسنه الألباني وقال في الارواء برقم (٢٠٢٦) و بالجملة. حديث صحيح بشواهده و بطرقه ، صحيح الجامع(٧٣٣٩) و الترغيب (٥٦٦) والادب المفرد(١٨) بتحقيق الألباني رحمه الله تعالىٰ رحمة واسعة.

❷(٣٥٧) صحيح مسلم، كتاب السلام، باب لابأس بالرقى ما لم يكن فيه شرك (٥٧٣٢).

عمل سے اس کا اثر زائل ہو سکے اثر زدہ کو خود بھی چاہیے کہ معوذ تین پڑھ کر اپنے کو دم کیا کرے۔ آثار سے بعض دفعہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ مسحور ہے جس طرح کہ ماہر طبیب بیماری کا کھوج لگا لیتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے سلف سے بعض آثار ایسے نقل کئے ہیں ملاحظہ ہو :(فتح الباری: ۱۰/ ۲۳٤، بابٌ هل يُسْتَخْرَجُ السِّحْرُ؟) ❶

سوال: قرآنی آیات پڑھ کر پانی پر دم کرنا یا قرآنی آیات پلیٹ پر لکھ کر پینا یا قرآنی آیات لکھ کر تعویذ گلے میں ڈالنا مسنون ہے یا بدعت؟

جواب: دم میں پھونک مارنی جائز ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

((أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَنْفُثُ فِي الرُّقْيَةِ .)) ❷

(مصنف ابن أبی شيبة: ٨/ ٤٤)

’’نبی ﷺ دم میں پھونک مارا کرتے تھے۔‘‘

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’دم میں پھونکنے سے مقصود اس رطوبت اور ہوا سے برکت کا حصول ہے جو ذکر کی معیت میں نکلتی ہے جس طرح لکھے ہوئے ذکر کے دھوون سے تبرک کیا جاتا ہے۔‘‘

نیز اس کا مقصد نیک شگون لینا بھی ہوسکتا ہے جس طرح کہ دم کرنے والے سے سانس الگ ہو رہی ہے اسی طرح مریض سے تکلیف اور مرض دور ہو جائے۔(فتح الباری: ١٠/ ١٦٨)

اور صاحب ’’تَيسِيرُ الْعَزِيزِ الْحَمِيد‘‘ (ص:١٦٦) میں فرماتے ہیں:

’’دم طب ربانی ہے۔پس جب مخلوق میں سے نیک لوگوں کی زبان سے دم کیا جائے تو اللہ کے حکم سے شفاء ہو جاتی ہے۔‘‘

اور علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’دم کرتے وقت پھونک مارنے سے منہ کی رطوبت، ہوا اور سانس سے مدد لی جاتی ہے جو ذکر، دعاء اور مسنون دم کے ساتھ نکلتی ہے اس لئے کہ دم پڑھنے والے کے دل اور منہ سے نکلتا ہے پس جب یہ دم باطنی اجزاء میں سے رطوبت، ہوا اور سانس کے ساتھ مل جائے تو تاثیر کے لحاظ سے

---

❶(٣٥٨) صحيح البخاری، كتاب الطب، باب هل يستخرج السحر(٥٧٦٥).

❷(٣٥٩) إسناده صحيح، ابن أبی شيبه (٥/ ٤٤١) وكيع عن مالك عن الزهری عن عروة عن عائشة رضی الله عنها...... الخ ومعناه فی البخاری، كتاب الطب، باب النفث فی الرقية(٥١٤٧).

مکمل اور عمل کے لحاظ سے قوی ہو جاتا ہے اور ان کے مجموعے سے ایسی مجموعی کیفیت پیدا ہوتی ہے جیسا کہ مختلف دوائیوں کے باہم ملانے سے ہوتی ہے۔" (الطب النبوی: ص۔۱٤٠)

امام احمد رحمہ اللہ کے بیٹے کا کہنا ہے کہ میں نے اپنے والد کو مریضوں کے لئے تعویذ لکھتے دیکھا۔ اپنے اہل خانہ اور اہل قرابت کو تعویذ لکھ دیتے۔ اور عسر ولادت کی بناء پر عورت کو چاندی کے برتن یا لطیف چیز پر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی تعویذ لکھ دیتے۔ (مسائل إمام أحمد بن حنبل:۳/۱۳٤٥)

ابن عباس رضی اللہ عنہما کے تعویذ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (مصنف ابن أبی شیبه:۸/۲۷)

قرآنی آیات اور ثابت شدہ دعاؤں پر مشتمل تعویذ لکھنا اگر چہ جائز ہے لیکن میرے نزدیک راجح اور محقق بات یہ ہے کہ تعویذوں سے مطلقاً پرہیز کیا جائے۔ صرف ثابت شدہ دم پر اکتفاء کی جائے۔ اس بارے میں میرے قلم سے تفصیل "الاعتصام" میں چند ماہ قبل ہو چکی ہے۔

سوال: جنگ خیبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آنکھوں پر دم کیا تھا یا لعاب دہن لگایا تھا اور کیا پڑھا تھا اور کتنی بار پڑھا تھا؟

جواب: خیبر کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آنکھوں پر دم کیا اور لعاب بھی لگایا تھا اور دم میں یہ دعا پڑھی تھی:

((اَللّٰهُمَّ أَذْهِبْ عَنْهُ الحَرَّ وَالْقَرَّ .)) [1] (فتح الباری:۷/٤۷۷)

یعنی "اے اللہ علی رضی اللہ عنہ سے گرمی اور سردی دور کر دے۔"

بظاہر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ دعا ایک ہی دفعہ پڑھی تھی۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰی أَعْلَمُ.

سوال: میں عرصہ ۲۵ سال سے وہم کی مریض ہوں۔ وہم صرف وضو، تیمم اور نماز کا ہے اور کسی بات کا نہیں۔ بار بار تیمم کرتی ہوں۔ ۴ کی بجائے ۵ رکعت پڑھتی ہوں۔ دو سجدوں کی جگہ ۳ سجدے ایک رکعت میں کرتی ہوں۔ دل مطمئن نہیں ہوتا۔ حافظ ثناء اللہ صاحب نے جمعہ کے خطبہ میں کہا ہے کہ اگر دو کی جگہ تین سجدے کریں تو ایک سجدہ شیطان کو ہوگا۔ میں سن کر پریشان ہوگئی کہ میں تو ہر نماز میں کئی سجدے اور ایک رکعت شیطان کو کرتی ہوں۔ خدا را مجھے مطمئن کریں؟

---

[1] (۳٦٠) حسنه الهیثمی وأحمد شاكر والألبانی.ابن ماجه، كتاب السنة ، فضائل علی بن أبی طالب (۱۱۷)،أحمد (۱/۹۹) [۷۷۸۔شاكر]ومجمع الزوائد (۹/ ۱۲۲).

جواب: حتی المقدور جدوجہد کریں کہ توہمات کی پیروی کے بجائے صرف یقین یا ظن غالب پر بنیاد رکھیں۔ ساتھ "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" کا ورد معمول بنالیں اور اگر بحالت نماز ایسی کیفیت پیدا ہو جائے تو: ((أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ خِنْزَب .)) ❶......❷ پڑھ کر تین دفعہ پھونک مار دیا کریں۔ اس سے ذہنی کیفیت بدل کر وسوسوں میں کمی آ جائے گی۔ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ.

سوال: کچھ لوگوں نے سورج اور چاند گرہن کے ساتھ کچھ واقعات منسوب کر رکھے ہیں۔ کیا شرعاً یہ ٹھیک ہے؟

جواب: شرعاً کوئی واقعہ گہن میں موثر نہیں۔ متعدد احادیث میں ہے:

((إِنَّهُمَا آيَتَانِ مِنْ ايَاتِ اللّٰهِ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهِمَا عِبَادَهٗ .)) ❸

یعنی "سورج چاند اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ ان کے ذریعے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔"

سوال: بعض علماء کے نزدیک قرآنی تعویذ بھی جائز نہیں۔ کیا ان کے نزدیک:

۱۔ تعویذ گھول کر پینا

۲۔ پیالے پر لکھ کر اس میں پانی پینا

۳۔ پانی پر دم کر کے یا کھانے پینے کی کسی اور چیز پر دم کر کے پھونکنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ہر شکل میں تعویذات کے کاروبار سے احتراز کرنا چاہیے۔ کسی شی پر دم کا کوئی حرج نہیں، جائز ہے، پھونک مارنا بھی جائز ہے۔

سوال: اگر کسی شخص پر جادو کے زور سے کوئی ایسا عمل کروایا جائے جو شریعت میں ناقابل معافی ہو۔ کیا ایسے کام کا گناہ جادوگر پر ہو گا یا جادو کروانے والے پر؟

جواب: باطل عمل کی معاونت میں جتنے لوگ شریک ہیں۔ سب گنہگار ہیں۔

سوال: کیا کالے علم، جادو کا علاج قرآن و حدیث کی بجائے کالے علم، جادو، ٹونے اور تعویذات وغیرہ سے کروانا جائز ہے؟

---

❶ (۳۶۱) صحیح مسلم، کتاب السلام، باب التعوذ من شیطان الوسوسة فی الصلاة (۵۷۳۸)

❷ (۳۶۲) بعض احادیث میں ہے کہ جو شیطان نمازیوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے اس کا نام خنزب ہے۔ (نعیم الحق نعیم)

❸ (۳۶۳) صحیح البخاری، کتاب الکسوف، باب قول النبی ﷺ ((یخوف الله عباده بالکسوف))(۱۰۴۷) و(۱۰۴۸)، صحیح مسلم، کتاب الکسوف، باب صلاة الکسوف (۲۰۸۹ إلی ۲۰۹۶).

جواب: جادو کا علاج ہر اس عمل سے جائز ہے جس میں شرک نہ پایا جائے۔

سوال: ایک خاتون جب حاملہ ہوئی تو اس کی ساس نندوں کا اصرار تھا کہ وہ تیسرے مہینے میں تعویذ پہن لے تا کہ کسی بھی قسم کے وار سے بچاؤ ہو جائے۔ نیز ان سب کے ہاں ہی تقریباً بچے فوت ہوئے۔ تعویذ پہننے پر ہی زندہ بچے۔

خاتون نے تعویذ پہننے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ اپنے رب پر متوکل تھی ویسے وہ نظر بد کی دعائیں آیۃ الکرسی، چاروں قل وغیرہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیتی۔ اب اس کے ہاں بیٹا ہوا لیکن اللہ کی قدرت کہ وہ پیدائش سے دو دن قبل وفات پا چکا تھا۔

اب ساس اور نندوں کو موقع ہاتھ آ گیا کہ ہم کہتی رہیں لیکن تم نے تعویذ نہیں پہنا۔ اب نتیجہ دیکھ لیا۔ اب بھی وقتاً فوقتاً اسے آمادہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اب وہ خاتون متذبذب ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ پہلے بھی اسے اپنے رب پر بھروسہ تھا وہ بیٹے کی وفات کو رب کی طرف سے آزمائش سمجھ کر اس پر صابر ہے۔ اب بھی اسے رب پر بھروسہ ہے لیکن ذہن کسی وقت شدید پریشان ہو جاتا ہے اور دل میں وسوسے آنے لگتے ہیں، اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیا رب سے استقامت کی دعا مانگنا چاہیے؟

جواب: ایمانیات کے اجزاء میں سے اہم ترین چیز یہ ہے کہ آدمی کا یہ عقیدہ ہو:

((مَا شَآءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ .))

یعنی '' کائنات میں وہی کچھ ہوتا ہے جو اللہ کی مشیت ہو اور جو وہ نہ چاہے اس کا وجود ناممکن اور محال ہے۔'' بنیادی طور پر ایک مومن کا ایمان ہونا چاہیے کہ دم جھاڑ وغیرہ میں مؤثر صرف خالق حقیقی ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔ یہاں تک کہ انبیاء علیہم السلام سے جو معجزات ظہور پذیر ہوئے یا نیک صالحین سے جن کرامات کا صدور ہے ان میں تاثیر پیدا کرنے والا صرف اللہ ہے۔ اس امر کی واضح مثال قرآن میں قصۂ موسیٰ علیہ السلام ہے۔ جب ان کے سامنے لاٹھی کا سانپ بنا تو گھبرا کر دوڑنے لگے۔ اگر وہ مؤثر خود ہوتے تو خوف زدہ ہونے اور بھاگنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ کچھ اسی طرح کا معاملہ تعویذ اور دم جھاڑا کا ہے۔ ان پر توکل اور بھروسہ کے بجائے نفع ونقصان میں اعتماد صرف ذات باری تعالیٰ پر ہونا چاہیے۔

قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ

شَيْئٍ قَدِيْرٌ. ﴾ (الأنعام:١٧)

''اور اگر اللہ کوئی سختی پہنچائے تو اس کے سوا اس کو کوئی دور کرنے والا نہیں۔ اور اگر (نعمت اور راحت عطا فرمائے) تو (کوئی، اس کو روکنے والا نہیں) وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَإِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَ إِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهِ يُصِيْبُ بِهِ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهِ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ. ﴾ (یونس:١٠٧)

''اور اگر اللہ تم کو کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اس کا کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر تم سے بھلائی کرنی چاہے تو اس کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے فائدہ پہنچاتا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

اور جادو کرنے والوں کے بارے میں فرمایا:

﴿ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ. ﴾ (البقرة:١٠٢)

یہ مذکورہ چیزیں تو صرف ایک ذریعہ ہیں جن کے جواز اور عدم جواز کا انحصار صرف نبوت کی روشنی پر موقوف ہے۔ مسنون دم کے لئے اہل علم نے بعض شرطیں بیان کی ہیں:

'' أَنْ تَكُوْنَ بِكَلَامِ اللّٰهِ تَعَالٰى أَوْ بِأَسْمَائِهِ وَ صِفَاتِهِ وَ بِاللِّسَانِ الْعَرَبِيِّ أَوْ مَا يُعْرَفُ مَعْنَاهُ مِنْ غَيْرِهِ وَأَنْ يَعْتَقِدَ أَنَّ الرُّقْيَةَ غَيْرُ مُؤَثِّرَةٍ بِنَفْسِهَا بَلْ بِتَقْدِيْرِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ.''

(عون المعبود ٢١/٤)

یعنی ''دم اللہ کے کلام یا اس کے اسماء وصفات اور عربی زبان میں ہو۔ دم معروف المعنی ہو۔ اور یہ اعتقاد رکھا جائے کہ دم جھاڑ ا بذاتہ مؤثر نہیں بلکہ اس کی تاثیر اللہ عزوجل کی قضاء وقدر سے ہے۔''

یہ غَيْر مُتَنَازَع فِيْه شَيْء کی تاثیر کا حال ہے جب کہ تعویذ ویسے ہی متنازع فیہ شیء ہے تو اس میں اس حد تک غلو کیسے جائز ہوگا۔ ''بچہ اس لئے مرا ہے کہ ماں نے تعویذ باندھنے سے انکار کر دیا تھا۔'' اس اعتقاد کا حامل انسان بلاشبہ مشرک ہے۔ اسے فوراً اپنے غلط عقیدہ سے تائب ہونا چاہیے۔ وَاللّٰهُ وَلِيُّ التَّوْفِيْق

موصوفہ کو قرآن مجید کی تلاوت اور ذکر واذکار کی صورت میں اپنے رب سے مزید تعلق گہرا کرنا چاہیے تاکہ شیطانی وسوسوں سے نجات حاصل ہو۔ رب کریم کا وعدہ ہے جو آسانی میں اسے یاد کرتا ہے۔ وہ ایام ابتلاء

میں اس کا دست و بازو بن جاتا ہے۔ دعا: « اَللّٰھُمَّ أْجُرْنِیْ...... » ❶ الخ اور « اَللّٰہَ اَللّٰہَ رَبِّیْ، لَا أُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا . » ❷ کا ورد کثرت سے کریں۔ ''ان شاء اللہ'' مشکل آسان ہو گی لیکن قبولیت دعا کی بنیادی شرط اکل حلال اور کبائر سے اجتناب ہے۔

سوال: تعویذ کے بارے میں ایک گروپ کا خیال ہے کہ اس کے پہننے کے بارے میں سخت وعید آئی ہے جب کہ دوسرے گروپ کا خیال ہے کہ علاج کے لئے تعویذ پہننا درست ہے بشرطیکہ شرکیہ نہ ہو؟

جواب: تعویذ کے جواز کے بارے میں میرا ایک تفصیلی فتویٰ ''الاعتصام'' میں شائع ہو چکا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ کتاب و سنت کے نصوص پر مبنی تعویذ کے بعض اہل علم جواز کے قائل ہیں۔ لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ صرف ثابت شدہ دم جھاڑ پر اکتفا کیا جائے جس طرح کہ متعدد صحیح احادیث میں اس کا جواز مصرح ہے۔

سوال: آپ ﷺ پر واقعی جادو ہو گیا تھا؟ کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: صحیح بخاری ''باب السحر'' میں موجود ہے کہ آپ کو جادو کیا گیا تھا۔ لیکن اس کا اثر صرف حافظہ پر تھا۔ عقل پر نہیں تھا۔ اس لئے تو اس حالت میں آپ ﷺ پر وحی آئی تھی جس میں جادو کی کیفیت سے آگاہ کیا گیا اگر عقل پر اثر ہوتا تو وحی بلا فائدہ تھی چنانچہ حدیث میں تصریح ہے:

« حَتّٰی أَنَّهُ لَيُخَيَّلُ إِلَيْهِ أَنَّهُ فَعَلَ الشَّيْءَ وَمَا فَعَلَهُ . » ❸

یعنی ''یہاں تک کہ آپ ﷺ کو خیال ہوتا کہ میں نے فلاں کام کر لیا ہے۔''

اور در حقیقت کیا نہ ہوتا اس کی تشریح میں شیخنا محدث روپڑی رقمطراز ہیں:

ان الفاظ سے دو باتیں ثابت ہوئیں: ایک یہ کہ جادو کا اثر حافظہ پر تھا، عقل پر نہ تھا کیونکہ کام کرنے نہ کرنے کے متعلق یاد نہ رہنا یہ حافظہ کا کام ہے اور حافظہ اور عقل دو قوتیں الگ الگ ہیں دیکھئے بچپن میں حافظہ قوی ہوتا ہے اور عقل کم اور معمر ہو کر عقل بڑھ جاتی ہے اور حافظہ میں فرق آ جاتا ہے پس حافظہ پر اثر ہونے

---

❶ (٣٦٤) مکمل دعاء: "إنا لله وإنا إليه راجعون، اللهم أجرني في مُصِيبَتِي وَ أَخْلِفْ لِيْ خَيْرًا مِنها . صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب ما يقال عند المصيبة (٢١٢٧) عن أم سلمة رضي الله عنها. قالت : فلما توفي أبو سلمة قلت كما أمرني رسول الله ﷺ، فأخلف الله لي خيراً منه رسول الله ﷺ.

❷ (٣٦٥) صححه الألباني. صحيح أبي داؤد، كتاب الو تر، باب الاستغفار (١٥٢٥)، صحيح ابن ماجه، كتاب الدعاء، باب الدعاء عند الكرب (٣٨٨٢) والصحيحة (٢٧٥٥) وأحمد (٦/٣٦٩) عن أسماء بنت عميس.

❸ (٣٦٦) صحيح البخاري، كتاب الطب، باب السحر، (ح:٥٧٦٦)

سے یہ لازم نہیں آتا کہ عقل پر بھی اثر ہو۔ دوسری بات ان الفاظ سے یہ معلوم ہوئی کہ حافظہ پر اثر سے مراد یہ نہیں کہ آپ کو معاذ اللہ قرآن مجید بھول گیا ہو یا اس طرح کا کوئی اور نقصان ہو گیا ہو بلکہ یہ صرف اس حد تک تھا کہ جزوی فعل میں کبھی بھول چوک ہو جاتی۔ اور جزوی فعل میں بھول چوک معمولی بات ہے۔ مثلاً نماز میں آپ کئی دفعہ رکعتیں بھول گئے اور فرمایا:

((أَنسٰی کَمَا تَنْسَوْنَ .)) ❶

یعنی ''جیسے تم بھول جاتے ہو میں بھی بھول جاتا ہوں۔''

بتلایئے ! یہ بھولنا کوئی دین میں نقصان دہ تھا۔ پس اگر جادو کے اثر سے عام بھولنے کی نسبت کسی قدر زیادہ بھول چوک ہو جاتی ہے تو یہ بھی دین کے منافی نہیں بلکہ بعض روایات میں اس جزوی فعل کی تعیین بھی آئی ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''بعض لوگ کہتے ہیں کہ حدیث میں وارد یہ ہے کہ آپ کو اپنی بیویوں کے پاس آنے کا خیال آتا مگر آئے نہ ہوتے۔ اور ایسا خیال خواب میں بہت آتا ہے۔ پس بیداری میں بھی کوئی بعید نہیں۔''

میں کہتا ہوں یعنی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کو جو کچھ بعض نے حدیث کی مراد بیان کی ہے۔ یہ بعض روایتوں میں صریحاً آیا ہے کہ آپ کو اپنی بیویوں کے پاس آنے کا خیال آتا مگر آئے نہ ہوتے۔ اور ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں:

((حَتّٰی کَادَ یُنْکِرُ بَصَرَہٗ .)) ❷

یعنی ''جادو کے اثر سے قریب تھا کہ آپ کی بصارت میں فرق آ جائے۔''

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ جادو کا اثر آپ کے بدن پر ایسا ہی تھا جیسے ظاہری امراض سے بدن میں کمزوری آ جاتی ہے اور اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور اشیاء وغیرہ بند ہو جاتی ہیں۔ مزید وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو: (فتاوی اهل حدیث (١ / ١٨٦-١٨٧)

سوال: میں ایک صحت مند ذہین لڑکا تھا، لیکن آہستہ آہستہ میں بالکل خراب ہو گیا۔ ایک عورت سے علاج

---

❶ (٣٦٧) صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، باب التوجه نحو القبلة حیث کان (٤٠١)، صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب السهو فی الصلاۃ والسجود له (١٢٧٤).

❷ (٣٦٨) قال ابن حجر عن سعید بن المسیب عند عبد الرزاق مرسلا . فتح الباری (١٠/٢٢٧) شرح الحدیث (٥٧٦٣).

کرایا۔ اس نے کہا کسی نے جادو کر دیا ہے۔ (اڑھائی) سال علاج کروایا۔ بہت افاقہ ہوا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ لیکن وہ عورت غلط عقیدہ کی تھی۔ لہٰذا میں نے اور میرے گھر والوں نے علاج چھوڑ دیا۔ ابھی میں مکمل ٹھیک نہیں ہوا۔ خوف بہت آتا ہے۔ عجیب عجیب خیالات گردش کرتے رہتے ہیں۔ بلا وجہ غصہ آتا ہے۔ میری والدہ کا اور چھوٹے بھائی کا بھی یہی حال ہے۔ گھر کی حالت سے پریشان ہو کر لکھ رہا ہوں۔ میں نے ایک خواب میں دیکھا کہ میرے دماغ کے اردگرد کوئی چیز لپٹی ہوئی ہے اور میں نے آیات پڑھ کر اس چیز کو اتار پھینکا۔ دماغ بالکل کام نہیں کرتا۔ زبان کسی وقت کھل جاتی ہے اور کسی وقت بالکل بند۔ کسی سے بات نہیں کر سکتا۔ معمولی معمولی باتوں پر ذہن پریشان ہو جاتا ہے۔ ہر طرف سے راستے بند دکھائی دیتے ہیں۔ جب کہ خدا کا شکر ہے کہ میں باقاعدگی سے ظہر، عصر، مغرب، عشاء کی نماز پڑھتا ہوں، والدہ بھی نمازی اور پرہیزگار ہیں۔ اور والد نے بھی کبھی حرام نہیں کھایا میری آپ سے گذارش ہے کہ خط کا جواب جلدی دیں اور جادو کا علاج بھی تجویز کریں؟

جواب: مُعَوِّذَات (الإخلاص۔ الفلق۔ الناس) پڑھ کر اپنے کو دم کیا کریں۔[1] شیطانی اثرات سے نجات مل جائے گی۔ ''ترمذی'' اور ''نسائی'' میں ہے کہ ''مُعَوِّذَات'' کے نزول کے بعد آپ ﷺ نے ان کے ماسوا سب دم جھاڑے ترک کر دیئے تھے۔[2] (بحوالہ فتح الباری ۱۰/۱۹۵)

اس کا معنی یہ نہیں کہ ان کے ماسوا دم منع ہے بلکہ یہ صرف اولویت پر محمول ہو گا۔ نبی ﷺ کی عادت مبارک تھی رات کو سوتے وقت بستر پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں کو ملا کر آپ ﷺ ان میں معوذات پڑھتے۔ پھر بقدر استطاعت منہ اور سارے بدن پر مل لیتے۔ یہ عمل تین دفعہ کرتے۔ کسی سے عمل کے بجائے بذات خود اس کا التزام کریں تو جملہ مصائب و مشکلات سے نجات حاصل ہو گی۔ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ.

سوال: میں نے ایک اخبار میں جادو کا علاج پڑھا تھا۔ آپ یہ بھی بتا دیں کہ کیا یہ صحیح ہے؟

۱۲۱'' مرتبہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس اس طرح پڑھیں کہ دونوں سورتیں پڑھ کر ایک دانہ شمار کریں۔ اول و آخر گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھیں اور جسم اور پانی پر پھونک مار کر دن رات میں پانچ مرتبہ پئیں۔ یہ عمل

---

[1] (۳٦۹) صحیح البخاري، کتاب فضائل القرآن، باب فضل المعوذات (۵۰۱۷).

[2] (۳۷۰) حسنه الترمذي وصححه الألباني وسكت عليه ابن حجر. كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يتعوذ من الجان وعين الإنسان حتى نزلت المعوذتان، فلما نزلتا أخذ بهما وترك ما سواهما. صحيح الترمذي، كتاب الطب، باب ما جاء في الرقية بالمعوذتين (۲۱۵۰) وابن ماجه (۳۵۱۱) فتح الباري، (۱۰/۱۹٦).

کم از کم چالیس دن کریں۔''

جواب: ''معوذتین'' کا ورد اور وظیفہ کرنا واقعی شیطانی خرافات کا علاج ہے لیکن قراءت میں یہ گنتی مقرر کرنا شرع میں ثابت نہیں۔ بلاتعیین ورد جاری رکھیں۔ ہر قسم کی مشکلات سے نجات حاصل ہوگی۔ نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ رات کو سوتے وقت آپ ﷺ بستر پر بیٹھ کر اور دونوں ہاتھوں کو ملا کر ان میں ''معوذات'' کی تلاوت کر کے بقدر استطاعت سارے جسم پر ہاتھ پھیرتے اور یہ عمل تین دفعہ کرتے۔ [1] اس مقام پر چونکہ گنتی ثابت ہے لہٰذا عمل اس پر ہوگا اور جہاں ثابت نہیں اپنی طرف سے مقرر نہیں کرنی چاہیے۔ نیز ان سورتوں کو پڑھ کر پانی کے بجائے اپنے جسم پر پھونک ماریں جس طرح کہ آپ ﷺ کی عادت مبارک تھی۔ [2]

❀❀❀❀❀❀❀

---

[1] (۲۷۱) صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل المعوذات (۵۰۱۷).

[2] (۲۷۲) ایضاً.

فرمان رسول ﷺ
« إِنَّ أَحَبَّ أَسْمَآئِكُمْ إِلَى اللّٰهِ عَبْدُاللّٰهِ وَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ .»
« إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَمُّوْنَ بِأَسْمَآءِ أَنْبِيَآئِهِمْ وَالصَّالِحِيْنَ قَبْلَهُمْ . »

﴿۲۲﴾ انسانوں اور اشیاء کے نام متعین کرنے کی شرعی حیثیت

سوال: میں الحمد سویٹس کے نام سے مٹھائی کی دکان کر رہا ہوں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ لفظ الحمد کی بے ادبی ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ الحمد سویٹس ڈبوں اور شاپروں پر لکھا جاتا ہے اور پھر وہ پاؤں تلے آتے ہیں۔ اس طرح لفظ الحمد کی بے ادبی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس بے ادبی کی شرعی حیثیت مطلوب ہے؟

جواب: لفظ ''الحمد'' بطور اسم استعمال کا کوئی حرج نہیں۔ کئی ایک ذوات و اشخاص کے اسماء جو کتاب اللہ میں وارد ہیں۔ علی الاطلاق ان کے استعمال کا جواز ہے۔ اسی طرح یہاں محل بحث میں سمجھ لینا چاہیے۔ ہاں البتہ ''الحمد'' کی نسبت اختصاص یا اضافت ''ذوالجلال والاکرام'' کی طرف ہو مثلاً " اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ " یا " وَلَهُ الْحَمْدُ" تو اس صورت میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اہانت کے خوف سے اس کا استعمال نہ ہو۔ اگرچہ دعوتی نکتۂ نظر سے اس کے استعمال کا بھی جواز ہے۔ سربراہان حکومت و رؤساء دُول کی طرف آپ کے پیغامات بھی اسی نظریہ کے مؤید ہیں۔

اسی بناء پر خطوط و رسائل میں ''۷۸۶'' کے بجائے محققین اہل علم کے نزدیک ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کا تعین ہے۔ [1] جملہ دلائل سے معلوم ہوا کہ ''الحمد سویٹس'' کے نام سے کاروبار جاری رکھا جا سکتا ہے۔ شرعاً کوئی قباحت نہیں لیکن ایک مسلمان کے لئے اللہ کے ذکر کی صورت میں نجس مقامات سے احتفاظ کا پہلو غالب رہنا چاہیے۔ سنن ابوداؤد میں حدیث ہے:

« إِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ وَضَعَ خَاتَمَهُ. » [2] (بابُ الْخَاتِمِ يَكُوْنُ فِيْهِ ذِكْرُ اللّٰهِ تَعَالٰى)

جب آپ ﷺ بیت الخلاء میں داخل ہوتے تو اپنی انگوٹھی اتار لیتے کیونکہ اس میں محمد رسول اللہ ﷺ نقش تھا۔ اسی حرمت کے پیش نظر دشمن کی سرزمین میں قرآن سمیت سفر سے منع کیا گیا ہے۔ ویسے بھی ''حمد''

---

[1] (۳۷۳) صحیح البخاری، بدء الوحی رقم (۷)

[2] (۳۷٤) أبوداؤد، کتاب الطهارة، باب الخاتم یکون فیه ذکر الله تعالیٰ (۱۹) قال أبوداؤد: هذا حدیث منکر.

سے مقصود چونکہ ثناء اور ذکر خیر ہوتا ہے گویا کہ اس اظہار تشکر کی طرف بھی اشارہ ہو گیا۔ اس بناء پر دکان کے لئے یہ تسمیہ حسن تفاؤل کے قبیل سے ہوا جو خیر و برکت کا موجب ہے۔

سوال: عبدالماجد، عبدالصمد وغیرہ کو صرف صمد یا ماجد کہہ کر پکار سکتے ہیں؟ جب کہ دل میں اللہ کے صفاتی نام اَلْمَاجِد، اَلصَّمَدُ مراد نہ ہوں، صرف مخاطب سے خطاب مقصود ہو۔ اگر نہیں کہہ سکتے تو اس بابت کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کہ ایک شخص کا نام محمد احمد ہے، جب کہ یہی نام نبی اکرم ﷺ کے ذاتی نام ہیں۔ کیا اس شخص کو صرف محمد یا احمد یا محمد احمد پکارا جا سکتا ہے؟ جب کہ وقت خطاب نبی ﷺ مراد نہیں ہیں۔

جواب: بات یہ ہے کہ یہاں لفظ ''اَلصَّمَدُ'' اور ''اَلْمَاجِدُ'' سے مراد یقینی طور پر اللہ عزوجل کی ذات گرامی ہے۔ اضافت عبد موجود ہو یا محذوف، بہر دوصورت یہی کچھ سمجھا جاتا ہے کہ مقصود ''عبدالصمد'' ہے یا ''عبدالماجد'' ایک نام ہے۔ لہٰذا پورا نام پکارنا ہی بہتر ہے۔ ہاں البتہ کلیتًا انقطاع اضافت کی صورت میں یہ اطلاق ممکن ہے۔

اور جہاں تک محمد احمد کا تعلق ہے سو یہ مستقل طور پر دو نام ہیں۔ اگرچہ عجمی زبان میں مرکب کی صورت میں ان کو ایک بنا دیا گیا ہے تو غیر نبی پر ان کے اطلاق میں کسی کو کلام نہیں۔ نبی ﷺ نے بذات خود اپنے بیٹے کا نام جد الأنبیاء ابراہیم علیہ السلام کے نام پر رکھا تھا۔ نیز فرمایا:

« سَمُّوا بِاسْمِي » [1] (بخاری)

'' میرے نام پر نام رکھو۔''

اور صحیح مسلم میں حدیث ہے، نبی ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَمُّونَ بِأَسْمَاءِ أَنْبِيَائِهِمْ وَالصَّالِحِينَ قَبْلَهُمْ . » [2]

''لوگ اپنے انبیاء اور اپنے سے پہلے نیک لوگوں کے ناموں پر نام رکھتے تھے۔''

اور دوسری روایت میں ہے:

« تَسَمُّوا بِأَسْمَاءِ الْأَنْبِيَاءِ . » [3] (أبوداؤد، نسائی)

---

[1] (٣٧٥) صحیح مسلم، کتاب الأدب، باب النهی عن التكنی بأبی القاسم (٥٥٨٦_٥٥٩٧)

[2] (٣٧٦) صحیح مسلم، کتاب الأدب، باب النهی...... و بيان ما يستحب من الاسماء (٥٥٩٨)

[3] (٣٧٧) أبوداؤد، كتاب الأدب، باب في تغيير الأسماء (٤٩٥٠) ضعفه الألبانی وانظر: الإرواء (٤٠٨/٤) رقم (١١٧٨) فيه عقيل بن شبيب وقال الذهبی: "لا يعرف" وقال الحافظ: " مجهول" .

''الأدب المفرد'' میں یوسف بن عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام یوسف رکھا ہے۔ اس کی سند صحیح ہے۔''❶ (فتح الباری ۱۰/۵۷۸)

تاہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تقدس کی بناء پر یہ بھی مکروہ سمجھا ہے۔ ان کا قصد بھی اچھا ہے۔ لیکن سابقہ دلائل کی بناء پر ترجیح جواز کو ہے۔

سوال: بچے کا نام رکھنے میں کن باتوں کا خیال ضروری ہے؟

جواب: بچے کا نام محبوب ترین رکھنا چاہیے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے:

« إِنَّ أَحَبَّ أَسْمَائِكُمْ إِلَى اللّٰهِ عَبْدُاللّٰهِ وَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ .» ❷

''تمہارے ناموں میں سے سب سے محبوب ترین نام اللہ کے ہاں عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔''

اسی طرح وہ نام جس میں عبودیت کا اظہار ہو۔ مثلاً عبدالرحیم، عبدالملک اور عبدالصمد وغیرہ۔ پھر انبیاء علیہم السلام اور نیک لوگوں کے ناموں کو اختیار کرنا چاہیے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے:

« إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَمُّونَ بِأَسْمَاءِ أَنْبِيَائِهِمْ وَالصَّالِحِينَ قَبْلَهُمْ .» ❸

اور سنن ابوداؤد میں ہے:

« تَسَمُّوا بِأَسْمَاءِ الْأَنْبِيَاءِ وَأَحَبُّ الْأَسْمَاءِ إِلَى اللّٰهِ عَبْدُاللّٰهِ وَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ وَأَصْدَقُهَا حَارِثٌ وَهَمَّامٌ وَأَقْبَحُهَا حَرْبٌ وَ مُرَّةُ .»❹ (بَابٌ فِيْ تَغْيِيرِ الْأَسْمَاءِ)

یعنی ''انبیاء علیہم السلام کے ناموں پر نام رکھو۔ اللہ کے ہاں سب سے محبوب ترین نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن اور سب سے سچا یعنی واقعہ کے مطابق حارث اور ہمام ہے۔ (کیونکہ ہر آدمی دنیا یا آخرت کی کھیتی میں لگا ہے۔ اسی طرح تفکرات بھی انسانی زندگی کا لاحقہ ہیں۔) اور سب سے برا نام حرب (لڑائی) اور مرۃ (کڑواپن) ہے۔''

نام کا اثر آدمی کی شخصیت پر بہت زیادہ پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو: (زادالمعاد ۲/۵، فَصْلٌ فِيْ فِقْهِ هٰذَا الْبَابِ) (اور برے نام سے اجتناب کرنا ضروری ہے اور ایسا نام بھی نہیں رکھنا

---

❶(۳۷۸) الأدب المفرد، باب أسماء الانبیآء رقم (۸۳۸) وصححه الألبانی.

❷(۳۷۹) صحیح مسلم، کتاب الأدب، باب النهی عن التکنی بأبی القاسم (۵۵۸۶-۵۵۹۷).

❸(۳۸۰) صحیح مسلم، کتاب الأدب، باب النهی...... و بیان ما یستحب من الاسماء (۵۵۹۸)

❹(۳۸۱) أبوداؤد، کتاب الأدب، باب فی تغییر الأسماء (۴۹۵۰) ضعفه الألبانی وانظر: الإرواء (۴/۴۰۸) رقم (۱۱۷۸) فيه عقيل بن شبيب وقال الذهبی: "لا يعرف" وقال الحافظ: "مجهول".

چاہیے جس میں تزکیہ نفس پایا جائے اور ایسا نام بھی نہیں رکھنا چاہیے جس میں سب و شتم کا مفہوم ہو۔ وغیرہ وغیرہ) (فتح الباری ۱۰/ ۵۷۵)

سوال: ''پرویز'' نام کے متعلق ایک اخباری تراشہ ارسال خدمت ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں! یہ نام نہ رکھئے!

میرے بھتیجے کا نام اسلم پرویز تھا مولوی صاحب نے نکاح پڑھانے سے انکار کر دیا وجہ پوچھی تو فرمانے لگے کہ ایران کے بادشاہ کا نام خسرو پرویز تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کے نام پر اپنا خط مبارک بھیجا اسلام کی دعوت دی مگر اس نے حضور ﷺ کا خط مبارک پھاڑ دیا اور حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کی بلکہ یہاں تک کہ دو آدمی حضور اکرم ﷺ کو گرفتار کرنے کے لئے مدینہ منورہ بھیجے لیکن اس دوران اس کے بیٹے نے اپنے باپ پرویز کو قتل کر دیا۔ واقعہ تو بہت بڑا ہے اکثر علماء کرام اس نام سے نفرت کرتے ہیں۔ جو حضور ﷺ کا دشمن وہ ہم سب مسلمانوں کا دشمن شاید اکثر مسلمانوں کو اس واقعہ کا علم نہ ہو اس لئے پرویز نام رکھ لیتے ہیں۔ پاکستان کے موجودہ سربراہ کا نام بھی پرویز مشرف ہے میری تمام اخبارات سے التماس ہے کہ وہ بھی پرویز نام نہ لکھیں بلکہ صرف جنرل مشرف لکھ دیا کریں ایک دو پرویز اور بھی تھے جو حضور اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کر چکے ہیں۔ مزید معلومات علماء کرام سے کر لی جائیں؟

جواب: اصلاً ناموں کے جواز یا عدم جواز کا تعلق شخصیات کی بجائے مطلب اور معنی کے ساتھ ہے۔ معنی قباحت کی بناء پر آپ ﷺ نے بعض ناموں اور القاب کو ناپسند فرمایا۔ مثلاً شاہان شاہ [1] (صحیح بخاری، بَابُ أَبْغَضِ الْأَسْمَاءِ إِلَى اللهِ) لیکن شخصیات کے پیش نظر آپ نے تبدیلی نہیں فرمائی۔ مثلاً ''الولید'' فرعون مصر کا نام تھا اور ''الولید بن الولید'' ایک صحابی کا نام بھی تھا لیکن آپ ﷺ نے اس میں اس حیثیت سے تبدیلی نہیں فرمائی کہ یہ ایک متکبر شخص کا نام ہے بلکہ اسے برقرار رکھا۔ اس اسم کے ساتھ کفار مکہ کی قید سے آپ ﷺ نے اس کے لئے بحالت نماز دعا فرمائی۔ [2] (صحیح بخاری، بَابِ تَسْمِيَةِ الْوَلِيْدِ)

اس بناء پر ''پرویز'' نام کو بدلنے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ واللہ اعلم

سوال: کیا عَبْدُ الرَّسُوْل، عَبْدُ النَّبِيِّ نام رکھنا درست نہیں جب کہ عبد، خادم، یا غلام کے معنی میں استعمال

---

[1] (۳۸۲) صحیح البخاری کتاب الأدب (ح: ۶۲۰۵ـ۶۲۰۶)

[2] (۳۸۳) صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الدلیل علی أن قاتل نفسه لا یکفر (۳۱۱). صحیح البخاری، کتاب الادب (ح: ۶۲۰۰)

کی نیت ہو؟ عبادت کی نیت سے نہ ہو۔ اور پھر قرآن و حدیث میں "عِبَادٌ لَّهٗ" کا لفظ خادموں یا نوکروں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

جواب: حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے زیر آیت:﴿ فَلَمَّا تَغَشّٰهَا﴾ ایسے ناموں کو شرک لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

''ازینجا دانستہ شد شرک در تسمیہ نوعیت از شرک چنانکہ اہل زمان ما غلام فلاں عبد فلاں نام می نہند۔'' (بحوالہ فتاوی ثنائیہ : ۳۷۹/۱)

سوال: کیا یزدانی تخلص رکھنا شرعی لحاظ سے جائز ہے؟ کیونکہ بعض کا خیال ہے کہ لفظ یزدان نامی ایرانیوں کا دیوتا تھا۔ بعض اپنے آپ کو صاحب علم کہلوانے والے یزدانی تخلص رکھنے والے کو مشرک گردانتے ہیں۔ شرعی صورت حال کیا ہے؟

جواب: واقعی یزداں مجوسیوں کے معروف دو دیوتاؤں سے ایک ہے۔ لہٰذا اس تخلص سے اجتناب ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ غیر اللہ کی طرف نسبت کو فال خیر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تو دراصل اس کے ساتھ ناطہ جوڑنے والی بات ہے، جو ایک باخبر کے کسی صورت لائق نہیں۔

فیروز اللغات (فارسی۔ اردو) میں ہے:

''اسلام سے پہلے اہل ایران دو خداؤں کو مانتے تھے۔ جن میں سے نیکی کے خدا کو ''یزدان'' اور برائی کے خدا کو ''اہرمن'' کہتے تھے۔''

سوال: ایک حکیم صاحب اپنے مطب کا نام سلفی شفاخانہ رکھے ہوئے ہیں۔ جب کہ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ سلفی دواخانہ نام ہونا چاہیے۔ سلفی شفاخانہ کہنے میں شرک ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: واقعی اصل یہی ہے کہ مطب کا نام ''سلفی دواخانہ'' [1] ہونا چاہیے۔ ہاں البتہ اگر بطور تفاؤل اس کا نام ''سلفی شفاخانہ'' رکھ لیا جائے تو جواز کا پہلو موجود ہے۔ کیونکہ ایک مومن مسلمان کا اعتقاد قطعاً یہ نہیں ہوتا کہ مقام ہذا بذاتہ شفاء میں موثر ہے۔ بلکہ اس کا سراسر یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ''شفاء من جانب اللہ'' ہے اس بناء پر عام مطبوں کے اوپر آویزاں ہوتا ہے۔ " هُوَ الشَّافِيْ "اور بعض مقامات پر یہ آیت بھی لکھی ہوتی ہے:

---

[1] اطباء کی اصطلاح میں دواخانہ پنساری کی دکان یا اسٹور کو کہا جاتا ہے، جب کہ شفاخانہ حکیم و طبیب کی دکان وغیرہ کو کہتے ہیں کہ جہاں بیماریوں کی تشخیص اور پھر ان کے لئے دوائیں تجویز کی جاتی ہیں جن کے استعمال پر اللہ سے شفاء کی امید رکھی جاتی ہے، عربی میں ہسپتال کو ''مستشفی'' کہا جاتا ہے جس کے معنی ہیں ''شفاء طلب کرنے کی جگہ''۔ (نعیم الحق نعیم ﷾)

﴿وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ .﴾ (الشعراء: ۸۰)

بہرصورت احتیاطی پہلو یہی ہے کہ اس لفظ کو ترک کر دیا جائے۔ کیونکہ امام الحنفاء ابراہیم علیہ السلام نے شفاء کی نسبت کلیۃ اللہ عزوجل کی طرف کی ہے۔لیکن آیت ہذا میں بیماری کی نسبت انہوں نے اپنی طرف کر دی۔ حالانکہ وہ بھی اللہ کی طرف سے ہے تو یہ صرف ادب کی بناء پر ہے۔ ورنہ بلاشبہ بیماری بھی اللہ کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔اسی طرح قرآن مجید میں جنات کا قول ہے:

﴿أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَنْ فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا﴾ (الجن: ۱۰)

آیت ہذا میں ارادۂ شر کی نسبت مجہول ہے جب کہ ارادۂ خیر کی نسبت بصیغۂ معروف ذکر ہوئی ہے۔ یہ بھی محض ادب کے پیش نظر ہے۔

۲۳ انسانی جسم واعضاء سے متعلقہ مسائل

سوال: کیا چھوٹے قد والا آدمی فتنہ ہے؟ اگر ہے تو احادیث کی روشنی میں قد کی کتنی بلندی ہے؟

جواب: پست قد آدمی کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ وہ فتنہ ہوتا ہے غلط خیال ہے۔ آپ ﷺ کی بیوی حضرت صفیہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا قد پست تھا لیکن ان کی جملہ صفات حسنہ سب کے سامنے عیاں ہیں۔ بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں۔ فرمایا: ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی کمزور پنڈلیاں اللہ کے نزدیک احد پہاڑ سے بھی وزنی ہیں۔ [1] (مسند أحمد)

ہاں البتہ دراز قد کی نسبت یہ کمزوری ان میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ بعض لوگ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی خونی گردشی نالیاں چھوٹا ہونے کی وجہ سے ہے۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِحَقِيْقَةِ الْحَالِ .

قد کے چھوٹا بڑا ہونے کا اندازہ ہر زمانہ کے افراد کے اعتبار سے ہوتا ہے جس کا کوئی معیار مقرر نہیں۔ صحیح بخاری کا ایک مشہور راوی ''حمید الطّویل'' ہے۔ طویل کا معنی قد آور ہے لیکن فی الواقع وہ قصیر (چھوٹا) تھا۔ اس کو طویل اس لئے کہا گیا کہ اس کا ایک ہمسایہ اس سے بھی زیادہ پست قد تھا تو اس کی نسبت کے اعتبار سے اس کو طویل کہا جاتا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو ہاتھ دیئے ہیں۔ قدرتی طور پر دائیں ہاتھ میں قوت زیادہ ہے اور دائیں ہاتھ سے سارے کام کاج کرنا یعنی اچھے کام کرنے کا حکم ہے۔ نیز کوئی چیز لیتے دیتے وقت بھی دائیں ہاتھ کو استعمال کرنے کا حکم ہے۔ مگر بعض لوگوں کو قدرتی طور پر پیدا ہی اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کی قدرتی طاقت جو کہ دائیں ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ بائیں طرف معلوم ہوتی ہے مگر وہ کام کرتے وقت ہی اس ہاتھ کو استعمال کرتے ہیں۔ اب جب کسی بھائی کو بائیں ہاتھ سے کام کرتے ہوئے منع کیا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرا دایاں

---

[1] (٣٨٤) أحمد (١٤٤/١)رقم (٩٢٠-شاكر وقال : إسناده صحيح)عن علي رضى الله عنه وابن سعد في الطبقات (١٤٩/٢) في حلفاء بني زهرة ،عنه وعن عبدالله هذا.

ہاتھ بائیں جانب والا ہے۔ کیوں کہ میری قدرتی طاقت جو کہ دائیں ہاتھ میں ہوتی ہے وہ اللہ نے بائیں ہاتھ میں پیدا کی ہے تو کیا وہ بائیں ہاتھ سے کام کاج لین دین کر سکتا ہے؟

جواب: جس انسان کے لین دین اور کام کاج کی قوت فی الجملہ دائیں ہاتھ کے بجائے بائیں ہاتھ میں ہو وہ ذی قوت ہاتھ کو استعمال میں لائے گا اگرچہ یہ الٹا ہاتھ ہو بشرطیکہ یہ کام وہ ہو جو دائیں ہاتھ سے مافوق الاستطاعت ہوں قرآن میں ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ. ﴾ (التغابن:١٦)

''سو جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو۔''

اور حدیث میں ہے:

((مَا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ فَاجْتَنِبُوْهُ وَمَا أَمَرْتُكُمْ فَأْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ .)) [1]

''جس چیز سے میں تمہیں منع کروں اس سے باز رہو۔ اور جس بات کا حکم دوں تو جس قدر بجا لا سکتے ہو بجا لاؤ۔''

❀❀❀❀❀❀❀

[1] (٣٨٥) صحیح مسلم ،کتاب الفضائل،باب توقیره صلی الله علیه وسلم وترك إكثار سؤاله ......(٦١١٣) والحج (٣٢٥٧) عن أبي هريرة رضى الله عنه بلفظ : ((إذا نهيتكم عن شئ فدعوه)).

۲۴ بدعات ورسومات

سوال: وسیلہ کسے کہتے ہیں؟

جواب: وسیلہ کا مطلب ہے مطلوب تک تقرب حاصل کرنا اور رغبت کے ساتھ اس تک پہنچنا۔ (النہایۃ)

اور وسیلہ کا ایک معنی اور بھی ہے: اور وہ ہے بادشاہ کے پاس مرتبہ اور درجہ اور قربت جیسا کہ حدیث میں اس کو جنت کا سب سے اعلیٰ مقام کہا گیا ہے۔ ❶

امام ابن جریر رحمہ اللہ ﴿وَابْتَغُوْا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ .﴾ کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

"اُطْلُبُوا الْقُرْبَةَ إِلَيْهِ بِالْعَمَلِ بِمَا يُرْضِيهِ ."

یعنی "اللہ کی طرف اس عمل کے ذریعہ قربت حاصل کرو جس کو پسند کرتا ہے۔"

شریعت میں وسیلہ کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا، اس کی اطاعت، عبادت اور اس کے انبیاء و رسل کی اتباع کر کے اور ہر اس عمل کے ذریعہ جس کو اللہ پسند کرے اور خوش ہو۔

سوال: وسیلہ کی کتنی اقسام جائز اور کتنی ناجائز ہیں؟

جواب: مشروع وسیلہ کی تین قسمیں ہیں:

① اللہ کی ذات اور اس کے اسماء وصفات کا وسیلہ۔

② مومن کے اعمال صالحہ کا وسیلہ۔

③ مومن کی غائبانہ دعا کا وسیلہ۔

اور ممنوع وسیلہ کی بھی تین قسمیں ہیں:

۱ اللہ کی بارگاہ میں مخلوقات کی ذات اور شخصیت کا وسیلہ۔

۲ بارگاہ الٰہی میں کسی کی جاہ، حق اور حرمت و برکت کا وسیلہ۔

---

❶ (۳۸٦) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة...... (ح: ٦٥٥٠)؛ (٢٨٠٩)

④ جس کا وسیلہ لیا گیا ہے اللہ پر اس کی قسم کھانا۔

وسیلہ مشروع کی جملہ اقسام رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔

سوال: مُردے کو لے جاتے وقت کلمہ شہادت پڑھنا کیسا ہے؟

جواب: میت کو قبرستان لے جاتے وقت کلمہ شہادت کا ورد کرنا احادیث سے ثابت نہیں۔ دین میں اپنی طرف سے اضافہ کرنا درست نہیں۔ کما تقدم.

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"اِتَّبِعُوا وَلَا تَبْتَدِعُوا فَقَدْ كُفِيتُمْ ."❶

"پیروی کرو بدعت مت نکالو تمہارے لئے یہی کافی ہے۔"

اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فَمَا لَمْ يَكُنْ يَوْمَئِذٍ دِينًا لَا يَكُونُ الْيَوْمَ دِينًا ." ❷

یعنی "جو شے عہد رسالت میں دین نہیں تھی۔ وہ آج بھی دین نہیں بن سکتی۔"

اس لئے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ ......الخ .﴾ (المائدة:٣)

جو شخص اسلام میں بدعت ایجاد کر کے اسے مستحسن خیال کرتا ہے وہ گویا یہ سمجھتا ہے کہ محمد ﷺ نے پیغام رسانی میں (نعوذ باللہ من ذلك) خیانت کی ہے۔

اصل یہ ہے کہ ایسے موقعہ پر انسان خود اپنی موت بھی یاد کر کے اپنے لئے زاد راہ بنائے۔ شریعت میں زیارت قبور کا یہی فلسفہ بیان ہوا ہے کہ

« فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الْآخِرَةَ .» ❸ (الحديث)

---

❶(٣٨٧) الدارمی (١/ ٨٠)رقم(٢٠٥)،و البدع والنهی عنها صـ١٠ للإمام محمد بن وضاح، وأصول السنة لابن أبی زمنين وقال محققه: الأثر صحيح ورواه أبو خيثمة فی العلم رقم (٥٤)من طريق العلاء عن حماد بن زيد به وصحح إسناده العلامة الألبانی.

❷(٣٨٨) الاعتصام فی ذم البدع (١/ ٣٣)للشاطبی.

❸(٣٨٩) صحيح الترمذی، أبواب الجنائز، باب ماجاء فی الرخصة فی زيارة القبور (١٠٦٦)وصححه الألبانی. وزاد ابن ماجه من حديث ابن مسعود :"وتزهد فی الدنيا" (١٥٦٩)عن أبی هريرة رضی الله عنه.

''بیشک یہ آخرت یاد دلاتی ہے۔''

واضح ہو کہ بدعت کا یہ خاصہ ہے کہ ہمیشہ استحسانی صورت میں سامنے آتی ہے جب کہ فی الواقع ایک مسلم کا مطمح نظر ہر حالت میں ہمیشہ کتاب و سنت کی پیروی ہونا چاہیے۔ خواہ وہ عمل بظاہر کتنا ہی کم نظر آئے۔ کیونکہ اصل قدر و قیمت تعلق بالشریعت کی ہے لَاغَیر.

" اَلْخَیْرُ کُلُّ الْخَیْرِ فِی الْاِتِّبَاعِ وَالشَّرُّ کُلُّ الشَّرِّ فِی الْاِبْتِدَاعِ ."

سوال: آدمی کے فوت ہونے سے تقریباً ایک ہفتہ بعد لواحقین، اہل محلّہ اور گاؤں کے عام لوگوں کو کھانے کی دعوت دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: کھانے کی ایسی مجالس میں شرکت نہیں کرنی چاہیے۔ اس لئے کہ یہ طریق کار سنت نبوی سے ثابت نہیں ہے۔ حدیث میں ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِیْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ .» [1]

یعنی ''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

یاد رہے۔ سوئم۔ دسواں۔ بیسواں، چالیسواں، چھ ماہی برسی وغیرہ سب بدعات کے زمرہ میں شامل ہیں۔

''شرح المنہاج'' نووی اور حنفی فقہ کی کتابوں میں ہے:

" اِتِّخَاذُ الطَّعَامِ فِی الْیَوْمِ الثَّالِثِ وَالسَّادِسِ وَالْعَاشِرِ وَالْعِشْرِیْنَ وَغَیْرِهَا بِدْعَةٌ مُسْتَقْبَحَةٌ ."

یعنی مذکورہ امور قبیح بدعت ہیں۔

سوال: ہمارے علاقے میں یہ رسم عام ہے کہ اگر کوئی فوت ہو جائے تو تیسرے دن قل اور اس کے بعد ہر جمعرات کو ختم پڑھایا جاتا ہے اور آخر میں رسم چہلم ادا کر کے سال تک مرنے والا بھلا دیا جاتا ہے۔ آپ بتائیں ایسی محفل میں جانا کیسا ہے؟ اور یہ رسم حدیث میں بھی موجود ہے یا نہیں؟

جواب: وفات کے تیسرے دن اور پھر ہر جمعرات کو ختم اور اخیر میں رسم چہلم کے انعقاد کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔ بلکہ یار لوگوں نے کھانے پینے کا ڈھب بنا رکھا ہے۔ ہندوؤں کی پیروی میں یہ رسومات ایجاد ہوئی ہیں۔ منوسمرتی میں ان رسموں کا ذکر ملتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

---

[1] (٣٩٠) صحیح البخاری، کتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا علی صلح جور فالصلح مردود (٢٦٩٧).

« مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ .»

یعنی ''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔'' (بخاری، کتابُ الصُّلح، بَابٌ إِذَا اصْطَلَحُوْا)

جب ان مجالس کا منعقد کرنا خلاف شرع ہے تو ان میں شرکت کرنا بھی ناجائز ہے۔

سوال: حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس بیماری میں (جس سے اچھے ہو کر نہیں اٹھے) یوں فرمایا: اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ [1]

(صحیح البخاری: ۱/۱۰۶ کتاب الجنائز)

اب آپ سے مسئلہ یہ پوچھنا ہے کہ یہودیوں نے تو اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا مگر نصاریٰ نے کیسے اپنے نبی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیا؟ کیونکہ نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کو کہتے ہیں۔ ایک قادیانی نے مجھ سے یہ سوال کیا ہے اور اس سلسلہ میں میں بہت پریشان ہوں۔

جواب: نصوص صحیحہ صریحہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو زندہ آسمان پر ہیں۔ قرب قیامت میں ان کا نزول ہوگا۔ [2] تو پھر دنیا میں ان کی قبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا مرزا قادیانی اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے کہ ان کی قبر کشمیر میں ہے۔ حدیث ہذا میں جو کچھ بیان ہوا مجمل ہے۔ صحیح مسلم میں جندب کے طریق میں مفصل ہے:

« كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِ هِمْ وَ صَالِحِيْهِمْ مَسَاجِدَ .» [3]

یعنی ''یہود و نصاریٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام اور اپنے نیک لوگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''

مقصود یہ ہے کہ یہود نے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ جب کہ نصاریٰ نے نیک لوگوں کی پوجا پاٹ کی۔ دلیل اس امر کی یہ ہے کہ دیگر روایات میں تذکرہ جب نصاریٰ کا ہوا تو وہاں صرف نیکوکار کی تصریح ہے۔ انبیاء کا ذکر نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے سرزمین حبشہ کے ایک کنیسہ کا ذکر کیا ہے وہ دیکھ کر آئی تھیں، اسے ماریہ کہا جاتا ہے۔ انہوں نے ان تصویروں کا ذکر کیا، جنہیں وہ دیکھ کر آئی تھیں تو سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« أُولٰئِكَ قَوْمٌ إِذَامَاتَ فِيْهِمُ الْعَبْدُ الصَّالِحُ أَوِ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِه مَسْجِدًا

---

[1] (۳۹۱) صحیح مسلم، کتاب المساجد رقم (۵۳۰).

[2] (۳۹۲) صحیح البخاری، کتاب المظالم، باب کسر الصلیب وقتل الخنزیر (۲۴۷۶)، (۳۴۴۸)، مسلم (۲۹۳۷).

[3] (۳۹۳) صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النهی عن بناء المسجد علی القبور (۵۳۲).

وَ صَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّوَرَ أُولٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَاللّٰهِ . » ❶ (بخاری ، باب الصلاۃ فِی الْبِیْعَة)

یعنی ''یہ وہ لوگ ہیں جب ان میں کوئی نیک آدمی فوت ہو جاتا تو اس کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیتے۔ اور اس میں یہ تصویریں بناتے۔ اللہ کے ہاں یہ مخلوق میں بدترین ہیں۔''

اور جب انفرادی طور پر یہود کا تذکرہ ہوا تو فرمایا:

« قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُودَ اِتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ .» ❷

یعنی ''اللہ تعالیٰ یہود کو برباد کرے انہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''

یہاں صرف انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے نیکوکاروں کا نہیں۔

یہ بھی احتمال ہے کہ یہود کے ساتھ نصاریٰ کا ذکر اس بناء پر ہو کہ نصاریٰ تو انبیاء یہود کو برحق تسلیم کرتے تھے جبکہ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ گویا انبیاء یہود دونوں گروہوں کے نزدیک مکرم ٹھہرے۔ اسی بناء پر دونوں ان کی عبادت میں شریک ہو گئے اور یہ بھی ممکن ہے یہاں حواری اور حضرت مریم علیہا السلام کو غیر مرسل قرار دیا گیا ہو۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ انبیاء سے مراد بذات خود انبیاء اور ان کے کبار متبعین ہی ہوں۔ (فتح الباری ۱/۵۳۳)

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرع متین اس بارے میں کہ ایک شخص نے مندرجہ ذیل باتیں ایک اخبار میں شائع کی ہیں۔ پوچھنا یہ ہے کہ یہ بات خلفائے راشدین سے کسی مستند کتاب میں ثابت ہے۔ یا یہ لوگوں کا افتراء ہے؟ لکھتے ہیں:

- میلاد کے سلسلے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ''جس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے میلاد پاک پر ایک درہم بھی خرچ کیا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔''
- حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جس نے امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے میلاد مبارک کی تعظیم کی اس نے اسلام کو زندہ کیا۔''
- خلیفۂ سوم داماد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ذوالنورین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ''جس نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے میلاد مبارک پر ایک درہم بھی خرچ کیا گویا کہ وہ بدر وحنین کے جہاد میں شریک ہوا۔''
- داماد رسول صلی اللہ علیہ وسلم شیر خدا مشکل کشا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: ''جس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

❶ (۳۹٤) صحيح البخاري، كتاب الصلاة، باب سل تنبش قبور مشر كى الجا هلية (٤٢٧)، مسلم (٥٢٨).

❷ (۳۹۵) صحيح مسلم، كتاب المساجد رقم (٥٣٠).

میلاد پاک کی تعظیم کی اور اسے بیان کی کوشش کی وہ دنیا سے ایمان کے ساتھ جائے گا اور بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوگا۔''

آگے لکھتے ہیں کہ حضرت عبدالمطلب فرماتے ہیں کہ:''میں امام الانبیاء کی ولادت کی رات خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ خانہ کعبہ سجدہ میں گر گیا اور کعبہ سے آواز آئی کہ آمنہ کے یہاں حضرت محمد ﷺ پیدا ہو گئے ہیں۔ اور کعبہ کے اندر ہبل نامی بڑا بت تھا اس کے اندر سے بھی آواز آئی کہ خبردار آخری نبی پیدا ہو گیا ہے''۔ حضرت عبدالمطلب یہ آوازیں سن کر خوشی خوشی آمنہ کے گھر پہنچے اور اندر جانے لگے تو ایک آدمی تلوار لئے ظاہر ہوا اور پکارا، جب تک تمام فرشتے محمد ﷺ کی زیارت نہ کر لیں نہ کوئی اندر جا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اسے دیکھ سکتا ہے۔'' (جنگ اخبار، ۱۲/۳/۱۴۱۸ھ)

جواب: بسلسلہ میلاد روزنامہ جنگ میں شائع شدہ خلفائے راشدین وغیرہ کی طرف منسوب مذکورہ بالا بیانات محض افتراءآت ہیں۔ تاریخی مستند حوالوں سے قطعًا ثابت نہیں۔

سوال: ہمارے یہاں ایک نئی رسم چل نکلی ہے۔ کہ کسی آدمی یا عورت کا انتقال ہوتا ہے تو دوسرے دن اس گھر عورتوں کا درس قرآن ہوتا ہے اور قرآن بھی پڑھا جاتا ہے۔ کیا یہ از روئے کتاب وسنت صحیح ہے؟

جواب: مردے کے لئے قرآن خوانی کرانا کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔ صحیح حدیث ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْه فَهُوَرَدٌّ .» [1]

یعنی ''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

سوال: مردے کی تجہیز وتکفین کے بعد میت والے گھر میں جو ٹینٹ وغیرہ لگاتے ہیں اور پھر وہاں پر موجود لوگوں کو کھانا وغیرہ ملتا ہے۔ کیا اس کا قرآن وحدیث سے کوئی ثبوت موجود ہے؟

جواب: مردے کی تجہیز وتکفین کے بعد اہل میت کے ہاں اجتماع کا شرع میں کوئی ثبوت نہیں بلکہ حدیث جریر میں اس کو نوحہ کی قبیل سے شمار کیا گیا ہے۔ [2]

---

[1] (۳۹۶) صحیح البخاری، کتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا علی جور فالصلح مردود (۲۶۹۷).

[2] (۳۹۷) عن جریر بن عبدالله البجلی قال : کنا نری الاجتماع إلی أهل المیت وصنعة الطعام من النیاحة. صححه الإمام البوصیری علی شرط البخاری ......ومسلم ،مصباح الزجاجة(۱/۵۳۵)،ابن ماجه، کتاب الجنائز،باب ما جاء فی النهی عن الاجتماع إلی أهل المیت و صنعة الطعام (۱۶۱۲) وصححه الألبانی. أحمد (۲/ ۲۰۴) (رقم ۶۹۰۵-شاکر وصححه). فقه حنفی کی مشهور ومعروف کتاب فتح القدیر (۲/۱۵۱) میں ہے " هی بدعة قبیحة " ومال إلیه النووی فی شرح المنهاج (۵/۲۹۰)ط .مکتبةالإرشاد ،مکة.

سوال: محرّم یا غیر محرّم کے مہینے میں کالا لباس پہن کر نماز ادا ہو جائے گی یا نہیں؟ کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ سیاہ لباس دوزخی لوگوں کا لباس ہے۔

جواب: کالا لباس پہننے کا کوئی حرج نہیں بشرطیکہ غیر قوم سے مشابہت مقصود نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے کالی پگڑی پہنی ہے [1] اور ام خالد بنت خالد کو آپ ﷺ نے سیاہ کمبل پہنا کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ [2]

(بخاری ، باب الْخَمِيصَةِ السَّوْدَاءِ)

نیز ابوداوٗد اور نسائی وغیرہ میں حضرت عائشہ ؓ کا بیان ہے:

«صَنَعْتُ لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جُبَّةً مِنْ صُوفٍ سَوْدَاءَ فَلَبِسَهَا.» [3]

اہل نار کا لباس سیاہ ہوگا اس سلسلہ میں کوئی واضح نص نظر سے نہیں گزری نیز بعض لوگ جو ایام حزن میں سیاہ لباس پہنتے ہیں اس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔ یاد رہے عام حالات میں بلاشبہ سب سے بہتر لباس سفید ہے۔

سوال: آج کل دعوت ولیمہ آئے دن ہوتی رہتی ہے۔ وہاں ''نیدرہ'' لیا جاتا ہے۔ یعنی کھانا کھانے کے بعد راستے میں میز کرسی لگا کر لوگوں سے پیسے وصول کئے جاتے ہیں جو باقاعدہ لکھے جاتے ہیں۔ لوگ مجبوراً ۱۰۰/ سے ۵۰۰/۱۰۰۰ تک کچھ زیادہ دیکھا دیکھی دیتے ہیں۔ نہ دینے والے کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔

کیا یہ جائز ہے؟ کیا یہ صورت مذکورہ بالا ہونے پر بھی یہ ولیمہ ہے؟

جواب: مذکورہ بالا رسم کا شریعت میں کوئی وجود نہیں۔ لہٰذا اس سے بچنا چاہیے۔ البتہ حسب توفیق ولیمہ کرنا مسنون ہے۔ اضافی رسم کے باوجود ولیمہ کی شرعی حیثیت اپنی جگہ قائم و دائم ہے جو باعث اجر وثواب ہے۔ إن شاء اللہ. اسی طرح دعوت ولیمہ کھانے والوں سے رقم وصول کرنا بھی اخلاق کے مطابق نہیں؛ بلکہ یہ محض رواج ہے جسے مٹانے کی سعی کرنی چاہیے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام گانے کی طرز پر نعت یا نظم پڑھنے والے اور غیر محرم عورتوں کو قرآن پاک پڑھانے والے مردوں کے متعلق؟ آیا یہ دو شخص گنہگار ہیں یا ثواب کے حقدار ہیں؟

جواب: گانے بجانے کی طرز پر قرآن مجید یا نعت ونظم وغیرہ پڑھنا ممنوع ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے

---

[1] (۳۹۸) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب جواز دخول مکة بغیر إحرام (۳۳۰۹، ۳۳۱۰)، أحمد (۳۰۷/٤).

[2] (۳۹۹) صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب الخمیصة السوداء (ح:۵۸۲۳)

[3] (٤۰۰) أیضاً

ابلیس کو زجر و توبیخ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ ﴾ (بنی إسرائیل:٦٤)

''ان میں سے تو جسے بھی اپنی آواز سے بہکا سکے بہکا لے''

آواز سے مراد پر فریب دعوت یا گانے، موسیقی اورلہو ولعب کے دیگر آلات ہیں جن کے ذریعے سے شیطان بکثرت لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ (کتب تفسیر)

غیر محرم عورتوں کو پردے کے پیچھے سے تعلیم دینے کا کوئی حرج نہیں۔ بلکہ امام احمد، ابن عساکر، علامہ سیوطی اور خطیب بغدادی رحمہم اللہ جیسے اجلاّء نے عورتوں سے بھی تعلیم حاصل کی ہے۔

سوال: کیا عید میلاد النبی ﷺ جائز ہے؟

جواب: عید میلاد النبی ﷺ کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں، لہٰذا بدعت ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''[1] (صحیح بخاری)

سوال: کسی بھی آدمی کے فوت ہو جانے پر تین دن تک افسوس کے لئے بیٹھا جاتا ہے، اگر کوئی آدمی وہاں آ کر دعا مانگنے کو کہتا ہے اور ہاتھ اٹھا کر جو دعا مانگی جاتی ہے اس بارے میں رسول اکرم ﷺ کا طریقہ کار بتائیں۔ کیا ہاتھ اٹھا کر دعا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: فوت شدہ آدمی کی پس ماندگان سے تعزیت کرنا مسنون و مستحب ہے لیکن اس امر کے لئے حلقہ لگا کر بیٹھے رہنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ حدیث جریر بن عبداللہ میں اہل میت کے ہاں اجتماع کو نوحہ قرار دیا گیا ہے:

'' كُنَّا نَعُدُّ الْاِجْتِمَاعَ إِلَى أَهْلِ الْمَيِّتِ وَ صُنْعَةِ الطَّعَامِ بَعْدَ دَفْنِهِ مِنَ النِّيَاحَةِ. ''[2] (رَوَاهُ أحمد)

---

[1] (٤٠١) صحیح البخاری، کتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا علی جور فالصلح مردود (٢٦٩٧).

[2] (٤٠٢) عن جریر بن عبدالله البجلی قال: کنا نری الاجتماع إلی أهل المیت وصنعة الطعام من النیاحة. صححه الإمام البوصیری علی شرط البخاری ......ومسلم ،مصباح الزجاجة(١/٥٣٥)،ابن ماجه ،کتاب الجنائز،باب ما جاء فی النهی عن الاجتماع إلی أهل المیت و صنعة الطعام (١٦١٢) وصححه الألبانی. أحمد (٢/ ٢٠٤) (رقم ٦٩٠٥-شاکر وصححه). فقہ حنفی کی مشہور ومعروف کتاب ''فتح القدیر'' (٢/١٥١) میں ہے'' هی بدعة قبیحة '' ومال إلیه النووی فی شرح المنهاج (٥/٢٩٠)ط .مکتبة الإرشاد، مکة.

علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ حدیث جریر: "أَخْرَجَه أَيْضًا ابْنُ مَاجه وَ إِسْنَادُهُ صَحِيْحٌ" (نيل الأوطار:٤/ ١٠٤)

بسلسلہ دعا، مولانا محمد اسماعیل سلفی رقمطراز ہیں:

''موت کے بعد میت کے لئے دعا اور صدقہ یقیناً مفید ہیں، جنازہ خود میت کے لئے دعا ہے لیکن صدقہ اور دعا کے لئے کسی وقت کا تعین شرعاً ثابت نہیں۔ موت کے بعد میت کے گھر بیٹھ کر عموماً دعاؤں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ ہر آنے والا دعا کے لئے اس انداز سے درخواست کرتا ہے گویا وہ اپنی حاضری نوٹ کرا رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں دعا ختم ہو جاتی ہے اور حقہ اور گپوں کا دور شروع ہو جاتا ہے اور دعا کے وقت بھی دل حاضر نہیں ہوتا۔ حالانکہ دل کی توجہ دعا کے لئے ازبس ضروری ہے: ((لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْ قَلْبٍ لَاهٍ)) ❶ ''اللہ غافل دل کی دعا قبول نہیں کرتا۔'' میت کے لئے دعا ہر وقت بلا تخصیص کی جا سکتی ہے اور زندوں کی طرف سے یہی بہترین صلہ ہے جو میت کو دیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ سنت کے مطابق ہو۔ تعزیت کا مطلب گھر والوں کی تسکین ہے۔ دعا اگر مجلس کی بجائے انفراداً کی جائے تو دعا کا مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ غرض یہ تین دن کا جلسۂ دعائیہ سنت سے ثابت نہیں۔ ان مجالس میں حقہ اور بھی ان کے مقصد کو برباد کر دیتا ہے۔ (''الاعتصام'' گوجرانوالہ ۲۸ دسمبر ۱۹۵۱ء)

سوال: قطبی ستارے کی دین اسلام میں کیا اہمیت ہے؟ کچھ لوگ قطبی ستارے کی وجہ سے شمال کی جانب پاؤں نہیں کرتے کہ اس ستارے میں نبی کریم ﷺ کا نور رہا ہے۔

جواب: اسلامی شریعت میں قطبی ستارے کی کوئی اہمیت ہے اور نہ کوئی امتیاز، رسول اللہ ﷺ کے نور کو ایک تارے میں محصور قرار دینا جہلاء اور نادانوں کی کہاوت ہے۔ شرع میں اس کی کوئی اصل نہیں۔ جاہلانہ اعتقاد تو اس حد تک ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق سے ستر ہزار سال قبل آپ ﷺ کا نور اس میں موجود تھا سوال یہ ہے کہ کائنات کی پیدائش سے پہلے یہ ستارہ کہاں تھا؟ جب کہ کتاب و سنت اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ان اشیاء کا وجود بعد از ارض و سماء معرض وجود میں آیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَ جَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِّلشَّيَاطِينِ ﴾ (الملك:٥)

---

❶ (٤٠٢) صححه الألباني: ((واعلموا أن الله لا يستجيب دعاءً من قلب غافل لاهٍ)) صحيح الترمذي، أبواب الدعوات، رقم الباب (٦٦) ح (٣٧٢٥)، الصحيحة (٥٩٤).

''اور ہم نے قریب کے آسمان کو (تاروں کے) چراغوں سے زینت دی اور ان کو شیاطین کے مارنے کا آلہ بنایا۔''

مزید آنکہ وہ روایات جن میں یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے سب سے پہلے نبی ﷺ کے نور کو پیدا کیا اور تمام کائنات کو اس نور سے بنایا اور یہ کہ اے جابر رضی اللہ عنہ! اللہ نے اشیاء سے قبل تیرے نبی ﷺ کا نور پیدا کیا۔ یہ سب باطل من گھڑت اور وضعی ہیں۔[1] ملاحظہ ہو :(کِتَابُ الْآثارِ المرفوعةِ فِي الْأَخبَارِ الْمَوْضُوعَةِ لمولانا عبدالحی حنفی اور الحاوی لِلْفَتَاوىٰ للسیوطی)

باعث تعجب بات یہ ہے کہ ایک طرف نبی ﷺ کے نور کو اللہ کا جز قرار دیا جاتا ہے جب کہ دوسری جانب اس پر خلق (مخلوق ہونا) کا اطلاق ہے جو واضح تضاد بیانی کے علاوہ ذات باری تعالیٰ میں نقص کو بھی مستلزم ہے جس کا عوام کو ذرہ برابر شعور ہے اور نہ سمجھ (عَافَانَا اللّٰهُ مِنْ هٰذِهِ الْعَقِيْدَةِ الْبَاطِلَةِ).

اصل بات یہ ہے کہ شرع میں جہاں کہیں رسول اللہ ﷺ پر نور کا اطلاق ہوا ہے اس سے مراد نور ہدایت ہے چنانچہ مولوی نعیم الدین مراد آبادی بریلوی زیر آیت :﴿ قَدْ جَاءَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ ﴾ (المائدۃ:۱۵) لکھتے ہیں:

''سید عالم ﷺ کو نور فرمایا گیا۔ کیونکہ آپ سے تاریکیٔ کفر دور ہوئی اور راہ حق واضح ہوئی۔''

(خَزَائِنُ الْعِرْفَان فِي تَفْسِيرِ الْقُرآن ص ۱۳۰)

سوال: مقلد حضرات :﴿ اِتَّخَذُوْا أَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ (التوبۃ:۳۱) کے شرک میں ملوث ہیں۔ کیونکہ ایک طرف حدیث نبوی ﷺ ہوتی ہے اور دوسری طرف امام کا قول ہوتا ہے۔ حدیث کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور امام کے قول پر عمل کرتے ہیں۔ براہ مہربانی وضاحت کریں کہ کیا یہ شرک نہیں؟ اگر ہے تو پھر ان کے پیچھے نماز کا جائز ہونا کیسا ہے؟

جواب: تقلید شخصی کو واجب سمجھنے والا اور امام کے قول کے مقابلہ میں کتاب و سنت کو علی الاعلان رد کرنے والا واقعی مشرک فی الرسالۃ ہے۔

---

[1] (٤٠٤) ......قال ابن جوزی والسیوطی والشوکانی والألبانی:" هذا حديث موضوع ".الفوائد المجموعة (١٠١٣) تذكرة الموضوعات(٨٦)اللؤلؤ المرصوع(٤٥٣)المشتهر(١٣)كشف الخفاء (١٦٤/٢) (٢١٢٣) الضعيفة (٢٩٩/١، ٣٠٠)موسوعة الأحاديث والآثار الضعيفة والموضوعة (٣٦٧/٨، ٣٦٨) وهذا الحديث مخالف للقرآن الكريم والحكيم وقال تعالى:﴿وما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون﴾.

حنفی فقیہ کرخی رحمہ اللہ کا قول معروف ہے۔قرآن کی ہر وہ آیت جو ہمارے ائمہ کے قول کے خلاف ہو گی یا تو ہم اسے منسوخ قرار دیں گے یا اس کی تطبیقی تاویل کریں گے۔ (اصول کرخی) نیز فرمایا ہر وہ حدیث جو ہمارے اماموں کے خلاف پڑتی ہے ہم اس کو منسوخ قرار دیں گے یا اس کا معارض تلاش کریں گے یا اس کی ہمیں ایسی توجیہ کرنی ہو گی جس سے ہمارا مسلک محفوظ ہو جائے۔ (اصول بزدوی)

مولانا محمودالحسن کا طرز عمل بھی ملاحظہ فرمائیں۔تقریر ترندی میں حدیث :((اَلْبَیِّعَانُ بِالْخِیَارِ)) پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔حق اور انصاف یہی ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک راجح ہے۔ بایں ہمہ ہم چونکہ حنفی مقلد ہیں اس لئے (احادیث صحیحہ اور نصوص کے علی الرغم) ہم پر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تقلید واجب ہے۔[1]

ایسے متعصب کی اقتداء میں نماز کسی صورت میں درست نہیں۔ اور اگر کوئی امام بظاہر تقلید کے باوجود کتاب وسنت کی نصوص کو فوقیت دینے والا ہو۔ اس کی اقتداء میں نماز تو ہو جائے گی لیکن اسے مستقل امام نہیں بنانا چاہیے۔ کیونکہ تقلیدی عمل بدعت ہے۔

اور جہاں تک بعض محدثین کا بعض ائمہ کی طرف انتساب ہے، سو یہ تقلید کی وجہ سے نہیں۔ یہ تو محض اصول اجتہاد میں موافقت کی بناء پر ہے۔

سوال: اگر کوئی آدمی فوت ہو جائے تو پھر جب کوئی اس کا افسوس اور تعزیت کرنے آئے تو کیا میت کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا درست ہے یا نہیں؟

جواب: شریعت میں مروجہ فاتحہ خوانی کا کوئی ثبوت نہیں۔ حقہ کی مجلس سجی ہو۔ لوگ ادھر ادھر کی باتیں ہانک رہے ہوں۔ ہر آنے والا التماس کرتا ہے۔ پڑھو فاتحہ منٹوں سیکنڈوں میں فارغ کر کے بلا وقفہ حقے کا دور جاری رکھا جاتا ہے۔ احادیث سے تو معلوم ہوتا ہے جس منہ سے پیاز وغیرہ کی بدبو آ رہی ہو فرشتے قریب نہیں پھٹکتے۔ پھر کیا خیال ہے ایسی بدبودار مجلس میں رحمت کے فرشتوں کی آمد ممکن ہے؟ جواب یقیناً نفی میں ہے۔ پھر اصل اختلاف موجود مجلس کی ہیئت ترکیبی پر ہے۔ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے کسی عزیز کی وفات پر تین دن کا جلسہ دعائیہ جما کر بیٹھا کرتے تھے جب کہ بعض روایات میں اس کو نوحہ قرار دیا گیا ہے۔ جہاں تک میت کے لئے دعائے مغفرت سو یہ غیر متنازع امر ہے۔ سبھی اس بات کے قائل ہیں کہ دعا ہونی چاہیے جس طرح کہ کئی ایک احادیث اور قرآنی آیات:

---

[1] (٤٠٥) وقال :الحق والإنصاف أن الترجيح للشافعي في هذه المسئلة و نحن مقلدون يجب علينا تقليد إمامنا أبي حنيفة . التقرير للترمذي (ص٣٦) ط. سعيد ايچ ايم كمپنى كراچى.

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ ﴾ (الحشر:۱۰)

میں تصریح ہے۔ ابو عامر کے لئے رسول اللہ ﷺ نے باوضو ہاتھ اٹھا کر دعا کی تھی جس طرح کہ تفصیلی قصہ صحیحین وغیرہ میں موجود ہے [1] اور تعزیت بھی مسنون ہے جس کے لئے جگہ اور وقت کی کوئی حد بندی نہیں محل نظر صرف مروجہ طریقہ ہے جو درست نہیں۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گاؤں میں جو شادی بیاہ ہوتے ہیں لڑکا بارات لے کر سر پر سہرا باندھ کر اور ہاتھوں میں ۲ عدد گانے باندھ کر آتا ہے جب نکاح پڑھانے کے لئے مولوی صاحب سے کہا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں پہلے سر سے سہرا اور چادر لال (جسے چنی کہتے ہیں) اور گانے اتار پھر نکاح پڑھاؤں گا۔ بعض لڑکے والے سہرا چنی چادر اتار دیتے ہیں اور اہل حدیث مولوی نکاح پڑھا دیتے ہیں اور بعض مولوی صاحب نہ اتارنے کی صورت میں نکاح نہیں پڑھاتے۔ کیا سہرا بندھا رہے تو نکاح پڑھنا درست ہے یا سہرا چنی چادر وغیرہ اتار کر نکاح پڑھا لیا جائے اگر دولہا کے وارث بضد ہوں کہ ہم سہرا نہیں اتاریں گے۔ لڑکے کا نکاح پڑھاؤ کیونکہ ہماری عزت کا مسئلہ ہے۔ اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب: دولہا کو گانا، سہرا باندھنا یا اس پر چنی وغیرہ ڈالنا سب ہندوانہ رسوم ہیں۔ ایک مسلمان کے لائق نہیں ہے کہ غیر مسلموں کے عادات و تقالید کو اپنائے حدیث میں ہے:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ .» [2]

اہل علم کا فرض ہے کہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اس قسم کی خلاف شرع قباحتوں اور برائیوں سے عامۃ الناس کو آگاہ کریں تاکہ وہ ان کے برے اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔ بوقت عقد نکاح اگر کسی ایسے شخص سے واسطہ پڑ جائے جو اس فعل کا مرتکب ہو تو اسے بطریق احسن سمجھانا چاہیے۔ شاید کہ نصیحت اس کے لئے نفع بخش ثابت ہو۔ اور اگر وہ اپنے فعل قبیح پر بضد ہو اور نکاح نہ پڑھانے سے اس پر اثر ہو سکتا ہو تو نہیں پڑھانا چاہیے۔ بصورت دیگر اصلاح احوال کی بجائے الٹے اثرات کا خدشہ ہو تو چلو کم از کم گانا، سہرا چنی وغیرہ اتروا کر نکاح کر دیا جائے شاید کہ اسے شرم آ جائے۔ اور اگر کوئی پھنسا ہو مجبوراً اتنا بھی نہ کر سکے تو بہر صورت نکاح

---

[1] (٤٠٦) صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب في إغماض الميت والدعاء له (٢١٣٠)، المشكاة (١٦١٩).

[2] (٤٠٧) حسنه وصححه الألباني، صحيح أبي داؤد، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة (٤٠٣١)، الارواء (١٢٦٩)، المشكاة (٤٣٤٧).

منعقد ہو جائے گا۔ اگرچہ فعل ہذا مستحسن نہیں ہے۔

سوال: ماہ محرم خصوصاً یکم محرم تا ۱۰ محرم میں عام طور پر بیاہ شادی نہیں کی جاتی۔ کیا اس کی کوئی شرعی حیثیت ہے؟ دیگر یہ کہ شہادت امام حسین رضی اللہ عنہ کے بعد کن کن صحابہ رضی اللہ عنہم تابعین، تبع تابعین وائمہ کرام، فقہاء اور علمائے کرام کی شادیاں اس ماہ میں ہوئیں؟

جواب: ماہ محرم میں شادی کرنا، کتاب و سنت میں منع کی کوئی دلیل نہیں۔ یہ صرف جہلائے امت کا من گھڑت خودساختہ مسئلہ ہے، تاریخی شہادتوں سے یہ بات مسلمہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے بہت عرصہ قبل حسین رضی اللہ عنہ کے نانا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر شریعت مکمل ہو چکی تھی جس میں یہ نوید سنائی گئی تھی: ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ﴾ (المائدة:٣) لہٰذا عرصہ بعد اس میں تغیر و تبدل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بعض اقوال کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے یکم محرم کو ہوا تھا۔ ملاحظہ ہو: (الإصابة)

باقی رہا شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد کن صحابہ یا ائمہ کی شادیاں محرم میں ہوئی تھیں ان تاریخی واقعات کو جمع کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ دور تکمیل شریعت کا ہے۔ نہ کہ تجدید شریعت کا۔

موضوع ہذا پر میرا ایک تفصیلی فتویٰ ہفت روزہ ''تنظیم اہل حدیث'' لاہور میں کچھ عرصہ قبل شائع ہو چکا ہے۔ جس کا عنوان ہے'' کیا محرم میں شادی کرنا منع ہے''؟

سوال: نکاح کے موقع پر سہرا یعنی نظم پڑھنا کیسا ہے؟

جواب: نکاح کے موقعہ پر گانا سہرا اور دولھے کا لوہے کی چھڑی ہاتھ میں لے کر چلنا سب ہندوانہ رسمیں ہیں ان سے اجتناب ضروری ہے اور مباح اشعار میں کوئی حرج نہیں۔

سوال: شریعت میں شادی کی تقریب کیسے منانے کا حکم ہے؟

۱- کیا لڑکی کو جہیز دینا جائز ہے؟

۲- کیا لڑکی والے بارات کے لئے کھانا وغیرہ پکا سکتے ہیں؟

۳- کیا بارات میں تین سے زیادہ آدمی شرعاً جا سکتے ہیں؟

۴- کیا بینڈ باجے وغیرہ اور دولہا کے ہار وغیرہ پہن لینے سے نکاح اور پکا ہوا کھانا حرام ہو جاتا ہے اور شادی میں شریک لوگوں کے ایمان پر اس کا اثر پڑتا ہے؟

جواب: ①...... جہیز کے بارے میں مولانا عبدالسلام بستوی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں: اگر استطاعت ہے تو حسب توفیق لڑکی کو کچھ ضروری سامان دے دینا چاہیے۔ تاکہ وہ اپنے خاوند کے گھر ان کو برت سکے۔ جس کو اصطلاح

میں جہیز کہتے ہیں۔ یہ سنت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

" جَهَّزَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ فِيْ خُمَيْلٍ وَ قِرْبَةٍ وَ وِسَادَةِ أُدُمٍ حَشْوُهَا إِذْخِرٌ۔" ❶ (اَلْبِدَايَةُ وَالنِّهَايَةُ)

"رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے جہیز میں یہ چیزیں عنایت فرمائی تھیں۔ ایک چادر حاشیہ دار اور ایک مشک اور چمڑے کا تکیہ جس کا بھراؤ اذخر گھاس کا تھا۔"

اور ایک پلنگ اور ایک پانی کا گھڑا اور ایک چکی اور چاندی کے دو بازو بند کا دینا بھی بعض روایتوں میں آیا ہے اور ریا نمود کے لئے جہیز دینا جائز نہیں۔ اسلامی خطبات، حاشیہ (۱)......(۳۸۵/۲)

اور مولانا سیالکوٹی مرحوم فرماتے ہیں: کتنی سادہ، سہل اور آسان شادی کر کے دکھائی جناب سید الکونین والثقلین نے اپنی صاحبزادی کی کہ امت کے لئے نمونہ ہو جس میں نہ منگنی کی مسرفانہ رسمیں ہیں، نہ شادی کی قباحتیں ہیں، نہ مہر کا پہاڑ ہے، لیکن آج کا مسلمان ہے کہ جب تک وہ منگنی کی رسوم کا اسیر اور شادی کے رواجوں کا پابند ہو کر دیوالیہ نہ ہو جائے اس وقت تک اس کے منہ پر ناک دکھائی نہیں دیتی اور اس جان لیوا مرض میں سب ہی مبتلا ہیں۔ بس نہیں چلتا۔ رواج کا قاتل خنجر بکف سر پر کھڑا ہے۔ کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ حالانکہ دین اور دین کے اوامر و احکام سب آسان اور سہل ہیں۔ (اصلاح معاشرہ: ۲۵۳)

② .....لڑکی والوں کا بارات کے لئے کھانا تیار کرنا محض ضیافت عامہ کی قبیل سے ہے۔ اس کا نفس نکاح سے کوئی تعلق نہیں۔ شیخ محدث روپڑی ایک سوال کے جواب میں رقمطراز ہیں: نجاشی نے ام حبیبہ کا نکاح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پڑھا۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تھے حبشہ سے رخصت کر کے رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیج دیا۔ ❷ (مشکوٰۃ، بَابُ الصَّدَاقِ)

اس سے معلوم ہوا بارات ضروری نہیں لیکن کسی روایت میں منع بھی نہیں آئی۔ اس لئے اگر لڑکے کے ساتھ ضروری آدمی لڑکی کو لینے کے لئے چلے جائیں تو کوئی حرج نہیں، مگر اب جو رواج ہو گیا کہ بہت سے

---

❶(٤٠٨) أحمد ٨٤/١رقم(٦٤٣،٧١٥،٨٣٨،٨٥٣)لأحمد شاكر وقال :إسناده صحيح وهكذا قال الأرنؤوط في تحقيقه على مسند الإمام أحمد .الحاكم ١٨٥/٢(٢٧٥٥) صححه ووافقه الذهبي. دلائل النبوة للبيهقي (١٦٠/٣) وقال محققه: "صحيح."

❷(٤٠٩) صححه الألباني،صحيح أبي داؤد، كتاب النكاح، باب الصداق (٢١٠٧) ،النسائي ،باب القسط في الأصدقة (٣١٤٢) ،المشكاة (٣٢٠٨). واسم أم حبيبة رملة بنت أبي سفيان(عون)

آدمی ناموری کے لئے جاتے ہیں اور فضول خرچی کرتے ہیں یہ جائز نہیں اور چونکہ دلہن کے لینے کے لئے جو ضروری آدمی جاتے ہیں وہ مہمان ہوتے ہیں۔ ان کا کھانا بحیثیت مہمان ہونے سے اس کے ذمہ ہے جس کے مہمان ہیں۔ یعنی لڑکی والوں کے مہمان ہیں۔ انہی کے ذمہ ان کا کھانا ہے اس کھانے کو شادی یا نکاح کا کھانا نہیں کہنا چاہیے بلکہ عام مہمان نوازی ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک مہمان نوازی ہے۔ ہاں دلہن کو گھر میں لاکر جو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ یہ بے شک شادی یا نکاح کا کھانا ہے جسے ولیمہ کہتے ہیں۔ یہ بے شک اس موقع پر سنت ہے حسب طاقت کھلانا چاہیے۔ (فتاوی اهل حدیث (۱۶۰/۳)

بعض اہل علم نے آج کل کے عمومی تصور بارات کو آیت کریمہ: ﴿ لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ ﴾ کے تحت شامل کرنے کی سعی کی ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب: (نُزُلُ الْأَبْرَارِ فِيْ فِقْهِ النَّبِيِّ الْمُخْتَارِ، كِتَابُ النِّكَاحِ)

واضح ہو کہ موجودہ حالات میں عموماً لوگ باراتوں پر جو فضول خرچی اور اسراف کرتے ہیں وہ یقیناً اس زمرہ میں شامل ہیں تاہم سادگی سے اگر بعض حضرات لڑکی کو لینے کے لئے چلے جائیں تو بظاہر اس میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔

③..... بارات میں شرکت کرنے والوں کا شرع میں کوئی عدد متعین نہیں۔ حسب ضرورت افراد دلہن کو لینے کے لئے جا سکتے ہیں۔

④..... شادی بیاہ کے موقعہ پر بینڈ باجے وغیرہ بجانا ہندوانہ رسوم ہیں جن سے اجتناب ضروری ہے۔ تاہم ان افعال کے ارتکاب سے نہ کھانا حرام ہوتا ہے اور نہ کوئی کافر بنتا ہے اور جہاں تک ہار کا تعلق ہے سو اس کا پہننا بھی کراہت سے خالی نہیں۔

سوال: دفع بلا یا برکت کی نیت سے بخاری شریف کی تلاوت کرنا سنت ہے یا بدعت؟

جواب: بخاری شریف کی قراءت رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر ہونی چاہیے۔ دفع بلا یا برکت وغیرہ اس کے ثمرات میں سے ہے۔

سوال: ختم قرآن، ختم بخاری شریف وغیرہ یا کسی کتاب کی تکمیل پر جشن منانا اور کھانا کھلانا کیسا ہے؟

جواب: بعض تفسیروں میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ''سورۃ البقرۃ'' ختم کی تو دس اونٹ راہ اللہ ذبح کر ڈالے [1] اس سے معلوم ہوا کسی دینی کتاب کے اختتام پر کھانا کھلانا یا شیرینی وغیرہ بانٹ دی جائے تو کوئی

---

[1] (٤١٠) البيهقى (٣٣١/٢) (١٩٥٧) (الشعب) فصل فى تعليم القرآن.

حرج نہیں کسی حد تک یہ شے طبعی اور قدرتی خوشی میں بھی داخل ہے۔ البتہ اس فعل کو ضروری سمجھ کر اس کا اہتمام والتزام کرنا سلف سے ثابت نہیں۔ (وَاللّٰہُ أَعْلَمُ)

سوال: نئے سال کے آغاز پر تقریر کرنا یا نظم و مقالہ شائع کرنا کیسا ہے؟

جواب: ایسا اہتمام کتاب و سنت سے ثابت نہیں۔

سوال: چونکہ آج کل ختم کا رواج عام ہے جو مؤحد کہلواتے ہوئے بھی کھا جائے اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: ختم اور چالیسویں وغیرہ دین میں بدعی اضافہ ہیں۔ جن سے اجتناب ضروری ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

« مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَالَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » ❶

یعنی ''جس نے دین میں نئی شے ایجاد کی وہ مردود ہے۔''

اہل حدیث کہلاتے ہوئے اگر کسی نے ختم والی شے کھا پی لی ہے، تو اسے اپنے فعل پر نادم اور خالق و مالک کی بارگاہ میں تائب ہونا چاہیے۔ حدیث میں ہے:

«اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ .» ❷

عدم ندامت اور عدم توبہ کی صورت میں اس کی شخصیت اہل بدعت میں اضافہ کا موجب ہوگی۔

سوال: میں نے اکثر جگہوں پر کچھ کلمات لکھے ہوئے دیکھے اور اب بھی دیکھتا ہوں جو درج ذیل ہیں۔ جس نے گلے میں تعویذ لٹکایا اس نے شرک کیا۔ اور ساتھ یہ حدیث لکھی ہوتی ہے :«مَنْ تَعَلَّقَ تمِيمةً فَقَد أَشْرَكَ». (مسند أحمد) گذارش ہے کہ یہ صحیح ہے یا غلط یا حدیث مذکور کا درجہ کیا ہے۔ اگر اس کا ذکر کہیں نہ ہو تو بھی درخواست ہے کہ گلے میں تعویذ پہننا کیسا ہے؟

جواب: جہاں تک حدیث مذکور کا تعلق ہے تو وہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مسند احمد میں مروی ہے ملاحظہ ہو: ❸ (الفتح الربانی: ۱۸۷/۱۷) مسند احمد کے مبوب اور شارح علامہ ساعاتی مصری نے اس کے رجال کے بارے میں کہا ہے کہ "رِجَالُهٗ ثِقَاتٌ" (اس کے راوی ثقہ ہیں)

اب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ تمیمہ کا صحیح مفہوم اور مطلب کیا ہے، اس سلسلے میں ائمہ لغت و شارحین حدیث

❶(٤١١) صحيح البخارى، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود(٢٦٩٧).

❷(٤١٢) صحيح ابن ماجه، كتاب الزهد باب ذكر التوبة (٤٢٥٠) والضعيفة ٨٣/٢(٦١٥) حسنه الألبانى وقال...... حسنه ابن حجر.

❸(٤١٣) صححه الألبانى.أحمد ١٥٦/٤(١٧٣٥٣)وقال محققه حمزة :إسناده حسن.الحاكم ٢١٩/٤ (٧٥١٣) سكت عنه الذهبى.الصحيحة(٤٩٢).قال الإمام البيهقى رحمه الله:والتميمة يقال:إنها خرزة كانوا يتعلقونها (٣٥٠/٩) السنن الكبرى).

کے چند اقوال حسب ذیل ہیں۔

تمیمہ کا معنی منکا لکھا ہے۔ چنانچہ امام ابن اثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" اَلتَّمَائِمُ جَمْعُ تَمِيْمَةٍ وَهِيَ خَرَزَاتٌ "(النهاية: ١٩٨/١)

''تمائم تمیمہ کی جمع ہے اور اس کے معنی منکے کے ہیں۔''

اور کتاب ''لسان العرب'' میں ابومنصور سے منقول ہے:

" اَلتَّمَائِمُ وَاحِدَتُهَا تَمِيْمَةٌ وَهِيَ خَرَزَاتٌ " (لسان العرب ٧/١٢)

''تمائم کا مفرد تمیمہ ہے اور وہ منکوں کا نام ہے۔''

اسی طرح ''فتح المجید'' میں علامہ خلخالی رحمہ اللہ کا قول ہے:

" وَهِيَ مَا يُعَلَّقُ بِأَعْنَاقِ الصِّبْيَانِ مِنْ خَرَزَاتٍ وَ عِظَامٍ " (ص٢٧)

''تمیمہ ان ہڈیوں اور منکوں کا نام ہے جو بچوں کے گلے میں لٹکائی جاتی ہیں۔''

نیز ''لسان العرب'' میں ہے:

" وَ لَمْ أَرَ بَيْنَ الْأَعْرَابِ خِلَافًا أَنَّ التَّمِيْمَةَ هِيَ الْخَرَزَةُ نَفْسُهَا " (٧٠/١٢)

''مجھے اعراب میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں ہو سکا کہ تمیمہ فی نفسہ منکوں کو کہا جاتا ہے۔''

اور یہی مذہب ائمہ لغت کا بھی ہے۔

واضح ہو کہ اہل جاہلیت یہ فعل اس لئے کرتے تھے تاکہ اپنی اولاد کو نظر بد سے محفوظ رکھ سکیں۔ چنانچہ ''المنجد'' میں ہے:

" كَانَ الْأَعْرَابُ يَضَعُوْنَهَا عَلٰى أَوْلَادِهِمْ لِلْوِقَايَةِ مِنَ الْعَيْنِ وَ دَفْعِ الْأَرْوَاحِ. "

''اعراب اپنی اولاد کو نظر بد اور بد روحوں سے بچاؤ کی خاطر ان کے گلے میں تمیمہ لٹکاتے تھے۔''

امام ابن اثیر رحمہ اللہ مسئلہ ہذا کی مزید وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

" كَأَنَّهُمْ يَعْتَقِدُوْنَ أَنَّهَا تَمَامُ الدَّوَاءِ وَالشِّفَاءِ وَإِنَّمَا جَعَلَهَا شِرْكًا لِأَنَّهُمْ أَرَادُوْا بِهَا دَفْعَ الْمَقَادِيْرِ الْمَكْتُوْبَةِ عَلَيْهِمْ فَطَلَبُوْا دَفْعَ الْأَذٰى مِنْ غَيْرِ اللّٰهِ الَّذِىْ هُوَ دَافِعُهٗ. "

(النهاية: ١٩٨/١)

''گویا کہ ان کا یہ عقیدہ تھا، تمیمہ ہی مکمل دوا اور شفاء ہے۔ اور اس تمیمہ کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا۔

انہوں نے چاہا کہ تمیمہ کے ذریعے لکھی ہوئی تقدیر کو محو کر دیں۔ اور بیماریوں کے ازالہ کے لئے غیراللہ کا سہارا ڈھونڈا۔ حالانکہ صرف رب العزت ہی تکالیف کو دور کرنے والا ہے۔''

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" اَلتَّمَائِمُ جَمْعُ تَمِيْمَةٍ وَّهِيَ خِرْزٌ أَوْ قِلَادَةٌ تُعَلَّقُ فِي الرَّأْسِ، كَانُوْا فِي الْجَاهِلِيَّةِ يَعْتَقِدُوْنَ أَنَّ ذٰلِكَ يَدْفَعُ الْآفَاتِ ." (فتح الباری: ۱۹٦/۱۰)

''تمائم تمیمہ کی جمع ہے اور وہ منکے یا ہار ہے جسے سر میں لٹکایا جاتا ہے۔ جاہلیت میں لوگوں کا اعتقاد تھا کہ اس سے مصائب رفع ہو جاتے ہیں۔''

اہل فن کی تشریحات کی روشنی میں: « مَنْ تَعَلَّقَ تَمِيْمَةً فَقَدْ أَشْرَكَ » کا مفہوم بھی واضح ہو گیا کہ مقصود اس سے مذکورہ معتقدات کی تردید ہے۔ نہ کہ معروف تعویذات، جن میں جاہلیت والے مشرکانہ تصورات نہیں ہوتے۔

علامہ البانی رحمہ اللہ نے "سلسلة الاحاديث الصحيحة" میں صاحب ''دلائل الخیرات'' کا رد کیا ہے جس نے تمیمہ کی تعریف میں قرآنی آیات یا اسمائے الٰہی پر مشتمل مرقوم تعویذات کو داخل کیا ہے۔

قرآنی آیات اور اسماء اللہ الحسنٰی پر مشتمل تعویذ لٹکانے کے بارے میں سلف اور خلف کا ہمیشہ سے اختلاف چلا آ رہا ہے کچھ منع کے قائل ہیں اور دیگر نے جواز کا فتوٰی دیا ہے۔

چنانچہ ''فتح المجید'' میں ہے:

" لٰكِنْ إِذَا كَانَ الْمُعَلَّقُ مِنَ الْقُرْآنِ فَرَخَّصَ فِيْهِ بَعْضُ السَّلَفِ وَ بَعْضُهُمْ لَمْ يُرَخِّصْ فِيْهِ." (۱/ ۳۹۲)

''لیکن لٹکی ہوئی شے جب قرآنی آیات پر مشتمل ہو تو بعض سلف نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور بعض نے ناجائز۔''

اس سے معلوم ہوا متنازعہ فیہ شی صرف جواز عدم جواز ہے نہ کہ جواز کا معتقد و عامل مشرک ہے۔ شرک کا فتوٰی صادر کرنے سے پہلے قائلین بالجواز سلف کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے:

مَنْ كَانَ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْ مَاتَ......الخ

البتہ دلائل کی رو سے میرے نزدیک محقق مسلک یہی ہے کہ تعویز گنڈے سے مطلقاً احتراز کیا جائے اور

صرف ثابت شدہ دم پر اکتفا کیا جائے۔ وَاللّٰہُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ .

سوال: بعض عورتیں اپنے ملنے جلنے والیوں اور محلّہ والیوں کو اکٹھی کر کے قرآن پاک پڑھواتی ہیں یعنی قرآن خوانی کرواتی ہیں۔ جو کام رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا اور نہ اس کے کرنے کا حکم دیا ہو وہ دین میں پیدا کرنا کیا بدعت نہیں ہے؟

جواب: عورت کے لئے تلاوت قرآن مجید کا بہترین محل و مقام اس کا اپنا گھر ہے کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے فریضۂ نماز کی ادائیگی کے لئے عورت کا اپنا گھر افضل ترین قرار دیا ہے۔

« بُيُوتُهُنَّ خَيْرٌ لَّهُنَّ » [1] (رواہ ابوداؤد)

جہاں نماز بہتر ہے وہاں تلاوت بھی بہتر ہے۔

سوال: اسی طرح اگر کوئی مصیبت آ جائے یا کوئی اور وجہ ہو تو آیت کریمہ پڑھواتی ہیں۔ کیا آیت کریمہ کا پڑھوانا جائز ہے؟

جواب: آیت کریمہ: ﴿ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ کا ورد وظیفہ اکیلے صاحب حاجت و ضرورت کو ہی کرنا چاہیے۔ دوسروں سے کرانے کا کوئی ثبوت نہیں۔

یاد رہے کہ اس وظیفہ کے لئے شریعت میں نہ کوئی وقت مقرر ہے اور نہ دن کا تعین اور نہ کوئی گنتی کی حد بندی۔ جس طرح کے بعض لوگوں نے اختراعی طریقے ایجاد کر چھوڑے ہیں۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

« مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ . » [2]

یعنی ”جس نے دین میں اضافہ کیا وہ مردود ہے۔“

سوال: ۲۲ رجب کو بعض لوگ کونڈے دیتے ہیں۔ یہ کب اور کس تاریخ سے ایجاد ہوئے ان کی اصل کیا ہے۔ نیز ان کا شرعًا کیا حکم ہے؟

جواب: ۲۲ رجب کے کونڈوں کے سلسلے میں ایک جعلی فرضی اور بے بنیاد حکایت بیان کی جاتی ہے۔ جس کو منشی جمیل احمد جمیل نے اپنے منظوم کلام میں بڑے مزے لے کر بیان کیا ہے کہ مدینہ میں ایک لکڑ ہارے کو فقر و فاقہ

---

[1] (٤١٤) صححه الحاكم والذهبی وأحمد شاكر والألبانی والنووی كما فی الإرواء.صحيح أبی داؤد، كتاب الصلاة،باب ما جاء فی خروج النساء إلى المسجد (٥٦٧). والإرواء (٥١٥). أحمد (٧٦/٢، ٧٧) (٥٤٦٨، ٥٤٧١)- شاكر).الحاكم(٢٠٩/١).

[2] (٤١٥) صحيح البخاری، كتاب الصلح،باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود(٢٦٩٧).

نے آ گھیرا۔ اور وہ گھر بار کو خیر باد کہہ کر مارے مصیبت کے بارہ سال تک دردر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ دوسری طرف اس کی بیوی نے مدینے میں ایک وزیر کے محل میں ملازمت اختیار کر لی۔ ایک روز یہاں محل کے سامنے سے حضرت جعفر صادق کا اپنے مصاحبوں کے ہمراہ گزر ہوا۔ اس وقت یہ عورت جھاڑو دے رہی تھی۔ دریافت فرماتے ہیں۔ آج کونسی تاریخ ہے۔ عرض کیا جاتا ہے کہ رجب کی بائیسویں تاریخ ہے۔ فرمایا اگر کسی حاجت مند کی حاجت پوری نہ ہوتی ہو۔ مشکل میں پھنسا ہوا ہو۔ مشکل کشائی نہیں ہو رہی۔ تو اس کو چاہیے کہ نئے کونڈے لائے اور ان میں پوریاں بھر کر میری فاتحہ پڑھے۔ پھر میرے وسیلے سے دعا مانگے۔ اگر اس کی حاجت روائی اور مشکل کشائی نہ ہوئی تو وہ قیامت کے روز میرا دامن پکڑ سکتا ہے۔

مذکورہ عورت نے اس ورد کے مطابق عمل کیا اس کے نتیجہ میں خاوند ایک مدفون خزانہ لے کر واپس آ گیا۔ فقر و فاقہ کے دن امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ میں بدل گئے۔ ہمارے معزز و مکرم دوست مولانا فضل الرحمن اپنے کتابچہ ''رجب کے کونڈے'' میں تفصیلی کہانی کے اختتام پر رقمطراز ہیں:

''یہ ایک من گھڑت قصہ ہے کہ اس کی کوئی سند نہیں۔ کسی بھی مستند کتاب میں یہ منقول نہیں۔ اس کے جھوٹے ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مدینہ طیبہ میں نہ کبھی کوئی بادشاہ ہوا اور نہ ہی کوئی وزیر حضرت جعفر صادق کی پیدائش ایک روایت کے مطابق ''۸ رمضان ۸۰ ھ میں ہوئی اور دوسری کے مطابق ۷ ربیع الاول ۸۳ ھ میں ہوئی۔ ان کی وفات پر اتفاق ہے کہ ۱۵ شوال ۱۴۸ ھ میں ہوئی۔ ان کی عمر عزیز کے تقریباً ۵۲ سال خلفائے بنی امیہ کے عہد میں گذرے جن کا دارالخلافہ دمشق تھا۔ باقی سال بنو عباس کے دور خلافت میں گزرے جنہوں نے بغداد کو اپنا دارالخلافہ بنا لیا تھا۔ معلوم ہوا کہ ۲۲ رجب (حضرت جعفر صادق کا یوم پیدائش ہے اور نہ ہی یوم وفات) درحقیقت اہل تشیع کے ہاں اس دن کاتب وحی اور ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات پر خوشی منائی جاتی ہے۔ جب اہل سنت والجماعت تک بات پہنچی تو اس کو داستان عجیب کے ذریعہ ایک نئی صورت دے دی گئی۔ (ص ۱۳-۱۴)

مزید آنکہ حضرت جعفر کی طرف منسوب عبارت شرکیات سے پُر ہے جس سے وہ کوسوں دور تھے۔ قرآن نے شہادت دی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی فریادرس نہیں ہے:

﴿ أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ ﴾ (النمل:٦٢)

''کون ہے جو مجبور کی پکار سنتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور تکلیف کو دور کرتا ہے۔''

اور نفع ونقصان کا مالک وہی مختار کل ہے۔ قرآن میں سورۃ یونس ، الأعراف، الأنعام، الإنفطار، المؤمن وغیرہ کی متعدد آیات میں اس بات کی صراحت موجود ہے۔

((مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَ مَالَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ .))

اور وسیلہ بذات المخلوق کفار مکہ کا عقیدہ تھا جس کی سورۃ الأنعام اور سورہ یونس میں واضح الفاظ میں تردید کی گئی ہے۔ یہ شواہد ہیں کہ حضرت جعفر صادق جیسی عظیم ہستی مجسمۂ تعلیمات کتاب وسنت اس کے منافی حکم صادر نہیں کرسکتے۔ لہٰذا ان کی طرف منسوب حکایت جھوٹی ہے۔

سوال: جنازے پر اعلان کرنا کہ تیسرے دن (قل والے دن) ۱۰ بجے تیجہ، ساتواں، دسواں، وغیرہ سب کچھ اکٹھا ہی ہوگا۔ سب حضرات وقت پر پہنچ جائیں۔ کیا یہ اعلان کرنا درست ہے؟ جب تیجے والے دن وقت مقرر پر سب لوگ اکٹھے ہو جائیں تو لوگوں کے سامنے کھانا وغیرہ کچھ نہ رکھا جائے۔ ایک دو مولوی کھڑے ہوں۔ قرآن مجید کی ایک دو سورتیں پڑھیں اور اجتماعی دعا کروا دیں۔ کیا صورت ثانی مسنون ہے یا غیر مسنون، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

اور کیا اہل حدیث عالم یا لوگوں کو اس جیسے اجتماع میں شرکت کرنا درست ہے؟

جواب: مذکورہ بالا چیزوں اور اعلانات خصوصی کا شریعت میں وجود نہیں۔ ان سے اجتناب ضروری ہے۔ صحیح حدیث میں ہے: ''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔'' (البخاری)

غیر شرعی اجتماعات میں شرکت بھی نہیں کرنی چاہیے۔

سوال: ایک عورت کا بیٹا سخت بیمار تھا۔ اس نے محلے کی تمام ہم مسلک عورتوں کو اکٹھا کر کے سورۃ یٰسین ستر ستر بار پڑھوا کر دعا منگوائی ہے کیا قرآن وحدیث میں اس کا کوئی جواز ہے؟

جواب: مذکورہ طریقہ کتاب وسنت کی کسی نص سے ثابت نہیں۔ بچے کی والدہ محترمہ کو خود ہی رب العزت کے حضور دعا کرنی چاہیے تھی۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حتمی ویقینی ہے:

﴿ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ (البقرة:۱۸٦)

''جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔''

نیز فرمایا:

﴿ أَمَّنْ يُّجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْءَ﴾ (النمل:٦٢)

''بھلا کون بے قرار کی التجا قبول کرتا ہے جب وہ اس سے دعا کرتا ہے اور (کون اس کی) تکلیف کو دور کرتا ہے۔''

سوال: میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد قبر پر سورہ بقرہ کے ابتدائی اور آخری رکوع کی تلاوت کرنا اور اسمائے الٰہی پڑھنا کیسا ہے؟ کیا میت کی بخشش کے لئے اس موقع پر جنازے والی دعائیں پڑھی جا سکتی ہیں؟

جواب: قبر پر کھڑے ہو کر سورہ بقرۃ کی آیات کی تلاوت والی حدیث امام بیہقی رحمہ اللہ نے ''شعب الایمان'' میں ذکر کی ہے۔ لیکن اسے ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ درست بات یہ ہے کہ یہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اسمائے الٰہی کا ورد بھی ثابت نہیں۔ البتہ دعا کرنا ''جزء رفع الیدین'' و ''نسائی'' وغیرہ میں ثابت ہے اور دعائیں جونسی چاہے پڑھ لے۔

سوال: ① ...... میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان دینا کیسا ہے؟

ٹوبہ ٹیک سنگھ میں قبر پر اذان دی گئی جو کہ باعث نزاع بنی ہوئی ہے اور قبر پر اذان دینے کے جواز میں ''مشکوۃ المصابیح'' کی یہ حدیث پیش کی جاتی ہے:

« عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ :خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ إِلٰى سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ حِيْنَ تُوُفِّيَ فَلَمَّا صَلّٰى عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَوُضِعَ فِيْ قَبْرِهٖ وَسُوِّيَ عَلَيْهِ، سَبَّحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَسَبَّحْنَا طَوِيْلًا ،ثُمَّ كَبَّرَ فَكَبَّرْنَا ،فَقِيْلَ : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ! لِمَ سَبَّحْتَ ثُمَّ كَبَّرْتَ ؟ قَالَ: لَقَدْ تَضَايَقَ عَلٰى هٰذَا الْعَبْدِ الصَّالِحِ قَبْرُهٗ حَتّٰى فَرَّجَهُ اللّٰهُ عَنْهُ .» [1]

(رَوَاهُ أَحْمَدُ ، مِشْكٰوةُ الْمَصَابِيْح ، بَابُ إِثْبَاتِ عَذَابِ الْقَبْرِ، الفصل الثالث،ص ٢٦)

② ...... کیا شیطان (ابلیس) قبر میں میت کے پاس آتا ہے یا نہیں؟

③ ...... کیا شیطان قبر میں سوال و جواب کے وقت میت کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے؟

قبر پر اذان دینے سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔ اور میت کو جواب دینے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں۔

---

[1] (٤١٦) قال الألباني إسناده ضعيف ،المشكاة،(١٣٥)،أحمد(٣٦٠/٣) ح(١٤٨٠٩).

محمد فیض احمد صاحب اویسی مصنف کتاب ''اذان برقبر'' مکتبہ اویسیہ رضویہ ملتان روڈ، بہاولپور مصنف نے قبر پر اذان دینے کو ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔

جواب: ① ...... قبر پر اذان دینا بدعت ہے کتاب و سنت اور سلف صالحین کے عمل سے اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ .)) ❶ (بخاری و مسلم)

''یعنی جس نے ہمارے دین میں اضافہ کیا وہ مردود ہے۔''

اور سوال میں ذکر کردہ حدیث کا زیر بحث مسئلہ سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس سے مستدل کا قبر پر اذان دینے کے جواز پر استدلال کرنا اس کی جہالت اور لاعلمی کا مظہر ہے اس میں تو صحابی رضی اللہ عنہ جلیل پر قبر تنگ ہونے کی بناء پر آپ ﷺ کا محض تسبیح و تکبیر میں سُبْحَانَ اللّٰهِ اور اَللّٰهُ أَكْبَرُ کہنے کا ذکر ہے۔ اس کے سبب اللہ رب العزت نے اس کی قبر کو فراخ کر دیا تھا۔ پھر یہ کہاں ہے کہ مسنون و مشروع اذان بھی اس موقعہ پر کہی گئی۔ ﴿ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ .﴾

② ...... حدیث ہذا ''مسند احمد'' کے علاوہ ''طبرانی کبیر'' ❷ میں بھی موجود ہے۔ لیکن متکلم فیہ ہے۔ چنانچہ صاحب ''مجمع الزوائد'' فرماتے ہیں:

'' وَ فِيْهِ مَحْمُوْدُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَمْرِوبْنِ الْجُمُوْحِ ،قَالَ الْحُسَيْنِيُّ: فِيْهِ نَظَرٌ ''

③ ...... اس کے بعد والے جملہ سوالوں کا جواب یہ ہے کہ موت کے بعد والا گھر دار الجزاء ہے دار العمل نہیں ہے کہ شیطان کا آدمی کو ورغلانے یا غلبے کا موقعہ میسر آ سکے۔ شیطانی بھاگ دوڑ صرف دنیا تک محدود ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ الشَّيْطَانَ قَالَ:وَ عِزَّتِكَ يَارَبِّ لَا أَبْرَحُ أَغْوِيْ عِبَادَكَ مَا دَامَتْ أَرْوَاحُهُمْ فِيْ أَجْسَادِهِمْ ،فَقَالَ الرَّبُّ عَزَّوَجَلَّ:وَعِزَّتِيْ وَ جَلَالِيْ وَارْتِفَاعِ مَكَانِيْ لَا أَزَالُ أَغْفِرُلَهُمْ

❶ (٤١٧) صحيح البخاري، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود(٢٦٩٧).

❷ (٤١٨) المعجم الكبير١٣/٦(٥٣٤٦)للطبراني،فيه ضعف. مجمع الزوائد(٤٦/٣)وقال:فيه محمود بن محمد بن عبد الرحمن ابن عمرو بن الجموح،قال الحسيني:فيه نظر،ولم أجد من ذكر غيره.

مَا اسْتَغْفَرُوْنِیْ . »[1] (رَوَاهُ أَحْمَدُ بحواله مشکوۃ باب الاستغفار والتوبة)

''تحقیق شیطان نے پروردگار سے عرض کیا اے میرے پروردگار! تیری عزت کی قسم میں تیرے بندوں کو ہمیشہ گمراہ کرتا رہوں گا جب تک کہ ان کے ارواح ان کے بدنوں میں ہوں گے۔ پس پروردگار نے فرمایا مجھے اپنی بزرگی وعزت اور بلند مرتبہ کی قسم ہے کہ میں ان کو ہمیشہ بخشتا رہوں گا جب تک کہ مجھ سے بخشش مانگتے رہیں گے۔''

لہٰذا بعد از موت شیطانی تسلط یا بذریعہ اذان اس کو اس موقعہ پر بھگانے کا نظریہ بالکل فضول اور بے کار ہے۔ تارِ عنکبوت سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

﴿ وَاللّٰهُ يَهْدِیْ مَنْ يَّشَآءُ إِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (النور:٤٦)

واضح ہو کہ اہل بدعت کا ہمیشہ سے یہ شیوہ ہے کہ وہ اپنے خودساختہ نظریات وعقائد کی ترویج کے لئے کتاب وسنت کی قطع برید میں لگے رہتے ہیں۔ شاید کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل جائے۔ دراصل فعل ہذا دین و دنیا کے اعتبار سے انتہائی خطرناک کھیل ہے۔

﴿ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ﴾ (البقرة:١٦)

اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں کو رجوع الی الحق کی توفیق بخشے آمین!

سوال: ہمارے علاقہ میں جب کوئی موت واقع ہوتی ہے تو غریب یا متوسط طبقہ سے ہو، کفنی پر شہادتیں لکھ کر میت کے سینہ پر رکھ کر دفن کرتے ہیں۔ پھر اسقاط کے نام پر کچھ رقم بعض علاقوں میں توشہ کے نام سے غلہ، نمک، چھوہارے وغیرہ قبر پر لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں اچھی گزران والے لوگ حفاظ قبر پر چند دن بٹھاتے ہیں اور میت کے ورثاء ایک کاپی رکھ دیتے ہیں۔ آنے والے لوگ اپنا نام لکھا کر حسب توفیق ۱۰، ۲۰ یا زیادہ روپے دے کر جاتے ہیں، اسی دن یا دوسرے دن قبر پر روشنی آگ یا لالٹین جلا کر ۴۰ دن رکھتے ہیں پھر ختم قرآن کا سلسلہ ہر جمعرات سے جاری ہو کر کوئی کھلے یا یٰس کوئی کچھ یعنی جس دن جمعرات ہو چالیسواں کرتے ہیں۔ ان تمام امور میں ہم رکاوٹ ڈالتے ہیں مگر اکثریت پر اثر نہیں ہوتا۔ کیا ان کاموں سے روکنے کے باوجود جو نہ رکے یا اگر میت کا ہفتہ وار ختم ہو اور دعوت اس طرح ہو کہ آپ میت کے گھر دعوت

---

[1] (٤١٩) صحيحه محقق مسند الإمام أحمد.أحمد(٤١/٣)(١١٣٠٧))بتحقيق الحمزة.يونس حدثنا ليث عن يزيد يعني ابن الهاد عن عمرو عن أبي سعيد......الخ وإسناده صحيح.المشكاة(٢٣٤٤)والتحقيق الثاني للألباني على المشكاة(٢٢٨٣)وقال:حسن بمجموع الطريقين.الصحيحة(١٠٤).

کھائیں گے۔ اس صورت میں بغیر ختم پڑھے گاؤں کے رواج کے مطابق وہ کھانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: سوال میں مذکور امور بعض وجوہات کی بناء پر ناجائز ہیں:

۱- عہد نبوت اور عہد صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین وتبع تابعین میں ان کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔ اگر اس طریق سے گناہ معاف ہوتے تو کیا ان کو گناہ کی معافی کی ضرورت نہ تھی؟ یا وہ میت کے خیر خواہ نہ تھے؟ یا ان کو نیک کاموں کا شوق نہ تھا؟ جب یہ سب باتیں تھیں بلکہ ہم سے بڑھ کر وہ ایسی باتوں کا خیال رکھتے تھے، تو پھر کیا وجہ ہے خیر القرون میں اس کا ثبوت نہیں ملتا؟ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے اسقاط سے میت کے گناہ معاف نہیں ہوتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

«مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ .» ❶ (مشکوۃ)

یعنی ''جو مجھ پر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنائے۔''

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ .» ❷ (مشکوۃ)

اور ایک روایت میں ہے کہ ایسا شخص لعنتی ہے۔ ❸ بلکہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نیا کام دین میں مردود ہے۔ خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ پس اسقاط کرنے والوں کو چاہیے کہ یا تو خیر القرون سے اس کا ثبوت دیں یا اللہ سے ڈریں۔ اور ایسے کاموں سے باز آ جائیں جو بجائے ثواب کے اللہ کی ناراضگی کا باعث ہیں۔ (ماخوذ از رسالہ رد بدعات شیخنا محدث روپڑی)

ایسی مجالس میں شرکت سے ہر صورت احتراز کرنا چاہیے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ إِنَّكُمْ إِذًا مِّثْلُهُمْ﴾ (النساء:١٤٠)

---

❶ (٤٢٠) صحيح البخارى، كتاب العلم، باب إثم من كذب......(١٠٦ إلى ١١٠)، صحيح مسلم، فى المقدمة، باب تغليظ الكذب......(٢ إلى ٥).

❷ (٤٢١) صحيح البخارى، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود (٢٦٩٧).

❸ (٤٢٢) صحيح البخارى، كتاب فضائل المدينة، باب حرم المدينة (١٨٦٧، ١٨٧٠) عن أنس وعلى بهذا اللفظ: ((من أحدث فيه حدثا فعليه لعنة الله......الخ)) وصحيح مسلم، كتاب الأضاحى، باب تحريم الذبح لغير الله تعالى ولعن فاعله (٥١٢٤) عن على بهذا اللفظ: ((لعن الله من اوى محدثا......الخ)) وانظر: عبدالرزاق (١٥/٢٠٦، ٢٠٧) فيه: ((من أحدث فعليه لعنة الله......الخ)) والله أعلم.

''اور اللہ نے تم مومنوں پر اپنی کتاب میں (یہ حکم) نازل فرمایا ہے کہ جب تم (کہیں) سنو کہ اللہ کی آیتوں سے انکار ہو رہا ہے اور ان کی ہنسی اڑائی جاتی ہے تو جب وہ لوگ اور باتیں (نہ) کرنے لگیں ان کے پاس مت بیٹھو ورنہ تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے۔''

سوال: شادی کا سلسلہ درج ذیل خرافات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ پہلے شادی کے دن مقرر کرنے کے لئے گاؤں بلوایا جاتا ہے۔ دن مقرر ہوتے ہیں۔ پھر شادی کی مقررہ تاریخ سے قبل شادی والے گاؤں میں گانے کے لئے بلاتے ہیں۔ عزیز و اقارب دیگر لوگ خصوصًا خواتین شادی والے گھر جا کر گانا گاتے ہیں۔ پھر دولہا کی دوستی شروع ہوتی ہے۔ پھر اسی طرح دعوت دی جاتی ہے کہ اس دوست کی چورمائی کے نام سے خرافات شروع ہوتی ہیں۔ جتنے دوست ہوئے اتنے ہی دن وہ لوگ کچھ کھانا یا مٹھائی لے کر جائیں گے۔ مرد حضرات مع دولہا و دوست ایک دوسرے کو کچھ کھلا کر باقی لوگ پھر کھائیں گے۔ پھر حجام سب سے پیسے لے گا۔ پھر مختلف رسومات کے بعد شادی والے مقررہ دن سے دو دن پہلے دلہن کے گھر کپڑے وغیرہ لے جا کر دلہن کے سر کے چند بال کھول دیں گے جسے مینڈھی کہتے ہیں۔ پھر شادی کے بعد ایک تیسرے نام کی رسم ہے۔ دولہا سسرال میں دوستوں کے ساتھ آئے گا۔ پھر دلہن کے گھر سے گاؤں کی عورتیں دولہا کے گھر آئیں گی جسے تیجا یا تیسرا کہتے ہیں۔ ان باتوں سے بھی لوگ باز نہیں آتے۔ اس مضمون پر پوری بحث فرما کر جواب مرحمت فرمائیں۔

جواب: اسوۂ رسول اللہ ﷺ کے پیش نظر شادی بیاہ میں سادگی اختیار کرنی چاہیے۔ بے جا رسومات و خرافات سے بچاؤ ضروری ہے۔ غور فرمایئے۔ مدینۃ الرسول ﷺ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف جیسے جلیل القدر صحابی کا نکاح ہوتا ہے لیکن مدینہ میں موجود سرور کونین ﷺ کو اس کی اطلاع نہیں ہو پاتی۔ [1] پھر آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«نَهٰى عَنْ إِضَاعَةِ الْمَالِ .» [2]

یعنی ''آپ نے مال ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔''

ظاہر ہے کہ مال کے ضیاع کا بڑا ذریعہ اسی قسم کی خرافات کا ارتکاب کرنا ہے۔

---

[1] (٤٢٣) صحیح البخاری کتاب النکاح ، باب کیف یدعی للمتزوج (٥١٥٥)، (٢٠٤٩)، مسلم(٣٤٩٠)، المشکاۃ(٣٢١٠)

[2] (٤٢٤) صحیح البخاری ،کتاب الاستقراض ،باب ما ینهی عن إضاعة المال(٢٤٠٨) ،صحیح مسلم ،کتاب الأقضیة ،باب النهی عن کثرة المسائل...... (٤٤٨١إلی٤٤٨٦).

اور قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا . إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيٰطِينِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كُفُوْرًا﴾ (بنی إسرائيل: ٢٧)

''اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار (کی نعمتوں) کا کفران کرنے والا (یعنی ناشکرا) ہے۔''

اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں کو کتاب و سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق بخشے۔ (آمین)

سوال: کیا نکاح میں ڈھول اور باجے وغیرہ بجانے جائز ہیں؟

جواب: نکاح میں ڈھول باجے بجانا ناجائز ہے۔ حدیث میں ہے کہ مجھے ڈھول ڈھمکے توڑنے کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔[1] (مشکوٰۃ)

لیکن مباح غناء جس میں فحش گوئی نہ ہو اور دف کی اجازت ہے۔ دف اس آلے کو کہا جاتا ہے جس میں لہریں نہ ہوں اگر لہر ہو تو اسے المزمر کہا جاتا ہے۔ (فتح الباری)

سوال: کیا قرآن خوانی کا ثواب مردوں کو پہنچتا ہے؟

جواب: مردوں کے لئے قرآن خوانی کتاب و سنت سے ثابت نہیں بلکہ حنفی فقہاء نے اس کو بدعت قرار دیا ہے۔

علی متقی رحمہ اللہ صاحب ''کنز العمال'' فرماتے ہیں:

" اَلِاجْتِمَاعُ لِلْقِرَاءَ ةِ بِالْقُرْاٰنِ عَلَى الْمَيِّتِ بِالتَّخْصِيصِ فِي الْمَقْبَرَةِ وَالْمَسْجِدِ اَوِ الْبَيْتِ بِدْعَةٌ مَذْمُوْمَةٌ ."

---

[1] (٤٢٥) صحيح ألفاظ:بعثت بكسر المزامير......الغيلانيات لأبى بكرمحمد بن عبدالله البزار،رقم(٨٠)عن على رضى الله عنه.فيه موسى بن عمير القرشى مولاهم،أبوهارون الكوفى الأعمى،متروك،كذبه أبوحاتم، التقريب (٧٠٤٦) . فائدة:عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد ان کے توڑنے کا پاکیزہ عمل سرانجام دیتے تھے۔ابن أبى شيبة(٥٧/٩)بسند صحيح كما فى تحريم آلات الطرب (صـ١٠٣)للألبانى. نبی ﷺ نے مزمار کی آواز کو ملعون کہا۔ البزار(٧٩٥/٣٧٧/١كشف الأستار)۔كما فى تحريم آلات الطرب (صـ٥١،٥٢) للألبانى وحسنه.اور طبلہ کو بھی حرام کہا : أحمد(٢٨٩/١)،البيهقى(٢١٣/١٠)،وحسنه الألبانى كما فى تحريم آلات الطرب (صـ٥٦). گھنٹی جہاں ہو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے، اور گھنٹی کو "مزمار الشيطان" کہا۔ انظر: صحيح أبى داؤد (٢٥٥٤إلى ٢٥٥٦)۔طبلہ، ڈھول وغیرہ کے متعلق آپ خود سوچ لیں......

سوال: میت کوثواب پہنچانے کے مشروع طریقے کون سے ہیں؟

جواب: میت کے لئے دعا استغفار کرنا، حج کرنا، قربانی دینا اور بلاتعیین کے صدقہ خیرات کرنا وغیرہ سب مشروع امور ہیں۔

سوال: (ا) کیا میلاد خود اللہ تعالیٰ نے منایا ہے؟ بریلوی مولوی حضرات کہتے ہیں کہ قرآن حکیم میں ہے کہ یحییٰ علیہ السلام کے یوم ولادت کے بارے میں اللہ جل مجدہٗ کا سورہ مریم میں ارشاد ہے: ''ان پر سلام ہو جس دن وہ پیدا ہوئے۔''

(ب) امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے ''اَلْحَاوِی لِلْفَتَاوٰی'' میں ایک باب: ''حُسْنُ الْمَقْصَدِ فِیْ عَمَلِ الْمَوْلِد'' کے نام سے رقم کیا ہے جس میں انہوں نے اس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنا میلاد منایا۔ اس لحاظ سے یہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ ایک روایت کے حوالے میں فرماتے ہیں کہ مدنی دور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بکرے ذبح کر کے فقراء و مساکین کو کھلائے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا عقیقہ کیا تھا۔ امام صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عقیقہ ان کے دادا عبدالمطلب کر چکے تھے اور عقیقہ دوسری مرتبہ نہیں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صرف اسی خوشی میں کام کیا کہ اللہ نے مجھے رحمۃ اللعالمین بنایا۔

جواب: (ا) میلاد منانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعاً ثابت نہیں لہٰذا یہ بدعت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ .» [1] (بخاری)

یعنی ''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

سلام کا معنی میلاد منانا آج تک کسی موثوق بہ مفسر نے نہیں کیا۔ یہ صرف اہل بدعت کی اختراعی ایجاد ہے: ﴿ مَّآ أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ﴾

(ب) علامہ سیوطی کا رسالہ بنام: ''حُسْنُ الْمَقْصد فِيْ عَمَلِ الْمَوْلِدُ'' (اَلْحَاوِی لِلْفَتَاوٰی ۲۹۲/۱) اس وقت میرے زیر نظر ہے۔ اس کے ابتدائیہ میں صاحب موصوف نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ میلاد کا عمل بدعت حسنہ ہے۔ جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ شریعت میں بدعت حسنہ کا کوئی وجود ہی نہیں۔ ثابت شدہ روایات میں ہے: «كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ» [2] یعنی ''ہر بدعت گمراہی ہے۔''

---

[1] (٤٢٦) صحيح البخاری، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود (٢٦٩٧).

[2] (٤٢٧) الرقم المسلسل ٩٠

اور اس کا موجد صاحب اربل الملک المظفر ابو سعید کو کبری بن زین الدین بن علی کو قرار دیا ہے۔ جو ساتویں صدی ہجری کا بادشاہ تھا اس میں مصنف نے بذات خود اس بات کو مان لیا ہے کہ عمل ہذا متاخر زمانہ کی پیداوار ہے۔ جو کسی صورت بھی امت مسلمہ کے لئے قابل حجت نہیں۔ پھر انہوں نے علامہ فاکہانی مالکی کا رسالہ "اَلْمَوْلِدُ فِي الْكَلَامِ عَلَى عَمَلِ الْمَوْلِدِ" کو نقل کر کے اپنی صوابدید کے مطابق حرف بحرف اس کا جواب دیا ہے۔ اس ضمن میں موصوف نے پوری سعی کی ہے کہ عمل ہذا شریعت سے ثابت کیا جائے۔ زیادہ تر دو دلیلوں پر انہوں نے زور دیا ہے۔ آپ ﷺ سے سوموار کے دن روزہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا:

((ذَاكَ يَوْمٌ وُلِدْتُ فِيهِ)) ❶

اور دوسری روایت بحوالہ بیہقی انس سے مروی ہے:

((أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَقَّ عَنْ نَفْسِه بَعْدَ النُّبُوَّةِ)) ❷

صحیح مسلم کی روایت میں سوموار کے دن ولادت باسعادت کے ساتھ بعثت اور نزول کتاب کا بھی ذکر ہے۔ (۸/۵۱-۵۲)

سوموار کے روز کا نفلی روزہ بطور تشکر آپ ﷺ نے رکھا ہے۔ ہمیں بھی اسی انداز پر اقتدائی پہلو اختیار کرنا چاہیے۔ لیکن یار لوگوں نے اتباع کے بجائے ابتداع کو ترجیح دی۔ سال کے عشرات سومواروں کو بھلا کر من مانی خوشی کے لئے انتخاب صرف ۱۲ ربیع الاول کا کر لیا جس کا ادنیٰ اشارہ بھی اس حدیث میں موجود نہیں، اور مصنف کی دوسری دلیل کہ آپ ﷺ نے بعد از نبوت اپنا عقیقہ کیا ہے۔ اس پر یہ کہنا کہ عقیقہ تو آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے کر دیا تھا۔ آپ نے جو کچھ کیا ہے دراصل اپنے رحمۃ اللعالمین بننے کی خوشی پر کیا ہے یہ بھی محض دعویٰ بلا دلیل ہے۔

اولاً ضروری ہے کہ اس حدیث کی اسنادی حیثیت کو پرکھا جائے کیونکہ فرع کی بناء اصل پر ہوتی ہے کہا جاتا ہے:

---

❶ (٤٢٨) صحيح مسلم، كتاب الصيام، باب استحباب صيام ثلاثة أيام...... (٢٧٤٧).

❷ (٤٢٩) ضعفه ابن حجر، مختصر زوائد مسند البزار (١/١ ٥٠) (٨٦٤) لابن حجر، وقال: انفرد به عبدالله بن محرر وهو " ضعيف جدا "، وفي التقريب (٣٥٩٨) " متروك ". والبيهقي، (٢٩٩/٩، ٣٠٠) بسندين وفيهما عبدالله بن محرر هذا. عبدالرزاق (٣٢٩/٤) (٧٩٦٠) فيه هذا. وشاهده في الطبراني (٥٢٩/١ ـ الأوسط) لكن فيه الهيثم بن جميل وهو ضعيف. تحفة الأخيار...... مشكل الأخيار (٤٣٥/٦) (٤٥٢٨).

"اُثْبِتِ الْعَرْشَ ثُمَّ انْقُشْ ."

یعنی "پہلے تخت ثابت کر پھر نقش و نگار کرنا۔"

اس حدیث کے بارے میں علامہ نووی رحمہ اللہ "شرح المہذب" میں فرماتے ہیں:

"هٰذَا حَدِيْثٌ بَاطِلٌ ."

یعنی "یہ حدیث باطل ہے۔"

اور بیہقی نے کہا: منکر ہے۔ اس میں عبداللہ بن محرر راوی ہے اور وہ سخت ضعیف ہے۔ ملاحظہ ہو: (التلخیص الحبیر ۱۴۷/٤) (لہٰذا روایت ہذا سے کسی قسم کا استدلال لینا قطعاً درست نہیں۔)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ کے مناسب نہیں تھا کہ بلاتحقیق صحت روایت ہذا سے استدلال کرتے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ حَاطِبُ اللَّيْل ہیں یعنی رطب و یابس کے جامع ہیں۔ لہٰذا ایک مُحَقِّقْ مُسْتَدِلْ کے لئے ضروری ہے کہ پہلے بیان کردہ ان کی مرویات کو معیار محدثین پر پرکھے پھر استدلال کا سوچے ورنہ ڈر ہے کہ کہیں: « مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ » کے زمرہ میں شامل نہ ہو جائے۔

نیز اہل اسلام کا اجماعی مسئلہ ہے کہ دین اسلام میں صرف دو عیدوں کا تصور ہے تیسری کا کوئی وجود نہیں۔ احادیث کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھیں، تراجم و ابواب محدثین میں صرف دو عیدیں نظر آئیں گی۔ آج کے دور میں تیسری عید میلاد کا اضافہ صرف اہل بدعت کا کارنامہ ہے۔ اللہ کے دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر ستم ظریفی یہ کہ اس کو بطور تصور اسلام کے سکولوں کی کتابوں میں رائج کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی پست حالت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ حقیقت حال یہ ہے:

﴿ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ . ﴾

دنیاوی اعتبار سے بہت سمجھدار لیکن دینی اور اخروی امور میں معاملہ فہمی سے عاری:

﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا . ﴾

"بھلا یہ لوگ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے یا (ان کے) دلوں پر قفل لگ رہے ہیں۔"

اہل بدعت نے اسلام کے نام پر اپنی تحریروں اور تقریروں میں تحریفات کے وہ گل کھلائے ہیں جنہیں دیکھ کر آج یہود و نصاریٰ بھی شرمسار ہیں کہ کیا واقعی یہی لوگ ہمیں تحریفات میں مورد الزام ٹھہراتے تھے۔ اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں کو صائب فکر کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین!

سوال: بعض لوگ دفن کے بعد اور چار یا سات دن کے بعد میت کے گھر جمع ہو کر کھانا کھاتے ہیں اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب: شریعت میں تیجے، ساتویں اور چالیسویں وغیرہ کا کوئی ثبوت نہیں۔ حدیث میں ہے:

« مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ . »[1]

یعنی ''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

دراصل یہ ہندوانہ رسوم ہیں ان کا تذکرہ منوسمرتی میں موجود ہے۔

سوال: میت کی وفات کے بعد پہلی عید یا شب برات وغیرہ کو خاص طور پر غم منانا میت کے گھر افسوس کے لئے جانا بدعت ہے لیکن یہ بدعت کب سے شروع ہوئی؟

جواب: یہ غلط قسم کی رسمیں ہیں۔ شریعت مطہرہ میں ان کا کوئی ثبوت نہیں بدعت عام طور پر ماحول اور معاشرہ کی ایجاد ہے۔ اس میں تاریخ کا تعین مشکل امر ہے۔

سوال: ۲۲ اگست ۱۹۹۴ کا پرچہ پڑھا۔ اس میں آپ نے ڈاڑھی تراشنے والے مؤذن کے بارے میں فتویٰ دیتے وقت فقہ حنفیہ کی کتب سے بھی حوالہ دیا ہے حالانکہ سائل نے فقہ حنفی کے مطابق مسئلہ دریافت نہیں کیا تھا۔ بھلا قرآن مجید و حدیث کی موجودگی میں فقہ حنفی کی کتابوں کے حوالے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ امید ہے آپ برا خیال نہیں کریں گے۔

جواب: بلاشبہ اصل کتاب و سنت ہے۔ محدثین اور فقہائے امت کے حوالے محض مسئلہ کی مزید تشریح و توضیح کے لئے پیش کئے جاتے ہیں جیسا کہ عام محدثین کا طریق کار ہے۔ بالخصوص سید المحدثین امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کے تراجم وابواب میں جا بجا اسی طریق کار اور طرز استدلال کو پسند اور اختیار کیا ہے۔

سوال: آج کل بعض نوجوان نعرہ لگاتے ہیں:

ہم بیٹے کس کے؟.......... ساجد کے

ہم فرزند کس کے؟.......... ساجد کے

کیا ایسے نعرے لگانا جائز ہے؟ اپنے آپ کو کسی اور کی طرف منسوب کرنا درست ہے؟ نبی اکرم ﷺ ہمارے روحانی باپ ہیں۔ کیا حضرت آدم علیہ السلام کو ہمارا باپ کہا گیا ہے؟

---

[1] (۴۳۰) صحيح البخاري، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود (۲٦۹۷).

جواب: نعرہ بازی کا شریعت میں ثبوت نہیں۔ ہاں البتہ غیر کو باپ یا بیٹا بطور الفت اور محبت قرار دیا جا سکتا ہے۔ فرمایا:

((أَنَا لَكُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ .)) ❶ (أبو داؤد)

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کئی دفعہ بیٹا کہہ کر پکارتے تھے۔ ❷ صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوالمومنین کہنے کے بارے میں شوافع کے دو قول ہیں۔ صحیح جواز ہے۔ احادیث الشفاعۃ میں حضرت آدم علیہ السلام کو باپ کے لفظوں سے یاد کیا گیا ہے۔

سوال: ایک لڑکا اپنے قصبہ سے برائے شادی شہر میں وارد ہوتا ہے مع ایک عدد لوہے کی چھڑی کے۔ اس چھڑی (لوہے) کے ساتھ نکاح ہو جاتا ہے۔ حاضرین میں کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ جب کہ کہا جاتا ہے کہ یہ چھڑی دافع بلیات ہے۔ حالانکہ یہ دقیانوسی خیالات والے مسلمان اکثر ایسا کرتے ہیں۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ چھڑی کی موجودگی نکاح میں خلل انداز تو نہیں ہوتی؟

جواب: بوقت نکاح دولہے کا گانہ، سہرا باندھنا اور ہاتھ میں لوہے کی چھڑی لے کر چلنا سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں بلکہ یہ سب امور بدعیہ ہندوانہ رسوم و آثار سے ہیں جن سے اجتناب ضروری ہے۔ حدیث میں ہے:

((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ .)) ❸

یعنی ''جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی وہ ان سے ہے۔''

بلا ریب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جنس اور وصف میں اشتراک کی خاص کشش ہوتی ہے جس کا اثر انسانی طبائع پر لازمی طور پر ہوتا ہے چاہے دانستہ ہو یا غیر دانستہ۔ اسی بناء پر ہمیں غیر اقوام کی نقالی سے منع کیا گیا ہے۔

---

❶ (٤٣١) حسنه الألباني و شعيب الارنؤوط و بشارعواد . صحيح أبي داؤد، كتاب الطهارة، باب كراهية استقبال القبلة عند قضاء الحاجة (٨) ،النسائي(٤٠)،ابن ماجه (٣١٣)،مسند الشافعي (٦٤)،أحمد ٢٤٧/١ (٧٣٦٢)،الحميدي (٩٨٨)،ابن حبان (١٤٣١) الإحسان.

❷ (٤٣٢) صحيح مسلم، كتاب الأدب، باب جواز قوله لغير ابنه:يا بني، واستحباب للملاطفة (٥٦٢٣)،أبوداؤد (٤٩٦٤).

❸ (٤٣٣) حسنه وصححه الألباني،صحيح أبي داؤد، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة (٤٠٣١)، الارواء (١٢٦٩) ،المشكاة (٤٣٤٧).

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے امراء اور سپہ سالاروں کو ہمیشہ ہدایات تحریر فرماتے تھے:

" اِرْتَدُوْا وَاتَّزِرُوْا وَ زِیُّوْا بِزِیِّ الْعَرَبِ الْاَوَّلِ. "

یعنی " چدر پہنو، تہ بند باندھو اور عرب اول کی وضع اختیار کرو۔"

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ اہل حدیث: ۳/۳۳۸-۳۳۴ لشیخنا محدث روپڑی)

خیر بایں ہمہ نکاح تو منعقد ہو جاتا ہے لیکن اس میں خلل واقع ہو جاتا ہے جس سے تائب ہونا ضروری ہے۔

سوال: مروجہ قرآن خوانی کے بارے میں تفصیل سے فرمائیں کہ کیا نبی ﷺ سے اس طرح قرآن ختم کرنا ثابت ہے اور لوگ چندہ اکٹھا کر کے مٹھائی وغیرہ منگوا کر ختم پڑھتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: مروجہ قرآن خوانی کا کوئی ثبوت نہیں لہٰذا یہ بدعت ہے حدیث میں ہے جو دین میں اضافہ کرے مردود ہے۔ (بخاری) [1]

سوال: میت کے وارث جمعرات وغیرہ کا ختم دیتے ہیں دعوت اس طرح دی جائے کہ بغیر کچھ پڑھے۔ آپ نے کھانا کھانا ہے، جائز ہے یا نہیں؟

جواب: بدعتی مجالس میں شرکت کرنا ناجائز ہے۔

سوال: تعزیت کا مسنون طریقہ کیا ہے۔ مطلب یہ کہ کوئی دوست فوت ہو جائے تو دس دن بعد یا مہینہ یا سال بعد اس کے رشتہ داروں کے پاس تعزیت یا فاتحہ خوانی کے لئے جانا، جائز ہے یا نہیں؟

جواب: تعزیت سے مقصود صرف اہل میت کو تسلی دینا ہوتا ہے وہ کسی وقت بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے شرع میں کوئی حد بندی نہیں ہے۔

سوال: شادی کے موقع پر کوئی تحفہ نیوندرہ دینا اسلام میں جائز ہے یا نہیں؟

جواب: تحفے تحائف کی شریعت میں عمومی اجازت ہے۔ شادی کے موقعہ پر ہو یا اس کے علاوہ۔

سوال: میت کو غسل دے کر کفن پہنا کر کفن پر کوئی سورت وغیرہ لکھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: کفن پر کچھ لکھنا کتاب وسنت سے ثابت نہیں صحیح حدیث میں ہے:

((مَنْ أَحْدَثَ فِیْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ)) [2]

---

[1] (٤٣٤) صحیح البخاری، کتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا علی صلح جور فالصلح مردود (٢٦٩٧).

[2] (٤٣٥) ایضاً

یعنی ''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

سوال: جنازے کو قبرستان لے جاتے وقت بلند آواز سے کلمۂ شہادت وغیرہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: میت کے ساتھ قبرستان جاتے ہوئے بلند آواز سے کلمۂ شہادت کا ورد کرنا کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔

سوال: جنازہ پڑھ کر اور میت کو دفن کر کے ستر قدم پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا چاہیے یا نہیں؟

جواب: میت کو دفن کرنے کے بعد ستر قدم پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔ اس کا مرتکب اہل بدعت سے شمار ہوگا۔

❀❀❀❀❀❀❀

﴿۲۵﴾ دورِ حاضر کے جدید مسائل اور ان کا شرعی حکم

سوال: ایک مسلمان انسان مرنے سے قبل وصیت کر جائے کہ مرنے کے بعد اس کے اعضاء کسی اور کو لگا دیئے جائیں تو کیا یہ شرعاً درست ہے؟

جواب: مرنے کے بعد اپنے اعضاء کی کسی دوسرے کے لئے وصیت کرنا درست نہیں۔ کیوں کہ انسانی بدن اللہ کی امانت ہے بندے کی ملکیت نہیں۔ اسی بناء پر تو خودکشی کو جرم قرار دیا گیا ہے۔

سوال: محترم عرض ہے کہ ''الاعتصام'' نومبر اور دسمبر ۱۹۹۰ء کے شمارہ جات میں جناب حافظ زبیر علی زئی صاحب کا ایک مضمون ''فتنہ انکار حدیث'' شائع ہوا تھا۔ منکرین حدیث کے چند اعتراضات نے آج کل خود مجھے اور مجھ جیسے کئی طالب علموں کے ذہنوں میں خلجان پیدا کر رکھا ہے۔ ان کے اعتراضات درج ذیل ہیں:

حدیث شریف میں ہے کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟ لڑکی ہے یا لڑکا ہے؟ اس کے بارے میں کوئی نہیں بتا سکتا یا کوئی نہیں جانتا۔ اس کا علم صرف اللہ کو ہی ہے۔ جب کہ موجودہ وقت میں سائنس نے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان معلوم کر سکتا ہے کہ لڑکی ہے یا لڑکا ہے۔ بلکہ یہاں تک وہ کہتے ہیں، مرد چاہے تو لڑکی پیدا کریں یا لڑکا پیدا کریں۔ ظاہر ہے یہ تو نہ ہونے والی بات تھی مگر اب ممکن ہو گیا ہے۔ کیا کہتے ہیں علمائے کرام اس کے بارے میں؟

جواب: حدیث میں لڑکے اور لڑکی کا ذکر نہیں بلکہ قرآن و حدیث میں « مَا فِی الْأَرْحَام » کے الفاظ وارد ہیں جو رحم کی فطرتی اور بنیادی تمام صلاحیتوں اور شکلوں کو حاوی ہے۔ چاہے کوئی عورت شادی شدہ ہو یا نہ ہو۔ مقدر شکل کے معرض وجود میں آنے سے قبل اللہ رحم پر موکل فرشتے کو آگاہ فرماتے ہیں۔ پھر بہت بعد میں ڈاکٹروں کو معلوم ہوتا ہے تو بتایئے اس میں انسانی ترقی کا کیا کمال ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹری علم شرعی نصوص کے منافی نہیں۔ لڑکا یا لڑکی پیدا کرنا مرد کے اختیار میں نہیں بلکہ یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ رحم پر مقرر فرشتہ بھی رب العزت سے دریافت کرتا ہے:

" أَذَكَرٌ أَمْ أُنْثٰى " یہ لڑکا بنے گا یا لڑکی؟

سوال: ''بیمۂ زندگی'' کی شرعی حیثیت قرآن وسنت کی روشنی میں کیا ہے؟

جواب: بیمہ کرانا سود اور قمار کی وجہ سے حرام ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں :ایک یہ کہ بیمہ کمپنی جمع شدہ رقم دوسروں کو سود پر دیتی ہو اور اس میں سے ایک معین حصہ بیمہ کرانے والوں کو بانٹ دیتی ہو یا یہ کہ خود ہی اس روپیہ سے تجارت کرے اور اس کے منافع سے ایک معین اور طے شدہ منافع ادا کرے اسی کا نام سود ہے۔

دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ایک کا حق دوسرے کو منتقل کر دینا جس میں مالک کی مرضی شامل نہیں۔ ایسی صورت میں جواز کا فتویٰ دینا سود یا قمار کا جواز پیدا کرنا ہے۔ اقساط کے قصداً یا مجبوراً ادا نہ کرنے کی صورت میں جمع شدہ قسطوں کو ضبط کر لینا اُکل مال بالباطل ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ)

سوال: خاندانی منصوبہ بندی کس حد تک کرنا جائز ہے؟

جواب: اسلام خاندانی منصوبہ بندی کا قائل نہیں بلکہ اس نے تکثیر نسل کی ترغیب دی ہے۔ اس قسم کی نصوص اہل علم سے مخفی نہیں۔ ذخیرۂ احادیث میں متعدد روایات موجود ہیں جو اس کی تردید کے لئے کافی وشافی اور وافی ہیں۔ وَاللّٰهُ وَلِيُّ التَّوْفِيْق۔

سوال: جمعہ کی چھٹی ضروری ہے؟ یا کسی اور دن بھی چھٹی کی جا سکتی ہے؟

جواب: عام حالات میں اسلام میں چھٹی کا تصور نہیں البتہ آدمی اپنے راحت اور آرام کی خاطر کسی دن بھی چھٹی کر سکتا ہے۔ اسلام میں کوئی پابندی نہیں۔ تاہم اولیٰ معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کے دن چھٹی کی جائے تاکہ عبادت گو آدمی دن کے پہلے حصہ میں فضیلت کے اوقات کو بآسانی پا سکے جن کی تصریح صحیح احادیث میں موجود ہے۔

سوال: (جلد نمبر ۵۰ ،شمارہ ۱۷ ، احکام ومسائل کے کالم میں ،ص ۸) پر آخری سوال کہ خاندانی منصوبہ بندی کس حد تک کرنا جائز ہے؟ تو اس کے جواب میں لکھا گیا ہے کہ اسلام منصوبہ بندی کا قائل نہیں۔ راقم الحروف کو اس نظریہ سے اختلاف ہے۔ میرے ناقص مطالعہ کے مطابق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عزل کیا کرتے تھے۔ اور یہ بھی منصوبہ بندی کی ایک شکل ہے اور بعد میں اس پر عمل جاری رہا۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو جائز سمجھتے تھے۔ اس کے شواہد بخاری ومسلم میں ہیں۔ اس کے متعلق جو روایتیں ملتی ہیں [1] ان پر آپ بحث کریں کہ ان کا مطلب یہ ہے؟ یہ کس لئے ہے؟

---

[1] (٤٣٦) صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب العزل(٥٢٠٧ تا ٥٢١٠)

جواب: منصوبہ بندی اور عزل میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں قطع نسل مقصود ہوتا ہے جب کہ فعل عزل عارضی اور وقتی شی ہے۔ اس کے باوجود بسا اوقات حمل ہو جاتا ہے۔ پھر فعل عزل کو بھی شرع میں مکروہ سمجھا گیا ہے۔ جواز کی صورت میں عورت کی رضا سے معلق کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے لذت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا منصوبہ بندی کو عزل پر قیاس کرنا قیاس مَعَ الْفَارِق ہے۔

سوال: ① پارلیمنٹ کی رکنیت اور موجودہ جمہوری نظام کے ماتحت کوئی سرکاری عہدہ قبول کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

② رکنیت پارلیمنٹ اور عام سرکاری عہدے جب دونوں ایک ہی نظام کے ماتحت ہوں تو ان میں فرق کرنا اور پہلے کو کفر اور دوسرے کو جائز تصور کرنا کیسا ہے؟

③ مروجہ سیاسی نظام کے تحت اگر انتخابات کرائے جائیں تو کیا ووٹ ڈالا جا سکتا ہے؟

④ جو حضرات انتخابات میں حصہ لینے اور ووٹ ڈالنے کو کفر گردانتے ہیں، ان کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

⑤ موجودہ صورت حال میں بعض احباب "أَخَفُّ الضَّرَرَيْنِ" یا "أَهْوَنُ الْبَلِيَّتَيْنِ" کو قبول کرنے کا کوئی تصور شرعاً موجود ہے؟ خاص طور پر ایسے حالات میں جب اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ ہو اور اسے وقتی طور چند شرعی مصالح کا لحاظ کرتے ہوئے قبول کر لیا جائے؟

⑥ یہ بھی بتایئے کہ اگر الشیخ عبدالرحمٰن عبدالخالق کی اسی موضوع پر کتاب کا اردو ترجمہ (جو تیار کر لیا گیا ہے) چھپوا دیا جائے تو کیا مفید ہو گا؟

جواب: ① جن ممالک کے دساتیر میں شریعت کی بالادستی کا دعویٰ موجود ہو وہاں پارلیمنٹ کی رکنیت اور مروجہ نظام کے ماتحت سرکاری عہدہ اس غرض سے قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں کہ خیر کی طرف کوئی قدم بڑھایا جا سکے تاہم یہ واضح رہے کہ اس صورت میں اول اپنی شخصیت کا ناقدانہ جائزہ اور محاسبہ پیش نظر رہے کیونکہ مصلحت کا تقاضا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بعض لوگ اثر انداز ہونے کی زیادہ اہلیت رکھتے ہیں جبکہ بعض دوسرے اثر پذیر ہونے کی۔ بہر صورت مقصد امر بالمعروف ونھی عن المنکر رہے تو ٹھیک ورنہ اقتدار کا مطالبہ (فرمان رسول ﷺ کے مطابق) [1] اللہ تعالیٰ کی مدد سے محرومی کا باعث ہونے کی وجہ سے بے برکتی پر منتج ہوتا ہے

---

[1] (٤٣٧) صحيح البخاري، كتاب الأحكام، باب من سأل الإمارة وكل إليه (٧١٤٧) و (٧١٤٦).

دوسری بات مروجہ نظاموں کے اعتبار سے یہ ہے کہ ان تمام وضعی نظاموں کی اساس حصول اقتدار ہے اور ان نظاموں کے تانے بانے اسی جال کے لیے بنے گئے ہیں۔ اس لیے جب تک خیر کے رستے کھلے پائے، کار اصلاح میں شریک رہے۔ ورنہ خود کو فتنہ سے بچانے کی راہ اختیار کرے۔

۲ پارلیمنٹ کی رکنیت اور دیگر سرکاری عہدوں میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں۔ پارلیمنٹ کا زیادہ تر تعلق تشکیل حکومت سے ہوتا ہے تو سرکاری عہدوں کا حکومت کے ساتھ تعاون سے بعض اعتبار سے پارلیمنٹ کی رکنیت زیادہ اہمیت رکھتی ہے تو دوسرے اعتبارات سے کوئی سرکاری عہدہ بہرصورت اس کا تعلق اشخاص کی صلاحیت اور مواقع کی مناسبت سے ہے اور اس کا فیصلہ اسی چیز کے مدنظر ہونا چاہیے۔ کافرانہ یا ظالمانہ نظام میں شرکت یا تعاون دونوں میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ اصل مقصد خیر اور اس کے حصول کے مواقع کی اہمیت ہے۔ اسلام میں وسائل مقاصد کے تابع ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں شرعی مقصد کے لیے حیلے کا جواز اور غیرشرعی مقصد کے لیے حیلوں کی مذمت میں ''اعلام الموقعین'' کا مطالعہ مفید ہوگا۔

۳ مصالح دینیہ کی بناء پر اسلام اور مسلمانوں کی ہمدردی میں قریب ترین پارٹی یا اشخاص کو ووٹ ڈالنا مناسب سمجھتے ہیں لیکن اس شعور کے ساتھ کہ ووٹ اور بیعت کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ جیسا کہ ہم تمہیدی نکات میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ لادینی نظاموں کی بعض جزئیات کو اسلامی شعارات کے مماثل قرار دینا کج فہمی ہے جو لوگ ووٹ کو بیعت پر قیاس کرنے کی جرأت کرتے ہیں یا جمہوریت کو اسلامی شوریٰ پر۔ وہ اسلامی سیاست سے نابلد ہیں۔ تاہم ہماری گزارشات کے مطابق ووٹ ڈالنا ہو یا امیدواری کا مسئلہ، اس کا اصل تعلق اسلام کے لیے جدوجہد کرنے سے ہے لیکن یہ بھی واضح رہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ لادینی نظاموں کے ذریعے نفاذ شریعت کا مقصد حاصل ہوسکتا ہے بلکہ ایسے اداروں میں شامل ہو کر زیادہ سے زیادہ برائی کے خلاف دفاع کیا جاسکتا ہے یا خیر کے کچھ رستے تلاش کیے یا کھولے جاسکتے ہیں۔

البتہ انتخاب کے سلسلے میں ایک بات کا تعلق زیادہ تر تجربہ سے ہے جو گزشتہ تقریباً پچاس سال سے ہم پاکستان میں دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ جمہوری انتخاب میں ووٹ سے آگے بڑھ کر امیدواری اور کامیابی کے لیے دیگر سیاسی جماعتوں سے مقابلہ اور گٹھ جوڑ کے لیے مروجہ سیاسی ہتھکنڈوں کے حوالے سے جو شخص سیاسی فریب اور جھوٹ کو اختیار نہ کرے۔ اس کا اقتدار میں آنا مشکل ہوتا ہے۔ اتفاقات کی بات چھوڑیئے، عام حالات میں اگر وہ مکار، منافقانہ ہتھکنڈے اس یکساولی سیاست میں استعمال نہ ہوں تو یا ناکامی مقدر بنتی ہے یا

پھر کامیاب ہونے والا ''شوپیس'' بن کر رہ جاتا ہے ایسے حالات میں مقصد خیر کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کرنے کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ اگر اس کا دروازہ چوپٹ کھول دیا جائے تو پھر تقویٰ و دین کا اللہ ہی حافظ ہے! لہٰذا ہمارے نزدیک اس میدان میں اترنے کی مشروط اجازت دفاع دین کے لیے اسی قدر ہے جتنی جہاد و قتال میں دشمن کے خلاف مکر و فریب کی ہوسکتی ہے۔ اس لیے ہم انتخابات میں شرکت کی گنجائش، نفاذ شریعت کا مؤثر ذریعہ ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ شر میں کمی کی غرض سے دینی دفاع کے ایک حربہ کے طور پر ہی پاتے ہیں۔ کیونکہ جمہوری انتخابات میں بالفرض کامیاب ہوکر زیادہ سے زیادہ چہرے بدلے جاسکتے ہیں۔ نظام میں تبدیلی مشکل ہوتی ہے۔ پھر یکساولی سیاست تو ایک کاروبار ہے۔ اس میں جو لوگ آتے ہیں وہ زیادہ تر نو دولتیے، جاگیردار اور ایسے صنعت کار ہوتے ہیں جن کے پاس سیاست بازی کے لیے اوقات فارغ ہوتے ہیں۔ وہ اقتدار کے لیے غلط طریقوں سے حاصل کردہ دولت کا بے دریغ استعمال کر کے کرسئ اقتدار پر براجمان ہوتے ہیں۔ پھر اقتدار کا حصہ بنتے ہیں وہ جوع الکلب (کتے سے منسوب حرص کی بیماری) کی صورت میں لوٹ مار میں مبتلا ہو جاتے ہیں بلکہ یہ سیاست تو ایک کاروبار ہے۔ دوسرے پیشوں کی طرح اس کے لیے خاندان مخصوص ہوتے ہیں۔ ایک ہی خاندان کے افراد مختلف جماعتوں سے وابستہ ہو جاتے ہیں کہ اگر مخصوص جماعت اقتدار میں آئی تو فلاں فرد کے ذریعہ سیاسی فائدہ اٹھائیں گے اور اگر دوسری جماعت کامیاب ہوگئی تو دوسرا فرد خاندانی مفادات کے لیے کام آئے گا۔ یہ کھیل اتنا گھناؤنا ہے کہ اس کی کوئی سنجیدہ قوم متحمل نہیں ہوسکتی۔ یہاں اس کی طرف اشارہ ہی کافی ہے۔ ایسے حالات میں بہت کم اللہ کے بندے نیک نیت رہ کر اپنی سیرت و کردار کا تحفظ کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسے معاشرے اور نظام کے زیر نگیں رہ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینا بھی کوئی نجات کی راہ نہیں ہے کیونکہ اس طرح اقتدار کے سرچشموں پر صرف گندے لوگ ہی قابض ہوکر نیکی کی راہیں زیادہ سے زیادہ مسدود کرتے چلے جائیں گے اور سارا معاشرہ انہی کے رحم و کرم پر رہ جائے گا۔

ہمارے نزدیک اگر کوئی شخص ہجرت کے مواقع نہ پائے اور دعوت دین یا دفاع دین کی مساعی میں شریک و معاون بھی نہ ہو تو یہ بھی بے کاری کی ایک شکل ہے بہرصورت مسلمان کو تادم حیات معاشرے کا عضو معطل بن کر رہنے کے بجائے کسی نہ کسی حد تک اصلاح میں اپنا حصہ ضرور ڈالنا چاہیے خواہ جتنا حضرت ابراہیم کی چتا پر پرندوں نے چونچوں سے پانی کے قطرے گرا کر لیا تھا۔ (اسی چتا پر گرگٹ یا چھپکلی کے پھونک مارنے کی

سرشت ہی کی بناء پر اس کا قتل باعث اجر وثواب ٹھہرا۔) ❶

④ جمہوری انتخابات میں حصہ لینے کی بناء پر کفر کا فتویٰ لگانا مناسب نہیں کیوں کہ کسی نظام کے کلی یا جزوی طور پر کافرانہ یا لادین ہونے کی بناء پر ہمارا طرز عمل صرف ہجرت کا نہیں ہونا چاہیے بلکہ اصل کام جدوجہد ہے۔ جس طرح رسول کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں تیرہ سال جدوجہد کی ہے۔ ہجرت کی اجازت تو آپ ﷺ کو انتہائی مجبوری کی حالت میں ملی۔ پھر ہجرت کوئی فرار نہیں بلکہ اصلاح کا ایک متبادل طریقہ کار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے کے بعد دوبارہ مکہ مکرمہ فتح کیا ہے۔

⑤ أخف الضررين (أهون البليتين) کے فقہی قواعد کا استعمال عموماً ان کی حیثیت جانے بغیر عام لوگ کرتے ہیں حالانکہ اصول فقہ اور فقہی قواعد کی اصطلاح میں بڑا فرق ہے۔ اصول فقہ کتاب وسنت سے مسائل کے استنباط کے لیے اجتہادی اصول ہیں تو قواعد فقہیہ استنباط مسائل کے وقت اجتہادی رویوں کو متوازن رکھنے کے کام آتے ہیں۔

"اهون البلیتین" کوئی اصول فقہ (اجتہاد) میں سے نہیں بلکہ ایک فقہی قاعدہ ہے۔ بہرصورت اس قاعدہ کی رو سے مصالح اور مفاسد کا باہمی تقابل کر کے مصلحت کو ترجیح دینا اور مفسدہ سے بچنا درست ہے۔ جب دین دار یا اسلام پسندوں کا مقابلہ دین بیزار یا سیکولر لوگوں سے ہو تو اس وقت ووٹ نہ دینا صرف ووٹ کا ضیاع نہیں ہوتا بلکہ بالواسطہ بے دین لوگوں کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے۔ کیوں کہ مروجہ جمہوری انتخابات میں اصل معیار ووٹوں کی حقیقی کثرت نہیں بلکہ مقابلہ میں ووٹوں کی اکثریت ہے۔ لہٰذا نسبتاً بھلے آدمیوں کو ووٹ نہ دینا اسے مقابلہ میں کم تر بنانے کا باعث ہوتا ہے۔ نتیجتاً برے لوگ اقتدار کے سرچشموں پر فائز ہو کر خیر کے راستے بالکل بند کر دیتے ہیں۔ یہ پہلو اگر نظر میں رہے تو مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید کی "سورۂ رُوم" کی ابتداء میں روم (اہل کتاب عیسائی) اور فارس (مشرک) کی جنگ میں مسلمانوں کو پہلے روم (عیسائیوں) کی شکست پر رنجیدہ ہونے کی بناء پر اس طرح تسلی دی گئی ہے کہ چند ہی سالوں میں رومی (عیسائی) فارس (مجوسیوں) پر غالب آئیں گے:

---

❶ (٤٣٨) ((من قتل وزغاً فی اول ضربة كتبت له مائة حسنة، و فی الثانية دون ذلك و فی الثالثة دون ذلك)) صحيح مسلم ، كتاب السلام، باب استحباب قتل الوزغ (٥٨٤٧)، ابو داؤد، كتاب الأدب ، باب فی قتل الأوزاغ (٥٢٦٣)

﴿ وَ يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ ﴾ (الروم:٤)

''اس دن مومن خوش ہوں گے۔''

حالانکہ عیسائی اور مجوسی دونوں کافر ہیں لیکن مشرکین کے بالمقابل اہل کتاب اسلام کے زیادہ قریب ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو نہ صرف اہل کتاب کی فتح کی بشارت دی گئی بلکہ ان کا خوش ہونا بھی پسندیدہ قرار پایا۔

نوٹ:

زیر نظر سوال و جواب کے بارے میں یہ گزارش مناسب ہے کہ ایسے معاملات کا تعلق اسلام اور مسلمانوں کے مصالح اور مفاسد سے ہے اور ایسے معاملات میں جو رد یے اختیار کئے جاتے ہیں وہ بھی تدبیر کی قسم سے ہیں۔ ان کے بارے میں کفر و شرک کا فتویٰ تشدد اور انتہا پسندی ہے۔ البتہ مکرر یہ بات واضح رہے کہ وضعی نظام ہائے سیاست کا اسلام سے پیوند لگانا قطعاً درست رویہ نہیں۔ مسلمانوں کے اندر غور وفکری کے طور پر ان نظاموں کی خرابیوں کو واضح کرنا اور اسلامی نظام کی خوبیاں اجاگر کرنا بڑا ضروری ہے۔ بالخصوص تقابلی مطالعہ کے وقت وہ فرق ضرور ملحوظ رکھنے چاہئیں جن کی بناء پر لادین نظاموں کی بعض جزئیات کے لیے اسلامی نظام کی بعض جزئیات سے تشابہ کا مغالطہ دینے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔

٦ آج ہمیں یہ چیلنج درپیش ہے کہ اسلامی اصول وضوابط کے مطابق دور حاضر کے لیے اسلام کا قابل عمل سیاسی نظام دنیا کے سامنے پیش کریں اور جب تک کوئی ایسی صورت حال نہیں ہوتی ایسی بحثوں کی اشاعت مفید ہے جو کتاب وسنت کی روشنی میں ہمارے تدبیری معاملات میں راہنمائی کر سکیں۔ شیخ عبدالرحمٰن عبدالخالق کی محولہ بالا کتاب جو اگرچہ زیر بحث موضوع پر جامع تبصرہ کی حامل نہیں بلکہ مروجہ لادینی نظاموں میں اشتراک کی پر زور حمایت کا ایک رخ ہی ہے تاہم ایسی مباحث کا بہ دلائل مطالعہ غور وفکر کی راہیں ضرور کھولتا ہے۔ اس طرح معاشرہ میں باشعور طرز عمل اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ کتاب جس طرح عربی میں شائع ہوئی ہے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہونا چاہیے۔ اس وضاحت کے ساتھ کہ کویت کا جمہوری دور ابھی جمہوریت کے تجربہ سے اتنا آشنا نہیں جتنا پاکستان یا وہ ملک اس تجربہ کی خوبیوں اور خرابیوں سے متعارف ہو چکے ہیں جو ایک عرصہ سامراج کے زیر نگیں رہے اور اب بھی انہیں سامراجی نظاموں کی دلدل سے نکل کر اسلام کی طرف پیش رفت کرنا ہے۔

﴿إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ (محمد:۷)

سوال: آج کل بازاروں میں دکان، مکان، جان اور مال میں خیر و برکت کے لئے قرآن کے مخصوص الفاظ فریم کیے ہوئے ملتے ہیں۔ کیا ان فریموں کو اپنی رہائش یا کاروباری جگہ پر لٹکایا جا سکتا ہے؟

جواب: کتاب وسنت کی نصوص سے کسی جگہ مخصوص الفاظ قرآنی کا لٹکانا ثابت نہیں۔

سوال: شیزان شربت کا استعمال کرنا درست ہے یا نہیں؟

جواب: ''شیزان شربت'' میں محلول اشیاء اگر حلال ہیں تو شربت بھی حلال ہے مگر چونکہ اس فیکٹری کا مالک فرقہ ضالہ ''قادیانی'' ہے۔ لہٰذا کوشش کرنی چاہیے کہ خرید وفروخت میں فائدہ کسی صحیح مسلمان کو پہنچے۔

سوال: جائے استعجاب ہے کہ بھارتی مسلمان علمائے کرام سیکولر ازم کو اسلام کی حقیقی تعبیر گردانتے ہیں اور مسلمان عوام کو اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ انتخابات میں سیکولر جماعتوں کو ہی ووٹ دیں۔ اشکال یہ ہے کہ اسلام کا سیاسی پہلو عالمی ہے یا علاقائی؟ یعنی اس کی تعبیر اپنے اپنے ملک کے معروضی حالات کو پیش نظر رکھ کر کی جانی چاہیے یا تمام اقوام عالم پر یکساں اصول لاگو ہوگا؟

جواب: میرے علم میں نہیں کہ آپ کا ادعا حقیقت کے مطابق ہو۔ اسلام اور کفر کی تعبیر کے واضح تفاوت میں کسی بھی کلمہ گو کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس لئے انڈین علمائے حق پر بدگمانی کرنا صحیح نہیں۔ اور جہاں تک سیکولر جماعتوں کو ووٹ ڈالنے کا تعلق ہے سو دیارِ کفر میں ان کی مجبوری سمجھیں۔ جس طرح کہ ہمارے ہاں بھی اس عمل کی آمیزش موجود ہے۔ اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں کو راہ حق اختیار کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین!

سوال: تامرگ بھوک ہڑتال کرنا اسلام میں جائز ہے یا ناجائز؟

① اور اگر ناجائز ہے تو اس کی شرعی سزا کیا ہے؟

② تامرگ بھوک ہڑتال کرنے والے کی حمایت کرنا جائز ہے۔ یا ناجائز؟

③ اگر ناجائز ہے تو اس کی سزا کیا ہوگی؟

④ علمائے کرام کا تامرگ بھوک ہڑتال کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا کیسا ہے؟

جواب: تامرگ بھوک ہڑتال کرنا غیر اسلامی تصور اور اللہ کی رحمت سے یأس اور ناامیدی کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک مومن کے لائق نہیں ہے کہ لمحہ بھر بھی اپنے محسن اعظم اللہ رب العزت سے روگردانی کر کے تعلق منقطع کرے۔ نفع ونقصان اور خیر وشر سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔

کائنات کے فہیم ترین انسان حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

«اِعلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى أَنْ يَنْفَعُوْكَ بِشَيْئٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ إِلَّا بِشَيْئٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ وَ لَوِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى أَنْ يَضُرُّوْكَ بِشَيْئٍ لَمْ يَضُرُّوْكَ إِلَّا بِشَيْئٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَ جَفَّتِ الصُّحُفُ .» ❶

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ :حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ)

یعنی ''سب لوگ جمع ہو کر اگر تجھے کوئی بھلائی پہنچانا چاہیں تو صرف اسی قدر دے سکتے ہیں جو کچھ اللہ نے تیرے لئے لکھا ہے اور اگر سب لوگ جمع ہو کر تجھے نقصان پہنچانا چاہیں تو صرف اسی قدر پہنچا سکتے ہیں جو تیرے مقدر میں ہے۔ قلمیں کتابت سے فارغ ہو چکیں اور صحیفے خشکی کا مظہر ہیں۔''

اور دوسری روایت میں ہے:

«اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ أَمَامَكَ، تَعَرَّفْ إِلَى اللّٰهِ فِي الرَّخَاءِ يَعْرِفْكَ فِي الشِّدَّةِ » ❷

یعنی ''اللہ سے تعلق پیدا کر تو اسے سامنے پائے گا، آسانی میں اس سے راہ ورسم پیدا کر وہ سختی میں تجھے پہچان لے گا۔''

قرآن مجید نے حضرت یعقوب علیہ السلام کا قول بایں الفاظ نقل کیا ہے:

﴿ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَأَخِيْهِ وَلَا تَيْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِنَّهٗ لَا يَيْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ .﴾(یوسف:۸۷)

''بیٹا (یوں کرو کہ ایک دفعہ پھر) جاؤ، اور یوسف اور ان کے بھائی کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو کہ اللہ کی رحمت سے بے ایمان لوگ ناامید ہوا کرتے ہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ أَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ

❶(۴۳۹) صححه احمد شاكر والألبانى، صحيح الترمذى، ابواب صفة القيامة باب رقم (۲۲)، ح(۲۶۴۸)، احمد(۱/۲۹۳،۳/۱۹۵) (۲۶۶۹۔ شاكر)

❷(۴۴۰) صححه احمد شاكر، أحمد(۱/۳۰۷،۳/۲۴۶)، (۲۸۰۴۔ شاكر)، الطبرانى فى الكبير (۱۱/۱۰۰)(۱۱۲۴۳)

الْأَرْضِ أَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ .﴾ (النمل:٦٢)

''بھلا کون بے قرار کی التجا قبول کرتا ہے جب وہ اس سے دعا کرتا ہے اور (کون اس کی) تکلیف کو دور کرتا ہے اور (کون) تم کو زمین میں (اگلوں کا) جانشین بناتا ہے (یہ سب کچھ اللہ کرتا ہے) تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہے (ہرگز نہیں)۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ .﴾ (البقرة:١٩٥)

نیز مصائب و مشکلات سے نجات حاصل کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ کا طریقۂ کار یہ تھا کہ آپ ﷺ نماز میں منہمک ہو جاتے تھے۔

ان نصوص صریحہ سے معلوم ہوا کہ ہر حالت میں اعتماد بندوں کے بجائے صرف اللہ کی ذات پر ہونا چاہیے،کلمہ : "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ "کا مفہوم بھی یہی ہے۔

اور اگر کوئی ناعاقبت اندیش اس حالت میں مر جاتا ہے تو اس نے علیٰ وجہ البصیرت جہنم کا مہنگا سودا کیا ہے۔اہل اصول فرماتے ہیں:

" مَنْ تَعَجَّلَ بِشَيْءٍ قَبْلَ أَوَانِهِ عُوقِبَ بِحِرْمَانِهِ ."

دوسرے لفظوں میں اس فعل کا نام خود کشی بھی رکھا جا سکتا ہے جس کی وعید کے بارے میں کتاب و سنت میں بے شمار نصوص ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔

بہرصورت فعل ہذا کے ارتکاب سے اجتناب ایک ضروری امر ہے۔اس لئے کہ انسانی جسم چونکہ اللہ کی امانت ہے لہٰذا اس کی حفاظت بذمہ انسان ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا .﴾ (آل عمران:٢٩)

''اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو کچھ شک نہیں کہ اللہ تم پر مہربان ہے۔''

ذمہ داران سے مطالبات تسلیم کرانے کی بیسیوں شکلیں ہیں۔کسی بھی مباح شکل کو بطور تدبیر اختیار کیا جا سکتا ہے۔

﴿ بِيَدِهِ الْخَيْرُ إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ .﴾

علماء پر ضروری ہے کہ منکر کا انکار کریں تا کہ فعل تقصیر سے بری الذمہ قرار پائیں۔ واللہ ولی التوفیق. اور مرتکب کی شرعی سزا صرف تائب ہونا ہے:

"اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَه ." ❶

سوال: کیا جماعت لاؤڈ سپیکر میں کرانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: لاؤڈ سپیکر میں جماعت کرانا جائز ہے کیونکہ یہ محض مقتدیوں تک ابلاغ صوت کا ایک ذریعہ ہے جس طرح کہ سامع کے ذریعہ آواز کو دور تک پہنچانے کا جواز ہے۔

سوال: حکومت ہماری تنخواہ سے جبراً جی پی فنڈ کی کٹوتی کرتی ہے۔ اس پر سالانہ سود لگاتی ہے۔ کیا مذکورہ فنڈ بمع سود لے سکتے ہیں یا نہیں نیز لینے کی صورت میں سود والی رقم کن جگہوں پر لگائی جا سکتی ہے؟

جواب: کل رقم حاصل کر لیں۔ البتہ جی پی فنڈ سے حاصل ہونے والے سود کا مصرف یہ ہے کہ وہ رقم کسی ایسے شخص کو دے دی جائے جس نے سودی رقم دینی ہے یا جس پر حرام کی چٹی ہے تا کہ اسے اس سے خلاصی مل جائے لیکن مباح کاموں پر خرچ کرنا حرام ہے۔ مسئلہ ھذا پر جملہ تفصیلات ''الاعتصام'' میں شائع شدہ ہیں۔

سوال: عمرو کی بیوی کے ہاں جب بھی بچہ پیدا ہوتا ہے، آپریشن کے ساتھ ہوتا ہے۔ گذشتہ ۲۰ یا ۲۲ ماہ کے عرصہ میں اس کے تین اپریشن ہو چکے ہیں دو تو بچوں کے لئے جب کہ ایک اپریشن ٹانگ ٹوٹنے کی بناء پر ہوا۔ اب کی بار بچہ کی پیدائش کے بعد لیڈی ڈاکٹر نے سختی سے کہا کہ آئندہ آپ کے ہاں کم از کم پانچ سال کا وقفہ انتہائی ضروری ہے۔ بصورت دیگر کیا وقفہ کے لئے کوئی مصنوعی طریقہ اپنایا جا سکتا ہے؟ اور شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب: صورتِ ہذا میں اگر عزل کا طریقہ اختیار کر لیا جائے تو جواز ہے اگر چہ کراہت سے خالی نہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ بوقت انزال پانی باہر ڈال دیا جائے یا کوئی اور ذریعہ اختیار کیا جائے۔ بصورت دیگر یعنی سرعت انزال وغیرہ کی بناء پر ادویات کے استعمال کی بھی گنجائش ہے کیوں کہ جان کا بچانا فرض ہے۔ تاہم شرط یہ ہے کہ وہ قاطع نسل نہ ہوں۔ بایں وجہ اگر جماع کے وقت محفوظ مصنوعی آلہ کو اختیار کر لیا جائے تو بھی کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ (هٰذَا مَا عِنْدِیْ، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ)

سوال: جب کسی مفتی صاحب سے شرعی احکام کے متعلق فتویٰ لیا جاتا ہے تو وہ فتویٰ دینے سے پہلے اپنی ذات مدرسہ کے نام پر مقررہ فیس لے کر فتویٰ دیتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟

---

❶ (٤٤١) صحیح ابن ماجه، کتاب الذهد، باب ذکر التوبة (٤٢٥٠) والضعیفة ٨٣/٢ (٦١٥) حسنه الألباني وقال...... حسنه ابن حجر.

جواب: حضرات مفتیان کرام کا شرعی فتویٰ پر عام حالات میں فیس وصول کرنا مستحسن فعل نہیں۔ ہاں البتہ اگر کوئی اپنی مرضی سے یا مدرسہ یا ادارہ وغیرہ کی خدمت کر دے تو منع بھی نہیں ہے:

﴿ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا ﴾

(المزمل: ۲۰)

اسی طرح اگر کوئی مفتی صاحب محتاج ہوں تو وہ بھی قاضی پر قیاس کرتے ہوئے حق خدمت وصول کرنے کے مجاز ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری کے ترجمۃ الباب میں ہے:

" وَكَانَ شُرَيْحٌ الْقَاضِي يَأْخُذُ عَلَى الْقَضَاءِ أَجْرًا. وَقَالَتْ عَائِشَةُ: يَأْكُلُ الْوَصِيُّ بِقَدْرِ عَمَلِهِ. وَأَخَذَ أَبُوبَكْرٍ وَعُمَرُ. " [1]

''قاضی شریح قضاء پر اجرت لیتے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: "وَصِیّ" اپنی محنت کے بقدر رقم وصول کر سکتا ہے اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے بھی یہ حق وصول کیا ہے۔''

سوال: وضاحت فرمایئے کہ ہومیو پیتھی طریقہ علاج اپنانا، اس کی پریکٹس کرنا کس حد تک جائز ہے؟

اس میں درج ذیل امور وضاحت طلب ہیں:

۱ کہ ہومیو پیتھی ادویات کی تیاری میں الکوحل ایک بنیادی عنصر ہے۔

۲ باوجودیکہ ہومیو پیتھی ادویہ الکوحل میں تیار کی جاتی ہیں اور اسی میں محفوظ رکھی جاتی ہیں مگر یہ ادویہ قطعاً نشہ آور نہیں ہوتیں۔

۳ جب ادویہ مریض کو دی جاتی ہیں تو اکثر الکوحل کے اڑ جانے کے بعد مریض کو دی جاتی ہیں۔

جواب: ہومیو پیتھی ادویات کے ذریعہ طریقہ علاج جن مراحل سے گزرتا ہے وہ قابل اطمینان و تسلی نہیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ اس میں الکوحل کی آمیزش جزو لاینفک ہے اگرچہ مختلف مراحل میں بعض تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اس کے باوجود اس کے جواز کا قائل ہونا مشکل امر ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب سے سرکہ بنانے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی۔ [2] نیز امام موصوف نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی

---

[1] (۴۴۲) صحیح البخاری، کتاب الأحکام، باب رزق الحکام والعاملین علیها.

[2] (۴۴۳) صحیح مسلم، کتاب الأشربة، باب تحریم تخلیل الخمر (۵۱۴۰).

نقل کی ہے کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے یتیموں کے متعلق پوچھا جنہیں شراب ورثہ میں ملی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شراب بہا دو! ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم اس سے سرکہ نہ بنالیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ ❶

امام زیلعی رحمہ اللہ " نَصبُ الرَّایَة " میں لکھتے ہیں: شافعیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث سے استدلال کیا ہے کہ شراب سے سرکہ بنانا منع ہے۔ اگر شراب سے سرکہ کی کشید جائز ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے بیان فرما دیتے۔ جس طرح کہ مردہ بھیڑ کے چمڑے کی دباغت کے متعلق اجازت مرحمت فرمائی۔

اگرچہ بعض روایات اس کے برعکس بھی ہیں لیکن اہل علم نے ان کی مختلف توجیہات کی ہیں جن کی تفصیلات مطولات میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم میں کہتے ہیں: کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب سے سرکہ کشید کرنے کے بارے میں پوچھا گیا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ شوافع اور جمہور کے نزدیک اسی دلیل کی بناء پر شراب میں پیاز، روٹی اور کھیرا وغیرہ ڈال کر سرکہ بنانا جائز نہیں۔ کہ اس سے شراب کی نجاست ختم نہیں ہوتی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس شراب یا اس طرح حاصل کردہ سرکہ میں ڈالی ہوئی چیز دھونے یا کسی اور طرح سے ہرگز پاک نہیں ہوتی۔ ہاں اگر شراب کو دھوپ سے ہٹا کر سایہ میں یا سایہ سے ہٹا کر دھوپ میں رکھ دیا جائے اور اس سے سرکہ بن جائے تو یہ صحیح قول کے مطابق پاک ہے۔ البتہ اگر اس میں کوئی چیز ڈال دی جائے تو پاک نہیں ہوتی۔ شافعی احمد اور جمہور کا یہی مذہب ہے۔

امام اوزاعی، لیث اور ابوحنیفہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ وہ پاک ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے تین روایتیں نقل ہوئی ہیں۔ صحیح روایت یہ ہے کہ اس طرح سرکہ بنانا ناجائز ہے۔ اس کا مرتکب گنہگار ہوگا۔ البتہ سرکہ پاک ہو گا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اس طرح (یعنی کوئی چیز ڈال کر) سرکہ بنانا ناجائز ہے۔ اور سرکہ بھی پاک نہیں رہتا۔ ایک تیسری روایت یہ ہے کہ سرکہ بنانا بھی جائز ہے اور سرکہ بھی پاک ہے۔ البتہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر شراب خود سے سرکہ بن جائے تو پاک ہے۔

علامہ عظیم آبادی فرماتے ہیں: مذکورہ بالا تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں صحیح رائے امام شافعی احمد اور جمہور علماء رحمہم اللہ کی ہے کہ شراب سے خاص طور پر سرکہ بنانا ناجائز اور ممنوع ہے اور اس طرح کشید کردہ

---

❶ (٤٤٤) سنن الدارمی (٢١٦١)

سرکہ پاک نہیں ہوتا۔ البتہ اگر کسی چیز کی ملاوٹ کے بغیر مشروب خود سے سرکہ میں تبدیل ہو جائے تو پاک اور حلال ہے۔ ظاہر ہے ملاوٹ کے ساتھ سرکہ بنانا ہی ناجائز ہو تو پھر اس کا استعمال کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

''بلا شبہ شراب کا سرکہ بھی سرکہ ہے مگر شارع نے اسے ناجائز قرار دیا ہے اگر جائز ہوتا تو آپ ﷺ یتیموں کا مال ہرگز ضائع کرنے کا حکم نہ دیتے بلکہ یتیموں کو اس مال سے حلال طریقے سے فائدہ پہنچاتے۔'' (فتاوی عظیم آبادی، ص ۳۳۲)

اسی طرح ہومیوپیتھی ادویات سے مختلف مراحل طے کرنے کے باوجود ''الکوحل'' کی نجاست زائل نہیں ہوتی۔ اگرچہ ظاہر سکر (نشہ) محو ہو جاتا ہے لیکن تاثیر امکانی حد تک موجود رہتی ہے۔ جس کا کوئی بھی ذی عقل اور صاحب شعور انکار نہیں کر سکتا۔ نبی اکرم ﷺ نے شراب کو جو سرکہ میں حلول کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس کا سبب بھی یہی ہے کہ کسی نہ کسی انداز میں نجاست کا اثر قائم رہتا ہے جو مسلمان کی جسمانی و روحانی طہارت و پاکیزگی کے منافی ہے۔ حدیث میں ہے:

((مَا أَسْكَرَ كَثِيرُهُ فَقَلِيلُهُ حَرَامٌ .)) [1]

یعنی ''جس شئ کے زیادہ استعمال سے نشہ آئے وہ تھوڑی بھی حرام ہے۔''

اس کی وجہ یہی ہے کہ کمتر جز بھی نجاست میں مؤثر ہے۔ اس وجہ سے شرابی کی نماز کے عدم قبولیت میں اس کی بہت بڑی تاثیر ہے جو اثر کئی روز تک زوال پذیر نہیں ہوتا۔

بھلا وہ شئ جس کو قرآن نے رِجس اور شیطانی عمل قرار دے کر تہدیدی ووعیدی تاکیدات کے الفاظ کے ساتھ روکا ہو اس میں خیر و برکت توقع کرنا کیسے ممکن ہے۔ ہماری سوچ وفکر کا معیار بھی انتہائی عجیب وغریب ہے کہ ''الکوحل'' ادویات کو محفوظ کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ بھلا وہ شئ جو بذاتہ ''ام الخبائث'' ہو یہ دائمی نفع بخش کیسے ثابت ہو سکتی ہے۔

زمانہ قدیم میں اطباء کی عادت تھی کہ وہ جملہ ادویات کو شہد کے ذریعے محفوظ رکھتے تھے۔ شہد کو کتاب و سنت میں شفاء قرار دیا گیا ہے۔ بے شمار امراض کے لئے مفید ہے جن کا احاطہ اس مختصر مجلس میں ممکن نہیں۔

---

[1] (٤٤٥) صححه ابن حبان والألباني، وحسنه الترمذي والزيلعي، صحيح ابی داؤد، كتاب الأشربة، باب ما جاء في السكر (٣٦٨١)، الترمذي(١٨٦٥)، عن جابر، والنسائي(٥٦١٠) عن ابی عمرو، ابن ماجه (٣٣٩٣)، عن ابن عمر، الدارمي(٢٠٩٩)، عن سعد، نصب الراية (٣٠٧،٣٠٥/٤) اور امام زیلعی نے کہا: کہ اس کے مخالف مفہوم والی روایات ضعیف ہیں۔

اطباء نے لکھا ہے کہ اس کی تراوت سے تین ماہ تک گوشت کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ بالوں کو نرم ملائم خوبصورت بناتا ہے۔ رگوں اور انتڑیوں کو صاف کرتا ہے۔ میت کے جسم کو بوسیدہ ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (فتح الباری ١٠/١٤٠)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَلَمْ یَکُنْ یُعَوِّلُ قُدَمَاءُ الْأَطِبَّاءِ فِی الْأَدْوِیَةِ الْمُرَکَّبَةِ إِلَّا عَلَیْهِ ،وَلَا ذِکْرَ لِلسُّکَّرِ فِی أَکْثَرِ کُتُبِهِمْ أَصْلًا ."

"قدیم اطباء مرکب ادویات میں صرف شہد پر اعتماد کرتے تھے۔ ان کی اکثر کتابوں میں نشہ کا بالکل ذکر نہیں ملتا۔"

پھر قدیم علماء کی عادت بھی یہی تھی کہ وہ طب جسمانی کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے بلکہ عالم ساتھ حکیم بھی ہوتا تھا۔ اس کی بہترین مثالیں ماضی قریب میں محدث گوندلوی اور محدث روپڑی تھے۔ (رحمہما اللہ)

وائے افسوس! آج ہم اس ورثہ سے محروم نظر آ رہے ہیں۔ اس کی وجہ محض انگریزی طریقۂ علاج پر اعتماد ہے۔ جس میں نقصان کے پہلو غالب ہیں۔ آج ہم اسلامی طریق علاج سے روگردانی کر کے اغیار کی تقلید میں سیدھی راہ سے بھٹک چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری راہنمائی فرمائے! طب نبوی ﷺ کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق بخشے۔ آمین!

مسلمانوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ طب نبوی کی ترویج کے لئے مستقل ادارے قائم کریں تاکہ دنیا اسلامی طریق علاج کے فوائد و ثمرات سے مستفید ہو جس میں دنیا و آخرت کی برکات ہیں۔ اور دیگر علاج کے طریقوں پر اس کے تفوق کا بھی اظہار ہو۔ شاید کہ غیر اقوام کی ہدایت کا ذریعہ بن جائے۔ جیسے مشہور ہے کہ ایک انگریز ڈاکٹر حدیث "الذباب" پڑھ کر مسلمان ہو گیا تھا۔

سوال: کیا ہومیوپیتھی کی دوائی جس میں "الکوحل" تقریباً ۹۰ فی صد ہے، استعمال کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ "ایلوپیتھی" کی بھی کچھ ایسی دوائیاں ہیں۔ مثال کے طور پر کھانسی کے جو شربت ہیں ان میں بھی خمر ہے۔ وضاحت سے بیان کریں۔

جواب: ہر وہ دوائی جس کے بارے میں حتمی و یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ اس میں شراب کی آمیزش ہے۔ اس کا استعمال مطلقاً ناجائز ہے۔ سنن ابوداؤد میں حدیث ہے:

« إِنَّ اللّٰهَ أَنْزَلَ الدَّاءَ وَالدَّوَاءَ وَجَعَلَ لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءً فَتَدَاوَوْا وَلَا تَدَاوَوْا بِحَرَامٍ .» ❶

''بے شک اللہ نے بیماری اتاری ہے اور دوا بھی۔ہر بیماری کے لئے دوا کر دی ہے ۔ پس علاج کرواور حرام کے ساتھ علاج نہ کرو۔''

سوال: سرکاری ملازمین کی تنخواہ کا کچھ حصہ ان کی ملازمت گریڈ اور تنخواہ کے لحاظ سے جبراً کاٹ لیا جاتا ہے جسے جی۔ پی فنڈ کہا جاتا ہے اور پھر بنکوں کے طریق کار کے مطابق اس پر سالانہ منافع یا سود بھی جمع ہوتا رہتا ہے۔ یہ رقم اس سرکاری ملازم کو ریٹائرمنٹ کے موقعہ پر۔اصل مع زائد۔ ادا کی جاتی ہے۔

اب جواب طلب امور یہ ہیں کہ:

① کاٹی گئی مقدار سے زائد وصول کرنا اس ملازم کے لئے شرعًا جائز ہے یا نہیں؟

② جائز نہیں تو وہ شخص اسے وصول کرے یا نہ کرے؟ کیونکہ اگر وہ خود وصول نہ کرے تو متعلقہ محکموں کے افسران اور کارندے کھا جاتے ہیں؟

③ اور جو شخص اسے وصول کر چکا ہو۔اب اس رقم کو کہاں خرچ کرے؟

براہ کرم ان پیش آمدہ سوالات کا شرعی حل پیش فرمائیں۔ اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ مثلاً آج سے تیس برس قبل جو رقم کاٹی گئی آج اگر اتنی ہی واپس ملے تو اس کی مالیت پہلے کی نسبت کہیں کم ہو چکی ہے۔

جواب: ہر سرکاری ملازم کی تنخواہ سے حکومت جو مخصوص نسبت سے کٹوتی کرتی ہے پھر ملازمت کے اختتام پر اسے بمعہ سود متعلقہ شخص کو ادائیگی کی جاتی ہے۔ چونکہ فعل ہذا ملازم کی رضا مندی سے نہیں ہوتا اس لئے وہ بری الذمہ ہے۔

اور جہاں تک سودی رقم کی وصولی کا تعلق ہے۔اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں:

انسان اس کو وصول کرے یا چھوڑ دے بظاہر دونوں صورتوں میں قباحت معلوم ہوتی ہے۔لیکن چھوڑنے میں قباحت زیادہ ہے۔ممکن ہے سرکار اس مال کو ایسے مشن پر صرف کر دے جہاں اسلام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو یا کارندے خود ہی ہضم کر جائیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ سودی مال وصول کر لیا جائے

---

❶(٤٤٦) ضعفه الألباني،أبو داؤد، كتاب الطب،باب في الأدوية المكروهة(٣٨٧٤)،ضعيف أبي داؤد، (٨٣٣) فيه إسماعيل بن عياش وهو ضعيف،غاية المرام(٦٦)لكن نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الدواء بالخمر، انظر: صحيح مسلم،الأشربة(٥١٤١)أبو داؤد(٣٨٧٣).

اس کا کھانا چونکہ حرام ہے اس لئے حرام مال کو حرام رستے صرف کر دینا چاہیے۔ مثلاً کسی نے سودی قرض دینا ہے اس کی اعانت کر دے تا کہ وہ سود اتار دے یا اپنا جائز حق نہیں مل رہا کوئی ظلم سے دبائے بیٹھا ہے اور وہ کسی شے کا خواہاں ہے اس کو سودی رقم پیش کر کے اپنا حق وصول کرے یا کسی کو ناحق جرمانہ ہو گیا تو اس سے اس کو ادا کر دے۔

غرضیکہ اصلاً بھلائی اور خیر کے کسی بھی کام میں اس کو خرچ نہ کیا جائے بلکہ حرام شے کو حرام طریق سے ہی نکالنا چاہیے۔ مذکور بحث میں جو موقف اختیار کیا گیا ہے۔ ائمہ اصول فقہ کی اصطلاح میں وہ اختیار ''اَھْوَنُ الْبَلِیَّتَیْن'' سے موسوم ہے ایسی پیش آمدہ صورت میں آدمی اگر دونوں ناجائز کاموں کو چھوڑ سکتا ہو تو اولیٰ یہی ہے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو ہلکے کام کو اختیار کر لیا جائے۔

اس کی مثال حضرت یوسف علیہ السلام کا زنا کے بالمقابل جیل کو اختیار کرنا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ﴾ (یوسف:۳۳)

یعنی ''یوسف علیہ السلام نے دعا کی کہ پروردگار! جس کام کی طرف یہ مجھے بلاتی ہے اس کی نسبت مجھے قید پسند ہے۔''

اور اگر حضرت یوسف علیہ السلام رب کریم سے دونوں مصیبتوں کے ازالے کی التجا اور دعا کرتے تو اللہ تعالیٰ دونوں کو ٹالنے پر قادر تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ نیز کٹوتی کی رقم وصول کرنے پر کوئی کلام نہیں۔ ہر فرد کو بصد خوشی اپنا استحقاق حاصل کرنا چاہیے مالیت کی کمی بیشی کا معاملہ بھی احتساباً اللہ کے سپرد کر دینا چاہیے۔

﴿ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِينَ ﴾ (سبا:۳۹) وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَاب.

کیا جی پی فنڈ کا سود وصول کرنا چھوڑنے سے چھوٹی برائی ہے؟

فتویٰ پر تعاقب، از حافظ عبد السلام بھٹوی حفظہ اللہ (۱)

ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور میں ایک مفتی صاحب کا فتویٰ شائع ہوا ہے جس میں جی پی فنڈ کی سودی رقم کی وصولی کو کمتر برائی قرار دے کر وصول کر لینے کا مشورہ دیا گیا ہے، اس سے پہلے بھی ''الاعتصام'' میں اس موقف کی تبلیغ کے لیے بعض علماء کے فتوے شائع ہوئے تھے، اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ قرآن و حدیث کی رو سے مفتی صاحب کی خطا واضح کروں، اور اللہ تعالیٰ کا حکم صاف الفاظ میں سب بھائیوں تک پہنچاؤں۔

سائل کا سوال یہ تھا کہ: سرکاری ملازمین کی تنخواہ کا کچھ حصہ ان کی ملازمت گریڈ اور تنخواہ کے لحاظ سے جبراً کاٹ لیا جاتا ہے جسے جی پی فنڈ کہا جاتا ہے اور پھر بنکوں کے طریق کار کے مطابق اس پر سالانہ منافع یا سود بھی جمع ہوتا رہتا ہیں، یہ رقم اس سرکاری ملازم کو ریٹائر منٹ کے موقع پر ...... اصل مع فنڈ...... ادا کی جاتی ہے اب جواب طلب یہ امور ہیں کہ:

① کاٹی گئی مقدار سے زائد وصول کرنا اس ملازم کے لیے شرعاً جائز ہے یا ناجائز ؟

② جائز نہیں تو وہ شخص اسے وصول کرے یا نہ کرے کیونکہ اگر وہ خود وصول نہ کرے تو متعلقہ محکموں کے افسران اور کارندے کھا جاتے ہیں۔

③ اور جو شخص اسے وصول کر چکا ہو اب اس رقم کو کہاں خرچ کرے؟ الخ

مفتی صاحب نے اس کا جواب جو لکھا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

① سودی رقم وصول کرنے اور چھوڑنے دونوں میں قباحت ہے۔

② سودی رقم چھوڑنے میں قباحت زیادہ ہے۔

③ سودی رقم وصول کرنا اھون البلیتین ہے۔

④ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ دو ناجائز کاموں میں سے ہلکے ناجائز کو اختیار کرنے کی مثال ہے۔

ہمارے خیال میں یہ سب باتیں غلط ہیں جس کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے۔

سودی رقم وصول کرنے کی قباحت:

اس بات پر مفتی صاحب بھی متفق ہیں کہ زائد رقم سود ہے اس لیے پہلے ہم وصول کرنے کی قباحت پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس کے لیے صرف چند آیات و احادیث تحریر کی جاتی ہیں تاکہ بات مختصر رہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی ہے اسے چھوڑ دو۔ اگر تم مومن ہو۔ پس اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمھارے خلاف اعلان جنگ ہے اور توبہ کرلو تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حق دار ہو۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سودی رقم چھوڑ دینے اور صرف اپنی اصلی رقم وصول کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر کوئی شخص سودی رقم وصول کرے گا تو اس کا یہ فعل ایمان کے منافی ہے اور اللہ اور اس کے

رسول ﷺ کی طرف سے اس کے خلاف اعلان جنگ ہے۔

حضرت عبداللہ بن حنظلہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

« دِرْهَمٌ رِبًا يَأْكُلُهُ الرَّجُلُ وَ هُوَ يَعْلَمُ اَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَ ثَلَاثِيْنَ زِنْيَةً .»[1] (مسند احمد)

یعنی ''سود کا ایک درہم آدمی جانتے ہوئے کھائے تو چھتیس زناؤں سے زیادہ سخت ہے۔''

حافظ ہیثمی رحمہ اللہ اور حافظ منذری رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔''

شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے مشکوۃ کے حاشیہ میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ صرف سود کھانا حرام ہے بلکہ سود مطلقاً حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ حَرَّمَ الرِّبَا . ﴾

یعنی ''اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔''

یہ آیات سن کر دوبارہ سود لینے والے کے متعلق فرمایا:

﴿ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ . ﴾

''یعنی جو دوبارہ سود لے تو یہ لوگ جہنمی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

سود کھائے، پہنے، کسی اور استعمال میں لائے یا صرف وصول کرے ہر طرح حرام ہے اور ہمیشہ آگ میں رہنے کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے جرائم میں یہ بھی شمار فرمایا ہے:

﴿ وَ اَخْذِهِمُ الرِّبَا . ﴾

''وہ سود لیتے تھے۔''

پھر صرف سود کھانا یا لینا ہی حرام نہیں اس سے تعلق بھی حرام ہے اور لعنت کا باعث ہے چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

« لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ آكِلَ الرِّبَا وَ مُؤْكِلَهُ وَ كَاتِبَهُ وَ شَاهِدَيْهِ وَ قَالَ هُمْ سَوَاءٌ .»[2]

'' رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، اس کے لکھنے والے اور اس کے دونوں

---

[1] (٤٤٧) صحيح الترغيب (٣٧٦/٢)، رقم (١٨٥٥)، الارواء (١٢٧/٣)، للألباني و صححه.

[2] (٤٤٨) صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب لعن آكل الربا و موكله......(٤٠٩٣).

گواہوں پر لعنت فرمائی اور فرمایا کہ یہ سب برابر ہیں۔''

یہ حدیث صحیح مسلم میں ہے اور صحیح بخاری میں حضرت ابو جحیفہ سے اسی مفہوم کی حدیث موجود ہے۔ ❶

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اَلرِّبَا ثَلَاثَةٌ وَ سَبْعُوْنَ حُوْبًا اَيْسَرُهَا مِثْلُ اَنْ يَنْكِحَ الرَّجُلُ اُمَّهُ . » ❷

''سود کے تہتر گناہ ہیں جن میں سب سے ہلکا اس طرح ہے کہ آدمی اپنی ماں سے نکاح کرے۔''

یہ حدیث ابن ماجہ میں ہے۔ شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے صحیح ابن ماجہ میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ❸

بلوغ المرام میں ہے کہ حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اس میں'' ثلاثه و سبعون حوباً. '' کی جگہ ''ثلاثة و سبعون بابًا.'' ہے یعنی سود کے تہتر دروازے ہیں۔ ❹

ان آیات و احادیث سے معلوم ہوا کہ ''جی پی فنڈ'' یا کسی اور طریقے سے اپنی رقم کے ساتھ سودی رقم وصول کرنا حرام اور ایمان کے منافی ہے۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ قبول کرنے، جہنمی بننے اور رسول اللہ ﷺ کی زبانی ملعون بننے کا سبب ہے۔ اس کا ایک ایک درہم چھتیس چھتیس زناؤں سے زیادہ گناہ گار بننے کا باعث ہے اور اس کا سب سے ہلکا گناہ ماں کے ساتھ نکاح کے برابر ہے۔

سودی رقم وصول نہ کرنے کی قباحت:

مفتی صاحب نے سودی رقم وصول نہ کرنے کی قباحت یہ بیان فرمائی ہے کہ ''ممکن ہے سرکار اس مال کو ایسے مشن پر صرف کر دے جہاں اسلام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو یا کارندے خود ہی ہضم کر جائیں۔''

یہ امکان تو اس وقت بھی موجود تھا جب سود کی حرمت نازل ہوئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ﴿ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا . ﴾ کہہ کر ہر طرح کا سود چھوڑنے اور صرف اپنی اصل رقم لینے کا حکم دیا تھا۔

ہمارے مفتی صاحب کے مطابق اللہ تعالیٰ کو وضاحت فرما دینی چاہیے تھی کہ اگر تمھیں یقین ہو کہ تمہارے

---

❶(٤٤٩) صحيح البخاری، كتاب اللباس، باب الواشمة، ح(٥٩٤٥)، والبيوع (٢٠٨٦) و احمد(٤٠٩/١)، ح (٣٨٨١)

❷(٤٥٠) صحيح الترغيب(٣٧٤/٢)، ح(١٨٥١)، صحيح الجامع الصغير، ح(٣٥٣٧)، الصحيحة (١٨٧١)، للألباني و صححه.

❸(٤٥١) الحاكم(٣٧/٢)، ح(٢٧٥٩)، و صححه على شرط الشيخين و وافقه الذهبی .

❹(٤٥٢) صحيح الترغيب رقم(١٨٥٨)، و صحيح الجامع (٣٥٤١)، بلفظ "سبعون حوبا"

سود چھوڑنے پر وہ رقم جائز مصرف میں ہی خرچ ہو گی تو چھوڑ دو اور اگر اندیشہ ہو کہ ناجائز مصرف میں خرچ ہو گی یا کوئی دوسرا لے جائے گا تو اسے چھوڑنا بڑی قباحت ہے۔ اس لیے اس بڑی قباحت سے بچتے ہوئے سودی رقم وصول کرلو۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ تقسیم نہیں فرمائی۔

یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ ملازم کی رقم پر جو سودی رقم دی جا رہی ہے اس کا مالک کون ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ ملازم صرف اپنی رقم کا مالک ہے۔

﴿ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ . ﴾

''تم صرف اپنے اصل مال کے مالک ہو۔''

سودی رقم کا یہ مالک ہی نہیں، تو جس رقم کا یہ مالک ہی نہیں وہ غلط مصرف میں خرچ ہو یا کوئی کارندہ لے جائے یہ بے چارہ اس کا ذمہ دار کیسے بن گیا ہے۔ جو گناہ نہ اس نے کیا ہے نہ اسے روکنا اس کے اختیار میں ہے اس کی گردن پر کیسے پڑ گیا؟

زیادہ قباحت کس میں ہے؟

اوپر بیان شدہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ سودی رقم وصول نہ کرنے میں اس کے لیے قباحت نہیں اگر وہ غلط جگہ پر صرف ہوتی ہے تو اس کے ذمہ دار اسے خرچ کرنے والے ہیں۔ یہ ہرگز نہیں بلکہ اس کے لیے یہ رقم وصول نہ کرنا باعث اجر وثواب ہے کیونکہ گناہ سے بچنا بھی ثواب ہے۔

اس کے برعکس وصول کرنے کی صورت میں یہ جہنمی اور ملعون بنتا ہے۔ ایک ایک درہم سود لینے پر چھتیس چھتیس زناؤں کا مجرم ٹھہرتا ہے اور سب سے کم تر سود پر ماں سے زنا کا مجرم قرار پاتا ہے۔ اس کام کی چھوٹی قباحت قرار دینا اور جو کام گناہ ہے ہی نہیں بلکہ فرض ہے ﴿ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا. ﴾ اسے بڑی قباحت قرار دینا کس طرح درست ہوسکتا ہے؟

اگر کسی شخص کی ذاتی رقم جو واقعی اس کی ملکیت ہو۔ کسی ظالم آدمی کے پاس پھنس جائے مثلاً وہ قرضہ لے کر قبضہ جما لے یا اس سے چھین کر لے جائے اور پھر اس رقم سے اسلام کے خلاف جنگ کے لیے اسلحہ تیار کرنا شروع کردے۔ رقم کے مالک کے مطالبے پر وہ یہ کہے کہ رقم تمھیں صرف اس صورت میں واپس مل سکتی ہے کہ تم اسلام (اللہ اور اس کے رسول ﷺ) کے خلاف جنگ میں شریک ہو جاؤ یا اپنی ماں کے ساتھ زنا کرو یا ایک ایک درہم پر چھتیس چھتیس مرتبہ زنا کرو بلکہ تینوں کام بیک وقت سرانجام دو تو ایسی

صورت میں مفتیان کرام کیا فرماتے ہیں؟ کیا اسے اپنی رقم کو غلط کام میں استعمال ہونے سے روکنے کے لیے اسلام کے خلاف جنگ میں شریک ہو جانا چاہیے یا ماں کے ساتھ زنا جیسے قبیح فعل کا ارتکاب کر لینا چاہیے یا ایک ایک درہم پر چھتیس چھتیس مرتبہ زنا کا ارتکاب گوارا کر لینا چاہیے؟ مجھے یقین ہے کہ کوئی عالم بلکہ عام مسلمان جو ایمان کی لذت سے آشنا ہو وہ کبھی ان قباحتوں کے ارتکاب کے لیے تیار نہیں ہو گا خواہ اپنی رقم اسے ملے یا نہ ملے بلکہ کئی ہزار گنا رقم ہاتھ سے دینی پڑے تب بھی ان ہولناک گناہوں سے بچے گا بلکہ اتنی رقم قربان کر کے ان گناہوں سے بچ جانے پر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرے گا۔

جب کوئی مسلمان اپنی حقیقی ملکیت والی رقم واپس لینے کے لیے ان قباحتوں کے ارتکاب پر آمادہ نہیں تو مسلمانوں کو سودی رقم لینے کے لیے تیار کرنا جو ان قباحتوں سے بھی زیادہ قبیح ہے۔ کسی مسلمان عالم کو کس طرح زیب دے سکتا ہے؟ اور اگر کوئی بزرگ اس حد تک پہنچ جائیں کہ سودی رقم چھوڑنے کو بڑی برائی اور سود وصول کرنے کو چھوٹی برائی قرار دیں تو إنا للہ و إنا الیہ راجعون. "اَللّٰھُمَّ اَجُرْنَا فِیْ مُصِیْبَتِنَا وَ اَخْلِفْ لَنَا خَیْرًا مِّنْھَا" کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے؟

رہی یہ بات کہ اس حرام رقم کو حرام جگہ پر خرچ کرے تو یہ "ظلمات بعضھا فوق بعض" کے مترادف ہے۔ مشورہ یہ دیا جا رہا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ شروع کرنے ملعون و جہنمی بننے، ماں کے ساتھ زنا کرنے اور چھتیس چھتیس مرتبہ زنا کے ارتکاب کے بعد اب اس حرام مال کو حرام جگہ پر خرچ کرنے کا گناہ بھی برداشت کرے حالانکہ قیامت کے دن پانچ سوالوں میں سے ایک یہ ہوگا کہ مال کہاں سے کمایا، اور ایک یہ کہ کہاں خرچ کیا تھا۔ اس لیے اگر کسی ناجائز جگہ پر خرچ کے لیے مجبور کیا جائے تو ہرگز خرچ نہ کرے۔ مصیبت برداشت کر لے، اگر نہ کر سکے اور ظالم حلال رقم چھین کر لے جائیں تو صبر کرے، اور اللہ تعالیٰ سے اس مالی مصیبت پر ثواب کی امید رکھے۔ مومن کے پاس حرام مال ایک لمحہ کے لیے بھی ہونا جائز نہیں چہ جائیکہ اسے حرام جگہوں پر خرچ کرنے کے لیے محفوظ کر رکھے۔

کیا یوسف علیہ السلام نے دو ناجائز کاموں میں سے ہلکے ناجائز کام کو اختیار کیا تھا:

مفتی صاحب سودی رقم وصول کرنے کو "اھون البلیتین" (چھوٹی برائی) قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ایسی پیش آمدہ صورت میں آدمی اگر دونوں ناجائز کاموں کو چھوڑ سکتا ہو تو اولیٰ یہی ہے اگر یہ نہ ہو سکے تو ہلکے کام کو اختیار کر لیا جائے اس کی مثال حضرت یوسف علیہ السلام کا زنا کے بالمقابل جیل کو اختیار کرنا ہے۔"

اس بیان کے مطابق یوسف علیہ السلام کا مصر کی عورتوں کو پھسلانے پر زنا میں مبتلا ہو جانا بھی ناجائز کام تھا اور اس کے مقابلے میں جیل کو پسند کرنا بھی ناجائز کام تھا مگر جیل کو پسند کرنا ہلکا ناجائز تھا۔ افسوس! مفتی صاحب نے غور نہیں فرمایا۔ زنا سے بچنے کے لیے جیل جانے پر تیار ہونا ناجائز کام نہیں تھا بلکہ عزیمت و استقامت کے کمال کی جلوہ گری تھی۔ ایک طرف زنا تھا جو معصیت (گناہ) ہے۔ دوسری طرف عزیز مصر کی بیوی اپنی خواہش پوری نہ ہونے پر جیل کی سزا سنا رہی تھی جو مصیبت ہے گناہ نہیں۔ یوسف علیہ السلام نے مصیبت کو معصیت پر ترجیح دی۔ اللہ کے برگزیدہ بندے مصیبتیں برداشت کر لیتے ہیں۔ مگر گناہ پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اور ان مصیبتوں پر اللہ تعالیٰ انھیں بے حساب اجر عطا فرماتا ہے۔ اگر اسے گناہ کہا جائے تو یہ عجب گناہ ہے جس پر اجر کی بشارتیں ہیں کہ بدن کے کسی حصے میں چبھا ہوا کانٹا بھی گناہوں کی معافی اور درجات کی بلندی کا باعث ہے۔

رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ ''اگر حضرت یوسف علیہ السلام رب کریم سے دونوں مصیبتوں کے ازالے کی التجا اور دعا کرتے تو اللہ تعالیٰ دونوں کو ٹالنے پر قادر تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔'' تو اس بات کا علم نہ اللہ کے برگزیدہ رسول یوسف صدیق علیہ السلام کو ہو سکا کہ مجھے کس طرح دعا کرنی چاہیے، نہ اللہ تعالیٰ نے ان کے فعل کی اصلاح کی، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ آپ نے یوسف علیہ السلام کے متعلق فرمایا ہو کہ بہتر تھا کہ وہ دونوں مصیبتوں کے ازالے کی دعا کرتے۔ یہ لقمہ دینا ان لوگوں کو ہی سوجھا جو سود سے بچنے جیسی اعلیٰ درجے کی نیکی کو بڑی قباحت قرار دیتے ہیں اور سود جیسی لعنت کو چھوٹی قباحت قرار دے کر وصول کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

ویسے آیت پر غور کریں تو اس میں یہ ہے ہی نہیں کہ یوسف علیہ السلام نے جیل جانے کی دعا کی تھی۔ انھوں نے صرف یہ دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان عورتوں کے مکر و فریب کو ان سے ہٹا دے اور یہ دعا قبول ہو گئی۔

﴿ فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ . ﴾

زنا کے مقابلے میں جیل کو پسندیدہ قرار دینا اور بات ہے، اور جیل جانے کی دعا دوسری بات۔ مزید تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

آخر میں سب مسلم بھائیوں سے گزارش ہے کہ انھیں کسی طریقے سے بھی سود کی رقم دی جائے ہرگز وصول نہ کریں۔ خواہ ''جی پی فنڈ'' کا سود ہو یا ''سیونگ اکاؤنٹ'' کا سود یا ''پی ایل ایس'' کا سود اللہ سے ڈر کر ہر قسم کا سود چھوڑ دیں بلکہ سود سے شبہ والی چیز بھی چھوڑ دیں۔ اتقوا الربا والريبة.

مدارس دینیہ کے منتظمین سے بھی گزارش ہے کہ حکومت زکوٰۃ کے نام پر بینکوں سے جو رقم وصول کرتی ہے۔ وہ صرف سودی کھاتوں سے وصول کرتی ہے اور وہ خالص سود ہے کیونکہ رقم کے مالکوں کی اصل رقم بالکل محفوظ رہتی ہے۔ اللہ سے ڈرنے والے یہ رقم کبھی وصول نہیں کرتے۔ لاعلمی کی وجہ سے کسی نے وصول کر لی ہو تو الگ بات ہے جیسا کہ میں نے اللہ کے نیک بندے سید بدیع الدین شاہ صاحب رحمہ اللہ سے ''مرید کے اجتماع'' کے موقع پر اس کے متعلق پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ پہلے ہمیں معلوم نہیں تھا جب اصل حقیقت کا پتہ چلا تو ہم نے اپنے مدرسہ کے لیے یہ زکوٰۃ لینا چھوڑ دیا۔

حکومت کے لیے دینی مدارس ہی بے حیائی پھیلانے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے اور ہیں اس لیے بے دینوں نے دینی مدارس کو زکوٰۃ کے نام پر سود کھلانا شروع کر دیا کہ جب ماں کے ساتھ زنا پر انھیں کوئی گھن نہیں آئے گی تو ملک میں زنا، فحاشی اور بے حیائی پھیلنے پر بھی یہ لوگ خاموش رہیں گے اور یہ نتائج ظاہر ہو بھی رہے ہیں۔

تعاقب از ڈاکٹر عطاء محسن حیدر آباد سندھ(۱):

''الاعتصام'' کے تازہ شمارہ میں احکام و مسائل کے تحت ''سودی رقم کی وصولی'' کے بارے میں جو موقف بیان ہوا ہے، وہ محل نظر ہے کیونکہ اس پر کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں۔ لہٰذا اس بارے میں کتاب وسنت کی روشنی میں موقف پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ جہاں آپ نے اس مسئلہ کے بارے میں ایسا موقف شائع کیا ہے جس کی بنیاد محض فقہی ہے وہاں آپ کو اس موقف کے شائع کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہو گی جس کی بنیاد واضح طور پر قرآن مجید کے حکم اور رسول اللہ ﷺ کے عمل پر ہے تاکہ ''الاعتصام'' کے قارئین اس معاملے کا صحیح فیصلہ کر سکیں۔ جزاك الله احسن الجزاء.

کسی بھی سرکاری ملازم کے لیے یہ مرحلہ بڑا آزمائشی ہوتا ہے جب ریٹائرمنٹ کے موقع پر دوران ملازمت اس کی تنخواہ سے کاٹی گئی رقم اسے سود کے ساتھ واپس کی جاتی ہے وہ عجیب الجھن کا شکار ہوتا ہے کہ اصل رقم تو لینی ہے مگر اتنی بڑی سود کی رقم کا وہ کیا کرے؟ یونہی چھوڑ دے یا لے کر خود استعمال نہ کرے اور کہیں اور لگا دے۔ اسی طرح کی اور بھی بہت شکلیں ہیں۔ بعض پاکستانی جو غیر ممالک میں مقیم ہیں وہ بیرونی بینکوں سے اپنی جمع شدہ رقم پر پورا پورا سود وصول کرتے ہیں۔ مبادا ان کا چھوڑا ہوا سود عیسائی مشنریز کے کام آئے اور اسلام کے خلاف استعمال ہو۔ لہٰذا وہ یہ سود جسے اپنے لیے حرام سمجھتے ہیں پاکستان بھیج کر غریبوں اور

بیواؤں کی مدد کرتے ہیں۔ بعض مساجد کے بیت الخلاء تعمیر کرا دیتے ہیں یا اور کسی کام میں ثواب کی امید رکھے بغیر خرچ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ''الاعتصام'' میں شائع شدہ مذکورہ موقف میں بھی اس طرف راہنمائی کی گئی ہے کہ ''جی پی فنڈ'' سے ملنے والے حرام مال سے کسی سودی قرضدار کی اعانت کر دے، اپنا جائز حق نہیں مل رہا تو سودی رقم پیش کر کے وصول کر لے۔ یا کسی کا ''ناحق جرمانہ'' ادا کر دے۔

اب دیکھیے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں سود کے بارے میں کیا ارشاد فرماتا ہے:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ. ﴾ (البقرة:٢٧٩-٢٧٨)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

ایمان کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس واضح قرآنی حکم کے بعد مسلمان خود کو مکمل طور پر سود سے بچاتے لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا بلکہ لوگوں نے خواہ مخواہ یہ بوجھ اپنے سر لیا کہ اگر ہم سود چھوڑ دیں گے تو یہ فلاں فلاں جگہ خرچ ہو گا اس سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھالیں گے یا یہ اسلام کے خلاف استعمال ہو گا اور پھر بات یہاں تک پہنچی کہ سود جس کا وصول کرنا ہی حرام ہے اور جس کی وصولی سے باز نہ آنے پر اللہ اور رسول ﷺ سے جنگ کی دھمکی دی گئی تھی، اس کی وصولی کو اس بناء پر جائز کر دیا گیا کہ اسے حرام سمجھ کر لے لیا جائے اور پھر'' حرام مال کو حرام کے رستے میں صرف کر دینا چاہیے۔ جیسا کہ مذکورہ فتویٰ میں کہا گیا ہے، حالانکہ استعمال تو بعد کی بات ہے اللہ نے تو اس کی وصولی ہی سے روکا ہے اور اس کے وصول کرنے پر ہی اتنی سخت وعید بیان کی ہے کہ کسی اور گناہ کے متعلق نہیں کی۔ قرآن مجید سے ایسی کوئی گنجائش نہیں نکلتی کہ مسلمانوں کی بھلائی کی خاطر سود وصول کر و تو کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے بھی اس کی نفی ہوتی ہے، چنانچہ مذکورہ آیت کے نازل ہونے کے بعد آپ ﷺ نے وہ تمام سود باطل قرار دیے جو قریش ثقیف اور دوسرے عرب قبائل میں سے بعض تاجروں کے اپنے قرضداروں کے ذمے باقی تھے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا: کہ جاہلیت کے تمام سود باطل ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان یعنی اپنے چچا عباس کا سود باطل کرتا ہوں۔ [1] کیا آپ کے فرمان کے مطابق جن مسلمانوں نے اپنا سود کفار کی طرف چھوڑا تھا تو اس سے ان کو فائدہ نہ ہوا تھا؟

[1] (٤٥٣) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی صلی الله علیه وسلم(٢٩٥٠).

کہ یہ اسلام دشمنوں کا فائدہ نہ تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر اگر رسول اللہ ﷺ چاہتے تو آپ یہ حکم دے دیتے کہ سارا سود وصول کر کے غریبوں، مسکینوں اور یتیموں میں تقسیم کر دیا جائے، اور اس وقت اس کی ضرورت بھی تھی لیکن آپ نے تو ایسا نہ کیا پھر بعد میں یہ جسارت کیسے ہوئی کہ قرآن کہے سود چھوڑ دو۔ اور مذکورہ فتویٰ میں لکھا گیا کہ ''چھوڑنے میں قباحت زیادہ ہے'' اور ''ممکن ہے سرکار اس مال کو ایسے مشن پر صرف کر دے جہاں اسلام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو یا کارندے خود ہی ہضم کر جائیں'' یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ اسلام ایک چیز سے روکے مگر ہم رکنے کے بجائے اس بحث میں پڑ جائیں کہ اس سے اسلام کا نقصان ہوگا اور غیروں کا فائدہ ہوگا۔ کیا اللہ اور رسول ﷺ کی ہر اس بات کو چھوڑ دیا جائے گا جس کے بارے میں ہم یہ سمجھیں کہ اس سے اسلام دشمنوں کو فائدہ ہوگا۔ ذرا صلح حدیبیہ پر نظر کریں بظاہر کفار ہی کا فائدہ تھا اور مسلمانوں کی خفت تھی لیکن وجہ تسلیم و رضا یہ تھی کہ صلح کرنے والے اللہ کے رسول تھے اور بعد میں مسلمانوں کو اس اطاعت کا ثمرہ بھی مل گیا۔ یہ تو صحابہ کے ایمان کی مثال تھی اور ہماری حالت یہ ہے کہ اپنی فقہی موشگافیوں سے قرآن و سنت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ مذکورہ موقف میں سود کی وصولی کے بعد جو گُر بتایا گیا ہے کہ ''حرام مال کو حرام کے رستے صرف کر دینا چاہیے'' اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ ''کسی کو ناحق جرمانہ ہو گیا ہو تو اس کو ادا کر دے۔'' حالانکہ اس قسم کا کام ثواب ہے اور مظلوم کی مدد ہے اسے حرام کا رستہ قرار دینا فاش غلطی ہے۔ اسی طرح سود وصول کر کے کسی اور کا سود ادا کرنا یہ بھی شرعی حدود سے تجاوز ہے۔ نبی ﷺ نے تو یہ بات نہ فرمائی کہ اگر کوئی کافر کسی مسلمان کو سود معاف نہ کرے تو اور مسلمان اپنا سود چھوڑنے کے بجائے وصول کر کے ادا کر دیں کہ یہ ایک مجبوری ہے۔ لہٰذا ہمیں اس قسم کے معاملات میں قرآن کا یہ حکم یاد رکھنا چاہیے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ . ﴾ (حجرات:۱)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے آگے مت بڑھو۔ اور اللہ سے ڈرو۔''

فتویٰ کے آخر میں بحالت مجبوری دو ''ناجائز کاموں'' میں سے ہلکے کام کو اختیار کرنے کا جو اصول بیان کیا گیا ہے اور جسے فتویٰ کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، اس کا بھی یہاں اطلاق نہیں ہو سکتا، کیونکہ سود چھوڑنا کوئی ناجائز کام نہیں بلکہ حکم الٰہی ہے، اور اس کا وصول کرنا کبیرہ گناہ جو اللہ اور رسول ﷺ سے جنگ کے مترادف ہے۔ اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کی جو مثال دی گئی وہ بھی بے محل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو شریعت کے مزاج کو صحیح معنوں میں سمجھنے کی توفیق فرمائے۔ و ما علینا الا البلاغ.

جواب تعاقب از حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ ...... (۱)

مسلک اہل حدیث اور ظاہری مذہب میں نمایاں فرق ہے۔ (پراویڈنٹ فنڈ کے مسئلہ میں تعاقب پر نظر)

''الاعتصام'' مورخہ ۷دسمبر ۱۹۹۰ء میں میرا ایک فتویٰ ''جی۔ پی فنڈ'' کے بارے میں شائع ہوا تھا جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا تھا کہ سرکار کی طرف سے ملازم کی تنخواہ میں سے جو کٹوتی جبراً ہوتی ہے اور بعد ازاں ریٹائرمنٹ کے وقت اصل مع زائد رقم (سود) جو حکومت ادا کرتی ہے وہ اگرچہ حرام ہے لیکن اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ حرام مال دوسروں کو کھلانے کی بجائے ان لوگوں کے لئے استعمال کیا جائے جو کسی الجھن میں پھنس کر حرام مطالبے پورے کرنے پر مجبور ہیں۔ مثلاً کسی پر سودی قرض بنتا ہو یا ایسا جرمانہ ادا کئے بغیر کسی کا جائز حق نہ مل رہا ہو تو وہ شخص ظالم کو یہ حرام سود کھلا کر اپنی جان چھڑا لے۔

ہمارے اس مؤقف کا تعاقب ''الاعتصام'' مورخہ ۱۲جنوری ۱۹۹۱ء میں کیا گیا ہے جس میں ہمارے ایک دیرینہ فاضل دوست حافظ عبدالسلام بھٹوی بھی شریک ہیں۔ علمی مسائل میں دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو ترجیح دینا اہل علم کا معروف طریق ہے، جس کی تردید ثقہ علماء ضروری نہیں سمجھتے تاہم مجھے خوشی ہے کہ میرے فاضل دوست نے میرے موقف کے برخلاف دوسرے پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ اگرچہ فاضل موصوف جیسے پرانے مدرس سے میں یہ توقع رکھنے میں حق بجانب تھا کہ وہ تنقید کے وقت ہوش پر جوش کو غالب نہ آنے دیتے۔ [1] کیونکہ اس طرح سے بعض اہل حدیث عوام میں ظاہری مذہب پھیل کر مسلک اہل حدیث، جو فقہا، محدثین کا منہاج ہے متاثر ہو رہا ہے۔ فاضل موصوف کو بھی اس امر کا اعتراف ہوگا کہ مسلک اہل حدیث اور ظاہری مذہب میں عقیدہ سے لے کر فقہی مسائل کے استنباط تک میں نمایاں فرق ہے۔ جس کا ذکر فاضل موصوف کے استاذ محترم مولانا محمد اسماعیل سلفی اپنی تصانیف میں جا بجا کرتے ہیں۔

میرے فتویٰ اور صاحب موصوف کے تعاقب میں سود کی حرمت اور اس کی شناعت پر کوئی اختلاف نہیں۔ لہٰذا جوش میں حرمت سود پر رسول کریم ﷺ کے وہ ارشادات جو قرآن مجید کی نص: ﴿ فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ . ﴾ کی تعبیر پیش کرتے ہیں۔ تعاقب میں ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ مسئلہ تو صرف یہ تھا کہ یہ

[1] واضح رہے کہ فاضل ناقد نے تین سوالوں میں سے تیسرا سوال کہ ''جی پی فنڈ'' میں سود کی رقم وصول کرنے والا اسے کہاں خرچ کرے بالکل نظر انداز کر دیا ہے کہ اس سے سود کی حرمت کا اصل مقصد زیر بحث آتا تھا لہٰذا مقصد کو چھوڑ کر صرف لفظی بحث شروع کر دی کہ سودی رقم کو ہاتھ لگائے یا نہ لگائے۔ (حافظ ثناء اللہ مدنی)

زائد رقم جو سود کے نام پر اس کے ''جی پی فنڈ'' میں شامل کی جا رہی ہے۔ وہ حساب رکھنے والے کارندوں کے کھانے کے لئے چھوڑ دی جائے یا اس کا کوئی ایسا مصرف تلاش کیا جائے کہ اس طرح کوئی مظلوم ظالم کو حرام مال دے کر اپنی جان چھڑا لے۔ حالانکہ یہ مظلوم کے لئے اپنی جان چھڑانے کی جائز سبیل ہے، کیونکہ یہ حرام مال مظلوم نے نہیں کھایا بلکہ ظالم کو مظلوم کے حلال مال کی بجائے دیا جا رہا ہے جو ظالم کے لئے بہر صورت حرام تھا۔ اسی کے لئے یہ محاورہ استعمال کیا جا سکتا ہے:

''مال حرام بود، بجائے حرام رفت۔''

فاضل موصوف نے اس شرعی مصلحت کو دیکھے بغیر یہ مفروضہ قائم کر لیا ہے کہ میں نے گویا سود کے جواز کا فتویٰ صادر کر دیا ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

فاضل موصوف نے قرآنی آیات اور احادیث نبویہ ﷺ سود کی حرمت و شناعت میں بے محل پیش فرمائی ہیں، اور ظاہریت کے غلبے کی وجہ سے قرآنی آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔'' اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سودی رقم چھوڑ دینے اور صرف اصل رقم وصول کرنے کا حکم دیا ہے ...... پھر ایک حدیث ذکر کر کے فرماتے ہیں۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ صرف سود کھانا حرام ہے بلکہ سود مطلقاً حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَحَرَّمَ الرِّبَا ﴾. یعنی اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔''

قرآن و حدیث کی اس تشریح میں موصوف نے دو بڑی غلطیاں کھائی ہیں۔

- پہلی یہ کہ سود کے مطلقاً حرام قرار دینے پر زور دیا ہے۔ حالانکہ اس کا استعمال حرام ہے۔ بلکہ سودی معاملے کے ساتھ تعاون بھی حرام ہے جیسا کہ موصوف کی پیش کردہ حدیث میں سود کے گواہان اور لکھنے والوں پر بھی لعنت ہے۔ اصول فقہ میں یہ بات مسلمہ ہے کہ حرمت ذوات اشیاء پر وارد نہیں ہوتی، بلکہ ان کے استعمال پر وارد ہوتی ہے۔ مثلاً آیت: ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ. ﴾ (النساء: ٢٣) ماں سے نکاح وغیرہ حرام ہے ورنہ ماں سے متعلقہ حرمت مطلقہ کی صورت میں ہر معاملہ حرام ہو جانا لازم آئے گا۔ جس میں ماں کی خدمت یا ماں کی شفقتیں بھی شامل ہو جائیں گی۔ اسے اصطلاح میں اقتضاء النص کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فاضل موصوف بعد ازاں خود یہی مفہوم پیش کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ لیکن آیت کا ترجمہ کرتے وقت اس کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔
- دوسری غلطی یہ ہے کہ ﴿ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا ﴾ (البقرة:٢٧٨) کا ترجمہ سود چھوڑنا کر کے اسے ہی نص مان لیا گیا ہے حالانکہ یہ ظاہری الفاظ کا لغوی ترجمہ ہے۔ اس نص کا مفہوم سود کے ناجائز استعمال

سے روکنا ہے۔ فاضل موصوف سے یہ امر مخفی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات کے نص ہونے کے معنی یہ ہیں کہ الفاظ میں اصل مقصد کو بھی ملحوظ رکھا جائے بلکہ ظاہر الفاظ کا مفہوم بھی وہی درست ہوتا ہے جو نص کے مطابق ہو۔ اس لئے ﴿ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا ﴾ (البقرة:٢٧٨) کے لفظ پر مقصد سے قطع نظر زور دینا ظاہریہ کا طرزِ عمل ہے۔

واضح رہے کہ صرف ظاہری مفہوم احتمال کی حیثیت رکھتا ہے جب کہ نص قطعی ہوتی ہے۔ لہٰذا ظاہری احتمال والے مفہوم پر تشدد اختیار کرنا مناسب نہیں۔ حاصل یہ ہے کہ قرآنی ارشاد کا مقصد سود سے متعلق غلط معاملات اور ناجائز ذرائع سے روکنا ہے۔ ایسا مال جو سود کی صورت میں حرام تھا اگر وہی مال ناجائز استعمال سے بچا لیا جائے تو اس کی حرمت بھی ختم ہو سکتی ہے۔ جیسے یہی سود اگر اصل مالک کو لوٹا دیا جائے جس سے سود لیا جا رہا ہے تو اس کے لئے یہ مال حرام نہیں ہوگا۔ ❶

یہی وجہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر رسول کریم ﷺ نے سود کو اصل مالکوں کے پاس چھوڑ دینے کا حکم دیا تھا۔ ❷ اس میں یہ توجیہ پیدا کرنا کہ وہ بھی کافر ہونے کی صورت میں اس مال سے تقویت پکڑ سکتے تھے درست نہیں کہ یہ مال زائد بھی انہی کا تھا جبکہ ''جی پی فنڈ'' کی صورت یوں نہیں ہے، چونکہ حکومت اپنے قانون کے مطابق اسے لے نہیں سکتی لہٰذا درمیان والے جو اس مال کے مالک نہیں ہوتے۔ ریٹائر ہونے والے شخص کے انکار کرنے پر یہ سود خود ہی کھا جاتے ہیں۔ دراصل یہ مال زائد (سود) حکومت کے چھوڑ دینے کے بعد کسی کی ملکیت ہی نہیں ہوتا لیکن ریٹائر ہونے والے شخص کے نام درج ہوتا ہے۔ اس میں علماء کی دو رائے ہیں۔ ایک یہ کہ اسے ریٹائر ہونے والا خود قطعاً استعمال نہ کرے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ شخص اسے متعدد وجوہ سے خود بھی استعمال کر سکتا ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ حکومت بہت سے ظالمانہ طریقوں سے لوگوں کے مال لیتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس سے جس طرح بھی ہو سکے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس شخص کا یہ زائد مال بھی اپنا ہی مال ہے کہ اس کے مال کا کمایا ہوا فائدہ ہے۔ وہ سود صرف اس وجہ سے بنا کہ حکومت نے متعین

---

❶ غالباً موصوف کے نزدیک جو شخص سود لے چکا ہو پھر موصوف کے فتویٰ کے مطابق ضائع کر دے تو اس پر ان کی پیش کردہ وعیدیں وارد نہ ہونگی جبکہ ﴿ وَذَرُوْا مَابَقِيَ مِنَ الرِّبَا ﴾ کے ظاہری لفظ سے ایسا شخص بھی ماں سے زنا کا مرتکب ہو گیا ہے کیا موصوف اپنے اس ممدوح کو جو اپنے مدرسہ کے لئے سود وصول کرتے رہے اپنے فتویٰ کی زد میں لاتے ہیں اور ان کے وصول کردہ سود کا کیا بنا؟

❷ (٤٥٤) صحيح مسلم، كتاب الحج، باب حجة النبى صلى الله عليه وسلم (٢٩٥٠).

نسبت سے اس کی جمع شدہ رقم میں شامل کر دیا اور بقیہ منافع جو عمومی طور پر سودی رقم سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ اسے نہ دیا اگر حکومت مضاربت کی صورت بنا کر منافع نسبت متعین کیے بغیر دیتی تو وہ اس شخص کا جائز منافع ہوتا۔ ❶

وجہ یہ ہے کہ یہ منافع کونسا ریٹائر ہونے والے شخص کی طلب پر دیا جا رہا ہے اور شرعی تعلیمات میں سے یہ بھی ہے کہ قرض خواہ معاملہ بے باق کرتے وقت اگر اپنی مرضی سے کچھ زیادہ دے دے تو پھر لینے والے کے لئے کچھ حرج نہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے قرض خواہ کو اس کے قرض سے بہتر ادائیگی ثابت ہے۔ ❷ ہم نے اس منافع کے حلال کرنے والے علماء کی رائے کو اس لئے اختیار نہیں کیا تھا کہ اس میں بہر صورت شبہ یا دیگر احتمالات موجود ہیں۔ مثلاً احتمال ہے کہ اس فنڈ کو حکومت کے تجارت میں استعمال کرنے سے اس کا منافع سود سے کم آیا ہو لہٰذا ہم نے فتویٰ میں احتیاطی پہلو اختیار کیا تھا کہ ریٹائر ہونے والا شخص خود نہ کھائے۔

حاصل یہ ہے کہ جب یہ مال سود بن کر باطل قرار پایا، تو اب اس کا کیا جائے؟ کیونکہ اس کا مالک کوئی نہیں لیکن نام کے اعتبار سے اس کا مالک ریٹائر ہونے والا شخص ہے۔ اب اسے سوچنا چاہیے کہ اس کے لئے دو رویوں میں سے کونسا رویہ بہتر ہے اور شرعی مصلحت کس امر میں ہے؟ کیا یہ درمیان والے حلال اور حرام کی تمیز نہ کرنے والے لوگوں کے لئے چھوڑ دیا جائے یا ریٹائر ہونے والا شخص اس کا جائز مصرف تلاش کر کے اس سے مجبور شخص کا تعاون کر دے جو حرام مال ظالم کو دینے پر مجبور ہے۔ اسے اصطلاح میں ''أَهْوَنُ الْبَلِيَّتَيْن'' کہتے ہیں اور ہم نے اس کی مثال یوسف علیہ السلام کا جیل کو پسند کرنا قرار دی تھی کہ آپ کی دعا کے الفاظ: ﴿ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ ﴾ .الآیة یعنی ''اے میرے رب جیل مجھے دعوت زنا کے قبول کرنے سے زیادہ پسندیدہ ہے۔'' ہم نے ''أَهْوَنُ الْبَلِيَّتَيْن'' کے اصول کا ذکر بعض اصولی علماء کے حوالے سے کیا تھا۔ اگرچہ دیگر ائمہ اصول نے ''أَهْوَنُ الْبَلِيَّتَيْن'' کی بجائے وہ توجیہ بھی پیش کی ہے جس کا ذکر فاضل موصوف نے کیا ہے۔ یہ صرف استدلال کا اختلاف ہے۔ نتیجتاً کوئی فرق نہیں، جیسا کہ ہم نے اوپر واضح کیا کہ مجبور شخص کا ظالم کو حرام مال دے کر بچ نکلنا اس کے لئے حلال ہے لیکن کہا یہی جائے گا کہ اس نے حرام مال کا استعمال کیا ہے۔ اس ظاہری طریق استعمال پر علماء اصول ''أَهْوَنُ الْبَلِيَّتَيْن'' کا اطلاق کرتے ہیں۔

---

❶ (٤٥٥) تیسری وجہ ملاحظہ ہو فتاویٰ علمائے حدیث ج ١٤، ص ٣٣۔

❷ (٤٥٦) صحیح البخاری، کتاب الاستقراض، باب حسن القضاء (٢٣٩٣، ٢٣٩٤).

''الاعتصام'' کے مذکورہ بالا شمارہ میں حیدر آباد سندھ کے ایک دوسرے صاحب کا تعاقب بھی شائع ہوا ہے۔ جو بعض اہل حدیث کی جذباتی روش سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ کہ قرآن و حدیث کے علاوہ انہیں لفظ ''فقہ'' سے چڑ ہے، حالانکہ لفظ ''فقہ'' قرآن و حدیث دونوں میں اچھے مفہوم میں بھی وارد ہوا ہے جیسا کہ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ .)) ❶

یعنی ''جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی چاہے اسے دین کی فقاہت عطا کرتا ہے۔''

لہٰذا اہل حدیث کو تقلید سے بچانے کا علاج فقہی بصیرت مہیا کرنا ہے، سطحیت نہیں، تقلید کی وجہ سطحیت بھی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صاحب مظلوم سے ظلم کا مداوا ثواب بھی قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی اس مقصد کے لئے سود وصول کرنے کو بھی شرعی حد سے متجاوز بتاتے ہیں۔ البتہ ان صاحب نے بعض پاکستانیوں کے جو غیر ممالک میں مقیم ہیں۔ بیرونی بینکوں سے سود وصول کرنے کی اس توجیہ کو ناپسند قرار دیا ہے کہ مبادا سود عیسائی مشنریز کے کام آئے اور اسلام کے خلاف استعمال ہو۔ چونکہ ہم نے اپنے فتویٰ میں جبری ''جی پی فنڈ'' کے سود کا ذکر کیا ہے۔ بینکوں سے سودی معاملہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں لہٰذا اس پر تفصیل کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اختیاری سودی معاملے کی مشابہت حجۃ الوداع میں نبی اکرم ﷺ کی اس واقعاتی صورت حال سے پوری طرح موجود ہے، جس میں آپ ﷺ نے کافروں سے سود وصول کرنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ یہ سود مع اصل ان کافروں کا ہی مال ہوتا ہے۔ نیز بیرون ملکوں سے کارخیر کے نام پر مدد وصول کرنے کا دعویٰ اس لئے بھی درست نہیں ہے کہ بینکوں میں حساب جاری (کرنٹ اکاؤنٹ) کی صورت میں اکاؤنٹ کھولنے کی بھی اجازت ہوتی ہے۔ لہٰذا ''جی پی فنڈ'' میں تنخواہ کی کٹوتی جی پی سود کی جبری شکل ہے جب کہ بینک میں ''سیونگ اکاؤنٹ'' کھول کر سود لینا اختیاری ہے لہٰذا سود کی صورت میں اختیاری معاملہ کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

آخر میں ہم اپنی گفتگو کا خلاصہ حسب ذیل نکات میں دوبارہ پیش کئے دیتے ہیں:

1. ناقدین نے آیت: ﴿ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰا. ﴾ (البقرۃ:۲۷۸) کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کھائی ہے،

❶ (۴۵۷) صحیح البخاری، کتاب العلم، باب من یرد اللہ......(۷۱)، صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب النھی عن المسئلۃ (۲۳۸۹)، عن معاویۃ رضی اللہ عنہ.

کیوں کہ لفظی معنی ''سود چھوڑ دینا'' ظاہر ہے جب کہ مقصد کے پیش نظر سودی معاملات سے بچنا ''نص'' ہے۔ نص اور ظاہر کا فرق نہ کرنے کی بناء پر ناقدین فتویٰ کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکے۔

۲ اسی طرح آیت: ﴿ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ﴾ (البقرۃ:۲۷۵) میں حرمت ذات سود پر وارد نہیں ہوتی بلکہ سودی معاملات پر وارد ہوگی۔

۳ ''حجۃ الوداع'' میں اصل زر کے علاوہ سود چھوڑنا اس لئے درست تھا کہ وہ سود دراصل قرضدار کا کمایا ہوا مال تھا۔ جو اس کے لئے حلال مال ہے۔ لیکن ''جی پی فنڈ'' کا سود کارندوں اور افسروں کا اپنا مال نہیں وہ حرام مال کو کھائیں گے یا غلط مقاصد میں استعمال کریں گے۔ لہٰذا قیاس مع الفارق ہے جو درست نہیں۔

۴ ناقدین جا بجا یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی وضاحت کیوں نہ کر دی؟ حالانکہ شریعت میں ہر چیز کی صراحت کا نظریہ ظاہریہ کا ہے۔ اسالیب بیان کی متعدد صورتیں ہیں۔ اگر تشدد کی بجائے مقاصد اور محاورہ کلام پیش نظر رہے تو بات خود بخود کھل جاتی ہے۔

۵ بینکوں سے سودی معاملات کر کے سود کو نیک مقاصد میں صرف کرنے کا الزام درست نہیں کیونکہ ہمارے نزدیک ہر سودی معاملہ حرام ہے۔ لہٰذا سود مجبور و مضطر کے لئے تو جائز ہو سکتا ہے جیسے جان بچانے کے لئے سور کھانا وغیرہ حرام مال کا صدقہ عنداللہ مقبول نہیں۔

تعاقب از حافظ عبدالسلام بھٹوی حفظہ اللہ ...... (۲)

پراویڈنٹ فنڈ پر زائد ملنے والی رقم کی حقیقت ...... (ایک فتویٰ کے دفاع کا جائزہ)

ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں ایک مفتی صاحب کا فتویٰ شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے سرکاری ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والے سود کو چھوٹی برائی قرار دے کر وصول کر کے حرام جگہ پر خرچ کر دینے کا مشورہ دیا تھا میں نے ایک تفصیلی مضمون میں اس موقف کی غلطی واضح کی۔ اب محترم مفتی صاحب نے اپنے فتوے کا دفاع کیا ہے۔

اس دفاع میں انھوں نے شکوہ کیا ہے کہ سود کی شناعت و حرمت پر جب ہم میں کوئی اختلاف نہیں تو وہ آیات و احادیث کیوں لکھی گئی ہیں جن میں سود کو حرام اور ایمان کے منافی قرار دیا ہے، اور اسے اللہ اور اس

کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلان جنگ قبول کرنے، جہنمی اور ملعون بننے کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ اس کا ایک ایک درہم چھتیس چھتیس مرتبہ زنا سے زیادہ گناہ کا باعث بننے کا باعث اور اس کا سب سے ہلکا گناہ ماں کے ساتھ نکاح کے برابر بتایا گیا ہے۔ ان آیات و احادیث کے نقل کرنے کو انھوں نے بے محل اور ہوش پر جوش کا غالب آنا قرار دیا ہے۔

اس معاملے میں میرا عذر یہ ہے کہ علم بلاغت کا ایک مسلمہ اصول ہے۔ بعض اوقات مخاطب اگرچہ ایک حکم کا منکر نہیں ہوتا مگر اس سے کلام اس انداز سے کیا جاتا ہے جس انداز میں انکار کرنے والے سے کیا جاتا ہے مثلاً ایک مسلمان جو نماز کی فرضیت سے خوب آگاہ ہو، اگر نماز میں سستی کرے تو اسے وہ آیات و احادیث سنائی جاتی ہیں جن میں نماز کو فرض قرار دیا گیا ہے اور اس کے ان آیات و احادیث سے واقف ہونے کے باوجود اسے بے محل کلام، یا ہوش پر جوش کا غالب آنا قرار نہیں دیا جاتا۔

ان احادیث و آیات کے تحریر کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ محترم مفتی صاحب نے چند چیزیں خود تسلیم کی ہیں مگر ان سے لازم آنے والا نتیجہ وہ تسلیم نہیں کرتے۔ اس پر میں نے گرفت کی۔ کیونکہ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ "المرء یوخذ باقرارہ" آدمی اپنے اقرار سے پکڑا جاتا ہے۔

① پہلی بات جو انھوں نے تسلیم کی تھی، یہ ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کے ساتھ زائد ملنے والی رقم سود ہے۔ اپنے دفاعی مضمون میں اگرچہ انھوں نے بعض لوگوں کے اس خیال کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ منافع چونکہ مانگے بغیر ملتا ہے اس لیے سود نہیں لیکن آخر میں اپنا فیصلہ یہی دیا ہے کہ یہ سود ہے (اس رقم کے واضح سود ہونے کے متعلق ان شاء اللہ آگے مزید گفتگو آ رہی ہے۔)

② دوسری بات جو انھوں نے خود تسلیم کی، یہ ہے کہ اس رقم کی وصولی میں بھی قباحت موجود ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"جہاں تک سودی رقم کی وصولی کا تعلق ہے اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں انسان اس کو وصول کرے یا چھوڑ دے بظاہر دونوں صورتوں میں قباحت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن چھوڑنے میں قباحت زیادہ ہے۔"

یہ سب کچھ تسلیم کرنے کے بعد سودی رقم وصول نہ کرنے کی قباحت یہ بیان فرمائی کہ "ممکن ہے سرکار اس مال کو ایسے مشن پر صرف کردے جہاں اسلام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو یا کارندے خود ہی ہضم کر جائیں۔"

مگر انھوں نے سود وصول کرنے کی قباحت بیان نہیں فرمائی تاکہ موازنہ ہو جاتا کہ بڑی قباحت کون سی ہے۔ اگر وہ اسے قباحت قرار ہی نہ دیتے تو الگ بات تھی۔ جب مانتے ہیں کہ یہ بھی قباحت ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ صرف سود وصول نہ کرنے کی قباحت بیان فرماتے ہیں؟ وصول کرنے کی قباحت بیان نہیں فرماتے۔ میں نے کیا برا کیا، اگر آیات و احادیث سے وہ قباحت بیان کردی کہ اس رقم کا وصول کرنا ایمان کے منافی اور حرام ہے وغیرہ وغیرہ۔

میرا قصور صرف یہ ہے کہ میں نے دونوں کا موازنہ کرکے واضح کردیا کہ اصل قباحت صرف سود وصول کرنے میں ہے۔ سود وصول نہ کرنے میں سرے سے کوئی قباحت موجود ہی نہیں۔

کیا صرف سود کا استعمال حرام ہے؟

مفتی صاحب اگرچہ پہلے یہ تسلیم کر چکے تھے کہ اس رقم کی وصولی میں بھی قباحت ہے اور یہ دو ناجائز کاموں میں سے ایک ہے مگر جب میں نے یہی بات کی کہ سود کھانا ہی نہیں وصول کرنا بھی حرام ہے تو اس پر انھوں نے مجھ پر ظاہریت کا فتویٰ لگا دیا۔ اگر میری یہ بات غلط ہے تو آپ نے خود اس کی وصولی کو قباحت اور ناجائز کام کیوں قرار دیا؟

سود کو مطلقاً حرام قرار دینے پر مفتی صاحب میرے متعلق لکھتے ہیں:

① ''قرآن و حدیث کی اس تشریح میں موصوف نے دو بڑی غلطیاں کھائی ہیں۔ پہلی یہ کہ سود کے مطلقاً حرام قرار دینے پر زور دیا ہے۔ حالانکہ اس کا استعمال حرام ہے'' الخ

② دوسری غلطی یہ کی ہے کہ ﴿ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا ﴾ کا ترجمہ سود چھوڑنا کرکے اسے ہی نص مان لیا گیا ہے حالانکہ یہ ظاہری الفاظ کا لغوی ترجمہ ہے۔ اس نص کا مفہوم سود کے ناجائز استعمال کو روکنا ہے۔'' الخ

③ حاصل یہ ہے کہ قرآنی ارشاد کا مقصد سود سے متعلقہ غلط معاملات اور ناجائز ذرائع سے روکنا ہے ایسا مال جو سود کی صورت میں حرام تھا اگر وہی مال ناجائز استعمال سے بچا لیا جائے تو اس کی حرمت بھی ختم ہو سکتی ہے جیسے یہی سود اگر اصل مالک کو لوٹا دیا جائے جس سے سود لیا جا رہا ہے تو اس کے لیے یہ مال حرام نہیں ہوگا۔ الخ

مفتی صاحب کا کلام بقدرِ ضرورت ختم ہوا۔

یہاں مفتی صاحب نے سود کی حرمت ختم کرنے کے لیے جو مثال دی، اُس میں وہ سودی رقم رہتی ہی نہیں اصل مالک کے لیے وہ سود کس طرح ہے؟ اس کا تو اپنا مال ہے سود تو اس شخص کے لیے ہے جو اپنے قرض کے ساتھ زائد وصول کر رہا ہے اس کے لیے اس کا وصول کرنا اور ہر قسم کا تصرف مطلقاً حرام ہے۔ مفتی صاحب کو کوئی ایسی نص پیش کرنی چاہیے تھی جس میں یہ آئے کہ سود وصول کرنا تو جائز ہے مگر اس کا ناجائز استعمال حرام ہے۔

میرا موقف یہ ہے کہ سود چونکہ حرام ہے اس لیے اس میں تصرف مطلقاً حرام ہے جس کی ابتداء اسے وصول کرنے یا اپنی ملکیت میں لینے سے ہوتی ہے، اس لیے اس کا وصول کرنا، کھانا، کسی کو دینا یا کوئی اور تصرف کرنا سب حرام ہے۔ چونکہ اس کا وصول کرنا حرام تھا اسی لیے اگر کوئی شخص یہ غلطی کر بیٹھا ہے تو اس کا مالک نہیں بن سکتا ﴿فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ﴾ (تم صرف اپنے اصل مال کے مالک ہو) اب اس کی تلافی کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ رقم اصل مالک کو لوٹائے اور توبہ بھی کرے۔ اس صورت میں گناہ معاف ہونے کی امید ہے۔ جیسا کہ کسی کا مال غصب کرلے تو وہ اس پر حرام ہے کیوں کہ اس نے یہ مال باطل طریقے سے لیا ہے اس کی تلافی کی صورت یہی ہے کہ وہ مال اصل مالک کی طرف لوٹا دے۔

میں نے یہ ذکر کیا تھا کہ حکومت زکوۃ کے نام پر بینکوں سے جو رقم وصول کرتی ہے وہ خالص سود ہے کیونکہ رقم کے مالکوں کی اصل رقم محفوظ رہتی ہے۔ اللہ سے ڈرنے والے یہ رقم کبھی وصول نہیں کرتے جیسا کہ میں نے اللہ کے نیک بندے سید بدیع الدین شاہ راشدی رحمہ اللہ سے مریدکے میں اجتماع کے موقع پر اس کے متعلق پوچھا تو انھوں نے فرمایا: کہ پہلے ہمیں معلوم نہیں تھا جب اصل حقیقت کا پتہ چلا تو ہم نے اپنے مدرسہ کے لیے یہ زکوۃ لینا چھوڑ دیا۔

اس پر مفتی صاحب نے مجھ پر سوال کیا ہے کہ "کیا موصوف اپنے اس ممدوح کو جو اپنے مدرسہ کے لیے سود وصول کرتے رہے اپنے فتوے کی زد میں لاتے ہیں اور ان کے وصول کردہ سود کا کیا بنا؟

اس کے متعلق گزارش ہے کہ میرے ممدوح اور مفتی صاحب کے ممدوحین میں یہ فرق ہے کہ میرے ممدوح نے لاعلمی میں زکوۃ سمجھ کر مدرسے کے لیے وہ رقم لی جب کہ مفتی صاحب کے ممدوحین یہ کر رہے ہیں کہ یہ سودی رقم ہے۔ اور دوسرا فرق یہ ہے کہ میرے ممدوح کو جب علم ہوا کہ انھوں نے اسے وصول کرنا چھوڑ دیا جب کہ مفتی صاحب کے ممدوحین یہ جانتے ہوئے بھی

برابر ہڑپ کیے جا رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دونوں کرداروں کا ذکر فرمایا ہے:

﴿ فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهِ فَانْتَهٰى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَ اَمْرُهُ اِلَى اللّٰهِ وَ مَنْ عَادَ فَاولٰئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ .﴾

اصول فقہ سے سودی رقم کی وصولی پر استدلال:

سود کی مطلق حرمت سے انکار چونکہ بالکل ہی بے دلیل بات تھی اس لیے کوئی آیت یا حدیث نہ ملنے کی وجہ سے مفتی صاحب نے اہل الرائے کی طرح اصول فقہ کے ایک مزعومہ قاعدے کا سہارا لیا ہے۔

فرماتے ہیں: ''اصول فقہ میں یہ بات مسلمہ ہے کہ حرمت ذوات اشیاء پر وارد نہیں ہوتی بلکہ ان کے استعمال پر وارد ہوتی ہے۔ مثلاً ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُم.﴾ میں ماں سے نکاح وغیرہ حرام ہے۔ ورنہ ماں سے متعلقہ حرمت مطلقہ کی صورت میں ہر معاملہ حرام ہو جانا لازم آئے گا، جس میں ماں کی خدمت یا ماں کی شفقتیں بھی شامل ہو جائیں گی۔'' الخ

یہ قاعدہ جو انھوں نے بیان فرمایا بالکل ہی غلط ہے حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس چیز پر حرمت آئے گی اس میں ہر قسم کا تصرف مطلقاً حرام ہوگا خواہ ذات پر آئے وصف پر، اگر ذات پر حرمت آئے تو کسی وصف کا اعتبار کیے بغیر اس میں ہر قسم کا تصرف مطلقاً حرام ہوگا اور اگر وصف پر حرمت آئے، تو جب تک وہ وصف رہے گا اس میں ہر قسم کا تصرف مطلقاً حرام ہوگا۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ خود اس اطلاق میں سے کوئی چیز مستثنیٰ فرما دے تو الگ بات ہے۔

ذات پر آنے والی حرمت کی مثال ہے: ﴿ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ .﴾ اس پر امام بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' والحرمة المضافة الى العين تفيد عرفا حرمة التصرف مطلقاً الا ما خصه الدليل كالتصرف فى المدبوغ ''

''یعنی جس حرمت کی نسبت ذات کی طرف ہو وہ عرف میں تصرف کے مطلقاً حرام ہونے کا فائدہ دیتی ہے سوائے اس کے جسے دلیل خاص کر دے جیسا کہ رنگے ہوئے چمڑے میں تصرف ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ مردار کا کھانا، کسی کو دینا، کسی سے لینا، اس کا بیچنا، اس کی قیمت کھانا، غرض ہر تصرف

حرام ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے جو چیز اس سے مستثنیٰ فرما دی ہے مثلاً رنگا ہوا چمڑا یا حالت اضطرار تو وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

وصف کی مثال ربا (سود) ہے جب کسی مال میں یہ وصف ہوگا تو اس میں تصرف مطلقاً حرام ہوگا۔ اس کا وصول کرنا، کھانا، استعمال کرنا سب حرام ہے۔ اگر کسی مال میں یہ وصف نہ ہو تو اس میں حرام ربا (سود) نہیں وہ حرام نہیں ہوگا اگر اس میں حرمت کی کوئی اور وجہ نہ ہو۔

﴿ حُرِمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهَاتُكُم. ﴾ کی جو مثال انھوں نے لکھی ہے تو یہاں ﴿ حُرِمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ. ﴾ کی طرح ذات پر حرمت آئی ہی نہیں بلکہ آیات کے اخیر میں اللہ تعالیٰ نے خود وضاحت فرما دی ہے کہ محرمات کی حرمت اور دوسری عورتوں کی حلت کس چیز میں ہے۔

﴿ انْ تَبْتَغُوا بِاَمْوَالِكُم مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُصَافِحِيْنَ . ﴾ یعنی یہ حرمت وعلت نکاح سے متعلق ہے، اور ماں سے نکاح مطلقاً حرام ہے۔ اس کی کوئی صورت بھی حلال نہیں، یہاں حرمت کی نسبت ذات کی طرف ہے ہی نہیں، کہ ماں کی شفقت وغیرہ بھی حرام ہو جائے۔

اہل کتاب کی غلطی کی وجہ:

معلوم ہوتا ہے یہی قاعدہ اہل کتاب کو گمراہ کرنے کا سبب بنا کہ حرمت ذوات اشیاء پر نہیں بلکہ ان کے ناجائز استعمال پر وارد ہوتی ہے۔ انھوں نے مردار اور چربی کی حرمت کے بعد ان میں تصرف مطلقاً حرام نہ سمجھا۔ صحیح بخاری: (۲۹۸/۲) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَّا حَرَّمَ شُحُوْمَهَا اَجْمَلُوْ ثُمَّ بَاعُوْهُ وَ اَكَلُوْ ثَمَنَهٗ » [1]

"اللہ تعالیٰ یہودیوں کو تباہ کرے، جب اللہ تعالیٰ نے ان پر چربیاں حرام کیں تو انھوں نے اسے پگھلایا، پھر اسے بیچ دیا اور اس کی قیمت کھا گئے۔"

اگر وہ مطلقاً تصرف کو حرام سمجھتے تو کبھی ایسا نہ کرتے۔

ہو سکتا ہے یہی قاعدہ یہودیوں کے سود وصول کرنے کا سبب بنا ہو کہ انھوں نے سودی رقم میں تصرف کو مطلقاً حرام نہ سمجھا بلکہ اسے وصول کر کے اپنی ملکیت میں لاتے رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے جرائم میں یہ بھی شمار فرمایا ہے:

---

[1] (٤٥٨) صحيح البخاري، كتاب البيوع، باب لا يذاب شحم الميتة ولا يباع و دكه (٢٢٢٣)، متفق عليه كما في المشكاة (٢٧٦٦)

﴿ وَ اَخۡذِهِمُ الرِّبٰا وَ قَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ . ﴾
''یعنی وہ سود وصول کرتے تھے حالانکہ انھیں اس سے منع کیا گیا تھا۔''

آیات قرآنی ﴿ اَحَلَّ اللّٰهُ الۡبَيۡعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰا. ﴾ اور ﴿ اِتَّقُوۡا اللّٰهَ وَذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰا. ﴾ کا ظاہری مفہوم بھی سود کی حرمت مطلقہ ہے، اور یہ آیات اس مفہوم میں نص بھی ہیں۔ یعنی یہ ذکر بھی اسی مقصد کے لیے کی گئی ہیں۔ مفتی صاحب نے ان سے سود کی حرمت مطلقہ کو تو قصورِ فہم اور ظاہریت قرار دے دیا۔ مگر ﴿ وَاَخۡذِهِمُ الرِّبٰا . ﴾ یعنی یہودیوں کے سود لینے کو جرم قرار دینا ایسی واضح نص تھی کہ مفتی صاحب اس کی تاویل نہیں کر سکے۔ حالانکہ میں نے سود کی حرمت مطلقہ کے سلسلے میں یہ آیت بھی ذکر کی تھی۔

اصول فقہ کے قواعد کی حقیقت:

معلوم ہوا کہ اصول فقہ کے بہت سے قاعدے آیات واحادیث کو رد کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ احناف نے بہت سے قاعدے اس لیے ایجاد کیے ہیں کہ وہ ان کے ذریعے ان تمام صحیح احادیث کو رد کر سکیں جو ان کے مذہب کے خلاف ہیں۔ پھر انھوں نے مثال کے طور پر نو قاعدے بیان کئے ہیں۔ دیکھیے ''مقدمہ نتائج التقلید'' ایسے ہی قواعد کی رو سے احناف نے دار الحرب میں سود حلال قرار دیا اور یہودیوں نے اپنے مخالفین (امیین) کا مال کھانا جائز قرار دیا خواہ کسی طرح بھی ہاتھ آجائے۔

ایسے وضعی قواعد جن کی قرآن وحدیث سے تائید نہ ہوتی ہو، ماننا مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ کجا یہ کہ ان کے نہ ماننے کو ظاہریت اور ماننے کو اہل حدیث ہونا قرار دیا جائے۔

''جی پی فنڈ'' کی سودی رقم کا اصل مالک کون ہے؟:

مفتی صاحب نے اپنے پہلے فتوے میں سودی رقم وصول نہ کرنے کی قباحت یہ لکھی تھی کہ ممکن ہے سرکار اس مال کو ایسے مشن پر صرف کر دے جہاں اسلام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو یا کارندے خود ہی ہضم کر جائیں۔

اس پر میں نے لکھا تھا کہ'' ملازم صرف اپنی رقم کا مالک ہے ﴿فَلَكُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِكُمۡ. ﴾ تم صرف اپنے اصل مال کے مالک ہو۔ سودی رقم کا یہ مالک ہی نہیں تو جس رقم کا یہ مالک ہی نہیں وہ غلط مصرف میں خرچ ہو یا کوئی کارندہ لے جائے یہ بے چارہ اس کا ذمہ دار کیسے بن گیا؟''

اب انھوں نے دفاعی مضمون میں سرکار کو اس مال کی ملکیت سے ہی فارغ کر دیا ہے صرف کارندوں کے

ہضم کرنے کا اندیشہ باقی رکھا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: چونکہ حکومت اپنے قانون کے مطابق اسے نہیں لے سکتی۔ لہٰذا درمیان والے جو اس کے مالک نہیں ہوتے، ریٹائر ہونے والے شخص کے انکار کرنے پر یہ سود خور ہی کھا جاتے ہیں۔ دراصل یہ زائد مال (سود) حکومت کے چھوڑ دینے کے بعد کسی کی ملکیت نہیں ہوتا لیکن ریٹائر ہونے والے شخص کے نام درج ہوتا ہے۔ الخ

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے نام پر درج ہونے سے سود اس کے لیے کیسے حلال ہو گیا؟ کیا اس کے نام اللہ تعالیٰ نے وہ رقم درج کر دی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے: تم صرف اپنے اصل مال کے مالک ہو اگر کروڑ رجسٹروں میں بھی سود اس کے نام پر درج کر دیا جائے وہ اس کا مالک نہیں ہو سکتا۔ تو جس چیز کا وہ مالک نہیں اور وہ ہے بھی سود، اسے وصول کر کے جہنمی، ملعون، اللہ کا دشمن اور ماں سے زنا کا مرتکب بننا کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟

میں نے ''پراویڈنٹ فنڈ'' اور دوسرے فنڈز کے متعلق کچھ سوالات لکھ کر جناب ماسٹر محمد سعید صاحب کے ہاتھ بھیجے کہ آپ ان کا تحریری جواب لے کر آئیں۔ انھوں نے ''اے جی آفس'' لاہور کے سپرنٹنڈنٹ جناب محمد اقبال سے ان کے تحریری جواب لا کر مجھے دیے۔ ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ اگر ''جی پی فنڈ'' پر سود لگ چکا ہو اور ملازمت کے آخر میں کوئی ملازم سود نہ لینا چاہے تو اس کے لیے وہ کیا طریق کار اختیار کرے وہ زائد رقم اس صورت میں کہاں جائے گی؟

اس کا جواب یہ آیا کہ ''جی پی فنڈ'' کے ساتھ اگر سود لگ چکا ہے تو ملازم آخری ادائیگی کے وقت سود لینے سے انکار کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں سودی رقم بحق سرکار خزانہ میں جمع ہو جائے گی اور اس کو نکالنے کا اختیار صرف متعلقہ ملازم کو ہے۔ دفتر کے کارندے اسے نکال کر نہیں کھا سکتے کیونکہ وہ اس کے اکاؤنٹ میں جمع ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ یہ کہنا درست نہیں کہ ملازم کے انکار کی صورت میں وہ رقم کسی کی بھی ملکیت نہیں بلکہ وہ حکومت کے پاس ہی رہتی ہے۔ دفتر کے کارندے اسے نہیں نکال سکتے۔ بالفرض کوئی کارندہ جعل سازی کر کے رقم نکلوا لے تو حکومت جانے اور اس کا کارندہ جانے۔ ہم حکومت کا مال اس کے کارندوں کے ہاتھوں خرد برد سے بچانے کے لیے خود کیوں اللہ کے دشمن، جہنمی، ملعون اور ماں سے زنا کے مرتکب بنیں؟

کیا پراویڈنٹ فنڈ پر ملازم کی مرضی کے بغیر سود دیا جاتا ہے؟

مفتی صاحب نے ''پراویڈنٹ فنڈ'' کے ساتھ ملنے والی رقم کو سود قرار دیا تھا اور پھر اس کو وصول کر کے حرام جگہ پر خرچ کرنے کا مشورہ دیا تھا، اس پر بعض احباب نے مؤاخذہ کیا کہ پھر تو بینکوں میں جمع شدہ رقم پر بھی سود لے لینا چاہیے اور حرام جگہ پر خرچ کر دینا چاہیے۔ مفتی صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا ہے، ''جی پی فنڈ'' کے سود اور بینکوں کے سود میں فرق ہے کیوں کہ بینکوں میں دو قسم کے کھاتے ہوتے ہیں، ایک ''سیونگ اکاؤنٹ'' جس میں رقم جمع کرائی جائے تو سود ملتا ہے دوسرا ''کرنٹ اکاؤنٹ'' جس میں رقم جمع کرائی جائے تو سود نہیں ملتا۔ چونکہ اس نے اپنے اختیار سے سود والے کھاتے میں رقم جمع کروائی ہے اس لیے سودی معاملہ ہونے کی وجہ سے یہ سودی رقم وصول کرنا حرام ہے۔ اس کے برعکس پراویڈنٹ فنڈ میں ملازم کی مرضی کے بغیر سود دیا جاتا ہے۔ اس لیے اسے وصول کر کے حرام جگہ پر خرچ کر دینا چاہیے۔

مفتی صاحب کا دم غنیمت ہے کہ انھوں نے ''پراویڈنٹ فنڈ'' کے ساتھ ملنے والی رقم کو سود تو قرار دیا۔ یہاں کئی ایسے بزرگ موجود ہیں جو اس رقم کو بغیر مانگے ملنے کی وجہ سے سود قرار ہی نہیں دیتے (بلکہ حلال اور طیب مال سمجھتے ہیں) جیسا کہ مفتی صاحب نے ''فتاویٰ علمائے حدیث'' سے نقل کیا ہے اور جیسا کہ اوکاڑہ کے ایک بزرگ نے ''الاعتصام'' میں فرمایا کہ '' ملازم کی تنخواہ میں سے وضع کردہ رقم پر گورنمنٹ ملازم کی مرضی سے نہیں بلکہ اپنی مرضی سے کچھ زائد رقم دیتی ہے اس لیے اسے سودی رقم کہنا محل نظر ہے۔''

افسوس! کہ ہمارے علماء الا ما شاء اللہ فتویٰ دیتے وقت پوری معلومات حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ اور ''اَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ'' کا مصداق بنتے ہیں۔ اگر کوئی انھیں ٹوکے تو اس پر ظاہریت اور عدم تفقہ کا فتویٰ چسپاں کر کے اہل حدیث سے ہی نکال باہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حکومت کسی سرکاری ملازم کی مرضی کے بغیر اسے ''پراویڈنٹ فنڈ'' پر سود دیتی ہی نہیں جو لوگ کہتے ہیں کہ حکومت اپنی مرضی سے یہ زائد رقم دیتی ہے۔ اصل صورت حال سے بالکل بے خبر ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ کسی سرکاری ملازم کی تنخواہ سے ''پراویڈنٹ فنڈ'' کی کٹوتی اس وقت شروع ہوتی ہے جب ایک درخواست کا فارم پر کروا کر اس سے دستخط لئے جاتے ہیں۔ اس فارم میں ملازم سے صاف لفظوں میں پوچھا گیا ہے کہ آیا درخواست دہندہ اپنی جمع شدہ رقم پر سود لینا چاہتا ہے یا نہیں؟ گورنمنٹ اکاؤنٹ آفس سے وہ فارم حاصل کر کے اس کی فوٹو ساتھ دی جا رہی ہے۔ اس کے خانہ نمبر:۱۴ کو ملاحظہ

فرمالیں اور بے شک کسی انگریزی جاننے والے سے اس کا ترجمہ کروالیں۔

اگر ملازم لکھ دے کہ میں سود نہیں لینا چاہتا تو اس کی رقم کے ساتھ سود نہیں لگایا جاتا۔ اس سے معلوم ہوا بینک کے سود اور ''جی پی فنڈ'' کے سود میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں اختیار ہیں۔ امید ہے اب مفتی صاحب ''سیونگ اکاؤنٹ'' کے سود کی طرح جی پی فنڈ کا سود وصول کرنے کو بھی حرام قرار دیں گے۔

بعض اوقات اکاؤنٹ آفس کے کلرک اپنی مرضی سے اس کا فارم پر کرکے اس کی طرف سے لکھ دیتے ہیں کہ میں سود لینا چاہتا ہوں اگر ایسی صورت پیش آجائے تو ملازم جس وقت بھی چاہے ایک درخواست لکھ کر ذمہ دار افسر کو دے دے کہ میں سود نہیں لینا چاہتا تو اس کے فنڈ کے ساتھ سود نہیں لگایا جائے گا۔ جیسا کہ ہمارے کئی بھائیوں نے درخواستیں دے کر سود ختم کروایا ہے۔ ہمارے بھائی ماسٹر ابوسعید محمد خالد صاحب نے مجھے اپنا ایک واقعہ سنایا کہ میں نے درخواست لکھ کر بھیجی کہ ''پراویڈنٹ فنڈ'' میں میری رقم کے ساتھ سود نہ ملایا جائے۔ جب کئی دن تک کوئی جواب نہ آیا تو میں خود متعلقہ افسر کے پاس حاضر ہوا۔ ان نے بتایا کہ آپ کی درخواست پہنچ گئی ہے مگر آپ ہمارے ساتھ بحث کرلیں کہ آپ یہ زائد رقم کیوں نہیں لیتے۔ میں نے کہا بحث کی خاص ضرورت نہیں۔ آپ دولفظوں میں بتائیں کہ یہ زائد رقم سود ہے یا نہیں؟ اس نے کہا سود تو ہے۔ میں نے کہا پھر مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ آپ میرے فنڈ کے ساتھ یہ نہ ملائیں۔ اس نے درخواست منظور کرکے سودی اضافہ ختم کردیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے وہ بھائی جو سرکاری ملازم ہیں شروع ہی میں فارم پر لکھ کر دے دیں کہ ہم اپنے جمع شدہ فنڈ پر سود نہیں لینا چاہتے۔ اگر ان کے علم کے بغیر کسی کلرک نے از خود لکھ دیا ہے تو سود لینا چاہتے ہیں تو اولین فرصت میں درخواست دے کر سودی اضافہ ختم کروائیں۔ اگر یہ وقت بھی گزر چکا ہے اور فنڈ وصول کرنے کا وقت آ گیا ہے تو پھر اپنی اصل رقم وصول کرلیں۔ سود وصول نہ کریں۔ حکومت کے پاس ہی رہنے دیں اگر کوئی لے چکا ہے تو اصل مالک (حکومت) کی طرف واپس کردے۔ واللہ اعلم بالصواب.

بعض بزرگوں کی ایک نئی دلیل:

بعض بزرگوں نے جو تازہ بات نکالی ہے کہ حکومت ''جی پی فنڈ'' کے علاوہ ''انشورنس فنڈ'' اور ''بہبود فنڈ'' بھی وضع کرتی ہے، اور ریٹائر ہونے کے بعد ایک ٹیڈی پیسہ بھی واپس نہیں کرتی۔ اس لیے ملازم ''جی پی فنڈ'' کے ساتھ زائد ملنے والی رقم لے سکتا ہے کیونکہ وہ اس کی مرضی کے بغیر دی جاتی ہے اور سود نہیں ہے۔ تو یہ بات

درست نہیں ہے۔ حکومت کے ساتھ ملازم کی یہ بات شروع میں ہی طے ہو چکی ہے کہ فلاں فلاں فنڈ میں اتنی رقم کاٹی جائے گی اور ریٹائر ہونے کے بعد آپ کو نہیں ملے گی۔ اگر اس کو یہ شرط قبول نہ تھی تو ملازمت منظور نہ کرتا۔ اب ساری شرطیں قبول کر کے ملازم بن جانے کے بعد حق غصب کیسے ہو گیا۔ حق غصب تو تب ہوتا کہ حکومت ملازم کو ریٹائر ہونے کے بعد وہ رقم دینے کا وعدہ کرتی اور پھر مار جاتی۔

''پراویڈنٹ فنڈ'' میں ملازم کی مرضی کے ساتھ سود شامل کرنے کی بات اوپر تفصیل سے گزر چکی ہے۔

تعاقب از ڈاکٹر عطاء محسن ......(۲)

''الاعتصام'' میں ''جی پی فنڈ'' میں ملنے والی سودی رقم کی وصولی اور اس کے استعمال کی بابت جو فتویٰ شائع ہوا تھا۔ میں نے اس پر کتاب وسنت کی روشنی میں موقف پیش کیا تھا۔ حالیہ شمارے میں مفتی صاحب نے اس موقف پر تعاقب فرمایا ہے جو محض تعاقب ہی ہے کیونکہ مفتی صاحب نے پہلے کی طرح اب بھی اپنے موقف کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور قرآن مجید یا رسول اللہ ﷺ کے عمل سے کوئی دلیل نہیں دی، بلکہ فرماتے ہیں: ''شریعت میں ہر چیز کی صراحت کا نظریہ ظاہریہ کا ہے۔'' جب کہ خود اس معاملے میں قرآن مجید اور پھر رسول اللہ ﷺ کے عمل کی صراحت کے باوجود اس کے برعکس موقف اختیار کئے ہوئے ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے سود کو چھوڑنے کا جو حکم دیا رسول اللہ ﷺ نے بھی اس پر اس طرح عمل کیا اور سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سود چھوڑ دینے کا حکم دیا حالانکہ اس وقت بھی استعمال کی یہ صورتیں موجود تھیں جن کا ذکر مفتی صاحب نے کیا ہے۔ لیکن مفتی صاحب نے اپنے فتویٰ کے اثبات کی خاطر رسول اللہ ﷺ کی اس عملی تفسیر کو نظر انداز کیا اور سود کی دو خود ساختہ قسمیں بیان کیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''ہم نے اپنے فتوے میں ''جبری جی پی فنڈ'' کے سود کا ذکر کیا ہے۔''

اور رسول اللہ ﷺ کے عمل سے میں نے جو مثال پیش کی اس کے بارے میں فرماتے ہیں: ''اختیاری سودی معاملے کی مشابہت حجۃ الوداع میں نبی اکرم ﷺ کی اس واقعاتی صورت حال سے پوری طرح موجود ہے۔''

اس طرح مفتی صاحب نے نبی ﷺ کا عمل جو قرآن مجید کے الفاظ کی تفسیر تھا اسے اختیاری سودی معاملے تک محدود کیا اور اس معاملے میں قرآن مجید کی جو آیت پیش کی گئی اسے ظاہری معنیٰ کی پیروی کہہ کر الگ کر دیا

اور اپنے فتوے کے بارے میں کوئی شرعی دلیل پیش کرنے کی بجائے یہ فرما دیا تھا کہ ہر چیز کی صراحت کا نظریہ ظاہریہ کا ہے۔ مولانا کے ایسے ہی اندازِ تحقیق کو دیکھتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ ان کے فتویٰ کی بنیاد ''فقہی'' ہے، اور اس پر کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں اور عام طور پر اہلحدیث علماء بھی کتاب وسنت کے مخالف رائے پر ''فقہ'' کا لفظ بولتے ہیں لیکن مولانا نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے میرے بارے میں یہ لفظ فقہ سے چڑ کا خیال ظاہر کرتے ہوئے حدیث: «مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ.» لکھ دی۔ حالانکہ اس سے مراد قرآن وحدیث کی سمجھ ہے نہ کہ وہ فقہ جس کے نمونے مولانا کے علم میں بخوبی ہوں گے اور یہ حقیقت ہے کہ مفتی صاحب کے زیرِ بحث فتوے کی بنیاد بھی چند ایک عقلی دلائل پر ہے جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ یہ زائد مال جو سود کی شکل ہے، سرکار کے کارندوں کے لیے کیوں چھوڑا جائے۔ وہ حرام مال کو کھائیں گے یا اسے غلط مقاصد کے لیے استعمال کریں گے۔ حالانکہ یہی کارندے اور بہت سے ناجائز حربوں سے سرکار کا مال کھا جاتے ہیں جو ان کے لیے حرام ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ زائد مال بھی سرکار کا ہے۔ ریٹائر ہونے والے کا نہیں لہٰذا وہ اسے سرکار کو واپس کردے اور ایسا کیا جا سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ چھوڑا ہوا سود لازماً کارندے ہی کھائیں گے۔ ویسے بھی یہ گورنمنٹ اور اس کے کارندوں کا معاملہ ہے۔ ریٹائر ہونے والا شخص چونکہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ سود ہے (اور مفتی صاحب بھی اسے سود مانتے ہیں) لہٰذا قرآن مجید کے حکم اور رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کی روشنی میں اسے یہ سود چھوڑ دینا چاہیے، کیونکہ کتاب وسنت میں کسی بھی مقصد کے لیے سود لے کر اس کے استعمال کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ میرے اسی موقف کو ''سطحی'' قرار دیتے ہوئے مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ ''یہ صاحب مظلوم سے ظلم کا مداوا ثواب بھی قرار دیتے ہیں اور اس مقصد کے لیے سود وصول کرنے کو بھی شرعی حد سے متجاوز بتاتے ہیں۔''

مولانا کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک اس قسم کے مقاصد کے لیے سود وصول کرنا شرعی حد سے تجاوز نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اتنے اہم اور بنیادی معاملے میں اپنے موقف پر قرآن مجید یا رسول اللہ ﷺ کے عمل سے کوئی ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکے لیکن اس کی ضرورت بھی کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک ''شریعت میں ہر چیز کی صراحت کا نظریہ ظاہریہ کا ہے اسالیب بیان کی متعدد صورتیں ہیں اگر تشدد کے بجائے مقاصد اور محاورہ کلام پیش نظر رہے تو بات خود بخود کھل جاتی ہے۔'' جب مفتی صاحب نے قرآن مجید کے حکم کو ظاہری معنی اور رسول اللہ ﷺ کی عملی صراحت کو ''اختیاری سودی معاملے'' تک محدود کر دیا تو ظاہر ہے

''جی پی فنڈ'' جیسے جبری معاملوں کے سود کے بارے میں ان کی فقاہت درکار ہوگی۔ جس کی اہمیت انھوں نے حدیث میں ((یُرِدِ اللّٰهُ......)) لکھ کر بیان کی ہے۔

اللہ ہم سب کو کتاب و سنت سے تمسک کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

تعاقب از ڈاکٹر عبید الرحمٰن چوہدری ......(۲)

السلام علیکم۔ آج کل ''الاعتصام'' میں ''پراویڈنٹ فنڈ'' پر سود لینے کے متعلق بحث چل رہی ہے۔ فتویٰ دینا تو علماء کا کام ہے خواہ کوئی اہل حدیث کہلائے یا کسی پر ظاہریت کی چھاپ لگ جائے۔ میری گزارش یہ ہے کہ اجتہاد کے لیے بنیاد حتی الامکان مضبوط تلاش کرنی چاہیے، اس بحث میں آپ نے کئی بار اس مفہوم کا اظہار فرمایا کہ سود کی رقم حساب رکھنے والے کارندوں کے لیے نہیں چھوڑ دینی چاہیے اور چونکہ حکومت اپنے قانون کے مطابق اسے لے نہیں سکتی۔ لہٰذا درمیان والے جو اس مال کے مالک نہیں ہوتے۔ ریٹائر ہونے والے شخص کے انکار پر سود خود ہی کھا جاتے ہیں۔ وغیرہ

میرے خیال میں آپ کو اس ضمن میں حکومت کے قانون کا علم غالباً نہیں ہے۔ یاد رہے کہ ریٹائر ہونے والا ملازم اگر درخواست کرے کہ وہ سود لینا نہیں چاہتا تو سود کی رقم منہا کر کے اسے اصل رقم ادا کی جا سکتی ہے اور اگر دوران ملازمت جب کہ اس کے ''جی پی فنڈ'' کی رقم کے ساتھ سود بھی شمار کیا جاتا ہو تو وہ کسی بھی وقت جمع شدہ رقم سے سود منہا کروا سکتا ہے اور آئندہ کے لیے بغیر سود کے رقم جمع ہوتی رہے گی۔ چنانچہ میں نے خود ایسا ہی کیا۔ میں نے ملٹری اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں ۳۷ سال ملازمت کی اور کبھی خیال آیا نہ کسی سے سنا کہ کوئی کارندہ سود کی رقم کھا گیا۔ گویا ہر دو صورتوں میں کوئی حساب رکھنے والا کارندہ سود کی رقم نہیں کھا سکتا۔ ایسی رقم حکومت کے اکاؤنٹ میں واپس چلی جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ریٹائر شدہ کو سمیت سود کے رقم ملی ہو اور وہ خزانچی کے کاؤنٹر پر سود کی رقم چھوڑ کر چلا جاتا ہو۔ اس بے چارے کو تو یہ علم بھی نہیں ہوتا کہ سود کی رقم ہے کتنی؟ درمیان والا کارندہ کیسے کھا جائے گا؟

- علی ھذا القیاس دیگر اداروں کا بھی یہی حال ہے خواہ سرکاری ہو یا نیم سرکاری یا غیر سرکاری۔ اگر سود لے ہی لیا ہے تو آپ سود دہندہ کو واپس کر کے تو دیکھیں، انکار نہیں کرے گا بلکہ وہ تو خوش ہوگا۔ ایسے سود کو رسول اللہ ﷺ والے قرض کی ادائیگی کے وقت کچھ زیادہ دے دینے کے ساتھ مطابقت نہیں ہے یہ سود پہلے

سے طے کر کے دیا جاتا ہے مگر رسول اللہ ﷺ نے ایسا نہیں کیا ورنہ سود ٹھہرتا۔ پھر یہ بھی ایک مفروضہ ہے کہ حکومت جی پی فنڈ کی صورت میں ملازم کی رقم تیس سال تک غصب کیے رکھتی ہے۔جس پر سود کے لے لینے کا جواز بنتا ہے۔ میرے خیال میں رسول اللہ ﷺ کے کچھ عرصہ کے لیے قرض اور واپسی پر کچھ زائد دینے والی بات کو موجودہ سود والے نظریے پر منطبق کرنا توہین رسالت ﷺ کے مترادف ہے۔

رہی بات ملکیت کی تو ملازم خود بھی اس سود کا مالک نہیں ہوتا۔اس کی تو ملک ہی حرام ٹھہری۔ جسے اللہ نے چھوڑ دینے کا سختی سے حکم دیا تو پھر کیا ضرورت ہے کہ ایسا حرام مال غصب کر کے ضرورتمندوں کو ڈھونڈتا پھرے اور اللہ کی نافرمانی کر کے اس کے غضب کو دعوت دے۔ ہاں البتہ اضطراری حالت شاذ ہے۔ایسی حالت میں تو خود بھی کھا سکتا ہے۔

میری گزارش ہے کہ حکومت ''جی پی فنڈ'' کی رقم لازم بچت کے طور پر اپنے پاس رکھتی ہے غصب نہیں کرتی۔ ملازم لوگ خوشی سے اس سے بہت زیادہ جمع کرواتے رہتے ہیں۔خواہ سود کا لالچ ہو یا بچت کا مقصد۔ اور یہ بھی عرض کردوں کہ جس زمانے میں ''جی پی فنڈ'' کی کٹوتی لازمی نہیں تھی اس وقت بھی سود دیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بھی کئی لوگ سود کے اسی قسم کے جواز کے فتاویٰ جاری کر دیا کرتے تھے، حالانکہ کوئی اضطراری حالت نہ ہوتی تھی۔ وہ صرف اس لیے کہ غیر مسلم اس سود سے فائدہ نہ اٹھائیں، حالانکہ اصل رقم سے وہ فائدہ اٹھا چکے ہوتے تھے۔اس لیے ایسی باتیں بنیاد ہی نہیں بن سکتیں،کوئی دیگر بنیاد تلاش کرنی چاہیے، ورنہ سود چھوڑ کر معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے جس کا حکم ہے۔

جواب تعاقب از حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ......(۲)

مسلک اہل حدیث ظاہریت اور خارجیت سے الگ راہِ اعتدال ہے:

میں نے ملک کے اطراف واکناف سے ''جی پی فنڈ'' کے استعمال کے بارے میں متعدد سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ ''جی پی فنڈ'' کی صورت میں مناسب یہ ہے کہ اس رقم میں شامل سود ریٹائر ہونے والا سرکاری ملازم خود استعمال نہ کرے بلکہ اسے حرام کی چٹی میں دے کر ظالم سے نجات حاصل کرے اس طرح وہ خود حرام سے بچ جائے گا۔اور ظالم سے مظلوم کو بچانے کا باعث ہوگا کیوں کہ یہ مال سود ہونے کی وجہ سے بظاہر حرام ہے تاہم مظلوم جو ظالم کو مال کھلانے پر مجبور ہے اس کے لئے مضطر ہونے کی وجہ

سے جائز ہے، اس کے لئے میں نے اصول فقہ کے ائمہ کے حوالہ سے "أَهْوَنُ الْبَلِيَّتَيْن" (دومصیبتوں سے کمتر اختیار کرنا) کے قاعدے سے بھی بات سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

اگر چہ اس اولیٰ انداز کے علاوہ سیدھا یہ کہہ دیا جائے کہ ایسے مضطر کے لئے سود حرام ہی نہیں ہوتا یہ بھی درست ہے کیوں کہ انداز بیان کی زیادہ اہمیت نہیں اصل چیز فتویٰ ہے۔ ''الاعتصام'' ۸فروری میں اس طرف توجہ دلا چکا ہوں مگر مجھے افسوس ہے کہ مولانا عبدالسلام بھٹوی صاحب غور کرنے کی بجائے جذباتی رویہ چھوڑنے پر تیار نہیں اور سود کی حرمت کا اصل مقصد نظر انداز کر کے اس رقم کو ہاتھ لگانے یا چھوڑنے کی لغوی بحث میں الجھے ہوئے ہیں اور اپنے فتویٰ کا مدار بے مقصد بات کو بنائے ہوئے ہیں۔ میں نے موصوف کو ظاہریت کا اسلوب چھوڑ کر فقہائے محدثین کا رویہ اختیار کرنے کی طرف توجہ دلائی اور سطحیت سے فتویٰ بازی کا رخ موڑنے کے لئے دوسوالات بھی حواشی میں درج کئے ہیں کہ کسی طرح وہ اپنے پیش کردہ مثالی ممدوح کو اپنے فتویٰ کی زد سے بچانے کے لئے ہوش میں آسکیں، لیکن وہ جوش میں نہ یہ دیکھتے ہیں کہ آیات واحادیث کا محل کیا ہے؟ اور نہ یہ کہ ان کی یہ سنگینی فتویٰ کس پر لاگو ہو رہی ہے؟ بلکہ سود کی حرمت کے مقصد سے قطع نظر سود کے مال کو ہاتھ لگانے پر ہی شنیع الفاظ ماں سے زنا، لعنتی اور جہنمی قرار دینے کو بار بار جا بجا دہراتے ہیں کہ ان کے سننے سے توحش سا ہونے لگتا ہے۔

جب ہم نے توجہ دلائی کہ اس وقت سود کی حرمت اور اس کی شناعت زیر بحث نہیں تو جواب یہ دیتے ہیں کہ نماز سے سستی کرنے والے کو نماز کے فرض ہونے کی احادیث سنانا بلاغت کا مسلمہ اصول ہے حالانکہ مسئلہ ہذا کی نوعیت ایسی نہیں تاہم اس مناسبت کے مفقود ہونے سے قطع نظر مزعومہ اصول بلاغت کا استعمال فتویٰ سے متعلق نہیں ہے، کہ وعظ ونصیحت اور فتوے دو مختلف چیزیں ہیں: وعظ ونصیحت میں مبالغہ پسندیدہ ہوتا ہے، جب کہ فتوے میں احتیاط ضروری ہے، کیوں کہ فتوے میں مبالغہ کرنے سے فتوے کی شناعت خود مفتی کے اوپر لوٹ آتی ہے۔ نیز جس شخص کو اصولوں سے اتنی چڑ ہو کہ وہ اصول فقہ کے کسی قاعدہ سے انداز تعبیر کو ہی فتویٰ کی بنیاد بنا لے اور یہ دعویٰ کرے کہ اصول فقہ کے قواعد آیات واحادیث کو رد کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں تو اسے یہ کب زیب دیتا ہے کہ وہ اپنی دلیل کے لئے قواعد بلاغت کو مسلمہ قرار دے۔ اگر وہ اصول فقہ کو اہل الرائے کی ایجاد قرار دیتے ہیں تو انہیں کوئی شخص یہ بھی یاد دلا سکتا ہے کہ علم بلاغت کے بیشتر قواعد اہل ھوی (خوارج معتزلہ شیعہ وغیرہ) نے اپنی باطل تأویلوں کے لئے وضع کئے اس طرح ایک علمی

مسئلہ کج بحثی کا شکار ہو جائے گا۔

ہماری رائے میں یہ درست ہے کہ علوم الٰہیہ، بلاغت وغیرہ کے ذریعے اگرچہ گمراہ فرقوں نے بھی غلط فائدے اٹھائے ہیں لیکن ہم آپ کو یہ حق دیتے ہیں کہ آپ ان سے استدلال کریں۔ لیکن ساتھ ہی انہیں درست محل میں استعمال کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی عرض کریں گے کہ اصول فقہ و اجتہاد مرتب کرنے کا سہرا خواہ مخواہ اہل الرائے کے سر نہ لگایئے کہ اسے سب سے پہلے متعارف کرانے کا اعزاز امام شافعی رحمہ اللہ کو حاصل ہوا تو اس علم کی شان اجاگر کرنے میں ابن تیمیہ اور شوکانی رحمہما اللہ کے علاوہ برصغیر میں اہل حدیث کے سرخیل شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ، نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ بھی شامل ہیں۔

ماضی قریب کے اہل حدیث بزرگوں میں سے مولانا ثناء اللہ امرتسری، حافظ عبداللہ محدث روپڑی اور حافظ محمد گوندلوی رحمہم اللہ سبھی اس علم کے خادم رہے ہیں۔

اور دورِ حاضر کے اہل علم اپنے افتاء و قضاء میں اسے نہ صرف استعمال کرتے ہیں بلکہ بلا تفریق جملہ مکاتب فکر بشمول اہل حدیث اسے اپنے مدارس میں اہتمام سے پڑھاتے ہیں، بلکہ اگر موصوف کو خود ضرورت پڑے تو "یُؤْخَذُ الْمَرْءُ بِإِقْرَارِہٖ" اصول پیش کرنے سے بھی نہیں چونکتے۔ ہمیں حیرانی ہے کہ جب بلاغت و اصول آپ استعمال کریں تو یہ علم مسلمہ ہو جاتا ہے لیکن جب ہم بیان کریں تو اصول فقہ کے بانی اہل الرائے بن جاتے ہیں۔

فاضل موصوف نے ہماری وضاحت پر جو تعاقب ''الاعتصام'' میں شائع کرایا ہے اس کا تفصیلی جائزہ لینا ہمارے نزدیک تو وقت کا ضیاع ہے کہ ہر دوسرا فقرہ پریشان خیالی کا مظہر ہے تاہم منتشر بحث کو ہم پھر اصل نکات کی طرف لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ زیر بحث صورت صرف یہ ہے کہ تنخواہ میں سے جو جبری کٹوتی کی جاتی ہے اس کٹوتی پر جو رقم سود شامل کر کے ملازم کے کھاتے میں جمع کر دی جاتی ہے قانوناً اس کا مالک ملازم ہوتا ہے۔ یہ ملازم اگر نہ نکلوائے تو یہ رقم اس کے کھاتے ہی میں جمع رہے گی۔ جو کسی دیگر محکمانہ چٹی کے وقت اس سے وصول بھی کی جا سکتی ہے۔ تاہم اگر یہ نکلوائے تو پھر کیا کرے؟

مولانا عبدالسلام بھٹوی کے نزدیک ظاہری تشدد پسندی کی وجہ سے اس کا ہاتھ چونکہ اس رقم کو لگ گیا ہے اس لئے یہ شنیع فتویٰ کے زیر عتاب آ جائے گا، جب کہ ہماری رائے میں ہاتھ لگنا یا نہ لگنا اصل مسئلہ نہیں بلکہ اس

رقم کے استعمال کا ہے۔ اگر وہ محکمہ کے کاندھوں پر چھوڑتا ہے تو وہ ان کو حرام کھلانے کا سبب بنتا ہے اگر وہ اسے لے کر ظلم کے علاج کے لئے صرف کر دے تو اس صورت میں وہ بے بس (مضطر) کے زمرے میں داخل ہو کر معذور قرار پائے گا۔ دراصل اس طرح کے پہلو مسائل کے تیسرے سوال کے جواب میں کھلتے ہیں جسے فاضل موصوف ہمارے توجہ دلانے کے باوجود عملاً نظر انداز کر رہے ہیں۔ حالانکہ ہم نے موصوف سے یہ پوچھا تھا کہ آپ کی اس لفظی بحث سے لازم آتا ہے کہ جو شخص اس رقم کو لے کر پھر ضائع کر دے اس پر بھی ماں سے زنا، لعنتی جہنمی بننے کی وعیدیں وارد ہو جائیں گی کیوں کہ اس نے سود کو ہاتھ لگا کر: ﴿ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا. ﴾ (البقرۃ:۲۷۸) کے ظاہری الفاظ کی خلاف ورزی کی ہے، لیکن موصوف اس سوال کا جواب چھوڑ کر اپنے ممدوح کا قرآن کریم کی آیت: ﴿ فَمَنْ جَاءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ. ﴾ (البقرۃ:۲۷۵) (جس کے پاس اس کے رب کی نصیحت آئی پس وہ باز آ گیا اسی کے لئے ہے جو پہلے ہو چکا ہے) سے دفاع کرتے ہیں حالانکہ یہ بالکل آیت مذکورہ کا بے محل استعمال ہے۔ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نص ہے جو سود کی حرمت آنے سے پہلے سود کھا چکے تھے۔ ان لوگوں کے بارے میں یہ آیت قطعاً عذر نہیں ہے جو سود کی حرمت آنے کے بعد سود کھاتے رہے ایسے شخص کے لئے ایسا مال واپس کرنا ضروری ہے۔ لیکن ہمارے سوال کے باوجود کہ شاہ صاحب کے وصول کردہ سود کا کیا بنا؟ موصوف آیت مذکورہ سے ان کا دفاع کرتے ہیں۔ ہم موصوف سے اپنے ممدوح پر رحم کرنے کی اپیل کرتے ہیں۔

باقی رہا ہم پر یہ اعتراض کہ ہم نے ﴿ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا. ﴾ اور ﴿ وَ أَخْذِهِمُ الرِّبَا. ﴾ کا ذکر نہیں کیا درست نہیں، کہ وصول کرنے کی ممانعت اور چھوڑنے کا حکم ایک ہی معنی رکھتا ہے بلکہ ﴿ وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا. ﴾ والی آیت میں: ﴿ وَ أَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ. ﴾ (النساء:۱۶۱) کے الفاظ ہماری طرف سے پیش کردہ حرمت سود کے اصل مقصد کی نشاندہی کرتے ہیں۔

لہٰذا وہ ہماری دلیل ہے جو شخص سود خود کھانے کی بجائے ظلم کی چٹی میں دے دے۔ وہ سود وصول کرنے کی مذمت کا مستحق ہی نہیں جب کہ آپ کے ممدوح آپ کے فتوے کی پوری طرح زد میں ہیں۔

اصول فقہ اور اہل حدیث ہم نے فاضل موصوف سے حسن ظن کی بناء پر ان سے اول فقہ کے حوالہ سے گفتگو اس لئے کی تھی کہ اہل علم کو اپنی غلطی کا احساس دلانے کے لئے یہ معروف طریقہ ہے۔ اگر قواعد واصول چھوڑ کر بالکل آزاد عامیانہ گفتگو کی جائے تو اس کی کوئی انتہاء نہیں ہوتی۔ اصول فقہ کے استعمال کا ایک روشن

پہلو یہ بھی ہے کہ [1] خوارج کی طرح بے بنیاد فتویٰ بازی سے بچاؤ بھی ممکن ہوتا ہے۔عرب ممالک میں جو نوجوان جذباتیت اور کم علمی کی بناء پر زیر زمین تحریکوں میں شامل ہو کر اہل علم کی تکفیر وغیرہ میں پیش پیش ہیں جن سے جہاد افغانستان میں روابط کی وجہ سے بعض اہل حدیث بھی متاثر ہو رہے ہیں۔

اس وجہ سے بھی اہل حدیث کو فقہ و اجتہاد سے بدکنا نہیں چاہیے بلکہ جیسے ہمارے اسلاف نے کتاب و سنت کے ساتھ فقہ مقارن کا طریقہ اپنایا ہے اسی طرح تقلید کے بالمقابل باضابطہ اجتہاد کی تربیت کے اصول کے لئے اصول فقہ کی علمی بصیرت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔جس کی بناء پر اہل حدیث میں عدم تقلید کے ساتھ مثبت سلفی بنیادوں پر چلنے کا رجحان فروغ پائے گا۔کیونکہ اصول فقہ کے لئے اس تمہید کے بعد ہم موصوف کی طرف سے شریعت کے مقاصد کو نظر انداز کر کے قرآن و حدیث کی لغوی تشریح کو ہی نصوص قرار دینے پر اپنے تبصرہ کی طرف آتے ہیں جس میں ہم نے اصول فقہ کے حوالے سے یہ لکھا تھا کہ حرمت ذوات اشیاء پر وارد نہیں ہوتی بلکہ ان کے استعمال پر وارد ہوتی ہے جسے موصوف نے نہ صرف غلط قرار دیا بلکہ اسے یہودی طرز عمل بتلایا ہے۔چنانچہ ہم حنفی اصول کی بجائے نامور اہل حدیث عالم مدینہ یونیورسٹی کے سابق مدیر تعلیم شیخ محمد سلیمان اشقر کی اصول فقہ میں مشہور تالیف "اَلْوَاضِح فِيْ أُصُوْلِ الْفِقْه ص۴۳-۴۴" جسے کویت کے الدار السلفیہ (اہل حدیث) نے شائع کیا ہے، سے یہ اصول پیش کرتے ہیں۔فرماتے ہیں:

" اَلذَّوَاتُ غَيْرُ الْإِنْسَانِيَّةِ لَيْسَتْ مَحْكُوْمًا فِيْهَا فَحَيْثُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ﴾الاية. لَيْسَ التَّحْرِيْمُ وَارِدًا عَلٰى ذَاتِ الْمَيْتَةِ وَالدَّمِ ،وَ إِنَّمَا هُوَ وَارِدٌ عَلٰى فِعْلٍ لِلْإِنْسَانِ مُتَعَلِّقٌ بِالْمَيْتَةِ وَ يَكُوْنُ الْمَقْصُوْدُ تَحْرِيْمَ(تَنَاوُلِ) الْإِنْسَانِ لِلَحْمِ الْمَيْتَةِ أَوِالْاِنْتِفَاعِ بِهٖ وَ حَيْثُ قَالَ تَعَالٰى:﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ﴾.يَكُوْنُ الْمُرَادُ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ (فِعْلٌ) مُعَيَّنٌ يَتَعَلَّقُ بِالْأُمَّهَاتِ وَ هُوَالنِّكَاحُ وَ مُقَدِّمَاتُهٗ فَيُقَدَّرُ الْفِعْلُ فِيْ كُلِّ مَقَامٍ بِحَسْبِهٖ ."

---

[1] (۴۵۹) آج کل عرب ممالک میں انہیں "أَصْحَابُ الْهِجْرَةِ وَالتَّكْفِيْر" کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ معاشرے میں پائی جانے والی خرابیوں پر سیخ پا ہو کر فوراً کفر کے فتویٰ لگانے لگتے ہیں۔اور عموماً بڑی خرابی کو نظر انداز کر کے چھوٹی برائی ہی کے خلاف جہاد پر ابھارتے ہیں اور اسلام کے کھلے دشمنوں کی بجائے مسلمانوں سے قرب رکھنے والوں سے ہجرت کی تبلیغ کرتے ہیں۔خوارج کا یہی طریق کار تھا۔(حافظ ثناء اللہ مدنی)

''شرعی احکام انسان کے علاوہ دوسری چیزوں پر بعینہ وارد نہیں ہوتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قرآن میں ارشاد: مردار اور خون وغیرہ کی حرمت کے بارے میں ہے۔ یہاں مردار اور خون وغیرہ بعینہ حرام نہیں بلکہ انسان کا وہ فعل حرام ہے جو مردار اور خون سے متعلق ہے یعنی مقصود انسان کے اس استعمال کی حرمت ہے جو مردار کے گوشت اور اس سے نفع اٹھانے سے متعلق ہے اسی طرح قرآن میں اللہ کا ارشاد: ماؤں کی حرمت کے بارے میں ہے کہ یہاں مراد بیٹوں کا وہ خاص فعل ہے جو ماؤں سے متعلق ہے یعنی نکاح اور اس کی مبادیات ،پس ہر جگہ اس کے مناسب فعل محذوف مانا جائے گا۔''

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہاں ہماری دی ہوئی مثال ماں کی حرمت اور فاضل موصوف کی پیش کردہ مثال مردار اور خون کی حرمت دونوں کا ذکر ہے، جس سے معلوم ہوا کہ ہمارا پیش کردہ اصول درست ہے۔ فاضل موصوف نے اگرچہ بیضاوی کے حوالہ سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ مردار میں تصرف کی حرمت مطلقاً ہے لیکن لفظ تصرف بتا رہا ہے کہ حرمت کا تعلق ذات سے نہیں تصرف و استعمال سے ہے۔

لفظ تصرف اور استعمال (جو ہمارے کلام میں ہے) کے درمیان عربی اور اردو محاورے کے علاوہ کیا فرق ہے؟ ایک ہی معنیٰ ہے۔ اسی طرح مطلقاً ہے لیکن لفظ تصرف بتا رہا ہے کہ حرمت کا تعلق ذات سے نہیں تصرف و استعمال سے ہے۔

اسی طرح مطلقاً کے لفظ کے بعد بیضاوی کی عبارت: "إِلَّا مَا خَصَّهُ الدَّلِيْلُ كَالتَّصَرُّفِ فِي الْمَدْبُوْغِ " نے یہ حقیقت بھی کھول دی کہ استعمال کے متعلق بھی یہ دیکھا جائے گا کہ استعمال جائز ہے یا ناجائز۔ گویا فاضل موصوف کی پیش کردہ مثال بھی ہمارے موقف کی تائید اور ان کے پیش کردہ قرآن کی آیت کی تشریح کی تردید کر رہی ہے۔ یہی بات سود کے بارے میں ہم کہتے تھے۔ موصوف ہماری ہی تائید فرما رہے ہیں مگر ہمارا پیش کردہ اصول ماننے کے لئے تیار نہیں۔

باقی رہا: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَا تُكُمْ .﴾ (النساء:۲۳) کے بارے میں یہ قرینہ کہ دیگر مقام پر نکاح کی ترغیب اور زنا سے بچنے کا قرینہ موجود ہے۔ اگرچہ ان کا یہ کہنا غلط ہے کہ حرمت کے ذکر کے آخر میں نکاح مذکور ہے بلکہ وہ دوسرے حکم حلال عورتوں کے سیاق میں ہیں تاہم ایسے قرائن ہی بتاتے ہیں کہ حرمت ذوات اشیا پر وارد نہ ہونے کا اصول درست ہے۔

قرآن مجید میں مردار وغیرہ کی حرمت کے بارے میں جو حکم آیا ہے بعض آیات میں وہاں بھی کھانے کا ذکر اسی سیاق میں صراحتاً موجود ہے۔سورۃ الانعام،آیت:۱۴۶ ملاحظہ ہو۔

﴿قُلْ لَّا أَجِدُ فِيمَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا.﴾

''پس اپنی طرف وحی میں کسی کھانے والے کے کھانے میں مردار اور بہنے والے خون وغیرہ کے علاوہ کسی چیز کی حرمت نہیں پاتا۔''

آپ نے دیکھا کہ مردار کے ساتھ بھی کھانے کا قرینہ اس آیت میں موجود ہے۔لہٰذا آپ کا مغالطہ ہے کہ ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ.﴾ (النساء:۲۳)میں حرمت ماں کی ذات سے متعلق نہیں لیکن ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ.﴾ میں حرمت مردار کی ذات سے متعلق ہے۔

حالانکہ دونوں مثالیں بتاتی ہیں کہ حرمت ذات سے متعلق نہیں ہوتی بلکہ تصرف واستعمال سے متعلق ہوتی ہے۔موصوف کی حرمت مطلقہ کی بات ماننے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ مردار کو ہاتھ بھی نہ لگائے خواہ اسے پھینکنا چاہتا ہو یا چمڑا اتارنا مقصود ہو۔یہی وہ انتہاء ہے جو شریعت کی بصیرت کے بغیر افراط کی صورت میں سامنے آتی ہے۔طوالت سے بچنے کے لئے ہم قرآن کی مذکورہ بالا آیت کے علاوہ صحیح بخاری کی چند ایک احادیث پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

« أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِشَاةٍ مَيِّتَةٍ ، فَقَالَ:« هَلَّا اسْتَمْتَعْتُمْ بِإِهَابِهَا؟ ». قَالُوا: إِنَّهَا مَيِّتَةٌ ، قَالَ:« إِنَّمَا حَرُمَ أَكْلُهَا » ❶ ......❷

''رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک مری ہوئی بکری کے پاس سے ہوا،تو آپ ﷺ نے فرمایا:''تم نے اس کے چمڑے سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا''؟صحابہ رضی اللہ عنہم نے جواب دیا:بے شک وہ مردار ہے۔ آپ نے فرمایا:''اس کا صرف کھانا ہی حرام ہے۔''

---

❶ (٤٦٠) صحيح البخارى ، كتاب البيوع، باب جلود الميتة قبل ان تذبح (٢٢٢١)، (٥٥٣١)، (١٤٩٢)

❷ انما کلمہ حصر ہے جس نے مردار،خون وغیرہ کھانے کے علاوہ دوسری حرمت کی صورتیں ختم کر دی ہیں۔چنانچہ ہم موصوف کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ ایک عرصہ ان کا پولٹری فارم مرغیوں کی جس خوراک پر چلتا رہا اس خوراک میں خون اور مردار بھی شامل ہوتا تھا۔واضح رہے کہ حرمت بھی انسان کے کھانے سے متعلق ہے مرغیوں وغیرہ کو کھلانا حرام نہیں۔(حافظ ثناء اللہ مدنی)

دیکھ لیجئے صحیح بخاری کی حدیث نے قرآن کی آیات کی تشریح کر کے آپ کی غلطی کو بالکل واضح کر دیا ہے کہ حرمت صرف کھانے کی ہے۔ دوسرے استعمالات کی نہیں۔ کیا نعوذ باللہ آپ رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل کو بھی یہودیوں کا طرز عمل قرار دیں گے؟ اس کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت تو نہ تھی لیکن ہمیں خطرہ ہے کہ موصوف جذبات میں غور کی بجائے اپنی پیش کردہ یہود کی مذمت والی حدیث سے معارضہ سامنے لائیں گے لہٰذا ہم توجہ دلاتے ہیں کہ اس کے بارے میں یہود کی مذمت کی وجہ خود حدیث کے الفاظ: «وَ أَكَلُوا ثَمَنَهُ .» میں موجود ہے کہ یہود نے چربی حرام ہونے کے بعد اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کھانے کا طریقہ ❶ اپنا لیا۔ یہ دراصل حیلے کا مسئلہ ہے جب کوئی شخص محض الفاظ کی بجائے اصل مقصد کے پیش نظر اس مفہوم کی طرف توجہ دلائے جو عبارت کے نص ہونے کی صورت ہو تو اس کے خلاف ندموم حیلہ کی دلیل نہیں پیش کرنی چاہیے۔ کیوں کہ ہمارے فتویٰ سے حیلہ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ نیز حیلہ کی دو قسمیں ہیں:

ایک وہ حیلہ جو مقصد کلام کے موافق ہو، اور دوسرا وہ حیلہ جس سے مقصود مجروح ہو۔ قرآن مجید میں صحیح احادیث میں خود اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے پہلی قسم کے حیلوں کا نہ صرف جواز ملتا ہے بلکہ ترغیب بھی موجود ہے جیسے سورۃ ص کی آیت ۴۴ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو اپنی خدمت گار بیوی کے بارے میں نذر پوری کرنے کے لئے سزا میں حیلہ کرنے کی ترغیب دی ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِهِ وَلَا تَحْنَثْ﴾.

یعنی ایوب علیہ السلام نے اپنی بیوی کو چھڑیاں مارنے کی جو قسم کھائی تھی اس کے متعلق اللہ نے انہیں تنکوں سے جھاڑو بنا کر حیلہ کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ اسی طرح حضرت نبی اکرم ﷺ کا خاص طور پر سود کے متعلق ایک قسم کا حیلہ بلال رضی اللہ عنہ وغیرہ کو بتانا صحیح بخاری وغیرہ میں ثابت ہے کہ جب بلال رضی اللہ عنہ نے دو صاع ردی کھجور کو ایک صاع عمدہ کھجور کے بدلے میں خرید و فروخت کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے اس پر بڑے دکھ سے فرمایا:

« أَوِّهْ! عَيْنُ الرِّبَا ،عَيْنُ الرِّبَا، لَا تَفْعَلْ، وَلٰكِنْ إِذَا أَرَدْتَ أَنْ تَشْتَرِيَ فَبِعِ التَّمْرَ بِبَيْعٍ آخَرَ ثُمَّ اشْتَرِ بِهِ .» ❷

''یہ بالکل سود ہے۔ یہ بالکل سود ہے۔ ایسا ہرگز نہ کر! لیکن اگر ضرور عمدہ کھجور خریدنا چاہتا ہے تو

❶ یہ حرام چیز صرف ظاہری شکل بدل کر کھانا ہی ہے لہٰذا اس کی حرمت واضح ہے۔ یہ ناجائز حیلہ کی صورت ہے۔

❷ (٤٦١) صحیح البخاری ، كتاب الوكالة ، باب اذا باع الوكيل شيئاً فاسداً فبيعهٗ مردود (٢٣١٢)

ایک دوسرے سودے سے دو صاع نکمی کھجور بیچ کر جو نقدی حاصل ہو اس سے تو ایک صاع عمدہ کھجور خرید لے۔''

ہم موصوف کو ظاہریہ کی کتب کے ساتھ مقاصد شریعت کے مطالعہ کے لئے راسخ العقیدہ متبع سنت علماء شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے شاگردان رشید کی کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیتے ہیں۔

موصوف نے ''جی پی فنڈ'' کے مسئلہ میں ایک بات یہ بھی درج کی ہے کہ ''جی پی فنڈ'' پر سود جبری نہیں ہوتا اس کے بارے میں خواہ مخواہ مفتی کو علم کے بغیر فتویٰ کا سزاوار بھی ٹھہرایا ہے حالانکہ اس حدیث کا تعلق شریعت سے ناواقفی کے باوجود فتویٰ دینے سے ہے، اصل واقعات کے علم سے نہیں کہ وہ معلومات میں اصل معمولات ہوتے ہیں حکومت کے معمولات یہی ہیں کہ کوئی شخص خواہ کسی خانہ میں یہ لکھ بھی دے کہ وہ ''جی پی فنڈ'' پر سود نہیں لے گا پھر بھی سود کی رقم شامل کرتے رہتے ہیں۔ ❶ جیسا کہ ''سیونگ اکاؤنٹ'' کے معاملہ میں بینکوں کا معمول رہا ہے۔ یعنی کوئی شخص ''سیونگ اکاؤنٹ'' کھولتے وقت سود والے خانہ میں اگر یہ لکھ دے کر سود نہیں لے گا پھر بھی اس کے کھاتے میں سود جمع کیا جاتا ہے۔ ہمارے سامنے کئی لوگوں نے ایسی صورتیں پیش کیں اور یہ بھی بتلایا کہ اس خانہ میں سود نہ لینے کے ذکر کے باوجود ان کے کھاتہ میں سود جمع کیا جاتا رہا۔ لیکن انہوں نے سود نہیں لیا جو آج بھی ان کے نام کھاتے میں موجود ہے۔ ❷

موصوف کی اپنی حاصل کردہ معلومات سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ایسا سود ''جی پی فنڈ'' لینے والے کے کھاتے میں ہی موجود رہے گا۔

ہم اس بات کو طول دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ فتویٰ سوال کی پیش کردہ صورت پر مبنی ہوتا ہے۔ ہمارے سائلین نے ہمیں جو سوال کیا ہے اس میں ''جی پی فنڈ'' کی جبری صورت ہی دکھائی ہے۔ ہمارا جواب اسی سے متعلق ہے۔

---

❶ اس کا اظہار موصوف کی پیش کردہ تشریحات میں بھی موجود ہے کہ کارندے فارم خود ہی پر کر کے اس میں سود کی رضا مندی درج کر دیتے ہیں۔

❷ موصوف نے بھی یہی بات درج کی ہے کہ ''جی پی فنڈ'' میں سود نہ لینے کی صورت میں وہ سود اس ملازم کے کھاتہ میں جمع رہے گا۔ وہ خود اسے نکال سکتا ہے کوئی دوسرا نہیں لے سکتا۔ گویا وہ اسی شخص کے نام رہا اس کا کوئی وارث یا امیر کوئی چٹی پڑنے پر وہ خود بخود اس کے لئے استعمال ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر خود نہیں لیا تو وہی صورت حال اس کو ویسے بھی پیش آ سکتی ہے۔

ورنہ اس کا تعلق سود کی ایسی دوسری جبری صورتوں سے ہوگا جو ہمارے معاشرے میں ملتی ہیں۔ موصوف چھوٹی چھوٹی باتوں پر جو لوگوں کو سرکاری ملازمتیں چھوڑ کر "أَصْحَابُ الْهِجْرَةِ وَالتَّكْفِير" کا رویہ اپنانے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ بغاوت لوگوں کو مشقت میں ڈالنے والی ہے۔ آپ خود ایک عرصہ قبل ہجرت کے ارادہ کے باوجود ہجرت نہیں کر سکے۔ عام مسلمان اپنی زندگیاں آپ کے فتویٰ کی رو سے مشکلات میں ڈال دیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

« وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ .» [1] (بخاری)

"کوئی شخص دین میں سختی نہیں کرتا مگر دین سے وہ مغلوب ہو کر رہ جاتا ہے۔"

یعنی دین پر عمل مشکل ہو جاتا ہے۔

"الاعتصام" کی حالیہ اشاعت میں دو دوسرے حضرات کے تعاقب بھی شائع کئے گئے ہیں۔ ہم نے انہیں بغور پڑھا۔ لیکن نہ کوئی نئی بات ملی اور نہ کوئی علمی نکتہ۔ "الاعتصام" کو کم از کم اپنے صفحات کی قدر و قیمت کا احساس ہونا چاہیے۔ [2]

---

[1] (٤٦٢) صحيح البخاری، کتاب الإيمان، باب الدين يسر (٣٩). الصحيحة (١١٦١) فتح (٩٣/١).

[2] "الاعتصام" کو اپنے صفحات کی قدر و قیمت کا پورا احساس ہے۔ اس نے مسئلے کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے فریقین کے مضامین اور مراسلات، باوجود صفحات کی کمی کے شائع کئے ہیں۔ مقصد صرف یہی تھا کہ اہل علم و تحقیق مسئلے پر غور کر رہے ہیں تو اس کے سارے پہلو ان کے سامنے آ جائیں تاکہ کسی ایک واضح نتیجے تک پہنچنے میں آسانی ہو۔
جہاں تک مسئلہ زیر بحث کا تعلق ہے، اس کی بابت بنیادی طور پر فریقین کی رائے میں کچھ زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ دونوں ہی "پراویڈنٹ فنڈ" کی اضافی رقم کے سود ہونے پر اور سود کی حرمت و شناعت پر متفق ہیں۔ اختلاف صرف اتنا ہے کہ مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب ﷾ نے معاشرے میں پائے جانے والے ایک مظلوم طبقے کو اس کا مصرف قرار دے کر اس کے وصول کرنے کو اصول "أَهْوَنُ الْبَلِيَّتَيْن" کے تحت جائز قرار دیا ہے جب کہ مولانا حافظ عبدالسلام بھٹوی صاحب کے نزدیک اسے کسی صورت میں بھی وصول کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔
راقم کے خیال میں دونوں حضرات کے نقطہ ہائے نظر کے لئے جواز کے پہلو موجود ہیں، مولانا بھٹوی صاحب کے فتوے کا مبنیٰ احتیاط و تقویٰ ہے اور اس بناء پر مولانا مدنی صاحب بھی اس کے عدم جواز کو ترجیح دیتے ہیں، تاہم ان کا فتویٰ معاشرے میں پائے جانے والی ایک ضرورت کا عملی حل بھی پیش کرتا ہے۔ جسے اختیار کر لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔
وَالْعِلْمُ عِنْدَاللهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔
بہر حال فی الحال اب یہ بحث بند کی جاتی ہے۔ البتہ کوئی اور صاحب علم فریقین کے دلائل کا محاکمہ و جائزہ پیش کر کے کسی ایک نقطہ نظر کی ارجحیت ثابت کرنا چاہیں تو اس علمی و تحقیقی بحث کے لئے "الاعتصام" کے صفحات حاضر ہیں۔ (صلاح الدین یوسف)

سوال: عرض ہے کہ عموماً لوگ سرکاری ملازمین کے ''جی پی فنڈ'' سے سود کی رقم کے مصرف کا پوچھتے رہتے ہیں اور مناسب جواب سے مستفید ہوتے ہیں۔ سرکاری جی پی فنڈ کے سلسلے میں ممکن ہے کہ قوانین پوری طرح یاد نہ ہوں۔ تو عرض ہے کہ ہماری حکومت ملازمین کی تنخواہ میں سے چند فی صد کے حساب سے جی پی فنڈ جبراً کاٹتی ہے۔ اور اس پر سود بھی دیتی ہے۔ مگر سود جبراً نہیں۔ جو ملازم سود نہ لینا چاہے۔ درخواست دے کر بغیر سود کے اپنا حساب رکھوا سکتا ہے۔ اور اگر پہلے سود کچھ عرصہ لگتا رہا ہو تو وہ جب چاہے پچھلا سارے کا سارا سود اپنے جمع شدہ جی پی فنڈ سے منہا کروا سکتا ہے۔ اور آئندہ بغیر سود کے جمع ہوتا رہتا ہے۔ اسی اپنے جی پی فنڈ کی رقم میں سے ملازم بطور قرض بھی رقم لے سکتا ہے اور وہ رقم ماہانہ اقساط میں اس کی تنخواہ سے کٹ کر ملازم کے ہی اکاؤنٹ میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ اور جس کا فنڈ سود کے ساتھ جمع ہو رہا ہو تو متذکرہ قرض پر بھی سود لگا کر اسی کے کھاتے میں جمع ہو جاتا ہے اور جس کا فنڈ بغیر سود کے جمع ہو رہا ہو اس کے قرض پر سود نہیں لگایا جاتا۔ ملازمت کے آخری لمحات میں جب کہ جی پی فنڈ کی رقم فائنل وصول کرنی ہو تو بھی وہ درخواست دے کر سود کی رقم منہا کروا سکتا ہے۔ وہ کاغذات میں ہی حکومت کے کھاتے میں چلی جائے گی۔ کوئی اہل کار اس سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

اب قرآن میں تو صاف طور پر سود کی رقم چھوڑ دینے کا حکم ہے۔ ظاہر ہے کہ سود کی رقم اسی کے پاس جائے گی یا رہے گی جس سے رقم لی۔ چونکہ سودی رقم کا وصول کرنا حرام ہے۔ اس لئے اسے وصول کر کے خواہ مخواہ ذمہ داری (خرچ کرنے کی) کیوں لی جائے۔ حرمت تو وصولی کی ہے کہ جس ادارے سے جی پی فنڈ کی رقم وصول کر رہا ہے اگر اسی کو رقم چھوڑ سکتا یا واپس کر سکتا ہے تو پھر دانستہ وصول کر کے قصور وار تصور ہو گا۔ ہاں البتہ نادانستہ یا کم علمی کی وجہ سے سودی رقم وصول ہو چکی ہو تو پھر اس کا حل وہی ہونا چاہیے جیسا کہ آپ نے مشورہ دیا۔ معذرت خواہ ہوں صرف ''جی پی فنڈ'' کی قانونی حیثیت کی یاد دہانی کے لئے سمع خراشی کی جرات کی۔

جواب: محترم ڈاکٹر صاحب! عرض ہے کہ میری معلومات کے مطابق جس رقم پر حکومتی کھاتے میں سود لگ جائے اس کا اندراج باقاعدہ کھاتے میں ہوتا رہتا ہے، کوئی وصول کرے یا نہ کرے۔ بعض دفعہ ذمہ دار حضرات یہی ظاہر کرتے ہیں کہ ہم نے سود نہیں لگایا۔ حالانکہ سود ساتھ لگا ہوتا ہے۔ جس کا مالک بننے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں۔ نتیجتاً پھر یہ سود لوٹ کر حکومت کے خزانے میں جمع ہو جاتا ہے۔ جس کا جواز حکومت کے لئے بھی کسی

صورت نہیں۔ بایں صورت حکومت دہرے جرم کا ارتکاب کرتی ہے۔ ایک، اصل رقم پر سود لگانا۔ اور پھر وہ کسی حیلے بہانے سے قوم کے پیٹ میں ڈالنا، یہ شدید ترین جرم ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حرام رقم کے ذریعے حکومت حرام در حرام کمائے بلکہ ایسے ہی ہے، تو پھر کیا اس سے بہتر یہ نہیں کہ حرام کی رقم وصول کر کے اسے دے دی جائے جس نے سود کا پیسہ دینا ہو۔ اس پر ظلم کی چٹی ہے تاکہ حرام سے جان چھڑا سکے۔ لیکن عملاً رضا و رغبت کے ساتھ سودی پیسے کے حصول کی سعی کرنا واقعتاً جرم ہے۔ بلاشبہ اس سے احتراز ضروری ہے۔

جبکہ جی پی کٹوتی اس کے دائرہ اختیار سے خارج ہے۔ اس وقت صرف اس کے مصرف کی نشاندھی کرنا مقصود ہے۔

سوال: بعض نجی ادارے اور حکومت اپنے ملازمین کو ریٹائر ہونے پر ''گریجوٹی'' اور ''پنشن'' دیتے ہیں۔ اس کے شرعی یا غیر شرعی ہونے پر روشنی ڈالیں؟

جواب: جبری کٹوتی پر اضافہ تو ناجائز ہے البتہ ''پنشن'' لینی جائز ہے کیونکہ وہ خدمات کے اعتراف کے طور پر انعام دی جاتی ہے۔

سوال: بینک میں رکھی گئی رقم پر وصول شدہ سودی رقم کا مصرف کیا ہے؟

جواب: سودی رقم مباح امور میں استعمال نہیں کرنی چاہیے۔ ہاں البتہ کسی پر ظلم کی چٹی ہو یا کسی نے سودی رقم دینی ہے تو اسے دے دی جائے تاکہ حرام مال حرام راستے جائے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ خلیج عرب میں امریکہ اور اس کے حواری ممالک کی افواج چھ سال قبل عراق کویت جنگ کے حوالے سے آئی تھیں اور ان کی آمد کا مقصد صرف سعودی عرب اور دیگر خلیجی ممالک کا تحفظ اور دفاع بتایا گیا تھا۔ عراق کویت جنگ کو ختم ہوئے چھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر یہ افواج نہ صرف ابھی موجود ہیں بلکہ امریکی راہ نماؤں کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ یہ فوجیں امریکی مفادات کے تحفظ کے لیے خلیج میں موجود ہیں اور وہ واپس نہیں جائیں گی۔

اسرائیل نے امریکی پشت پناہی کے ساتھ بیت المقدس اور فلسطین پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے اور اب اس کی طرف سے مستقبل کے ''عظیم تر اسرائیل'' کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے اس میں دیگر ممالک کے ساتھ ''مدینہ منورہ'' کو بھی اسرائیل کا حصہ دکھایا گیا ہے اور اسرائیل ''حرم مدینہ'' پر قبضے کا خواب دیکھ رہا ہے اس پس منظر میں خلیج میں امریکہ کی افواج کی مسلسل موجودگی اسرائیل کے لیے تقویت کا باعث ہے۔ جناب رسالت مآب ﷺ

کا مشہور ارشاد گرامی ہے: ''جزیرہ عرب سے یہود و نصاریٰ کو نکال دو'' ❶ اور خلیج میں امریکی افواج کی موجودگی میں اس ارشاد مقدس کی صریح خلاف ورزی ہے۔

جواب: موجودہ حالات میں مسلمانان عالم کا فرض ہے کہ باہمی اتفاق و اتحاد سے ہر ممکن طریقے سے یہود و نصاریٰ پر مشتمل امریکی افواج کو جزیرہ عرب سے نکالنے کی سعی کریں سستی اور کاہلی کی صورت میں تمام ذمہ داران رب العالمین کی عدالت عالیہ میں جواب دہ ہوں گے۔

اللہ رب العزت ہمیں فہم و بصیرت سے بہرہ ور فرمائے تاکہ اپنی آخرت کا تحفظ کرسکیں۔

سوال: مرغی خانوں میں جو مرغیاں رکھی جاتی ہیں۔ خصوصًا برائلر وغیرہ ان کی خوراک میں تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ دم مسفوح وافر مقدار میں ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اپریشن کا خون بھی ملایا جاتا ہے اور "میتة" کا گوشت بھی جبکہ احادیث مبارکہ میں ''جلالہ'' (گندگی کھانے والا جانور) کے کھانے کی ممانعت ہے اور دم مسفوح اور "میتة" کے متعلق حرمت کی نص وارد ہے تو جس جانور کی نشوونما ہی حرام سے ہو اس کے متعلق کتاب وسنت میں کھانے وغیرہ کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب: مرغیوں کی خوراک کو حرام ملاوٹ سے تیار کرنا درست فعل نہیں، جس طرح بذات خود انسان کے لائق نہیں کہ اپنے استعمال کی خوراک میں حرام کی آمیزش کرے اس طرح جانوروں کو بھی حرام کھانے کے ارتکاب سے بچانا چاہیے۔ اگرچہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے مکلف نہیں۔ بالخصوص وہ جانور جو کل اس کی اپنی ہی خوراک بننے والے ہیں رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

« نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْجَلَّالَةِ أَنْ يُؤْكَلَ لَحْمُهَا أَوْ يُشْرَبَ لَبَنُهَا .» ❷

(رَوَاهُ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ بِسَنَدٍ حَسَنٍ)

یعنی ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نجاست کھانے والے جانور سے منع فرمایا کہ اس کا گوشت کھایا جائے یا دودھ پیا جائے۔''

اور سنن ابوداؤد اور نسائی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

---

❶ (٤٦٣) صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب اخراج اليهود والنصارىٰ من جزيرة العرب(٤٥٩٤)، الترمذى(١٦٠٦،١٦٠٧) عن عمر بن الخطاب رضى الله عنه.

❷ (٤٦٤) صححه الألبانى. ابن أبى شيبة، كتاب الأطعمة، باب فى لحوم الجلالة. صحيح أبى داؤد، كتاب الأطعمة، باب النهى عن أكل الجلالة وألبانها(٣٧٨٥). ابن ماجه(٣١٨٩) عن ابن عمر. الإرواء(٢٥٠٣، ٤: ٢٥).

« نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ خَيْبَرَ عَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ وَ عَنِ الْجَلَّالَةِ عَنْ رُكُوْبِهَا وَ أَكْلِهَا . » [1] (وَسَنَدُهٗ حَسَنٌ)

یعنی ''رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے روز گھریلو گدھے کے گوشت اور گندگی کھانے والے جانور پر سواری اور اس کے گوشت کے کھانے سے منع فرمایا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لفظ ''الجلالۃ'' کی تعریف میں رقمطراز ہیں:

''وَالْجَلَّالَةُ عِبَارَةٌ عَنْ دَابَّةٍ الَّتِيْ تَأْكُلُ الْجِلَّةَ بِكَسْرِ الْجِيْمِ وَالتَّشْدِيْدِ وَهِيَ الْبَعْرُ .''

یعنی ''جلالہ کا اطلاق گندگی کھانے والے جانور پر ہے۔''

اور ابن حزم نے دعویٰ کیا ہے کہ لفظ ''اَلْجَلَّالَةُ'' چوپائیوں کے ساتھ مخصوص ہے لیکن معروف بات یہ ہے کہ اس کا اطلاق عام ہے۔ ابن ابی شیبہ میں بسند صحیح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ وہ گندگی کھانے والی مرغی کو تین راتیں باندھ لیتے تھے۔ دوسری طرف امام مالک اور امام لیث رحمہما اللہ سے منقول ہے کہ گندگی کھانے والی مرغی وغیرہ کے کھانے کا کوئی حرج نہیں۔ ممانعت تو صرف نفرت دلانے کے طور پر وارد ہے۔ اور شوافع نے علی الاطلاق بیان کیا ہے کہ کراہت تو اس گندگی کھانے والے جانور کی ہے جس کے گوشت کا ذائقہ گندگی کھانے کی وجہ سے تبدیل ہو چکا ہو۔ اور ایک وجہ یہ ہے کہ جب کثرت سے گندگی استعمال کرے ان میں سے اکثر نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ کراہت تنزیہی ہے۔ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کا قصہ جو صحیح بخاری میں ''لَحْمُ الدُّجَاجِ'' کے تحت وارد ہے اس کا مقتضیٰ یہی ہے۔ [2] انتہی بتصرف۔

حاصل اس کا یہ ہے زہدم جرمی کا کہنا ہے کہ ہم ابوموسیٰ کی مجلس میں تھے ان کے پاس کھانا لایا گیا۔ اس میں مرغی کا گوشت تھا تو ایک شخص نے کھانے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا: میں نے اسے گندگی کھاتے دیکھا تھا، مجھے نفرت ہے تو جواباً موسیٰ نے کہا: میں نے تو رسول اللہ ﷺ کو مرغی کا گوشت کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ مقصد ان کا یہ ہے کہ مرغی ''جلالہ'' میں شامل نہیں۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک کو گندگی کھاتے ہوئے دیکھنے سے لازم نہیں کہ سب مرغیاں اسی طرح کی ہوں۔ ظاہر ہے پہلا معنی زیادہ واضح معلوم ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ہمارے

---

[1] (٤٦٥) حسنه الترمذي والألباني. صحيح سنن النسائي، كتاب الضحايا، باب عن أكل لحوم الجلالة (٤١٤٢). الترمذي (١٨٢٤) ط. دار السلام. أبو داؤد (٣٧٨٧). الإرواء (٨/١٥٠، ١٥١).

[2] (٤٦٦) صحيح البخاري، كتاب الذبائح، باب لحم الدجاج (٥٥١٧، ٥٥١٨).

شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ نے ''فتاویٰ اہل حدیث'' میں مرغی کو ''جلالہ'' میں شامل ہی نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اللہ رب العزت نے اس کا معدہ اتنا مضبوط بنایا ہے کہ اس میں گندگی کا اثر باقی رہتا ہی نہیں، شیشہ تک کو ہضم کر جاتی ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ فِيهِ جَوَازُ أَكْلِ الدَّجَاجِ الْإِنْسِيَّةِ وَ وَحْشِيَةٍ وَ هُوَ بِالْاِتِّفَاقِ إِلَّا عَنْ بَعْضِ الْمُتَعَمِّقِيْنَ عَلٰى سَبِيْلِ الْوَرَعِ إِلَّا أَنَّ بَعْضَهُمْ اِسْتَثْنَى الْجَلَّالَةَ وَهِيَ مَا تَأْكُلُ الْأَقْذَارَ وَ ظَاهِرُ صَنِيْعِ أَبِي مُوْسٰى أَنَّهُ لَمْ يُبَالِ بِذٰلِكَ." (فتح الباری ٦٤٨/٩)

چند سطور بعد فرماتے ہیں:

" وَالْمُعْتَبَرُ فِيْ جَوَازِ أَكْلِ الْجَلَّالَةِ زَوَالُ رَائِحَةِ النَّجَاسَةِ بَعْدَ أَنْ تَعْلَفَ بِالشَّيْئِ الطَّاهِرِ عَلَى الصَّحِيْحِ ."

یعنی ''گندگی کھانے والے جانور کے بارے میں قابل اعتبار بات یہ ہے کہ چارہ سے نجاست کا اثر زائل ہونے کی صورت میں اس کا گوشت کھایا جا سکتا ہے۔''

حال یہ ہے کہ بظاہر حضرت ابوموسیٰ اشعری کے قول کی بناء پر مرغی کے گوشت کا کھانا علی الاطلاق جائز ہے۔

تاہم اس کے منہ میں خوراک کی صورت میں حرام ڈالنا بہر صورت قابل مذمت فعل ہے جس سے اجتناب ضروری ہے۔ ہاں البتہ اگر کسی جانور کے بارے میں یہ بات ثابت ہو جائے کہ نجاست اس میں مؤثر ہو چکی ہے تو بایں صورت جب تک چارہ کھلا کر اس شبہ کو زائل نہ کیا جائے، اس وقت تک اس کا گوشت، دودھ اور اس پر سواری کرنا ناجائز ہے۔ بعض اہل علم نے بیان کیا ہے کہ اگر کسی بکری کو کتیا کا دودھ پلا دیا جائے تو اس صورت میں جب تک چارہ سے دودھ کا اثر زائل نہیں ہو جاتا۔ یہ ''جلالہ'' کے حکم میں رہے گی۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ نجاست کا اثر کتنے روز میں زائل ہوتا ہے؟ اس بارے میں جانوروں کے اعتبار سے اہل علم کے مختلف اقوال ہیں مثلاً پرندے اور مرغی کو تین دن محبوس رکھا جائے اور گائے کو چالیس روز وغیرہ۔ (المغنی ٧٢/١١)

المختصر طاہر چارہ سے جب نجاست کے ازالہ کا ظن غالب حاصل ہو تو جانور کو ذبح کیا جا سکتا ہے۔ (هٰذا مَا عِنْدِيْ وَاللّٰهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ)

سوال: عورت شرعاً گاڑی چلا سکتی ہے یا نہیں؟

جواب: ''اللہ تعالیٰ کائنات کے علیم بذات الصدور'' نے اولاد آدم میں سے مرد اور عورت کا دائرہ کار عملی زندگی میں علیحدہ علیحدہ متعین کر رکھا ہے۔ مرد کو جفاکش بنایا تاکہ بیرونی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکے اور صنف نازک کو اس کی اپنی حیثیت سے ذمے داریاں سونپی ہیں۔ یہ ایک ایسا شعور ہے جس کا احساس غیر جنس بنی آدم میں بھی ودیعت کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کوئی آدمی بیل کی پیٹھ پر سوار ہو کر جا رہا تھا۔ بیل نے بزبان قال کہا:

«إِنَّا لَمْ نُخْلَقْ لِهٰذَا، إِنَّمَا خُلِقْنَا لِحِرَاثَةِ الْأَرْضِ» [1] (بحواله بخاری و مسلم)

یعنی ''ہماری تخلیق کا مقصد سواری کرنا نہیں ہمیں تو صرف کھیتی باڑی کے لئے بنایا گیا ہے۔''

بنی نوع انسان کو اعلیٰ جنس اور اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے بطریق اولیٰ یہ احساس و ادراک ہونا چاہیے۔ اسلام میں مرد و زن کی ذمہ داریوں میں اس حد تک احتیاط کا پہلو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ راہ چلتے اختلاط کو بھی ناپسند فرمایا۔

صحابیات دنیا کی سب سے پاکدامن عورتوں کو بصورت خطاب حکم دیا گیا ہے کہ عام گزرگاہوں سے علیحدہ ہو کر چلیں۔ انہوں نے اس کا عملی نمونہ یوں پیش کیا کہ وہ در و دیوار کے ساتھ چمٹ چمٹ کر چلتی تھیں۔ نیز بعض روایات میں عورتوں کو جنازہ اٹھا کر چلنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ نے ''شرح المہذب'' میں اس کی توجیہ یوں کی ہے:

''یہ حالت مردوں کے ساتھ اختلاط کو مستلزم ہے جو فتنے کا سبب بن سکتی تھی۔ اس لئے منع کر دیا گیا۔'' (فتح الباری:۳/۱۸۲)

پھر حضرت عائشہ کا بیان ہے: رسول اللہ ﷺ اگر آج حیات ہوتے تو عورتوں کو فتنے کے ڈر سے مساجد میں جانے سے منع کر دیتے جس طرح کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو روکا گیا تھا (آپ ﷺ نے چونکہ اپنی زندگی میں روکا نہیں اس لئے عورتوں کا مسجدوں میں جانا جائز ہے۔)

اسی اثر کو بنیاد بنا کر حنفیہ عورتوں کو مسجدوں میں جانے سے روکتے ہیں۔

مفتی محمد حسین نعیمی صاحب! ذرا تأمل فرمایئے! جس مذہب میں عورت کو عبادت خانہ جانے تک کو زیادہ پسند نہ کیا گیا ہو وہاں صنف نازک کو گاڑی یا کار چلانے کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے؟

---

[1] (٤٦٧) صحيح البخاري، كتاب أحاديث الأنبياء، باب أخرى (٣٤٧١) عن أبي هريرة و (٢٣٢٤). صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل أبي بكر رضي الله عنه (٦١٨٣).

بہر حال حالات و واقعات شاہد ہیں کہ عورت کو گاڑی ، کار وغیرہ چلانے کی اجازت کی شکل میں تمام تحفظات کو خیر باد کہنا پڑے گا۔ جس سے عورت کی کرامت و مقام اور عزت و وقار مجروح ہو گا جبکہ اسلامی تعلیمات کا اہم جز ہے کہ عورت کو عورت بنا کر رکھو۔ گاڑی ایک متحرک مشینری ہے جب تک انسانی فعل کو اس میں دخل نہ ہو، وہ کسی کام کی نہیں، بے کار ہے۔ اس کو دھچکا لگانے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ انجن خراب ہو سکتا ہے۔ ٹائر پنکچر ہو سکتا ہے۔ معمولی سے نقص کو دور کرنے کے لئے بذات خود گاڑی کے نیچے لیٹنے کی نوبت بھی پیش آ سکتی ہے۔ گاڑی کو آگے پیچھے کرنے کے لئے ﴿ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ ﴾ کی مخاطبہ کو غیر مردوں سے واسطہ بھی پڑ سکتا ہے۔ پھر نقائص کی اصلاح کے لئے کاریگروں سے تعلق امر لابدی ہے۔ ایسی ضرورت حضر کے علاوہ سفر میں بھی پیش آ سکتی ہے۔

نیز گاڑی چلانے کے لئے آزادانہ نگاہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک روایت میں حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نابینا کی موجودگی میں بعض ازواج مطہرات نے پردہ سے تساہل برتا تو نبی ﷺ نے اِنذار کے انداز میں فرمایا: کیا تم بھی نابینی ہو؟ ❶

الحاصل علی رغم انوف متاثرین اور مقلدین مغرب و استعمار اسلام میں عورت کو قطعًا گاڑی چلانے کی اجازت نہیں۔

مذکورہ دلائل و براہین کی روشنی میں بلا تردد کہا جا سکتا ہے کہ مفتی اعظم سعودی عرب الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز حفظہ اللہ تعالیٰ کا فتویٰ عدم جواز مبنی برحق وصواب ہے۔ جب کہ مفتی نعیمی کا فتویٰ جواز محل نظر اور غیر درست ہے۔

یاد رہے یہ دونوں فتویٰ روز نامہ ''جنگ'' لاہور کی قریبی اشاعتوں ماہ نومبر ۱۹۹۰ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ (وَاللّٰهُ وَلِيُّ التَّوْفِيْقِ.)

سوال: اسلام کے آغاز میں اَمَۃ (لونڈی) کے مسائل تھے۔ اس وقت ان کی ازدواجی حیثیت کس نوعیت کی تھی؟ موجودہ دور میں عرب وغیرہ عرب متمول جنسی تسکین کی خاطر لونڈی کے متعلق دور نبوی ﷺ کے احکام کا

---

❶ (٤٦٩) قال الألباني: في إسناده جهالة. أبوداؤد، كتاب اللباس، باب في قوله عز و جل ﴿وقل للمؤمنات يغضضن......﴾ (٤١١٢). الترمذي، كتاب الأدب، باب ما جاء في احتجاب النساء من الرجال (٢٨٧٨). أحمد (٦/٢٩٦) (٢٦٤١٦). المشكاة (٣١١٦). الإرواء (١٨٠٦). لكن معناه صحيح كما في القرآن الحكيم" وقل للمؤمنات يغضضن ......الخ"

سہارا کیسے لیتے ہیں؟

جواب: لونڈیوں کے مسائل کا تعلق مسئلہ جہاد سے ہے۔ جب تک عملی نمونۂ جہاد مسلمانوں میں موجود رہا۔ لونڈیوں کے مسائل بھی موجود تھے۔ روح جہاد ختم ہونے پر آج یہ مسائل بھی ناپید ہیں۔ جب کہ کتاب و سنت میں ان امور کی پوری پوری پابندی وضاحتیں موجود ہیں۔ آج کے دور میں چونکہ باقاعدہ اسلامی جہاد موجود نہیں ہے۔ اس لئے یہ مسائل بھی کتابوں میں مدفون ہیں۔

﴿ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا ﴾ (الطلاق:۱)

دراصل غلاموں اور لونڈیوں کا وجود کفر کے آثار میں سے ہے اس لئے اسلام نے ان کی آزادی کی ترغیب دی ہے بلکہ اس پر اخروی جزاء مترتب فرمائی ہے۔ مزید آنکہ جو اس کو آزاد کر کے نکاح کر لے اس کے لئے عظیم اجر کی نوید سنائی ہے۔

موجودہ دور میں اگر کوئی متمول آدمی لونڈیوں پر قیاس کرتے ہوئے چار سے زیادہ بیک وقت آزاد بیویاں رکھنے کی راہ نکالتا ہے تو سراسر یہ غلط اور ناجائز استدلال ہے۔ جس کا اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ پھر محض خادماؤں کا نام لونڈیاں رکھ کر شہوت رانی کرنی حرام کا ارتکاب کرنا ہے۔ کیوں کہ اسلام میں مذکور تعداد سے زیادہ بیک وقت بیویاں رکھنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ اور لونڈی سے دو شرطوں (عدم طول اور خوف العنت) سے نکاح کی اجازت دی ہے۔ (ملاحظہ ہو: سورۃ النساء)

نیز پرویزیوں کی باتوں پر کان دھرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہر دور کے ملحدین کا ہمیشہ وطیرہ رہا ہے کہ حیلے بہانے سے اسلامی تعلیمات میں کیڑے نکالنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ جو ان کے لئے خسارے کی تجارت ہے۔

﴿ فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِيْنَ ﴾ (البقرۃ:۱۲)

سوال: گذارش ہے کہ مروجہ ہڑتال، احتجاجاً کاروبار اور تجارتی مراکز بند رکھنا، جلوس نکالنا، سڑکوں پر پتلے اور ٹائر جلانے کی کتاب و سنت کی روشنی میں کیا حیثیت ہے؟

❁ بعض علماء اس مذکورہ احتجاج کو صحیح اور جائز کہتے ہیں دلیل کے طور پر بیعت رضوان کو اللہ کے رسول ﷺ کا احتجاج قرار دیتے ہیں۔

جواب: مروجہ نظام حکومت چونکہ استعماری قوتوں کی پیداوار ہے۔ اس کے کارہائے نمایاں میں سے یہ ہے کہ

مطالبات تسلیم کرانے کے لئے درج بالا چیزیں ضروری اجزاء کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے بغیر ان کے زعم کے مطابق نعرۂ جمہوریت نامکمل اور نا تمام ہے۔ اس کے برعکس اسلام ایسی لاقانونیت کا قطعاً حامی نہیں۔ اس کی سنہری تعلیمات میں سے ہے:

﴿ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ . ﴾ (البقرة: ٢٧٩)

''یعنی تم کسی کو نقصان نہ دو۔ اور نہ دوسرا کوئی تم کو نقصان پہنچائے۔''

مقصد یہ ہے کہ پیمانۂ عدل و انصاف تھامے رکھو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی" ﴾(المائدة:٨)

''انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے۔''

ظاہر ہے جہاں عدل کا ترازو قائم ہوگا وہاں ایسے احتجاجات اور واویلے کی نوبت نہیں آئے گی بلکہ حکمران یتیموں، بیواؤں اور بے بس مظلوموں کے پہلو میں کھڑے اور ان کے دروازوں پر دستک دیتے ہوئے نظر آئیں گے۔ یقین نہ آئے تو عمرین (عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ) کے مثالی نظام حکومت کا مطالعہ کیجئے۔ یہ جھلک آپ کو بڑی واضح نظر آئے گی۔ قصہ ''بیعۃ الرضوان'' سے مروجہ طریق احتجاج پر استدلال کرنا جہالت اور لاعلمی پر مبنی ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیعت کے انعقاد سے کافروں سے احتجاج کیا تھا؟ جو عقلاً نقلاً غیر معقول اور آپ کی شان سے بہت فروتر ہے۔ یہ بیعت تو اس عہد وفاداری کی تجدید تھی جو بندوں نے اپنے اللہ سے کر رکھا تھا۔ اس کا مخلوق کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مقام غور و فکر ہے کہ اس سے مروجہ طریق احتجاج کا جواز کیسے نکل آیا؟

اصل بات یہ ہے کہ اس قسم کے امور کا ارتکاب دراصل خواہشات کے پجاریوں کی سنن کا احیاء ہے اور یہ وہاں ہوگا جہاں عدل و انصاف کی بجائے ظلم و ستم کا دور دورہ ہوگا۔ اللہ رب العزت ہم سب کو صراط مستقیم پر گامزن رہنے کی توفیق بخشے۔ آمین!

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حرام جانوروں کے اعضائے بدن انسانی جسم کو لگائے جا سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: حرام جانوروں کے اعضاء کی انسانی بدن میں پیوندکاری ناجائز ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے، حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:« إِنَّ اللّٰهَ أَنْزَلَ الدَّاءَ وَالدَّوَاءَ، وَجَعَلَ لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءً، فَتَدَاوَوْا ، وَلَا تَدَاوَوْا بِحَرَامٍ » ❶ (رواه أبوداؤد)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تحقیق اللہ نے بیماری اور علاج نازل کیا ہے۔ ہر بیماری کا علاج ہے پس دوا کرو اور حرام کے ساتھ دوا نہ کرو۔''

اس روایت سے معلوم ہوا کسی بھی حرام شیٔ کو بطور علاج معالجہ استعمال کرنا حرام ہے۔

مزید آنکہ قرآن مجید میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف حمیدہ میں مصرح ہے:

﴿وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ .﴾ (الأعراف:١٥٧)

''اور پاک چیزوں کو ان کے لئے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے۔''

لہٰذا حرام چیزوں کے اجزائے بدن کو انسانی طاہر جسم میں کسی صورت استعمال کی اجازت نہیں۔ (وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَ عِلْمُهُ أَتَمُّ .)

سوال: بعض لوگ پاؤں اور ہاتھوں میں مہندی لگا لیتے ہیں ایسا کرنا جائز ہے یا کہ نہیں؟

جواب: گرمی کی وجہ سے ہاتھ پاؤں جلتے سڑتے ہوں تو بایں صورت مرد مہندی لگا سکتا ہے۔ عام حالات میں نہیں۔ سنن ابوداؤد میں حدیث ہے:

« وَلَا وَجَعًا فِيْ رِجْلَيْهِ إِلَّا قَالَ:« اِخْضِبْهُمَا .» ❷

یعنی ''جب کوئی پاؤں کے درد کی شکایت کرتا تو آپ ﷺ فرماتے انہیں رنگ لے۔''

(بَابُ الْحِجَامَةِ) زَادَ الْبُخَارِي فِيْ تَارِيْخِهِ: بِالْحِنَّاءِ ،قَالَه فِيْ فتح الودود . (بحواله العون ٢/٤)

یعنی ''بخاری نے اپنی تاریخ میں یہ اضافہ کیا ہے کہ مہندی سے رنگ لے۔'' ❸

سوال: کیا محکمہ انکم ٹیکس میں نوکری کرنا جائز ہے اور جو سہولتیں حاصل ہیں ان سے استفادہ جائز ہے؟

---

❶ (٤٧٠) ضعفه الألباني،أبوداؤد،كتاب الطب،باب فى الأدوية المكروهة(٣٨٧٤)،ضعيف أبى داؤد، (٨٣٣) فيه إسماعيل بن عياش وهو ضعيف،غاية المرام(٦٦)لكن نهى رسول الله ﷺ عن الدواء بالخمر، انظر: صحيح مسلم، الأشربة(٥١٤١)أبوداؤد(٣٨٧٣).

❷ (٤٧١) حسنه الألباني،صحيح أبى داؤد،كتاب الطب،باب الحجامة (٣٨٥٨)، المشكاة (٤٥٤٠) التحقيق الثانى، الصحيحة(٢٠٥٩).

❸ اسی طرح اگر ہاتھ یا پاؤں میں کوئی ایسا مرض لاحق ہوگیا ہو تو بطور دوا مہندی لگانا جائز ہے (عبدالشکور مدنی)

جواب: انکم ٹیکس کی کمائی محل نظر ہے لہٰذا محکمہ ہذا میں ملازمت اختیار کرنا بھی مشکوک ہے۔ حدیث میں ہے:«دَعْ مَا یُرِیْبُكَ إِلٰی مَا لَا یُرِیْبُكَ .» ❶

سوال: ہماری مساجد کو جو لوگ چندہ دیتے ہیں ان میں اکثریت صرف جمعہ پڑھنے والوں کی ہوتی ہے۔ کیا ان سے یہ چندہ لینا جائز ہے اور اس مسجد میں جو ان پیسوں سے تعمیر ہو نماز پڑھ سکتے ہیں؟

جواب: بظاہر ایسے لوگوں سے چندہ لینے کا کوئی حرج نہیں۔ حدیث میں ہے:

« إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ .» ❷

یعنی ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔''

ایسی مسجدوں میں نماز پڑھنا درست ہے۔

سوال: کیا دینی امور پر اجرت جائز ہے؟

جواب: دینی کاموں پر اجرت وصول نہیں کرنی چاہیے۔ البتہ وقت کی پابندی کی مزدوری لینے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔

سوال: کافر حکومت کی جتنی بھی ہمیں سہولتیں حاصل ہیں، انہیں استعمال کر سکتے ہیں؟

جواب: شریعت کی نافرمان حکومت سے مباح امور میں سہولتوں سے استفادہ جائز ہے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام دریں مسئلہ کہ دینی مدرسین دو ماہ سالانہ تعطیلات کی تنخواہ کے شرعاً مستحق ہوتے ہیں یا نہیں بعض دفعہ مدرس خود برموقعہ امتحان سالانہ استعفاء دے دیتا ہے اور انتظامیہ کو تنخواہ سے محروم کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے اور بعض دفعہ انتظامیہ کی طرف سے مدرسین کو جواب مل جاتا ہے۔ دوسری صورت میں کسی مدرس کو ایام رخصت کی تنخواہ مل جاتی ہے اور کسی کو محرومی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا تفصیل سے روشنی ڈالیں۔ کس صورت میں محروم ہوتا ہے اور کس صورت میں حقدار؟

جواب: انتظامیہ اور مدرس کو شروع ہی سے اتفاق رائے سے چھٹیوں کی تنخواہ کا مسئلہ طے کر لینا چاہیے۔ چاہے اتفاق ادائیگی پر ہو یا عدم ادائیگی پر بعد میں اسی کے مطابق عمل ہوگا۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ﴾(المائدة:۱)

---

❶(۴۷۲) صححه الألباني،صحيح الترمذي، أبواب صفة القيامة رقم الباب (۲۲) ح (۲۶۵۰) والنسائي، كتاب الأشربة، باب الحث على ترك الشبهات(۵۲۶۹) ،أحمد (۱/ ۲۰۰) ،المشكاة (۲۷۷۳) ،الارواء (۱۲،۲۰۷۴).

❷(۴۷۳) صحيح البخاري، بدء الوحي رقم (۱)

اگر یہ صورت نہ ہو تو فیصلہ معروف پر ہوگا بقاعدہ" المعروف کالمشروط" اور اگر یہ بھی ناممکن ہو تو مدرس کی حیثیت اجیر خاص کی ہوگی۔ مغنی ابن قدامہ (۳۰۵/۵) پر اجیر خاص کی تعریف بایں الفاظ ہے:

" هُوَالَّذِی یَقَعُ الْعَقْدُ عَلَیْهِ فِیْ مُدَّةٍ مَعْلُوْمَةٍ یَسْتَحِقُّ الْمُسْتَأْجِرُ نَفْعَهُ فِیْ جَمِیْعِهَا كَرَجُلٍ اسْتُؤْجِرَ لِخِدْمَةٍ أَوْ عَمَلٍ فِیْ بِنَاءٍ أَوْ خَیَّاطَةٍ أَوْ رِعَایَةٍ یَوْمًا أَوْ شَهْرًا سُمِّیَ خَاصًّا لِاخْتِصَاصِ الْمُسْتَأْجِرِ بِنَفْعِهٖ فِیْ تِلْكَ الْمُدَّةِ دُوْنَ سَائِرِ النَّاسِ ."

نیز ہدایہ میں ہے:

" وَالْأَجِیْرُ الْخَاصُّ الَّذِیْ یَسْتَحِقُّ الْأُجْرَةَ بِتَسْلِیْمِ نَفْسِهٖ فِی الْمُدَّةِ وَ إِنْ لَمْ یَعْمَلْ كَمَنِ اسْتُؤْجِرَ شَهْرَ الْخِدْمَةِ أَوْ یَرْعَی الْغَنَمَ وَ إِنَّمَا سُمِّیَ أَجِیْرًا لِأَنَّهٗ لَایُمْكِنُهٗ أَنْ یَعْمَلَ لِغَیْرِهٖ ."

صورت ہذا میں مدرسین حضرات تعطیلات کی تنخواہ کے مستحق ہوں گے، اسی طرح اثناء سال مدرس کی تدریس اگر کسی وجہ سے موقوف ہو جاتی ہے۔ مثلاً طلباء نہیں ملتے یا اسی طرح کا کوئی اور عارضہ پیش آ جاتا ہے تو مدرس بدستور رواتب کا مستحق ٹھہرے گا جب تک کہ اتفاق رائے سے اس کے خلاف کوئی حتمی فیصلہ نہ ہو۔ بدایۃ المجتہد میں ہے:

" فَقَالَ عَبْدُ الْوَهَّابِ: الظَّاهِرُ مِنْ مَذْهَبِ أَصْحَابِنَا أَنَّ مَحَلَّ اسْتِیْفَاءِ الْمَنَافِعِ لَایَتَعَیَّنُ فِی الْإِجَارَةِ وَإِنْ عُیِّنَ فَذَالِكَ كَالْوَصْفِ لَا یَنْفَسِخُ بِبَیْعِهٖ أَوْ ذِهَابِهٖ بِخِلَافِ الْعَیْنِ الْمُسْتَأْجَرَةِ إِذَا تَلِفَتْ وَ ذَالِكَ مِثْلُ أَنْ یَسْتَأْجِرَ عَلٰی رِعَایَةِ غَنَمٍ بِأَعْیَانِهَا أَوْ خِیَاطَةِ قَمِیْصٍ بِعَیْنِهٖ فَتَهْلِكُ الْغَنَمُ وَ یَحْتَرِقُ الثَّوْبُ فَلَا یَنْفَسِخُ الْعَقْدُ وَ عَلَی الْمُسْتَأْجِرِ أَنْ یَأْتِیَ بِغَنَمٍ مِثْلِهَا لِیَرْعَاهَا أَوْ قَمِیْصٍ مِثْلِهٖ لِیَخِیْطَهٗ ."

نیز مدرسین کو چھٹیوں کا حق چونکہ انتظامیہ کی طرف سے حاصل ہوا ہے اس کا بھی تقاضا ہے کہ مدرسین کو حق سے محروم نہ رکھا جائے جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جنگ بدر میں اپنی رفیقۂ حیات رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ اس کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

« إِنَّ لَكَ أَجْرَ مِمَّنْ شَهِدَ بَدْرًا أَوْ سَهْمَهُ .» [1] (رواه البخاری)

چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا پیچھے رہ جانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا مندی سے تھا۔ اس لئے مال غنیمت سے سہم کے حقدار بنے اسی طرح مدرسین کا عدم حضور بھی انتظامیہ کی رضا سے ہے لہٰذا وہ بھی حقدار بننے چاہئیں۔

بنا بریں مسئولہ صورتوں کو مذکورہ بالا صورتوں پر محمول کیا جائے گا۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ وَ عِلْمه أَتَمّ.

سوال: ہمارے ایک ساتھی میڈیکل اسٹور کا کام کرتے ہیں۔ میڈیکل سٹور میں بونس سسٹم ہوتا ہے۔ کمپنی اپنا مال زیادہ فروخت کرنے کے سلسلہ میں بونس میں اضافہ کرتی ہے۔ بونس کے حساب سے چاہے پیسے لے لیں /رقم لے لیں یا کوئی چیز کلاک، تھرموس، الیکٹرک واٹر کولر، فریج وغیرہ یعنی جتنا مال اسی حساب سے بونس یا چیز یا رقم مثلاً:

- ۱۰۰ پیس ۲۵ پیس بونس یا اتنی رقم کی اشیاء (تھوڑی سی زیادتی یا کمی بیشی کے ساتھ)
- ۵۰۰ = الیکٹرک واٹر کولر (ایضًا)
- ۲۰۰ = فریج (ایضًا)
- ۱۵۰ = فرانس کا واٹر سیٹ وغیرہ وغیرہ۔

کیا یہ بھی لاٹری /''انعامی اسکیم'' ہے۔ کیا بونس وغیرہ لینا چاہیے یا نہیں؟ اگر نہ لینا ہو تو پھر کیا طریق کار ہے؟ کیونکہ نہ لینے کی صورت میں یہ رقم یا اشیاء متعلقہ سیلز مین یا میڈیکل ریپ کھا جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔

جواب: ا: بظاہر موجودہ صورت کمپنی کے مال کی زیادہ کھپت کی صرف ترغیبی شکل ہے۔ جس میں نہ سود ہے اور نہ جوا۔

ب: مرقوم بونس سکیم کا بظاہر جواز ہے۔

سوال: جانوروں کی مصنوعی نسل کشی جائز ہے یا ناجائز؟

جواب: جانوروں کی نسل کشی کا بظاہر جواز ہے۔ بشرطیکہ دوسری جنس کے سلسلۂ نسل کو کلی طور پر نیست و نابود یا صریح نقصان پہنچانا مقصود نہ ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے خچر کا تذکرہ بطور امتنان و احسان فرمایا ہے:

﴿وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً .﴾ (النحل:۸)

یعنی ''گھوڑے، خچر، گدھے کی سواری کے لئے اور تمہاری زینت کے لئے ہیں۔''

---

[1] (٤٧٤) صحيح البخاري، كتاب فرض الخمس، باب إذا بعث الإمام رسولا في حاجته......(٣١٣٠)

یعنی گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کی پیدائش کا مقصد ہی زینت اور سواری ہے۔

پھر یہ بات معروف ہے کہ خچر کی اپنی کوئی نسل نہیں وہ محض گدھے اور گھوڑی کے ملاپ سے معرض وجود میں آتا ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ وغیرہ نے متعدد احادیث بیان فرمائی ہیں۔ جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خچر پر سواری کرنے کی تصریح موجود ہے۔

مندرجہ بالا دلائل سے معلوم ہوا کہ گدھے اور گھوڑے کے درمیان اختلاط ممنوع نہیں کیوں کہ اگر ممنوع ہوتا تو خچر پر سواری بھی جائز نہ ہوتی۔ جب سواری جائز ہے تو یہ فعل ممنوع نہیں۔

باقی رہیں وہ حدیثیں جن سے اس کی ممانعت ظاہر ہوتی ہے جیسے ابوداؤد کی وہ روایت جس میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خچر ہدیہ میں ملا۔ آپ نے اس پر سواری کی پھر علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر ہم نے گدھے اور گھوڑی کی جفتی کرائی ہوتی تو اسی طرح ہمارے پاس بھی خچر ہوتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نادان لوگ ایسا کرتے ہیں۔[1] (سُنَن أَبِیْ دَاوٗد بَابٌ فِیْ کَرَاھِیَۃِ الْحُمُرِ تُنْزٰی عَلَی الْخَیْلِ.)

نیز ''شرح معانی الآثار'' میں ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں (اہل بیت کو) دوسروں سے تین باتوں میں ممتاز بتایا۔ إِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ (اچھی طرح سے وضو کرنا) صدقہ کا مال نہ کھانا اور گھوڑی اور گدھے کے درمیان جفتی نہ کرانا۔[2] علامہ عظیم آبادی فرماتے ہیں۔ ان کا جواب تین طریقے سے دیا گیا ہے۔

اولاً: یہ کہ علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ممانعت نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ کرتے ہیں جو بے خبر ہیں۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جو بے علم اور جاہل ہیں۔ اور یہ کہ یہ کام اہل علم اور سادات کا نہیں کہ وہ اس کام میں وقت صرف کریں۔ اسی معنی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بیان ہوئی۔ یعنی یہ ممانعت کا حکم صرف ہاشمیوں کے ساتھ خاص ہے۔ دوسرے تمام لوگ اس حکم میں شامل نہیں یعنی انہیں رخصت ہے۔ اہل بیت کو صرف تین چیزوں میں دوسروں سے ممتاز کیا گیا ہے۔ ایک ''إِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ'' دوسرے یہ کہ صدقہ نہیں کھاتے اور گھوڑے گدھے میں جفتی نہیں کراتے۔

---

[1] (٤٧٥) صححه أحمد شاكر والألباني. صحيح أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب في كراهية الحمر تنزى على الخيل، ح(٢٥٦٥)، أحمد، (٩٨/١)(٧٦٦ـ شاكر).

[2] (٤٧٦) شرح معاني الآثار، كتاب الزكاة، باب الصدقة على بني هاشم(٤/٢).

یہ حکم ہاشمیوں کے لئے ان کے شرف شان کی وجہ سے ہے کسی معصیت کی وجہ سے یہ تخصیص نہیں۔ اگر اس میں معصیت کو دخل ہوتا تو ہاشمیوں کی تخصیص نہ ہوتی کہ اوامر ونواہی میں امت محمدیہ ﷺ کے افراد سب برابر ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ گھوڑے اور گدھے کی جفتی نہ کرانا اور ''إِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ'' نہ کرنا ہاشمیوں کی عالی شان کے خلاف ہے۔ البتہ غیر ہاشمی اس حکم سے الگ ہیں۔ ہاشمیوں کے لئے ان تینوں باتوں کا حکم ان کی شان کی وجہ سے باقی ہے اور یہی ہمارا مدعا ہے۔

ثانیًا: یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے قول ''یہ کام وہ کرتے ہیں جو بے علم ہیں'' کا مطلب یہ ہے کہ جو یہ کام کرتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ گھوڑوں کے استعمال میں کتنا اجر ہے، جو خچروں وغیرہ کے استعمال میں نہیں، اگر انہیں اس کے صحیح اجر کا پتہ ہوتا تو کبھی بھی خچروں کی طرف راغب نہ ہوتے۔ گھوڑوں سے لگاؤ اور اس سے رغبت سے متعلق بہ کثرت حدیثیں آئی ہیں۔ ان میں ابوہریرۃ اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کی یہ دو حدیثیں بڑی مشہور ہیں۔ جو ''صحاح ستہ'' میں موجود ہیں۔

ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے گھوڑے سے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہ یہ تین طرح کے لوگوں کے لئے ہیں۔ کسی کے لئے باعث اجر ہیں اور کسی کے لئے باعث زینت اور کسی کے لئے وبال جان اور ہلاکت خیز۔ پھر لوگوں نے گدھے سے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: گدھے کے فائدے سے متعلق اس آیت کے علاوہ مجھ پر اور کچھ نازل نہیں ہوا۔

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ. وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ. ﴾ (الزلزال:۸)

''جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی وہ اس کا اجر پائے گا اور جس نے ذرہ برابر بھی برائی کی اسے بھی دیکھے گا۔''[1]

امام طحاوی رحمہ اللہ ''شرح معانی الآثار'' میں لکھتے ہیں: ''اگر کوئی کہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ ''نادان ایسا کرتے ہیں۔'' تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ علماء کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ گھوڑے کے حصول اور اس کے استعمال میں جو اجر اور فائدہ ہے وہ خچر میں نہیں۔ اسی وجہ سے نبی ﷺ نے فرمایا کہ گھوڑے کے فوائد بہت ہیں۔ بہ نسبت خچر کے جو گدھے اور گھوڑے کے ملاپ سے نادان لوگ حاصل کرتے ہیں گویا وہ ایسی چیز پر توجہ نہیں کرتے جس میں اجر ہے بلکہ ایسی چیزوں پر توجہ دیتے ہیں جس میں اجر نہیں۔

---

[1] (٤٧٧) صحیح البخاری، کتاب الجهاد، باب الخیل ثلاثة (٢٨٦٠)، شرح معانی الآثار (٢٧٣/٣)

ثالثاً: یہ کہ نبی ﷺ کے زمانے میں بنی ہاشم کے پاس گھوڑے بہت کم تھے۔ اس لئے آپ ﷺ نے یہ فرمایا تاکہ خچر کے مقابلے میں گھوڑے کی نسل پر توجہ دی جائے اور اس طرح ان کی افزائش ہو۔

امام طحاوی رحمہ اللہ نے ''شرح معانی الآثار'' میں عبیداللہ بن عبداللہ کے واسطے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لئے (اہل بیت کے لئے) تین باتیں خاص کر دی ہیں۔ اول یہ کہ ہم صدقہ نہ کھائیں۔ اچھی طرح وضوء کریں اور گھوڑے اور گدھے میں جفتی نہ کرائیں۔ راوی کہتے ہیں کہ میری عبداللہ بن حسن سے ملاقات ہوئی۔ آپ بیت اللہ کا طواف فرما رہے تھے۔ میں نے ان سے باتیں کیں انہوں نے اس کی تصدیق کی اور کہا بنی ہاشم میں گھوڑے بہت کم تھے۔ آپ ﷺ چاہتے تھے گھوڑے کی نسل بڑھے۔ ❶ عبداللہ بن حسن کی توجیہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھوڑے اور گدھے کی جفتی کرانے کو حرام نہیں قرار دیا تھا بلکہ گھوڑوں کی قلت کی وجہ سے یہ بات کہی تھی پھر جب یہ علت دور ہوگئی تو اس سے کوئی چیز مانع نہ رہی۔ نیز یہ کہ اس عمل سے صرف بنی ہاشم کو روکا گیا ہے۔ یعنی دوسروں کے لئے یہ عمل مباح ہے۔ (فتاویٰ عظیم آبادی ص ۳۲۶-۳۳۰)

۲۔ سابقہ دلائل سے جب مصنوعی نسل کشی کا جواز نکل آیا تو انجکشن کے ذریعے جانور کو حاملہ کرنے کا جواز بھی خود بخود ثابت ہوگیا۔ ❷ کیونکہ ہر دو صورتوں میں مقصود مادۂ تولید کی منتقلی ہے۔ چاہے غیر معروف طریقہ سے ہی کیوں نہ ہو۔

سوال: چوبیس افراد مل کر ایک کمیٹی ڈالتے ہیں۔ اور سو روپے روزانہ جمع کرتے ہیں۔ اس طرح ایک آدمی گویا کہ تین ہزار روپے ماہانہ جمع کراتا ہے۔ اور چوبیس افراد کی اس رقم سے ہر ماہ بہتر ہزار (۷۲۰۰۰) روپے جمع ہو جاتے ہیں۔ ہر ماہ ایک بولی ہوتی ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ جو آدمی اس بہتر ہزار روپے میں سے کم سے کم بولی دے کر کمیٹی حاصل کرے وہ اس کو دے دی جائے گی مثلاً ایک آدمی کہتا ہے کہ میں ساٹھ ہزار (۶۰۰۰۰) روپے میں لیتا ہوں اور بارہ ہزار روپے (۱۲۰۰۰) چھوڑ دیتا ہوں۔ اس کے مقابلے میں ایک آدمی کم

---

❶ (٤٧٨) شرح معانی الاثار (۲۷۵/۳)

❷ راقم کے خیال میں جانور کو بذریعہ انجکشن حمل ٹھہرانا علی الاطلاق جائز نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ یہ صرف اس صورت میں جائز ہونا چاہیے جب کہ مادہ جانور کو کسی مرض کی وجہ سے معروف طریقے کے مطابق حمل نہ ٹھہرتا ہو۔ اس لیے کہ جانور کو بغیر کسی وجہ کے اس کے ''حق استلذاذ'' سے محروم کرنا شرعاً مناسب اور درست نہیں کیونکہ شریعت نے انسان پر انسانوں کے علاوہ جانوروں کے بھی کچھ حقوق مقرر کر رکھے ہیں جن کا اسے خیال رکھنا چاہیے۔ (نعیم الحق نعیم)

بولی دیتا ہے اور ساٹھ ہزار کی بجائے پچاس ہزار روپے لیتا ہے تو کمیٹی کم بولی دینے والے کو مل جائے گی۔ اس طرح بقیہ بائیس ہزار (۲۲۰۰۰) روپے تمام کمیٹی کے افراد میں مساوی تقسیم کر دیئے جائیں گے اور اس طرح چوبیس ماہ ہر مہینہ ایسا ہی ہو گا۔

سوال یہ ہے کہ

① کیا یہ سود ہے اور اگر ہے تو اس کی کون سی شکل ہے؟

② اگر ایک آدمی کمیٹی کا حصہ دار ہو لیکن وہ کہے کہ میں نے (۷۲۰۰۰) دینا ہے اور (۷۲۰۰۰) ہزار روپیہ واپس لینا ہے اس لئے کہ میں سود نہیں کھانا چاہتا تو آیا وہ شخص کس اعتبار سے (شرکت یا اور وجہ سے) مجرم ہے یا نہیں؟

③ اگر وہ اس جرم میں ملوث ہے تو آیا اس کو مسجد کا امام بنایا جا سکتا ہے اور اس کے پیچھے نماز کا کیا حکم ہے؟

جواب: ①.....صورت مرقومہ بلاشبہ سود کی ایک شکل ہے، اسلام نے ربویات میں جو اصول مقرر کیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک جنس کی بیع اپنی ہی جنس سے کمی بیشی کے ساتھ ناجائز ہے۔ اِلّا یہ کہ اس میں مساوات اور نفس مجلس میں تقابض ہو تو پھر جائز ہے جب کہ مذکورہ صورت اس طرح نہیں لہٰذا وہ صریحاً حرام ہے۔

②.....ایسے لوگوں کے ساتھ شرکت بھی ناجائز ہے۔ اس لئے کہ یہ تعاون علی الاِثم کے زمرہ میں آتا ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ﴾ (المائدہ:۲)

''نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔''

اور ایک روایت میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص انگور کاٹنے کے دنوں میں انگور بند رکھے یہاں تک کہ شراب بنانے والے کے ہاتھ فروخت کر دے تو وہ دیدہ دانستہ آگ میں جا گھسا۔[1] (رواہ الطبرانی فی الأوسط بإسناد حسن، بحوالہ بلوغ المرام کتاب البیوع)۔

[1] (٤٧٩) بلوغ المرام، رقم (٨٠٤)، الطبرانی (١٧٠/٦، ١٧١) (٥٣٥٢) الأوسط، مجمع البحرین (١٩٨٤)، الضعیفة (١٢٦٩) فیه الحسن ابن مسلم المروزی التاجر. قال الألبانی:" باطل". وقال الذهبی: " أتی بخبر موضوع فی الخمر". ثم ذکر هذا الحدیث. میزان الاعتدال (٥٢٣/١).

اس سے معلوم ہوا مجرموں کا معاون اور شریک کار نہیں بننا چاہیے۔

③...... ایسا شخص امامت کا اہل نہیں، تمام مقتدیوں کو مسئلے کی نوعیت سمجھا کر اسے معزول کر دینا چاہیے۔ صحیح حدیث میں ہے:

((مَنْ غُذِیَ بِالْحَرَامِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ)) ❶

یعنی ''جس کی نشوونما حرام مال سے ہوئی اس پر جنت حرام ہے۔''

اور دوسری روایت میں ہے:

((اِجْعَلُوْا أَئِمَّتَکُمْ خِیَارَکُمْ)) ❷

یعنی ''اپنے امام پسندیدہ لوگوں کو بناؤ۔'' (هٰذَا مَا عِنْدِیْ، وَاللّٰہُ أَعْلَمُ بِالصَّوَاب .)

سوال: ① ......کیا دوکانداری میں جھوٹ بول کر سودا گاہک کوفروخت کرنا جائز ہے؟

② ......اگر دوکان پر گاہک ہو تو نہ تو نماز پڑھ سکیں اور نہ کھانا کھا سکیں جب تک بالکل دوکانداری سے فارغ نہ ہو چاہے نماز قضا کرنی پڑے۔

③ ملازمین کو نماز پڑھنے سے روکنا یا کسی طریقہ سے منع کرنا۔

④ اگر کوئی شخص نماز پڑھنے جا رہا ہو تو راستے میں گاہک مل جائے تو گاہک کو لے کر واپس دکان پر آ جائے اس کو سودا فروخت کر کے فارغ ہو تب نماز پڑھے۔

⑤ ملازمین کی بےعزتی کرنا اور گاہک کی عزت کرنا۔

⑥ ملازمین سے کیسا سلوک کیا جائے۔

---

❶(٤٨٠) الأول:إسناده ضعيف.قاله الأستاذ إرشاد الحق الأثری حفظه الله تعالیٰ،أبویعلی بتحقیق الأثری (٨٥/١) (٧٨،٧٩) ومختصر زوائد مسند البزار لابن حجر(٥١٤/٢)(٢٣٢٢)وقال ابن حجر:فیه عبد الواحد " ضعیف جدا". الثانی:معناه صحیح ثابت عن رسول الله ﷺ انظر:بهذا اللفظ: ((لایدخل الجنة لحم نبت من سحت،النار أولی به......))أحمد،(٣٢١/٣)وقال حمزة:إسناده صحیح. عبد الرزاق (٣٤٦/١١) (٢٠٧١٩)،ابن حبان (٩/٥) (١٧٢٣ـ الإحسان)، الدارمی (٢٨١٨) بتحقیق حسین سلیم، وقال: " قوی" وقال شعیب الأرناؤوط "صحیح" والطبرانی فی الأوسط (٢٧٥، ٤٤٧٧) عن کعب و (٦٦٧١) عن حذیفة ،والمشکاة(٢٧٧٢)عن جابر.

❷(٤٨١) الدار قطنی (٨٨/٢) مع تعلیق المغنی، ضعفه الالبانی انظر: الضعیفة(١٨٢٢)، ضعیف الجامع الصغیر(١٥٠).

④ ایک ملازم کو برتر سمجھنا دوسرے کو بدتر سمجھنا۔

جواب: ①......جھوٹ سے سودا سلف فروخت کرنا سخت منع ہے صحیح حدیث میں وارد ہے:

« إِنَّ الصِّدقَ يَهْدِىْ إِلَى الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِىْ إِلَى الْجَنَّةِ، وَ إِنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتّٰى يَكُوْنَ صِدِّيقًا، وَ إِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِىْ إِلَى الْفُجُوْرِ، وَ إِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِىْ إِلَى النَّارِ، وَ إِنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا. » [1] (بخاری مع فتح الباری ۵۰۷/۱۰)

یعنی "سچائی نیکی کی طرف لے جاتی ہے اور نیکی جنت میں پہنچا دیتی ہے اور آدمی سچ بولتا رہتا ہے حتی کہ بہت زیادہ سچا بن جاتا ہے۔ اور جھوٹ فسق و فجور کی طرف لے جاتا ہے اور فسق و فجور جہنم میں لے جاتا ہے اور آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے حتیٰ کہ اللہ کے ہاں بہت زیادہ جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔"

②......اذان سنتے ہی کاروبار زندگی معطل کر دینا چاہیے۔قرآن مجید میں مومنوں کے اوصاف میں سے ہے:

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ إِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ إِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ. ﴾

(النور: ۳۷)

یعنی (ایسے) لوگ جن کو اللہ کے ذکر اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے سے نہ سوداگری غافل کرتی ہے نہ خرید و فروخت۔"

راویٔ حدیث ابراہیم بن میمون الصائغ کے بارے میں امام ابوداؤد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَكَانَ إِذَا رَفَعَ الْمِطْرَقَةَ فَيَسْمَعُ النِّدَاءَ " [2] (سنن أبي داود:۳/ ۲۴۲ مع عون المعبود)

یعنی "ابراہیم جب ہتھوڑا اٹھاتا کہ لوہے پر مارے اسے اذان سنائی دیتی تو فوراً کام چھوڑ کر مسجد میں چلا جاتا۔"

صاحب العون فرماتے ہیں": ابوداؤد کا مقصود اس سے ابراہیم کی تعریف و توصیف کرنا ہے کہ ان کا لوہارا کام اللہ کی یاد سے مانع نہیں تھا بلکہ جب اذان سن لیتے تو ہتھوڑا چھوڑ کر مسجد میں چلے جاتے۔"

(سنن أبي داود:۳/ ۲۴۲ مع عون المعبود)

---

[1] (۴۸۲) صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب قول الله تعالى:﴿يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله......﴾وما ينهى عن الكذب (۶۰۹۴). صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب قبح الكذب وحسن الصدق وفضله (۶۶۳۷).

[2] (۴۸۳) أبوداؤد، كتاب الأيمان والنذور، باب لغو اليمين (۳۲۵۴).

③...... ملازمین کو نماز کی ادائیگی سے روکنا کفار مکہ کی سنت کا احیاء ہے جو بیت اللہ میں اللہ کی عبادت سے منع کرتے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِيْ خَرَابِهَا. ﴾

(البقرة:١١٤)

یعنی ''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے نام کا ذکر کئے جانے کو منع کرے اور ان کی ویرانی میں ساعی ہو۔''

لہٰذا عاقل انسان کے لائق نہیں ہے کہ اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر کے اپنے لئے ذلت و رسوائی کا گڑھا کھودے۔ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا.

④...... ایسے فعل کے مرتکب کو اللہ سے معافی اور استغفار کرنا چاہیے۔ فرمان باری تعالیٰ:

﴿ اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ إِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴾ (نوح:١٠)

''اپنے پروردگار سے معافی مانگو کہ وہ معاف کرنے والا ہے۔''

⑤...... ملازمت کرنا نبیوں کی سنت ہے۔ ہمارے نبی ﷺ بذات خود چند سکّوں پر اہل مکہ کی بکریاں چراتے رہے۔ ❶

لہٰذا ملازم کو حقیر سمجھنا کمینگی ہے اس کے مرتکب کو تائب ہونا چاہیے اور گاہک سے خوش خلقی سے پیش آنا قابل تعریف فعل ہے۔

⑥...... ملازم کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا چاہیے جس طرح کہ نبی اکرم ﷺ کے خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے بارے میں توصیفی کلمات متعدد احادیث میں بیان فرمائے ہیں۔ ملاحظہ ہو: (مشکوٰۃ)

⑦...... اگر یہ تفاوت خصائل و عادات کے اعتبار سے ہے تو اس کا کوئی حرج نہیں بلاوجہ کسی کو بدتر سمجھنا درست بات نہیں۔ بعض روایات میں ہے:

« أَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ. » ❷

---

❶ (٤٨٤) صحيح البخاری، كتاب الإجارة، باب رعی الغنم علی قراريط (٢٢٦٢).

❷ (٤٨٥) أبو داؤد، كتاب الأدب، باب فی تنزيل الناس منازلهم (٤٨٤٢) عن عائشة، وقال أبو داؤد: ميمون لم يلق عائشة رضی الله عنها، و ضعفه الألبانی؛ انظر: الضعيفة (١٨٩٢، ١٨٩٤)، المشكاة (٤٩٨٩) التحقيق الثانی.
صحيح مسلم فی المقدمة بغير سند.

یعنی ''لوگوں سے ان کے مرتبے و مقام کے اعتبار سے پیش آؤ۔''

سوال: انشورنس بیمہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ متقدمین اور متاخرین علماء اہل حدیث و علمائے دیوبند سے جو انشورنس کے حق میں ہیں، ان کے دلائل کہاں تک درست ہیں اور جو علماء بیمہ کے خلاف ہیں ان کے دلائل کہاں تک درست ہیں؛ جب کہ عوام الناس کا خیال ہے کہ اگر اسلامی حکومت ہو تو وہ انسانی جان کے ضیاع کی صورت میں بال بچوں کی کفالت کا بوجھ بیت المال سے ادا کرتی ہے غیر اسلامی حکومت میں انسان کے مرنے یا مار دینے کی حالت میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں تو اس غیر اسلامی حکومت میں انشورنس کی کیا صورت ہوگی؟

جواب: اسلام نے بڑے صاف اور واضح انداز میں حلال اور حرام کے مشکل ترین مسائل کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے اس کے لئے کچھ قواعد و ضوابط بھی مقرر فرمائے ہیں جو راہنما اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک مومن مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ تا حیات پیش آمدہ حوائج و ضروریات کو اسی اصول پر پرکھے۔ تاکہ اس کا معیار زندگی اللہ اور اس کے رسولِ کریم ﷺ کی منشا کے مطابق بن کر دائمی بشارتوں سے بہرہ ور ہو سکے۔ فی الجملہ شریعت نے باہمی کاروبار کی بنیاد نفع اور نقصان میں اشتراک پر رکھی ہے۔ ''مُضَارَبَتْ'' اور ''مُقَارَضَتْ'' کے حل طلب مسائل کے لئے اسی کو **اَصْلُ الْاُصُوْل** قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ صورت مسئولہ میں نفع کا پہلو صرف غالب ہی نہیں بلکہ حتمی و یقینی ہے بلکہ آغاز عمل سے منافع کی شرح اور مقدار بھی متعین ہوتی ہے جو واضح طور پر اس کے سود ہونے کی دلیل ہے نیز لفظ ''بیمہ'' بھی جملہ تحفظات کا ضامن ہے جس میں سرمائے کے خسارے کا کوئی امکان نہیں بلکہ اس کو تجارتی سود میں استعمال کر کے کئی گنا اضافہ کیا جاتا ہے جس کی قلیل نسبت طالب بیمہ کے حصہ میں آتی ہے۔ صورت ہذا مذکور شرعی ضابطے کے منافی ہے اور اگر ''بیمہ'' کرانے والا اقساط کی ادائیگی کے درمیان انتقال کر گیا تو کمپنی پھر بھی مخصوص وارث کو معاہدہ کے مطابق رقم واپس کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ قمار (جوا) ٹھہرا، اور میت کے دیگر ورثاء اگر موجود بھی ہوں تو ان کو محروم کر دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ ظلم بھی ہے اور بعض دفعہ یہ وارث طالب ''بیمہ'' کو اس طمع سے قتل کر دیتا ہے کہ اس کی مخصوص رقم پر قبضہ جما لے۔ اور اگر یہ کل قسطیں ادا نہ کر سکا۔ عاجز آ گیا تو ادا شدہ رقم بھی بحق کمپنی ضبط ہو جائے گی جو دھوکہ کی ایک شکل ہے۔ اتنی ساری قباحتوں کی موجودگی میں انشورنس ''بیمہ'' کی حلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کی جتنی بھی صورتیں ہیں سب حرام ہیں کیوں کہ ہر صورت میں محور سود کو بنایا جاتا ہے۔

اور دوسری طرف جو لوگ اس کی حلت اور جواز کے قائل ہیں ان کے پاس شرعی کوئی ثبوت نہیں۔ الا یہ کہ ان کے سامنے انسانی ہمدردی کا پہلو نمایاں ہے۔

لیکن غور وفکر کی بات یہ ہے کہ انسانی ہمدردی بھی تو صرف وہی قابل اعتماد ہوتی ہے جس کی اصل شرعی تعلیمات پر ہو وہ کیسی ہمدردی ہے جہاں اشرف المخلوقات کو حرام خوری کا عادی بنا دیا جائے؟ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ.

اور حکومت وقت اگر مستحقین کا احساس نہیں کرتی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اللہ عزوجل کی منہیات کا ارتکاب کیا جائے بلکہ اس کے لئے بہترین صورت یہ ہے کہ ''صندوق البر'' (فلاح و بہبود فنڈ) کے نام سے ایک فنڈ قائم کیا جائے جس میں احباب کو ماہانہ رقم جمع کرانے کی ترغیب دی جائے پھر بلا معاوضہ حسب ضرورت اس سے محتاجوں سے تعاون کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ . ﴾ (المائدة:۲)

سوال: بنک میں ڈرافٹ اور بعض تجارتی حضرات کے ہاں ہنڈی کا ذریعہ چل رہا ہے۔ ہنڈی میں رقم ایک دن یا کم یا زیادہ مگر پھر بھی جلدی پہنچانے کی ضمانت دی جاتی ہے۔ فائدہ یہ ہے کہ بنک کے ریٹ سے زیادہ ریٹ دیتے ہیں۔ شائد بنک جتنی رقم اجرت کے بہانے کاٹتا ہے۔ یہ پوری کر دیتے ہیں۔ مثلاً اگر بنک ایک ریال میں ۶.۸۰ روپے دیتا ہے تو یہ ۷ یا کچھ اوپر پیسے کے حساب سے دیتے ہیں نیز ہمارے پیسے ہمارے گھر پہنچانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ پاکستان کے زرمبادلہ کو جو نقصان ہوتا ہے وہ واضح ہے مگر بعض نے پھر بھی اسے سودی کاروبار میں شامل کیا ہے کہ یہ تاجر اس سے سودی ذریعہ بنا لیتے ہیں واللہ اعلم کیسے؟ اگر سودی ذریعہ نہ بنایا جائے تو کیا حکم ہے؟ ایک ڈاکٹر کی تحقیق دونوں میں سود ثابت کرتی ہے۔

جواب: ہنڈی کے کاروبار میں بظاہر کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ مختلف کرنسیوں کا کمی بیشی سے تبادلہ سود نہیں۔ یہاں جنس کے اعتبار سے دونوں مختلف ہیں۔ اور ''مختلف الأجناس'' کے تبادلہ میں کمی بیشی جائز ہے۔ پھر اس کمی زیادتی کی شرعی طور پر کوئی حد مقرر نہیں ہے بلکہ معاملہ جانبین کی باہمی رضا مندی پر موقوف ہے۔

سوال: کیا انشورنش کروانا جائز ہے؟

جواب: شریعت اسلامی میں انشورنس کرانا ناجائز ہے کیونکہ اس میں حرام خوری کی متعدد صورتیں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ بیمہ کمپنیوں کے ہاں یہ طے شدہ اصول ہے کہ جس چیز کا بیمہ ہو چکا ہے اگر وہ معینہ مدت سے پہلے مر جائے یا ہلاک ہو جائے تو بیمہ کی پوری رقم اس کے ورثاء یا مالکوں کو ادا کی جاتی ہے اور اگر وہ مقررہ مدت

تک زندہ رہے تو کل جمع شدہ رقم مع سود اس کو ادا کی جاتی ہے۔ اور اگر کچھ قسطیں ادا کر کے باقی کی ادائیگی سے وہ قصداً انکار کر دے یا مجبوراً وہ ادا نہ کر سکے تو پھر ادا شدہ رقم بحق کمپنی ضبط کر لی جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ پوری رقم کس معاملہ میں ادا کی جاتی ہے جب کہ اصل تعلق حوادث کی وجہ سے پہلے ہی منقطع ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ کمپنی نے یہ پیسہ سود پر لگا رکھا ہوتا ہے جس کا ادنیٰ منافع اس کے ورثاء کو دیا جاتا ہے۔ باقی وہ ذمہ داران خود ہضم کر جاتے ہیں۔

اور اگر کہا جائے کہ بیمہ کرانے والا تو ''مضارب'' ہے یہ بھی غلط ہے کیونکہ ''مضاربت'' میں تو نسبت حصہ کا تعین ہوتا ہے اور طرفین نفع و نقصان میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔ جب کہ بیمہ کمپنیوں کے ہاں نسبت ادائیگی پہلے سے متعین ہوتی ہے اسی کا نام سود ہے۔ اس طرح یہ بھی ممکن ہے بعد میں بیمہ کرانے والے کی رقم پہلے کو ادا کی جائے۔

سوال یہ ہے کہ پہلے کو یہ کس حق کے تحت دی گئی ہے اس کا نام قمار نہ رکھا جائے تو اور کیا ہے؟ نیز کچھ قسطوں کی ادائیگی کے بعد باقی سے عاجز آ جانا یا قصداً رقم جمع نہ کرانے کی صورت میں جمع شدہ رقم کو ضبط کر لینا کون سے شرعی ضابطہ میں جائز ہے؟ یہ دوسرے کا مال باطل طریقہ سے کھانا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

انہی قباحتوں کی بناء پر انشورنس کا کاروبار کرنا حرام ہے۔

دراصل معاملہ ہذا یورپ کے مظالم سرمایہ داری کا طبعی تقاضا ہے۔ دین اسلام میں اس کے جواز کا تصور بھی ناممکن اور محال ہے۔

سوال: ہمارے معاشرے میں عموماً لڑکیاں شادی کے بعد اپنے نام کے ساتھ موجود والد کے نام کو ہٹا کر شوہر کا نام لگا دیتی ہیں۔ کیا ان کا ایسا کرنا صحیح ہے؟ اگر کوئی شرعی قباحت ہو تو مطلع فرمائیں۔

جواب: بحیثیت زوجیت شوہر کی طرف نسبت کا کوئی حرج نہیں۔ جب کہ حقیقی انتساب بہر صورت والد کی طرف ہی ہونا چاہیے۔

سوال: ہم پر جو لوگ حکمرانی کرتے چلے آ رہے ہیں جب وہ عموماً بے حد شاہ خرچ اور عیاش طبع لوگ ہیں اور اپنی عیاشیوں کی خاطر غریب عوام پر مستقل ٹیکسوں کی بھرمار اور بجلی، گیس اور فون بلوں پر مسلسل اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔ کیا عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ ان کا بھی جہاں بس چلے بجلی، گیس، فون، یا ٹیکسوں میں چوری کر لیں؟

جواب: شریعت میں مسلمانوں پر ٹیکس کا کوئی تصور نہیں۔ ہر ممکن طریقہ سے ظالموں کے خلاف جہاد ہونا چاہیے۔

سوال: محمد فاضل (سمن آباد) چاہتے ہیں کہ اپنی زمین اپنی زندگی میں اپنی اولاد کے مابین تقسیم کر دیں۔ اس تقسیم کا طریقہ کیا ہوگا؟ کیا بیٹی کو بیٹے کے برابر حصہ ملے گا یا بیٹے کے حصے کا نصف ملے گا؟

جواب: راجح مسلک کے مطابق ''ہبہ'' کی صورت میں لڑکی کا حصہ لڑکے کے برابر ہوتا ہے قصۂ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ میں ہے:

« أَكُلَّ وَلَدِكَ نَحَلْتَ مِثْلَهُ ؟ » [1]

یعنی نعمان بن بشیر کا کہنا ہے کہ جب میرے والد نے مجھے ایک غلام ہبہ کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر گواہ بنانا چاہا تو آپ نے فرمایا: ''کیا تمام اپنی اولاد کو تو نے اس کے مثل ہبہ کیا ہے۔ میرے والد نے کہا نہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس ہبہ سے رجوع کر لے۔''

اور دوسری روایت میں ہے اللہ سے ڈرو! اور اولاد میں عدل کرو! [2] اولاد کا اطلاق لڑکے اور لڑکیوں سب پر ہوتا ہے۔

سوال: حکومت سرکاری ملازمین کی تنخواہ کا کچھ حصہ کاٹ لیتی ہے اور ریٹائرمنٹ کے وقت اس کل جمع شدہ رقم میں مزید رقم ملا کر ملازم کو دیتی ہے۔ آیا یہ زائد رقم سود ہے یا اس کے لینے کا جواز ہے؟

جواب: کٹوتی سے زائد رقم سود ہے۔

سوال: حکومت اپنے ملازمین کو مکان کرائے پر لے کر دیتی ہے۔ اور ملازم کی تنخواہ سے کرایہ الاؤنس کے علاوہ پانچ فیصد کٹوتی مکان کی چھوٹی موٹی مرمت کے لئے کرتی ہے۔ ملازم جو مرمت کرواتا ہے۔ اس کی رسید دفتر میں جمع کروانے سے خرچ شدہ رقم وصول کر لیتا ہے۔ لیکن بعض لوگ مرمت نہیں کرواتے اور جعلی رسیدیں جمع کروا کر رقم وصول کر لیتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ یہ رقم ہماری ہی تنخواہ سے کٹی ہے تو آیا جعلی رسیدیں جمع کروا کر رقم حاصل کرنا جائز ہے؟

جواب: فریب کاری سے معاملہ کرنا ممنوع ہے چاہے اپنا حق ہی وصول کرنا کیوں نہ مقصود ہو۔ کیونکہ یہ شے

---

[1] (٤٨٦) صحيح مسلم، كتاب الهبات، باب كراهة تفضيل بعض الأولاد في الهبة (٤١٧٧)، أبو داؤد كتاب الإجارة (٣٥٤٣).

[2] (٤٨٧) صحيح مسلم، أيضاً (٤١٨١) أبو داؤد (٣٥٤٤)

دیانت وامانت کے منافی ہے جس کو اسلامی تعلیمات میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

سوال: قرآن شریف میں آیا ہے کہ خزانے اللہ کے پاس ہیں بقدر ضرورت ....الخ

لیکن کیا اللہ کی رضا اسی میں ہے کہ وقت کا انتظار کیا جائے اور معاشی تکلیف کو برداشت کیا جائے یا خوب محنت کی جائے اور نتیجہ اللہ پر چھوڑا جائے؟ مگر ایسا کرنے والے کو لوگ دنیا دار کہتے ہیں۔

جواب: قرآن نے رفتہ رفتہ روزی دینے کی وجہ یوں بیان فرمائی ہے:

﴿ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ وَلٰكِنْ يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ إِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌ بَصِيْرٌ ﴾ (الشوریٰ:۲۷)

''اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لئے رزق میں فراخی کر دیتا تو وہ زمین میں فساد کرنے لگتے لیکن وہ جو کچھ چاہتا ہے اندازے کے ساتھ نازل کرتا ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں کو جانتا اور دیکھتا ہے۔''

لیکن شریعت کی نگاہ میں کسب حلال کی صورت میں محنت کرنا باعث اجر وثواب ہے۔

سوال: ووٹنگ کے ذریعے جو حکومت منتخب ہوتی ہے اور جو جمہوریت ہے کیا یہ اسلامی ہے؟

جواب: انتخاب امیر کے لئے عوام سے رائے طلب کرنا تو شریعت میں ثابت ہے البتہ مغربی جمہوریت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے ہاں مروجہ نظام جمہوریت اسلام سے متصادم ہے اس کو بدلنا از بس ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں میرا ایک تفصیلی فتویٰ ماہنامہ ''محدث'' لاہور میں شائع شدہ ہے۔ اس کا مطالعہ کافی مفید ہے۔

سوال: عورت کی ملازمت دور حاضر میں کیسی ہے جب کہ پرفتن دور ہے؟

جواب: اسلام میں عورت کو چونکہ کسب حلال کی اجازت ہے بناء بریں اگر اس کو اسلامی حدود میں رہتے ہوئے جملہ تحفظات میسر آ جائیں تو ملازمت میں کوئی حرج نہیں۔

باقی فتنے تو قریبًا بعد کے ہر دور میں متنوع شکل میں موجود ہیں۔ ان کا توڑ صرف اسلامی تعلیمات کو مضبوطی سے تمسک کرنے میں ہی ممکن ہے۔ واللہ ولی التوفیق.

سوال: میرے ایک دوست نے بیمہ کرایا ہے یعنی اسٹیٹ لائف انشورنس میں بیمہ پالیسی کرائی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سود ہے۔ جب کہ اسٹیٹ لائف والے کہتے ہیں کہ ہم آپ کے ہی پیسوں سے کاروبار

کرتے ہیں پلازے خریدتے ہیں۔ پھر ان کا کرایہ وصول کرتے ہیں اور اسی میں سے آپ لوگوں کو منافع دیتے ہیں۔ میرے اس دوست نے کچھ رقم جمع بھی کروا دی ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں ذرا وضاحت فرما دیں؟

جواب: ارباب بیمہ بلاشبہ عوام کے سرمایہ سے حاصل کردہ منافع سے ان کو حصہ دار بناتے ہیں۔ لیکن یہ منافع شراکت نفع ونقصان کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ متعین شرح پر مالک کو حصہ دار قرار دیا جاتا ہے، اس لئے یہ ناجائز ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے قواعد وضوابط میں بھی کئی ایک شروط خلاف شرع ہیں۔ بناء بریں ان لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے سے احتراز ضروری ہے۔

سوال: وکالت کا شعبہ شرعی لحاظ سے کیسا ہے؟

جواب: وکالت کا شعبہ شبہ والا ہے۔ اگر کوئی آدمی اس میں سچائی کی حمایت پر بھی ڈٹ جائے تب بھی انگریزی قانون میں کئی ایسے قوانین ہیں جو اسلام سے متصادم ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہاں وضعی قانون کی حمایت کرنی پڑے گی تو لازماً یہ انسان قرآنی تہدید اور وعید کی زد میں آئے گا:

﴿ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ . ﴾ (المائدة:٤٤)

اور دوسری آیت میں ہے:

﴿ اَلْفَاسِقُوْنَ . ﴾ (المائدة:٤٨)

اور تیسری آیت میں ہے:

﴿ اَلظَّالِمُوْنَ . ﴾ (المائدة:٤٥)

ممکن ہے کوئی زیادہ سعی کرے تو بچاؤ کی بھی کوئی صورت پیدا کرے۔ اور رب کی مخلوق کی خدمت کا بھی بہترین موقعہ مل جائے بالخصوص مظلوم کی داد رسی عظیم نیکی ہے۔ بہرصورت اس کی علی الاطلاق حرمت کا فتویٰ تو نہیں مگر بچنا ہر صورت اچھا ہے تاکہ انسان خطرات سے دور رہے۔

سوال: جسم ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ کیا کسی کو خون، گردے، آنکھ یا جسم کا کوئی بھی حصہ عطیہ کرنا جائز ہے یا نہیں، اگر پاس کوئی مر رہا ہو تو کیا اس کو خون دینا چاہیے یا نہیں؟

جواب: بنی نوع انسان کے لئے اپنے جسم میں ایسا تصرف جس سے انسانی زندگی کا ضیاع لازم آتا ہو یہ تو قطعاً ممنوع ہے جیسے خودکشی وغیرہ اور اگر اس کی اصلاح کی خاطر آپریشن کے مراحل سے بھی گزرنا پڑے تو

سبھی جواز کے قائل ہیں۔ چاہے بعض زہر آلود عضووں کو کاٹ کر ہی اس کی اصلاح کیوں نہ کرنی پڑے بلکہ زندہ کی مصلحت کی خاطر کئی ایک اہل علم مردہ کی چیر پھاڑ کے بھی قائل ہیں چنانچہ علامہ ابن حزم "المحلّٰی" میں فرماتے ہیں [1] اگر حاملہ عورت فوت ہو جائے اور اس کے پیٹ میں بچہ حرکت کرتا معلوم ہو جس پر چھ ماہ سے اوپر مدت گزر چکی ہو تو اسے اپریشن کے ذریعہ نکال لیا جائے۔ قرآن میں ہے: جس نے ایک جان بچائی گویا اس نے سب لوگوں کی جانیں بچائیں۔

امام نووی رحمہ اللہ نے (المجموع ۱/۵ ۳۰) میں اس قول کی تبویب کی ہے اور اسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اکثر فقہاء کی طرف منسوب کیا ہے لیکن عمل ہذا کو "کَشَّافُ الْقِنَاع" اور ابوداؤد نے اپنے مسائل میں ناجائز قرار دیا ہے لکھتے ہیں:

" سَمِعْتُ أَحْمَدَ، سُئِلَ عَنِ الْمَرْأَةِ تَمُوتُ وَالْوَلَدُ يَتَحَرَّكُ فِي بَطْنِهَا أَيُشَقُّ عَنْهَا؟
قَالَ: لَا ، كَسْرُ عَظْمِ الْمَيِّتِ كَكَسْرِهِ حَيًّا ." [2]

یعنی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کی رو سے پیٹ چاک کر کے بچہ نکالنے کو حرام قرار دیا ہے۔

علامہ رشید رضا مصری اس کے حواشی میں رقمطراز ہیں: "اس حدیث سے علی الاطلاق ترک جنین پر استدلال جائز نہیں ہے کیونکہ حدیث کا مقصد میت کی لاش کو بے حرمتی سے بچانا ہے یعنی لاش کی بے حرمتی کے لئے ہڈی وغیرہ توڑنا (مثلہ کرنا) حرام ہے۔ اور عمل جراحی بے حرمتی کے تحت نہیں آتا اور پھر بعض اوقات وہ بچہ زندہ بھی رہتا ہے لہٰذا یہ طبی عمل بلاشبہ جائز ہے۔"

اسی طرح زندہ آدمی کی مصلحت کے پیش نظر سوال میں مذکورہ اشیاء کی منتقلی کا بھی جواز ممکن ہے بشرطیکہ ان سے استفادہ کا ظن غالب ہو۔ سعودی عرب کی ہیئت کبار العلماء (علماء کی سپریم کونسل) نے بھی اکثریت سے مردہ کے اعضاء کی منتقلی کے جواز کا فتویٰ صادر کیا ہے۔ قرار رقم ۶۲ تاریخ ۲۵/۱۰/۱۳۹۸ "مجلة البحوث الإسلامية" عدد ۱۴ ص ۶۸-۶۷ نص کلمات کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں: مطالعہ بحث و تمحیص اور باہمی تبادلۂ خیالات کے بعد علماء کے اجلاس میں اکثریت کے ذریعے درج ذیل فتویٰ طے پایا:

---

[1] (٤٨٨) المحلی (٣٩٥/٣) رقم المسألة (٦٠٧).

[2] (٤٨٩) انظر الرقم المسلسل (٤٩١)

① کسی انسان کی موت کا تعین ہو جانے کے بعد اس کی آنکھ کے ڈھیلے کو منتقل کر کے کسی ایسے مسلمان کی آنکھ میں پیوند کرنا جائز ہے جو مجبور ہو اور پیوند کاری کے اپریشن کی کامیابی کے بارے میں ظن غالب ہو بشرطیکہ میت کے ورثاء کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔ اس کی اجازت اس قاعدے کی رو سے ہے جس میں دو مصلحتوں میں سے بہترین مصلحت کے حصول کو مدنظر رکھنے، دو مضرت رساں چیزوں میں سے کمتر ضرر والی کو اختیار کرنے اور زندہ انسان کی مصلحت کو مردہ شخص کی مصلحت پر مقدم کرنے کا تحقق پایا جاتا ہے کیونکہ اس عمل میں یہ امید پائی جاتی ہے کہ زندہ شخص میں دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی جب کہ پہلے اس میں یہ صلاحیت مفقود تھی۔ اس سے نہ صرف یہ کہ وہ شخص خود استفادہ کر سکے گا بلکہ اس میں پوری امت کو فائدہ پہنچنے کا امکان موجود ہے۔ اور جس مردہ شخص سے یہ آنکھ لی گئی ہو اس کے (بدن) میں کوئی کمی بھی واقع نہیں ہو گی۔ کیونکہ اس کی آنکھ کو بالآخر مٹی کے ساتھ مٹی ہو کر برباد ہو جانا ہے اور آنکھ کو منتقل کرنے کے عمل میں بظاہر کوئی مثلہ (قطع و برد) بھی نہیں پایا جاتا کیونکہ اس کی آنکھ بند ہو چکی ہے اور اس کے دونوں پپوٹے اوپر تلے مل گئے ہیں۔

② جس انسان کی آنکھ کے بارے میں طبی رپورٹ کی رو سے یہ طے کیا گیا ہو کہ اس کا باقی رکھنا خطرے کا باعث ہے تو ایسی آنکھ کے صحیح و سالم ڈھیلے کا انتقال اور اسے کسی دیگر مجبور انسان کی آنکھ میں پیوند کرنا ناجائز ہے کیونکہ دراصل اس آنکھ کو اس سے نکالا گیا ہے تاکہ اس آنکھ والے شخص کی صحت کی حفاظت کی جا سکے۔ چنانچہ ایسے ڈھیلے کو منتقل کرنا اور کسی دیگر شخص کی مصلحت کی خاطر اس کی آنکھ میں پیوند کرنا مذکور شخص کے لئے قطعاً نقصان دہ نہیں۔ چنانچہ شریعت اور انسانیت اسی بات کی متقاضی ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق دینے والا ہے۔ وَ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِه وَ صَحْبِه وَسَلَّمَ

(نامور علماء کمیٹی، بورڈ آف دی گریٹ سکالرز)

آنکھ پر دیگر انسانی اعضاء کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ تیز خون وغیرہ دینے کا معاملہ نسبتاً سہل ہے لہٰذا یہ بطریق اولیٰ جائز ہے۔

سوال: کیا موجودہ حالات میں جب کہ یونیورسٹی اور کالج میں مخلوط تعلیم کا رواج ہے۔ کسی اہل حدیث کے لئے ان مخلوط اداروں میں تعلیم حاصل کرنے یا پڑھانے میں گناہ تو نہیں؟

جواب: فہم و بصیرت سے بہرہ ور اور شرعی احکام و مسائل سے واقف کار انسان کے لائق نہیں کہ اپنی اولاد کو

مخلوط اداروں میں تعلیم دلائے۔ دراصل ایسے ادارے قوموں کی تعمیر و ترقی میں حصہ دار بننے کے بجائے اخلاقی بگاڑ اور شیطانی معاونت کے مؤثر ترین ہتھیار ہیں جن کے نتائج و ثمرات اخلاقی پستی کی صورت میں ظاہر ہونا ایک لازمی امر ہے۔ بہرصورت دین و ایمان کی سلامتی کی خاطر ان سے بچنا ضروری ہے۔

سوال: بچوں کی اچھی تربیت کرنے کی وجہ سے برتھ کنٹرول کی کونسی صورت جائز ہے۔ آپریشن انجکشن یا مرد کا عزل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اچھی تربیت سے مقصود اگر کم بچے ہیں یہ تو درست نہیں کیوں کہ احادیث میں تکثیر اولاد کی ترغیب ہے۔ بوقت ضرورت فعل ''عزل'' مَعَ الکَرَاھۃ درست ہے۔ دوسرے سوال میں ذکر کردہ صورتوں سے اقرب الی الجواز معلوم ہوتی ہے۔ عزل کی تعریف:

'' اَلنَّزْعُ بَعْدَ الْإِیْلَاجِ لِیَنْزِلَ خَارِجَ الْفَرْجِ . ''

سوال: اولاد میں ۲ یا ۳ سال کا وقفہ کرنے کا اقدام کیسا ہے؟ جب کہ نیت یہ ہو کہ بچے کی تربیت بہتر ہو جائے، اور صحت بھی اتنی مشقت اٹھانے کی ہر سال متحمل نہ ہو؟ کیونکہ آج کل قدرتی وقفہ بالکل نہیں ہوتا؟

جواب: عورت کی صحت کے پیش نظر اولاد میں عارضی وقفہ کا جواز ہے کیوں کہ اسلام نے کراہت کے ساتھ بوقت ضرورت عزل (بوقت انزال علیحدہ ہو جانا) کی اجازت دی ہے۔ فرمایا:

« كُنَّا نَعْزِلُ وَالْقُرْآنُ يَنْزِلُ .» (متفق علیه) وَ زَادَ مُسْلِمٌ : « فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يَنْهَنَا. »[1]

یعنی ''ہم اس دور میں عزل کرتے جب کہ قرآن اترتا تھا۔'' یہ روایت بخاری اور مسلم کی ہے اور مسلم نے یہ الفاظ زیادہ کئے۔ ''پس اس کی خبر نبی ﷺ کو پہنچی تو ہم کو منع نہ کیا۔''

اسی طرح دیگر عارضی ذرائع اختیار کرنے کا بھی بظاہر کوئی حرج نہیں بشرطیکہ عورت کی کمزوری پیش نظر ہو۔ مسئلہ ہذا پر تفصیلی گفتگو پہلے ''الاعتصام'' میں شائع ہو چکی ہے۔ (جلد ۴۶ شمارہ ۴۴)

سوال: اپنی زندگی میں اپنے جسمانی اعضاء وقف کر جانا مثلاً میری آنکھیں، گردے وغیرہ میرے مرنے کے بعد ان اعضاء سے محروم لوگوں کو لگا دیئے جائیں۔ آیا جائز ہے؟

---

[1] (۴۹۰) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب العزل (۵۲۰۷، ۵۲۰۸) صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب حکم العزل (۳۵۵۶ إلی ۳۵۵۹).

جب کہ مردے کے اعضاء اس کے کسی کام کے نہیں۔ وہ مٹی میں مٹی ہو جائیں گے جب کہ دوسری طرف ایک جان کو فائدہ ہو جائے گا۔

جواب: انسانی اعضاء اللہ کی امانت ہیں۔ انسان کو ان میں تصرف کا اختیار نہیں۔ اسی بناء پر خودکشی حرام ہے۔ اعضاء کی منتقلی سے دوسرے کو فائدہ پہنچانا غیر درست ہے کیونکہ میت کو گزند پہنچانا کبیرہ گناہ ہے۔ یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ نے قبروں پر بیٹھنے، تکیہ لگانے سے منع فرمایا ہے۔ اس سے میت کا احترام مقصود ہے ایک حدیث میں ہے:

« إِنَّ كَسْرَ عَظْمِ الْمَيِّتِ كَكَسْرِهِ حَيًّا يعني فِي الْإِثْمِ .» [1]

یعنی ''گناہ میں میت کی ہڈی توڑنا اس طرح ہے جس طرح زندہ کی توڑنا ہے۔'' ابوداؤد ابن ماجہ، ابن القطان نے کہا۔ اس کی سند حسن درجہ کی ہے۔

سوال: انجکشن کے ذریعے گائے یا بھینس وغیرہ میں بچوں کی پیدائش کا طریقہ کیا ہے؟ جائز ہے یا نہیں؟

جواب: بوقت ضرورت گائے اور بھینس وغیرہ کو انجکشن کے ذریعہ حاملہ کرنا جائز ہے۔

سوال: انجکشن لگا کر بھینس، گائے وغیرہ سے دودھ حاصل کرنا (دوہنا) جائز ہے یا حرام؟ دلیل کے ساتھ وضاحت کریں۔

جواب: بوقت ضرورت انجکشن کے ذریعہ بھینس گائے وغیرہ کے دودھ کو حاصل کرنے کا جواز ہے۔ بشرطیکہ مالک نے جانور کو چارہ کا حق پورا ادا کیا ہو۔ کتب احادیث میں موجود ہے کہ نبی ﷺ سے ایک اونٹ نے شکایت کی تھی کہ مالک چارہ کم دیتا ہے اور کام زیادہ لیتا ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے مالک کو تنبیہ فرمائی تھی۔ [2]

ملاحظہ ہو: (مشکوٰۃ باب المعجزات)

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حق کی ادائیگی کی صورت میں انسان ہر ممکنہ صورت میں جانور سے اپنا حق وصول کر سکتا ہے کیونکہ دودھ جو انسانی خوراک کا اہم ترین جز ہے۔ قرآن مجید میں رب العزت نے اسے بطور

---

[1] (٤٩١) صححه الألباني، أحمد (٦/٥٨، ١٦٨) ح (٢٤١٨٩) وقال محققه حمزة: إسناده صحيح. صحيح أبي داؤد، كتاب الجنائز، باب في الحفار يجد العظم هل يتنكب ذلك المكان (٣٢٠٧) عن عائشة. وابن ماجه (١٦١٦) عنها وعن أم سلمة رضي الله عنهما. الارواء (٧٦٣).

[2] (٤٩٢) صححه الألباني بشواهده. شرح السنة (١٣/٢٩٥)، (٣٧١٨)، احمد (٤/١٧٣)، (١٧٤٩٥)، والمشكاة، كتاب الفضائل والشمائل (٥٩٢٢).

امتنان واحسان بیان فرمایا ہے:

﴿ وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُّسْقِيكُمْ مِّمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ . ﴾ (النحل:٦٦)

''اور تمہارے لئے چارپایوں میں بھی مقام عبرت وغور ہے کہ ان کے پیٹوں میں جو گوبر اور خون ہے۔اس کے درمیان سے ہم تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لئے خوشگوار ہے۔''

سوال: محترم جناب حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب!..........السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

''الاعتصام'' مورخہ یکم جولائی ۱۹۸۴ء میں عزل کے متعلق آپ کا فتوی شائع ہوا۔ غالبًا اس سے قبل بھی آپ اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار فرما چکے ہیں تاہم میرے ذہن میں کچھ خلش ہے جسے دور فرما کر عند اللہ ماجور ہوں إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيْ مِنَ الْحَقِّ۔

زید نے اپنی رفیقہ حیات سے عزل کے بارے میں بات کی۔اس نے زید سے اختلاف کرتے ہوئے کہا یہ مانع حمل اور ممنوع فعل ہے۔ زید کہنے لگا یہ جائز ہے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فرمان ہے کہ نزول قرآن کے دور میں ہم عزل کیا کرتے تھے۔ زید کا خیال تھا کہ اگر یہ فعل ناجائز ہوتا تو آسمان سے اس کے متعلق کوئی نہ کوئی حکم ضرور نازل ہوتا۔ یہ سن کر اس کی اہلیہ کہنے لگی کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ عزل خفیہ طور پر قتل اولاد ہے۔ممکن ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کا فرمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ممانعت سے پہلے کے دور سے متعلق ہو لہٰذا جب تک تم واضح طور پر اس کو جائز اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تنسیخ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی دوسرے فرمان سے ثابت نہیں کرو گے میں نہیں مانوں گی کیوں کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ . ﴾ (الأنعام:١٤٠)

''گھاٹا پا گئے وہ لوگ جنہوں نے نادانستہ طور پر اپنی اولاد کو قتل کیا۔''

زید نے اپنی بیوی کو اس کی بیماری کی طرف متوجہ کر کے عزل کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا کہ اب ڈاکٹروں کے بقول بچے کی پیدائش تمہارے لئے جان لیوا ثابت ہوسکتی ہے مگر وہ کہتی ہے کہ میں اپنی جان کی خاطر دوسری جان کا حق زندگی تلف کر کے کیوں اخروی ناکامی مول لے لوں تم چاہو تو عقد ثانی کر لو۔ زید جو صاحب عیال ہے اور کسی بھی صورت عقد ثانی کا خواہشمند نہیں۔ نہ ہی اسے صرف ایک خاص وجہ سے پسند کرتا ہے ''لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى: ﴿ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ . ﴾'' کیوں کہ اس کے خیال میں باوجود کوشش کے انصاف کا دامن اس کے ہاتھ

سے نکل جائے گا۔ اور عذاب الٰہی کا مستوجب ٹھہرے گا۔

اندریں حالات شرع متین کی روشنی میں بتایئے کہ زید اور اس کی زوجہ میں کس کا نظریہ درست اور راجح ہے تاکہ دنیا کی زندگانی سے بھرپور انداز میں لطف اندوز بھی ہوسکیں۔ اور آخرت میں عتاب الٰہی سے بالکل محفوظ رہیں۔

جواب: حضرت جابر [1] اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما [2] وغیرہ سے مروی روایات واضح طور پر عزل (بوقت انزال علیحدگی) کے جواز پر دال ہیں۔ لیکن یہ جواز دو وجہ سے اولویت کے منافی ہے۔

اولاً: جماع عورت کا حق ہے۔ فعل ہذا کے ارتکاب سے لذت جماع میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اس بناء پر اہل علم کا کہنا ہے کہ اس کا جواز عورت کی اجازت پر موقوف ہے۔ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" لَا خِلَافَ بَيْنَ الْعُلَمَاءِ أَنَّه لَا يُعْزَلُ عَنِ الزَّوْجَةِ الْحُرَّةِ إِلَّا بِإِذْنِهَا لِأَنَّ الْجِمَاعَ مِنْ حَقِّهَا وَلَهَا الْمُطَالَبَةُ بِهَا وَلَيْسَ الْجِمَاعُ الْمَعْرُوفُ إِلَّا مَا لَا يَلْحَقُهُ عَزْلٌ ."

(فتح الباری، ۹/۳۰۸)

یعنی "اہل علم کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ آزاد عورت سے عزل اس کی اجازت سے ہونا چاہیے کیونکہ جماع عورت کا حق ہے وہ اس کا مطالبہ کرسکتی ہے اور معروف جماع وہی ہے جس میں عزل نہ ہو۔"

اس کے باوجود شوافع کا اس میں اختلاف موجود ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جماع میں عورت کا اصلاً کوئی حق نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے تکثیر نسل میں کمی واقع ہوتی ہے جو شریعت کا مطلوب ہے۔ البتہ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے جذامہ بنت وہب رضی اللہ عنہا کی حدیث:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنِ الْعَزْلِ فَقَالَ: «ذٰلِكَ الْوَأْدُ الْخَفِيُّ»» [3]

---

[1] (۴۹۳) صحیح مسلم (۳۵۵۶إلی ۳۵۵۸)،عبد الرزاق (۱۴۰/۷)(۱۲۵۴۹) وصحیح أبی داؤد ،کتاب النکاح ،باب ما جاء فی العزل(۲۱۷۳).

[2] (۴۹۴) صحیح البخاری (۵۲۱۰)وعبد الرزاق (۱۴۰/۷)،صحیح مسلم ،(۳۵۴۴) وعن سعد بن أبی وقاص. صحیح مسلم(۳۵۶۷).

[3] (۴۹۵) صحیح مسلم ،کتاب النکاح ،باب جواز الغیلة ......وکراهة العزل(۳۵۶۵). المحلی لابن حزم (۲۲۲/۹- ۲۲۴) رقم المسألة (۱۹۰۳).

یعنی ''نبی ﷺ سے عزل کے بارے میں سوال ہوا تو جوابًا فرمایا: یہ خفیہ زندہ درگور کرنا ہے''
کی بناء پر وطی کو واجب اور عزل کو حرام قرار دیا ہے، لیکن ان کا یہ نظریہ درست نہیں ہے۔ چنانچہ ترمذی اور نسائی میں حدیث ہے: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہماری کچھ لونڈیاں تھیں اور ہم ان سے عزل کرتے تھے۔ یہود نے کہا یہ تو چھوٹا زندہ درگور کرنا ہے۔ یعنی زندہ اولاد کے بالمقابل پس آپ ﷺ سے دریافت ہوا تو فرمایا: یہود جھوٹے ہیں اگر اللہ مخلوق پیدا کرنی چاہے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ ❶

امام بیہقی رحمہ اللہ نے رفع تعارض کی صورت یہ اختیار کی ہے کہ جذامہ کی حدیث کراہت تنزیہی پر محمول ہے اور بعض نے جذامہ کی حدیث کو ضعیف قرار دینے کی سعی کی ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَالْحَدِيْثُ صَحِيْحٌ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَالْجَمْعُ مُمْكِنٌ ."

یعنی ''بلاشبہ حدیث صحیح ہے اور متعارض حدیثوں میں تطبیق و جمع ممکن ہے۔''

اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ حدیث منسوخ مگر تاریخ معلوم نہ ہونے کی بناء پر اس پر نسخ کا حکم نہیں لگ سکتا۔ امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: احتمال ہے کہ حدیث جذامہ آپ ﷺ نے اہل کتاب کی موافقت میں فرمائی ہو۔ کیونکہ غیر مامور بہ امور میں آپ اہل کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے۔ بعد میں اللہ نے اس کے حکم سے آگاہ فرمایا تو یہود کی تکذیب کر دی۔ لیکن ابن رشد اور پھر ابن العربی نے اس کا تعاقب یوں فرمایا ہے کہ آپ ﷺ یہود کی پیروی میں کسی بات کو بالجزم بیان کریں اور پھر اسی امر میں ان کی تکذیب کی بھی تصریح کر دیں یہ کیسے ہو سکتا ہے! بحث کے اختتام پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" وَجَمَعُوْا أَيْضًا بَيْنَ تَكْذِيْبِ الْيَهُوْدِ فِيْ قَوْلِهِمْ: الْمَوْؤُدَةُ الصُّغْرٰى وَ بَيْنَ إِثْبَاتِ قَوْلِهِمْ: وَأْدًا خَفِيًّا فِى حَدِيْثِ جَذَامَةَ بِأَنَّ قَوْلَهُمْ: الْمَوْؤُدَةُ الصُّغْرٰى يَقْتَضِيْ أَنَّهُ وَأْدٌ ظَاهِرٌ لٰكِنَّهُ صَغِيْرٌ بِالنِّسْبَةِ إِلٰى دَفْنِ الْمَوْلُوْدِ بَعْدَ وَضْعِهِ حَيًّا فَلَا يُعَارِضُ قَوْلَهُ: أَنَّ الْعَزْلَ وَأْدٌ خَفِيٌّ فَإِنَّهُ يَدُلُّ عَلٰى أَنَّهُ لَيْسَ فِيْ حُكْمِ الظَّاهِرِ أَصْلًا فَلَا يُتَرَتَّبُ

❶ (٤٩٦) صحيح الألباني ، صحيح ابى داؤد، كتاب النكاح ، باب ما جاء فى الغسل(١٩٠٣) ، عن ابى سعيد، صحيح الترمذى، ايضاً(١١٥١) عن جابر و آداب الزفاف (ص١٣٠) و قال الألباني۔رواه احمد (٣٣/٣، ٥١، ٥٣) بسند صحيح و له شاهد من حديث ابى هريرة اخرجه ابو يعلى (٢٨٤/١) و البيهقى (٢٣٠/٧)

عَلَيْهِ حُكْمٌ، وَ إِنَّمَا جعلَهُ وَأْدًا مِنْ جِهَةِ اشْتِرَاكِهِمَا فِي قَطْعِ الْوِلَادَةِ وَقَالَ بَعْضُهُمْ: قَوْلُهُ: اَلْوَأْدُ الْخَفِيُّ وَرَدَ عَلٰى طَرِيْقِ التَّشْبِيْهِ لِأَنَّهٗ قَطْعُ طَرِيْقِ الْوِلَادَةِ قَبْلَ مَجِيْئِهٖ فَأَشْبَهَ قَتْلَ الْوَلَدِ بَعْدَ مَجِيْئِهٖ. قَالَ ابْنُ الْقَيِّمِ:اَلَّذِيْ كَذَبَتْ فِيْهِ الْيَهُوْدُ زَعْمُهُمْ أَنَّ الْعَزْلَ لَا يُتَصَوَّرُ مَعَهُ الْحَمْلُ أَصْلًا وَ جَعَلُوْهُ بِمَنْزِلَةِ قَطْعِ النَّسْلِ بِالْوَائِدِ فَأَكْذَبَهُمْ وَأَخْبَرَ أَنَّه لَا يَمْنَعُ الْحَمْلَ إِذَا شَاءَ اللّٰهُ خَلْقَهٗ وَإِذَا لَمْ يُرِدْ لَمْ يَكُنْ وَأْدًا حَقِيْقَةً وَ إِنَّمَا سَمَّاهُ وَأْدًا خَفِيًّا فِيْ حَدِيْثِ جَذَامَةَ لِأَنَّ الرَّجُلَ إِنَّمَا يَعْزِلُ هَرَبًا مِّنَ الْحَمْلِ فَأَجْرٰى قَصْدَه لِذٰلِكَ مَجْرَى الْوَأْدِ لٰكِنَّ الْفَرْقَ بَيْنَهُمَا أَنَّ الْوَأْدَ ظَاهِرُهٗ بِالْمُبَاشَرَةِ اجْتَمَعَ فِيْهِ الْقَصْدُ وَالْفِعْلُ وَالْعَزْلُ يَتَعَلَّقُ بِالْقَصْدِ صَرْفًا فَلِذٰلِكَ وَخَصَّهٗ بِكَوْنِهٖ خَفِيًّا.'' (فتح الباری ۳۰۹/۹)

عبارت ہذا کا مفہوم یہ ہے:

تعارض:

اس مقام پر دو احادیث کے درمیان ظاہری تعارض کا حل پیش کیا گیا ہے۔ پہلی وہ حدیث جس میں رسول اللہ ﷺ نے یہود کی تکذیب فرمائی ہے۔ یہود کا کہنا تھا کہ عزل ''موؤدۃ صغریٰ'' (یعنی وأد صغیر چھوٹا زندہ درگور کرنا) ہے تو آپ ﷺ نے انہیں جھوٹا قرار دیا۔ دوسری حدیث وہ جس میں آپ نے فرمایا: ''عزل''، ''وأد خفی'' ہے یعنی ایک حدیث میں ''عزل'' کو ''وأد صغیر'' کہنے کی نفی ہے اور دوسری حدیث میں ''عزل'' کو ''وأد خفی'' کہنے کا اثبات ہے۔

رفع تعارض:

تو علماء نے ان دونوں احادیث کے درمیان تطبیق یہ دی کہ یہود کی تکذیب اس لئے کی کہ ان کی بات کی رو سے یہ حقیقی اور ظاہری ''وَأْد'' ہے مگر مولود کو زندہ دفن کرنے کی نسبت ذرا کم ہے۔ نتیجتاً اس وعید کے تحت آتا ہے کہ ﴿وَإِذَا الْمَوْءُ دَةُ سُئِلَتْ.﴾ اور جو نبی ﷺ نے یہ فرمایا ہے: ((إِنَّ الْعَزْلَ وَأْدٌ خَفِيٌّ.)) یہ جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ عزل ظاہری (یعنی حقیقی) ''وَأْد'' ہے ہی نہیں کہ اس پر کوئی حکم یا وعید مترتب ہو مگر چونکہ مولود کو زندہ دفن کرنا اور عزل کرنا دونوں کا نتیجہ ''قَطْعُ الْوِلَادَة'' ہے۔ لہٰذا اس اشتراک کی وجہ سے اسے ''وَأْد'' قرار دیا۔ جب کہ حقیقی ''وَأْد'' نہیں ہے۔ تبھی تو اسے ''وَأْد'' خفی فرمایا۔

چنانچہ دونوں احادیث باہم متعارض نہ رہیں۔

دیگر تطبیق:

بعض نے کہا ہے کہ عزل پر ''وَأْد'' کا اطلاق باہمی مشابہت کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ کیونکہ عزل میں مولود کے پیدا ہونے سے پہلے ولادت کے ذریعے کو قطع کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ مولود کے پیدا ہو جانے کے بعد اسے قتل کر دینے کے مشابہ ہوا۔ ''لہٰذا عَلٰی وَجهِ التَّشْبِيه'' عزل کو ''وَأْد'' قرار دیا ''عَلٰی وَجهِ الْحَقِيقَة'' نہیں۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ کی توجیہ:

امام ابن قیم رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو اس لئے جھوٹا قرار دیا کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ عزل کی صورت میں حمل قرار نہیں پا سکتا۔ یعنی عزل حمل سے مانع ہے اور ان کے نزدیک یہ قطع نسل کے سلسلے میں ویسے ہی ہے جیسے زندہ دفن کرنا۔ لہٰذا آپ نے انہیں جھوٹا قرار دیا۔ اور خبر دی کہ عزل حمل سے مانع نہیں بلکہ اللہ چاہے تو اسے پیدا کر دے اور اگر اللہ اسے پیدا کرنے کا ارادہ ہی نہ کرے تو وہ ''وَأْد حقیقی'' نہ رہا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جذامہ کی روایت میں اسے ''وَأْد خفی'' کا نام اس لئے دیا کیونکہ عزل کرنے والا اس لئے عزل کرتا ہے تاکہ حمل نہ قرار پائے یعنی وہ حمل سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس کے ارادہ اور قصد کو ''وَأْد'' کے قائم مقام قرار دیا لیکن دونوں میں فرق واضح ہے اور وہ یہ کہ حقیقی ''وَأْد'' وہ ہوتا ہے کہ جس میں انسان کا ارادہ بھی شامل ہو اور براہ راست ''وَأْد'' کے فعل کا بھی ارتکاب کرے جب کہ عزل کا تعلق خالص ارادہ اور قصد سے ہوتا ہے اس وجہ سے اسے ''وَأْد خفی'' کہا ہے۔

شیخنا علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب: (آدابُ الزِّفَافِ فِي السُّنَّةِ الْمُطَهَّرَةِ، ص ۵۵ طبع ۳) میں مذکور تطبیق کو خوب پسند فرمایا ہے۔ اس سے سائل کے بھی جملہ اشکالات کا ازالہ بطریق احسن ہو جاتا ہے۔ نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فرامین کا تعلق جملہ عہد نبوت سے ہے۔ تخصیص کی کوئی دلیل نہیں۔ اصول حدیث میں مدون نسخ کی صورتوں (نص میں نسخ کی تصریح، تاریخ کا علم، جمع ناممکن ہو، صحابی کی وضاحت وغیرہ) میں سے کوئی صورت بھی اس پر منطبق نہیں ہوتی۔ بالخصوص جب کہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم:

«اِعْزِلْ عَنْهَا اِنْ شِئْتَ» ❶

''اگر چاہو تو عزل کر لو۔''

---

❶ (۴۹۷) صحیح مسلم کتاب النکاح (۳۵۵۶).

میں اذن ماثور ہے۔لہٰذا جمع و تطبیق ہی اصل ہے۔ کما تقدم ،وَاللّٰهُ اَعْلَمُ.

سوال: بیل سانڈ بکرے وغیرہ، جو جانور خصی کئے جاتے ہیں ان کی کیا دلیل ہے۔مسلم و غیرمسلم دونوں خصی کر سکتے ہیں؟ کوئی مسلمان بھی یہ کام کرسکتا ہے وضاحت فرمائیں؟

جواب: جانوروں کوخصی کرنے کے بارے میں اہل علم کے دو متضاد اقوال ہیں۔ایک گروہ منع کا قائل ہے جب کہ دوسرا گروہ عملی جواز کا قائل ہے۔

اول الذکر طائفہ کے دلائل بالاختصار حسب ذیل ہیں۔

① قرآن مجید میں شیطان کا قول ہے:

﴿ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ . ﴾ (النساء:١١٩)

''اور (یہ بھی) کہتا رہوں گا کہ وہ اللہ کی بنائی صورتوں کو بدلتے رہیں۔''

زیرآیت ہذا امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''مفسرین کی ایک جماعت بشمول عکرمہ کا کہنا ہے، مراد اس سے خصی کرنا، گودنا اور کان کاٹنا ہے اور بعض اہل علم نے خصی کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔''

(معالم التنزيل ٤٨٢/١)

نیز حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس سے مقصود جانوروں کا خصی کرنا ہے۔'' یہی رائے درج ذیل اسلاف کی ہے:ابن عمر، انس، سعید بن مسیّب،عکرمہ، ابن عباس (رضی اللہ عنہم)،قتادہ، ابوصالح رحمہ اللہ اور ثوری رحمہ اللہ۔(٦١٢/١)

② حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دم گھونٹنے اور جانوروں کو خصی کرنا سختی سے منع فرمایا ہے۔❶ (رواہ البزار) امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس پر صحت کا حکم لگایا ہے۔

③ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ماثور ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹوں، گایوں ، بھیڑ بکریوں، اور گھوڑوں کوخصی کرنے سے منع فرمایا ہے۔❷ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ❸ افزائش نسل کا دارومدار اسی پر ہے۔کوئی

---

❶(٤٩٨) صححه ابن حجرو الهيثمي والشوكاني، مختصر زوائد مسند بزار (١٢٨٢)،النيل(٤٢٤/٨).

❷(٤٩٩) حسنه الألباني بشواهده فى غاية المرام تحت الحديث (٤٨٢) وصحيح الجامع الصغير (٦٩٥٧) وضعفه البيهقي والشوكاني و أحمد شاكر لِأجل"عبدالله بن نافع "فقط البيهقي (٢٤/١٠)شرح معاني الآثار (٣١٧/٤)للطحاوي واحمد (٢٤/٢(٤٧٦٩) شاكر) نيل(٤٢٤/٨).

❸(٥٠٠)صححه الألباني.عن نافع عن ابن عمر قال : ......الخ موقوفاً .عبدالرزاق (٤٥٦/٤) والبيهقي (٢٤/١٠) وغاية المرام تحت الحديث (٤٨٢).

بھی مادہ نر کے بغیر اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتی۔ (شرح معانی الآثار) .

④ ''مصنف ابن ابی شیبہ'' میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے۔[1] جانوروں کا خصی کرنا مثلہ کے حکم میں ہے پھر دلیل میں مذکور آیت پیش کی۔ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی عدم جواز پر اپنی مروی روایت اور مذکورہ بالا آیت سے استدلال کیا ہے۔

ان دلائل کے جواب میں ثانی الذکر فریق کا کہنا ہے کہ: ﴿ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلۡقَ اللّٰهِ. ﴾ کی تفسیر میں جانوروں کو خصی کرنے کی بات کسی صحیح یا ضعیف روایت سے مرفوعًا ثابت نہیں، اور جہاں تک سلف کی ایک جماعت کا تعلق ہے کہ اس نے آیت ﴿ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلۡقَ اللّٰهِ. ﴾ سے خصی کرنا سمجھا ہے جب کہ ان کے بالمقابل دوسری جماعت نے «خَلۡقَ اللّٰهِ» سے اللہ کا دین مراد لیا ہے۔ چنانچہ امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصری، مجاہد، قتادہ، سعید بن میسیب اور ضحاک (رحمہم اللہ) نے اس کی تفسیر دین اللہ سے کی ہے اور نظیر میں دوسری آیت: ﴿ لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ . ﴾ پیش کی ہے۔ اور ''خَلۡقَ اللّٰهِ'' کا معنی دین اللہ بتایا ہے۔ یعنی حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرانا اور حافظ ابن کثیر نے بھی اپنی تفسیر میں قریبًا ایسی ہی وضاحت فرمائی ہے۔ جب آیت کی تفسیر میں دونوں قسم کے اقوال ہیں تو فیصلہ حتمی اور یقینی نہ ہوا۔ اور اگر سنت ثابتہ سے کوئی بات ثابت ہو تو انکار کی گنجائش نہ تھی، جس کا وجود یہاں ناپید ہے اور طحاوی کی روایت کمزور ناقابل استدلال ہے۔ اس میں راوی عبداللہ بن نافع ہے جو محدثین کے نزدیک ضعیف ہے اور ابن ابی شیبہ کی روایت میں ایک راوی مجہول ہے پھر ابن عباس رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے مرفوع نہیں۔ اگرچہ مسند بزار کی روایت جس کو امام شوکانی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے مطلقًا ممانعت پر دال ہے خواہ ''مَأۡکُوۡلُ اللَّحۡمِ'' جانور ہو یا ''غَیۡرُ مَأۡکُوۡلِ اللَّحۡمِ'' لیکن دیگر مرویات مثلًا ابوہریرۃ،[2] عائشہ، ابورافع، جابر بن عبداللہ اور ابودرداء (رضی اللہ عنہم) جواز پر مصرح ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قربانی کا ارادہ فرماتے تو بڑے فربہ سینگوں والے سفید خصی کردہ دنبے خریدتے۔''[3] (سنن ابن ماجه)

---

[1] (٥٠١) جامع البیان فی تفسیر النساء ،فیه جهالة ,والدر المنثور(٢/٦٨٩) للسیوطی.

[2] (٥٠٢) صححه الألبانی.صحیح ابن ماجه (٣١٢٢)، الإرواء (١١٣٨)، أحمد .(٢٢٠/٦) وقال حمزة: إسناده حسن.الحاکم،(٢٢٧/٤، ٢٢٨)وسکت عنه الذهبی.

[3] (٥٠٣) صححه الألبانی،صحیح ابن ماجه (٣١٢٢) ،أحمد ٢٢٠/٦ (٢٣٧٥٠)، الحاکم (٢٢٧/٤) وسکت عنه الذهبی.

ابورافع رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسفید خصی کردہ دنبوں کی قربانی کی۔ ❶

(مسند احمد، مسند اسحاق بن رَاهَوَیہ اور مُعْجَم طبرانی)

جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم دوسفید بڑے سینگوں والے خصی کردہ دنبے لائے اور ان میں ایک کو ذبح کیا۔فرمایا:

« بِسْمِ اللّٰهِ اللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُمَّ عَنْ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ. » ❷ (مسند ابن ابی شیبہ وغیرہ)

ان میں سے بعض طرق میں اگرچہ عبداللہ بن محمد بن عقیل کی وجہ سے کچھ کلام ہے لیکن علماء کی ایک جماعت نے ان پر اعتماد کا اظہار کیا ہے جیسے امام محمد، اسحاق بن راھویہ، حمیدی، امام بخاری، ترمذی اور ابن عدی (رحمہم اللہ) تہذیب، میزان اور خلاصہ میں ان ائمہ سے اس کی توثیق منقول ہے۔ علاوہ ازیں عبداللہ بن محمد بن عقیل کی روایت کے اور بھی شواہد ہیں جو اس روایت کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ملاحظہ ہو: (فتاویٰ عظیم آبادی)

نیز بعض علماء نے مختلف احادیث میں تطبیق یوں دی ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہو گوشت کو مزید اچھا بنانے کے لئے ان کو خصی کرنا جائز ہے۔ اور جب جانوروں کا کھانا قطعاً ممنوع ہے۔ ان کو خصی کرنا بھی ناجائز ہے۔ متقدمین میں سے طاؤس اور عطاء وغیرہ اور متاخرین کی اکثریت اسی بات کی قائل نظر آتی ہے۔

فیصلہ:

لہٰذا ترجیح اسی بات کو ہے کہ "مَاکُولُ اللَّحَمِ" جانوروں کو بوقت ضرورت خصی کرنا جائز ہے اور فاعل کے لئے مسلمان ہونا ضروری نہیں کیونکہ عمل ہذا عبادات کی قبیل سے نہیں جس میں اسلام شرط ہو۔ اس لئے مسلم و غیر مسلم سب برابر ہیں بالخصوص ایک مسلمان کے لئے عمل خصاء کرنے میں کوئی ممانعت نہیں اصلاً جواز ہے۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَاب وَ عِلْمُه أَتَمُّ.

سوال: اپنے ذاتی مسائل و وسائل کو سامنے رکھتے ہوئے وقت کے تقاضوں کے مطابق موجودہ بچوں کی صحیح طور پر تعلیم و تربیت کی خاطر کیا مزید بچے پیدا نہ کرنے کی گنجائش ہے؟ بے شک رزق اللہ دیتا ہے۔ اور بھوکوں

❶(٥٠٤) حسنه الشوكاني، النيل (١٣٣/٥)، الارواء(١١٣٨)، أحمد (٨/٦) ومثله عن أبي الدرداء رضي الله عنه، أحمد (١٩٦/٥).

❷(٥٠٥) حسنه الألباني،أبو داؤد، باب ما يستحب من الضحايا (٢٧٩٥)،الإرواء (١١٣٨) وابن ماجه (٣١٢١).

کوئی نہیں مرتا۔ مگر یہ بات مشاہدہ کی ہے کہ کم وسائل والے آدمی کی کثیر اولاد مناسب تعلیم وتربیت کی کمی یا نہ ہونے کی وجہ سے خود بھی ناگفتہ بہ حالت میں ہوتے ہیں۔ کیوں کہ حالات کے پیش نظر عمومی معیار زندگی بدل گیا ہے جو چیزیں کل کلاں عیش وعشرت کا سامان تھیں۔ آج ضروریات زندگی بن چکی ہیں۔ ان کا انکار کرنا مشکل امر ہے۔ کیونکہ انسان کو انسانوں کی طرح رہنے کا حق ہے مزید یہ کہ آسودگی میں انسان دین و مذہب پر بھی توجہ دیتا ہے کہ جہالت و افلاس نے منکر انسانوں کو شرک و گمراہی میں دھکیلا ہوا ہے۔ بے شک اس کے مقابلہ میں کثرت دولت بری چیز ہے جو عیاشی اور تکبر کو جنم دے کر انسانوں کو گمراہ کرتی ہے مگر سوال کا مدعا اوسط درجہ کی زندگی کے حصول کے متعلق ہے۔

جواب: اس طرح کی حیلہ سازی دراصل عقیدۂ توحید میں ضعف و کمزوری کی مظہر ہے۔ اللہ رب العالمین صرف انسان کا روزی رساں نہیں بلکہ ہر ذی روح اور متنفس کی روزی کا ذمہ اس نے پہلے روز سے لیا ہوا ہے۔ ہر جنس کو اس کی طبیعت کے مطابق رزق مہیا کر کے اپنے رزاق ہونے کا ثبوت ہر آن دے رہا ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ . ﴾

لیکن کمزور فطرت انسان ہے کہ اس کے دل و دماغ میں یہ بات سماتی نہیں۔ محدود وسائل پر عارضی تسلط کی وجہ سے اپنے کو رزاق سمجھ بیٹھا ہے۔ کمی اولاد کی صورت میں صحیح تعلیم و تربیت کا دعویٰ محض ایک مفروضہ ہے۔ جس کا حقیقت حال سے کوئی تعلق نہیں۔ لیل ونہار ہمارے مشاہدے میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں کہ کثرت اولاد کے باوجود انہوں نے اولاد کی تربیت میں مثالی کردار ادا کیا اور وہ بھی ہیں جن کی اولاد کم لیکن تعلیم وتربیت سے عاری۔

شریعت اسلامیہ میں تکثیر اولاد میں ترغیب کے نصوص سے یہ بات عیاں ہے کہ اسلام میں تحدید نسل کا کوئی تصور نہیں۔ راوی کا بیان ہے بصرہ میں حجاج کی آمد ۷۵ (ہجری) کے وقت حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حقیقی بچے ایک سو بیس سے اوپر فوت ہو چکے تھے۔ [1] (بَابُ مَنْ زَارَ قَوْمًا فَلَمْ يُفْطِرْ عِنْدَهُمْ.)

اور صحیح مسلم میں اسحاق بن ابی طلحہ کی روایت میں ہے۔ زندہ اولاد و احفاد سو کے قریب تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بایں الفاظ انس رضی اللہ عنہ کے لئے دعا کی تھی:

---

[1] (٥٠٦) صحيح البخاري، كتاب الصوم، باب من زار قوما......(١٩٨٢)، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل أنس رضي الله عنه(٦٣٧٦).

« اَللّٰھُمَّ ارْزُقْهُ مَالًا وَّوَلَدًا وَبَارِكْ لَهٗ » ❶

اس بناء پر ان کا باغ سال میں دو دفعہ ثمر آور ہوتا تھا۔ دراصل جب سے ہم میں فکر جہاد مفقود ہوئی ہے۔ اس وقت سے ہم کمی اولاد کی برکات کے وسوسوں میں مبتلا ہو گئے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جذبۂ سلیمانی علیہ السلام کو لے کر مسابقت کی راہ اختیار کرتے لیکن ہماری ترقی معکوس ہے۔ رب العزت سب کو سمجھ عطا فرمائے۔ پھر آسودگی کا دین و مذہب کی طرف توجہ کا باعث بننا محض خوش فہمی ہے۔ تاریخ اوائل اس کی نفی کرتی ہے۔

❀❀❀❀❀❀❀

---

❷ (۵۰۷) ایضاً

۲۶ قبروں اور قبرستان سے متعلقہ مسائل

سوال: قبروں پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا کیسا ہے؟

جواب: قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے۔ چنانچہ مسند احمد وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت بقیع میں تشریف لے گئے۔ وہاں جا کر کھڑے ہو گئے۔ پھر آپ نے ہاتھ اٹھائے (اور دعا کی) پھر واپس چلے آئے۔ ❶

نیز صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک دوسرے قصہ میں مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اہل بقیع کے پاس تشریف لے گئے۔ اور وہاں تین مرتبہ ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ ❷ لیکن داعی بوقت دعا قبروں کی طرف متوجہ نہ ہو بلکہ قبلہ رو کھڑے ہو کر دعا کرے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کی طرف متوجہ ہو کر نماز سے منع فرمایا ہے ❸ اور دعا ہی نماز کا لب لباب ہے۔ لہٰذا دعا بھی قبلہ رخ ہو کر ہی کی جائے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ دعا ہے کہ دعا کے کرنے والے کے لئے اس جانب متوجہ ہونا مستحب ہے جس جانب کہ وہ نماز میں متوجہ ہوتا ہے۔" (اقتضاء الصراط المستقیم، صـ ۱۷۵)

امام احمد بن حنبل اور امام مالک رحمہما اللہ فرماتے ہیں: "دعا کے وقت قبلہ کی جانب متوجہ ہونا ضروری ہے خواہ دعا کرنے والا "روضۃ الرسول" کے جوار میں کیوں نہ ہو۔" یہی مسلک ائمہ شوافع کا بھی ہے جس طرح کہ "شرح المہذب" نووی میں ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ جس کی تصریح "القاعدۃ الجلیلۃ" میں موجود ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر سلام کے وقت بھی توجہ الی القبلہ

---

❶ (۵۰۸) مؤطا للإمام مالك، كتاب الجنائز، جامع الجنائز، حديث الباب (۵۵)، احمد (۶/۹۲) شاكر و صححه.

❷ (۵۰۹) صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب ما يقال عند دخول القبور (۲۲۵۵)، (۲۲۵۶)

❸ (۵۱۰) صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب النهي عن الجلوس (۲۲۵۰).

ضروری قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ دعا میں ضروری ہے۔ البتہ عام حالات میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں قبلہ رخ اور غیر قبلہ رخ دونوں طرح دعا کو جائز قرار دیا ہے۔[1] چنانچہ فرماتے ہیں:" بَابُ الدُّعَاءِ غَيْرَ مُسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةِ " خطبہ جمعہ میں آنحضرت ﷺ کی دعا: « اَللّٰهُمَّ حَوَالَيْنَا وَلَا عَلَيْنَا.»[2] سے ان کا استدلال ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَوَجْهُ أَخْذِه مِنَ التَّرْجَمَةِ مِنْ جِهَةِ أَنَّ الْخَطِيبَ مِنْ شَأْنِهِ أَنْ يَسْتَدْبِرَ الْقِبْلَةَ وأَنَّهُ لَمْ يُنْقَلْ أَنَّه صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لَمَّا دَعَا فِي الْمَرَّتَيْنِ اِسْتَدَارَ وَقَدْ تَقَدَّمَ فِي الْاِسْتِسْقَاءِ مِنْ طَرِيْقِ إِسْحَاقَ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ عَنْ أَنَسٍ فِيْ هٰذِهِ الْقِصَّةِ. فِيْ آخِرِه "وَلَمْ يُذْكَرْ أَنَّه حَوَّلَ رِدَائَه وَلَا اسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ ." (فتح الباری ۱۴۳/۱۱)

اور دوسری تبویب یوں ہے کہ ''بَابُ الدُّعَاءِ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ ''[3] پھر ''حدیث الاستسقاء'' کے الفاظ سے استدلال ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فَأَشَارَ كَعَادَتِهِ إِلٰى مَا وَرَدَ فِيْ بَعْضِ الْحَدِيْثِ وَقَدْ مَضٰى فِي الْاِسْتِسْقَاءِ مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ بِلَفْظٍ : وَأَنَّهُ لَمَّا أَرَادَ أَنْ يَّدْعُوَ اسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَحَوَّلَ رِدَاءَهُ ."

اس بارے میں متعدد احادیث وارد ہیں۔ جن میں قبلہ رخ کا تعین ہے۔ صاحب ''فتح الباری'' نے ان کی نشاندہی کی ہے۔ پھر بحث کے اختتام پر فرماتے ہیں: ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو عبداللہ ذی النجادین کی قبر پر دیکھا۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

« فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ دَفْنِه اسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ رَافِعًا يَدَيْهِ .» (أَخرَجه أَبُو عَوَانَةَ فِيْ صَحِيْحِه)

یعنی ''جب آپ ﷺ عبداللہ ذی النجادین کے دفن سے فارغ ہوئے تو قبلہ رخ ہو کر آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے۔''

سوال: قبر پر نشانی لگانا کیسا ہے؟ مثلاً پتھر لگا دینا یا برتن گاڑ دینا؟ یا لکڑی گاڑ دینا؟ نام لکھنا وغیرہ؟

جواب: مباح چیز کے ساتھ قبر پر نشانی رکھنے کا کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی قبر پر پتھر رکھتے ہوئے فرمایا: ''اس سے میں اپنے بھائی کی قبر پہچان لوں گا اور ہمارے اہل میں سے جو فوت ہو

---

[1] (۵۱۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء غیر مستقبل القبلة (۶۳۴۲).

[2] (۵۱۲) ایضاً، کتاب الجمعة، باب الاستسقاء وفی الخطبة یوم الجمعة (۹۳۳)

[3] (۵۱۳) باب الدعاء مستقبل القبلة (۶۳۴۳).

گا اس کے قریب ہی دفن کروں گا۔"[1] (أبو داؤد)

البتہ حدیث "اَوْ یُکْتَبُ عَلَیْهِ"[2] کی بناء پر قبر پر کتبہ لگانا حرام ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ "الآثار" میں لکھتے ہیں: "قبر پر لکھنا یا کتبہ لگانا مکروہ (حرام) ہے۔"[3]

سوال: تدفین کے وقت قبر کے اندر رشتہ داروں کا ذرہ ذرہ مٹی جمع کر کے تھوڑی سی رکھنا کیسا ہے؟

جواب: بوقت دفن رشتہ داروں کا قبر کے اندر مٹی رکھنا محض رسم و رواج ہے۔ اس سے اجتناب ضروری ہے۔ حدیث میں ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِیْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ .»[4]

یعنی "جس نے دین میں اضافہ کیا وہ مردود ہے۔"

سوال: مزاروں پر اور فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا سلسلہ کب شروع ہوا؟

جواب: قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا سنت سے ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

" فَوَقَفَ فِیْ أَدْنَی الْبَقِیْعِ ثُمَّ رَفَعَ یَدَیْهِ."

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم بقیع کے پاس کھڑے ہو گئے پھر آپ نے ہاتھ اٹھائے (اور دعا کی) پھر واپس چلے آئے"۔[5] (أحمد (٦/٩٢) إسنادُه حَسَنٌ ۔المؤطا: ١/٢٣، ٢٤)

اور صحیح مسلم و احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک دوسرے قصہ میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اہل بقیع کے پاس تشریف لے گئے اور وہاں تین مرتبہ ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبداللہ ذی النجادین کی قبر میں دیکھا:

« فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ دَفْنِهِ اسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ رَافِعًا یَدَیْهِ .» (أخرجه أبو عَوَانَةَ فِیْ صَحِیْحِه)

---

[1] (٥١٤) حسنه الألبانی. صحیح أبی داؤد، کتاب الجنائز، باب فی جمع الموتی فی قبر والقبر یعلم(٣٢٠٦).

[2] (٥١٥) صححه الترمذی والألبانی والذهبی،أبواب الجنائز ،باب ما جاء فی کراهیة ......الکتابة علیها (١٠٦٤)،والإرواء (٧٥٧)بطریق عن أبی الزبیر عن جابر؛وانظر:تراجع العلامة الألبانی (صـ٣٠٣) (رقم الحدیث: (١٩٦)، الحاکم (١/٣٧٠).

[3] (٥١٦)کتاب الآثار، باب تسنیم القبور وتجصیصها(٢٥٦)بهذا اللفظ : ونکره أن یجصص،أو یطین،أو یجعل عنده مسجد أو علم أو یکتب علیه ویکره الآجر أن یبنی به... الخ.

[4] (٥١٧) صحیح البخاری، کتاب الصلح،باب إذا اصطلحوا علی صلح جور فالصلح مردود(٢٦٩٧).

[5] (٥١٨) مؤطا للإمام مالك ،کتاب الجنائز، جامع الجنائز،حدیث الباب (٥٥)،أحمد (٦/ ٩٢). صحیح إسناده أحمد شاکر.

''جب آپ ﷺ اس کے دفن سے فارغ ہوئے تو قبلہ رخ ہو کر دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔''

(بحوالہ فتح الباری(١١/١٤٤)

سوال: مسلمانوں کے قبرستان کی بے حرمتی گناہ ہے یا نہیں؟

جواب: قبروں کی بے حرمتی کرنا بلاشبہ گناہ ہے لیکن اس کے مباح الدم ہونے کی شریعت میں کوئی دلیل نہیں۔

سوال: اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی بلاوجہ یا بر بنائے دشمنی و انتقام قبر کھود ڈالے تو ایسے شخص کی شریعت اسلامیہ میں کیا سزا ہے؟

جواب: حکومت جو مناسب سمجھے بطور تعزیر سزا دے سکتی ہے۔

سوال: اگر کوئی شخص کسی شخص کو اپنی والدہ کی قبر کھودتے ہوئے دیکھے تو وہ اس شخص سے کیا سلوک کر سکتا ہے؟ کہاں تک اسے بدلہ یا سزا کا حق ہے اس سے قطع تعلق کرنا یا اس کو دل سے برا جاننا اور سزا دینا، انتقام لینا ان میں کیا بہتر ہے؟

جواب: ایسے شخص سے ہر ممکن طریقہ سے نفرت کا اظہار ہونا چاہیے اور اگر وہ تائب ہو جائے تو پھر رنجش دل سے نکال دینی چاہیے۔

سوال: عذاب قبر روح کو یا میت کو یا دونوں کو ہوتا ہے؟

جواب: نصوص سے ظاہر یہ ہے کہ عذاب قبر کا تعلق جسم اور روح دونوں سے ہے۔

سوال: ایک آدمی دنیاوی قبر کے عذاب کا منکر ہے۔ کہتا ہے کہ برزخی قبر میں عذاب ہوتا ہے اسی طرح مومن کی برزخی قبر کشادہ ہوتی ہے۔ دنیاوی قبر نہیں۔ یہ عقیدہ اسلام کی نظر میں کیسا ہے؟

جواب: دنیاوی قبر کا تعلق بھی اصلاً برزخ سے ہے۔ لہٰذا اس تفریق کی کوئی ضرورت نہیں۔ عذاب قبر ہر دو صورت میں برحق ہے۔ تاویل یا انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔

سوال: قبر میں میت سے تین مشہور سوال: مَنْ رَبُّكَ ؟ مَادِيْنُكَ ؟ مَنْ نَبِيُّكَ؟ کا پوچھا جانا صحیح حدیث سے ثابت ہے؟

جواب: ہاں یہ تینوں سوالات صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔[1] (رواہ أحمد و أبوداؤد قال الألبانی علی هامش مشكاة المصابيح :و إسناده صحيح ٤٨/١)

---

[1] (٥١٩) المشكاة(٤٧/١)للألبانی،وقال:إسناده صحيح.وقال البيهقی هذا حديث صحيح الإسناد. وقال المنذری: هذاحديث حسن كما فی المرعاة (٢٢٨/١).

سوال: قبر پر پھولوں کی چادر چڑھانا یا دیئے جلانا کیسا ہے؟

جواب: قبر پر پھولوں کی چادر چڑھانا کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

« مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ . »

(بخاری، كِتَابُ الصُّلح۔ بَابٌ إِذَا اصْطَلَحُوْا ......٢٦٩٧)

یعنی ''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

اہل مغرب کی تقلید میں

یہ قبیح رسم مسلمانوں میں داخل ہوئی ہے۔(أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ.)

اس کا مرتکب دین سے بے بہرہ جاہل اور غبی ہے۔ اور قبروں پر دیئے جلانے والا شریعت کی نگاہ میں لعنت کا مستحق ہے۔ ایک حدیث میں ہے: ''قبروں پر چراغ جلانے والے پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت کی ہے۔'' [1] (أبو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی)

اس حدیث کی تشریح میں صاحب المرعاۃ فرماتے ہیں:

" وَفِيْهِ رَدٌّ صَرِيْحٌ عَلَى الْقُبُوْرِيِّيْنَ الَّذِيْنَ يَبْنُوْنَ الْقُبَابَ عَلَى الْقُبُوْرِ وَيَسْجُدُوْنَ إِلَيْهَا وَ يَسْرُجُوْنَ عَلَيْهَا وَ يَضَعُوْنَ الزُّهُوْرَ وَالرَّيَاحِيْنَ عَلَيْهَا تَكْرِيْمًا وَ تَعْظِيْمًا لِأَصْحَابِهَا. " [2] (٤٨٦/١)

اس حدیث میں واضح تردید ہے ان قبوریوں کی جو قبروں پر قبے بناتے، ان کی طرف سجدے کرتے، ان پر چراغ جلاتے اور ان پر تعظیم واحترام کی خاطر پھول اور خوشبو رکھتے ہیں۔

سوال: آپ کی خدمت میں جناب پروفیسر حافظ محمد سعید صاحب امیر مرکز الدعوۃ والارشاد کی ایک تقریر کا کچھ حصہ ارسال ہے۔ جس میں انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ قبروں پر پھول چڑھانا، قبر کو سجدہ کرنا وغیرہ

---

[1] (٥٢٠) إسناده ضعيف ومعناه صحيح ثابت دون "السرج" وبدل "زائرات" "زوارات" .انظر :الترمذي، أبواب الصلاة،باب ما جاء في كراهية أن يتخذ على القبر مسجدا (٣٢٠) وضعيف الترمذي (٥١) والضعيفة (٢٢٥) والإرواء رقم (٧٦١) أبوداؤد (٣٢٣٦) النسائي (٢٠٤٥) ابن ماجه(١٥٧٥) .قال الإمام ابن الحاج :فترى من لاعلم عنده: يطوف بالقبر الشريف كما يطوف بالكعبة الحرام ويتمسح به ويقبله ويلقون عليه مناديلهم وثيابهم يقصدون بها التبرك وذلك كله من البدع . المدخل لابن الحاج (١/ ٢٦٣)بحواله كشف الباحث(ص٢٣٦).

[2] (٥٢١) صاحب المرعاة (٤٨٦/١)

شرک نہیں؟ متن ساتھ منسلک ہے آپ سے استفسار ہے کہ:

① کیا یہ موقف درست ہے؟ قرآن کی اصطلاح کی روشنی میں جو شرک کی تعریف کی گئی ہے کیا یہ تعریف درست ہے؟

② کیا اہل کتاب مشرک نہیں ہیں؟

③ کیا پھول چڑھانا اور قبروں کو سجدہ کرنا کسی صورت میں بھی شرک نہیں ہے؟

تقریر کا متن:

"ومن الذین اشرکوا ۔۔۔۔ اور مشرکین سے کون لوگ مراد ہیں؟ مشرکین کی باقاعدہ اصطلاح قرآن کی اصطلاح ہے اور اس اصطلاح سے کون کون مراد ہیں؟ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ کی شریعتوں کو نہیں مانتے تھے۔ نہ وہ تورات کو، نہ وہ انجیل کو، نہ وہ ان نبیوں کو اور نہ آخرت کو مانیں، نہ شریعت، نہ کتاب، نہ نبوت، نہ آخرت، جو ان کو سرے سے مانتے ہی نہیں تھے ان کو قرآن مجید نے کیا کہا؟ مشرکین! یہ ہے مشرکین کی اصطلاح .... یہاں میں ایک بات اور بھی واضح کر دوں۔ بعض ہمارے بھائیوں کو ہو گی تو تکلیف! لیکن نئی بات کچھ پریشان کن بھی ہوتی ہے لیکن بات سمجھنے کی ہے ہمارے ہاں آج کل مشرکین کی اصطلاح کس کے لئے استعمال ہوتی ہے؟ کلمہ گو مسلمان جو قبروں کے اوپر پھول چڑھانے لگ جائیں یا ایسے وہاں جناب! دیئے جلانے لگ جائیں کوئی غلط کوئی سجدہ کر دے ان کو کیا کہتے ہیں؟ کہ ہم عام طور پر کہتے ہیں کہ جی یہ مشرکین ہیں۔ میرے بھائی! یہ مشرکین کی اصطلاح میں قرآن مجید کے اعتبار سے نہیں آئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے عقیدوں میں خرابیاں ہیں ان کے لیے قرآن مجید میں اصطلاح فاسق کی موجود ہے۔ ان کے لیے ادر مختلف قسم کی اصطلاحات قرآن مجید کے اندر موجود ہیں۔ قرآن میں مشرکین ان کو کہا گیا ہے جو نہ نبوت کو مانتے تھے نہ آخرت کو مانتے تھے نہ شریعت کو مانتے تھے۔ ان کو اہل کتاب کے مقابلے میں مترین کہا گیا ہے اور اس آیت میں بھی ان دونوں کا ذکر ہے۔ فرمایا: ﴿ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ أَشْرَكُوْا أَذًى كَثِيْرًا. ﴾ (آل عمران:١٨٦)

جواب: سوالات کے مشترکہ جواب بالاختصار ملاحظہ فرمائیں:

یہ اصطلاح غیر درست ہے کیونکہ قرآن نے یہود و نصاریٰ کی طرف بھی ان اعمال مذکورہ کی نسبت کی ہے اور انہیں مشرک بھی کہا ہے۔ بطور مثال ملاحظہ ہو: (التوبۃ :۲۹، ۳۰، ۳۱ اور المائدۃ :۷۲، ۷۳)

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عام مشرکوں کی نسبت بعض مسائل میں قرآن کریم نے ان سے امتیازی سلوک کیا ہے۔ اس بناء پر قرآن کے کئی ایک مقامات میں ان کو عام مشرکوں کے مقابلہ میں کتابی نسبت سے یاد کیا گیا ہے۔ تاہم صرف کتابی نسبت سے اس دھوکہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ یہ مشرک نہیں۔ بلاشبہ یہ بھی مشرک ہیں جس طرح قرآنی آیات میں مصرح ہے۔

غالباً اسی وجہ سے میرے عزیز تلمیذ پروفیسر حافظ محمد سعید ﷾ کو غلطی لگ گئی کہ وہ مسلمان جن کی نسبت قرآن و اسلام کی طرف ہے وہ بھی مشرک نہیں ہو سکتے چاہے جتنے مرضی اعمال شرکیہ کے مرتکب ہوں۔ شاید اسی نظریے کی بناء پر جہاد کشمیر میں وہ ایک قبوری تنظیم سے متعاون ہیں جس کا سلفی تنظیم سے ذہنی بُعد ہے۔

بھلا کون نہیں جانتا کہ غیر اللہ کے نام نذر و نیاز اور قبروں پر سجدہ ریز ہونا شرک ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ إِنَّ صَلَا تِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَایَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ بِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ . ﴾ (الأنعام:١٦٢)

''آپ کہہ دیجیے! کہ میری نماز، میری قربانی اور میرا جینا، مرنا سب اللہ رب العالمین ہی کے لئے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی بات کا حکم ملا ہے اور میں سب سے اول فرمانبردار ہوں۔''

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سجدہ اور ذبح عبادت ہے اور یہ حق غیر اللہ کو دینا شرک ہے۔

حدیث میں ہے:

« لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِيْنَ عَلَيْهَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ . » [1] (رواه أبو داؤد والترمذی والنسائی)

مرعاۃ المفاتیح ۱/۴۸۶ میں ہے:

'' وَفِيْهِ رَدٌّ صَرِيْحٌ عَلَى الْقُبُوْرِيِّيْنَ الَّذِيْنَ يَبْنُوْنَ الْقُبَابَ عَلَى الْقُبُوْرِ وَ يَسْجُدُوْنَ إِلَيْهَا

[1] (٥٢٠٢) انظر الرقم المسلسل(٥١٩)

وَ يَسْرُجُوْنَ عَلَيْهَا وَ يَضَعُوْنَ الزُّهُوْرَ وَالرِّيَا حِيْنَ عَلَيْهَا تَكْرِيْمًا وَ تَعْظِيْمًا لِاَصْحَابِهَا. "

یعنی ''اس حدیث میں صریح رد ہے ان قبوریوں کا جو قبروں پر قبے تعمیر کرتے، انہیں سجدہ کرتے، ان پر چراغاں کرتے، اور اصحاب قبور کی تعظیم و تکریم کرتے ہوئے ان پر پھول چڑھاتے ہیں''۔

المرعاۃ ۱/۲۲۴ میں ہے: ''اور یہ قبوری لوگ جو قبروں پر پھول ڈالتے ہیں اور درخت لگاتے ہیں اور غلاف چڑھاتے ہیں پھر ان پر خوشبو بکھیرتے ہیں اور ان پر چراغ جلاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بدعت اور گمراہی کے کام ہیں۔''

لہٰذا موصوف کو میرا مشورہ ہے کہ اپنے غلط موقف پر دلائل دینے اور اس کی توجیہ و تاویل کرنے کی بجائے اس سے رجوع کریں۔ اسی میں آپ کی عظمت و شان ہے، إن شاء اللہ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشہور مقولہ ہے:

" مُرَاجَعَةُ الْحَقِّ خَيْرٌ مِّنَ التَّمَادِي فِي الْبَاطِلِ . "

''باطل پر اصرار سے بہتر ہے کہ انسان حق کی طرف رجوع کرے''۔ (اعلام الموقعین)

اللہ رب العزت سب کو اخلاص کی توفیق بخشے، آمین!

سوال: میرے ایک دوست کی والدہ کی قبر کسی بدبخت نے تین فٹ گہرائی تک ٹریکٹر سے جان بوجھ کر کھود دی ہے اور اس طرح ہل چلایا ہے کہ اوپر کی مٹی نیچے اور نیچے کی اوپر آ گئی ہے۔ ہمارا دل چاہتا ہے کہ اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیں۔ براہ کرم رہنمائی فرمائیں کہ ہم شرعی لحاظ سے اسے کس حد تک سزا دے سکتے ہیں۔ قتل کر سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: بلاشبہ شریعت اسلامیہ میں اکرام مسلم کو بڑی اہمیت حاصل ہے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ۔ عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک قبر پر ٹیک لگائے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ''اس قبر والے کو ایذا نہ دے۔'' ❶

اور دوسری روایت میں ہے:

❶ (۵۲۳) الحاکم (۳/ ۵۹۱)، (۶۵۰۲)، مجمع الزوائد (۳/ ۶۱)، مرعاۃ المفاتیح (۵/ ۴۵۷)، المشکوٰۃ (۱۷۲۱)، للألبانی و قال: لم أجده في المسند بل أجزم انه ليس فيه: بل ان عمرو بن حزم ليس له في مسند احمد مطلقاً و قال: فيه ابن لهيعة و هو ضعيف .

"میت کی ہڈی توڑنا زندہ کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے۔" [1] (المشکوٰۃ:باب البکاء علی المیت)

اور صحیح مسلم میں ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ہے:

«لَا تَجۡلِسُوۡا عَلَى الۡقُبُوۡرِ وَلَا تُصَلُّوۡا اِلَيۡهَا أَوۡ عَلَيۡهَا .» [2]

"یعنی قبروں پر مت بیٹھو اور نہ ان کی طرف اور نہ ان کے اوپر نماز پڑھو۔"

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی عزت و احترام ہر حالت میں واجب ہے۔ اس کی اہانت کرنے والے کے ساتھ وہی کچھ ہونا چاہیے جس کے وہ لائق ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ اس کے لیے مناسب طریقہ سزا و تأدیب تجویز کرے جس سے عام لوگوں کو عبرت ہو تاکہ آئندہ فعل شنیع کا اعادہ نہ ہونے پائے لیکن اس کے بدلا میں کسی کو موت کے گھاٹ اتارنا بہر صورت ناجائز ہے۔

سوال: قبر پر زیادہ مٹی (بوجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان قبروں کو اونچا نہ کرو) (مفہوم) نہ ڈالی جائے۔ اور شدید بارش سے پانی کے بہاؤ میں پانی قبر کے اندر چلا جائے اور قبر بیٹھ جائے اتنی کہ مٹی زمین کے بالکل برابر یا ایک فٹ نیچے ہو جائے اور قبر پر جہاں پہلے مٹی کی سطح تھی۔ ایک غلاف سارہ جائے تو کیا یہ مردہ کے لئے عذاب ہو گا؟

جواب: شریعت میں قبر کا مفہوم صرف اس گڑھے کا نہیں جس میں میت کو دفن کر دیا جاتا ہے۔ بے شمار ایسے لوگ بھی ہیں جو جنگل کے درندوں کی خوراک بن جاتے ہیں یا سمندری گہرائی میں مچھلیوں کی خوراک بنتے ہیں یا ان کے ذرات ہوا میں بکھر جاتے ہیں۔ بظاہر ان کے لئے کسی قبر کا سامان نہیں لیکن درحقیقت ان کے لئے بھی حسب اعمال نعمتیں یا عذاب ہے۔ کیوں کہ شریعت میں قبر کا مفہوم برزخی ساری زندگی کو محیط ہے۔ اس لئے قبر کے ظاہری تغیرات کے بارے میں مت سوچیں۔ جمیع معاملات اللہ کے سپرد کریں۔ اور عاجزی و انکساری سے اس کے سامنے ہر وقت جھکے رہنے کا نام ہی عبودیت ہے جو بندہ سے مطلوب ہے۔ لہٰذا قبر کے بیٹھنے یا نہ بیٹھنے سے میت کی اصل کیفیت میں قطعاً کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر کوئی نیک ہے تو ہر حالت میں اس کی نیکی اس کے ساتھ ہے۔ اور اگر کوئی برا ہے تو اس کی برائی بھی اس سے جدا نہیں ہوتی۔ اللہ عزوجل ہم سب کو عذاب قبر

---

[1] (٥٢٤) صححه الألباني، احمد(١٦٨،٥٨/٦)، (٢٤١٨٩)، و قال محققه۔ حمزة ۔ اسناده صحيح و صحيح ابی داؤد كتاب الجنائز ، باب فی الحفار يجد العظم حل...... (٣٢٠٧)، عن عائشة و ابن ماجه (١٦١٦)، عنها و عن ام سلمة رضی الله عنهما والارواء (٧٦٣).

[2] (٥٢٥) صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب النهی عن الجلوس (٢٢٥٠)، ابن خزيمة (٧٩٣) أبو داؤد (٣٢٢٩).

سے محفوظ رکھے۔ آمین!

سوال: کیا قبر پر قرآن پڑھنا زبانی یا ناظرہ درست ہے؟ نیز یہ بتائیں کہ ایصال ثواب کا کیا طریقہ ہے؟

جواب: کسی صحیح حدیث میں قبر پر قرآن مجید زبانی یا ناظرہ پڑھنا ثابت نہیں۔ ایصال ثواب کا طریقہ کار یہ ہے کہ مثلاً میت کے لئے دعا کی جائے۔ قرآن میں ہے:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ ......﴾ (الحشر: ١٠)

یا صدقہ خیرات کر دیا جائے۔ حدیث میں ہے [1] صدقہ جاریہ یا علمی انتفاع مثلاً شاگردی یا مفید تالیفات وغیرہ یا نیک اولاد جو والدین کے لئے دعا گو ہیں۔ اسی طرح میت کی طرف سے قربانی کرنا یا اس کی طرف سے حج کرنا، مسجد بنوا دینا یا مدارس میں غریب طلبہ کی خدمت کرنا یا خیراتی تعمیر میں حصہ دار بننا وغیرہ وغیرہ۔

سوال: ایک گھرانے نے اپنی بہو کی وفات کے وقت بطور ثواب قبر میں عورت کے سینے پر قرآن مجید رکھ کر دفنا دیا ہے کیا اسلام میں جائز ہے؟ اور کیا اب قبر کو اکھاڑ کر قرآن مجید نکالنے کی اجازت ہے یا کہ نہیں؟

جواب: میت کے ساتھ قرآن کو دفنانے کی صورت میں اب قبر کو اکھاڑنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ یہ فعل اکرام میت کے منافی ہے۔

سوال: ہر مسلمان کو قبر میں دفنانا ضروری ہے لیکن جو میت پانی میں ختم ہو جائے یا کوئی درندہ کھا جائے یا آگ میں جل جائے، تو اس سے قبر کا سوال، جواب یا عذاب، ثواب اور قیامت کو قبروں سے اٹھنا کیسے ہوگا؟

جواب: جو شخص پانی میں غرق ہو جائے یا درندہ کھا جائے یا آگ وغیرہ میں جل جائے اس سے بھی قبر کا سوال و جواب ہوگا۔ کیونکہ اس کی قبر وہی ہے جہاں یہ پہنچ چکا ہے۔

سوال: آدمی کے فوت ہونے کے وقت اس کے رشتہ دار جو پہلے فوت ہو چکے ہوتے ہیں ان کو لینے آتے ہیں۔ کیا ان کی روح فوت ہونے والے کے قریب اس وقت ہوتی ہے؟ کیا انسان مرنے کے بعد اپنے رشتہ دار کے پاس پہنچ جاتا ہے؟ اور ان کو پہچان لیتا ہے وضاحت فرمائیں؟

جواب: مردے فوت ہونے والے کو لینے آتے ہوں کتاب و سنت سے ثابت نہیں۔ ہاں البتہ مرنے والے کی

---

[1] (٥٢٦) صحیح مسلم، کتاب الوصیة، باب ما یلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته (٤٢٢٣)، الترمذی (١٣٨١)، أبو داؤد (٢٨٨٠)، النسائی (٣٦٥٣)، ابن ماجه (٢٤٢)، أحمد (٣٧٢/٢)، السنن الكبرى (٦/ ٢٧٦) للبیهقی.

بعض فوت شدگان سے ملاقات ہو جاتی ہے بعض روایات میں پیغام رسانی کا ذکر ہے جو قابل حجت ہیں۔(ملاحظہ ہو: تنقیح الرواۃ ۱/ ۳۱۵)

سوال: کیا قبر میں حساب و کتاب کے وقت حضور اکرم ﷺ حاضر ہوتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر فِیْ ھٰذَا الرَّجُلِ سے کیا مراد ہے؟

جواب: قبر میں سوال و جواب کے وقت نبی ﷺ حاضر نہیں ہوتے۔"ھٰذَا الرَّجُلِ" [1] سے مراد صرف استحضار ذہنی ہے۔یعنی وہ نقشہ جو آدمی کے دل و دماغ میں ہوتا ہے اس کا اظہار مقصود ہے اسی لئے مومن جواباً: "ھٰذَا عَبْدُاللّٰہِ وَ رَسُوْلُہٗ " کے بجائے:"ھُوَ عَبْدُاللّٰہِ وَ رَسُوْلُہ [2] أَوْ أَنَّہٗ عَبْدُاللّٰہِ وَ رَسُوْلُہٗ." [3]

یعنی اسم اشارہ قریب کے بجائے ضمیر غائب استعمال کرتا ہے اسی بناء پر ہرقل نے ابوسفیان سے کہا تھا:

" أَیُّکُمْ أَقْرَبُ نَسَبًا بِھٰذَا الرَّجُلِ؟ " (بخاری مع فتح الباری ۱/ ۳۱)

یعنی"تم سے نسب کے اعتبار سے کون اس آدمی کے قریب تر ہے؟"

وہ دونوں اس وقت کافر تھے۔ اور نبی ﷺ اس وقت ان کے پاس نہیں تھے۔ ہرقل نے لفظ "ھذا" کا استعمال محض استحضار ذہنی کے طور پر کیا ہے۔

سوال: کیا رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! پڑھنا افضل ہے یا درود ابراہیمی؟

جواب: یاد رہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عادت نہیں تھی کہ مدینہ شریف میں رہتے ہوئے سلام کے لئے وہ قبر اطہر پر حاضری دیتے ہوں۔صرف عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ جب وہ سفر سے واپس آتے تو "صلوٰۃ و سلام" کے لئے قبر مبارک پر حاضری دیتے [4] جب کہ عام صحابہ رضی اللہ عنہم کا معمول یہ تھا کہ بلا تخصیص قبر وہ ثابت شدہ مقامات پر ثابت شدہ درود پڑھتے تھے۔ لہٰذا افضل ترین عمل یہی ہے۔ البتہ سفری صورت میں صحابی کی اقتداء

---

[1] (۵۲۷) صحیح البخاری ،کتاب الجنائز ،باب المیت یسمع خفق النعال (۱۳۳۸) ،صحیح مسلم ،کتاب الجنۃ ونعیمھا ،باب عرض مقعد المیت من الجنۃ والنار(۷۲۱۶) ،المشکاۃ (۱۲۶، ۱۳۰، ۱۳۱).

[2] (۵۲۸) صحیح الترمذی (۱۰۸۳)حسنہ الألبانی،الصحیحۃ (۱۳۹۱).

[3] (۵۲۹) صحیح البخاری، کتاب الجنائز،باب ماجاء فی عذاب القبر (۱۳۷۴).

[4] (۵۳۰) مؤطا للإمام مالك، کتاب الصلاۃ،باب ماجاء فی الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم (۳۹۷)،عبد الرزاق (۶۷۲۴)،البیہقی (۵/ ۲۴۵)،المطالب العالیۃ (۱۳۲۰)لابن حجروصححہ.

میں قبر مبارک پر ''صلوۃ وسلام'' کا محض جواز ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (جلاء الأفهام تاليف ابن القيم)

سوال: قبرستان میں جا کر مرحومین کی بخشش کے لئے کون کون سی دعائیں پڑھنا مسنون ہیں؟ اور قبر کے کس حصے پر کھڑے ہو کر دعائیں پڑھیں؟

جواب: قبرستان میں میت کے لئے ہر وہ دعا پڑھی جا سکتی ہے جس میں اس کے لئے مغفرت کی دعا ہو۔ مثلاً:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَان...... ﴾ (الحشر: ۱۰)

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا بھی سکھائی تھی:

« اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ عَلٰى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَ يَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَاخِرِيْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ .» [1] (مسلم والنسائی)

مزید اس موضوع پر مؤلفہ کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ کچھ دعاؤں کا ذکر صحیح مسلم میں ہے۔ قبروں سے پیچھے ہٹ کر قبلہ رخ ہو کر دعا کرنی چاہیے۔

سوال: کیا پختہ قبر بنوائی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص مرنے سے پہلے وصیت کر گیا ہو کہ اس کی قبر پختہ بنوائی جائے تو کیا اس کی اس وصیت کو پورا کرنا اس کے ورثاء کا فرض ہے؟

جواب: صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں تصریح موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا: کہ قبر کو چونا گچ کیا جائے۔ [2] امام محمد رحمہ اللہ نے بھی اس کی کراہت کی تصریح کی ہے۔ چنانچہ ''کتاب الآثار'' میں لکھتے ہیں: ''ہمارے نزدیک قبر کو چونا گچ کرنا یا مٹی سے لپائی کرنا مکروہ ہے۔ [3] خلاف شرع وصیت کی اصلاح ورثاء کے ذمہ ضروری ہے۔ بصورت دیگر وہ بھی مجرم ٹھہریں گے۔''

سوال: کیا عورت قبرستان میں جا سکتی ہے؟

جواب: عورت قبرستان جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ جزع وفزع کا اظہار نہ کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو قبر کے پاس بیٹھی دیکھا کہ رو رہی تھی، فرمایا:

---

[1] (۵۳۱) صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب ما يقال عند دخول القبور (۹۷۵).

[2] (۵۳۲) ((عن جابر رضى الله عنه قال: نهى رسول ﷺ أن يجصص القبر، و أن يقعد عليه، و أن يبنى عليه. صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب النهى عن تجصيص القبر و البناء عليه)) (۲۲٤۵)، الترمذى (۱۰٦۲).

[3] (۵۳۳) كتاب الآثار رقم (۲۵٦) وفيه: ونكره أن يجصص، أو يطين أو يجعل عنده مسجد أو علم أو يكتب عليه ويكره الآجر أن يبنى عليه. و كتاب الآثار رقم (٤۲۰) ص (۸٤) لأبى يوسف، ط. مكتبة الأثرية.

« اِتَّقِی اللّٰہَ وَاصْبِرِیْ .» ❶ (بخاری و مسلم)

''اللہ سے ڈر اور صبر کر۔''

سوال: کیا قرآن مجید قبرستان میں لے جا کر قبر پر بیٹھ کر پڑھنا یا زبانی قبر کے پاس پڑھنا جائز ہے یا کہ نہیں؟

جواب: قبرستان میں قرآن مجید پڑھنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔

سوال: ایک آدمی مرزائی مر گیا اور اسی حالت میں فوت ہو گیا۔ بعض مسلمانوں نے اس کے جنازہ میں شرکت بھی کی اور اسے دفن بھی مسلمانوں کے قبرستان میں ہی کیا گیا۔

اس کے جنازہ میں شریک ہونے والے مسلمانوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور کیا اسے مسلمانوں کے قبرستان میں ہی دفن رہنے دیا جائے یا اسے نکال کر دوسرے قبرستان میں دفن کیا جائے؟

جواب: مرزائی بلاشبہ کافر ہیں۔ ان سے مسلمانوں جیسا تعلق قائم کرنا بھی حرام ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ أَوْلِیَاءَ تُلْقُوْنَ إِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ کَفَرُوْا بِمَا جَآءَکُمْ مِّنَ الْحَقِّ .﴾ (الممتحنه : ۱)

''مومنو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔ تم تو ان کو دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔ اور وہ (دین) حق سے جو تمہارے پاس آیا ہے، منکر ہیں۔''

لہٰذا جن مسلمانوں نے ایک مرزائی کے جنازہ میں شرکت کی ہے وہ شدید ترین کبیرہ گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انہیں فوراً اپنے جرم پر نادم ہو کر رب کے حضور توبۂ نصوح کرنی چاہیے بصورت دیگر عقابِ الٰہی کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ حدیث میں ہے:

« اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ .» ❷

یعنی ''آدمی روز جزاء اس کے ساتھ ہوگا جس سے اسے پیار ہوگا۔''

مرزائیوں کے بارے میں نرم گوشہ اختیار کر کے ان کے جنازہ میں شرکت کرنا بھی محبت ہی کی ایک شکل ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا.

نیز مذکورہ شخص کی لاش کو مسلم قبرستان سے نکال کر اس کے مناسب حال جگہ میں دفن کر دیا جائے۔

---

❶ (۵۳٤) صحیح البخاری ،کتاب الجنائز ،باب زیارۃ القبور (۱۲۸۳)صحیح مسلم ،کتاب الجنائز ،باب فی الصبر علی المصیبة (۲۱٤۰).

❷ (۵۳۵) صحیح البخاری، کتاب الأدب،باب علامة الحب فی الله......(٦۱٦۸) صحیح مسلم،کتاب البر والصلة،باب المرء مع من أحب (٦۷۱۸).

بسلسلۂ زیارت قبور دعاؤں میں مقابر کی اضافت صرف مسلمانوں کی طرف کرنا اس امر کی واضح دلیل ہے۔

بعض الفاظ نبوی ﷺ ملاحظہ فرمائیں:

۱......« اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ .» ❶ (أحمد ،مسلم ،نسائی)

۲......« اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ .» ❷ (أحمد،مسلم، ابن ماجه)

نیز شریعت اسلامی میں اموات مسلمین کی زیارت کا حکم ہے۔ جب کہ مشرکین کی قبور کے پاس کھڑا ہونے سے منع کیا گیا ہے۔قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَ لَا تُصَلِّ عَلٰٓى أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ أَبَدًا وَ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ﴾ (التوبة:٨٤)

اور بعض روایت میں مشرکوں کی قبروں سے تیزی کے ساتھ گزر جانے کا امر بھی ہے۔ صحیح بخاری کے ''بَابُ مَاجَاءَ فِیْ قَبْرِ النَّبِیِّ ﷺ وَ أَبِیْ بَکْرٍ وَ عُمَرَ'' میں ہے:

" قُلْ يَسْتَأْذِنُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَإِنْ أَذِنَتْ لِیْ فَادْفِنُوْنِیْ وَ إِلَّا فَرُدُّوْنِیْ إِلٰی مَقَابِرِ الْمُسْلِمِيْنَ . " اِنْتَهٰی ❸

علامہ عظیم آبادی فرماتے ہیں۔ اس روایت میں مقابر مسلمین کا علیحدہ ہونا ثابت ہوا (فتاویٰ عظیم آبادی ص۱۳۲) مزید آنکہ امت مسلمہ کا تعامل بھی اس بات کا مؤید ہے کہ ہمیشہ مسلمانوں کے قبرستان غیر مسلموں سے علیحدہ رہے ہیں (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:(فتاویٰ مذکور)

سوال: مردہ بھائی کے لئے اس کی تدفین کے بعد کے ایام میں دعائے مغفرت کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ کیا اس کے لئے دعا کرتے وقت کسی وقت ہاتھ اٹھانے کا جواز ہے؟

جواب: بلاتعیین وقت اور مکان کے میت کے لئے ہر وقت مغفرت کی دعا ہوسکتی ہے۔قرآن میں ہے:

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ .﴾ (الحشر:١٠)

''اے پروردگار ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں، گناہ معاف فرما۔''

---

❶(٥٣٦) صحيح مسلم،كتاب الطهارة،باب استحباب إطالة الغرة والتحجيل فی الوضوء (٥٨٤) والجنائز (٢٢٥٥) ،النسائی (٢٠٣٨).

❷(٥٣٧) صحيح مسلم، كتاب الجنائز ،باب مايقال عند دخول القبور (٢٢٥٦) و (٢٢٥٧) ،النسائی (٢٠٣٦).

❸(٥٣٨) صحيح البخاری، كتاب الجنائز،باب ما جاء فی قبر النبی ﷺ وأبی بكر و عمر رضی الله عنهما (١٣٩٢).

نیز میت کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے۔ حدیث میں ہے:

« فَدَعَا بِمَاءٍ فَتَوَضَّأَ ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ فَقَالَ:« اِغْفِرْ لِعُبَيْدٍ أَبِي عَامِرٍ.» ثُمَّ قَالَ: «اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَوْقَ كَثِيرٍ مِّنْ خَلْقِكَ مِنَ النَّاسِ. » [1]

(بخاري ،باب غزوة أوطاس)

یعنی ''نبی ﷺ نے پانی منگوایا، پھر ہاتھ اٹھا کر دعا کی فرمایا: اے اللہ !عبید ابوعامر کو معاف کر دے۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی دیکھی ،یعنی اس قدر ہاتھ بلند کیے۔ پھر فرمایا: اے اللہ ! قیامت کے دن اسے اپنی مخلوق میں سے بہت پر فائق فرما۔''

سوال: گاؤں کے مشرق کی طرف قبرستان ہے میت کو قبرستان میں لے جانے کے لئے میت کے پاؤں قبرستان کی طرف کریں یا خانہ کعبہ کی طرف؟

جواب: اس موقعہ پر کسی حدیث میں جہت کے تعیین کی صراحت نظر سے نہیں گزری بظاہر مسئلہ ہذا میں وسعت معلوم ہوتی ہے۔

سوال: بعض علماء کہتے ہیں کہ اگر عورتیں قبرستان میں جا کر شرک اور واویلا نہ کریں تو ان کا قبرستان میں جانا جائز ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ قبرستان جانے والی عورتوں پر خدا کی لعنت ہوتی ہے۔ ان میں کونسی بات صحیح ہے؟

جواب: عورتوں کے لئے زیارت قبور جائز ہے۔ اس سلسلہ میں وارد چند ایک احادیث ملاحظہ فرمائیں:

① رسول اکرم ﷺ کا گزر ایک قبر کے پاس سے ہوا، دیکھا کہ وہاں ایک عورت رو رہی ہے۔ فرمایا:

« اِتَّقِى اللّٰهَ وَاصْبِرِى .» (بخاری ۱۲۵۲(۱۲۷۳)، مسلم ۶/۲۲۷-۲۲۸)(۲۱۴۰)

یعنی ''اللہ سے ڈر اور صبر کر۔''

وجہ استدلال یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو اللہ سے ڈر اور صبر کی تلقین کی ہے۔ اگر عورت کے لئے زیارت قبور ناجائز ہوتی تو اسے منع فرما دیتے۔ اصول فقہ کا قاعدہ معروف ہے:

'' تَأْخِيرُ الْبَيَانِ عَنْ وَقْتِ الْحَاجَةِ لَا يَجُوزُ .''

② نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

---

[1] (۵۳۹) صحيح البخاري، كتاب المغازي ،باب غزوة أوطاس (۴۳۲۳).

«كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا.» [1] (رواه مسلم)

''میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا سوتم قبروں کی زیارت کرو۔''

حدیث ہذا میں عمومی رخصت مردوزن سب کو شامل ہے۔

③ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی قبر کی زیارت کی تو عبداللہ بن ابی ملیکہ نے ان سے دریافت کیا۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو زیارت قبور سے منع نہیں فرمایا تھا؟ کہا ہاں مگر بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو زیارت قبور کی اجازت فرما دی۔ [2]

(مُسْتَدرَك حاكم(١/٣٧٦)، التَّمهِيد لابنِ عبدِالبر(٢/٢٣٢)

حاکم نے اس پر سکوت کیا ہے اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اور حافظ عراقی نے تخریج ''احیاء علوم الدین'' میں اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔(۴/۵۲۱)

④ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے دریافت کیا کہ جب قبرستان جاؤں تو کیا دعا پڑھوں؟ تو جواباً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پڑھو:

«اَلسَّلَامُ عَلٰى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَيَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَأْخِرِيْنَ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ.» [3] (مسلم (٧/٤٤)،نسائی(٤/٩٢-٩٣)

اور جو لوگ عورتوں کو زیارت قبور سے منع کرتے ہیں ان کا استدلال اس روایت سے ہے کہ:

«لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ.»

(ابوداؤد (٢٨٣٦)، نسائی(٤/٩٤-٩٥)

''یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔''

اور بعض الفاظ میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت سے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔ [4] (مسند طيالسى(١/١٧١) ابن ماجه (١٥٧٥٠)

---

[1] (٥٤٠) صحيح مسلم ،كتاب الجنائز ،باب استئذان النبى صلى الله عليه وسلم ربه عزو جل فى زيارة قبر أمه(٢٢٦٠، ٢٢٦١).

[2] (٥٤١) الحاكم ١/٣٧٦(١٣٩٢)وقال الذهبى:صحيح .المشكاة،رقم الحديث(١٧١٨).

[3] (٥٤٢) صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب ما يقال عند دخول القبور(٩٧٥).

[4] (٥٤٣) حسنه الألبانى ، صحيح ابن ماجه، ابواب الجنائز ، باب ما جاء فى النهى عن زيارة النساء القبور (١٢٧٩ إلى ١٢٨١)، المشكاة (١٧٧٠)، الارواء (٣/٢٣٣)]

علامہ ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ممکن ہے مراد اس سے وہ عورتیں ہوں جو کثرت سے زیارت قبور کرتی ہیں۔''

اور علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

'' بعض اہل علم نے ترمذی کی روایات میں وارد لعنت کو کثرت زیارت پر محمول کیا ہے کیونکہ زوارات مبالغہ کا صیغہ ہے۔'' (اَلْمِرْعَاة (۲/۲۵۲)

نیز امام موصوف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر عورت قبرستان میں زیادہ نہ جائے، نوحہ نہ کرے، مرد کے حقوق ضائع نہ کرے تو اس کو جانا جائز ہے۔ ورنہ نہیں، رسول اللہ ﷺ نے جو زیارت کرنے والی عورتوں کو لعنت کی ہے یہ رخصت سے پہلے تھی، جب رخصت ہوئی تو عورتوں مردوں سب کو ہوگئی اور عورتوں کے لئے جو زیادہ مکروہ ہے وہ صرف بے قراری اور بے صبری کی وجہ سے ہے۔''

اور علامہ شوکانی نے اس کو اعتماد کے قابل ولائق بتایا ہے۔ بلاشبہ مختلف احادیث کو تطبیق دینے کی یہ ایک بہترین صورت ہے۔ (وَاللّٰهُ أَعْلَمُ.)

سوال: نماز جنازہ سے فارغ ہو چکنے کے بعد میت کے لئے دعا مانگنا شرعاً کیسا ہے؟ کیا حدیث « اذا صليتم على الميت فاخلصوا له الدعاء. » ''جب تم میت کی نماز جنازہ پڑھو تو اس کے لئے خصوصی طور پر دعائیں کرو۔'' اور ابن شیبہ کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کہ ''انہوں نے نماز جنازہ پڑھی پھر میت کے لئے دعا کی'' سے اس کا جواز نکلتا ہے؟

جواب: بحث طلب مسئلہ یہ ہے کہ آیا نماز جنازہ سے فارغ ہو چکنے کے فوراً بعد میت کے لئے دعا کا جواز ہے یا نہیں؟ ...... نماز جنازہ کے بعد دعا مانگنے کی دلیل کے طور پر، سوال میں مذکور دو روایات پیش کی گئی ہیں لیکن درست بات یہ ہے کہ میت کے لئے دعا نماز جنازہ کے دوران مانگی جائے۔ پہلی حدیث کی تشریح بقول علامہ مناوی رحمہ اللہ یوں ہے:

''میت کے لئے اخلاص کے ساتھ دعا کرو کیونکہ اس نماز سے مقصود صرف میت کے لیے سفارش کرنا ہے جب دعا میں اخلاص اور عاجزی ہوگی تو اسے قبول ہونے کی امید ہے۔''

(عون المعبود ۳/۱۸۸)

اور مستدرک حاکم میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

"ویخلص الصلاۃ فی التکبیرات الثلاث."

یعنی "جنازہ کی تین تکبیروں کے دوران اخلاص سے دعا کرے۔"

مستدرک حاکم کی اس حدیث سے اس امر کی وضاحت ہوگئی کہ دعا کا تعلق خالصۃً حالت نماز کے ساتھ ہے نہ کہ بعد از نماز سے۔ اصول فقہ کا معروف قاعدہ ہے کہ:

" الاحادیث یفسر بعضها بعضا " ...... "احادیث ایک دوسری کی تفسیر کرتی ہیں۔"

اس بناء پر اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جب تم نماز جنازہ پڑھنا چاہو تو میت کے لئے خلوص کے ساتھ دعا کرو۔ یہ "إِقَامَةُ الْمُسَبَّبِ مَقَامَ السَّبَبِ" (سبب بول کر مسبب مراد لینا) کی قبیل سے ہے، ارادہ سبب اور نماز مسبب ہے۔ حدیث کے الفاظ:« فَأَخْلِصُوْا .»میں فاء کے ترتیب و تعقیب بلا مہلت ہونے کا یہی مطلب ہے ...... اگر مقصود یہاں نماز جنازہ سے فراغت کے بعد دعا ہوتی تو پھر فاء کی بجائے لفظ: " ثُمَّ" ہونا چاہیے تھا جو عام حالات میں ترتیب اور تراخی کا فائدہ دیتا ہے۔ احناف کی یہ توجیہ غلط ہے کہ فاء "تعقیب" کا یہ مطلب ہے کہ نماز کے بعد دعا کی جائے۔

علاوہ ازیں یہ حدیث سنن ابوداؤد اور سنن ابن ماجہ وغیرہ میں ہے اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اس حدیث کو جنازہ کے دوران دعا پڑھنے کے ضمن میں ذکر کیا ہے انہوں نے اس پر عنوان یوں قائم کیا ہے: "بَابُ الدُّعَاءِ لِلْمَيِّتِ"[1] اور اس حدیث پر امام ابن ماجہ رحمہ اللہ کی تبویب بھی ملاحظہ فرمائیں اور بار بار غور سے پڑھیں:

"بَابُ مَاجَاءَ فِي الدُّعَاءِ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَازَةِ ." [2]

یعنی "نماز جنازہ میں دعا کے بارے میں جو کچھ آیا ہے۔" اس کا بیان ......

اس سے معلوم ہوا کہ محدثین اور احناف کے فہم میں زمین و آسمان کا فرق ہے لہٰذا اس تحریف پر انہیں ندامت کا اظہار کر کے حق کی طرف رجوع کی فکر کرنی چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

---

[1] (٥٤٤) ابو داؤد، کتاب الجنائز، رقم الباب(٦٠)

[2] (٥٤٥) صحیح ابن ماجه للألبانی ، کتاب الجنائز، رقم الباب (٢٣)، فائدہ: قال العینی الحنفی: و فیه من الفقه ان المیت یدعیٰ له فی الصلاۃ علیه و لکن بالاخلاص ، شرح سنن ابی داؤد للعینی(١٤٣/٦) (اس باب میں فقہ یہ ہے کہ میت کے لیے اخلاص کے ساتھ نماز کے اندر دعا کی جائے۔)

" مُرَاجَعَةُ الْحَقِّ خَيْرٌ مِّنَ التَّمَادِیْ فِی الْبَاطِلِ ."

''باطل پر اصرار سے بہتر ہے کہ آدمی حق کی طرف رجوع کر لے۔'' (اعلام الموقعین)

اس کی مثال یوں سمجھیں جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ (النحل:۹۸)

''جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔''

ائمہ لغت ''زجاج'' وغیرہ نے اس کا معنی یوں بیان کیا ہے۔

"إِذَا أَرَدْتَ أَنْ تَقْرَأَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ،وَلَيْسَ مَعْنَاهُ اسْتِعَاذٌ بَعْدَ أَنْ تَقْرَأَ الْقُرْآنَ"

''جب آپ قرآن کی تلاوت کا ارادہ کریں تو اللہ سے پناہ مانگ لیا کریں، اس کا یہ معنی نہیں کہ تلاوت قرآن کے بعد ''اعوذ باللہ'' پڑھا کرو۔''

اسی کی مثل قائل کا قول ہے:

"إِذَا أَكَلْتَ فَقُلْ :بِسْمِ اللّٰهِ"

یعنی ''جب تو کھانے کا ارادہ کرے تو بسم اللہ پڑھ۔''

اس کا قطعاً یہ معنی نہیں کہ کھانے سے فراغت کے بعد بسم اللہ پڑھنی چاہیے'' ...... امام واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''فقہاء کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ ''استعاذہ'' قراءت سے پہلے ہے''۔

(تفسیر فتح القدیر: ۱۹۳/۳)

بلاشبہ شرع میں دعا کی بالعموم تاکید ہے۔ غالباً اس بناء پر فقہاء حنفیہ نے جنازہ میں قراءت سے استغنائی پہلو اختیار کر کے اس کا نام دعاء وثناء وغیرہ رکھا ہے۔ موطا امام محمد رحمہ اللہ میں ہے: "لَا قِرَاءَ ةَ عَلَى الْجَنَازَةِ ،وَهُوَ قَوْلُ أَبِیْ حَنِيْفَةَ ."اور یہ قول "المبسوط" للسرخسی رحمہ اللہ میں بھی ہے(۶۴/۲) ...... البتہ محقق ابن الهمام فتح القدير (۴۸۹/۱) میں فرماتے ہیں:

''فاتحہ نہ پڑھے تاہم بہ نیت ثنا پڑھی جا سکتی ہے۔ کیونکہ قراءت رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں''۔

علامہ ابن الہمام جیسے محقق کی یہ بات انتہائی ناقابل فہم ہے، اس لئے کہ فاتحہ کی قراءت کا اثبات تو صحیح بخاری میں موجود ہے: "بَابُ قِرَاءَ ةِ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ عَلَى الْجَنَازَةِ" تو پھر کیا یہ بات معقول ہے کہ اثناء جنازہ میں اخلاص دعا کی تاکید تو نہ ہو، لیکن سلام پھیرنے کے بعد کہا جائے کہ اب اخلاص سے دعا کرو۔ غالباً

اس دھوکہ کے پیش نظر حنفی بھائی نماز جنازہ کا تو جھٹکا کرتے ہیں، بعد میں لمبی لمبی دعائیں کی جاتی ہیں، جس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔

اصول فقہ کا قاعدہ معروف ہے کہ ''عبادات میں اصل ''حظر'' (ممانعت) ہے، جواز کے لئے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے''۔ عہد نبوت میں کتنے جنازے پڑھے گئے، کسی ایک موقع پر بھی ثابت نہیں ہے کہ نبی ﷺ نے نماز جنازہ کے بعد دعا کی ہو۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے۔

« مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ .» ❶

''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے''۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''عَلَيْكَ بَالْأَثَرِ وَ طَرِيْقَةِ السَّلَفِ ،وَ إِيَّاكَ وَ كُلَّ مُحْدَثَةٍ فَإِنَّهَا بِدْعَةٌ .''

''آثار اور طریقہ سلف کو لازم پکڑو، اپنے آپ کو دین میں کمی بیشی سے بچاؤ وہ بدعت ہے۔''

(ذم التأویل، از ابن قدامه)

ابن الماجشون نے کہا کہ میں نے امام مالک رحمہ اللہ سے سنا، وہ فرماتے تھے:

''جو دین میں بدعت ایجاد کر کے، اسے اچھا سمجھے تو گویا وہ یہ باور کراتا ہے کہ محمد ﷺ نے رسالت میں خیانت کی ہے، اس لئے کہ اللہ کا فرمان ہے: ﴿ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ . ﴾ جو شے اس وقت دین نہیں تھی، وہ آج بھی دین نہیں بن سکتی۔'' ❷

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جس نے بدعت کو اچھا سمجھا اس نے نئی شریعت بنا لی۔ (السنن والمبتدعات)

رہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر (فعل صحابی) تو اس کا تعلق نماز جنازہ کے متصل بعد سے نہیں بلکہ اس کا تعلق دفن میت کے بعد سے ہے۔ کیونکہ مصنف نے اس اثر پر جو عنوان قائم کیا ہے اور اس کے تحت مذکورہ جملہ آثار اسی بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس دعا کا تعلق تدفین میت کے بعد سے ہے۔ عنوان کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

'' بَابٌ فِي الدُّعَاءِ لِلْمَيِّتِ بَعْدَ مَا يُدْفَنُ وَيُسَوّٰى عَلَيْهِ''

---

❶ (٥٤٦) صحيح البخاری، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود (٢٦٩٧).

❷ (٥٤٧) الاعتصام فی ذم البدع (٣٢/١) للشاطبی .

''قبر پر مٹی برابر کر کے میت کے لئے دعا کرنے کا بیان۔''

اور تدفین کے بعد میت کے لئے دعا کرنا ثابت شدہ امر ہے جس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبداللہ ذی النجادین کی قبر پر دیکھا، جب دفن سے فارغ ہوئے تو قبلہ رخ ہاتھ اٹھا کر دعا کی''۔ (أخرجه أبو عوانة فی صحیحه ،فتح الباری ١١/١٤٤)

تمام بھلائی سنت نبوی کی پیروی میں ہے،اور بدعت میں شر ہی شر ہے۔ اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں کو ''صراط مستقیم'' پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین!

سوال: عذاب قبر کی کیفیت کیسی ہوتی ہے حالانکہ روح تو ''عِلِّیِّین'' یا ''سِجِّین'' میں ہوتی ہے اور جسم قبر میں ہوتا ہے کیا عذاب قبر ایک نئے برزخی جسم کے ساتھ آسمان پر نہیں ہوتا؟ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات کچھ لوگوں کو عذاب میں مبتلا دیکھا تھا۔ حالانکہ قیامت سے پہلے تو عذاب نہیں ہوسکتا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ غزوہٴ بدر کے شہیدوں کی روحوں کو سبز رنگ کے پرندوں کے جسموں میں منتقل کر دیا گیا ہے اور وہ جنت میں اڑتے پھرتے ہیں۔ [1]

جواب: قبر میں جزا سزا کا برزخی معاملہ برحق ہے لیکن انسانی عقول حقیقت کے ادراک سے قاصر ہیں اس پر ایمان لانا واجب ہے اور انکار کرنا الحاد ہے، اس موضوع پر میرے قلم سے تفصیلی فتویٰ (الاعتصام ۲۳،اگست ۱۹۹۱ء، جلد ۴۳، شمارہ ۱۳۴ میں شائع ہو چکا ہے)

سوال: قبرستان جا کر السلام علیکم پکارنا جب کہ مردے بھی نہیں سنتے، جائز ہے؟

جواب: قبرستان میں جا کر سلام کہنا صرف شرعی حکم کی تعمیل ہے۔ مردوں کے سننے کی کسی صحیح حدیث میں تصریح موجود نہیں ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مختلف مکاتب فکر کے ملاحظے اور مطالعہ اور ایک عرصہ تک ذہنی طور پر گومگو کی حالت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلام کی اصل روح کو صرف ''مسلک اہل حدیث'' ہی سمجھتا

[1] (٥٤٨) جابر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت مجھے نہیں ملی، البتہ شہداء کی روحوں کے ساتھ ایسا معاملہ علی الاطلاق صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ دیکھیے صحیح مسلم ، کتاب الامارة، باب بیان أن أرواح الشھداء فی الجنة.....(٤٨٨٥)، البتہ حدیث حضرت جابر کی طرح حدیث عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مسند احمد میں مروی ہے لیکن اس میں ''شہداء احد'' کا ذکر ہے۔

ہے۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ انشاء اللہ اسی مسلک کی روشنی میں اپنی گناہ گار زندگی کے لئے استفسار کروں گا اور دین حق پر چلنے کے لئے سماجی و مذہبی راہنمائی حاصل کروں گا۔ اس سلسلہ میں آپ میری راہنمائی فرمائیں مثلاً:

① مختلف مسائل خصوصًا وضونماز، نماز جنازہ روزہ وغیرہ کے متعلق کتابوں کی نشاندہی فرمائیں۔

② اہل بدعت کے ہاں جو خرافات موجود ہیں اور ان کے جواز و اثبات کے لئے جو تأویلات کرتے ہیں۔ ان کے رد کے لئے کونسی کتابیں پڑھنی چاہئیں مثلاً ختم، فاتحہ، نیاز، چہلم، قل وغیرہ۔

③ قبور پر جانے کے متعلق جو احکامات شرعی ہیں وہ کیا ہیں۔ کیا کبھی اپنے والدین کی قبور پر جانا چاہیے کہ نہیں، اگر جانا چاہیے تو کیا کرنا چاہیے؟ عام قبرستان سے گزرتے ہوئے کیا کرنا چاہیے؟

میرے علم کے مطابق عورتوں کا قبور پر جانا منع ہے۔ اہل بدعت یہ تأویل کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا صدیقہ اپنے خاوند اور اپنے والد کے روضۂ مبارک پر جاتی تھیں۔ اس مسئلہ کے متعلق ارشاد فرمائیں!

جواب: 1...... طہارت و وضوء نماز جنازہ اور روزہ وغیرہ کے موضوعات پر علماء کی بے شمار تصانیف موجود ہیں چند ایک کے نام ملاحظہ فرمائیں: ''تعلیم الصلوٰۃ'' محدث روپڑی۔ ''پیارے رسول ﷺ کی پیاری دعائیں'' مولانا عطاء اللہ بھوجیانی رحمہ اللہ۔ ''احکام جنائز'' مولانا محمد عبدہ حفظہ اللہ۔ ''احکام الجنائز'' مولانا مبارکپوری رحمہ اللہ۔ ''حقیقۃ الصیام'' شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ۔ ''جنازہ کے احکام و مسائل'' مولانا فضل الرحمٰن صاحب۔ ''دستور المتقی'' اور ''منتقی الأخبار'' مترجم وغیرہ وغیرہ۔

2...... بدعات کے رد میں بہت ساری کتابیں بازار میں دستیاب ہیں۔ اردو بازار لاہور میں اہل توحید کی دوکانوں پر رجوع فرمائیں۔ مثلاً:

سبحانی اکیڈمی، فاروقی کتب خانہ، مکتبہ قدوسیہ، اسلامی اکیڈمی اور مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ وغیرہ وغیرہ۔ اس بارے میں ردّ بدعات محدث روپڑی کی مشہور و معروف تالیف ہے اور جملہ تصانیف مولانا محمد صادق سیالکوٹی خرید کر اپنی لائبریری کی ضرور زینت بنائیں، بے حد مفید ہیں، تنہا شخص اپنی ذات میں مستقل ادارہ تھا جس کی کاوش کو رب العزت نے شرف قبولیت سے نوازا ہے۔ جَزَاهُ اللّٰهُ عَنَّا خَيْرَ الْجَزَاء.

3 قبروں کی زیارت کرنا مشروع ہے اس سے آخرت یاد آتی ہے اور دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے۔ بعض روایات میں موجود ہے کہ میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا۔ مگر اب زیارت کرو

کیونکہ اس سے موت یاد آتی ہے۔ اور باعث عبرت بھی ہے۔

شریعت میں مسلمانوں کی قبروں کی زیارت کا چونکہ عمومی اذن موجود ہے اس میں والدین بھی شامل ہیں۔ لہٰذا ان کی قبروں پر جا کر بھی دعا رحمت و استغفار ہونی چاہیے۔ بشرطیکہ وہ اہل توحید ہوں ورنہ نہیں۔ نیز راجح مسلک کے مطابق عورتوں کو بھی زیارت قبور کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ وہاں جزع و فزع کا اظہار نہ کریں (اور زیادہ نہ جائیں)۔ چند روایات ملاحظہ فرمائیں:

① نبی ﷺ کا گزر ایک عورت کے پاس سے ہوا جو قبر پر بیٹھی رو رہی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« اِتَّقِی اللّٰهَ وَاصْبِرِیْ .» ❶

''اللہ سے ڈر اور صبر اختیار کر۔''

وجہ استدلال یہ ہے کہ آپ ﷺ کا اس عورت کو قبر پر بیٹھنے سے نہ روکنا جواز کی دلیل ہے۔(بخاری و مسلم)

② حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی جب میں قبرستان جاؤں تو کیا دعا پڑھوں؟ فرمایا پڑھ:

« اَلسَّلَامُ عَلٰی أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَيَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَأْخِرِيْنَ وَإِنَّا إِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ .» ❷ (مسلم)

③ عبداللہ بن ابی ملکیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک روز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آمد قبرستان کی طرف ہوئی، میں نے دریافت کیا: کہاں سے آئی ہو؟ کہا: میں اپنے بھائی ابن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی قبر سے آئی ہوں، کہا: کیا رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت سے منع نہیں فرمایا؟ کہا: پہلے کیا تھا، بعد میں اجازت دے دی تھی۔ ❸ حاکم نے روایت ھذا پر سکوت کیا ہے۔ اور ذہبی نے اس کو صحیح کہا ہے اور حافظ عراقی نے اس کی سند کو جید کہا ہے۔ (تخریج إحیاء علوم الدین ٤/ ٥٢١)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خاوند رسول اکرم ﷺ اور والد گرامی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کے گھر ہی میں مدفون ہیں جو ہر وقت کا مشاہدہ تھا آمد و رفت کا کوئی مسئلہ نہیں۔ مسئلہ ہذا پر ''الاعتصام'' میں تفصیلی گفتگو پہلے بھی شائع ہو چکی ہے۔

---

❶(٥٤٩) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب زیارة القبور (١٢٨٣) صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب فی الصبر علی المصیبة (٢١٤٠).

❷(٥٥٠) صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب ما یقال عند دخول القبور (٩٧٥).

❸(٥٥١) الحاکم (٣٧٦/١) (١٣٩٢)، المشکاة (١٧١٨)

سوال: قبرستان میں نماز کی ممانعت سے اتفاق ہے مگر غالباً ''مشکوٰۃ'' کی شرح ''مظاہر حق'' میں یہ بات دیکھی کہ بیت اللہ میں سابق انبیاء کی ۷۰ کے قریب قبریں ہیں۔ جس طرح عام قبرستان مسمار کر کے مدرسہ تعمیر ہوا ہو نیز نئی مثال دارالحکومت اسلام آباد پرانے قبرستان میں عام مساجد ہوں گی۔ تفصیل لکھیں؟

جواب: ''بیت اللہ'' میں انبیاء علیہم السلام کی قبروں والا قصہ قابل اعتماد طرق سے ثابت نہیں ہو سکا۔ ہاں البتہ جس جگہ قبروں کا نام و نشان مٹ جائے وہاں تعمیر کا کوئی حرج نہیں۔ اور کفار کی قبروں کو مسمار کر کے بھی تعمیر مساجد وغیرہ کا جواز ہے۔ ملاحظہ ہو (صحیح بخاری) [1]

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ ہمارے آباء واجداد کی قبریں ہم نے اپنے گھر میں بنوائی تھیں۔ اور لوگ اب ان کی پوجا و پرستش کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے کئی دفعہ ہمارا لوگوں سے جھگڑا بھی ہو چکا ہے۔ اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ ان قبروں کا یہاں سے نام و نشان ہی مٹا دیا جائے تاکہ شرک کا خطرہ باقی نہ رہے۔ کیا شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب: توحید و سنت کے احیاء کی خاطر اور جذبۂ ایمانی کے تقاضوں کے مطابق آپ لوگوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنی جدی پشتی قبروں کو زمینی سطح کے ہموار کر دیں تاکہ کسی بھی قبر پرست اور غیر اللہ کے پجاری کی نگاہ ان کی طرف اٹھنے نہ پائے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں وارد ہے:

ابوالہیاج اسدی کا بیان ہے، مجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا میں تجھے اس کام پر مقرر نہ کروں جس پر مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا تھا؟

١ ...... ''جو تصویر نظر آئے اسے مٹا کر دم لو۔''

٢ ...... ''ہر وہ قبر جو بلند ہو اسے زمین کے برابر کر دو۔'' [2] (مسلم)

اسی طرح دوسری حدیث میں ہے، ثمامہ بن شفی کہتے ہیں کہ ہم فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کے ساتھ سرزمین روم میں سفر کر رہے تھے کہ رُوْدَسْ کے مقام پر ہمارا ایک ساتھی فوت ہو گیا۔ فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق اس کی قبر زمین کے برابر کر دی گئی۔ پھر فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبر کو زمین کے برابر کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ [3]

---

[1] (٥٥٢) صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ ،باب ھل تنبش قبور مشرکی الجاھلیۃ......، (٤٢٨).

[2] (٥٥٣) صحیح مسلم، کتاب الجنائز باب الأمر بتسویۃ القبر(٢٢٤٣).

[3] (٥٥٤) صحیح مسلم، کتاب الجنائز،باب الأمر بتسویۃ القبر(٢٢٤٢)عن فضالۃ بن عبید.

اسی طرح کتب تاریخ و سیر میں یہ قصہ معروف ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب تُستر میں ہرمز کے مخزن سے دانیال علیہ السلام کی لاش برآمد ہوئی تو مختلف مقامات پر تیرہ قبریں کھود کو ان کو دفن کر کے رات کی تاریکی میں مٹی کے برابر کر کے قبروں کا نام و نشان مٹا دیا گیا تاکہ عامۃ الناس اور جہلاء کے لئے فتنہ کا سبب نہ بنے۔ ❶

پھر حدیبیہ کے مقام پر جس درخت کے زیر سایہ ''بیعت الرضوان'' کا انعقاد ہوا تھا جب اس کے بارے میں خلیفہ راشد عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ لوگ اسے متبرک سمجھ کر اس کی زیارت کے لئے اہتمام کرتے ہیں تو اس کو جڑ سے کٹوا پھینکا باوجودیکہ ❷ اس شجرۂ عظیمہ کا تذکرہ کتاب الٰہی میں بھی مصرح ہے جو اس کی عظمت پر دال ہے۔

مزید آنکہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بحالت سفر ساتھیوں کو صبح کی نماز پڑھائی۔ پھر دیکھا کہ لوگ ادھر ادھر جا رہے ہیں۔ دریافت کیا کہ یہ کہاں جاتے ہیں؟ کہا گیا: اے امیر المومنین رضی اللہ عنہ! ایک مسجد ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی تھی یہ اسی میں نماز پڑھتے ہیں۔ فرمایا: پہلی امتیں اسی وجہ سے ہلاک ہوگئیں کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کے آثار کی پیروی میں ان جگہوں میں عبادت خانے اور گرجے بنا لئے۔ جس شخص کو ان مسجدوں میں نماز کا وقت آ جائے نماز پڑھے ورنہ گزر جائے۔ ❸

پھر سب سے بین اور واضح بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو فتنے سے بچانے کی غرض سے ہی ''مسجد ضرار'' کو منہدم کر دیا تھا۔ یہاں قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ شریعت کی نگاہ میں گھروں میں قبریں بنانا مذموم فعل اور منکر کام ہے صحیح مسلم میں حدیث ہے:

« لَا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ مَقَابِرَ .» ❹

یعنی ''اپنے گھروں کو قبرستان مت بناؤ۔''

---

❶(٥٥٥) وقال ابن كثير: هذا إسناد صحيح إلى أبي العالية. البداية والنهاية (٣٨،٣٧/٢).

❷(٥٥٦) ابن ابی شيبة (١/٨٤/٢) بحواله قبروں پر مساجد للألبانی (٨٨ الاردية) والطبقات لابن سعد (١/١٦٦) غزوة رسول الله ﷺ الحديبية و فتح البارى (٤٤٨/٧) و صححه.

❸(٥٥٧) ابن ابی شيبه، كتاب الصلوات، باب فى الصلاة عند قبر النبى ﷺ و إتيانه رقم الباب (٦٦١) (١٥٣/٢) ح (٧٥٤٩)

❹(٥٥٨) صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب استحباب صلاة النافلة فى بيته..... (١٨٢٤).

شارح بخاری شریف حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

" فَإِنَّ ظَاهِرَهُ يَقْتَضِي النَّهْيَ عَنِ الدَّفْنِ فِي الْبُيُوتِ مُطْلَقًا." وَاللّٰهُ أَعْلَمُ.

(فتح الباری: ۱/ ۵۳۰)

یعنی "مذکور حدیث کا ظاہر اس بات کا متقاضی ہے کہ گھروں میں قبریں بنانا مطلقاً ممنوع ہے۔"

بنابریں گھروں میں قبروں کے آثار باقی رکھنا بھی ممنوع ٹھہرا، لازم ہے کہ فعل منکر کو تبدیل کیا جائے اس کی صورت یوں ہوسکتی ہے۔ اگر تو یہ قبریں گزرگاہ سے الگ ہیں تو ان کو زمین کے برابر کر دیا جائے۔ اور اگر راستہ میں پڑتی ہیں تو ہڈیاں نکال کر مسلمانوں کے عمومی قبرستان میں دفن کر دی جائیں۔ البتہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ مشرکین اور گور پرستوں کو جائے دفن کا علم نہ ہونے پائے؛ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ پھر کسی وقت یہاں شرک و بدعت کا اڈا قائم کر لیں۔ لہٰذا آپ بھی اس کار خیر میں مساہمت اور مسابقت کے جذبہ کا اظہار فرمائیں۔ وَالتَّوْفِيْقُ بِيَدِ اللّٰهِ.

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: "إِغَاثَةُ اللَّهْفَانِ مِنْ مَصَايِدِ الشَّيْطَانِ لِلْحَافِظِ ابْنِ قَيِّمٍ" (ص ۲۲۲ تا ۲۳۱، ۲۳۲ اور فتاویٰ أهل حديث: ۳/ ۴۱ تا ۴۴)

سوال: قبر کے ساتھ سیٹ پر نام، وفات، عمر، پتہ لکھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: قبر پر لکھنے کی ممانعت وارد ہے۔ تحریر کی جونسی صورت بھی ہو سب ممنوع ہیں۔ چنانچہ جامع ترمذی وغیرہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: انہوں نے کہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ قبر کو چونے گچ کیا جائے۔ اس پر بیٹھا جائے، اس پر عمارت بنائی جائے یا اس پر کچھ لکھا جائے۔ [1]

سوال: کیا عورتوں کا قبرستان میں جانا جائز ہے؟

جواب: عورتوں کو زیارت قبور کی گاہے گاہے اجازت ہے۔ بشرطیکہ وہاں جزع و فزع، بے صبری، بے قراری اور چیخنے چلانے کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ جواز پر دال چند ایک احادیث ملاحظہ ہوں:

① رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک عورت کے پاس سے ہوا جو قبر کے قریب بیٹھے رو رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِتَّقِي اللّٰهَ وَ اصْبِرِي. » (بخاری: ۱۲۵۲، مسلم ۶/ ۲۲۷-۲۲۸)

---

[4] (۵۵۸) صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب استحباب صلاۃ النافلۃ فی بیتہ...... (۱۸۲۴).

"اللہ سے ڈر اور صبر کر۔"

حدیث ہذا سے وجہ استدلال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کو صرف اللہ کے ڈر اور صبر کی تلقین کی ہے زیارت قبور سے منع نہیں فرمایا۔ اگر یہ ناجائز ہوتا تو روک دیتے۔ اصول فقہ میں قاعدہ معروف ہے:

" تَاخِيرُ الْبَيَانِ عَنْ وَقْتِ الْحَاجَةِ لَا يَجُوزُ ."

② حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ جب میں قبرستان جاؤں تو کیا کہوں تو فرمایا:

« اَلسَّلَامُ عَلٰى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمِينَ وَ يَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنَّا وَالْمُسْتَأْخِرِينَ وَ إِنَّا إِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُونَ .» [1]

(مسلم ٤٤/٧، النسائی ٩٢/٤-٩٣)

③ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی قبر کی زیارت سے واپس آ رہی تھیں۔ عبداللہ بن ابی ملیکہ نے کہا کیا رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو قبروں کی زیارت سے منع نہیں کیا؟ فرمایا منع تو کیا تھا لیکن بعد میں اجازت مرحمت فرما دی تھی۔ [2] حافظ عراقی نے کہا اس کی سند جید ہے۔ (تخريج إحياء علوم الدين ٥٢١/٤)

نیز امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر جو لعنت وارد ہے یہ بطور مبالغہ ہے اور قبرستان میں اکثر و بیشتر جانے والی عورتوں کے متعلق ہے کیوں کہ اس سے خاوندوں کے حقوق ضائع ہونے کا اندیشہ ہے، بے پردگی ہوتی ہے۔ بعض دفعہ نوحہ وغیرہ کرنے لگتی ہیں۔ اگر یہ کوتاہی نہ ہو تو پھر اجازت ہے کیونکہ موت کی یاد کے لئے جیسے مرد محتاج ہیں ایسے ہی عورتیں بھی محتاج ہیں۔"

امام شوکانی رحمہ اللہ "نیل الاوطار" میں اس عبارت کے اختتام پر فرماتے ہیں:

" وَ هٰذَا الْكَلَامُ هُوَ الَّذِي يَنْبَغِي اِعْتِمَادُهُ فِي الْجَمْعِ بَيْنَ الْأَحَادِيثِ الْمُتَعَارِضَةِ فِي الظَّاهِرِ ."

---

[1] (٥٥٩) انظر، الرقم المسلسل (٥١٥)

[2] (٥٦٠) صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب ما يقال عند دخول القبور (٩٧٥).

یعنی ''قرطبی کا یہ کلام قابل اعتماد ہے جس سے بظاہر متعارض احادیث میں تطبیق ہو جاتی ہے۔''

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (فتح الباری ۲٤٨/٣)

سوال: میت پر رونے، پیٹنے اور بال نوچنے کے متعلق قرآن مجید اور احادیث مبارکہ سے وضاحت کریں؟

جواب: میت پر چلا کر رونا پیٹنا، گریبان پھاڑنا اور بین کرنا یہ سب امور حرام ہیں۔ بخاری اور مسلم میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''وہ شخص ہم میں سے نہیں (یعنی ہمارے طریقے پر نہیں) جو اپنے رخسار پیٹے، گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی پکار پکارے یعنی نوحہ اور واویلا کرے۔''❶

اور سنن ابوداؤد میں حدیث ہے:

''لعنت کی رسول اللہ ﷺ نے نوحہ کرنے والی عورت کو اور نوحہ سننے والی عورت کو۔''❷

نیز بخاری و مسلم میں ہے:

''میں بیزار ہوں اس سے جو (موت کی مصیبت میں) سر کے بال منڈائے اور چلا کر روئے اور اپنے کپڑے پھاڑے۔''❸ اور ایک حدیث قدسی میں ہے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میرے (اس) مومن بندے کے لئے بہشت ہے جس کے پیارے کو میں اہل دنیا سے قبض کرتا ہوں اور وہ اس کی موت پر صبر کرے۔''❹ (بخاری)

سوال: کیا نماز جنازہ کے بعد قبر تیار ہونے کے بعد (اکثر دیوبندی علماء حضرات اور بعض چھوٹی چھوٹی نماز کی کتب اہل حدیث میں بھی نظر سے گزرا ہے) قبر کی سرہاندی پر کھڑے ہو کر ﴿ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيهِ ...... تا ...... مُفْلِحُوْنَ .﴾ (البقرہ:۲) اور ٹانگوں کی طرف ﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَا اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ .﴾ (الحشر:٥٩) پڑھنے کے بعد ایک بار سورہ فاتحہ اور گیارہ بار سورہ اخلاص پڑھتے ہیں۔ کیا یہ طریقہ جائز ہے؟

جواب: مذکورہ آیات کا قبرستان میں ورد و وظیفہ کرنا رسول اللہ ﷺ سے قطعاً ثابت نہیں ہے۔ صحیح حدیث

---

❶(٥٦٢) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب لیس منا من شق الجیوب (١٢٩٤،١٢٩٧)، مسلم کتاب الایمان، باب تحریم ضرب الخدود......(٢٨٥).

❷(٥٦٣) ضعفه الألبانی، ضعیف ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب النوح (٣١٢٨).

❸(٥٦٣٤)صحیح البخاری(١٢٩٦)، صحیح مسلم(٢٨٧).

❹(٥٦٥)صحیح البخاری، کتاب المرضی، باب فضل من ذهب بصره(٥٦٥٣) اس حدیث میں ''پیارے'' سے مراد ''آنکھیں'' ہیں۔

میں ہے:« مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ .»❶

یعنی ''جس نے دین اسلام میں اضافہ کیا وہ مردود ہے۔''

سوال: میرے والد صاحب تقریباً ڈیڑھ دو ماہ پہلے فوت ہوئے تھے۔ ان کی قبر اندر کی طرف گر گئی تھی۔ اور پکی سلیں میت کے اوپر گر گئی تھیں۔ ہم نے اسی طرح قبر پر مٹی ڈال کر قبر صحیح حالت میں کر دی۔ یہ تقریباً پندرہ روز پہلے کی بات ہے۔ آپ سے سوال یہ ہے کہ کیا قبر کو دوبارہ کھود کر ان کے اوپر سے وزن اٹھا کر پھر دوبارہ قبر بنا دی جائے یا ایسے ہی رہنے دیا جائے؟

جواب: آپ کے والد صاحب مرحوم کی قبر جس حالت میں ہے اسی میں رہنے دیں۔ تجدید کی ضرورت نہیں معاملہ اللہ کے سپرد کریں۔ اس کے ہاں نیکی و تقویٰ کی بنیاد پر بہت ہی آسانی و کشادگی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی قبر منور فرمائے۔ آمین!

سوال: کیا مٹی ڈالنے سے پہلے قبر پر سلیں یا پھٹے ڈالنا ضروری ہیں۔ یا اسی طرح میت پر مٹی ڈال دی جائے؟

جواب: مٹی اور میت کے درمیان کوئی شے حائل ہونی چاہیے اسی طرح مٹی ڈالنا احترام میت کے منافی ہے۔ عمرو بن حزم فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایک قبر پر ٹیک لگائے دیکھا، فرمایا: اس قبر والے کو ایذا نہ دو۔''❷ (رواہ أحمد)

نیز فرمایا: نبی اکرم ﷺ نے میت کی ہڈی توڑنا زندہ کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے۔❸ ان روایات سے معلوم ہوا احترام میت کے منافی کوئی فعل نہیں ہونا چاہیے۔ احادیث میں وارد لفظ (سامی) لحد (بغلی قبر) کا تقاضا بھی یہی ہے کہ درمیان میں آڑ ہو۔

---

❶(٥٦٦) صحيح البخاري، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود(٢٦٩٧).

❷(٥٦٧) الحاكم ٣/ ٥٩١ (٦٥٠٢)، مجمع الزوائد(٣/٦١)، مرعاة المفاتيح (٥/ ٤٥٧)، المشكوة (١٧٢١) للألباني وقال: لم أجده في المسند بل أجزم أنه ليس فيه؛ بل إن عمرو بن حزم ليس له في مسند أحمد مطلقا. و قال: فيه ابن لهيعة وهو ضعيف.

❸(٥٦٨) صححه الألباني، احمد(٦/٥٨، ١٦٨)، (٢٤١٨٩)، و قال محققه۔ حمزة ۔ اسناده صحيح و صحيح ابى داؤد كتاب الجنائز، باب في الحفار يجد العظم حل...... (٣٢٠٧)، عن عائشة و ابن ماجه (١٦١٦)، عنها و عن ام سلمة رضى الله عنهما والارواء (٧٦٣).

سوال: جب مردوں کو سلام کہا جائے تو کیا وہ سنتے ہیں، اگر سنتے ہیں تو جواب دیتے ہیں یا نہیں؟

جواب: کسی صحیح حدیث میں بوقت سلام اموات کے سماع اور پھر جواب دینے کی تصریح موجود نہیں ہے بلکہ قرآن مجید میں نفی مصرح ہے:

﴿ وَمَا أَنْتَ بِسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ . ﴾ (الفاطر: ۲۲)

''اور تم ان کو جو قبروں میں مدفون ہیں نہیں سنا سکتے۔''

دوسری جگہ ہے:

﴿ إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى . ﴾ (النمل: ۸۰)

نیز فرمایا:

﴿ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآءِ هِمْ غَافِلُوْنَ . ﴾ (الأحقاف: ۵)

''اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوسکتا ہے جو اللہ کے سوا ایسے کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہ دے سکے۔''

اگر کوئی کہے دعائیہ کلمات میں صیغہ تخاطب و نداء کا تقاضا ہے کہ مردوں کو سماعت حاصل ہو، سو اس اشکال کا جواب یوں ہے کہ عربی زبان کا اُسلوب ہے کہ '' مَالَا يَعْقِلُ '' سے بسا اوقات معاملہ '' ذَوِي الْعُقُوْل . '' جیسا کیا جاتا ہے جس طرح کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ''حجر اسود'' سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا: ''إِنِّيْ لَأَعْلَمُ إِنَّكَ حَجَرٌ .''[1] اسی طرح یہاں بھی سمجھ لیں۔

فقہاء حنفیہ نے بے شمار نصوص میں مردوں کے عدم سماع کی تصریح کی ہے۔ بطور امثلہ چند ایک نمونے ملاحظہ فرمائیں:

علامہ ابن الھمام ''فتح القدیر'' کتاب الجنائز میں فرماتے ہیں:

''هٰذَا عِنْدَ أَكْثَرِ مَشَائِخِنَا وَهُوَ أَنَّ الْمَيِّتَ لَا يَسْمَعُ عِنْدَهُمْ عَلٰى مَا صَرَّحُوْا بِهٖ فِيْ كِتَابِ الْأَيْمَانِ فِيْ بَابِ الْيَمِيْنِ بِالضَّرْبِ لَوْ حَلَفَ لَا يُكَلِّمُ فُلَانًا فَكَلَّمَهٗ مَيِّتًا لَا يَحْنُثُ. لِأَنَّهَا تَنْعَقِدُ عَلٰى مَاحَيْثُ يَفْهَمُ وَالْمَيِّتُ لَيْسَ كَذٰلِكَ لِعَدَمِ اسْتِمَاعِ

---

[1] (۵۶۹) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب استحباب تقبیل الحجر الأسود فی الطواف (۳۰۶۷).

".(انتهى) " وَ أَيضاً فِيهِ فِيْ ذٰلِكَ الْبَابِ قَوْلُه :وَ كَذٰلِكَ الْكَلَامُ يَعْنِيْ إِذَا حَلَفَ لَا يُكَلِّمُهُ اقْتَصَرَ عَلَى الْحَيٰوةِ فَلَوْ كَلَّمَه بَعْدَ مَوْتِه لَا يَحْنَثُ فَإِنَّ الْمَقْصُوْدَ مِنْهُ الْإِفْهَامُ وَالْمَوْتُ يُنَافِيْهِ لِأَنَّهُ لَا يَسْمَعُ فُلَانٌ يَفْهَمُ . " انتهى.❶

اور ''فصول فی علم الاصول'' میں ہے:

" لَوْ حَلَفَ لَا يُكَلِّمُ فُلَانًا وَ كَلَّمَه بَعْدَ الْمَوْتِ أَوْ ضَرَبَهُ بَعْدَ الْمَوْتِ لَا يَحْنَثُ لِعَدَمِ مَعْنَى الْإِفْهَامِ وَالْإِعْلَامِ ."

اور ''اصول الشاشی'' میں ہے:

" مَنْ حَلَفَ لَا يُكَلِّمُ فُلَانًا فَكَلَّمَهُ بَعْدَ الْموْتِ لَا يَحْنَثُ لِعَدَمِ الْإِسْمَاعِ ."

اور تفسیر ''جامع البیان'' میں زیر آیت :﴿ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ .﴾ ہے:

" أَيِ الْكُفَّارُ الَّذِيْنَ كَالْمَوْتٰى لَا يَسْمَعُوْنَ ."

اور تفسیر ''جلالین'' میں ہے:

" أَيِ الْكُفَّارُ شَبَّهَهُمْ بِهِمْ فِيْ عَدَمِ السَّمَاعِ ."

اور بدر کے مقتولین سے نبی ﷺ نے جو خطاب فرمایا تھا اس کا جواب بعض حنفیہ نے یوں دیا ہے:

" وَلَئِنْ ثَبَتَ فَهُوَ مُخْتَصٌّ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ يَجُوْزُ اَنْ يَّكُوْنَ ذٰلِكَ لِوَعْظِ الْاَحْيَاءِ لَا عَلٰى سَبِيْلِ الْخِطَابِ لِلْمَوْتٰى ."

یعنی ''اگر یہ قصہ ثابت ہو جائے تو نبی ﷺ کے ساتھ مخصوص ہوگا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ مقصود اس سے زندہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا ہو مردوں کے لئے خطاب نہیں۔''

(فتاویٰ علمائے اہل حدیث: ۵/۴۴۴)

سوال: قبرستان میں جا کر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا کیسا ہے؟

جواب: قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« حَتّٰى جَاءَ الْبَقِيْعَ فَقَامَ فَأَطَالَ الْقِيَامَ ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ انْحَرَفَ

❶(٥٦٩) صحيح مسلم، كتاب الحج، باب استحباب تقبيل الحجر الأسود فى الطواف (٣٠٦٧).

فَانْحَرَفْتُ .» ❶ (مسلم:۱/۳۱۳، سنن النسائی:۱/۲۸۶ وصـ ۲۸۹، اَلْاَمْرُ بِالْاِسْتِغْفَارِ لِلْمُؤْمِنِیْنَ)

سوال: جنازہ کو دفنانے کے بعد اجتماعی دعا کا کیا حکم ہے؟

جواب: دفن کے بعد میت کے لئے دعائے مغفرت کرنا اسوۂ رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے ثابت ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ إِذَا فَرَغَ مِنْ دَفْنِ الْمَیِّتِ وَقَفَ عَلَیْہِ فَقَالَ « اِسْتَغْفِرُوْا لِأَخِیْکُمْ ثُمَّ سَلُوْا لَہٗ بِالتَّثْبِیْتِ فَإِنَّہُ الْآنَ یُسْأَلُ .» ❷

(رَوَاہُ أَبُوْدَاوٗدَ وَ قَالَ الْعَزِیْزِیُّ إِسْنَادُہٗ حَسَنٌ)

یعنی ''نبی ﷺ دفن میت سے فارغ ہو کر قبر پر کھڑے ہوتے اور فرماتے اپنے بھائی کے لئے دعا بخشش کرو۔ پھر اس کے لئے اللہ کے حضور ثابت قدمی کی درخواست کرو اور وہ اس وقت سوال کیا جاتا ہے۔''

حدیث ہذا محتمل ہے کہ دعائے استغفار انفرادی ہو یا اجتماعی ہاتھ اٹھا کر ہو یا بلا ہاتھ اٹھانے کے۔ البتہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ انفرادی طریقہ کو اپنایا جائے اور ہاتھ اٹھانا بھی ضروری نہیں۔ اس کے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ ہاتھ اٹھانا جائز ہے۔ کَمَا سَبَقَ.

سوال: فوت شدہ آدمی کے گھر تین دن کے بعد تعزیت کی خاطر جانا درست ہے یا نہیں؟

جواب: تعزیت کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں ممکنہ حد تک قریب ترین فرصت میں اظہارِ تعزیت ہونا چاہیے۔ جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی کے بچے کی وفات پر بایں الفاظ تعزیت فرمائی:

« إِنَّ لِلّٰہِ مَا أَخَذَ وَلَہٗ مَا أَعْطٰی وَکُلُّ شَیْئٍ عِنْدَہٗ بِأَجَلٍ مُسَمًّی .» ❸

مزید علامہ ابن قیم فرماتے ہیں:

"تَعْزِیَۃُ أَھْلِ الْمَیِّتِ وَ لَمْ یَکُنْ مِنْ ھَدْیِہٖ أَنْ یَجْتَمِعَ لِلْعَزَآءِ وَ یُقْرَأَ لَہُ الْقُرْآنُ لَا عِنْدَ

---

❶(۵۷۱) صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب ما یقال عند دخول القبور(۲۲۵۵، ۲۲۵۶)

❷(۵۷۲) صححہ الألبانی. صحیح أبی داؤد، کتاب الجنائز، باب الاستغفار عند القبور للمیت فی وقت الانصراف (۳۲۲۱).

❸(۵۷۳) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبی ﷺ: ((یعذب المیت ......)) (۱۲۸۴)، صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب البکاء علی المیت (۲۱۳۵).

قَبْرِهٖ وَلَا غَيْرِهٖ وَكُلُّ هٰذَا بِدْعَةٌ حَادِثَةٌ مَكْرُوْهَةٌ وَكَانَ مِنْ هَدْيِهِ السُّكُوْنُ وَالرِّضَا بِقَضَاءِ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالْاِسْتِرْجَاعُ وَيَبْرَأُ مِمَّنْ خَرَقَ لِأَجْلِ الْمُصِيْبَةِ ثِيَابَهٗ أَوْ رَفَعَ صَوْتَهٗ بِالنَّدْبِ وَالنِّيَاحَةِ أَوْ حَلَقَ لَهَا شَعْرَهٗ . وَكَانَ مِنْ هَدْيِهٖ أَنَّ أَهْلَ الْمَيِّتِ لَايَتَكَلَّفُوْنَ إِطْعَامَ النَّاسِ بَلْ أَمَرَ أَنْ يَصْنَعَ النَّاسُ لَهُمْ طَعَامًا يُرْسِلُوْنَه إِلَيْهِمْ . وَهٰذَا مِنْ أَعْظَمِ مَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ وَالشِّيَمِ وَالْأَحْمَلُ عَنْ أَهْلِ الْمَيِّتِ فَإِنَّهُمْ فِيْ شُغْلٍ بِمَصَابِهِمْ عَنْ إِطْعَامِ النَّاسِ وَكَانَ مِنْ هَدْيِهٖ تَرْكُ نَعْيِ الْمَيِّتِ بَلْ كَانَ يَنْهٰى عَنْهُ وَيَقُوْلُ هُوَ مِنْ عَمَلِ الْجَاهِلِيَّةِ وَقَدْ كَرِهَ حُذَيْفَةُ أَنْ يُّعْلِمَ بِه أَهْلُهُ النَّاسَ إِذَا مَاتَ وَقَالَ:أَخَافُ أَنْ يَّكُوْنَ مِنَ النَّعْيِ" (زَادُ الْمَعَاد، الجزء الأول ص: ١٤٦)

یعنی ’’تعزیت کے لئے اہل میت کے ہاں جمع ہونا رسول اللہ ﷺ کا طریقہ نہیں تھا اور نہ میت کے لئے قرآن خوانی کرنا قبر کے پاس اور نہ اس کے علاوہ۔ یہ جملہ امور خود ساختہ بدعات مکروہ میں شامل ہیں۔ آپ ﷺ کا طریقہ کار یہ تھا کہ ایسے موقعہ پر خاموشی اختیار کرتے اور اللہ کی قضاء و قدر کے ساتھ رضاء کا اظہار فرماتے۔ اللہ کی حمد و ثناء کرتے، ’’إِنَّا لِلّٰهِ‘‘ پڑھتے۔ جو آدمی مصیبت کے موقعہ پر کپڑے پھاڑتا یا نوحہ کرتا یا سر منڈاتا اس سے بیزاری کا اظہار کرتے اور آپ ﷺ کی سنت سے یہ بھی ہے کہ اہل میت لوگوں کو کھانا کھلانے کی تکلیف نہ کریں۔ بلکہ لوگ کھانا تیار کر کے ان کے پاس بھیجیں۔ یہ بات آپ کے عظیم اخلاق کی نشاندھی کرتی ہے۔ اہل میت کی پریشانی کی بناء پر لوگوں کو کھانا کھلانے کا بوجھ ان سے ہلکا کر دیا ہے۔ اور پھر آپ ﷺ کا طریقہ یہ بھی تھا کہ کسی کی موت پر واویلا اور تشہیر عام کرنے سے روکتے فرماتے یہ جاہلیت کے اُمور سے ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے مکروہ سمجھا کہ ان کے اہل خانہ ان کی وفات کی کسی کو اطلاع کریں۔ کہا مجھے اس بات کا خوف ہے کہ کہیں یہ ’’نعی‘‘ میں شمار نہ ہو۔

سوال: قبر کی مضبوطی کے لئے اکیلی ایک بوہڑی، پتھر لگا کر درجوں میں سیمنٹ بھرنا جائز ہے۔ یا نہیں؟

جواب: قبر پر آگ سے پکی ہوئی شی استعمال کرنے سے احتراز چاہیے۔ قرآن میں ہے:

﴿ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى . ﴾ (طه:٥٥)

یعنی ''ہم نے مٹی سے تمہیں پیدا کیا اور اس میں تمہیں لوٹائیں گے، اور اسی سے تمہیں دوبارہ نکالیں گے۔''

پھر برزخی معاملات میں قبر کی مضبوطی کو کوئی خاص اہمیت نہیں یہ محض طفل تسلی ہے۔

سوال: نئی قبر پر درندوں کے خوف سے لالٹینیں جلانا ویسے آگ جلانا کہ روشنی کی وجہ سے قبر کو درندے نقصان نہ پہنچائیں، جائز ہے؟

جواب: قبر پر چراغ یا آگ جلانا منع ہے۔ قبر کی حفاظت کے لئے خاردار لکڑیاں رکھی جا سکتی ہیں یا کوئی اور مباح قسم کا انتظام کر لینا چاہیے یا پھر لالٹین یا آگ کو قبر سے ہٹ کر دور رکھ دیا جائے تو بظاہر کوئی حرج نہیں: «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ.» ❶

سوال: یہ کہ قبرستان میں جو درخت ہوں انہیں اپنے استعمال میں لایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ خصوصاً جو متبرک سمجھے جاتے ہوں؟

جواب: قبر پر واقع درخت کو اپنے استعمال میں لانے میں کوئی حرج نہیں۔ کسی درخت کی کوئی خصوصیت نہیں سب برابر ہیں۔

سوال: قبر پر قرآنی آیات یا فوت شدہ کا نام و تاریخ وفات وغیرہ تحریر کرنا کیسا ہے؟

جواب: احادیث میں قبر پر لکھنے سے منع کیا گیا ہے۔ تحریر کی جونسی شکل ہو مطلقاً ناجائز ہے:

« نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يُجَصَّصَ الْقُبُورُ وَ أَنْ يُكْتَبَ عَلَيْهَا .» ❷ (ترمذی)

سوال: قبر پر پودے لگائے جا سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: قبر پر پودے لگانے کا واضح کوئی ثبوت موجود نہیں۔

سوال: بعض ملحدین عذاب قبر کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قبر میں عذاب نہیں ہوگا۔ کیونکہ قبر میں انسان کا صرف جسم ہوگا۔ اس کی روح آسمان پر ہوگی اور یہ سارے عذاب قیامت کے دن دیئے جائیں گے۔ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ فرعون اور آل فرعون کو ہر روز صبح و شام عذاب دیا جاتا ہے جب کہ فرعون کی لاش تو مصر یا پھر فرانس میں رکھی ہے اور جو سیلاب میں بہ گیا یا جو جل گیا، جیسے ہندو جلاتے ہیں یا کہ اس کے جسم کی راکھ بن گئی اس کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟

---

❶ (٥٧٤) صحيح البخاری بدء الوحی (١).

❷ كتاب الجنائز [illegible] (١٠٥٢)

جواب: ''عذاب قبر'' کا مسئلہ کتاب وسنت کی بے شمار نصوص میں ثابت شدہ ہے۔ کسی مومن کے لائق نہیں کہ اس کا انکار کرے اور جہاں تک عذاب کی کیفیت کا تعلق ہے سو یہ برزخی معاملہ ہے جس کا دنیا میں فیصلہ کرنا انسانی استطاعت سے ماوراء ہے۔ اکٹھے دو سوئے ہوئے آدمی بحالت خواب مختلف مناظر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایک نعمتوں میں اور دوسرا عذاب میں، کسی کو دوسرے کی حالت کا شعور نہیں ہونے پاتا، حالانکہ وہ ایک ہی جگہ آرام فرما ہیں۔ سو برزخی معاملہ تو بہت وسیع ہے۔ جس کا ادراک انسانی دائرہ اختیار سے خارج ہے۔ بس اس پر ایمان لانا واجب ہے۔ روح قبض ہونے کے ساتھ ہی حقیقت حال منکشف ہو جاتی ہے۔ یاد رہے نصوص شریعت میں کیڑے نکالنا الحاد کے علمبرداروں کا امتیازی نشان ہے۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ محدثین کرام کی خدمات نصف النہار کی طرح عیاں ہیں کھرے اور کھوٹے سکے کا بازار علیحدہ علیحدہ جما دیا ہے: ﴿ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَ مَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ ہزاروں افراد کے حالات زندگی کو معیار حق کی کسوٹی پر پرکھنا ان کا عظیم کارنامہ ہے جن کی مثال پیش کرنے سے تاریخ عالم قاصر ہے۔ اللہ رب العزت ان کی مساعیٔ جمیلہ قبول فرما کر اعلیٰ علیین میں مقام عنایت فرمائے! اور ہمیں شکر گزاری کی توفیق بخشے! احسان فراموش ہونا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

ملحدین کو قائل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ حسب استطاعت پہلے اپنے کو ضروری علم سے مسلح کریں پھر علیٰ وجہ البصیرت ان کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دیں۔ تو امید ہے کہ دعوت نتیجہ خیز ثابت ہو گی اور اشکالات کی صورت میں پختہ کار اہل علم کی طرف رجوع کریں۔ اور ایک عام آدمی کے لئے بھی یہ ہے کہ اپنی زبان میں موضوع سے متعلقہ صحیح العقیدہ علماء کی کتابوں کو پڑھ کر کما حقہ واقفیت حاصل کر کے ٹھوس دلائل کی روشنی میں عقل ونقل سے ان کو قائل کرنے کی سعی کرے۔ وَالتَّوْفِيْقُ بِيَدِ اللّٰهِ .

❀❀❀❀❀❀❀

قصہ ہاروت و ماروت اللہ رب العزت نے سورہ بقرہ کی آیت: ۱۰۲ کے ضمن میں بایں الفاظ بیان فرمایا ہے:

﴿ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ. ﴾ (سورة البقرة: ١٠٢)

﴿۲۷﴾ تاریخی حالات و واقعات

سوال: جناب ہمارے گاؤں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ایک قوم ایسی تھی جو جادو ٹونے بہت زیادہ کرتی تھی۔ وہ انسان کو بکرا اور مچھر بنا دیتے تھے۔ وہ حد سے گزر چکے تھے۔ ایک دن اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو ان کے پاس بھیجا تا کہ ان کا امتحان لیا جائے۔ چنانچہ حضرت جبریل علیہ السلام ایک انسان کی شکل میں زمین پر آئے اور ایک چرواہے سے پوچھا کہ اس وقت جبریل علیہ السلام کہاں ہوں گے؟ اس نے اپنی لٹھ اپنے چاروں طرف گھمائی، اور کہا کہ نہ وہ آسمان پر ہے اور نہ اردگرد یا وہ تم ہو یا میں ہوں۔ یہ بات سن کر حضرت جبریل اللہ تعالیٰ کے پاس گئے۔ اللہ تعالیٰ کو سارا واقعہ سنایا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس قوم کو تباہ کر دیا جائے اور اس قوم کو تباہ کر دیا گیا۔ کیا یہ واقعہ صحیح ہے یا غلط؟

جواب: واقعہ ہذا من گھڑت ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کتنے نبی زندہ آسمان پر اٹھائے؟ ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت ادریس علیہ السلام اور حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق بتائیں کہ ان کی قبریں کہاں ہیں؟

جواب: نص صریح صحیح میں صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ [1] اور حضرت ادریس کے بارے میں بعض آثار و اقوال وارد ہیں۔ [2] امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ''فتاوی کبریٰ'' میں فرماتے ہیں۔ کسی بھی نبی کی قبر کے بارے میں یقیناً کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں ہے؟ سوائے ہمارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ ان کی قبر مبارک

---

[1] (۵۷۸) ﴿بل رفعه الله إليه و كان الله عزيزا حكيما﴾ (النساء: ۱۵۸) وقال ابن عباس ورُفع عيسىٰ من روزنة في البيت إلى السماء. ابن كثير (۱/۶۳۴) و قال: إسناده صحيح إلى ابن عباس.

[2] (۵۷۹) قال الإمام ابن جرير الطبري في تفسيره جامع البيان: "إن الله رفعه وهو حيي إلى السماء الرابعة". (تفسير سورة مريم: ۵۷) ابن کثیر میں ابن عباس کی طرف منسوب قول میں ہے: ان کو زندہ چوتھے آسمان پر اٹھا لیا گیا، پھر ان کی روح قبض ہوئی۔ (۱۴۰/۳)۔

مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے کونہ میں واقع ہے۔

سوال: اویس قرنی کون تھا، کیا تھا؟

أ: کیا اس کو رضی اللہ عنہ کہنا جائز ہے؟

ب: کیا اویس قرنی کی قبر بہاولپور میں ہے؟

جواب: اویس قرنی یمن میں اللہ کا ایک نیک بندہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نشانیوں کے ساتھ اس کی آمد کی بشارت دی تھی۔ نیز فرمایا:

« فَمُرُوهُ فَلْيَسْتَغْفِرْ لَكُمْ .» ❶ (رواہ مسلم)

یعنی ''اسے کہنا کہ تمہارے لئے بخشش کی دعا کرے۔''

رسول اللہ ﷺ نے اس کو خیر التابعین کے لقب سے بھی یاد فرمایا ہے۔ ❷

أ: عام طور پر لفظ ''رضی اللہ عنہ'' صحابہ پر بولا جاتا ہے۔ دیگر پر ''رحمۃ اللہ علیہ'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن بعض لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد والے لوگوں پر بھی وسعت کے اعتبار سے ''رضی اللہ عنہ'' کا اطلاق کر دیتے ہیں جو محل نظر ہے۔ جبکہ جواز کا فتویٰ گزر چکا ہے۔ ص:

ب: مذکورہ بالا اوصاف سے متصف اویس قرنی کی قبر تاریخی طور پر بہاول پور میں ثابت نہیں ہو سکی۔ ممکن ہے موجود صاحب قبر ان کا ہم نام کوئی اور ہو۔

سوال: کیا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا دور بھی خلافت راشدہ میں شمار کیا جا سکتا ہے؟

جواب: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ خلیفہ ہی نہیں بنے لہٰذا ان کے عہد کو خلافت راشدہ میں شامل کرنا چہ معنی دارد؟

سوال: کیا رسول اللہ ﷺ نے یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کو کسی حدیث میں جنتی کہا ہے؟

جواب: کسی صحیح حدیث میں اس بات کی تصریح نہیں کہ نصاً رسول اکرم ﷺ نے یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کو جنتی قرار دیا ہو۔ البتہ بعض شارحین نے فرمان رسول اللہ ﷺ:

« أَوَّلُ جَيْشٍ مِنْ أُمَّتِي يَغْزُوْنَ مَدِيْنَةَ قَيْصَرَ مَغْفُوْرٌ لَهُمْ .» ❸

(بخاری، بابُ مَا قِيلَ فِي قِتَالِ الرُّوْمِ)

---

❶ (٥٨٠) صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل أويس القرني رضى الله عنه (٦٤٩١).

❷ (٥٨١) مسلم (٦٤٩١).

❸ (٥٨٢) صحيح البخاری، كتاب الجهاد والسير، باب أيضاً (٢٩٢٤).

یعنی ''میری امت کا پہلا لشکر جو مدینہ قیصر یعنی قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوگا انہیں معاف کیا ہوا ہے۔''

سے یہ سمجھا ہے کہ یہ وہی غزوہ ہے جو ۵۲ ہجری میں یزید کی قیادت میں ہوا تھا۔ (فتح الباری ۱۰۳/٦)

جب کہ مدینہ قیصر پر اس سے پہلے بھی ایک غزوہ ہو چکا تھا۔ اور وہ غزوہ ہے جو حضرت عبدالرحمٰن بن خالد بن الولید کی قیادت میں ہوا ہے۔ [1] ملاحظہ ہو: (سنن أبی داؤد، باب فی قوله تعالیٰ: ﴿ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾

لیکن اس میں یہ شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ جامع ترمذی کی روایت میں عبدالرحمٰن کی بجائے فضالۃ بن عبید کا ذکر ہے۔ [2] ان کا انتقال سن ۵۸ ہجری میں ہوا۔ اس صورت میں امکان موجود ہے کہ غزوہ ھذا سن ۵۲ ہجری کے بعد ہو لیکن حضرت عبدالرحمٰن کا انتقال سن ۴۶ھ ہجری سے قبل تقریباً پانچ سال ہوا ہے۔ اس صورت میں یہ غزوہ حتمی طور پر سن ۵۲ ہجری سے پہلے ہوگا۔

سوال: صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ کے سفر سے کیوں روکا؟

جواب: حالات کی نزاکت کے پیش نظر احباب نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو سفر کوفہ سے روکا۔ کوفیوں کی بے وفائی سب کے ہاں عیاں تھی۔ اس سے پہلے شہادت علی رضی اللہ عنہ کا سانحہ اور حضرت مسلم بن عقیل سے ان کی بدسلوکی سے سب واقف تھے۔ یہاں تک کہ بعد میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بذات خود بھی واپسی کی چاہت کا اظہار کرنا پڑا۔ اور فرمایا تھا:

''خَذَلَتْنَا شِيْعَتُنَا '' (كِتَابُ خَلَاصَةِ الْمَصَائِبِ لِلشِّيْعَةِ)

یعنی ''ہمارے شیعہ نے ہم کو ذلیل کیا ہے۔''

اسی کتاب میں مزید مرقوم ہے۔ یعنی وہ امام کے قتل کرنے والے سب کوفی تھے۔ ان میں نہ کوئی شامی تھا اور نہ کوئی حجازی۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ: ﴿ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا . ﴾ (الأحزاب:۳۸) کا ظہور عظیم سانحۂ کربلا کی شکل میں امت مسلمہ کے لئے مصائب و تکالیف کا سبب بن گیا جس کا مداوا قیامت تک نہ ہو سکے گا۔

---

[1] (۵۸۳) صححه الألبانی، صحیح أبی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی قوله تعالیٰ: ﴿ولا تلقوا بأیدیکم إلی التهلکة﴾ (۲۵۱۲).

[2] (۵۸٤) صححه الألبانی، صحیح الترمذی، أبواب التفسیر من سورة البقرة (۳۱٦۵)، الصحیحة (۱۸/۱، ۱۹) رقم (۱۳).

سوال: امیر یزید کے ہاتھ پر جلیل القدر اور خانوادۂ نبوت کے کتنے افراد نے بیعت کی؟

جواب: ظاہر یہ ہے کہ باقی ماندہ سب نے یزید سے عہد وفا کر لیا تھا کیونکہ شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد سفر شام میں سبھی حضرات راضی خوشی واپس آئے تھے حتی کہ خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی قبل ازیں یزید سے بیعت کی خواہش کر چکے تھے۔ جملہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ''تاریخ طبری'' وغیرہ۔

سوال: قصہ ہاروت و ماروت کی قرآن کی روشنی میں وضاحت فرمایئے؟

جواب: قصہ ہاروت و ماروت اللہ رب العزت نے سورہ بقرہ کی آیت:۱۰۲ کے ضمن میں بایں الفاظ بیان فرمایا ہے:

﴿وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ. وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَا اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ.﴾

''اور ان (ہزالیات) کے پیچھے لگ گئے جو سلیمان علیہ السلام کے عہد سلطنت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے اور سلیمان علیہ السلام نے مطلق کفر کی بات نہیں کی بلکہ شیطان ہی کفر کرتے تھے کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور ان باتوں کے بھی (پیچھے لگ گئے) جو شہر بابل میں دو فرشتوں (یعنی) ہاروت اور ماروت پر اتری تھیں۔ اور دونوں کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو (ذریعہ) آزمائش ہیں تم کفر میں نہ پڑو۔ بعض لوگ ان سے ایسا (جادو) سیکھتے جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ اور اللہ کے حکم کے سوا وہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے اور کچھ ایسے (منتر) سیکھتے جو ان کو نقصان ہی پہنچاتے اور فائدہ کچھ نہ دیتے۔ اور وہ جانتے تھے کہ جو شخص ایسی چیزوں (یعنی سحر اور منتر وغیرہ) کا خریدار ہوگا۔ اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور جس چیز کے عوض انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا وہ بری تھی۔ کاش وہ (اس بات کو) جانتے۔''

اس آیت کریمہ میں اس جادو کا بیان ہے جس پر '' أَرْذَلُ خَلْقِ اللّٰه'' یہود عامل تھے۔ پھر یہ ان اشیاء

میں سے ہے جن کو شیاطین نے سلیمان بن داؤد علیہ السلام کے عہد میں گھڑا تھا۔ (تا کہ اللہ کی مخلوق کو ورغلایا اور پھسلایا جا سکے) اور اس کا تعلق اس سے بھی ہے جو کچھ بابل کی سرزمین میں ہاروت اور ماروت پر نازل ہوا تھا۔ ثانی الذکر عہد کے اعتبار سے اول الذکر سے متقدم ہے کیونکہ قصہ ہاروت و ماروت بقول ابن اسحاق زمانہ نوح علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔ جادو حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں بھی موجود تھا کیونکہ اللہ نے خبر دی ہے کہ قوم نوح علیہ السلام کا دعویٰ مزعومہ تھا کہ یہ (نوح) علیہ السلام ساحر ہے۔ اسی طرح جادو قوم فرعون میں بھی پھیلا ہوا تھا۔ یہ سارا کچھ عہد سلیمان سے (بہت) پہلے کا ہے۔ اس آیت سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے سحر و کہانت کی کتابوں کو جمع کر کے اپنی کرسی کے نیچے دفن کر دیا۔ کوئی شیطان کرسی کے نزدیک پھٹک نہیں سکتا تھا۔ جب سلیمان علیہ السلام اور وہ علماء جن کو اصل معاملہ سے آگاہی تھی، فوت ہو گئے تو شیطان انسانی شکل میں ان کے پاس آیا۔ یہودیوں سے کہا میں آپ کو ایک ایسا خزانہ بتاتا ہوں جو بے مثال اور بے نظیر ہے۔ کہا ہاں بتاؤ! انہوں نے کرسی کے نیچے کھدائی کر کے ان کتابوں کو حاصل کر لیا تو شیطان نے ان سے کہا سلیمان کو انہی کے ذریعہ جن وانس پر کنٹرول حاصل تھا۔ اس واقعہ سے یہ بات عام پھیل گئی کہ سلیمان ساحر تھا۔ جب قرآن نے سلیمان علیہ السلام کا تذکرہ انبیاء میں کیا تو انہوں نے اس بات سے انکار کیا کہا: وہ تو جادوگر تھا۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر طبری)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قصہ ہاروت و ماروت مسند احمد میں بسند حسن ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مروی ہے۔ طبری نے اس واقعہ کے کئی طرق بیان کیے ہیں۔ [1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصہ کا اصل موجود ہے۔ [2] بخلاف ان لوگوں کے جنہوں نے اس قصہ کو باطل قرار دیا ہے۔ جیسے قاضی عیاض وغیرہ۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ اللہ نے بطور آزمائش دو فرشتوں میں شہوت ودیعت کر دی، پھر ان کو حکم دیا کہ زمین پر

---

[1] (٥٨٥) قال ابن كثير: "وأقرب ما يكون في هذا أنه من رواية عبد الله بن عمر عن كعب الأحبار لا عن النبي ﷺ كما قال عبد الرزاق في تفسيره عن الثوري عن موسى بن عقبة عن سالم عن ابن عمر عن كعب الأحبار قال:......الخ". قال ابن كثير أيضاً: ورواه ابن جرير أيضاً حدثني المثنى أخبرنا المعلى وهو ابن أسد أخبرنا عبدالعزيز بن المختار عن موسى بن عقبة حدثني سالم أنه سمع عبدالله يحدث عن كعب الأحبار فذكره، وقال ابن كثير: فدار الحديث ورجع إلى نقل كعب الأحبار عن كتب بني إسرائيل، والله أعلم. (١/ ١٨٤ ـ التفسير).

[2] مولانا محمد عطاء اللہ حنیف نے احسن التفاسیر (١/ ١٠٩) کے حاشیہ پر فرمایا: "لیکن اس بارے میں درست تحقیق حافظ ابن کثیر کی ہے کہ یہ مرفوع حدیث نہیں بلکہ اسرائیلی روایت ہے کیونکہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے دراصل یہ روایت کعب احبار سے اخذ کی ہے چنانچہ ایک مسند میں اس کا ذکر بھی ہے...... بنا بریں زہرہ والی کہانی بے اصل ہے"۔ (نعیم الحق نعیم)

قضاء کے فرائض سرانجام دو۔ مدت دراز تک انہوں نے بصورت بشر زمین پر عدل و انصاف قائم کئے رکھا۔ پھر حسین وجمیل عورت پر فریفتہ ہوکر فتنہ میں پڑ گئے،اس بنا پر ان کو بطور سزا بابل کے کنوئیں میں الٹا لٹکا دیا گیا۔ ان کی ابتلاء علم سحر کے ذریعے ہی ہوئی۔ جو اس علم تک رسائی چاہتا،ان کا قصد کرتا وہ اس وقت تک کسی کو تعلیم نہ دیتے جب تک اسے ڈراتے اور منع نہ کر لیتے۔ جب کسی کو اصرار ہوتا تو اس سے گفتگو کرتے اور تعلیم دیتے۔ اس علم کی حقیقت ان پر منکشف تھی۔ لوگ ان سے ان اشیاء کی تعلیم حاصل کرتے جن کی وضاحت قرآن میں ہے۔ (فتح الباری ۱۰/۲۲۵)

ترکیب:

﴿مَا تَتْلُو الشَّیٰطِیْنُ﴾ میں صحیح مسلک یہ ہے کہ ما موصولہ ہے ان لوگوں کا مسلک غلط ہے جنہوں نے اس کو ما نافیہ بنایا ہے کیونکہ نظم کلام اس سے انکاری ہے۔ "تَتْلُوْا" لفظ فعل مضارع ہے لیکن یہ ماضی کی جگہ واقع ہے یہ استعمال کلام عرب میں معروف ہے۔ اور "تَتْلُوْا" کا معنی منقول ہے۔ اسی بناء پر اس کا "علی" سے تعدیہ ہے۔

﴿ وَمَا كَفَرَ سُلَیْمَانُ﴾ کا ما یقینی طور پر نافیہ ہے۔ اور ﴿ وَلٰكِنَّ الشَّیَاطِیْنَ كَفَرُوْا﴾ میں واؤ عاطفہ ہے۔ اور یہ ماقبل سے جملہ استدراکیہ ہے۔

﴿ یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾ اَلنَّاس مفعول اور اَلسِّحْر مفعول ثانی ہے۔ جملہ كَفَرُوْا کے فاعل سے حال ہے۔ أَیْ كَفَرُوْا مُعَلِّمِیْنَ اور وَمَا أُنْزِلَ میں "مَا" موصولہ محل نصب میں ہے۔ اَلسِّحْر پر عطف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: "یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَیْنِ." یعنی لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے اور اس شئے کی جو دو فرشتوں پر نازل ہوئی تھی اور بِبَابِلَ مَا أُنْزِلَ کے متعلق ہے باء بمعنی فِی ہے۔ جمہور کے نزدیک اَلْمَلَكَیْن لام کے فتحہ سے ہے۔ بعض نے اس کو کسرہ سے بھی پڑھا ہے۔ ہاروت و ماروت اَلْمَلَكَیْن سے بدل ہے جو فتحہ کے ساتھ ہے یا عطف بیان ہے۔ یہ تعلیم انذاری تھی طلبی نہیں تھی۔

الفاظ کی مزید تشریح:

﴿وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَیْنِ﴾ کا عطف مَا تَتْلُوا پر ہے۔ معنی یہ ہیں کہ تابعداری کی انہوں نے اس چیز کی جو پڑھتے تھے شیطان سلیمان علیہ السلام کی بادشاہی میں اور اس چیز کی جو دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر نازل ہوئی۔

"اَلْمَلِکَیْن" لام کے کسرہ کے ساتھ قرأت غیر معروف ہے۔ مشہور لام کے فتحہ سے ہے۔ زیر کی صورت میں معنی یوں ہوگا کہ ہاروت و ماروت کے ساتھ جب خواہشات نفسانی لگا دی گئیں تو وہ گویا مرد بن گئے۔ اور جب قاضی بنائے گئے تو اس طرح سے بادشاہ ہو گئے۔ پس دونوں قرأت آپس میں موافق ہوگئیں۔ بعض لوگ "وَمَا اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْن" کے مَا کو نفی کا بناتے ہیں۔ اور معنی یوں کرتے ہیں کہ نہیں اتاری گئی فرشتوں پر کوئی چیز (جادو سے) اور لفظ "بِبَابِل" کو "یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ" سے متعلق بناتے ہیں یعنی شیطان لوگوں کو جادو بابل شہر میں سکھاتے تھے۔ اور ہاروت اور ماروت کو شیاطین سے بدل بناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہاروت اور ماروت شیطان تھے۔ اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جب جادو کفر ہے تو فرشتوں پر کس طرح اتارا جا سکتا ہے اور وہ لوگوں کو کس طرح سکھا سکتے ہیں۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اللہ جس چیز کے ساتھ چاہے۔ بندوں کی آزمائش کرے۔ اسی لئے وہ پہلے کہہ دیتے کہ یہ کفر ہے تا کہ کوئی شخص دھوکے میں نہ رہے۔ جب کہ کوئی باز نہ آتا تو اس کو سکھا دیتے۔ اور نظم قرآن کے لحاظ سے "مَا اُنْزِلَ" کے "مَا" کو نفی کے لئے بنانا صحیح نہیں کیوں کہ اس سے نظم قرآن میں کئی کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں۔

1. ببابل کا تعلق اگر "بِمَا اُنْزِلَ" سے ہو تو پھر ہاروت ماروت کو شیاطین سے بدل بنانا صحیح نہیں کیونکہ شیاطین صیغہ جمع ہے۔ جب کہ ہاروت ماروت تثنیہ ہے نیز ملکین سے بدل نہ بنانا تو اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جادو ملکین پر اتارا گیا ہے لیکن بابل میں نہیں بلکہ کسی اور جگہ۔ اور اگر "ببابل" کا تعلق "وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوْا الشَّیٰطِیْنُ" سے ہو تو وہ بہت دور ہے۔ درمیان میں اور کلام آ گیا اس سے عبارت میں خلل پیدا ہوتا ہے۔
2. ہاروت ماروت ظاہر نظم کے لحاظ سے "مَلَکَیْن" سے بدل ہے۔ کیونکہ "مَلَکَیْن" تثنیہ ہے اور ہاروت ماروت بھی دو ہیں۔ نیز ہاروت اور ماروت میں قرب بھی ہے۔ ہاروت ماروت کو شیاطین سے بدل بنانا ظاہر نظم کے بالکل خلاف ہے۔ کَمَا تَقَدَّمَ۔
3. اگر ہاروت و ماروت شیطان ہوں تو پھر ان کا تبلیغ کرنا کہ ہم آزمائش میں ہیں، تو کفر نہ کر یہ صحیح نہیں کیوں کہ نیکی کی تبلیغ کی توقع شیاطین سے نہیں ہو سکتی۔ پس صحیح معنی وہی ہے جو پہلے بیان ہو چکا کہ مَا اُنْزِلَ کا تعلق ما تتلوا سے ہے اور معنی یوں ہے کہ تابعداری کی انہوں نے اس چیز کی جو وہ پڑھتے تھے شیاطین سلیمان علیہ السلام کے عہد میں اور اس چیز کی جو اتاری گئی دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر بابل میں۔

سوال: کچھ لوگوں کو کہتے سنا گیا ہے کہ اصحاب کہف کا کتا بھی جنت میں جائے گا۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: یہ بات بلا اصل اور بے بنیاد ہے کہ اصحاب کہف کا کتا جنت میں جائے گا۔ کتاب وسنت میں اس کا کوئی استناد نہیں۔ البتہ رطب و یابس کے جامع مفسرین نے اس واقعہ کو ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: (تفسیر خازن ۳۰۲/۳ وغیرہ)

سوال: اویس قرنی، شمس تبریز اور منصور حلاج کا اصل واقعہ اور اس کی گرفت قرآن وسنت سے کریں؟

جواب: اویس قرنی کے فضائل و مناقب صحیح مسلم وغیرہ میں موجود ہیں، وہاں سے ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں آپ نے اس کو خیر التابعین قرار دیا ہے۔ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ:

« فَمُرُوْهُ فَلْيَسْتَغْفِرْ لَكُمْ .» [1]

یعنی ''اے میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اس سے اپنے لئے دعا استغفار کرانا۔''

مشکوٰۃ کے حاشیہ پر ہے اس حدیث سے اویس قرنی کی بڑی عمدہ فضیلت ثابت ہوئی۔ اویس قرنی تابعین میں سے ہے۔ صحابی نہیں۔ ہر چند حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں موجود تھے لیکن ماں کی خدمت سے فرصت نہ پائی کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوتے۔ اس حدیث سے اویس قرنی کی صحابہ پر فضیلت ثابت نہیں ہوتی۔ اس واسطے کہ تابعی اصحاب سے افضل نہیں ہوسکتا صرف دعا ثابت کرانے سے افضلیت نہیں ہوتی۔ اس واسطے کہ خود حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے واسطے بعضے لوگوں سے دعا کروائی ہے۔ بلکہ پانچوں وقت کی اذان میں تمام امت سے اپنے مقام محمود کے حاصل ہونے کے واسطے دعا کرنے کو فرمایا ہے۔ (حاشیہ غزنوی ٥٤٨٤)

اس کے بارے میں بہت ساری بے بنیاد باتیں بھی مشہور ہیں۔ مثلاً اس نے سنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض دانت مبارک جنگ احد میں شہید ہو گئے تو اس نے اپنے سارے دانت توڑ لئے۔ صرف اس خیال پر شاید کہ فلاں دانت ہو یا فلاں ہو وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح شمس تبریز کے بارے میں بھی لوگ بہت ساری بے پر کی اڑاتے ہیں جن کا کوئی اصل نہیں۔ اور پھر حسین بن منصور حلاج کا تو معاملہ ہی بڑا عجیب ہے۔ زندقہ کے الزام میں اس کو سولی پر چڑھا دیا گیا تھا۔

شیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں کہتے ہیں: حسین بن منصور حلاج بڑا عابد تھا۔ ہر رات ہزار رکعت نفل پڑھتا۔ جب اس کی زبان سے أَنَا الْحَقُّ۔ (میں خدا ہوں) کا کلمہ نکلا تو سید الطائفہ جنید بغدادی نے اور

---

[1] (٥٨٦) صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل أويس القرني رضي الله عنه (٦٤٩١).

دوسرے بزرگوں نے اس کے قتل کا فتویٰ دے دیا۔ اور سولی پر کھینچ دیا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی "أَخبَارُ الأَخيَار" میں لکھتے ہیں کہ: خواجہ نظام الدین اولیاء سے لوگوں نے پوچھا کہ حسین بن منصور حلاج کا کیا حکم ہے؟ فرمایا: مردود ہے۔ جنید نے اس کو مردود لکھا۔ جنید اپنے زمانے کا پیشوا تھا۔ اس کا مردود کہنا سب کا مردود کہنا ہے۔

"أَخبَارُ الأَخيَار" میں شاہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ انہوں نے کہا کہ منصور کو کسی نے پایا کہ اس کی دست گیری کرتا اور جو اس کو غلطی لگی تھی اس سے اس کو روکتا۔ میں اس زمانے میں ہوتا تو اس کی دستگیری کرتا تاکہ وہ اس حد تک نہ پہنچتا۔ (فتاویٰ اهل حدیث ۵۳/۱)

بہر صورت ان کے بارے میں اس مختصر مجلس میں تفصیلی جائزہ پیش کرنا ممکن نہیں۔ موضوع ہذا پر محققین مؤلفین کی بے شمار کتابیں بازار میں دستیاب ہیں۔ حقیقت حال پر آگاہی کے لئے ان کی طرف رجوع کریں۔

سوال: حجر اسود کیا واقعی جنت سے لایا گیا تھا، اگر نہیں تو اس کی تاریخ کیا ہے؟

جواب: بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ "حجر اسود" کا تعلق جنت سے ہے اگرچہ کچھ ضعیف ہیں لیکن دیگر بعض قابل حجت بھی ہیں۔ [1] ملاحظہ ہو (فتح الباری ۴۶۲/۳، ۹)

بلکہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے "حواشی مشکوٰۃ" پر ان کو صحیح قرار دیا ہے۔ (صحیح البخاری: بَابُ مَا ذُكِرَ فِي الْحَجَرِ الْأَسْوَدِ) اور جملہ تفاصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (تَارِيخُ الْكَعْبَةِ الْمُعَظَّمَةِ مؤلفہ حسین عبداللہ باسلامہ ،الفصل الخامس خبر الحجر الاسود۔ ص ۱۴۹)

سوال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کتنی عمر میں وفات پائی؟

جواب: حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے۔

ابوجعفر باقر کا کہنا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۳۵ سال تھی اور کعبہ زیر تعمیر تھا۔ جب فاطمہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئی اور عبیداللہ بن محمد بن سلیمان بن جعفر ہاشمی کا قول ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۴۱ سال تھی جب فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ولادت ہوئی۔ بعثت سے ایک سال یا کچھ زیادہ عرصہ پہلے ولادت ہوئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے قریباً پانچ سال بڑی تھیں۔ ۲ھ اوائل محرم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح ہوا۔ اور تاریخ وفات بقول واقدی منگل کی رات ۳ رمضان ۱۱ ہجری ہے۔ (الإصابة لابن حجر ، ۳۶۵/٤)

---

[1] (۵۸۷) المشکاۃ للألبانی،باب دخول مکة والطواف،الفصل الثانی،ح(۲۵۷۷).والتحقیق الثانی للألبانی (۲۵۱۰)، والترمذی(۱۷۷)، و قال " حسن صحیح" و قال الألبانی و هو کما قال.

سوال: حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عثمان اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو قتل کروانے والے کون تھے؟ اور وہ کیا چاہتے تھے؟

جواب: خلفاء راشدین ثلاثہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت میں ملوث مجوسی، یہودی، خوارج اور روافض تھے۔ ان لوگوں کا اہم ترین مقصد تخریب کاری کے ذریعہ اسلام کے کلمۂ وحدت اور مجتمع قوت کو پارہ پارہ کرنا تھا تاکہ اسلام کی اشاعت اور تعمیر و ترقی میں ہر ممکن رکاوٹ کھڑی کی جا سکے لیکن اللہ رب العزت کا وعدہ برحق ہے:

﴿ يُرِيْدُوْنَ أَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللّٰهُ إِلَّا أَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ . ﴾ (التوبة: ٣٢)

''یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں اور اللہ تعالیٰ انکاری ہے مگر اسی بات کا کہ اپنا نور پورا کرے۔ اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔''

سوال: اگر قتل حسین رضی اللہ عنہ میں یزید ملوث نہیں ہے تو کیا اس نے قاتل حسین رضی اللہ عنہ کو سزا دی ہے جب کہ وہ حکمرانی کے منصب پر فائز تھا؟

جواب: یزید کا معاملہ ہم اللہ پر چھوڑتے ہیں۔ وہ اس کے مناسب حال اس سے سلوک کرے گا۔ بعض دفعہ حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان چاہنے کے باوجود کام نہیں کر سکتا۔ جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ باغیوں سے حضرت عثمان کے قتل کا بدلہ نہ لے سکے۔

❀❀❀❀❀❀❀

﴿۲۸﴾ حکومت، سیاست، قیادت وسیادت اور حکمران

سوال: ہمارے مولوی صاحب سید نا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو امام کہنے سے منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں امام حسن رضی اللہ عنہ کہنا جائز ہے۔ امام حسین علیہ السلام کہنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ امت کے امام نہیں بنائے گئے۔ کیا مولوی صاحب کا کہنا ٹھیک ہے؟ جو مولوی صاحب یہ کہتے ہیں ان کی اقتداء کرنی چاہیے یا نہیں؟

جواب: مولوی صاحب کا مقصد یہ ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ چونکہ خلافت پر متمکن ہوئے تھے۔ اس لئے وہ امام ہیں۔ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ خلیفہ نہیں بنے اس لئے وہ امام نہیں۔ لیکن بمعنی اَعَمّ پیشوا کے طور پر امام کا اطلاق ہو جائے تو وجہ جواز ہے۔ جس طرح کہ بیشتر افراد امت پر اس کا اطلاق ہے۔ امام موصوف کی اقتداء میں نماز ادا کرنی چاہیے۔ کیونکہ یہ نظریہ قابل مؤاخذہ نہیں۔ اگرچہ مزید اس میں وسعت ہونی چاہیے۔ کَمَا تَقَدَّمَ آنِفًا.

سوال: کچھ حضرات دانستہ یا نادانستہ یزید بن معاویہ کو گالیاں دیتے اور برا بھلا کہتے ہیں جب کہ میں نے ایک اہل حدیث عالم سے سنا ہے کہ وہ ایک غزوہ میں شریک تھے۔ مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جتنے صحابی بھی جنگ میں شریک ہیں وہ سب جنتی ہیں کیا یہ درست ہے؟

جواب: یزید کے بارے میں تین قسم کی آراء ہیں۔

① بعض لوگ اسے اچھا سمجھتے ہیں۔

② دوسرے وہ جو اسے شرابی کبابی کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت ساری بے بنیاد باتیں اس کی طرف منسوب ہیں۔ شرابی کبابی ہونا بھی ان میں سے ایک ہے۔

③ تیسرا مسلک یہ ہے کہ ہمیں اس سے نہ پیار ہے نہ بغض اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ زیادہ احتیاط والی بات یہی ہے۔ (واللہ اعلم.)

ہاں صحیح بخاری میں سب سے پہلے مدینہ قیصر پر حملہ آور کے لئے بشارت ضرور ہے [1] لیکن اس میں زبان نبوت سے یزید کا تعلق نہیں۔ البتہ بعض شارحین نے اس کا مصداق یزید کو قرار دیا ہے جو بحث کا متقاضی ہے۔ تفصیلی بحث پہلے ''الاعتصام'' میں ہو چکی ہے تکرار کی ضرورت نہیں۔

سوال: ①...... مسجد کی خطابت کے لئے موجودہ زمانے میں کیا کوئی علمی معیار ہونا چاہیے یا نہیں؟ ایسا آدمی جو نہ تو کسی مدرسہ کا پڑھا ہوا اور نہ ہی اس نے باقاعدہ کسی معلم سے دین کا علم سیکھا ہو، حتیٰ کہ دنیاوی تعلیم بھی حاصل نہ کی ہو، خطابت کے فرائض انجام دے سکتا ہے؟

②...... ایک صاحب جو سکول میں ساتویں یا آٹھویں جماعت تک پڑھ سکے اور غالبًا انہوں نے دینی تعلیم بالکل حاصل نہیں کی، ترجمہ قرآن تک نہیں جانتے، پیشہ کے اعتبار سے درزی (ٹیلر ماسٹر) تھے۔ تقریبًا ۵ برس سعودی عرب میں اسی حیثیت سے ملازمت بھی کرتے رہے ابتداءً کچھ عرصہ تبلیغی جماعت کے ساتھ منسلک رہے ہیں اس لئے کچھ بول سکتے ہیں، آج کل ایک مسجد کے خطیب بن بیٹھے ہیں۔ کیا ایسے شخص کی اقتدا میں نماز پڑھنا اور انہیں خطابت کی ذمہ داری سونپنا درست ہے؟ جو لوگ اس کام میں ان کے مدومعاون ہیں ان کے بارے اور خود خطیب موصوف کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ نماز کی امامت کے لئے پہلی شرط قرآن پاک کا زیادہ جاننا ہے۔ کیا ایک حافظ قاری کی موجودگی میں ایک جاہل شخص کا از خود امامت کے لئے آگے بڑھنا اور امامت کا فریضہ ادا کرنا درست ہے؟

③...... کافی عرصہ پہلے ایک خطیب صاحب سے یہ روایت سنی تھی کہ ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو وعظ کرتے سنا تو اس سے دریافت کیا کہ کیا تم ناسخ و منسوخ کا علم جانتے ہو؟ جوابًا اس نے نفی کا اظہار کیا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وعظ نہ کرو خود بھی گمراہ ہو گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرو گے''۔ کیا یہ روایت درست ہے؟

جواب: نااہل لوگ خطابت و امامت کے قطعًا حقدار نہیں۔ صحیح حدیث میں ہے:

« إِذَا وُسِّدَ الْأَمْرُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ .» [2]

یعنی ''معاملات جب نااہل لوگوں کے سپرد کر دیئے جائیں تو قیامت کا انتظار کرنا چاہیے۔''

---

[1] (٥٨٨) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب أیضاً (٢٩٢٤).

[2] (٥٨٩) صحیح البخاری، کتاب العلم، باب من سئل علماً......، (٥٩)، (٦٤٩٦)، عن ابی هریرة رضی الله عنه.

اس کے ہم معنی اور بھی بہت ساری روایات ہیں، جو کتب احادیث کی طرف مراجعت سے بآسانی دستیاب ہوسکتی ہیں۔ اہل علم کے لائق نہیں کہ جاہلوں کے لئے مدد معاون بنیں ورنہ اس جرم میں وہ بھی شریک کار سمجھے جائیں گے۔ اہل کی موجودگی میں نا اہل کو فرائض کی ادائیگی کے لئے آگے کرنا امانت میں خیانت ہے، جو جرم عظیم ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلٰى أَهْلِهَا . ﴾

''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کرو۔''

اہل کی موجودگی میں نااہل کی اقتدا میں نماز نہیں پڑھنی چاہیے بصورت دیگر منتظمین و معاونین حضرات سب کے سب عدالت الٰہی میں جوابدہ ہوں گے۔ خطرہ ہے کہ کہیں نمازیں ضائع نہ ہو جائیں۔ پھر علماء کے بھی لائق نہیں کہ جرم یا گناہ ہوتا دیکھ کر خاموشی اختیار کریں، قیامت کے دن ہر آدمی سے اس کی ذمہ داری کی باز پرس ہو گی، اللہ رب العزت ہم میں فہم دین پیدا فرما کر فرائض کی ادائیگی کی کما حقہ توفیق بخشے۔ آمین!

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول علامہ بدر الدین زرکشی کی کتاب ''البرھان فی علوم القرآن'' میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو: (۳۴/۲)

سوال: ہمارے ملک میں بہت سی دینی جماعتیں اور تنظیمیں ہیں مثلاً جمعیت اہل حدیث، غرباء اہل حدیث، حزب اللہ، مرکز الدعوۃ والارشاد، جماعت المسلمین، مرکزی جمعیت اہل حدیث، اشاعۃ التوحید و السنۃ (عبدالسلام رستمی) وغیرہ۔

① ان کی جماعت سازی اور تنظیم سازی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

② ان جماعتوں اور تنظیموں کے امیر کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

③ خلافت اسلامیہ کے احیاء کے لئے انفرادی دعوت و جہاد کرنا چاہیے یا کسی تنظیم کے ساتھ مل کر کوشش کی جائے؟

جواب: ①...... مختلف ناموں سے جماعت بندی اور تنظیم سازی میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ مقصود صرف دعوت الی اللہ اور کسی نہ کسی انداز میں دین کی خدمت ہو۔ ناموں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اُكْتُبُوا لِي مَنْ تَلَفَّظَ بِالْإِسْلَامِ مِنَ النَّاسِ، فَكَتَبْنَا لَهُ أَلْفًا وَّ خَمْسَمِائَةِ رَجُلٍ .»[1]

(باب كتابة الامام الناس)

''مجھے مسلمانوں کے نام لکھ کر دو تو ہم نے پندرہ سو آدمیوں کے نام لکھ کر دیئے۔''

حدیث ہذا تنظیم سازی کے جواز کی دلیل ہے۔

۲......ان جماعتوں اور تنظیموں کے امیر کی حیثیت سفری امیر جیسی ہے نہ کہ ''امیر المومنین'' جیسی، جہاں وہ اپنی حدود میں شریعت کا نفاذ کرتا ہے۔

۳......اسلامی خلافت کے احیاء کے لئے انفرادی جدوجہد کی بجائے زیادہ بہتر یہ ہے کہ اقرب الی الحق تنظیم کے ساتھ مل کر کوشش کی جائے۔

مثل مشہور ہے: ایک اور ایک دو= گیارہ۔

سوال: ❀ اسلام میں بیعت کی کیا حیثیت ہے؟

❀ ڈاکٹر اسرار کی بیعت شرعی نقطۂ نظر سے کیسی ہے؟

❀ تبلیغی جماعت کی بیعت شرعی نقطۂ نظر سے کیسی ہے؟

❀ پیر بھائیوں کی بیعت شرعی نقطۂ نظر سے کیسی ہے؟

❀ آج کے دور میں کس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے۔ نیز بتائیں کہ بیعت کن موقعوں پر کی جاتی ہے اور کس کے ہاتھ پر کی جاتی ہے؟

❀ آیا جب ہم نے کلمہ پڑھ لیا ہے تو کیا کسی کا بیعت ہونا ضروری ہے؟

جواب: ڈاکٹر اسرار اور تبلیغی جماعت اور پیر بھائیوں کی مروجہ بیعت بدعت ہے۔ شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں بیعت کا تعلق صرف نبی ﷺ کی ذات یا اس کے قائمقام سے ہوتا ہے۔ صاحب اقتدار خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت ہوتی ہے جو کتاب و سنت کا داعی ہو۔ موجودہ دور میں سعودی عرب کے سربراہ مملکت کی بیعت ممکن ہے۔ خلیفۂ وقت جب مناسب سمجھے حالات کے مطابق بیعت لے سکتا ہے۔ کلمہ پڑھنے کے بعد اپنے رب سے شریعت کی پابندی کا صرف عہد ہی کافی ہوسکتا ہے۔ کسی سے بیعت کرنا ضروری نہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿ وَ مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ وَ ذٰلِكَ هُوَالْفَوْزُ

[1] (۵۹۰) صحيح البخاري، كتاب الجهاد، باب كتابة الإمام الناس (۳۰۶۰).

الْعَظِيْمُ .﴾ (التوبة: ١١١)

''اور اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے؟ سو جو سودا تم نے اس سے کیا ہے۔ اس سے خوش رہو اور یہی بڑی کامیابی ہے۔''

قصۂ ثمامہ بن اثال عدم بیعت کی واضح دلیل ہے۔ ❶

سوال: کیا زندگی میں کسی کا بیعت ہونا صحیح ہے؟ جیسے عموماً لوگ پیر و مرشد پکڑتے ہیں۔ بیعت ہونا صحیح ہے یا نہیں؟

جواب: محض پیری مریدی کی بیعت کا شرع میں کوئی وجود نہیں۔ بیعت کا اصل تعلق نبی کی ذات سے ہوتا ہے جو اللہ کے ساتھ پابندی عہد کی صورت میں ضمانت ہے یا پھر خلافت کی صورت میں جو اس کا قائم مقام ہو اس کی بیعت ہوتی ہے اس کے علاوہ اسلام میں بیعت کا کوئی تصور نہیں اگر اس کا کوئی وجود ہوتا تو ''قُرُوْنِ مُفَضَّلَه'' اس کے زیادہ حقدار ہوتے جبکہ ان میں اس کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ لہٰذا یہ: «كُلُّ مُحْدَثٍ بِدْعَةٌ .» ❷ کے زمرہ میں شامل ہے۔

سوال: ۱۹ جولائی ۱۹۹۶ء شمارہ نمبر ۲۷ میں آپ کا ایک فتویٰ شائع ہوا تھا۔ جس میں آپ نے بیعت کو بدعت قرار دیا ہے۔ اب نہ تو کسی نبی کو آنا ہے اور نہ اب کوئی خلیفہ ہے۔ آج کے دور ناگوار میں ایک اکیلا آدمی برائیوں کے طوفان کے سامنے کیسے سینہ تان کے کھڑا ہو سکتا ہے؟ اس کے لئے ایک بڑی جماعت کی ضرورت ہے جو کہ برائیوں کی روک تھام کر سکے۔ کسی جماعت میں امیر جماعت کی بیعت کے بغیر ڈسپلن قائم ہونا ممکن نہیں۔ تنظیم اسلامی کا ڈسپلن بیعت امیر پر قائم ہے۔ اگر بیعت بدعت ہے پھر تو دنیا میں اسلام کبھی نہیں آ سکتا۔ اس کے علاوہ شاہ اسماعیل شہید نے بھی سید احمد شہید کی بیعت کی تھی۔

اس لئے آپ قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ جواب دیں کہ پھر بیعت کے بغیر (جو کہ آپ کے فتویٰ کی روشنی میں بدعت ہے) ایک اکیلا آدمی کیا کرے؟

جواب: جواباً عرض ہے کہ ایک سوال کے جواب میں میں نے مطلق بیعت کو بدعت قرار نہیں دیا تھا بلکہ پیری مریدی اور حزبی اسراری مروجہ بیعت کو بدعت قرار دیا تھا۔ شریعت میں اس کا کوئی وجود نہیں۔

---

❶ (۵۹۱) صحيح البخاری، كتاب المغازی، باب وفد بنی حنيفة ......(٤٣٧٢).

❷ (۵۹۲) انظر، الرقم المسلسل(٩٦)!

جہاں تک نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس یا آپ ﷺ کے بعد قائم مقام کی حیثیت سے خلیفے کی بیعت کا تعلق ہے سو یہ برحق ہے۔ بطور مثال میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ آج کے دور انحطاط میں سعودی سربراہ حکومت کی بیعت ممکن ہے کیوں کہ وہاں کسی نہ کسی انداز میں شریعت الٰہیہ کا نفاذ ہے۔ جزیرۂ عرب میں جب ملک عبدالعزیز حکومت پر متمکن ہوئے تو اس زمانہ میں ہندوستان کے کئی ایک اہل علم ان سے بیعت ہوئے تھے۔ اس بات کا تذکرہ بِالصَّرَاحَة سعودی تاریخ میں موجود ہے۔ باقی شاہ اسماعیل رحمہ اللہ نے جو سید احمد شہید رحمہ اللہ کی بیعت کی تھی تو یہ بحیثیت حاکم تھی۔ اس کے عملی ظہور پر تاریخ شاہد ہے اس کے انکار کی چنداں گنجائش نہیں تاہم بلاریب ہمارے ہاں بعض مدعیان عمل بالحدیث پیری مریدی جیسی بیعت کے تساہلات کا شکار ہیں لیکن اس کو جواز کی دلیل بنا کر پیش کرنا کسی طور صحیح نہیں۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا قول [1] مشہور ہے ''جو شے عہد نبوت میں دین تھی وہ آج بھی دین ہے۔ اور جو اس وقت دین نہیں تھی، وہ آج بھی دین نہیں بن سکتی۔ اور جو شخص دین میں بدعت ایجاد کرتا ہے۔ دراصل اس کا زعم باطل یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے پیغام رسانی میں خیانت کی ہے۔'' جب کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ...... ﴾

نیز فرمایا:

﴿ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ . ﴾

پھر گناہوں سے پاکیزہ عملی زندگی کو سنوارنے کے لئے بیعت کو بطور شرط قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ نبی ﷺ کے مجموعی عہد پر اگر غور و خوض کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ ﷺ نے بعض اہم مواقع پر بیعت لی ہے جب کہ عام حالات میں مجرد عہد و پیمان کو کافی سمجھا گیا۔ حتی کہ نئے مسلمان ہونے والے کے لئے بھی بسا اوقات فعل بیعت کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔ قصہ ثمامۃ بن اثال اس امر کی واضح مثال ہے۔ لہٰذا بندے کو چاہیے کہ عملی زندگی کو سدھارنے کے لئے تعلق باللہ پر انحصار کر کے اس کو مضبوط تر بنانے کی ہر لحہ سعی کرتا رہے۔ وَالتَّوْفِیْقُ بِیَدِ اللّٰهِ وَ عَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَ.

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ ''موجودہ غیر شرعی اور غیر اسلامی حکومت (بوجہ مغرب زدہ اور بے پردہ شیعہ عورت کی سربراہی) کے ساتھ جو لوگ تعاون بالواسطہ یا بلاواسطہ کر رہے ہیں

---

[1] (۵۹۳) (الاعتصام فی ذم البدع (۱/۳۳) للشاطبی).

تا کہ حکومت مستحکم رہے اور کسی شرعی حکومت کا ایسے حالات میں قائم ہونا بظاہر ممکن نہ رہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں دین متین میں قرآن وسنت کے مطابق کیا حکم ہے؟''

جواب: واضح ہو کہ جس کسی ملک کا قانون شرعی نہ ہو وہ حکومت غیر شرعی ہی کہلاتی ہے۔ نظام مملکت چاہے بدست مرد ہی کیوں نہ ہو اس حالت میں اگر کسی عورت کو اپنے پر مسلط کر لیا جائے تو بے حس قوم کے لئے مزید جگ ہنسائی اور رسوائی کا سبب بنتی ہے۔ دراصل ہمیں ان اسباب وعلل پر بھی تو غور کرنا چاہیے جو اس قسم کی قباحتوں کو جنم دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قصور وار وہ لوگ ہیں جنہوں نے مغربی واستعماری نظریات کی اندھی تقلید میں کتاب وسنت کے ابدی دستور کو پس پشت ڈال کر غیر شرعی حکومت کے قیام کے لئے خود ساختہ قانون کی صورت میں راہ ہموار کی۔ اس کو مسلمان بنانا مسلمانوں کا اولین فرض ہے ورنہ ایسے حوادثات سے بچ بچاؤ ناممکنات سے ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا . ﴾ (العنکبوت:٦٩)

سوال: عورت کی حکومت سے تعاون کرنے والے عوام کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب: عورت کی حکومت سے تعاون کرنے والے عامۃ الناس کی صحیح راہنمائی کرنا علماء اور صلحاءِ امت کا اوّلین فرض ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ سمجھنے نہ پائیں تو پھر ان کا مقدمہ رب قہار کی عدالت کے سپرد کر دینا چاہیے جس دن حق کا بول بالا اور باطل خس وخاشاک ہوگا۔

سوال: ① نسوانی حکومت سے تعاون کرنے والے علماء کے بارے میں کیا حکم ہے؟

② عامۃ المسلمین جو کہ نفاذ شریعت کے لئے متفکر ہیں انہیں تعاون کرنے والے لوگوں سے کیسا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟

③ حکومت کے ساتھ تعاون کرنے والے علماء کے ساتھ عامۃ المسلمین کو کیسا برتاؤ کرنا چاہیے؟

④ علمائے حق کو حکومت کے ساتھ تعاون کرنے والے عوام کے ساتھ کیسا تعلق رکھنا چاہیے؟

⑤ علمائے حق کو حکومت کے ساتھ تعاون کرنے والے علماء کے بارے میں کیا اقدامات کرنے چاہئیں؟

جواب: [1] نسوانی حکومت سے تعاون کرنے والے علماء کے سامنے بھی بطور تذکیر نصوص وعید بار بار پیش کرنی چاہیے شاید کہ کسی ایک کے رجوع الی الحق کا موجب بن جائیں۔ بصورت یأس ایسے ضمیر فروش علماء سوء سے مقاطعہ کر لینا چاہیے۔ حتی کہ حق کی طرف لوٹ آئیں۔

۲ نفاذ شریعت کی جدوجہد ہر صورت جاری و ساری رہنی چاہیے۔ عامۃ المسلمین کو متعاون حضرات سے ناصحانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے شاید کہ یہ ان کے لئے ہدایت کا سبب بن جائے۔ بصورت دیگر ان بدکردار لوگوں سے نفرت کا اظہار ہونا چاہیے تاکہ ان کو اپنی غلطی کا احساس ہو۔

۳ عامۃ المسلمین کا فرض ہے کہ علماء کو اپنی ذمہ داری اور وراثت انبیاء کا احساس دلائیں، اس کے باوجود اگر وہ اپنی حرکات شنیعہ سے باز نہ آئیں تو پھر ان سے بائیکاٹ کر لینا چاہیے یہ بھی ظلم کو روکنے کی صورت ہے۔

۴ علمائے حق کا فرض ہے کہ عوام کالانعام کو ہر ممکن طریق سے وعظ و نصیحت کریں اور رب کے حضور پیشی کا احساس دلائیں۔

﴿ وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ . ﴾ (الذاریات:۵۵)

''نصیحت کرتے رہو نصیحت مومنوں کو نفع دیتی ہے۔''

۵ علمائے حق کا فرض ہے کہ علمائے سوء کے بدنما کردار کو واضح کریں تاکہ عامۃ الناس دھوکہ سے بچ جائیں۔

﴿۲۹﴾ معاشرتی و دیگر آداب

سوال: میرے ہاں خدا تعالیٰ نے بچہ دیا ہے۔ جس کے پلید بال اب تک نہیں اتروائے۔ کیوں؟ ہمارے قبیلہ میں رسم (رواج) ہے۔ ایک مزار ہے جس کا نام بابا شدی شہید ہے۔ وہ پلید بال کچھ وہاں کاٹتے ہیں کچھ دوسرے مزار پر جس کا نام پیر پہاڑ بادشاہ ہے کچھ وہاں کاٹتے ہیں اور کچھ گھر آ کر، مزے کی بات یہ ہے کہ ہر جگہ بکرے بھی ذبح کرتے ہیں۔ اب اس موضوع پر میرا جھگڑا چل رہا ہے۔ حتی کہ ایک دن ہم دونوں بھائی لڑ پڑے۔ اب اگر قرآن وسنت (میرے علم) کے مطابق میرے بچے کے زیادہ حق دار میرے والد محترم ہیں۔ دوسری طرف میرے والد صاحب بدعات تو درکنار۔ شرک کی طرف مائل کر رہے ہیں۔ اسلام بھی اس چیز کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ صاحب امر کی اطاعت کرو؟ مگر قرآن وسنت کی حد تک۔ اس لئے از راہ کرم (بذریعہ) مطابق قرآن وسنت میری راہنمائی فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیرا۔ مزید میں نے روز نامہ ''نوائے وقت'' (راولپنڈی/اسلام آباد ۹ اگست ۱۹۹۷ء) کے صفحہ نمبر۸ پر دو جواب پڑھے ہیں جو میری سمجھ سے باہر ہیں۔ جواب دینے والے مولانا قاضی عبدالہادی رسمی صاحب ہیں۔

جواب: آپ کو چاہیے تھا اپنے نومولود بچے کے بال ساتویں روز اتار دیتے۔ سنت طریقہ یہی ہے۔ مزاروں کے چکروں میں مت پڑیں۔ یہ شدید ترین جرم ہے۔ والد تک کی بات کو اس سلسلہ میں ٹھکرا دیں:

«لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ .» [1]

بچہ کے بارے میں آپ کو ہی اَحَقِّیَتْ حاصل ہے اور روز جزا ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔ والد صاحب

---

[1] (۵۹۴) صحیح البخاری ،کتاب أخبار الأحاد ، باب ما جاء فی إجازة خبر الواحد ......(۷۲۵۷) والأحکام ،باب السمع(۷۱۴۴) ،صحیح مسلم کتاب الإمارة ،باب وجوب طاعة الأمراء فی غیر معصیة (۴۷۶۵)، شرح السنة (۱۰/ ۴۴) والطبرانی (۱۶۵/۱۸) ـالکبیر)،المشکاة (۳۶۹۶) صححه الألبانی، والصحیحة (۱۷۹) واللفظ لشرح السنة والطبرانی.

کی ہدایت کے لئے کوشاں رہیں۔ شاید کہ سیدھی راہ میسر آ جائے۔ وَهُوَ الْهَادِي إِلَى الصَّوَابِ .

سوال: داڑھی کے بال منڈوائے جا سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: اصل یہ ہے کہ داڑھی پوری رکھی جائے۔

سوال: کھڑے ہو کر پانی پینا درست ہے یا غلط؟ اور کیا یہ سنت ہے یا آداب میں سے ہے؟

جواب: کھڑے کھانے پینے میں اہل علم کا سخت اختلاف ہے۔ راجح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ کھڑے ہو کر کھانے پینے کا اگرچہ جواز ہے لیکن کراہت سے خالی نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسی بات کو پسند کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

" وَهٰذَا أَحْسَنُ الْمَسَالِكِ وَأَسْلَمُهَا وَأَبْعَدُهَا مِنَ الْاِعْتِرَاضِ " (فتح الباری ۸٤/۱۰)

"یہ مسلک بہت اچھا اور نہایت سلامتی والا اور اعتراض سے بعید تر ہے۔"

سوال: کیا کسی کی اس لئے جاسوسی کرنا کہ اسے بدنام کیا جائے یا رسوا کیا جائے، جائز ہے؟

جواب: اس قسم کے امر کو کتاب و سنت کی متعدد نصوص میں حرام قرار دیا گیا ہے مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ﴾ (الحجرات: ۱۲)

" اے اہل ایمان بہت گمان کرنے سے احتراز کرو کہ بعض گمان گناہ ہیں اور ایک دوسرے کے حال کا تجسس نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس سے تو تم ضرور نفرت کرو گے (تو غیبت نہ کرو) اور اللہ کا ڈر رکھو بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔"

اور حدیث میں ہے:

« عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ،قَالَ: قَالَ: رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: « إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ وَلَا تَحَسَّسُوا وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا تَنَاجَشُوا وَلَا تَحَاسَدُوا وَلَا تَبَاغَضُوا وَلَا تَدَابَرُوا وَكُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا.» (وَ فِي رِوَايَةٍ)

«وَلَا تَنَافَسُوا .» ❶ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ بحواله مشكوٰة بَابُ مَا يُنْهٰى عَنْهُ مِنَ التَّهَاجُرِ وَالتَّقَاطُعِ وَاتِّبَاعِ الْعَوْرَاتِ.)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بدگمانی سے بچو، بدگمانی بدترین جھوٹ ہے اور نہ معلوم کرو خبر اور نہ جاسوسی کرو اور بلا ارادہ خرید کے چیز کے بھاؤ کو مت بڑھاؤ اور نہ آپس میں حسد کرو اور نہ آپس میں بغض رکھو۔ اور نہ آپس میں غیبت کرو اور سبھی اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ''۔ اور ایک روایت میں ہے: ''اور نہ حرص کرو۔''

نیز فرمایا: ''دو شخصوں کے درمیان برائی ڈالنے سے بچو، یہ شی دین کو تباہ کرنے والی ہے۔'' ❷ (ترمذی)

اور ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر ارشاد فرمایا تھا:

«يَا مَعْشَرَ مَنْ أَسْلَمَ بِلِسَانِهٖ وَلَمْ يُفْضِ الْإِيْمَانُ إِلٰى قَلْبِهٖ لَا تُؤْذُوا الْمُسْلِمِيْنَ وَلَا تُعَيِّرُوْهُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِهِمْ فَإِنَّهٗ مَنْ يَّتَّبِعْ عَوْرَةَ أَخِيْهِ الْمُسْلِمِ يَتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ وَمَنْ يَّتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ يَفْضَحْهُ وَلَوْ فِيْ جَوْفِ رَحْلِهٖ .» ❸ (رواه الترمذى ، بحواله مشكوٰة)

''اے گروہ لوگوں کے جو اسلام لایا ہے اپنی زبان کے ساتھ اور نہیں پہنچا! ایمان اس کے دل میں نہ ایذا دو تم مسلمانوں کو، اور نہ عار دلاؤ ان کو اور نہ تلاش کرو عیب ان کے پس تحقیق جو شخص کہ ڈھونڈے عیب اپنے بھائی مسلمان کا، ڈھونڈے گا اللہ تعالیٰ عیب اس کا اور جس کا اللہ نے عیب ڈھونڈا وہ اس کو رسوا کر دے گا اگرچہ وہ اپنی سواری کے کجاوے میں ہو۔''

سوال: کیا داڑھی کو خضاب لگانا ضروری ہے؟

جواب: داڑھی کو خضاب لگانا ضروری نہیں۔ احادیث اور سلف سے دونوں طرح ثابت ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ

❶ (٥٩٥) صحيح البخارى، كتاب الأدب، باب ﴿يا أيها الذين آمنوا اجتنبوا كثيرا من الظن...... الخ﴾ (٦٠٦٦)، صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم الظن و التجسس (٦٥٣٦) و زاد مسلم ((ولا تنافسوا)). المشكاة (٥٠٢٨).

❷ (٥٩٦) صححه الترمذى وحسنه الألبانى. صحيح الترمذى، أبواب صفة القيامة ،رقم الباب (٢٠) ح (٢٦٣٩) ((إياكم وسوء ذات البين فإنها الحالقة)). وقال الترمذى :لا أقول تحلق الشعر، إنها تحلق الدين.

❸ (٥٩٧) قال الألبانى "حسن صحيح" وحسنه الترمذى. صحيح الترمذى، أبواب البر والصلة، باب ما جاء فى تعظيم المؤمن (٢١١٨) ،أبى داؤد، كتاب الأدب، باب فى الغيبة (٤٨٨٠) ،المشكاة (٥٠٤٤) عن ابن عمر رضى الله عنهما . وقال المباركفورى :رواه أبو يعلىٰ بإسناد حسن من حديث البراء . التحفة (٣/١٥٦) بلفظ: ((يا معشر من آمن بلسانه)) وفى الترمذى : ((يا معشر من قد أسلم......الخ)) .

فرماتے ہیں:

" اَلصَّوَابُ أَنَّ الْأَحَادِيْثَ الْوَارِدَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ بِتَغْيِيْرِ الشَّيْبِ وَ بِالنَّهْيِ عَنْهُ كُلُّهَا صَحِيْحَةٌ وَ لَيْسَ فِيْهَا تَنَاقُضٌ بَلِ الْأَمْرُ بِالتَّغْيِيْرِ لِمَنْ شَيْبُهُ كَشَيْبِ أَبِي قُحَافَةَ وَالنَّهْيُ لِمَنْ لَه شَمَطٌ فَقَطْ قَالَ: وَاخْتِلَافُ السَّلَفِ فِيْ فِعْلِ الْأَمْرَيْنِ بِحَسْبِ اخْتِلَافِ أَحْوَالِهِمْ فِيْ ذٰلِكَ مَعَ أَنَّ الْأَمْرَ وَالنَّهْيَ فِيْ ذٰلِكَ لَيْسَ لِلْوُجُوْبِ بِالْإِجْمَاعِ لِهٰذَا لَمْ يُنْكِرْ بَعْضُهُم عَلٰى بَعْضٍ." (نيل الأوطار ١/١٣٣)

سوال: ہمارے استاد محترم جو ایک مدرسہ میں شعبہ تدریس سے وابستہ ہیں ان کے بقول داڑھی صرف گال اور ٹھوڑی پر ہوتی ہے اور جو بال گھنڈی پر اُگتے ہیں چونکہ گردن کے بال ہوتے ہیں۔ وہ داڑھی میں شامل نہیں اور حدیث میں صرف اتنا ہے: « خَالِفُوا الْمُشْرِكِيْنَ ، قَصُّوا الشَّوَارِبَ وَأَعْفُوا اللُّحٰى.» [1] اس میں صرف گال ٹھوڑی کے بال ہی ہو سکتے ہیں گردن کے بال داڑھی میں شامل نہیں اس کے کہنے پر ہم نے گردن کے بال اتروا دیئے تو داڑھی کے بالوں کی حد کیا ہے؟

جواب: اہل لغت نے داڑھی کی تعریف یوں کی ہے:

" شَعْرُ الْخَدَّيْنِ وَالذَّقْنِ ." (المنجد)

یعنی "وہ بال جو دونوں رخسار اور ٹھوڑی پر اُگتے ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا جو بال ان حدود کے ورے اُگتے ہیں، وہ داڑھی کی تعریف میں شامل نہیں۔ گھنڈی اور گردن کے بال بھی اسی زمرہ میں آتے ہیں ان کو لینا جائز ہے۔

موصوف مدرس نے مسئلہ درست بیان فرمایا ہے۔

واضح ہو کہ ہمارے ہاں بعض متبع سنت حضرات بالخصوص بعض علماء کا عمل رخساروں کے بال لینا ہے اس کی کسی صورت گنجائش نہیں نظر آتی کیونکہ یہ داڑھی میں شامل ہیں۔ لہٰذا ان کا لینا ناجائز ہے۔ اللہ رب العزت سب کو ہدایت کی توفیق بخشے۔

---

[1] (٥٩٨) صحيح البخاري ،كتاب اللباس ،باب تقليم الأظفار (٥٨٩٢) ،صحيح مسلم ،كتاب الطهارة ،باب خصال الفطرة (٦٠٢)،المشكاة ،الترجل (٤٤٢١).

مقدار لحیہ

حافظ ثناء اللہ صاحب کے ایک فتویٰ پر تعاقب

ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور مجریہ ۱۱ نومبر ۱۹۹۴ء کے ص ۸ پر احکام و مسائل کے تحت ''داڑھی کا شرعاً کیا حکم ہے؟ داڑھی کی مقدار شرعی کیا ہے؟ دو سوال مذکور ہیں جن کا جواب فضیلۃ الشیخ الحافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ تعالیٰ نے تحریر فرمایا۔

داڑھی کو انبیاء علیہم السلام کی سنت قدیمہ بروایت:

« عَشْرٌ مِّنَ الْفِطْرَةِ أَیْ مِنْ سُنَّةِ الْأَنْبِیَاءِ الَّذِیْنَ أُمِرْنَا أَنْ نَقْتَدِیَ بِهِمْ .» ❶

اور وجوب، بصیغۂ امر: « وَأَعْفُوا »، ❷ « أَوْفُوا »، ❸ « أَرْخُوا »، ❹ « وَفِّرُوا ». ❺ ثابت کرنے کے بعد آپ نے مداہنت اختیار کی:

''اگر کوئی شخص مٹھی سے زائد کٹا دے تو بعض آثار کی بناء پر گنجائش ہے۔ بالخصوص راوی حدیث ''إِعْفَاءُ اللِّحْیَه'' ابن عمر رضی اللہ عنہما کے عمل سے اس نظریہ کو تقویت ملتی ہے۔''

پھر جواب نمبر ۲ میں ترک علی الحال کے بعد ارشاد فرمایا کہ:

''مٹھی سے زائد سابقہ حوالوں کی بنا پر کٹوانی جائز ہے۔ کٹوانے کی مرفوع روایت بھی بحوالہ ترمذی بیان کی جاتی ہے لیکن اس میں عمر بن ہارون راوی ضعیف ہے۔'' ❻

---

❶ (۵۹۸) صحیح مسلم (۶۰۴) وصحیح ابن ماجه (۲۹۳) عنها و (۲۹۴) عن عمار بن یاسر رضی الله عنهما.

❷ (۵۹۹) صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب إعفاء اللحی (۵۸۹۳)، صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب خصال الفطرة (۶۰۰).

❸ (۶۰۰) صحیح مسلم (۶۰۲).

❹ (۶۰۱) صحیح مسلم (۶۰۳).

❺ (۶۰۳) صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب تقلیم الأظفار (۵۸۹۲).

❻ (۶۰۴) قال الألبانی موضوع. (۲۹۲۴) ضعیف الترمذی، کتاب الأدب، باب ما جاء فی الأخذ من اللحیة، والضعیفة (۲۸۸) وجرحوا الائمة علیه بهذا الألقاب: کذاب خبیث، کذاب، متروك الحدیث، وضعیف جدا. (میزان الاعتدال ۳/۲۲۸).

اب غور طلب بات یہ ہے کہ کیا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ فعل دائمی تھا جس کو حجت کے طور پر پیش کیا گیا ہے؟ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے:

« كَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا حَجَّ أَوِ اعْتَمَرَ قَبَضَ عَلٰى لِحْيَتِهِ فَمَا فَضَلَ أَخَذَهُ .» [1] (۲/ ۸۷۵)

اس عبارت سے یہ ظاہر ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا یہ فعل دائمی نہ تھا بلکہ مخصوص بالحج والعمرۃ تھا۔ اب اس مخصوص اور مقید فعل سے عام استدلال کرنا کیونکر صحیح ہوگا؟

نیز عون المعبود میں ہے کہ:

" كَانُوْا يَقُصُّوْنَ مِنَ اللِّحْيَةِ فِي النُّسُكِ."

یہاں بھی نسک کی شرط ہے اس کے بغیر داڑھی کترانا حرام ہے۔

علامہ مبارکپوری کا فیصلہ:

علامہ عبدالرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ ''تحفۃ الاحوذی'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

" وَأَمَّا قَوْلُ مَنْ قَالَ: إِنَّه إِذَا زَادَ عَلَى الْقَبْضَةِ يُؤْخَذُ الزَّائِدُ وَاسْتَدَلُّوا بِآثَارِ ابْنِ عُمَرَ وَ عُمَرَ وَ أَبِي هُرَيْرَةَ فَهُوَ ضَعِيفٌ لِأَنَّ أَحَادِيْثَ الْإِعْفَاءِ الْمَرْفُوْعَةَ تَنْفِي هٰذِهِ الْآثَارَ، فَهٰذِهِ الْآثَارُ لَا تَصْلُحُ لِلِاسْتِدْلَالِ بِهَا مَعَ وُجُوْدِ هٰذِهِ الْأَحَادِيْثِ الْمَرْفُوْعَةِ الصَّحِيْحَةِ ؛فَأَسْلَمُ الْأَقْوَالِ: هُوَ قَوْلُ مَنْ قَالَ بِظَاهِرِ أَحَادِيْثِ الْإِعْفَاءِ وَ كَرِهَ أَنْ يُؤْخَذَ مِنْ طُوْلِ اللِّحْيَةِ وَ عَرْضِهَا."

''داڑھی کو مٹھی سے زائد کٹوانے کے دعویدار جو حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عمر اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے آثار سے استدلال کرتے ہیں وہ انتہائی کمزور ہے کیونکہ مرفوع صحیح احادیث کی موجودگی میں آثار صحابہ رضی اللہ عنہ سے استدلال صحیح نہیں۔ احادیث مرفوعہ اعفاء اللحیہ ان اقوال کی نفی کرتی ہیں۔ پس سلامتی والا مذہب ان لوگوں کا ہے جو ''حدیث اعفاء'' کے ظاہر کو لیتے ہوئے بڑھاتے ہیں اور اس کے طول و عرض سے داڑھی کٹانا حرام سمجھتے ہیں۔''

امام طحاوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے:

" أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ:« مَنْ قَطَعَ شَعْرَةً مِّنْ لِحْيَتِهِ لَايُسْتَجَابُ دُعَائُهُ ، وَلَا تَنْزِلُ عَلَيْهِ

---

[1] (٦٠٥) صحيح البخاري (٥٨٩٢) .

الرَّحْمَةُ ، وَ لَا يَنظُرُ اللّٰهُ إِلَيْهِ نَظَرَ رَحْمَةٍ تُسَمِّيهِ الْمَلَائِكَةُ مَلْعُونًا وَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ بِمَنْزِلَةِ الْيَهُودِ وَالنَّصَارٰى .»

''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے داڑھی کا ایک بال بھی کاٹا اس کی دعاء قبول نہ ہو گی، اس پر رحمت الٰہی کا نزول نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔ فرشتے اس کا نام ملعون رکھیں گے۔ اور وہ عنداللہ یہود و نصاریٰ کے قائم مقام ہوگا۔''

جواب تعاقب از حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے عمل کے متعلق مؤطا امام مالک رحمہ اللہ کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

« عَنْ نَافِعٍ أَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ إِذَا أَفْطَرَ مِنْ رَمَضَانَ وَ هُوَ يُرِيدُ الْحَجَّ لَمْ يَأْخُذْ مِنْ رَأْسِهِ وَلَا مِنْ لِحْيَتِهِ شَيْئًا حَتّٰى يَحُجَّ .» [1]

''نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب رمضان کے روزوں سے فارغ ہوتے اور حج کا قصد ہوتا تو سر اور داڑھی کے بال نہ لیتے حتیٰ کہ حج کرتے۔''

مذکورہ الفاظ پر بار بار غور فرمائیں یہ واضح طور پر دال ہیں کہ ماسوائے مخصوص ایام کے ان کا یہ فعل دائمی تھا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" اَلَّذِيْ يَظْهَرُ أَنَّ ابْنَ عُمَرَ لَا يَخُصُّ هٰذَا التَّخْصِيْصَ بِالنُّسُكِ بَلْ كَانَ حَمَلَ الْأَمْرَ بِالْإِعْفَاءِ عَلٰى غَيْرِ الْحَالَةِ الَّتِيْ تَتَشَوَّهُ فِيْهَا الصُّوْرَةُ بِإِفْرَاطِ طُوْلِ شَعْرِ اللِّحْيَةِ أَوْ عَرْضِهٖ."

یعنی ''جو بات ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ فعل نسک کے ساتھ مخصوص نہیں تھا بلکہ وہ اعفاء لحیہ کا امر اس حالت پر محمول کرتے تھے کہ داڑھی کے طول و عرض میں افراط کی وجہ سے شکل و صورت قبیح نہ ہونے پائے۔ (فتح الباری ١٠/٣٥٠)

نیز شیخنا مجتہد العصر محدث روپڑی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا فعل، سو اس سے مجھے اتنا تردد

[1] (٦٠٦) المؤطا، كتاب الحج، باب التقصير رقم الباب(٦١)، رقم الحديث من الحج (١٨٦،١٨٧) يحيى عن مالك عن نافع......الخ

ہے اگر غیر حج عمرے میں داڑھی کو چھیڑنا ناجائز ہوتا تو ناجائز کام حج اور عمرے میں کس طرح جائز ہو گیا؟ احرام سے نکلنے کے لئے وہی کام کیا جاتا ہے جو غیر احرام میں جائز ہو۔ خاص طور پر جب ظاہر الفاظ قرآن میں سر منڈانے کٹانے کا ذکر ہے اور احادیث میں اس کا ذکر ہے تو آیت کو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے داڑھی کے کٹانے پر کس طرح چسپاں کر لیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غیر حج عمرے میں وہ کٹانے کے قائل تھے۔ اس لئے حج عمرے میں سر کے علاوہ بقیہ حجامت (ناخن وغیرہ) کی طرح مٹھی سے زائد داڑھی بھی کٹا لیتے۔ اور چونکہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حدیث: «أَعْفُوا اللُّحَى» (داڑھیاں بڑھاؤ) کے راوی ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ صحابی کا خیال ہے حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ شاید اس کو حدیث نہ پہنچی ہو۔ کیونکہ حدیث تو وہ خود روایت کر رہے ہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذرا سی بات میں خلاف برداشت نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ عادت کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی فعل صادر ہوتا تو اس میں بھی موافقت کی کوشش کرتے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ضرور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سند لی ہے۔ ورنہ داڑھیاں بڑھانے کی حدیث کے راوی ہو کر ایک ناجائز کام کا ارتکاب نہ کرتے۔ اس لئے اگر کوئی شخص مٹھی سے زائد کٹائے تو اس پر اعتراض نہ کرنا چاہیے ہاں افضل یہی ہے کہ مٹھی سے زائد نہ کٹائی جائے۔

(فتاویٰ علمائے اهل حدیث ۱۳/ ۳۳۷-۳۳۸)

علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ کی رائے کا جواب محدث روپڑی رحمہ اللہ کے کلام میں گزر چکا۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کی طرف منسوب حدیث کی بناء پر ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ دین پر کیا فتویٰ چسپاں کریں گے جن کا عمل اس کے خلاف تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس روایت کی صحت محل نظر ہے۔ اور اعتبار کے لائق نہیں۔

سوال: کیا پگڑی وغیرہ پہننا تعبدی عبادت ہے یا عادات سنن میں سے ہے؟

جواب: راسخین فی العلم واقعی اس بات کے قائل ہیں کہ لباس عادات سنن میں سے ہے۔ چنانچہ شیخ خیرالدین وائلی مسئلہ پگڑی پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

" وَهِيَ لَيْسَتْ سُنَّةً تَعَبُّدِيَّةً أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهَا ، بَلْ هِيَ مُجَرَّدُ سُنَّةٍ مِّنْ سُنَنِ الْعَادَاتِ " (كِتَابُ الْمَسْجِدِ فِي الْإِسْلَامِ صـ١٢٤)

یعنی "پگڑی پہننا تعبدی عبادت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس کا حکم دیا ہو بلکہ یہ تو محض

عادات سنن میں سے ایک سنت ہے۔"

نیز علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَالصَّوَابُ أَنَّ أَفْضَلَ الطُّرُقِ طَرِيْقُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ الَّتِيْ سَنَّهَا وَ أَمَرَ بِهَا وَ رَغَّبَ فِيْهَا وَدَاوَمَ عَلَيْهَا وَهِيَ أَنَّ هَدْيَهُ فِي اللِّبَاسِ مَا تَيَسَّرَ مِنَ اللِّبَاسِ ." (زَادُ الْمَعَاد ۱/ ۳۶)

"درست بات یہ ہے کہ سب سے افضل ترین طریق رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہے جو آپ نے مقرر فرمایا، اس کا حکم دیا، اس میں رغبت کی، اس پر مداومت کی۔ وہ یہ ہے کہ لباس میں آپ کا طریق کار یہ تھا کہ جو شئ آسانی سے میسر آتی پہن لیتے۔"

اس کے باوجود اگر کوئی شخص آپ ﷺ کی پیروی میں آپ کے لباس کی پسندیدہ صورتوں میں سے کسی صورت کو اختیار کرتا ہے تو وہ اپنی نیت کے اعتبار سے ماجور ہے (ان شاء اللہ) مثلاً کسی نے رسول اللہ ﷺ کے انداز کی پگڑی پہنی، بہ نیت اتباع رسول ﷺ۔ یہ آدمی مستحق اجر وثواب ہے۔ لیکن دوسرا شخص اپنے ماحول کے اعتبار سے غیر انداز اختیار کرتا ہے تو بھی جائز ہے۔ بشرطیکہ اس سے غیر مسلموں کی مشابہت مقصود نہ ہو جب کہ منہی عنہ صورتوں کا مرتکب بنظر شرع مجرم ٹھہرتا ہے۔

سوال: کیا بالوں کے درمیان سے مانگ نکالنا سنت ہے، میں نے سنا تھا کہ جس حدیث میں مانگ نکالنا آتا ہے وہ ضعیف ہے؟

جواب: بالوں کے مانگ نکالنے والی روایت بلاشبہ صحیح ہے۔ [1]

(بخاری، بَابُ إِتْيَانِ إِلَيْهِمُ النبی ﷺ حِيْنَ قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ)

سوال: تعزیت کے آداب و دعاء بتائیں؟

جواب: تعزیت کرنا سنت ہے کیونکہ اس سے پریشان حال کی دلجوئی ہوتی ہے۔ اور اس کے لئے بھلائی کی دعا بھی ہونی چاہیے۔ اس میں کوئی فرق نہیں، مرنے والا چھوٹا ہو یا بڑا اور نہ تعزیت کے لئے کوئی مخصوص الفاظ ہیں۔ بلکہ مناسب آسان جو بھی الفاظ ہوں، ان سے تعزیت ہو سکتی ہے۔ اور نہ اس کے لئے کوئی وقت یا دن مقرر ہے۔ تعزیت کے لئے مخصوص ہیئت میں مخصوص دن بیٹھے رہنا سنت سے ثابت نہیں۔ اس سے اجتناب

[1] (۶۰۷) صحیح البخاری، باب اتیان الیهود النبی ﷺ حین قدم المدینة، کتاب مناقب الأنصار (۳۹۴۴). درمیان سے مانگ نکالنے والی حدیث ابوداؤد میں ہے اور البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

ضروری ہے۔ صحیح حدیث میں ہے ''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔'' [1]

سوال: مردے کو نہلاتے ہوئے اس کے پیر کس سمت رہیں؟

جواب: بظاہر اختیار ہے کسی حدیث یا اثر میں پیروں کی سمت کا تعین نہیں۔

سوال: قبلے کی سمت پیروں کی صریح ممانعت ہو تو بتائیں؟

جواب: قبلے کی سمت پاؤں کی ممانعت کا کسی حدیث میں ذکر نہیں۔

سوال: مسجد ڈبل سٹوری ہے۔ امام کی رہائش نہ ہونے کی وجہ سے کیا مسجد کی تیسری منزل پر رہائش بنائی جا سکتی ہے؟

جواب: مسجد کی چھت پر رہائش گاہ کا راستہ اگر علیحدہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ البتہ احترامِ مسجد کا تقاضا یہ ہے کہ رہائش گاہ مسجد سے الگ ہو۔ بامر مجبوری جواز ہے۔

سوال: علماء نے حقوق اللہ میں توبہ کی تین شرائط بیان کی ہیں لیکن اگر حقوق الناس سے ہو تو مزید ایک اور شرط بڑھا دی ہے اور وہ ہے کہ اس مظلوم بھائی کے حق کو ادا کرے یا اس سے معافی مانگے۔ تو اس سے پتہ یہ چلا کہ جب تک وہ مظلوم اسے معاف نہیں کرے گا تب تک اس کا یہ گناہ اگر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے تب بھی معاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہاں چند اعتراضات کر سکتے ہیں وہ یہ کہ قرآن کی آیت:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهِ وَ يَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ . ﴾ (النساء:٤٨)

اس سے پتہ چلا کہ شرک کے علاوہ باقی تمام گناہ خواہ حقوق اللہ میں سے ہوں یا حقوق الناس سے وہ اللہ تعالیٰ معاف کر سکتا ہے۔ اور دوسری آیت:

﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ﴾ (الفرقان:٦٨)

﴿ إِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَّ كَانَ اللّٰهُ غَفُوراً رَّحِيماً ﴾ (الفرقان:٧٠)

اس میں بھی قتل اور زنا کے بعد توبہ کے ساتھ ہی مطلق معاف کرنے کا ذکر ہے اور یہ حدیث کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے مکمل ایک سو اشخاص کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ پھر اس نے اللہ تعالیٰ کی

---

[1] (٦٠٨) صحیح البخاری، کتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا علی صلح جور فالصلح مردود (٢٦٩٧).

طرف توبہ کی تو اس کی توبہ قبول ہوئی اور وہ جنت کا مستحق ہوا۔ حالانکہ یہ حقوق الناس اور حقوق اللہ دونوں میں سے ہے اور اس شخص نے مقتول کے ورثاء میں سے کسی سے نہ معافی مانگی ہے نہ ان کی دیت ادا کی ہے۔ لہٰذا ان دلائل کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے۔ کہ حقوق الناس میں بندوں سے معافی مانگے بغیر اگر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے تو بہ قبول ہوسکتی ہے کیونکہ : ﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ . ﴾ والی آیت عمومیت پر دلالت کرتی ہے۔ لہٰذا اس کے لئے قصاص کی ضرورت ہے۔ جو ہمارے خیال کے مطابق موجود نہیں۔ عاجز نے بڑے بڑے علماء سے اس کے بارے میں استفسار کیا لیکن کہیں سے بھی تسلی بخش جواب نہیں مل سکا۔ اسی لیے آپ کو اس چیز کی تکلیف دے رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

جواب : بلاشبہ عام قاعدہ ضابطہ یہی ہے کہ جب تک صاحب حق سے تصفیہ نہ ہو اس وقت تک انسان حقوق العباد سے بری الذمہ قرار نہیں پاتا لیکن یہ بات کہیں نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی خاص نظر شفقت سے بھی ایسے شخص کو معافی نہیں ملتی۔ بلکہ نصوص شریعت سے یہ بات عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت و رحیمیت کا جب تقاضا ہو تو بڑے بڑے گنہگاروں اور سیاہ کاروں کے لیے بھی عفو و کرم کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ سب کو پکڑ کر جنت میں داخل کر دے یا جہنم میں ڈال دے کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں۔

''مشکوٰۃ المصابیح'' کے باب ''الایمان فی القدر'' میں ایک روایت کے الفاظ ہیں:

« لَوأَنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ عَذَّبَ أَهْلَ سَمَاوَاتِهِ وَ أَهْلَ أَرْضِهِ عَذَّبَهُمْ وَ هُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ لَهُمْ وَلَو رَحِمَهُمْ كَانَتْ رَحْمَتُه خَيْرًا لَهُمْ مِنْ أَعْمَالِهِمْ . »[1]

''اگر اللہ عز و جل، ارض و سماء کی تمام مخلوق کو پکڑ کر عذاب میں مبتلا کر دے تو پھر بھی وہ بے انصاف نہیں ٹھہرتا اور اگر تمام کو اپنی رحمت کی آغوش میں لے لے تو ان کے اعمال سے اس کی رحمت کہیں بہتر ہے۔''

پھر قرآن مجید میں بھی بڑے واضح الفاظ میں موجود ہے:

﴿ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ . ﴾ (الأنبياء:٢٣)

''وہ اپنے کاموں کے لیے (کسی کے آگے) جوابدہ نہیں اور سب (اس کے آگے) جوابدہ ہیں۔''

---

[1] (٦٠٩) صححه الالبانی و حمزة ، صحیح ابی داؤد، کتاب السنة ، باب فی القدر(٤٦٩٩)، ابن ماجه(٧٧)، احمد(١٨٣/٥-١٩٩).

امام طحاوی رحمہ اللہ ''عقیدہ طحاویہ'' میں فرماتے ہیں:

" فَمَنْ سَأَلَ لِمَ فَعَلَ ؟ فَقَد رَدَّ حُكْمَ الكِتَابِ وَ مَنْ رَدَّ حُكْمَ الْكِتَابِ كَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ . "

یعنی'' جس نے بطور تعنت کہا اللہ نے فلاں کام کس لیے کیا ہے؟ اس نے کتاب کے حکم کو رد کیا اور جس نے کتاب کا حکم رد کیا اس کا شمار کافروں سے ہے۔ کیونکہ بندے کا کام صرف انقیاد و تسلیم ہے۔''

اور انجیل میں ہے:

" يَا بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَ أَمَرَ رَبُّنَا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا بِمَ أَمَرَ رَبُّنَا . ؟ "

'' اے بنی اسرائیل مت کہو ہمارے پروردگار نے ہمیں کس لیے حکم دیا ہے لیکن یہ کہو کہ ہمارے پرودگار نے ہمیں کس شئی کا حکم دیا ہے؟'' (بحواله شرح العقيدة الطحاوية ص:٢٣٩)

مذکورہ صورت حال کے پیش نظر ناممکن نہیں ہے کہ رب رحیم و کریم بعض ظالم و مجرم بندوں کے ظلم و ستم سے صرف نظر کر کے ان کی بداعمالیوں اور سیاہ کاریوں پر رحمت کا قلم چلا کر توبہ و استغفار کے آنسوؤں سے انہیں دھو ڈالے۔ اس لیے کہ وہ صاحب اختیار ہے۔﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا .﴾ (الزمر:٥٣) اور صاحب حق کی جھولی اپنی رحمت خاص سے بھر کر اسے راضی کر دے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" فِي الْحَدِيْثِ مَشْرُوْعِيَّةُ التَّوبَةِ مِنْ جَمِيْعِ الْكَبَائِرِ حَتّٰى مَنْ قَتَل الْأَنْفُسَ وَ يُحْمَلُ عَلٰى أَنَّ اللّٰهَ تَعالٰى إِذَا قَبِلَ تَوبَةَ الْقَاتِلِ تَكَفَّلَ بِرِضَا خَصْمِهٖ. قَالَ الطِّيبِيُّ: إِذَا رَضِيَ عَنْ عَبْدِهٖ أَرْضٰى خُصُومَهٗ وَرَدَّ مَظَالِمَهٗ. " (مرعاة المفاتيح: ٤٦٩/٣)

'' اس حدیث میں تمام کبیرہ گناہوں سے حتی کہ کئی اشخاص کے قتل سے بھی توبہ کی مشروعیت ہے اور یہ اس پر محمول ہے کہ جب اللہ تعالیٰ قاتل کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔ تو مقتول کی رضا کا وہ خود ضامن بن جاتا ہے۔''

امام طیبی رحمہ اللہ نے کہا: جب اللہ اپنے کسی بندے پر راضی ہو جاتا ہے تو اس کے مدمقابل کو بھی راضی

کر کے اس کا حق اپنے پاس سے اسے عنایت فرما دے گا۔

سوال: عورت کا سر کے بال کٹوانا کیسا ہے؟

''الاعتصام'' کے شمارہ ۳۶ (بابت ۸ ستمبر ۱۹۸۹ء) میں ایک سوال کے جواب میں تحریر کیا گیا تھا۔ کہ عورت پیچھے سے اپنے بال کاٹ سکتی ہے یعنی پٹے بال بنوا اور رکھ سکتی ہے۔ بشرطیکہ مقصود بے پردگی، مردوں سے تشابہ، مغربی تہذیب کی نقالی اور فیشن پرستی نہ ہو۔

اس مضمون کی اشاعت کے بعد یہ مسئلہ اہل علم و تحقیق میں زیر غور و بحث ہے۔ کئی علماء نے زبانی طور پر اس پر اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ بعض نے جواز کا رجحان ظاہر فرمایا ہے۔ انہی ثانی الذکر اہل علم و تحقیق حضرات میں ہماری جماعت کے نامور عالم اور شیخ الحدیث مولانا حافظ ثناء اللہ صاحب مدنی حفظہ اللہ بھی ہیں۔ چنانچہ راقم کی درخواست پر انہوں نے اپنے نقطۂ نظر کے دلائل تحریری طور پر ضبط فرما دیئے ہیں۔ جس پر ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ ہم اس دوسرے نقطۂ نظر کو بھی بطور مذاکرہ علمیہ شائع کر رہے ہیں تاکہ اہل علم کے سامنے دونوں نقطۂ نظر اور ان کے دلائل آ جائیں تاکہ مسئلے کی تنقیح و تحقیق میں آسانی ہو۔

اسی طرح ہماری جماعت کے ایک اور فاضل، محقق بزرگ مولانا صغیر احمد شاغف بہاری حفظہ اللہ (مکہ مکرمہ) نے بھی راقم کے نام اپنے ایک مکتوب میں شائع شدہ مضمون سے اختلاف فرمایا ہے۔ افادۂ عام کی غرض سے ان کے مکتوب گرامی کا یہ حصہ بھی شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔ اہل علم سے امید ہے کہ وہ طرفین کے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار فرمائیں گے۔ اس مذاکرہ علمیہ کے لئے۔ ''الاعتصام'' کے صفحات حاضر ہیں۔ لیجئے اب مولانا مدنی کا مضمون اور مولانا بہاری حفظہ اللہ کا مکتوب ملاحظہ فرمائیں۔

(صلاح الدین یوسف)

مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی کی رائے

بِلَا رَیْب اَللّٰہُ خَالِقُ الْبَشَرِ الْقَائِلُ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِیْ أَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ نے بنی نوع انسان کی زیبائش، زیب و زینت اور اس کا حسن اس کے سر کے بالوں میں رکھا ہے جو اس کی شخصیت میں پروقار اضافہ کے علاوہ قلبی و ذہنی مسرت و شادمانی کا پیغام ہیں۔ اس بناء پر شریعت مطہرہ میں ان کی طہارت و نظافت کا بطور خاص حکم دیا ہے۔ چنانچہ نبی الرحمۃ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ كَانَ لَهُ شَعْرٌ فَلْيُكْرِمْهُ .» ❶ (رواہ أبوداود ،بحوالہ مشکوۃ المصابیح :۳۸۲، جز ۲)

یعنی ”جس کے بال ہوں اسے چاہیے کہ ان کو صاف ستھرا رکھے۔“

دوسری روایت میں ہے:

«يُكْثِرُ دُهْنَ رَأْسِهِ وَ تَسْرِيحَ لِحْيَتِهِ وَ يُكْثِرُ الْقِنَاعَ ،كَأَنَّ ثَوْبَهُ ثَوْبُ زَيَّاتٍ.» ❷

(رَوَاهُ فِي شَرْحِ السُّنَّةِ بحوالہ مشکوۃ:۳۸۱/۲)

”آپ کثرت سے سر پر تیل لگاتے اور کنگھی کرتے۔ بسا اوقات پگڑی کے نیچے کپڑا رکھتے گویا کہ آپ کا کپڑا تیلی کا کپڑا تھا۔“

اسی حسن کو قائم و دائم رکھنے کے لئے سفید بالوں کو رنگنے کی تاکید فرمائی گئی۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«غَيِّرُوا الشَّيْبَ.» ❸ دوسری روایت میں ہے:

«غَيِّرُوا هٰذَا بِشَيْئٍ وَاجْتَنِبُوا السَّوَادَ .» ❹ (مسلم :۱۹۹/۲)

یعنی ”ابوقحافہ کے بالوں کو رنگ دو اور سیاہ کرنے سے بچو۔“

یہ ایک ایسا اہم مسئلہ ہے جو اسلام کی آمد سے قبل بھی فطرت انسانی میں مرکوز تھا۔ چنانچہ جاہلی شعراء کے دواوین و قصائد کو اٹھا کر دیکھیں۔ خوب صورت لمبے گھنے سیاہ بالوں کی مدح و ثناء میں جا بجا رطب اللسان نظر آئیں گے۔ بطور امثلہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

امرؤالقیس اپنے معلقہ میں کہتا ہے:

و فرع يزين المتن أسود فاحم
أثيث كقنو النخلة المتعثكل

---

❶(۶۱۰) صحيح أبي داؤد، كتاب الترجل، باب في إصلاح الشعر(۴۱۶۳)، فتح الباری(۳۸۱/۱۰). وقال: سنده حسن.

❷(۶۱۱) ضعفه الألبانی، مختصر الشمائل ، رقم (۳۶) والشمائل للترمذی(۶۱) ، المشكاة ، كتاب اللباس، باب الترجل(۴۴۴۵)، فتح(۲۷۴/۱۰)، تنقيح الرواة(۲۴۴/۳) و قال : و فی اسناده ربيع بن صبيح و يزيد بن أبان و كلاهما ضعيفان ، الضعيفة (۲۳۵۶).

❸(۶۱۲) احمد(۲۶۱/۲)ب (۷۵۳۶)، لأحمد شاكر و قال : اسناده صحيح، الصحيحة للألبانی(۸۳۶)، و قال : قلت و اسناده حسن ، شرح السنة للبغوی(۳۱۷۵) و قال زهير الشاويش و الأرناؤوط، اسناده حسن.

❹(۶۱۳) صحيح مسلم ، كتاب اللباس ، باب استحباب خضاب الشيب بصفرة و حمرة(۵۵۰۹) ، احمد (۳۱۶/۳)، عن جابر رضی الله عنه.

غدائره مستشزرات إلی العلی
تضل المداری فی مثنی و مرسل ❶

اور الاعشیٰ میمون بن قیس نے کہا:

غراء فرعاء مصقول عوارضها
تمشی الهوینا کما یمشی الوجی الوحل ❷

نیز ایک تیسرے نے کہا:

بیضاء تسحب من قیام فرعها
و تغیب فیه و هووصف أسحم
فکأنها فیه نهار ساطع
و کأنه لیل علیها مظلم ❸

ان اشعار کا ترجمہ و تفہیم اصحاب ذوق پر چھوڑے دیتا ہوں۔

تاہم اسلام میں جہاں تک مرد کے بالوں کا تعلق ہے اگرچہ بعض احادیث میں منڈوانے کا جواز ملتا ہے لیکن افضل و اولیٰ امر یہ ہے کہ بال رکھے جائیں صاف کرانے سے احتراز کیا جائے۔

نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کا عملی نمونہ کتب احادیث میں ہمارے سامنے موجود ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. ﴾ (الأحزاب:۲۱)

آپ کے بالوں کے وصف میں وارد ہے:

« إِلٰى أَنْصَافِ أُذُنَيْهِ. وَ فِیْ رِوَايَةٍ: بَيْنَ أُذُنَيْهِ وَ عَاتِقِهِ. »❹ (متفق علیه، بحواله مشکوة)

---

❶ ترجمہ: اس کی کالی سیاہ زلفیں اس کی پیٹھ کو زینت دے رہی ہیں، اور اس کے بال کثرت کے سبب اس طرح تہہ بتہہ ہیں جیسے پھلدار کھجوروں کے خوشے۔ اس کے بال کثرت کے سبب اتنے اُونچے ہیں کہ اس کا چونڈا گندھے اور کھلے بالوں میں گم ہو جاتا ہے۔ (ترجمۃ از صاحب ذوق الشیخ الحافظ جمیل أحمد ﷾ فاضل مدینہ یونیورسٹی)

❷ ترجمہ: وہ (ھریرہ) بڑی چمکتی پیشانی والی، لمبے بالوں والی، چمکتے دانتوں والی ہے۔ آہستہ آہستہ چلتی ہے جیسا کہ کیچڑ میں زخمی پاؤں والا چلتا ہے۔ دیوان الأعشی الکبیر (۳۰۰).

❸ وہ گورے چٹے رنگ کی ہے۔ وہ اٹھتے وقت اپنے لمبے بالوں کو گھسیٹ کر چلتی ہے۔

❹ (٦١٤) صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب الجعد (٥٩٠١). فیه شحمة أذنیه. صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب صفة شعر النبی ﷺ (٦٠٦٩). واللفظ لمسلم. والمشکاة (٥٧٨٢).

’’آپ ﷺ کے بال نصف کانوں تک اور ایک روایت کے مطابق، کانوں اور کندھوں کے درمیان تھے۔‘‘

’’مجمع البحار‘‘ میں اس اختلاف کی وجہ جمع یوں بیان ہوئی ہے کہ اس کو مختلف اوقات پر محمول کیا جائے گا۔‘‘ جب آپ بال کاٹنے میں تساہل برتتے تو کندھوں تک پہنچ جاتے اور جب کاٹتے تو کانوں تک۔‘‘

اس سے معلوم ہوا مردوں کے لئے بال رکھنے کا اندازہ اس حد بندی میں محدود ہے جب کہ عورتوں کو، ہیئت اختیار کرنی ممنوع ہے۔ جس طرح کہ مردوں کو عورتوں سے تشبہ اختیار کرنا بھی ناجائز ہے۔ حدیث میں ہے:

« لَعَنَ اللّٰهُ الْمُتَشَبِّهِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ.» [1]

(رَوَاهُ الْبُخَارِی)

’’اللہ لعنت کرے ان مردوں پر جو عورتوں سے مشابہت اختیار کرتے ہیں اور وہ عورتیں بھی ملعون ہیں جو مردوں سے مشابہت اختیار کرتی ہیں۔‘‘

دوسری روایت میں ہے:

« لَعَنَ النَّبِیُّ ﷺ الْمُخَنَّثِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالْمُتَرَجِّلَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَقَالَ: « أَخْرِجُوْهُمْ مِنْ بُيُوْتِكُمْ.» [2] (بخاری)

’’نبی ﷺ نے عورتوں سے مشابہت اختیار کرنے والے مردوں پر لعنت کی اور ان عورتوں پر بھی جو مردوں سے مشابہت کرتی ہیں اور فرمایا: ان کو اپنے گھروں سے نکال دو۔‘‘

باقی رہا ازواج مطہرات کا طرزِ عمل کہ وہ اپنے بالوں کو کانوں تک کاٹتی تھیں اس بارے میں وارد روایت کا قدرے تفصیل سے جائزہ لینا چاہتا ہوں۔

پہلے اصل روایت ملاحظہ فرمائیں:

« كَانَ أَزْوَاجُ النَّبِيِّ ﷺ يَأْخُذْنَ مِنْ رُؤُوْسِهِنَّ حَتّٰى تَكُوْنَ كَالْوَفْرَةِ .» [3]

(صحيح مسلم كِتَابُ الطَّهَارَةِ، بَابُ الْقَدْرِ الْمُسْتَحَبِّ مِنَ الْمَاءِ فِي غُسْلِ الْجَنَابَةِ: ١/١٤٨)

---

[1] (٦١٥) صحيح البخاری، كتاب اللباس ،باب المتشبهين بالنساء والمتشبهات بالرجال(٥٨٨٥).

[2] (٦١٦) صحيح البخاری، كتاب اللباس ،باب إخراج المتشبهين بالنساء من البيوت(٥٨٨٦).

[3] (٦١٧) صحيح مسلم ،كتاب الحيض ،باب القدر المستحب من الماء فی غسل الجنابة ......(٧٢٨).

یعنی ''ازواج مطہرات اپنے بالوں سے لیتی تھیں حتی کہ وہ وفرہ (کانوں تک) کی مانند ہوتے۔''

مصنف نے کلام ہذا حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن تابعی سے نقل کیا ہے۔ اس میں لفظ ''یَأْخُذْنَ'' کا ترجمہ ضروری نہیں کہ کاٹنا ہی ہو۔ احتمال ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ وہ اپنے بالوں کا خاص انداز میں جوڑا بنا لیتی تھیں جو وفرہ کی شکل میں نظر آتے مسائل طہارت سے اس معنی کی مناسبت بھی ہے۔ عورتیں عموماً غسل کے موقع پر ایسا فعل کرتی ہیں۔

پھر مصنف کا اس کے مناسب محل و مقام پر ذکر نہ کرنا بھی ہمارے مدعا کا مؤید ہے۔ جب کہ صحیح مسلم اپنے حسن ترتیب اور سَهْلُ الْمَأْخَذ ہونے میں معروف ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ شرع میں (وَفْرَہ ،لِمَّہ ،جُمَّة) (اہل فن کے صحیح قول کے مطابق وَفْرَہ وہ بال ہیں جو کانوں تک ہوں۔ کندھوں تک ''لمہ'' اور اس سے تجاوز کرنے والے بالوں کو ''جمہ'' کہا جاتا ہے) بالوں کے مذکورہ اوصاف عموماً مردوں کے لئے بیان ہوئے ہیں۔

یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بال حقیقتاً ''وفرہ'' نہ تھے۔ صرف دیکھنے کو ''وفرہ'' معلوم ہوتے تھے۔ اس لئے یہاں کاف تشبیہ سے تعبیر کی گئی ہے۔ کَالْوَفْرَة یعنی ''وفرہ جیسے تھے۔''

اور اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ ''یَأْخُذْنَ'' کا معنی کاٹنا ہے تو یہ ازواج مطہرات کا خاصا ہوگا۔ کیوں کہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد ان کی حیثیت معتدات (عدت گزارنے والیاں) جیسی تھی۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمًا. ﴾ (سورة الأحزاب)

قاضی عیاض شارح ''صحیح مسلم'' نے اس بات کا اشارہ دیا ہے کہ ازواج النبی ﷺ کا یہ فعل آپ کی وفات کے بعد تھا اور صاحب تفسیر ''اضواء البیان'' نے امام نووی رحمہ اللہ کی پیروی میں بایں الفاظ : وَهُوَ مُتَعَيِّنٌ وَلَا يُظَنُّ بِهِنَّ فِعْلُهُ فِي حَيَاتِهِ ﷺ اس موقف کی تائید وحمایت کی ہے۔

(أضواء البيان :٥/ ٥٩٨-٦٠١)

اس حکم کے پیش نظر ازواج النبی ﷺ نے سادگی اور ترک زینت کو ضروری سمجھ کر فعل ہذا کا ارتکاب کیا ہو تا کہ کلی طور پر نکاح کے دواعی سے قطع و یأس ہو سکے۔

ہر دو صورت میں امام نووی رحمہ اللہ کا قول: ''وَ فِیهِ دَلِیلٌ عَلٰی جَوَازِ تَخْفِیفِ الشُّعُورِ لِلنِّسَاءِ.'' (اس میں عورتوں کا بال ہلکے کرنے کی دلیل ہے) کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ ان کا استدلال درست نہیں۔ بالخصوص جب کہ خود بھی قاضی کے موقف کو درست قرار دے رہے ہیں۔ نیز اس میں تغییر لخلق اللہ اور مثلہ کا شائبہ بھی موجود ہے۔ جو اس فعل سے مانع ہے۔ (وَاللّٰهُ أَعْلَمُ)

عام حالات میں اگر عورت کو بال کاٹنے کی اجازت ہوتی تو میرے خیال میں کم از کم حج کے موقعہ پر اس کو سر مونڈنے کا حکم ضرور ہونا چاہیے تھا تا کہ: « اَللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِینَ.» [1] کی سعادت سے محروم نہ رہتی۔ اس کے برعکس معاملہ یہاں تک محدود ہے کہ ماسوائے چند بالوں کے سر کی تقصیر کی بھی اجازت نہیں تو عام حالات میں بلاوجہ بال کاٹنے کیسے جائز ہوں گے؟ ہرگز نہیں۔ البتہ کسی معقول علت و عذر کی بنا پر یہ فعل جائز ہے۔ جیسے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے بیماری کی وجہ سے اپنا سر منڈا دیا تھا:

﴿ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ﴾ (الأنعام:١١٩)
تفصیلی قصہ ''صحیح ابن حبان'' میں گیارھویں نوع اور پانچویں قسم میں موجود ہے۔

علامہ البانی ''كِتَاب حِجَابِ الْمَرْأَةِ الْمُسْلِمَةِ'' میں فرماتے ہیں بال کٹنے سے اگر غیر مسلموں کی مشابہت مقصود ہو تو حدیث: « مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ .» [2] کی بناء پر ناجائز ہے۔ ورنہ جائز۔ میرے خیال میں یہ بات بھی درست نہیں۔ اس کی کوئی نئی دلیل بیان نہیں کر سکے بلکہ بنیاد ازواج مطہرات کے فعل پر ہے۔ جس کی معقول توجیہات پہلے بیان ہو چکیں۔

نیز حدیث: « مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ. » کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس کی جھلک فتاویٰ اہل حدیث میں موجود ہے۔

دراصل ہمارے ماحول اور معاشرہ میں آج کل جو کچھ نظر آ رہا ہے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کا قطعًا اس سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں۔ یہ خالصتًا مغربی اور استعماری تہذیب و تقلید کا نتیجہ ہے۔ جس کی یلغار میں بڑے بڑے برج بھی منہدم اور بہتے نظر آ رہے ہیں۔ (نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذِهِ الْفِتَنِ)

علماء، خطباء اور اہل قلم حضرات کا فرض ہے کہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کے

---

[1] (٦١٨) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب الحلق والتقصیر (١٧٢٧)، صحیح مسلم، کتاب الحج، باب تفضیل الحلق علی التقصیر (٣١٤٥).

[2] (٦١٩) قال الألبانی "حسن صحیح"، صحیح ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس الشهرة (٤٠٣١)، عن ابن عمر رضی الله عنهما، احمد (٥٠/٢)، الارواء (١٠٩/٥)، ح (١٢٦٩).

لئے اپنے کو مسلح کرتے ہوئے "تَوَكُّلًا عَلَى اللّٰهِ" قوم کی اصلاح کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو!

﴿ إِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ ﴾ (محمد:۷)

مولانا ابوالأشبال صغیر احمد شاغف بہاری کا مکتوب گرامی:

''الاعتصام'' جلد ۴۱ شمارہ ۳۶/۶ صفر ۱۴۱۰ھ/۸ ستمبر ۱۹۸۹ء کے ص ۷-۸ پر عورت کے سر کے بال کے بارے میں فتویٰ آپ کا شائع ہوا ہے۔ اس سے مجھے اتفاق نہیں بے شک نووی، اُبیؒ اور دوسرے حضرات نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی مسلم کی روایت سے جواز کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میری رائے اس کے برخلاف ہے۔ کیونکہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں جو علت موجود ہے۔ یعنی بعد وفات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہوں نے ایسا کیا۔ تو اس حدیث سے استنباط بدون علت ازروئے اصول فقہ جائز نہیں۔ البتہ اس حدیث سے ان بیوہ عورتوں کے لئے جواز کی دلیل ہے۔ جو شادی کرنے کی بوجہ مجبوری خواہش مند نہ ہوں۔ بصورت دیگر اس سے جواز عام کی صورت محض مقلدانہ اندھا پن ہے کہ جو اگلوں نے لکھ دیا۔ اگر چہ ان سے اس نص کے سمجھنے میں سہو ہوا۔ اور ان کے بعد آنے والے آنکھ بند کر کے اسی پر فتویٰ صادر کرتے چلے گئے۔ پھر اس حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا پر خیر القرون کی عورتوں یعنی امہات المومنین کے علاوہ دیگر صحابیات اور تابعیات اور اس کے بعد میں اس پر عمل ہوا ہے یا نہیں؟ کم از کم میری نظر سے تو اس پر عمل کرنے کا ثبوت نہیں گزرا۔

لہٰذا میری نظر میں یہ فتویٰ قابل گرفت و تصحیح ہے۔ یعنی جواز کی صورت صحیح نہیں۔ رہی بات یہ کہ عدم جواز کی بھی کوئی روایت ثابت ہے یا نہیں تو اس سلسلہ میں یہ عملی تواتر از عہد صحابیات تا ایندم کافی ہے۔ البتہ مزید معلومات کے لئے کتب احادیث وفقہ کی ورق گردانی کرنے کی ضرورت ہے۔

عورت سر کے بال بلاوجہ نہ کٹوائے فتویٰ پر وارد چند اعتراضات کا جائزہ:

مؤرخہ ۷ جون ۱۹۹۶ء کے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں ایک سائل کے جواب میں ذکر ہوا تھا کہ بلا معقول عذر کے عورت کو سر کے بال نہیں کٹوانے چاہئیں۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے محض بیماری کی وجہ سے سر کے بال منڈوائے تھے۔ اس سلسلہ میں تلمیذ رشید آصف احسان ملک نے مزید استفسار کیا ہے بلکہ مسئلہ کی تصحیح کا مشورہ دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی جس روایت کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ یہ طبرانی میں ہے لیکن اس میں بیماری کی صراحت نہیں۔ اس کے علاوہ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بال

منڈوا دیتی تھیں ''كَالْوَفْرَة'' تک اور یہ حدیث بالکل ٹھیک ہے [1] اور اس حدیث میں بھی کسی عذر وغیرہ کا ذکر نہیں ہے۔ پھر ان احادیث کی مجمع الزوائد اور صحیح مسلم کے صفحوں کی مجھے فوٹو سٹیٹ بھی ارسال کی ہیں تا کہ بات میں مزید وزن پیدا ہو سکے۔

جواب: جوابًا عرض ہے: کہ بغرض صحت حدیث قصۂ میمونہ رضی اللہ عنہا تفصیلاً صحیح ابن حبان گیارہویں نوع اور پانچویں قسم میں موجود ہے۔ اس کے الفاظ یوں ہیں:

« وَكَانَتْ قَدْ حَلَقَتْ رَأْسَهَا فِي الْحَجِّ فَكَانَ رَأْسُهَا مُحَجَّمًا .»

یعنی راوی کا بیان ہے ''حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے حج میں اپنا سر منڈوا دیا تھا پس اس میں پچھنے لگے ہوئے تھے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنا سر بیماری کی وجہ سے منڈوایا تھا تا کہ سینگھی لگنے میں آسانی رہے۔ ضرورت کی بنا پر وہ شے مباح ہو جاتی ہے جس کا عام حالات میں کرنا درست نہیں ہوتا۔ قرآن میں ہے:

﴿ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ . ﴾ (الأنعام:١١٩)

واضح ہو کہ عام حالات میں اگر عورت کو بال کاٹنے کی اجازت ہوتی تو میرے خیال میں کم از کم حج کے موقعہ پر اس کو سر مونڈنے کا حکم ضرور ہونا چاہیے تھا تا کہ: « اَللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِينَ .» کی سعادت سے محروم نہ رہتی۔ اس کے برعکس معاملہ یہاں تک محدود ہے کہ ماسوائے چند بالوں کے پورے سر کی تقصیر کی بھی اجازت نہیں تو عام حالات میں بلاوجہ بال کاٹنے کیسے جائز ہوں گے؟ باقی رہا ازواج مطہرات کا طرز عمل تو وہ اپنے بالوں کو کانوں تک کاٹتی تھیں۔ اس بارے میں وارد روایت کا قدرے تفصیل سے جائزہ لینا چاہتا ہوں۔

پہلے اصل الفاظ روایت ملاحظہ ہوں:

«كَانَ أَزْوَاجُ النَّبِيِّ ﷺ يَأْخُذْنَ مِنْ رُؤُسِهِنَّ حَتّٰى تَكُونَ كَالْوَفْرَةِ .» [2]

(صحيح مسلم كِتَابُ الطَّهَارَةِ بَابُ الْقَدْرِ الْمُسْتَحَبِّ مِنَ الْمَاءِ فِي غُسْلِ الْجَنَابَةِ ١٤٨/١)

یعنی ''ازواج مطہرات اپنے بالوں سے لیتی تھیں حتی کہ وہ وفرہ (کانوں تک) کی مانند ہوتے۔''

مصنف نے کلام ہذا حضرت ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن تابعی سے نقل کیا ہے اس میں لفظ: ''يَأْخُذْنَ'' کا ترجمہ

---

[1] (٦٢٠) انظر الرقم المسلسل (٦١٧).

[2] (٦٢١) صحيح مسلم، كتاب الحيض، باب القدر المستحب من الماء في غسل الجنابة ......(٧٢٨).

ضروری نہیں کہ کاٹنا ہی ہو۔ احتمال ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ وہ اپنے بالوں کا خاص انداز میں جوڑا بنا لیتی تھیں جو ''وفرہ'' کی شکل میں نظر آتا مسائل طہارت سے اس معنی کی مناسبت بھی ہے۔ عورتیں عموماً غسل کے موقعہ پر ایسا فعل کرتی ہیں۔ پھر مصنف کا اس کے مناسب محل و مقام پر ذکر نہ کرنا بھی ہمارے مدعا کا مؤید ہے۔ جب کہ صحیح مسلم اپنے حسن ترتیب اور سہل المأخذ ہونے میں معروف ہے۔

اور اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ "یَأْخُذْنَ" کا معنی کاٹنا ہے تو یہ ازواج مطہرات کا خاصہ ہو گا کیونکہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد ان کی حیثیت معتدات (عدت گزارنے والیوں) جیسی تھی، قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللّٰهِ وَلَا أَنْ تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا إِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيمًا. ﴾ (سورۃ الأحزاب:۵۳)

قاضی عیاض ''شارح صحیح مسلم'' نے اس بات کا اشارہ دیا ہے کہ ازواج النبی ﷺ کا یہ فعل آپ ﷺ کی وفات کے بعد تھا۔ اور ہمارے شیخ صاحب ''تفسیر اضواء البیان'' نے بایں الفاظ اس موقف کی تائید و حمایت کی ہے:

" وَهُوَ مُتَعَيِّنٌ وَلَا يُظَنُّ بِهِنَّ فِعْلُهُ فِي حَيَاتِهِ ﷺ "(أضواء البيان:۵/ ۵۹۸-۶۰۱)

اس حکم کے پیش نظر ہوسکتا ہے کہ ازواج النبی ﷺ نے سادگی اور ترک زینت کو ضروری سمجھ کر فعل ہذا کا ارتکاب کیا ہو تاکہ کلی طور پر نکاح کے دواعی سے قَطْع وَ یَأْس ہو سکے۔ ہر دو صورت میں امام نووی رحمہ اللہ کا قول: " وَ فِيهِ دَلِيلٌ عَلٰى جَوَازِ تَخْفِيفِ الشُّعُوْرِ لِلنِّسَاءِ" کہ اس میں عورتوں کے سر کے بال ہلکے کرنے کی دلیل ہے، کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ ان کا استدلال درست نہیں۔ بالخصوص جب کہ خود بھی قاضی کے موقف کو درست قرار دے رہے ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے:

" فَوُعِكْتُ فَتَمَزَّقَ شَعَرِي فَوَفَّى جُمَيْمَةً ."[1] (بَابُ تَزْوِيجِ النَّبِيِّ ﷺ عَائِشَةَ)

یعنی ''مجھے بخار آیا تو میرے سر کے بال اکھڑ گئے۔''

اس سے نجات کے بعد میرے بال جو کندھوں تک تھے بڑھنے شروع ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا حضرت

[1] (۶۲۲) صحیح البخاري، كتاب مناقب الأنصار،باب تزويج النبي ﷺ عائشة و قدومها (۳۸۹۴).

عائشہ رضی اللہ عنہا کے بال عام حالات میں ''وفرہ'' سے زیادہ تھے۔ جب کہ ''وفرہ'' کا اطلاق کانوں کی لوتک بالوں پر ہوتا ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کی وفات کے سلسلہ میں حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے:

" فَضَفَرْنَا شَعَرَ هَا ثَلَاثَةَ قُرُوْن وَأَلْقَيْنَا هَا خَلْفَهَا. " ❶ (بخاری بَابُ يُلْقٰى شَعْرُالْمَرْأَةِ خَلْفَهَا)

یعنی ''ہم نے اس کے بال تین حصوں میں گوندکر پیچھے ڈال دیئے تھے۔''

اس قصہ سے نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کی وضع وقطع، بودوباش اور طرز معاشرت کی تصویر سامنے آتی ہے کہ ان کے ہاں بالوں کو طویل وعریض رکھنے کا معمول تھا۔ ورنہ ''جُمَّہ'' اور ''وَفْرَہ'' کی صورت میں ممکن نہ تھا کہ موجود ہیئت کو اختیار کیا جاتا۔

مراسلہ نگار نے مزید کہا ہے: ''کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح عورتوں کے بال کٹوانے سے کافر عورتوں کی مشابہت ہوتی ہے جو حدیث کے مطابق ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ایک چیز ہمارے مذہب میں جائز ہے تو اس کو کرنے سے کفار کی مشابہت نہ ہوگی۔ بلکہ مشابہت تو اسے کہتے ہیں کہ کفار وہ کام کریں اور مسلمان بھی ان کی پیروی کریں۔ مثال کے طور پر مسلمان عورتوں کو ریشم کا کپڑا پہننا جائز ہے اگر کافر بھی ریشم کا کپڑا پہننا شروع کر دیں تو مسلمان عورتوں کو ریشم کا کپڑا پہننا چھوڑ نہیں دینا چاہیے یہ سوچ کر کہ اس سے کفار کی مشابہت ہوگی۔''

میرے عزیز! مشابہت کی تعریف یہ نہیں ہے جو آپ نے سمجھی ہے بلکہ کسی قوم کے مَابِهِ الْإِمْتِيَاز اوصاف کو اختیار کر لینے کا نام مشابہت ہے۔ عرف عام میں اس کو مسئلہ امتیاز اشتراک کہا جاتا ہے۔ اسی کے پیش نظر مومنہ عورت اور مومن مرد کو آپس کی مشابہت سے منع کیا گیا ہے۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے:

''اللہ لعنت کرے ان مردوں پر جو عورتوں سے مشابہت اختیار کرتے ہیں۔'' ❷

اور وہ عورتیں بھی ملعون ہیں جو مردوں سے مشابہت اختیار کرتی ہیں۔ ❸ صحیح بخاری کی دوسری روایت میں ہے:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے مشابہت اختیار کرنے والے مردوں پر لعنت کی اور ان عورتوں پر بھی جو

❶ (٦٢٣) صحيح البخاری ،كتاب الجنائز ،باب يلقى شعر المرأة خلفها(١٢٦٣).

❷ (٦٢٤) صحيح البخاری ،كتاب اللباس ،باب المتشبهين بالنساء والمتشبهات بالرجال(٥٨٨٥).

❸ (٦٢٥) صحيح البخاری ،كتاب اللباس ، باب المتشبهين بالنساء والمتشبهات بالرجال(٥٨٨٥).

مردوں سے مشابہت پیدا کرتی ہیں۔ اور فرمایا: ان کو اپنے گھروں سے نکال دو۔"[1]

دوسری طرف نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کا عملی نمونہ کتب احادیث میں ہمارے سامنے موجود ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ (الممتحنة:٦)

آپ کے بالوں کے وصف میں وارد ہے:

" إِلٰى أَنْصَافِ أُذُنَيْهِ. وَ فِيْ رِوَايَةٍ :بَيْنَ أُذُنَيْهِ وَ عَاتِقَيْهِ "[2] (متفق علیه بحواله مشكوة)

"آپ کے بال نصف کانوں تک اور ایک روایت کے مطابق کانوں اور کندھوں کے درمیان تھے۔"

"مجمع البحار" میں اس اختلاف کی وجہ جمع یوں بیان ہوئی کہ اس کو مختلف اوقات پر محمول کیا جائے گا، جب آپ بال کاٹنے میں تساہل برتتے تو کندھوں تک پہنچ جاتے اور جب کاٹتے تو کانوں تک۔ اس سے معلوم ہوا مردوں کے لئے بال رکھنے کا انداز اس حد بندی میں محدود ہے جب کہ عورتوں کو یہ ہیئت اختیار کرنا ممنوع ہے۔ جس طرح کہ مردوں کی عورتوں سے تشبہ اختیار کرنا بھی ناجائز ہے۔

دیگر بعض احادیث میں عورتوں کو علی الاطلاق سر منڈانے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ فعل ہذا مرد کا خاصہ ہے جس میں عورت کو اشتراک کا عمل دخل نہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کا فعل علت کی بناء پر تھا ورنہ وہ صریح نہی کی مرتکب نہ ہوتیں۔

مزید آنکہ دنیا بھر کے تمام عقلاء، بلغاء، ادباء، شعراء اس امر پر متفق ہیں کہ صنف نازک کا حسن و جمال، اس کے خوبصورت طویل اور گھنے بالوں میں ودیعت ہے۔ دواوین عرب بالخصوص "سبعہ معلقہ" وغیرہ کو اٹھا کر دیکھئے اس بات کی شہادت واضح طور پر نظر آئے گی۔

استعمار اور مغرب زدہ خواتین کی اندھی تقلید میں تغییر لخلق اللہ کے پہلو کو اختیار کرنا عقل و دانش کی علامت نہیں۔

نبی الرحمۃ ﷺ نے بالوں کی حفاظت کی خصوصی تلقین فرمائی ہے۔ ارشاد ہے:

---

[1] (٦٢٥) صحيح البخاري (٥٨٨٦).

[2] (٦٢٦) صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب الجعد (٥٩٠١). فيه شحمة أذنيه. صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب صفة شعر النبي صلى الله عليه وسلم (٦٠٦٩). واللفظ لمسلم. والمشكاة (٥٧٨٢).

«مَنْ كَانَ لَهٗ شَعْرٌ فَلْيُكْرِمْهُ .» ❶ (رواہ أبوداؤد بحوالہ مشکوۃ المصابیح)

یعنی ''جس کے بال ہوں اسے چاہیے کہ ان کو صاف ستھرا رکھے۔''

اسی حسن کو قائم و دائم رکھنے کے لئے سفید بالوں کو رنگنے کی تاکید فرمائی گئی:

«غَيِّرُوا الشَّيْبَ .» ❷

دوسری روایت میں ہے:

«غَيِّرُوا هٰذَا بِشَيْءٍ وَاجْتَنِبُوا السَّوَادَ .» ❸ (مسلم ۲-۱۹۹)

یعنی ''ابوقحافہ کے بالوں کو رنگ دو اور سیاہ کرنے سے بچو۔''

بِلَا رَيب !اَللّٰهُ خَالِقُ الْبَشَرِ اَلْقَائِلُ:﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ.﴾ (التین:٤) نے بنی نوع انسان کی زیبائش، زیب و زینت اور اس کے حسن کا بہت بڑا حصہ انسان کے سر کے بالوں میں رکھا ہے، جو اس کی شخصیت میں پروقار اضافہ کے علاوہ قلبی و ذہنی مسرت و شادمانی کا سبب بھی ہے۔ معلوم نہیں پھر عقل و فہم سے عاری طبقہ کو مثلہ پن میں حسن و جمال کی جھلک کیسے نظر آ گئی۔ جب کہ فطرت انسانی اس امر کی تصدیق نہیں کرتی۔

معلوم یوں ہوتا ہے آج کے پرفتن دور کی مصروف ترین عورت جس کو گھر کا کام کاج سرانجام دینے کی فرصت نہیں ہے۔ وہ ان بالوں کی صفائی و حفاظت کا ذمہ کب اٹھا سکتی ہے؟

گندے بالوں کو اٹھائے پھرنے کی بجائے اس نے اپنے لیے خیر کا پہلو اسی میں تلاش کر لیا کہ اس بنیاد ہی کو اتار پھینکے تاکہ کوئی چیز آزادئ نسواں کے نعرے میں حائل نہ ہونے پائے۔ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔

دراصل ہمارے معاشرے اور ماحول میں آج کل جو کچھ نظر آ رہا ہے اسلامی تہذیب و تمدن کا قطعًا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خالصتًا مغربی اور استعماری تہذیب و تقلید کا عکس و ثمر ہے جس کی یلغار میں بڑے بڑے

---

❶ (٦٢٧) صحيح أبي داؤد، كتاب الترجل، باب في إصلاح الشعر(٤١٦٣)، فتح البارى(١٠/٣٨١) وقال: سنده حسن.

❷ (٦٢٨) احمد(٢/٢٦١) ب (٧٥٣٦)، لأحمد شاكر و قال : اسناده صحيح الصحيحة للألبانى(٨٣٦)، و قال: قلت و اسناده حسن، شرح السنة للبغوى(٣١٧٥) و قال زهير الشاويش و الارناؤوط، اسناده حسن.

❸ (٦٢٩) صحيح مسلم ، كتاب اللباس ، باب استحباب خضاب الشيب بصفرة و حمرة ... احمد(٣/٣١٦)، عن جابر رضى الله عنه.

برج بھی الٹتے نظر آ رہے ہیں۔(نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ھٰذِہِ الْفِتَنِ)

علماء وخطباء اور اہل قلم حضرات کا فرض ہے کہ وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ ادائیگی کے لیے اپنے کو مسلح کرتے ہوئے توکل علی اللہ ملک وقوم کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ ﴿إِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ.﴾ مسئلہ مشابہت پر نہایت عمدہ اور نفیس ترین بحث کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ اہلحدیث (۳۳۸/۳) لشیخنا الجلیل مجتھد العصر حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ و أدخلہ الجنۃ الفردوس)

سوال: طالب علموں کو حاضری کے جواب میں اکثر لبیک کہتے ہوئے سنا گیا ہے۔کیا ایسا کہنا درست ہے؟

جواب: موجودگی کا احساس دلانے کے لئے طالب علم کے لئے جائز ہے کہ حاضری کے جواب میں لبیک کہے۔متعدد مواقع پر اس کا استعمال شریعت میں ثابت ہے۔مثلاً قصہ معاذ میں ہے:

« لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ . »[1] (مشکوۃ، کتاب الإیمان،رقم الحدیث:۲۵)

اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اس کے جواز پر اپنی سنن میں بایں الفاظ باب قائم کیا ہے :

"بَابُ الرَّجُلِ یُنَادِی الرَّجُلَ فَیَقُوْلُ : لَبَّیْكَ ." [2]

(اس بات کا بیان کہ آدمی دوسرے آدمی کو آواز دے وہ "لبیک" کہے۔"

سوال: بعض لوگ جن کے مکان برسر بازار ہوتے ہیں وہ اپنے مکان یا دوکان کے سامنے بازار یا سڑک کی زمین پر تجاوز کر کے اپنا قبضہ کر لیتے ہیں جس سے بازار یا گزرگاہ عام کو تنگ کر دیتے ہیں۔ایسے ہی بعض لوگ گلیوں میں بھی اپنے مکان کے سامنے تھڑا یا دوسری قسم کی کوئی رکاوٹ بنا کر گلیوں کو تنگ کر دیتے ہیں۔ان کے لیے شریعت میں کیا حکم ہے؟

جواب: شریعت اسلامیہ کے واضح نصوص اور ہدایات میں عامۃ الناس کو اذیت پہنچانے یا اس کا ذریعہ اور سبب بننے سے منع کیا گیا ہے بلکہ وہ لوگ جو اللہ کے بندوں سے ازالہ تکالیف کے لیے کوشاں رہتے ہیں ان سے بخشش اور مغفرت کا وعدہ کیا گیا ہے۔

چنانچہ صحیح روایت میں ہے:"ایک شخص نے راستہ سے خاردار ٹہنی ہٹا دی اس کے صلہ میں رب العزت

---

[1] (۶۳۰) صحیح البخاری، کتاب العلم ، باب من خص بالعلم قوماً...... (۱۲۸).

[2] (۶۳۱) ابو داؤد، کتاب الادب، باب الرجل ینادی الرجل فیقول لبیک(۵۲۳۳)

نے اس کو معاف کر دیا": « فَشَكَرَ اللّٰهُ فَغَفَرَلَهُ .»❶ (بخاری مع فتح الباری:۱۱۸/۵)

اسی طرح دوسری روایت میں لوگوں سے: "إِمَاطَةُ الْأَذٰی" (رفع تکالیف) کو ایمان کی شاخوں میں شمار کیا گیا ہے۔ (بخاری مع فتح الباری:۱۱٤)

نیز حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے میں نے عرض کی:

« يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! دُلَّنِي عَلٰى عَمَلٍ أَنْتَفِعُ بِهِ، قَالَ:« اِعْزِلِ الْأَذٰی عَنْ طَرِيقِ الْمُسْلِمِيْنَ .» ❷ (مسلم)

"اے اللہ کے رسول! مجھے نفع بخش عمل سے آگاہ کیجئے! فرمایا مسلمانوں کے راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹا دے۔"

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ عام گزرگاہوں، راستوں اور سڑکوں وغیرہ کو اذیت رساں اشیاء سے صاف ستھرا رکھنا باعث اجر اور کار ثواب ہے۔ اور جو لوگ ان کو تنگ و تاریک کرنے کی سعی میں شریک و سہیم ہیں ظاہر ہے کہ ان کا معاملہ اول الذکر گروہ کے برعکس ہو گا جو مقام خطر اور وبال جان بن سکتا ہے۔

لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ عام حالات میں متعینہ فاصلہ چھوڑ کر جگہ میں اضافہ اور تجاوزات پر ممکنہ حد تک غور و فکر کرے بصورت دیگر اس کا یہ فعل قابل مؤاخذہ ہے۔ (واللہ اعلم۔)

سوال: یہ مسئلہ شریعت کی رو سے حل کر کے مطلع کر دیں عین نوازش ہو گی۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں نے اپنے داماد سے دس گیارہ سال سے پردہ کرایا ہوا ہے یعنی اپنی نوحیں بھاوجوں سے پردہ کرایا تھا۔ بعد میں میرے بیٹوں نے میری نوحوں بھاوجوں نے ہر ایک سے پردہ نہیں کیا میرے کہنے پر عمل نہیں کیا اس داماد سے پردے کی رسم قائم ہے۔ وہ کہتے ہیں اس اکیلے سے پردہ نہیں ہونا چاہیے اور کہتے ہیں تم نے پردہ کرایا ہے اور تم ہی کہو کہ یہ پردہ نہ کرو میں کہتا ہوں کہ میں شریعت کے حکم سے یہ قانون رد نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی یہ میں کہتا ہوں داماد ہمارے گھر نہ آئے اور گاہے بگاہے آتا بھی ہے۔ آپ یہ مسئلہ حل کر کے مشکور فرمائیں؟ میں ان کو کہتا ہوں کہ اگر آپ نے میرا کہنا نہ مانا تو میں آپ سے سخت ناراض ہوں گا۔ شریعت کی رو سے فرمائیں کہ مجھے

❶(٦٣٢) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب فضل إزالة الأذى عن الطريق(٦٦٦٩). والإمارة، باب بيان الشهداء (٤٩٤٠).

❷(٦٣٣) صحيح مسلم(٦٦٧٣) بهذا اللفظ: علمني شيئا أنتفع به......الخ.

ان کی بات ماننی چاہیے یا ان کو میری بات ماننی چاہیے؟

جواب: صورت سوال میں جن اشخاص کا ذکر ہے شریعت اسلامیہ کی رو سے ان لوگوں سے پردہ ضروری ہے۔

سورۂ نور کی آیت نمبر ۳۱ میں اللہ عزوجل نے جن افراد سے عورتوں کو عدم پردہ کی اجازت دی ہے مذکورہ آدمیوں کا شمار ان میں نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان حضرات سے پردہ کرنا واجب ہے۔

یاد رہے پردہ کا مفہوم قطعاً یہ نہیں کہ قطع تعلقی کا اظہار کر کے بے رخی اختیار کی جائے بلکہ شریعت میں مطلوب و مقصود باہمی تعلقات کا استحکام ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ شرعی حدود کے اندر آپس کی میل ملاقات میں تکرار و اضافہ ہو تا کہ نتائج ثمر آور ثابت ہوں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

"بَابُ قِيَامِ الْمَرْأَةِ عَلَى الرِّجَالِ فِي الْعُرْسِ وَ خِدْمَتِهِمْ بِالنَّفْسِ ." ❶

پھر قصہ ابوالسید الساعدی سے استدلال کیا ہے کہ عورت مہمانوں کی خدمت کر سکتی ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ فِي الْحَدِيْثِ جَوَازُ خِدْمَةِ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا وَ مَنْ يَدْعُوْهُ ، وَلَا يَخْفٰى أَنَّ مَحَلَّ ذٰلِكَ عِنْدَ أَمْنِ الْفِتْنَةِ وَ مُرَاعَاةِ مَا يَجِبُ عَلَيْهَا مِنَ السَّتْرِ ." (فتح الباری ۹/۲۵۱)

یعنی "اس حدیث میں اس بات کا جواز ہے کہ عورت اپنے خاوند اور اس کے مدعو مہمانوں کی خدمت کرے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب فتنہ کا ڈر نہ ہو اور عورت باقاعدہ باپردہ خدمت سر انجام دے۔"

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ جھوٹی قسم اٹھا کر ناحق اور بے گناہ آدمیوں کو مجرم بنائے، جن کی سزا موت ہے۔ اور ۲۵ ہزار روپے لے کر سچی بات کہے اور اس کی اس حرکت کے باعث دیہات کے لوگ دھڑوں میں تقسیم ہو جائیں۔ شر پیدا کرے۔ کیا ایسا امام مسجد امامت کے قابل ہے اور اس کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے؟

جواب: مذکورہ صفات کے حامل شخص کو فوراً امامت سے معزول کر دینا چاہیے۔ دارقطنی میں حدیث:

❶ (٦٣٤) صحيح البخاري، كتاب النكاح، رقم الباب (٧٨).

«اِجۡعَلُوۡا اَئِمَّتَکُمۡ خِیَارَکُمۡ .»❶

یعنی ''امام بہتر لوگوں کو بنایا کرو۔''

اسی طرح ''مشکوۃ المصابیح'' میں حدیث ہے: رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو قبلہ کی طرف تھوکنے پر امامت سے معزول کر دیا تھا۔

مرقوم وجوہات کی بناء پر مذکورہ شخص بہت بڑا مجرم ہے۔ اس کو فی الفور مصلائے امامت سے علیحدہ کر دیا جائے اور اگر وہ زبردستی مصلائے امامت سے چمٹا رہے اور مقتدی ہٹانے پر قادر نہ ہوں تو اس صورت میں مقتدی مجرم نہیں اور نہ ان کی نماز میں کوئی خلل آئے گا۔ ان شاء اللہ۔

سوال: کیا آدمی اپنی داڑھی سفید رکھ سکتا ہے یا [illegible] نے فرمایا: داڑھی کو رنگنا بہتر ہے سفید داڑھی سے۔

جواب: سفید داڑھی رنگنا صرف مستحب ہے واجب نہیں، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَ مُحَصِّلُهُ: أَنَّ مَنۡ جَزَمَ أَنَّهُ خَضَبَ كَمَا فِيۡ ظَاهِرِ حَدِيۡثِ أُمِّ سَلَمَةَ وَ كَمَا فِيۡ حَدِيۡثِ ابۡنِ عُمَرَ الۡمَاضِي قَرِيۡبًا أَنَّهُ ﷺ خَضَبَ بِالصُّفۡرَةِ حَكَى مَا شَهِدَهُ وَذٰلِكَ فِيۡ بَعۡضِ الۡأَحۡيَانِ ،وَمَنۡ نَفٰى ذٰلِكَ كَأَنَسٍ فَهُوَ مَحۡمُوۡلٌ عَلَى الۡأَكۡثَرِ الۡأَغۡلَبِ مِنۡ حَالِهِ.'' (فتح الباری ۱۰/ ۳۵٤)

''حاصل اس کا یہ ہے کہ بعض دفعہ آپ ﷺ نے زرد رنگ کے ساتھ اپنی داڑھی کو رنگا ہے جس طرح کہ ام سلمہ ❷ اور ابن عمر رضی اللہ عنہم ❸ کی احادیث میں ہے اور اکثر و اغلب احوال میں آپ ﷺ نے اپنی داڑھی کو اصلی حالت پر چھوڑا ہے جس طرح کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔'' ❹ (یعنی رنگا نہیں)

سوال: ماہنامہ محدث...... مارچ ۲۰۰۰ء میں آپ کا ایک فتوی شائع ہوا ہے جو مشترکہ غسل خانہ اور بیت الخلا

---

❶(٦٣٥) دارقطنی(٢/ ٨٨) مع تعليق المغنی، ضعفه الألبانی انظر: الضعيفة (١٨٢٢)، ضعيف الجامع الصغير(١٥٠).

❷(٦٣٦) النسائی ، كتاب الزينة، باب الخضاب بالصفرة(٤٧٠٩)، (٤٨٣٩)، وصححه الالبانی.

❸(٦٣٧) صححه الألبانی، صحيح ابی داؤد، كتاب الترجل، باب فی خضاب الصفرة (٤٢٠٩، ٤٢١٠) .

❹(٦٣٨) صحيح ابی داؤد، كتاب الترجل، باب فی الخضاب(٤٢٠٩) للألبانی وصححه.

میں وضوء کے متعلق ہے۔ آپ کے جواب کی روشنی میں مندرجہ ذیل امور میں مزید رہنمائی درکار ہے:

① ایسے غسل خانے میں بیت الخلاء کے دخول کی دعا کہاں پڑھی جائے گی اور اسی طرح بیت الخلاء سے نکلنے کی دعا کہاں ہو گی؟

② ایسے وقت میں کہ آدمی وضو یا غسل میں مصروف ہو اور اسے حاجت پیش آ جائے تو پھر دعا کہاں پڑھے گا اور اس سے فراغت کے بعد وضو کے لئے بسم اللہ کہاں پڑھے گا؟

③ کیا دل میں بسم اللہ یا أدعیہ مأثورہ پڑھ لینے سے ''عمل'' مرتب ہو گا؟ اور کیا ان کا زبان سے پڑھنا مسنون نہیں اور اگر دل میں پڑھ لینا کافی ہے تو اس کی دلیل ضرور ارشاد فرمائیں۔

جواب: ①..... بیت الخلاء سے باہر نکل کر دعا پڑھ لے پھر داخل ہو کر وضو کرے اور بیت الخلاء سے فراغت کی دعا بھی باہر آ کر پڑھے یا پھر دل ہی دل میں پڑھ لے۔

②.....ایسی اضطراری حالت میں بھی دعا باہر آ کر پڑھے اور حاجت سے فراغت کے بعد باہر آ کر وضو کے لئے بسم اللہ پڑھ کر پھر داخل ہو جائے۔

③.....دل کا مصمم ارادہ شریعت میں قابل اعتبار سمجھا گیا ہے اور اس پر جزاء مرتب ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ .﴾ (النور:١٩)

دوسری جگہ ہے:

﴿ اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ .﴾ (الحجرات:١٢)

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (فتح الباری: ٣٢٧/١١)

زبان سے پڑھنا اس وقت مسنون ہے جب آدمی پاکیزہ مقام پر ہو۔

سوال: میں نے ایک مولوی صاحب سے کہا کہ مولوی صاحب آپ کی داڑھی کے بال سفید ہیں، ان کو آپ تبدیل کیوں نہیں کرتے اور میں نے اسے وہ حدیث بھی سنائی کہ غیر مسلموں کی مخالفت کرو، تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اگر انسان زندگی میں ایک مرتبہ ہی رنگ لے تو کافی ہے ساری زندگی رنگنے کی ضرورت نہیں۔ پھر انہوں نے یہ بھی حدیث سنائی کہ یہودی جوتیاں اتار کر نماز پڑھتے ہیں اور ہم جوتیاں پہن کر نماز ادا کریں، تو میں اس کی یہ بات سن کر خاموش ہو گیا۔ تفصیلی جواب تحریر فرمائیں؟

جواب: مولوی صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ صحیح ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں ،جس کا حاصل یہ ہے کہ: جس نے نبی ﷺ کی داڑھی رنگنے کا ذکر کیا ہے (جس طرح کہ ام سلمہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کی روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے زرد رنگ کیا تھا) اس نے وہ کچھ بیان کیا جس کا اس نے مشاہدہ کیا۔ یہ بعض حالات میں ہے اور جس نے نفی کی ہے (جیسے حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں) یہ آپ ﷺ کے اکثر اور اغلب حال پر محمول ہوگا۔ (فتح الباری ۱۰/۳۵٤)

یہود کا داڑھی نہ رنگنا وقتی ہے حتمی نہیں۔ یہود داڑھی رنگ بھی سکتے ہیں تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟ ظاہر ہے کہ شرعی احکام ابدی ہیں،افعال یہود کے تابع نہیں۔لہٰذا داڑھی رنگنا صرف مستحب ہے واجب نہیں۔

سوال: کیا مسلمان معاشرے میں دیندار اور دنیادار ہونے کے حوالے سے کوئی طبقاتی تقسیم ہے یا نہیں؟

جواب: اسلامی معاشرے میں دین دار اور دنیا دار کی طبقاتی تقسیم کا کوئی تصور نہیں۔ بلکہ جملہ امور کا انحصار آدمی کی نیت پر ہے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ہے:« إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ.» (بخاری، بدء الوحی)

سوال: کافی لوگوں سے سنا ہے کہ اگر اخبارات، کتابوں یا رسالوں میں کسی جگہ بھی اللہ کا یا نبی ﷺ کا نام آ جائے تو اسے دیوار میں دبا دینا چاہیے یا پانی میں بہا دینا چاہیے یا جلا دینا چاہیے۔

کافی لوگوں سے سنا ہے کہ جلا دینے سے اللہ کا نام اڑ جاتا ہے۔کیا ضائع کرنے کے مذکورہ طریقے درست ہیں؟

جواب: کاغذ کا پرزہ جس پر عزوجل کا اسم ہو یا نبی ﷺ کا اسم گرامی ہو،اس کے ضیاع کی مذکورہ شکلوں سے کوئی بھی اختیار کی جا سکتی ہے، تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے دفن کر دیا جائے یا پانی میں بہا دیا جائے۔ اسم مبارک کے اڑنے کا مسئلہ بے بنیاد ہے،اس کی کوئی دلیل نہیں۔

سوال: ٹیڑھی مانگ اور انگریزی حجامت (جسے بودا کہتے ہیں) کا شرعی حکم ارشاد فرمائیں؟

جواب: ٹیڑھی مانگ اور انگریزی حجامت سے لازمًا احتراز ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ غیر مسلموں کا شعار ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ .» [1]

''جو کسی قوم سے مشابہت اختیار کرے گا وہ انہی میں ہوگا۔''

---

[1] (٦٣٩) حسنه وصححه الألباني،صحيح أبي داؤد، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة (٤٠٣١) ،الارواء (١٢٦٩) ،المشكاة (٤٣٤٧).

حدیث ہذا کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ اہل حدیث ۳۴۸/۲-۳۴۴)

سوال: اگر کسی فتنہ کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہوتو فتنہ کے ختم ہونے تک قریبی عزیز سے قطع تعلق کر سکتے ہیں؟

جواب: حتی المقدور تعلق قائم رکھنے کی سعی کرنی چاہیے۔ ممکنہ حد تک قطع رحمی سے بچنا چاہیے۔

سوال: اگر سر کے بال قینچی سے چھوٹے کروا لیے جائیں، مشین نہ لگائی جائے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ہاں! سر کے بال صرف ترشوانے جائز ہیں قرآن مجید میں ہے:

﴿ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِن شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُ وْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ. ﴾ (الفتح:۲۷)

”اگر اللہ نے چاہا تو تم مسجد حرام میں بلاخوف و خطر ضرور داخل ہو گے اپنے سروں کو منڈوائے ہوئے یا ترشوائے ہوئے۔“

سوال: زیر ناف بال اگر کوئی چالیس دن کے اندر نہ اتار سکے تو اس کا کفارہ کیا ہے؟

جواب: کوتاہی پر اللہ رب العزت کی بارگاہ میں معافی کی درخواست ضرور کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ کوئی کفارہ نہیں۔

سوال: اگر زیر ناف بال اتارتے وقت کوشش کے باوجود کوئی بال رہ جائے تو کیا اس کا کوئی کفارہ ہے؟

جواب: صرف توبہ و استغفار کافی ہے۔

سوال: زیر ناف بال ناف کے انتہائی نیچے سے اتارے جائیں گے یا کچھ جگہ چھوڑ کر، نیز بال اتارنے کی حد کیا ہے۔ یعنی کہاں سے کہاں تک اتارے جائیں گے؟

جواب: بال شرمگاہ کے اوپر اور قرب و جوار سے اتارنے کی بھی اجازت ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”فَحَصَلَ مِنْ مَجْمُوْعِ هٰذَا اسْتِحْبَابُ حَلْقِ جَمِيْعِ مَا عَلَى الْقُبُلِ وَالدُّبُرِ وَ حَوْلَهُمَا.“ (فتح الباری: ۳۴۳/۱۰)

یعنی ”مجموعہ دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ قبل اور دبر (یعنی آگے اور پیچھے) دونوں (طرف) سے بال صاف کرنا مستحب ہے۔“

سوال: کسی پر غسل واجب ہو اور اس نے غسل نہ کیا ہو یا غسل نہ کر سکے تو کیا ایسے اس کی نماز ہو جائے گی۔ نیز غسل واجب ہونے کی صورت میں قرآن کی تلاوت کر سکتا ہے؟

جواب: بلا غسل نماز نہیں ہو گی۔ ہاں البتہ جنگل میں اگر پانی میسر نہ آئے تو تیمم کر کے نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ بلا غسل قرآن کی تلاوت سے اجتناب کرنا چاہیے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام درج ذیل مسائل کے بارے میں کہ آج کل تقریباً تمام اسکولوں میں یہ رواج پایا جاتا ہے کہ جب کوئی ٹیچر کسی کلاس میں جاتا ہے تو سب بچے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب تک استاد کرسی پر نہ بیٹھے یا بچوں کو نیچے بیٹھنے کا حکم نہ دے پوری کلاس کھڑی رہتی ہے۔ اسی طرح جب کوئی عالم دین کسی کے پاس ملاقات کے لئے جاتا ہے تو وہ لوگ بھی اپنی جگہ پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب تک وہ نہ بیٹھے کھڑے رہتے ہیں۔ اور اسی طرح اسکولوں میں جب ہمارا قومی ترانہ گایا جاتا ہے تو اساتذہ سمیت تمام طلباء سجدہ کی جگہ نظریں جمائے کھڑے رہتے ہیں۔ تو کیا یہ قیام کتاب و سنت کی روشنی میں جائز ہے یا حرام؟

جواب: مسئلہ ہذا میں اہل علم کا سخت اختلاف ہے۔ ایک گروہ اساتذہ کرام اور بڑے بزرگوں وغیرہ کے لئے بطور احترام کھڑے ہونے کا قائل ہے۔ ان میں سے امام نووی اور غزالی رحمہما اللہ وغیرہ ہیں ان کا استدلال فرمان نبوی ﷺ: « قُومُوا إِلَى سَيِّدِكُمْ .» [1] سے ہے۔ ابن بطال رحمہ اللہ شارح بخاری نے کہا ہے:

" فِيْ هٰذَا الْحَدِيْثِ أَمْرُ الْإِمَامِ الْأَعْظَمِ بِإِكْرَامِ الْكَبِيْرِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَ مَشْرُوْعِيَّةُ إِكْرَامِ أَهْلِ الْفَضْلِ فِيْ مَجْلِسِ الْإِمَامِ الْأَعْظَمِ وَالْقِيَامُ فِيْهِ لِغَيْرِهِ مِنْ أَصْحَابِهِ وَ إِلْزَامُ النَّاسِ كَافَّةً بِالْقِيَامِ إِلَى الْكَبِيْرِ مِنْهُمْ ." (فتح الباری ۱۱/۴۹)

اور جو لوگ منع کے قائل ہیں ان کا استدلال ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے کہ آپ ﷺ عصا پر ٹیک لگائے نکلے۔ ہم آپ ﷺ کے لئے کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: عجمیوں کی طرح ایک دوسرے کے لئے کھڑے مت ہوں۔ امام طبری رحمہ اللہ نے اس حدیث کا جواب دیا ہے کہ اس کی سند میں اضطراب ہے اور اس میں بعض راوی غیر معروف ہیں۔ اور اسی طرح ان کا استدلال آپ کے اس ارشاد سے ہے:

« مَنْ أَرَادَ أَنْ يَتَمَثَّلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ .» [2]

---

[1] (٦٤٠) صحيح البخاری، كتاب الجهاد، باب اذا نزل العدو بحكم رجل (٣٠٤٣)، صحيح مسلم، كتاب الجهاد، باب جواز قتال من نقض العهد (٤٥٩٦).

[2] (٦٤١) صححه الألبانی، صحيح ابی داؤد، كتاب الأدب، باب الرجل يقوم للرجل يعظم بذلك (٥٢٢٩)، الترمذی (٢٩١٥)، الصحيحة (٣٥٧) المشكاة (٤٦٩٩)، عن معاوية رضی الله عنه.

امام طبری رحمہ اللہ نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کھڑا ہونے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اکرام کے لئے اس میں نہی کا ذکر نہیں۔ اور ابن قتیبہ نے جواب یوں دیا کہ اس سے مراد سر پر کھڑے رہنا ہے۔ جس طرح کہ عجمی شاہان کی عادت تھی اور ابن بطال نے جواز کے لئے نسائی کی روایت سے استدلال کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آتے دیکھ کر خوش آمدید کہتے پھر کھڑے ہو کر اس کا بوسہ لیتے پھر ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ بٹھا لیتے۔ ❶ یہ روایت ترمذی اور ابوداؤد وغیرہ میں بھی ہے اور قصہ توبۂ کعب بن مالک میں ہے:

"فَقَامَ إِلَيَّ طَلْحَةُ بْنُ عُبَيْدِ اللّٰهِ يُهَرْوِلُ ." ❷

یعنی "طلحہ بن عبیداللہ میری طرف دوڑتے ہوئے آئے۔"

اس طرح کے بہت سارے دلائل جانبین سے دیئے جاتے ہیں۔ ابن الحاج رحمہ اللہ نے "المدخل" میں امام نووی رحمہ اللہ کے جملہ مستندات کے جوابات دینے کی سعی کی ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "فتح الباری" میں سوال و جواب کی طویل بحث کی ہے جو ایک محقق کے لئے بے حد مفید ہے۔

اختتام بحث پر امام غزالی رحمہ اللہ کے نظریہ کو پسند فرمایا ہے:

"اَلْقِيَامُ عَلٰى سَبِيْلِ الْإِعْظَامِ مَكْرُوْهٌ وَ عَلٰى سَبِيْلِ الْإِكْرَامِ لَا يُكْرَهُ" (۵۴/۱۱)

"کسی کی بڑائی کے لئے کھڑا ہونا مکروہ اور عزت و احترام کی خاطر کھڑا ہونا جائز ہے۔"

وَ هٰذَا التَّفْصِيْلُ حَسَنٌ ۔ یہ اچھی وضاحت ہے۔

فی الواقع دونوں طرف روایات موجود ہیں۔ جواز کے اعتقاد کے باوجود احتیاط اس میں ہے کہ بطور اکرام کھڑا نہ ہو اس لیے کہ عام حالات میں صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے لئے کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ بسا اوقات آپ نے منع بھی فرمایا۔ سوال میں مرقوم پہلی دونوں صورتیں تو قطع نظر احترام کے محض ایک عادت مُسْتَمِرَّہ معلوم ہوتی ہے کتاب و سنت یا سلف صالحین کے عمل سے اس کی مثال ملنی مشکل ہے لہٰذا اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ اور قومی ترانہ کے احترام میں کھڑا ہونا تو قطعاً بدعت ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

---

❶ (٦٤٢) صححه الألباني ،صحيح أبي داؤد ،باب في القيام (٥٢١٧) والترمذى ،أبواب المناقب ،باب فضل فاطمة (٤١٤٦). (فائدہ) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عائشہ کو بوسہ دیا......الخ [صححه الألباني، صحيح أبي داؤد ،باب قبلة الخد (٥٢٢٢)].

❷ (٦٤٣) صحيح البخاري ، كتاب المغازي، باب حديث كعب (٤٤١٨).

« مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » [1]

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔'' [2]

سوال: داڑھی رکھنے کے متعلق اللہ اور اس کے رسول ﷺ کیا فرماتے ہیں؟ کیا یہ فرض ہے کہ سنت اور اور اگر سنت ہے تو مؤکدہ یا غیر مؤکدہ؟

جواب: داڑھی رکھنا واجب ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی سنت قدیمہ ہے۔ صحیح احادیث میں اس کی تعبیر بصیغۂ امر کی گئی ہے جو وجوب کی دلیل ہے۔ چنانچہ فرمایا: « وَاعْفُوا اللُّحى. » یعنی ''داڑھیاں بڑھاؤ'' اور بعض الفاظ میں: « أَوْفُوا »، « أَرْخُوا »، « أَرْجُوا »، « وَفِّرُوا » ہے۔ [3]

---

[1] (٦٤٤) صحيح البخاري، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود (٢٦٩٧).

[2] (٦٤٥) نبی ﷺ سے بڑھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک کوئی شخص مکرم و معظم و محبوب نہیں تھا لیکن وہ آپ کے لئے کھڑے نہیں ہوتے تھے، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ آپ ﷺ اسے ناپسند کرتے ہیں، جب یہ واضح وعید موجود ہے کہ: ((مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَتَمَثَّلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)). (أو كما قال) ''جسے یہ چیز خوش کرتی ہے کہ لوگ اس کے لئے مورتی کی طرح کھڑے ہو جائیں وہ اپنا ٹھکانا جہنم کو بنالے''۔ تو پھر ہم خواہ مخواہ کسی کی آمد پر کھڑے ہو کر اُسے خوشی دِلا کر اس کے لئے جہنم میں جانے کا سامان کیوں مہیا کر رہے ہیں؟ رہی بات رسول اللہ ﷺ کا ''فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لئے کھڑے ہو کر انہیں بوسہ دینا اور پھر ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ پر بٹھانا'' تو اس میں صرف کھڑا ہونا نہیں؛ بلکہ اس میں اپنی جگہ سے حرکت کرنا بھی شامل ہے، اور اگر یہ صورت اپنالی جائے کہ آنے والے کے لئے آدمی اپنی جگہ سے حرکت کر کے اس کی طرف کچھ قدم بڑھالے اور استقبال والی شکل بن جائے تو جائز ہے، یہی صورت :((قُومُوا إِلَى سَيِّدِكُمْ)) میں ہے، یہ الفاظ رسول اللہ ﷺ نے انصار کے لئے اس موقع پر فرمائے تھے جب سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو کہ غزوہ احزاب میں زخمی ہو گئے تھے۔ بنو قریظہ کی خواہش پر رسول اللہ ﷺ کے حکم سے بنو قریظہ کا فیصلہ کرنے کے لئے سواری پر بیٹھ کر آئے تھے تو آپ ﷺ نے انصار سے فرمایا: ((قُومُوا إِلَى سَيِّدِكُمْ)) ''اپنے سردار کی طرف اٹھو'' اور ایک روایت میں لفظ ہیں: ((فَأَنْزِلُوهُ.)) ''اور انہیں (سواری سے) اتارو''۔ آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا: ((قُومُوا لِسَيِّدِكُمْ.)) ''اپنے سردار کے لئے اٹھو'' بلکہ فرمایا: ((قُومُوا إِلَى سَيِّدِكُمْ.)) ''اپنے سردار کی طرف اٹھو'' اور ظاہر ہے یہ اٹھنا سواری سے اتارنے کے لئے تھا اور اس میں اپنی جگہ سے حرکت کرنا پڑتی ہے جو کہ استقبال کی شکل میں آتا ہے، اور استقبال جائز ہے: دو چار قدم چلے، دروازہ تک چلے، اڈہ تک جائے یا ائرپورٹ تک؛ لیکن جو رائج شکل ہے وہ اپنی جگہ کھڑے ہونے کی ہے جو کہ قطعاً حرام اور منع ہے، اور جس طرح رکوع و سجدہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے اسی طرح ((قُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ.)) قیام بھی اللہ کے لئے خاص ہونا چاہیے۔ هذا، والله أعلم
(خالد بن بشیر مرجالوی عفا اللہ عنہما).

[3] (٦٤٦) انظر الرقم المسلسل (٥٩٩ تا ٦٠٣).

امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

”وَمَعْنَاهَا كُلِّهَا: تَرْكُهَا عَلٰى حَالِهَا، هٰذَا هُوَ الظَّاهِرُ مِنَ الْحَدِيْثِ الَّذِىْ تَقْتَضِيْهِ أَلْفَاظُهُ.“ (۱۵۱/۳)

یعنی ”ان تمام الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ داڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دو۔ حدیث کے ظاہری الفاظ کا تقاضا یہی ہے۔“

دیگر بعض احادیث میں دس امور کو فطرت قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک: «إِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ» (داڑھی کا بڑھانا) بھی ہے۔ [1] (مسلم ۱٤٧/۳)

مزید وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو: (”الاعتصام“: ۱۱ نومبر ۱۹۹۴ء)

سوال: پردہ کے احکام کیا ہیں۔ کن کن سے پردہ ضروری ہے۔ کیا بہنوئی سے پردہ ضروری ہے یا کہ نہیں؟

جواب: پردہ کا حکم سورۃ الاحزاب (آیت: ۳۵) میں بایں الفاظ مرقوم ہے:

﴿ وَإِذَا سَأَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ﴾

”اور جب نبی ﷺ کی بیویوں سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے باہر سے مانگو۔ یہ تمہارے اور ان کے دلوں کے لئے بہت پاکیزگی کی بات ہے۔“

یہی آیت، آیت حجاب کے نام سے موسوم ہے اور یہ ”موافقات عمر رضی اللہ عنہ“ میں شمار ہوتی ہے۔ اس امر کی تفصیل حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری میں منقول ہے۔ اس حکم کے نزول کے بعد ازواج کے گھروں کے سامنے پردے لٹکا دیے گئے، [2] نبی ﷺ کا گھر چونکہ مسلمانوں کے لئے نمونہ تھا اس بنا پر مسلمانوں نے بھی اپنے گھروں پر پردے لٹکا دیے۔ اسی آیت کے آخری حصہ میں پردہ کی حکمت منکشف کی گئی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے دلوں کی پاکیزگی کا بہترین ذریعہ ہے۔ کسب حرام و بدکاری و بے حیائی وغیرہ کو روکتا ہے۔ شرم و حیا اور خودداری اور عفت و عصمت کی بقا کا ضامن ہے۔ اس حصار کی حفاظت کی خاطر مردوزن سے سورۂ نور میں نگاہ نیچی رکھنے کا تقاضا کیا گیا ہے عورت فطرۃً عقل و فہم میں کمزور ہے بلکہ کمزوریوں

---

[1] (٦٤٧) ايضاً (٦٤٧).

[2] (٦٤٨) صحيح البخارى ، كتاب التفسير ، باب قوله ﴿ لا تدخلوا بيوت النبى الا ان يؤذن لكم الى طعام ﴾ (٤٧٩١ إلى ٤٧٩٤) والادب، باب آية الحجاب (٦٢٣٨)

کی تصویر ہے۔ اپنی عفت و حفاظت کے لئے ایک مضبوط آہنی دیوار پردہ کا حکم دے دیا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی عصمت کا بہترین بچاؤ کر سکے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ یَـٰٓأَیُّهَا النَّبِیُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَ بَنَاتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِینَ یُدْنِینَ عَلَیْهِنَّ مِن جَلَابِیبِهِنَّ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰٓ أَن یُعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِیمًا ﴾ (الأحزاب:٥٩)

''اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ (باہر نکلا کریں تو) اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے کہ پہچان کی جائیں تو کوئی ان کو ایذا نہ دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ عورتیں اپنی چادریں اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر ان کا ایک حصہ یا ان کا پلو اپنے اوپر سے لٹکا لیا کریں جسے عرف عام میں گھونگھٹ ڈالنا کہتے ہیں۔ اور عبیدہ سلمانی وغیرہ سے جب اس آیت کی تفسیر دریافت کی گئی تو انہوں نے باقاعدہ عملی نمونہ کا اظہار کر کے دکھایا۔ اپنی چادر اٹھائی اور اسے اس طرح اوڑھا کہ پورا سر اور پیشانی اور پورا منہ ڈھانک کر صرف ایک آنکھ کھلی رکھی۔

حدیث میں ہے:

« اَلْمُحْرِمَةُ لَا تَنْتَقِبُ وَلَا تَلْبَسُ الْقُفَّازَیْنِ .» [1] (أبوداود، موطا)

یعنی ''محرمہ عورت احرام کی حالت میں نہ چہرے پر نقاب ڈالے اور نہ ہاتھوں میں دستانے پہنے۔''

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نقاب اوڑھنا اور دستانے پہننا غیر محرم عورتوں میں معروف تھا۔''

''وَ ذَالِكَ یَقْتَضِی سَتْرَ وُجُوهِهِنَّ وَ أَیْدِیهِنَّ.'' (حِجَابُ الْمَرْأَةِ الْمُسْلِمَةِ وَ لِبَاسُهَا فِی الصَّلَاةِ، ص١٧)

یعنی ''اس کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے چہروں اور ہاتھوں کو پردے میں رکھتی تھیں۔''

علامہ ابوبکر جصاص کا کہنا ہے کہ آیت ہذا اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جوان عورت کو غیروں سے اپنے چہرہ چھپانے کا حکم ہے اور اسے گھر سے نکلتے وقت ستر اور عفت مآبی کا اظہار کرنا چاہیے تاکہ مشتبہ سیرت

---

[1] (٦٤٩) صحیح البخاری، کتاب جزاء الصید، باب ما ینهی من الطیب للمحرم والمحرمة (١٨٣٨)، عن ابن عمر رضی اللہ عنهما.

و کردار کے لوگ اسے دیکھ کر کسی طمع میں مبتلا نہ ہوں۔ (أحکام القرآن:۳/۴۵۸)

پھر شریعت میں غیر محرم مردوں اور محرم رشتہ داروں کے درمیان فرق قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَاءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَاءِ اَخَوَاتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا﴾ (الأحزاب:۵۵)

''عورتوں پر اپنے باپوں سے (پردہ نہ کرنے میں) کچھ گناہ نہیں اور نہ اپنے بیٹوں سے اور نہ اپنے بھائیوں سے اور نہ اپنے بھتیجوں سے اور نہ اپنے بھانجوں سے اور نہ اپنی (قسم کی) عورتوں سے اور نہ لونڈیوں سے اور (اے عورتو)! اللہ سے ڈرتی رہو بے شک اللہ ہر شے سے واقف ہے۔''

علامہ آلوسی زیر آیت ہذا فرماتے ہیں: بھائیوں بھانجوں اور بھتیجوں کے حکم میں وہ سب رشتہ دار آ جاتے ہیں جو ایک عورت کے لئے حرام ہوں خواہ وہ نسبی رشتہ دار ہوں یا رضاعی۔ اس فہرست میں چچا اور ماموں کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ وہ عورت کے لئے بمنزلہ والدین ہیں یا پھر ان کے ذکر کو اس لئے ساقط کر دیا گیا کہ بھانجوں اور بھتیجوں کا ذکر آ جانے کے بعد ان کے ذکر کی حاجت نہیں ہے۔ کیونکہ بھانجے اور بھتیجے سے پردہ نہ ہونے کی جو وجہ ہے وہی چچا اور ماموں سے پردہ نہ ہونے کی وجہ ہے۔ (روح المعانی ،بواسطة تفهيم القرآن)

نیز فرمایا:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ ----- لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ .﴾ (النور:۳۰)

''مومن مردوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں۔ یہ ان کے لئے بڑی پاکیزگی کی بات ہے اور جو کام یہ لوگ کرتے ہیں ان سے خبردار ہیں۔ اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں اور اپنی آرائش (یعنی زیور کے مقامات) کو ظاہر نہ ہونے دیا کریں۔ مگر جو اس میں سے کھلا رہتا ہو، اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں اور اپنے خاوند اور باپ اور خسر اور بیٹوں اور خاوند کے بیٹوں اور بھائیوں اور بھتیجوں اور بھانجوں اور اپنی (قسم کی) عورتوں اور لونڈی غلاموں کے سوا نیز ان خدام کے جو عورتوں کی خواہش نہ رکھیں یا ایسے لڑکوں سے جو

عورتوں کے پردے کی چیزوں سے واقف نہ ہوں (غرض ان لوگوں کے سوا) کسی پر اپنی زینت (اور سنگار کے مقامات) کو ظاہر نہ ہونے دیں، اور اپنے پاؤں (ایسے طور سے زمین پر) نہ ماریں (کہ جھنکار کی آواز کانوں میں پہنچے اور) ان کا پوشیدہ زیور معلوم ہو جائے اور مومنو! سب اللہ کے آگے توبہ کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔" (سورۃ النور:۳۱)

الغرض جن افراد کو شرع متین میں مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے ان کے ماسوا باقی سب حضرات سے عورت کو پردہ کرنا شامل ہے ان میں بہنوئی بھی شامل ہے۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰی أَعْلَمُ وَ عِلْمُهٗ أَتَمُّ.

سوال: عورت کسی غیر مرد کو سلام کہہ سکتی ہے یا نہیں؟

عورت کسی گھر میں داخل ہو تو وہاں مرد بھی ہوں اور عورتیں بھی ہوں یا کسی دکان پر کوئی چیز خریدنے کے لئے جائے تو وہاں سلام کہنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: عورت مرد کو سلام کہہ سکتی ہے بشرطیکہ فتنہ کا ڈر نہ ہو۔ صحیح مسلم میں ام ہانی کی حدیث میں ہے:

« أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَغْتَسِلُ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ. » [1]

"میں نبی ﷺ کے پاس آئی، آپ غسل فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ کو سلام کہا۔"

یاد رہے ام ہانی آپ ﷺ کی چچا زاد بہن تھی اور صحیح بخاری میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« يَا عَائِشَةُ ! هٰذَا جِبْرِيْلُ يَقْرَأُ عَلَيْكِ السَّلَامَ. » قَالَتْ: قُلْتُ: وَعَلَيْهِ السَّلَامُ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهٗ. » [2]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

"بَابُ تَسْلِيْمِ الرِّجَالِ عَلَى النِّسَاءِ وَالنِّسَاءِ عَلَى الرِّجَالِ." [3]

یعنی "مرد عورتوں کو سلام کہہ سکتے ہیں اور عورتیں مردوں کو۔"

پھر عورتوں کے جواز کے لئے سلام جبریل اور جواب عائشہ رضی اللہ عنہا سے استدلال کیا ہے۔ شارح بخاری ابن بطال نے المھلب سے نقل کیا ہے:

---

[1] (٦٥٠) صحيح مسلم ، كتاب صلاة المسافرين ، باب استحباب صلاة الضحى(١٦٦٩)، صحيح البخارى، دون ذكر السلام (١١٠٣).

[2] (٦٥١) صحيح البخارى، كتاب الاستئذان ، ح(٦٢٤٩).

[3] (٦٥٢) صحيح البخارى ، كتاب الاستئذان رقم الباب(١٦).

" سَلَامُ الرِّجَالِ عَلَى النِّسَاءِ وَالنِّسَاءِ عَلَى الرِّجَالِ جَائِزٌ إِذَا أُمِنَتِ الْفِتْنَةُ ."

(فتح الباری ۱۱/۳٤)

''مردوں اور عورتوں کا ایک دوسرے کو سلام کہنا جائز ہے۔ بشرطیکہ فتنہ کا ڈر نہ ہو۔''

عورت کا مرد کو سلام کہنے کا جواز عام ہے۔ چاہے اس کا تعلق کسی مجمع سے ہو یا مخصوص مقام سے بشرطیکہ فتنہ کا ڈر نہ ہو۔

سوال: کیا عورت غیر آدمی کو اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہہ سکتی ہے جس طرح عورت دوکان میں یا کسی کے گھر میں داخل ہو وہاں آدمی بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ آنے والی عورت کو کیا اجازت ہے کہ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ زبان سے ادا کرے؟ چند آدمیوں کا خیال ہے۔ غیر محرم عورت غیر آدمی کو اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ نہیں کہہ سکتی۔

جواب: عورت غیر محرم کو سلام کہہ سکتی ہے بشرطیکہ فتنہ کا ڈر نہ ہو۔

صحیح مسلم میں ام ہانی رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے: میں نبی ﷺ کے پاس آئی تو آپ ﷺ غسل فرما رہے تھے۔ میں نے آپ ﷺ کو سلام کہا۔ [1] (بحوالہ فتح الباری ۱۱/۳٤)

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

" بَابُ تَسْلِيمِ الرِّجَالِ عَلَى النِّسَآءِ وَالنِّسَاءِ عَلَى الرِّجَالِ."

یعنی ''مرد عورتوں کو سلام کہہ سکتے ہیں اور عورتیں مردوں کو سلام کہہ سکتی ہیں۔''

سوال: صبح کی نماز کے بعد سورج نکلنے سے پہلے سونے کے بارے میں ہماری نظر میں جو احادیث گذری ہیں ان کی سندیں ٹھیک نہیں ہیں یا پھر اقوال ہیں۔ آپ صحیح حدیث سے وضاحت فرمائیں کہ واقعی سونا منع ہے اور پھر اپنا خیال یعنی اپنا عمل بھی ارشاد فرمائیں؟

جواب: صبح کی نماز کے بعد سونے کی ممانعت کے بارے میں کوئی روایت صحیح نہیں۔ لہٰذا سونا جائز ہے آج کل میرا معمول صبح کی نماز کے بعد پارک کی سیر و سیاحت یا مطالعہ کرنا ہے۔

سوال: خط لکھنے کا شرعی طریق کیا ہے؟

جواب: سب سے پہلے ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ لکھے پھر محرر اپنے نام سے چٹھی کا آغاز کرے پھر

---

[1] (۶۵۳) صحیح مسلم ، کتاب صلاۃ المسافرین ، باب استحباب صلاۃ الضحی (۱۶۶۹)، صحیح البخاری، دون ذکر السلام (۱۱۰۳).

مکتوب الیہ کے نام کی صراحت کرے۔ بعد ازاں مقصد کا اظہار کرے۔ اس امر کی واضح مثالیں رسول اللہ ﷺ کے رؤسا و ملوک کو بھیجے گئے خطوط و رسائل ہیں جو کتب احادیث کے علاوہ سیر و تاریخ میں محفوظ ہیں۔

سوال: داڑھی کو رنگنے والی کالی مہندی وغیرہ لگانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: خالص سیاہ رنگ سے پرہیز ضروری ہے۔ ابو قحافہ کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

« جَنِّبُوْهُ السَّوَادَ .» ❶ (منتقی الأخبار بَابُ تَغْيِيرِ الشَّيْبِ بِالْحِنَاءِ وَالْكَتَمِ وَ نَحْوِهِمَا وَ كَرَاهِيَةِ السَّوَادِ .)

سوال: میری رہائش گاہ کے نزدیک ایک پرانا قبرستان واقع تھا جس میں آخری قبر جو بنائی گئی تھی وہ ۱۲ سال پرانی ہے عرصہ ۶ سال قبل مالک زمین نے قبریں مسمار کر کے رہائش اختیار کر لی ہے۔ آپ مہربانی فرما کر تفصیل سے جواب ارسال فرمائیں۔

① ...... قبروں کو مسمار کر کے رہائش اختیار کی جاسکتی ہے؟

② ...... دوران رہائش اگر عبادت کی جائے تو درست ہو گی قبروں والی جگہ پر مویشی رکھے جا سکتے ہیں۔ قبروں کو مسمار کرنے سے پہلے کوڑا کرکٹ قبروں پر پڑا رہتا تھا۔ قبریں مسمار کرنے والے پر پرچہ بھی ہو گیا ہے۔ اس شخص نے زمین ایک دوسرے شخص کے پاس بیچ دی ہے آیا خریدنے والے کے لئے رہائش اختیار کرنا گناہ تو نہیں؟

جواب: مسلمانوں کی قبریں اکھاڑ کر رہائش اختیار کرنا درست نہیں ہے۔ البتہ قبریں اگر بے نشان ہو چکی ہوں تو تعمیر میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا اور جہاں تک کفار کی قبروں کا تعلق ہے سو وہاں ہر دو صورت میں بلا تردد رہائشی مکان تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو: (صحیح بخاری ، بَابٌ هَلْ يُنْبَشُ قُبُوْرُ مُشْرِكِيْ الْجَاهِلِيَّةِ وَ يُتَّخَذُ مَكَانُهَا مَسَاجِدُ.)

اور مذکور مقام چونکہ موجودہ صورت میں قبرستان نہیں رہا۔ اس لئے اس میں عبادت کرنا درست فعل ہے۔

حدیث میں ہے:

« اَلْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدٌ إِلَّا الْمَقْبُرَةَ وَالْحَمَّامَ .» ❷ (رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ)

---

❶(٦٥٤) صحيح مسلم ، كتاب اللباس ، باب استحباب خضاب الشيب بصفرة و حمرة(٥٥٠٩) ، احمد (٣١٦/٣)، عن جابر رضى الله عنه.

❷(٦٥٥) صححه الحاكم والذهبى وابن حبان وابن خزيمة والألبانى وإرشاد الحق الأثرى.صحيح أبى داؤد، كتاب الصلاة، باب فى المواضع التى لا تجوز فيها الصلاة (٤٩٢)،أحمد(٨٣/٣، ٩٣)،الترمذى (٣١٧)،مسند السراج بتحقيق الأثرى(٥٠١، ٥٠٢)،الحاكم (٢٥١/١) ،الإرواء(٢٨٧) (٣٢٠/١).

یعنی ''تمام زمین مسجد ہے مگر قبرستان اور حمام۔''

اور جس شخص نے اس زمین کو خرید کیا ہے وہ بری الذمہ، اصلاً مجرم تو پہلا انسان ہے جس نے مسلمانوں کی قبروں کی بے حرمتی کی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

« لَا تُصَلُّوا إِلَى الْقُبُورِ وَلَا تَجْلِسُوا عَلَيْهَا .» ❶ (رَوَاهُ الْجَمَاعَةُ إِلَّا الْبُخَارِيَّ وَ ابْنَ مَاجه.)

یعنی ''نہ قبروں کی طرف نماز پڑھو اور نہ ان کے اوپر بیٹھو۔''

سوال: ایک شخص جو کہ شادی شدہ ہے جب اس کی بیوی ماہواری سے ہوتی ہے یا ڈلیوری سے فراغت کے بعد سوا مہینہ یا چالیس دن تک وہ اپنی بیوی سے صحبت نہیں کرسکتا۔ یا بیمار ہوتی ہے یا شہر سے باہر گئی ہوئی ہوتی ہے۔

ان دنوں میں آدمی کو اگر بہت زیادہ خواہش ہو تو وہ اس سلسلہ میں کیا کرے؟ صرف شرعی لحاظ سے مسئلہ کا اگر کوئی حل ہے تو بتا دیں۔ سائل دو بیویوں کا خرچہ برداشت نہیں کرسکتا۔

جواب: ایسے شخص کو چاہئے کہ کثرت سے روزے رکھے۔ حدیث میں ہے:

« يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ .» ❷ (متفق علیه)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے نوجوانوں کے گروہ! جو کوئی تم میں سے طاقت رکھتا ہو اسے چاہیے کہ نکاح کر لے کیونکہ نکاح کرنا نظر نیچی رکھنے کا اور ستر کی حفاظت (بدکاری سے بچنے) کا بہترین ذریعہ ہے۔ اور جو طاقت نہ رکھے پس اس کو روزے رکھنے چاہئیں۔ کیوں کہ روزہ رکھنا (گویا) اس کے لئے خصی کرنا ہے۔''

یعنی جس طرح خصی کرنے سے شہوت جاتی رہتی ہے اسی طرح روزہ رکھنے سے بھی کمی آ جاتی ہے۔

سوال: شروع کے زمانہ اسلام میں لونڈی رکھنے کا رواج تھا لیکن آج کے معاشرتی ماحول میں کیا لونڈی رکھی جاسکتی ہے؟ اس کا طریقہ کار کیا ہوگا؟

---

❶(٦٥٦) صحیح مسلم، کتاب الجنائز ، باب النهی عن الجلوس(٢٢٥٠)، ابن خزیمة (٧٩٣، ابو داؤد (٣٢٢٩).

❷(٦٥٧) صحیح البخاری ، کتاب النکاح ، باب من لم یستطع الباءة فلیصم (٥٠٦٦).

جواب: شرعی اصطلاح میں لونڈیوں کا اطلاق غالباً کفار کی ان عورتوں پر ہوتا ہے جو دوران لڑائی مسلمانوں کے ہاتھ لگتی ہیں۔آج کے دور میں منظّم جہاد کے فقدان کی بناء پر یہ شیٔ مفقود ہے۔ [1]

سوال: رخساروں اور داڑھی پر جو بال اگیں وہ داڑھی ہے لیکن ٹھوڑی سے اوپر نچلے ہونٹ کے بالکل نیچے عنفقہ چھوٹی داڑھی کیا یہ بھی داڑھی میں شامل ہے؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اسے کتر ڈالتے تھے۔ (بخاری کِتَابُ اللِّبَاسِ ، قصُّ الشَّارِبُ)

جواب: ''عنفقہ'' یعنی بچہ داڑھی بھی داڑھی میں شامل ہے جو اسے خارج سمجھتے ہیں،ان کی غلطی ہے کیونکہ جو بال نیچے کے جباڑے پر ہیں ان کے داڑھی میں داخل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ (فتاویٰ اہل حدیث:۱/۳۲۷)

ممکن ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بچہ داڑھی کو لینے کا فعل کسی عذر یا اجتہاد کی بناء پر ہو کہ یہ داڑھی کی حد بندی میں داخل نہیں جب کہ فی الواقع یہ داخل ہے۔ یا ''یَأْخُذُ هٰذَیْنِ'' سے مراد باچھیوں کے دونوں جانب کے چند بال ہوں جن کے منہ میں گرنے کا خدشہ لاحق رہتا ہے، نہ کہ بچہ داڑھی۔

سوال: جبڑے کی ہڈی سے پرے جو بال اگیں ان کا کیا حکم ہے۔آنکھوں کی نچلی ہڈی کے بال مونڈنا جائز ہے؟

جواب: یہ بھی داڑھی میں شامل ہیں ان کو بھی لینا ناجائز ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماص سے منع فرمایا ہے۔ [2]

(بخاری بابُ الْمُتَنَمِّصَات)

سوال: العانہ (موئے زہار) آلۂ تناسل اور اردگرد کے بالوں کو کہتے ہیں لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ ناف کے بالکل قریب سے بال مونڈنا شروع کریں خصیوں تک۔ '' تَحْتَ السُّرَّہ ''بھی کسی حدیث میں آیا ہے یا تکونی حصے سے خصیوں تک بال صاف کئے جائیں؟

جواب: ''تَحْتُ السُّرَّۃ'' سے بال مونڈنے کا ذکر کسی حدیث میں نہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اَلْعَانَۃُ'' سے مراد آلۂ تناسل کے اوپر اور اردگرد ہوتے ہیں۔ نیز امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دبر کے بال فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کسی ایک صحابی سے بھی مونڈنے ثابت نہیں۔ (نیل الأوطار: ۱/ ۱۲٤)

---

[1] ویسے بھی بین الاقوامی قوانین اور اقوام متحدہ کے چارٹرڈ کی روشنی میں تمام اقوام عالم میں قیدیوں کے تبادلہ پر معاہدہ ہو چکا ہے۔اس وجہ سے بھی لونڈیوں کا وجود معدوم ہے جبکہ اسلام انسانیت کے احترام و اکرام کا علمبردار ہے اس لئے میرے خیال میں اب منظم جہاد کی صورت میں بھی اسی قانون کو مدنظر رکھنا چاہیے اور یہ قانون اسلام کے مزاج کے عین مطابق ہے۔تاہم خلیفہ وقت منظم جہاد کی صورت میں دوبارہ اس کا احیاء کرسکتا ہے۔ (عبدالشکور مدنی)

[2] (٦٥٨) صحیح البخاري، کتاب اللباس، باب المتنمِّصَاتِ (٥٩٣٩).

صرف تکوینی حصہ اور قرب و جوار پر بالوں کی صفائی پر اکتفا کرنا چاہیے۔ اگرچہ بعض اہل علم دبر وغیرہ کے بالوں کی صفائی کے بھی قائل ہیں۔

سوال: ''چہرۂ عورت کا'' پردے کے بارے میں تفصیلاً قرآن و حدیث سے جواب چاہیے اور عرض یہ ہے کہ صاف صاف چہرے کے پردے کے لئے کیوں نہیں کہا گیا؟

جواب: عورت کا چہرہ پردے میں شامل ہے۔ واقعۂ افک جس کی تفصیل صحیح وغیرہ میں موجود ہے اس میں صفوان کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے:

« وَ كَانَ قَدْ رَآنِيْ قَبْلَ الْحِجَابِ .» [1]

یعنی ''اس نے پردہ کا حکم نازل ہونے سے پہلے مجھے دیکھا ہوا تھا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ صحابیات رضی اللہ عنہن کے ہاں چہرے کا پردہ معہود تھا۔ اسی طرح سنن ابوداؤد میں حدیث ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم یعنی عورتیں احرام کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتیں۔ جب مردوں کی جماعت ہمارے ساتھ گذرتی اور رو برو ہو کر جاتی، تو اس وقت ہم اپنی چادر کو کھینچ کر اپنے چہرہ کو چھپا لیتیں۔ جب ان کی جماعت گزر جاتی تو ہم پھر اسی طرح اپنے چہرے کھول لیتیں۔ [2] (أبو داؤد مع عون المعبود ۱۰۴/۱)

اس سے معلوم ہوا کہ چہرہ پردے میں داخل ہے۔ یہ روایات کالصریح ہیں۔ ہر چیز میں امر کا پہلو ضروری نہیں۔ بلکہ شرعی مسائل کے بیان میں مختلف اسالیب ہیں جن سے مطلوبہ رہنمائی کو ایک مومن اپنے لئے حرزِ جان جانتا ہے۔

مزید تصریحات کے لئے ملاحظہ ہو: کتاب (نظرات فی کتاب حجاب المرأۃ المسلمة)

---

[1] (٦٥٩) صحيح البخاری، كتاب المغازی، باب حديث الإفك (٤١٤١).

[2] (٦٦٠) الاول: اسناده ضعيف، والثانی: معناه صحيح ثابت عن غيرها (الاول) انظر ضعيف ابی داؤد (٣٩٩)، والإرواء (١٠٢٤)، فيه يزيد بن ابی الزياد، قال الحافظ: ضعيف و ضعفه الشيخ إرشاد الحق الأثری حفظه الله أيضًا، (الثانی) عن فاطمة بنت المنذر أنها قالت: كنا نخمر وجوهنا و نحن محرمات و نحن مع أسماء بنت ابی بكر، صححه الأثری، المؤطا، المناسك (٧٢٤)، الحاكم (٤٥٤/١)، (١٦٦٨)، وصححه و قال الذهبی: علی شرط البخاری و مسلم و ابن خزيمة (٢٦٩٠)، و صححه و فی الحاكم و ابن خزيمة عن أسماء بنت ابی بكر قالت: كنا نغطی ...... الخ.

سوال: غیر محرم عورت کے جنازے کو غیر مرد اٹھا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں تبویب قائم کی ہے:

"بَابُ حَمْلِ الرِّجَالِ الْجَنَازَةَ دُوْنَ النِّسَاءِ."

یعنی "جنازہ صرف مرد اٹھائیں عورتیں نہ اٹھائیں۔"

پھر اس کے تحت مشہور حدیث بیان کی ہے۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب جنازہ تیار ہو جاتا ہے اور مرد اسے اپنی گردنوں پر اٹھا لیتے ہیں تو وہ واویلا کرتا ہے۔ مجھے کہاں لے چلے ہو۔ میت کی اس آواز کو انسان کے ماسوا ہر شی سنتی ہے اور اگر زندہ انسان اس آواز کو سن لے تو وہ مر جائے۔ [1]

اس حدیث میں جنازہ کو اٹھانے والے مردوں میں محرم اور غیر محرم کی تفریق روا نہیں رکھی گئی۔

لہٰذا عموم حدیث کے اعتبار سے غیر محرم کے جنازے کو اٹھانے کا جواز معلوم ہوتا ہے اور مصنف امام بخاری رحمہ اللہ کا فہم بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ (وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَ عِلْمُهُ أَتَمُّ.)

سوال: حدیث شریف میں ہے جو کسی مسلمان بھائی سے اختلاف کی وجہ سے تین دن تک کلام نہیں کرتا تو اس کی کوئی عبادت بھی قبول نہیں ہوتی ہم لوگ باہمی اختلافات کی وجہ سے طویل عرصہ تک بات چیت نہیں کرتے تو کس زمرہ میں آتے ہیں۔ عبادت کی قبولیت کے اعتبار سے امید ہے کہ جلد کتاب و سنت کی روشنی میں مفصل جواب سے نوازیں گے؟

جواب: عام حالات میں کسی مومن کے لائق نہیں ہے کہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلقی کرے، اس صورت میں جو بلانے میں پہل کرے وہ بری الذمہ ہے دوسرا چاہے رضا کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ بصورت عدم رضا ذمہ داری اس پر عائد ہو گی۔ اور اس کی عبادت بھی محل نظر ہو گی۔ ہاں البتہ مقاطعہ کا سبب اگر شرعی عذر ہے تو تین دن سے زیادہ بھی جائز ہے جس طرح کہ حضرت کعب بن مالک اور ان کے ساتھیوں کا غزوۂ تبوک میں قصہ معروف ہے۔ [2]

سوال: ایک آدمی داڑھی کا مذاق اڑاتا ہے اور پھر خوب خدا سے توبہ کر لیتا ہے کیا اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟

جواب: داڑھی کا مذاق اڑانے والے کی توبہ قابل قبول ہے قصۂ افک میں یہ الفاظ ہیں:

---

[1] (٦٦١) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، رقم الباب (٥٢)، ح(١٣١٦).

[2] (٦٦٢) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب حدیث کعب ابن مالك رضی الله عنه(٤٤١٨).

« فَإِنَّ الْعَبْدَ إِذَا اعْتَرَفَ بِذَنْبٍ ثُمَّ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ.» ❶

یعنی ’’بندہ جب اپنے گناہ کا اقرار کر لیتا ہے اور اللہ سے توبہ کی درخواست کرتا ہے تو وہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔‘‘

سوال: بغیر وضو دین کی باتیں کرنی جائز ہیں یا نہیں؟

جواب: جائز ہیں حدیث میں ہے کہ:

’’كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ أَحْيَانِهِ.‘‘ ❷

’’آپ ﷺ ہر حالت میں اللہ کا ذکر کیا کرتے تھے۔‘‘ (ماسوائے چند استثنائی صورتوں کے) یہ حکم عام ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ’’سبل السلام‘‘ وغیرہ۔

سوال: اگر درود شریف کی بے ادبی ہو جائے تو اس کا کیا حل ہے؟

جواب: درود شریف کی بے ادبی کا سوال غیر واضح ہے۔ اگر مقصود بلا وضو پڑھنا ہے۔ تو یہ جائز ہے اور اگر مقصود یہ ہے کہ محل نجاست وغیرہ پر پڑھا گیا، تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی چاہیے۔ صحیح بخاری میں قصۂ افک کے ضمن میں مذکور ہے کہ:

« فَإِنَّ الْعَبْدَ إِذَا اعْتَرَفَ بِذَنْبٍ ثُمَّ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ.‘‘ ❸

’’انسان جب اپنے گناہ کا اعتراف کرے، پھر توبہ کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتے ہیں۔‘‘

سوال: بعض لڑکیاں اُلٹی مانگ نکالتی ہیں یعنی سر کے بالوں کا ’’چیر‘‘ درمیان میں نکالنے کی بجائے انگریزوں کی طرح نکالتی ہیں۔ کیا شریعت میں اس کی کوئی ممانعت تو نہیں؟

جواب: بعض لڑکیوں کا غیروں کی نقالی میں سر کے بالوں کا الٹ چیر نکالنا سخت ممنوع ہے۔ حدیث میں ہے:

---

❶ (٦٦٣) صحيح البخاری، كتاب المغازی، باب حديث الإفك (٤١٤١)، صحيح مسلم، كتاب التوبة، باب فی حديث الإفك وقبول التوبة القاذف (٧٠٢٠).

❷ (٦٦٤) صحيح البخاری، كتاب الأذان، باب يتتبع المؤذن فاه هاهنا و هاهنا ؟ (٦٣٤) تعليقاً ، صحيح مسلم ، كتاب الحيض ، باب ذكر اسم الله تعالىٰ فی حال الجنابة و غيرها (٨٢٦).

❸ (٦٦٥) صحيح البخاری، كتاب المغازی، باب حديث الإفك (٤١٤١)، صحيح مسلم، كتاب التوبة، باب فی حديث الإفك وقبول التوبة القاذف (٧٠٢٠).

« مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ .» ❶

یعنی ''جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ انہی میں شمار ہوتا ہے۔''

حدیث ہذا کی مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ اہلحدیث ۳/۳۳۸-۳۴۴)

سوال: ملاقات کے وقت مصافحہ کرنے اور سلام کہنے کا حکم تو ہے کیا واپسی کے وقت سلام کہنا اور مصافحہ کرنا کسی حدیث سے ثابت ہے؟ مصافحہ ایک ہاتھ سے کرنا چاہیے یا دو سے؟

جواب: زائر کا واپسی کے وقت سلام کہنا بھی مسنون ہے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں حدیث ہے۔

« إِذَا انْتَهَى أَحَدُكُمْ إِلَى الْمَجْلِسِ فَلْيُسَلِّمْ فَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَقُومَ فَلْيُسَلِّمْ فَلَيْسَتِ الْأُولَى بِأَحَقَّ مِنَ الْآخِرَةِ .» ❷ (بَابٌ فِي السَّلَامِ إِذَا قَامَ مِنَ الْمَجْلِسِ)

یعنی ''جب ایک تمہارا مجلس میں آئے تو سلام کہے پس جب اٹھ کر جائے پھر بھی سلام کہے۔ پہلے سلام کی شرعی حیثیت دوسرے سے زیادہ نہیں۔''

مقصد یہ ہے کہ دونوں دفعہ سلام کہنا مسنون ہے۔

اور جہاں تک مصافحہ کا تعلق ہے۔ سو اس بارے میں عرض ہے اگر تو رخصت ہونے والا مسافر ہے اس سے مصافحہ کا جواز ہے چنانچہ ترمذی میں حدیث ہے:

« كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا وَدَّعَ رَجُلًا أَخَذَ بِيَدِهِ فَلَا يَدَعُهَا حَتّٰى يَكُونَ الرَّجُلُ هُوَ يَدَعُ يَدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ .» ❸ (أَبْوَابُ الدَّعَوَاتِ ،بَابُ مَا يَقُولُ إِذَا وَدَّعَ إِنْسَانًا)

یعنی ''نبی ﷺ جب کسی آدمی کو الوداع کرتے تو اس کا ہاتھ پکڑ لیتے اسے نہ چھوڑتے حتیٰ کہ آدمی نبی ﷺ کے مبارک ہاتھ کو چھوڑتا۔''

پھر مسافر کو رخصت کرتے وقت آپ ﷺ یہ دعا پڑھتے:

---

❶(٦٦٦) حسنه وصححه الألبانى،صحيح أبى داؤد، كتاب اللباس، باب فى لبس الشهرة (٤٠٣١) ،الارواء (١٢٦٩) ،المشكاة (٤٣٤٧).

❷(٦٦٧) صححه الألبانى ، صحيح ابى داؤد، كتاب الأدب ، باب فى السلام إذا قام من المجلس(٥٢٠٨)، الترمذى(٢٨٦١)، والصحيحة (١٨٣).

❸(٦٦٨) الترمذى، ابواب الدعوات، باب ما جاء ما يقول إذا ودع انسانا(٣٦٨٥) و صححه الألبانى، الصحيحة (٢٤٨٥،١٦).

«أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَ أَمَانَتَكَ وَاٰخِرَ عَمَلِكَ.»

بظاہر یہ حدیث مسافر سے مصافحہ پر دال ہے۔(واللہ أعلم.) اور اگر رخصت ہونے والا غیر مسافر ہے تو اس سے مصافحہ کے بارے میں کوئی مرفوع صحیح حدیث ثابت نہیں۔ اور نہ ہی کوئی صحیح اثر موجود ہے۔ لہٰذا مصافحہ سے اجتناب کرنا چاہیے۔

مصافحہ صرف ایک ہاتھ سے مسنون ہے۔ اس بارے میں کئی ایک احادیث وارد ہیں۔ چند ایک ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

« أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا صَافَحَ الرَّجُلُ لَمْ يَنْزِعْ يَدَهُ مِنْ يَدِه حَتّٰى يَكُوْنَ هُوَ الَّذِىْ يَنْزِعُ يَدَهُ......» [1] الحديث(رَوَاهُ التِّرْمِذِىْ بحواله مِشْكوٰةُ الْمَصَابِيْح ، بَابٌ فِي اَخْلَاقِهٖ وَ شَمَائِلِهٖ ﷺ)

یعنی ''رسول اللہ ﷺ جب کسی آدمی سے مصافحہ کرتے اپنے ہاتھ کو اس کے ہاتھ سے جدا نہ کرتے یہاں تک کہ وہ آدمی اپنا ہاتھ جدا کرتا۔''

دوسری روایت میں ہے:

« قَالَ رَجُلٌ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! اَلرَّجُلُ مِنَّا يَلْقٰى أَخَاهُ أَوْ صَدِيْقَهٗ أَيَنْحَنِىْ لَهٗ؟ قَالَ: « لَا.» ، قَالَ:فَيَلْتَزِمُهٗ وَ يُقَبِّلُهٗ؟ قَالَ:« لَا.» قَالَ: فَيَأْخُذُ بِيَدِهٖ وَ يُصَافِحُهٗ؟ قَالَ: « نَعَمْ.» [2] (ترمذی بَابُ الْمُصَافَحَة.)

اور تیسری روایت حدیث التودیع ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (كِتَابُ الْمَقَالَةِ الْحُسْنٰى فِي سُنِّيَّةِ الْمُصَافَحَةِ بِالْيَدِ الْيُمْنٰى لِلْمُحَدِّثِ مُبَارَكْپُوْرِىْ رَحِمَهُ اللّٰه)

---

[1] (٦٦٩) ضعفه الألبانی، وقال:جملة المصافحة صحيح .انظر صحيح ابن ماجه (٢٩٩٥)، ضعيف الترمذی، أبواب صفة القيامة، باب تواضعه صلی الله عليه وسلم مع جليسه(٤٤٤).

[2] (٦٧٠) حسنه الألبانی.صحيح الترمذی، أبواب الاستئذان، باب المصافحة(٢٨٨٣،٢٨٨٤)وابن ماجه (٣٧٠٢).

سوال: زید کلمہ گو پاکستانی ہے، باپ دادا مسلمان، شناختی فارم پر مذہب اسلام درج ہے،قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب تسلیم کرتا ہے،ارکان اسلام سے (اپنے علم کی حد تک) واقف ہے، مگر اپنی خواہشات کے تابع زندگی گزار رہا ہے۔ رفاہ عامہ کے کاموں میں غریب کی بچی کی شادی ،مدرسہ کی تعمیر، لاوارث میت کی تجہیز و تکفین (بے رسم چہلم تک) وغیرہ کے اخراجات برداشت کرتا ہے، دوستوں کی نماز جنازہ میں بہرصورت شریک ہوتا ہے۔ رمضان میں کبھی کبھار نماز جمعہ نماز تراویح نماز تہجد بھی ادا کر لیتا ہے، لیکن ہر سال بہشتی دروازہ پاکپتن سے گزرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔

لاہور میں عرس کی سالانہ تقریبات میں شریک ہوتا ہے۔ مزاروں سے گہرا شغف ہے۔ زراعت کے علاوہ آمدنی کے کئی اور بھی ذرائع ہیں۔ حلال وحرام سب درست جانتا ہے۔رقم کا لین دین ہو تو سودی کاروبار کرتا ہے۔ بینک میں کئی ایک سودی سکیموں میں پیسہ لگا رکھا ہے۔

دوستوں کی محفل میں شراب بھی پی لیتا ہے۔ اس نے کئی دفعہ زنا بھی کیا۔ معاملات میں جھوٹ بولتا ہے، فریب کاری، دھوکہ دہی اس کی زندگی کے معمول ہیں۔ موسیقی کا شوقین ہے۔ اگر کوئی موحد شخص راہِ حق کی ہدایت کرتا ہے تو اس کا جواب صرف یہ ہوتا ہے۔ بھئی ہم جیسوں کا بھی تو اللہ ہے۔اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ ہر کلمہ گو نے بہر حال جانا تو جنت میں ہی ہے۔ کیا زید کی یہ خوش فہمی درست ہے! بغیر توبہ کئے اگر فوت ہو جائے تو قرآن خوانی، ساتواں، چالیسواں وغیرہ کچھ فائدہ دے سکتے ہیں؟

جواب: مذکورہ صفات کے حامل شخص کو چاہیے کہ اپنی اولین فرصت میں امدادی ذرائع سے دعوۃ الرسل ''توحید خاص'' کو سمجھنے کی سعی کرے یا پھر کسی موحد بزرگ عالم کی صحبت کو اختیار کرے تاکہ اس کی باطنی کیفیت میں جلاء پیدا ہو کر اس میں جذبۂ توحید موجزن ہو جو اول و آخر ذریعۂ نجات ہے، ورنہ آپ جانتے ہیں کہ نکما بیج تو زمین بھی قبول نہیں کرتی۔ چہ جائیکہ سیاہ کاریوں اور بداعمالیوں کا سودا اللہ کے حضور پروان چڑھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ جل شانہٗ کا بندوں پر بہت زیادہ حق ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ بندہ کما حقہٗ حق عبودیت ادا کرے۔ اس کے ماسوا کسی کی پرستش نہ کرے اور نہ کسی کو نفع وضرر اور خوف و رجاء وغیرہ میں اس کا شریک وسہیم سمجھے۔ خالی گھر ہر ایک کی توجہ کا مرکز ہوتا ہے۔ ہر کوئی اس کو اپنے مقاصد میں استعمال کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔ اسی طرح یاد الٰہی سے غافل اور بے بہرہ دل و دماغ بڑی آسانی سے شیطانی قوتوں کا ملجاء و ماویٰ بن جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں گناہ آلود زندگی خوبصورت ومزین لگنے لگتی ہے۔ آدمی ہوائی گھوڑے پر سوار ہو کر خوش فہمی میں

مبتلا ہو جاتا ہے کہ اللہ کی رحمت بڑی وسیع ہے، عمل کی کیا ضرورت ہے، وہ خود بخود معاملہ حسنہ کرے گا۔ میرے اعمال سے وہ مستغنی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ سوچنے کا مقام ہے۔ اگر یہ بات حقیقت کا روپ دھارے ہوتی تو انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء عظام رحمہم اللہ کو عبادات کے مصائب و مشکلات کا بوجھ اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ مجاہدۂ نفس میں وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ اس بناء پر وہ خلد بریں کے وارث ٹھہرے۔

سوال میں ذکر کردہ بہت ساری چیزیں شرکیات، بدعات اور کبائر کی قبیل سے ہیں۔ دین اسلام سے غیر متعلق ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے دین کا صحیح فہم و ادراک حاصل کیا جائے۔ پھر اس کے تقاضوں کے مطابق اپنے کو ڈھالا جائے۔

" اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَه وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهُ وَ تَمَنّٰی عَلَی اللّٰهِ الْأَمَانِیَّ "[1]

یعنی "عقل مند اور دانا بینا وہ ہے جس نے اپنے نفس کو رب کی رضا کے تابع کر دیا اور عاجز و بے بس وہ ہے جو نفسانی خواہش کی پیروی میں لگا رہا اور اللہ سے صرف آرزوں کا متمنی ہے۔"

شخص ہذا منہیات کا مرتکب اگر مر گیا تو قرآن خوانی، ساتواں، چالیسواں وغیرہ اس کے لئے نفع بخش نہیں کیونکہ بذات خود ان اعمال کا وجود ہی شریعت اسلامیہ میں ثابت نہیں۔ دوسری طرف یہ شخص مشرک بھی ہے۔ جس کی نجات ممکن نہیں۔ ﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ أَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ ﴾ (النساء:۱۱٦) مزید آنکہ یہ شخص کبائر کا مرتکب ہے جس کی نجات کا انحصار مشیت الٰہی پر موقوف ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

سوال: شرعاً حکم ہے کہ زیر ناف بال ایک ماہ کے اندر اندر ہر ماہ صاف کئے جائیں۔ اس میں تشریح طلب درج ذیل مسائل ہیں:

① زیر ناف سے کیا مراد ہے کہ بال ٹھیک ناف سے لے کر خادوں سے نیچے تک حصہ صاف کیا جائے۔ کیا خادوں کے بال بھی صاف ہوں زیر ناف کی عملاً حد کیا ہوگی؟

② ایک بوڑھا آدمی جس کے ہاتھ کانپتے ہوں خطرہ ہے کہ وہ صفائی کرتے وقت زخم لگا بیٹھے۔ اس کی بابت کیا حکم ہے؟

③ شوگر کا مریض ہے خدانخواستہ صفائی سے زخم لگا بیٹھتا ہے۔ اس کی بابت شرعاً کیا حکم ہوگا؟

---

[1] (٦٧١) ضعفه الألبانی ،ضعیف الترمذی ،أبواب صفة القیامة ،رقم الباب (١٤) (٢٥٨٩) ،ابن ماجه (٤٢٦٠) ،أحمد (١٢٤/٤) ،المشکاة (٥٢٨٩).

✿ کتنے عرصہ کے اندر بالوں کی صفائی ضروری ہے؟

جواب: ① صحیح احادیث میں زیر ناف بالوں کی صفائی کو پیدائشی سنتوں میں سے شمار کیا گیا ہے۔ روایات میں اس کے لئے لفظ: "اَلإِسْتِحْدَاد" [1] (لوہے کو استعمال کرنا) یعنی استرا یا سیفٹی وغیرہ اور "اَلْعَانَہ" وارد ہے۔

✿...... امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اَلْعَانَة سے مراد وہ بال ہیں جو آدمی کے آلۂ تناسل کے اوپر اور اس کے گرد ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح وہ بال جو عورت کی شرمگاہ پر ہوتے ہیں۔"

✿...... ابن شریح نے کہا: "وہ بال ہیں جو انسانی حلقۂ دبر پر اگتے ہیں۔"

✿...... امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اس کا ماحاصل یہ ہے کہ "قُبل اور دُبر" اور ان کے گرد بالوں کو مونڈنا مستحب ہے۔"

✿...... علامہ شوکانی رحمہ اللہ کا کہنا ہے اگر "اِسْتَحْدَاد" بمعنی "اَلْعَانَة" ہو جس طرح کہ نووی نے کہا ہے تو بایں صورت دُبر پر اگنے والے بالوں کو مونڈنے کی سنیت ثابت نہیں ہوتی۔ اگر چہ لوہے سے مونڈنا حلق العانہ سے عام ہے۔ جس طرح قاموس میں ہے۔

لیکن صحیح مسلم وغیرہ میں "اَلإِسْتِحْدَاد" کے بجائے حدیث "دس چیزیں فطرت سے ہیں۔" میں حلق العانہ کو شمار کیا گیا ہے اس سے "اَلإِسْتِحْدَاد" کے اس اطلاق کی وضاحت ہوتی ہے جو حدیث "پانچ چیزیں فطرت سے ہیں" میں وارد ہے اس سے اس دعویٰ کی صداقت ظاہر نہیں ہوتی کہ دُبر کے بال مونڈنے سنت ہیں یا مستحب ہیں الا یہ کہ وہاں کوئی دلیل ہو۔ ہمیں اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے دُبر کے بال مونڈے ہوں۔ (نیل الأوطار ۱/۱۲۳-۱۲۴)

اس تشریح سے واضح ہو گیا کہ خادوں اور خصیتین وغیرہ پر موجود بالوں کو صاف کرنا چاہیے البتہ ناف کے نیچے کا متصل حصہ شاید اس میں شامل نہ ہو۔

② بوڑھا یا کمزور آدمی جس کے ہاتھ کانپتے ہوں ان کے لئے یہ ہے کہ وہ پوڈر وغیرہ استعمال کر سکتے ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اس کے جواز کی تصریح کی ہے۔

③ شوگر کا مریض بھی پوڈر کو استعمال میں لائے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اسی طرح بال کترے یا اکھاڑے بھی جا سکتے ہیں اگر چہ افضل مونڈنا ہے۔

---

[1] (٦٧٢) صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب تقلیم الأظفار (٥٨٩١) والعانة (٥٨٩٠).

④ زیر ناف بالوں کی صفائی کا وقفہ چالیس دن سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے پہلے حسب ضرورت صفائی ہوسکتی ہے۔ حدیث میں ہے:

« أَنْ لَا نَتْرُكَ أَكْثَرَ مِنْ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً .»❶ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَابْنُ مَاجَه)

سوال: ایک اہلحدیث بھائی اپنے والدین کو کافر قرار دیتا ہے۔ کیا وہ اپنے والدین کی وراثت میں حصہ دار ہو سکتا ہے؟ جب کہ مسلم شریف کی واضح حدیث موجود ہے کہ ''نہیں وارث ہو گا کافر مسلمان کا نہ مسلمان کافر کا۔''❷

جواب: اولاً ان وجوہات کا علم ہونا ضروری ہے جن کی بناء پر اس شخص نے اپنے والدین کو کافر قرار دیا ہے۔ اگر وہ واقعی شرعی طور پر قابل اعتبار ہوں تو پھر ان کی آپس میں وراثت جاری نہیں ہو گی۔ بصورت دیگر مفتری کو تائب ہوکر اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ ورنہ ڈر ہے کہ کلمۂ کفر اس کی طرف عود نہ کر آئے۔

سوال: اپنے والدین کو کافر قرار دینے کے بعد وہ شخص اپنے والدین کے مکان میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مستقل قیام کرسکتا ہے؟

جواب: بفرض صحت الزام والدین کے ہمراہ اس شخص کا مستقل قیام ان کی رضا مندی پر موقوف ہے۔ شرعی کوئی امر مانع نہیں۔

سوال: کیا وہ شخص اپنے والدین کی بجلی، پانی، گیس، ٹیلی فون استعمال کرسکتا ہے؟ جب کہ ان کا بل اس کے کافر قرار دیئے جانے والے والدین نے ادا کرنا ہوتا ہے۔

جواب: مکان میں موجود سہولتوں سے مستفید ہوسکتا ہے۔ واجبات کی ادائیگی والدین کی رضا پر موقوف ہے۔ خود ادا کریں یا بذمہ لڑکا ہوں۔

سوال: کیا وہ شخص اپنے والدین کو کافر قرار دینے کے بعد ان کی خدمت سے انکار کر دے اور اس کے مقابلے میں اپنی بیوی اور بیوی کے گھر والوں کی خدمت کو ترجیح دے؟ جب کہ وہ شخص اپنے والدین کا اکلوتا ہو کیوں کہ دوسرا بھائی مستقل ملک سے باہر قیام کرتا ہے۔ کیا یہ شخص اپنی بیوی اور بیوی کے گھر والوں کو اپنے والدین پر فوقیت دے سکتا ہے؟

---

❶(٦٧٣) صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب خصال الفطرة (٥٩٩) وابن ماجه(٢٩٥).

❷(٦٧٤) صحیح مسلم، کتاب الفرائض، باب لا یرث المسلم الکافر ولا یرث الکافر المسلم" و لفظ الحدیث هکذا"(٤١٤٠).

جواب: اثبات دعویٰ کے باوجود والدین کی خدمت کرنا واجب ہے۔قرآن میں ہے:

﴿صَاحِبۡهُمَا فِی الدُّنۡیَا مَعۡرُوۡفًا﴾ (لقمان:١٥)

''ہاں دنیا کے (کاموں میں) ان کا اچھی طرح ساتھ دینا۔''

جب کہ اہل وعیال کے حقوق کی ادائیگی بھی اپنی جگہ اہم ہے۔ ہر ایک کو اس کا حصہ ملنا چاہیے۔کسی ایک سے ترجیحی معاملہ کا انحصار حالات پر موقوف ہے۔البتہ عمومی اعتبار سے جہت اسلام بہر صورت مقدم ہے۔جس میں کوئی کلام نہیں۔

سوال: ایک اہل حدیث شخص اپنے والد کو کافر قرار دیتا ہے کیا وہ شخص اپنے بہنوئی کو اپنے والد سے ملاقات کرنے سے منع کرسکتا ہے۔والد سے ملاقات پر اپنے بہنوئی سے جھگڑا کرسکتا ہے اور اپنے بہنوئی کی والد سے ملاقات کی صورت میں اپنی بہن کو اس سے خلع دلوا سکتا ہے؟

جواب: اس آدمی کے معاملہ کی بھی چھان بین ہونی چاہیے۔کیا فی الواقع یہ شخص اپنے دعویٰ میں صادق ہے۔ بفرض صحت دعویٰ بہنوئی کو والد کی ملاقات سے روکنا اگر شرعی مفادات کے پیش نظر ہے پھر تو درست ہے۔ بصورت دیگر اس کو والد کی ملاقات سے منع نہیں کرنا چاہیے۔خلع میں بنیادی شرط یہ ہے کہ نفرت کا اظہار عورت کی طرف سے ہو جب کہ موجودہ حالات میں یہ شئ مفقود نظر آتی ہے۔لہٰذا فیصلہ قریب سے حالات کا جائزہ لے کر کرنا ہوگا۔

سوال: داڑھی کا شرعاً کیا حکم ہے،منڈانا یا کٹانا شرعاً کیسا ہے؟

جواب: داڑھی رکھنا واجب اور انبیاء علیہم السلام کی سنت قدیمہ ہے۔احادیث میں اس کی تعبیر بصیغۂ امر کی گئی ہے جو وجوب کی دلیل ہے۔چنانچہ فرمایا:

« وَاعۡفُوا اللُّحٰی.»

یعنی ''داڑھیاں بڑھاؤ۔''

اور بعض الفاظ میں: « أَوۡفُوۡا »، « أَرۡخُوۡا »، « أَرۡجُوۡا »،« وَفِّرُوۡا » ہے۔ [1]

امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

" وَ مَعۡنَاهَا كُلُّهَا تَرۡكُهَا عَلٰی حَالِهَا هٰذَا هُوَ الظَّاهِرُ مِنَ الۡحَدِيۡثِ الَّذِیۡ تَقۡتَضِيۡهِ أَلۡفَاظُه " (١٥١/٣)

[1] (٦٧٥)انظر : الرقم المسلسل(٥٩٩ تا ٦٠٣)

یعنی ''ان تمام الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ داڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دو۔ حدیث کے ظاہری الفاظ کا تقاضا یہی ہے۔''

دیگر بعض احادیث میں دس امور کو فطرت قرار دیا گیا ہے ان سے: إِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ (داڑھی کا بڑھانا) بھی ہے۔ (مسلم:۱٤٧/۳) [1]

اصل یہی ہے کہ داڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے لیکن اگر کوئی شخص مٹھی سے زائد کٹا دے تو بعض آثار کی بناء پر گنجائش موجود ہے۔

بالخصوص راوی حدیث: ''إِعْفَاءِ لحیه'' ابن عمر رضی اللہ عنہما کے عمل سے اس نظریہ کو مزید تقویت ملتی ہے۔ [1]

اور جہاں تک داڑھی منڈوانے کا تعلق ہے۔ سو متفقہ طور پر یہ عمل حرام ہے۔ تاریخ ابن جریر میں ہے۔ شاہ کسریٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو آدمی بھیجے، ان کی داڑھیاں منڈی ہوئی تھیں اور لبیں بڑھی ہوئیں۔ آپ نے ان کی طرف دیکھنے سے نفرت کی پھر فرمایا: تمہیں خرابی ہو، اس بات کا حکم تمہیں کس نے دیا؟ انہوں نے کہا ہمارے رب یعنی کسریٰ نے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیکن میرے رب نے تو مجھے داڑھی بڑھانے اور لبیں کٹانے کا حکم دیا ہے۔ [2]

سوال: داڑھی کی مقدار شرعی کیا ہے؟

جواب: احادیث میں وارد سابقہ الفاظ کی بناء پر ظاہر یہی ہے کہ داڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ البتہ مٹھی سے زائد سابقہ حوالوں کی بناء پر کٹوانی جائز ہے۔ کٹوانے کی مرفوع روایت بھی بحوالہ ترمذی بیان کی جاتی ہے۔ لیکن اس میں عمر بن ہارون راوی ضعیف ہے۔

سوال: کوئی شخص داڑھی منڈائے یا کٹائے اس کو امام بنانا جائز ہے؟

جواب: داڑھی منڈانے والے شخص کو قطعًا امام مقرر نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ علانیہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہے۔ حدیث میں ہے:

---

[1] (٦٧٦) انظر: الرقم المسلسل (٥٩٩ تا ٦٠٥)

[2] (٦٧٧) تاریخ الطبری (١٣٣/٢) و فیه تدلیس ابن اسحاق و عنه ابن کثیر فی البدایة (٢٦٩/٤)، بغیة الباحث عن زوائد مسند الحارث لابن حجر بطریق عبد العزیز بن أبان ثنا هشام عن یحییٰ بن ابی کثیر قال اتی رجل من العجم ...... الخ المطالب العالیة (٣٨١/١٠) (٢٢٥٥) و قال محققه: الاول عبد العزیز بن أبان و هو متروك۔ والثانیة: انّهٗ مرسل اتحاف المهرة (١٢٦/٦) (٥٦٠٧) للبوصیری۔

« كُلُّ أُمَّتِي مُعَافًى إِلَّا الْمُجَاهِرِينَ .» ❶

اور جو شخص مٹھ سے کم کٹائے اس پر سختی کرنی چاہیے۔ ایسا شخص امامت کے لائق نہیں، ہاں اتفاقیہ نماز پڑھ لی جائے مگر ایسے امام کو امامت سے معزول کرنے کی سعی کرنی چاہیے۔

سوال: کیا داڑھی سفید رکھنا مناسب نہیں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ داڑھی سفید رکھنا غلط ہے۔ داڑھی رنگنے کے متعلق فرمان رسول ﷺ کی وضاحت کیا ہے؟

جواب: داڑھی کو رنگنا اور اپنی اصلی حالت پر رہنے دینا دونوں طرح جائز ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رسول اللہ ﷺ کے عمل کے بارے میں بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

" وَحَاصِلُه:أَنَّ مَنْ جَزَمَ أَنَّه خَضَبَ كَمَا فِيْ ظَاهِرِ حَدِيْثِ أُمِّ سَلَمَةَ وَكَمَا فِيْ حَدِيْثِ ابْنِ عُمَرَ الْمَاضِيْ قَرِيْبًا أَنَّه صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَضَبَ بِالصُّفْرَةِ حَكَى مَا شَاهَدَهُ ، وَكَانَ ذٰلِكَ فِيْ بَعْضِ الْأَحْيَانِ وَ مَنْ نَفَى ذٰلِكَ كَأَنَسٍ فَهُوَ مَحْمُوْلٌ عَلَى الْأَكْثَرِ الْأَغْلَبِ مِنْ حَالِهِ ." (فتح الباری ١٠/٣٥٤)

" حاصل بحث یہ ہے کہ جس نے اس بات کا جزم کیا ہے کہ آپ ﷺ نے بالوں کو رنگا ہے جس طرح ام سلمہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کی احادیث ❷ میں ہے کہ آپ ﷺ نے بالوں کو زرد بنایا۔ انہوں نے جس شے کا مشاہدہ کیا اسے بیان کیا ہے اور یہ عمل بعض اوقات میں ہے اور جس نے نفی کی ہے جس طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں ❷ تو یہ آپ ﷺ کی اغلب اور اکثر حالت پر محمول ہے۔"

اور جو لوگ داڑھی سفید رکھنے کو غلط سمجھتے ہیں، سابقہ توجیہ کی بناء پر ان کا خیال غیر درست ہے۔ بلکہ امام طبری رحمہ اللہ نے یہاں تک کہا ہے: اگر کسی علاقہ میں لوگ داڑھیوں کو رنگتے نہ ہوں، اور رنگنے والا انسان منفرد حیثیت کا حامل نظر آئے تو اس کے حق میں فعل ہذا کو ترک کرنا اولیٰ ہے۔ (فتح الباری ١٠/٣٥٥) اور یہود و نصاریٰ کی مخالفت میں بال رنگنے والی روایت کو اہل علم نے صرف استحباب پر محمول کیا ہے۔ اس طرح کے شریعت میں

---

❶ (٦٧٨) صحیح البخاری ، کتاب الأدب ، باب ستر المؤمن (٦٠٦٩) ، صحیح مسلم ، کتاب الذهد ، باب النهی عن هتك الإنسان ......(٧٤٨٥).

❷ (٦٧٩) انظر الرقم المسلسل (٦٣٦ ...

تیس سے زائد احکام موجود ہیں جن میں غیر مسلموں کی مخالفت کا حکم پایا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک بالوں کو سیدھا چھوڑنے کے بجائے مانگ نکالنا ہے۔ لیکن بعد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دونوں طرح ثابت ہے، ایسے ہی مذکورہ مسئلہ کی نوعیت ہے کہ بالوں کو رنگنا اور ترک کرنا دونوں طرح کا جواز منقول ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁

﴿ وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً أَوْظَلَمُوْآ أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ. ﴾ (النساء: ١٣٥)

فرمانِ رسول ﷺ

« فَإِنَّ الْعَبْدَ إِذَا اعْتَرَفَ بِذَنْبٍ ثُمَّ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ .»

﴿۳۰﴾ حقوق العباد اور معاشرتی برائیاں وغیرہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص عابد کی شادی پروین اختر سے ہوئی، پروین اختر سے عابد کی ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ بعد میں عابد فوت ہو گیا۔ پروین اختر کے والدین کچھ عرصہ بعد اپنی بچی پروین اختر کو مع بچی کے لے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ والدین، پروین اختر کو گھر بٹھائے رکھتے ہیں، بعد میں اس کی شادی کسی دوسری جگہ کر دیتے ہیں۔ اب بچی کے دادا (عابد کے والد) نے اپنی پوتی کو اس کے ننھیال سے لینے کا مطالبہ کیا ہے تاکہ اس کی کفالت کریں۔ کیا وہ اس کے حقدار ہیں؟

جواب: بلاشبہ حضانت (پرورش) میں سب سے زیادہ حقدار والدہ ہے۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«اَلْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْأُمِّ .»[1]

یعنی ''خالہ بمنزلہ ماں ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ والدہ کو بچے کی پرورش میں اہمیت حاصل ہے۔ صاحب ''تیسیر العلام'' مذکورہ حدیث سے ماخوذ ومستنبط مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" إِنَّ الْأُمَّ مُقَدَّمَةٌ فِي الْحِضَانَةِ عَلٰى كُلِّ أَحَدٍ فَإِنَّهُ لَمْ يُعْطِهَا الْخَالَةَ فِي هٰذِهِ الْقِصَّةِ إِلَّا أَنَّهَا بِمَنْزِلَةِ الْأُمِّ بِكَمَالِ شَفْقَتِهَا وَ بِرِّهَا." (۲/۳۰۵-۳۰۶)

یعنی ''ماں حضانت میں ہر ایک پر مقدم ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے جعفر کی بیوی کی کفالت میں بنت حمزہ کو صرف اس بناء پر دیا تھا کہ خالہ قائم مقام ماں کے ہے۔ نیز اس لیے کہ خالہ میں احسان وسلوک اور شفقت ومحبت حد درجہ ہوتی ہے۔''

---

[1] (٦٨٠) صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب عمرة القضاء (٤٢٥١). الترمذي (١٩٠٤). أحمد، رقم ح (٧٧٠، ٩٣١ـ شاكر). أبوداؤد (٢٢٨٠).

مذکورہ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کی شادی کے باوجود کفالت کا حق ساقط نہیں ہوتا۔ کیونکہ مذکورہ عورت، جس کی کفالت میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کو دیا گیا تھا، وہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھی حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

«اِبْنَةُ عَمِّي وَ خَالَتُهَا تَحْتِي.»❶

یعنی "یہ بچی میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میرے نکاح میں ہے۔"

لیکن دوسری ایک روایت جو مسند احمد اور ابوداؤد وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس میں یہ ہے کہ ایک عورت اپنے بچے کو لے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ اس کا سابقہ خاوند، جس نے اس کو طلاق دی تھی، اس سے بچہ چھیننا چاہتا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَنْتِ أَحَقُّ بِهِ مَا لَمْ تَنْكِحِي.» ❷

یعنی "جب تک تو نکاح نہ کرے تو اس کی زیادہ حقدار ہے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے دوسری جگہ شادی کرنے سے حق حضانت ختم ہو جاتا ہے۔ جس طرح بعض کا استدلال قصہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بھی ہے کہ جب ان کی شادی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی تھی تو ان کی اولاد ان کے زیر کفالت تھی۔

بعض اہل علم نے ان مختلف روایات کو اس طرح جمع کیا ہے کہ مزوجہ کا خاوند اگر رضا مندی کا اظہار کرے تو حق حضانت ختم نہیں ہوگا۔ بصورت دیگر ختم ہے۔ کیونکہ حق حضانت ختم ہونے کی بنیادی وجہ خاوند کے حقوق و فرائض کی ادائیگی میں کمی کا احتمال ہے۔

لہٰذا صورت مرقومہ میں پروین اختر کا (دوسرا خاوند) بچی کی کفالت پر راضی ہے تو یہ بچی والدہ کی کفالت میں رہے گی۔ بصورت دیگر دادا کو واپس کر دی جائے۔ هٰذَا مَا عِنْدِي، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَ عِلْمُهُ أَتَمُّ.

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (نیل الأوطار جزء ٦، ص٣٤٨-٣٥٢)

سوال: زید کی حقیقی بیٹی ہے۔ اس نے بکر کو کہا یہ آپ کی بیٹی ہے۔ جہاں چاہیں۔ آپ اس کا نکاح کر دیں۔

---

❶(٦٨١) ایضاً۔

❷(٦٨٢) صححه أحمد شاكر وحسنه الألباني. صحيح أبي داؤد، كتاب الطلاق، باب من أحق بالولد (٢٢٧٦). أحمد ١٨٢/٢ (٦٧٠٧) شاكر.

بکر نے لڑکی کی شادی ایک داڑھی منڈے سے کر دی۔ جب کہ بچی درس نظامی کی فارغ شدہ ہے۔ بکر انتہائی درجے کا نیک اور بزرگ آدمی ہے۔ اور عالم دین بھی ہے اور اس کی عمر تقریباً ۶۵ برس سے اوپر ہے۔ لڑکی کے گھر میں تنہائی میں جاتے ہیں۔ وہ بچی ان سے پردہ بھی نہیں کرتی۔ عمر اور ان کے دیگر ساتھیوں کا کہنا ہے کہ حضرت صاحب ان کے گھر ایسے اکیلے نہ جایا کریں ہوسکتا ہے آپ بدنام ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے نامردی کی گولیاں کھا رکھی ہیں۔ جب کہ ان کی دو بیویاں بھی ہیں۔ ڈاکٹری معائنہ کرالیں اور میں نے ان کی مدد کرنی ہے۔ تم لوگ ویسے حسد کرتے ہو۔ کئی جاہلوں نے ان پر بری طرح کے الزام بھی لگائے ہیں اور بیہودہ بکواس کرتے ہیں کہ سنی نہیں جاتی۔ کیا بکر کا لڑکی کے پاس تنہائی میں بیٹھنا درست ہے یا کہ نہیں؟ اور اس کا یہ جواب دینا کہ میں نامرد ہو چکا ہوں۔ اس کا جواب درست ہے یا نہیں؟ کیا ایسا آدمی کسی جماعت کا امام یا امیر بن سکتا ہے؟

جواب: مرد کے لئے عورت کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنا ناجائز ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ .» [1]

(بخاری باب: " لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا ذُو مَحْرَمٍ ")

یعنی "کوئی آدمی محرم کے سوا کسی عورت کے ساتھ علیحدگی اختیار نہ کرے۔"

اس حدیث میں مرد نامرد کی کوئی تفریق نہیں۔ ہر دو صورت میں منع ہے۔ بلکہ احادیث میں ہیجڑوں کو عورتوں کے پاس جانے سے روکا ہے۔ [2] اس سے معلوم ہوا، نامرد بھی غیر عورت کے ساتھ علیحدگی اختیار نہیں کرسکتا۔ جب کہ واقعاتی طور پر مذکور موصوف بظاہر اپنے دعویٰ نامردی میں غیر صادق معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کے لئے نصیحت اگر فائدہ مند نہ ہو تو اسے فوراً اس کے منصب سے فارغ کر دیا جانا چاہیے۔

سوال: ایک لڑکا آٹھویں جماعت میں فیل تھا۔ جس نے کسی طریقے سے علاقہ غیر سنٹر علجو ہائی سکول سے دسویں جماعت کے امتحان کے لئے رول نمبر پشاور بورڈ سے حاصل کیا۔

علجو ہائی سکول میں یہ کام مسلسل ہوتا آ رہا ہے کہ جتنے لڑکے ہوتے ہیں ان میں سے ہر لڑکے سے ہر سال سودا ہوتا ہے نقل کے بارے میں۔

یعنی اس وقت جب یہ لڑکا امتحان دے رہا تھا۔ فی لڑکا ۵۰۷ روپے دینے پر تیار کرایا گیا، اس پر لڑکوں کو

---

[1] (۶۸۳) صحیح البخاری (۵۲۳۳)، (۳۰۰۶).

[2] (۶۸۴) صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب إخراج المتشبهين بالنساء من البيوت (۵۸۸۶، ۵۸۸۷).

کاپیوں سے لکھنے کی کھلم کھلا اجازت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جو لڑکا اپنی جگہ دوسرے شخص کو بٹھائے، اس کو ۲۰۰/- روپے دینے ہوتے ہیں۔ اس لڑکے نے بھی ۲۰۰/- روپے دے کر امتحان پاس کیا۔ اب وہ لڑکا گورنمنٹ پرائمری سکول کا استاد بن گیا ہے۔ یہ واقعہ تھا۔

① رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں دوزخی ہیں [1] اب یہ گناہ کیسے دور کیا جا سکتا ہے؟

② یہ لڑکا جو استاد بن کر تنخواہ لے رہا ہے۔ کیا اس کی تنخواہ حرام ہو گی؟ جب کہ یہ خوب محنت سے بچوں کو پڑھا رہا ہے۔

③ یہ لڑکا اپنی غلطی پر بہت پچھتا رہا ہے اور شرعی حل کا طالب ہے۔

جواب: عزیز طالب علم جن پُر خطر مراحل سے گزر کر ملازمت کی کرسی پر براجمان ہوا ہے بے حد افسوسناک، قابل توجہ اور لائق التفات لمحات ہیں۔ موجودہ حالات میں اسے چاہیے کہ اپنی ماضی کی کوتاہیوں پر نادم ہو کر رب کے حضور سربسجود ہو کر معافی کی درخواست کرے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوْٓا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَ مَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا اللّٰهُ وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ .﴾ (النساء:۱۳۵)

''اور وہ کہ جب کوئی کھلا گناہ یا اپنے حق میں کوئی اور برائی کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا بخش بھی کون سکتا ہے؟ اور جان بوجھ کر اپنے افعال پر اڑے نہیں رہتے۔''

اور صحیح حدیث میں وارد ہے:

« فَإِنَّ الْعَبْدَ إِذَا اعْتَرَفَ بِذَنْبٍ ثُمَّ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ .» [2]

یعنی ''بندہ جب گناہ کا اعتراف کرتا ہے پھر رب کے حضور توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔''

سابقہ لغزشوں کے مداوا کی بہترین شکل یہ ہے کہ توبہ نصوحہ کے بعد خوب محنت اور لگن سے محولہ فرض کو ادا کیا جائے۔

---

[1] (٦٨٥) ضعيف الترغيب والترهيب للألباني ٧٩/٢ (١٣٤١-١٣٤٢) وقال: منكر.

[2] (٦٨٦) صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب حديث الإفك (٤١٤١)، صحيح مسلم، كتاب التوبة، باب في حديث الإفك وقبول توبة القاذف (٧٠٢٠).

اس امر کا بڑا کفارہ یہی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ واللہ ولی التوفیق.

نیز ممکنہ حد تک مزید اطمینان و تسلی کی خاطر اپنے کو دوبارہ امتحان کے لئے تیار کرنا بھی مستحسن فعل ہے۔

حدیث میں ہے:« دَعْ مَا يُرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يُرِيبُكَ .» ❶ هَذَا مَا عِنْدِي وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

سوال: کیا کوئی شخص دوسرے کی جگہ پر قسم اٹھا سکتا ہے؟

مثلاً فریقین میں تنازعہ چل رہا تھا۔ دوران تنازعہ زید پارٹی کا آدمی قتل ہوگیا۔ زید پارٹی نے قتل بکر پارٹی پر ڈال دیا۔ کچھ عرصہ کیس چلنے کے بعد بکر پارٹی بری ہوگئی۔ پھر بکر پارٹی کا آدمی قتل ہوگیا۔ انہوں نے قتل زید پارٹی پر ڈال دیا۔ اور ان کے چند آدمی گرفتار کروا دیئے۔ جب کہ زید پارٹی اپنے آپ کو اس قتل سے بری الذمہ قرار دیتی ہے۔ اب بکر پارٹی کہتی ہے کہ اگر تمہاری جگہ پر فلاں فلاں شخص قسم دے دیں کہ زید پارٹی نے قتل نہیں کیا تو ہم آپ کو چھوڑ دیں گے۔ کیا اس صورت میں ان کی جگہ قسم دی جا سکتی ہے؟ جب کہ قسم دینے والا موقع کا چشم دید گواہ نہیں ہے؟

جواب : دوسرے کی امانت و دیانت پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی طرف سے قسم کھائی جا سکتی ہے۔ اس کی واضح مثال مسئلہ قسامت ہے۔ اس کی صورت یوں ہے کہ مثلاً کسی جگہ کوئی قتل ہو جاتا ہے اور قاتل کا علم نہیں تو اس صورت میں اولیاء مقتول میں سے پچاس آدمی قسمیں کھا کر وضاحت کریں کہ فلاں قبیلہ نے ہمارے آدمی کو قتل کیا ہے۔ اور اگر مدعیان قسم کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر مدعا علیہم میں سے پچاس آدمی قسمیں کھا کر بری ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ صورت ہے جو جاہلیت میں قبل از اسلام بھی مروج تھی، امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں بعض نسخوں کے مطابق اس پر یوں تبویب قائم کی ہے:" بَابُ الْقَسَامَةِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ " ❷ پھر اس کے تحت بسلسلہ قسامت ابوطالب کا ایک طویل قصہ نقل کیا ہے۔ یہ مسئلہ جاہلی مسائل میں سے ایک ہے۔ جس کو اسلام نے برقرار رکھا ہے۔ ❸ (اَلْمُنْتَقٰی، مَا جَاءَ فِي الْقَسَامَةِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ) بعد میں اسی نہج پر قریباً رسول اللہ ﷺ نے

---

❶(٦٨٧) صححه الألباني، صحيح الترمذي، أبواب صفة القيامة رقم الباب (٢٢) ح (٢٦٥٠) والنسائي، كتاب الأشربة، باب الحث على ترك الشبهات(٥٢٦٩) ،أحمد (٢٠٠/١) ،المشكاة (٢٧٧٣) ،الارواء (٢٠٧٤،١٢).

❷(٦٨٨) صحيح البخاري ، كتاب مناقب الانصار، فتح الباري (١٥٦/٧).

❸(٦٨٩) ((إن رسول الله صلى الله عليه وسلم أقر القسامة على ما كانت عليه في الجاهلية......)) .صحيح مسلم، كتاب وباب القسامة (٤٣٥٠) واللفظ له. صحيح البخاري، كتاب الديات ،باب القسامة(٦٨٩٩).

فیصلہ صادر فرمایا۔ چنانچہ صحیح روایات میں موجود ہے کہ خیبر میں عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ قتل ہو گیا تھا۔ اس کے ورثاء نے آپ سے گفتگو کی تو فرمایا:

« تَحْلِفُوْنَ خَمْسِيْنَ يَمِيْنًا وَ تَسْتَحِقُّوْنَ قَاتِلَكُمْ أَوْ صَاحِبَكُمْ ». فَوَدَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ عِنْدِهٖ بِمِائَةِ نَاقَةٍ .» ❶ (متفق علیہ)

یعنی تم سے پچاس آدمی قسمیں کھالیں تو قتل کا استحقاق ثابت ہو جائے گا ورنہ:

« فَتُبَرِّئُكُمْ يَهُوْدُ فِيْ أَيْمَانِ خَمْسِيْنَ مِنْهُمْ .»❷

یعنی "بصورت دیگر پچاس یہودی قسمیں کھا کر بری الذمہ ہو جائیں گے۔"

نصوص صریحہ سے یہ بات عیاں ہے کہ اثبات قتل یا اظہار بریت کا تعلق بشمول حالفین نیابتاً قبیلہ کے سب افراد سے ہوتا ہے جو دوسرے کی طرف سے قسم کھانے کے جواز کی دلیل ہے۔

نیز یہ بھی یاد رہے کہ شہادت کے لئے مشاہدہ کی بجائے علم بھی کافی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا .﴾ (البقرۃ:١٤٣)

"اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسول اللہ ﷺ تم پر گواہ بنیں۔"

سوال: حقوق العباد کے بارے میں آتا ہے کہ جب تک بندہ معاف نہ کرے اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں کرے گا۔ اب اتنی طویل زندگی میں ایک آدمی کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ اس نے کس کس کی چغلی کھائی ہے۔ کس کا حق چھینا ہے۔ کس کا قرض دینا ہے۔ کس سے لڑائی کی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان تمام باتوں کی بذریعہ اخبار اشتہار کے ذریعے معافی مانگ لی جائے تو کیا یہ حق ادا ہو جائے گا۔ خواہ اسے تمام حقدار پڑھیں یا نہ پڑھیں؟

جواب: ہر آدمی کو حتی المقدور تمام وسائل بروئے کار لاتے ہوئے جدوجہد کرنی چاہیے کہ دنیاوی زندگی ہی میں بندوں سے اپنا معاملہ بیباک کر لے ورنہ روز جزاء پچھتاوا کسی کام نہ آ سکے گا۔ اور ایسے امور جو انسانی استطاعت سے باہر ہیں ان کے بارے میں بالعموم رب کے حضور سربسجود ہو کر نہایت عاجزی و انکساری سے

---

❶(٦٩٠) صحیح البخاری (٦٨٩٩)، صحیح مسلم، کتاب وباب القسامة (٤٣٤٢، ٤٣٤٩).

❷(٦٩١) صحیح البخاری (٦٨٩٨، ٦٨٩٩)، صحیح مسلم (٤٣٤٣).

معافی کی درخواست کرنی چاہیے۔ ممکن ہے اللہ رب العزت مظلوم کو صلہ اپنی طرف سے عطا کر کے تعدی (زیادتی) کرنے والے کو معاف کر دے۔

سوال: ہماری فیملی میں دو گروپ ہیں۔ دونوں ہم عقیدہ ہیں۔ ان دنوں دونوں میں بڑھتی ہوئی رنجش ہے۔ ان میں سے ایک بزرگ اپنی اولاد اور متاثرین سے کہتے ہیں۔ مرجاؤں تو فلاں شخص (جس کا تعلق مخالف گروہ سے ہے) نہ میرا جنازہ پڑھے پڑھائے اور نہ جنازہ کے ساتھ آئے۔

سوال یہ ہے کہ آیا ایسی وصیت کرنا شرعاً درست ہے؟ اور اس پر عمل کرنا ضروری ہوگا؟ جب کہ اس کے بہت گھناؤنے اثرات کا ظہور بہت مخدوش بلکہ یقینی ہے۔ یہ بھی وضاحت کر دینی ضروری ہے کہ ان بزرگ کی اولاد میں سے بعض کہتے ہیں کہ یہ منکر وصیت ہے کیونکہ اس سے خاندان مزید ابتری کی طرف مائل ہوگا اور اصلاح کی ممکنہ صورتیں معدوم ہو جائیں گی اور یہ کہ کسی کو ایسی وصیت کہنی ہی نہیں چاہیے جس سے (بعد میں) لواحقین فتنہ کا شکار ہوں بلکہ بعد کی باتیں بعد والوں پر چھوڑ دینی چاہئیں تا کہ وہ وقت کی مناسبت اور نزاکت کو دیکھ کر معقول فیصلہ کر کے الجھاؤ سے بچ سکیں۔

جواب: کسی بھی مسلم کے جنازہ میں شرکت چونکہ امور خیر میں سے ہے اس کے حصول کی شریعت نے متعدد نصوص میں تحضیض و ترغیب دلائی ہے کہ اس کارخیر کا فاعل اتنے اتنے اجر و ثواب کا مستحق ہوگا چونکہ یہ استحقاق بندہ کو اللہ کی طرف سے تفویض کردہ ہے۔ لہٰذا دنیاوی کدورتوں و نزاعات کی بناء پر اسمیں کسی کو رکاوٹ بننے کا کوئی اختیار نہیں۔ مُوصِی کی اس قسم کی وصیت کہ فلاں اور فلاں میرے جنازہ میں شریک نہ ہوں، ناقابل عمل اور اپنے اختیارات کی حدود سے تجاوز کرنا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ . ﴾ (البقرہ:۱۸۲)

”اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے (کسی وارث کی) طرفداری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو تو اگر وہ (وصیت کو بدل کر) وارثوں میں صلح کرا دے تو اس پر کچھ گناہ نہیں بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔“

لہٰذا جملہ ورثاء اور عام مسلمان بلا تردد مرحوم کی نماز جنازہ میں شرکت کے حقدار ہیں۔

سوال: کیا جھوٹی کہانیاں (جو کہ مختلف ڈائجسٹوں وغیرہ میں شائع ہوتی ہیں) پڑھنا جائز ہے کہ نہیں؟

جواب: جھوٹے قصے کہانیاں، افسانے ڈرامہ، ناول، جنسی سنسنی خیز لٹریچر رسالے، بے حیائی کے پرچار اخبارات اور جدید ترین ایجادات: ریڈیو، ٹی وی، وی سی آر، ویڈیو فلمیں وغیرہ سے بے راہ روی کا درس لینا اپنی عاقبت کو خراب کرنا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ (لقمان:٣)

''بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو لغو باتوں کو مول لیتے ہیں کہ بے علمی کیساتھ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بہکائیں اور اسے ہنسی بنائیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔''

قرآنی لفظ: ﴿ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ﴾ میں مذکورہ بالا سب چیزیں داخل ہیں۔ ''سیرۃ ابن ہشام'' وغیرہ میں موجود ہے کہ نضر بن حارث کا کاروبار یہی تھا کہ وہ مکہ سے عراق وفارس وغیرہ جاتا۔ وہاں سے شاہان عجم کے قصے اور رستم و اسفندیار کی داستانیں لا کر قصہ گوئی کی محفلیں جماتا تاکہ لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹ جائے اور وہ قصے کہانیوں میں کھو جائیں مسئلہ ہذا پر سیر حاصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو:'' تَفْهِيْمُ الْقُرْآنِ: ۴/۸ مولانا مودودی)

سوال: کیا عورت کا بال کٹوانا جائز ہے؟ یاد رہے کہ عورت صرف اپنے خاوند کی خوشنودی کے لئے ایسا کرلے؟

جواب: کسی معقول عذر کے بغیر عورت کو سر کے بال نہیں کٹوانا چاہئیں۔ مثلاً بیماری وغیرہ کا کوئی عارضہ لاحق ہے۔ جس طرح کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے بیماری کی وجہ سے اپنے سر کے بال منڈوا دیے تھے۔ خاوند کی خوشنودی شریعت کے تابع ہونی چاہیے۔ موضوع ہذا پر میرا ایک تفصیلی فتویٰ ''الاعتصام'' میں شائع ہو چکا ہے۔

سوال: عورت کے لئے ناخن پالش لگانے کا کیا حکم ہے؟

جواب: مسلمان عورت کے لئے ناخن پالش کا استعمال بعض وجوہات کی بناء پر غیر درست ہے۔

اوّلاً: اس عمل کو ایجاد کرنے والی یورپین غیر مسلم فاحشہ عورتیں ہیں۔

ثانیا: اس فعل کے ارتکاب سے ان کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے۔ حدیث میں ہے:

« مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ .» [1] (رواہ أبوداؤد و أحمد)

---

[1] (٦٩٢) حسنه وصححه الألباني،صحيح أبي داؤد، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة (٤٠٣١) ،الارواء(١٢٦٩) ،المشكاة (٤٣٤٧).

یعنی ''جو کسی قوم سے مشابہت اختیار کرتا ہے وہ ان سے شمار ہوتا ہے۔''

ثالثاً : عمل ہذا اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تبدیلی کو مستلزم ہے جس کے فاعل پر حدیث میں لعنت کی گئی ہے۔ فرمایا:

« اَلْمُغَيِّرَاتُ خَلْقَ اللّٰهِ .»[1] (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ فِيْ صَحِيْحِهٖ وَ مُسْلِمٌ)

پھر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ کافر عورتیں اور مخنث مردوں کی ایک طویل عرصہ سے عادت مستمرہ ہے۔ کہ وہ اپنے ناخنوں کو لمبا کر کے مخصوص انداز میں رنگ لیتے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ قبیح رسم مسلم معاشرہ میں بھی دیمک کی طرح سرایت کر چکی ہے۔ جس سے ہر صورت اجتناب ضروری ہے۔ اس کے علاوہ شنید ہے کہ اس کے اجزاء ترکیبی میں حرام کی آمیزش ہوتی ہے۔ پھر بوقت وضو پانی بھی اس میں حلول نہیں کرتا۔ اس بناء پر اندیشہ ہے کہ اصلاً وضو ہی نہ ہو۔ تاہم اگر اس کے اجزائے ترکیبی میں مباح اشیاء استعمال کی گئی ہوں اور وضو کا پانی اس میں سے گزر کر ناخن تک پہنچ سکتا ہو تو پھر اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ معلوم نہیں ہوتا۔

جواب تعاقب از حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ

ناخن پالش کے فتویٰ پر چند اعتراضات کا جائزہ

مؤرخہ ۱۴ جون ۱۹۹۶ء کے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں میرا ایک فتویٰ شائع ہوا۔ اس میں ناخن پالش کے استعمال کو چند وجوہات کی بناء پر ناجائز قرار دیا گیا تھا۔ اسلام آباد سے ایک مراسلہ کے ذریعہ محترم عزیز الرحمٰن صاحب نے اس فتویٰ سے عدم اتفاق کا اظہار فرمایا ہے۔ بحث کے آغاز میں ہمارے شیخ محدث روپڑی کے ایک فتویٰ کی طرف توجہ بھی مبذول کرائی ہے۔ اس سے یہ تاثر قائم کرنا مقصود ہے کہ وہ ناخن پالش کے جواز کے قائل ہیں۔ اس کے باوجود کہ ان کے طریقہ استدلال سے خود مطمئن نہیں کہ ناخن پالش کو مہندی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ معلوم نہیں کہ فتویٰ ہذا پر پھر ان کو اطمینان کیسے حاصل ہو گیا؟ وضاحت کر دیتے تو ممکن ہے میرے لئے بھی موجب اطمینان بن جاتا۔ حالانکہ اکثر و بیشتر حالات میں دلائل کی بنیاد پر ان کا فتویٰ میرے لئے تسکین و تسلی کا باعث ہوتا ہے، یہاں دلیل کے مفقود ہونے کی بنا پر میں نے اس کو ترک کر دیا ہے۔ بہر

[1] (٦٩٣) صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب المتفلجات للحسن (٥٩٣١). صحيح مسلم، كتاب اللباس، باب تحريم فعل الواصلة والمستوصلة والمغيرات خلق الله (٥٥٧٣).

صورت میرے تفصیلی فتویٰ سے جن چند باتوں پر موصوف معترض ہیں مع جوابات ملاحظہ فرمائیں۔

فرماتے ہیں جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ناخن پالش کی موجد یورپ کی فحش اور گمراہ خواتین ہیں تو باوجود تلاش بسیار کے مجھے اس بارے میں کوئی قابل اعتماد روایت نہیں مل سکی۔

جواباً عرض ہے کہ عالم اسلام کے اس وقت مشہور محقق و عظیم محدث شیخنا علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ جو اصلاً یورپی النسل ہیں۔ اپنی مشہور معروف تالیف: ''آدَابُ الزِّفَافِ فِی السُّنَّةِ الْمُطَهَّرَةِ'' میں رقمطراز ہیں:

" هٰذِهِ الْعَادَةُ الْقَبِيحَةُ الْأُخْرٰى الَّتِىْ تَسَرَّبَتْ مِنْ فَاجِرَاتِ أُوْرُبَّا إِلٰى كَثِيرٍ مِّنَ الْمُسْلِمَاتِ وَهِيَ تَدْمِيْهِنَّ لِأَظْفَارِهِنَّ بِالصَّمْغِ الْأَحْمَرِ الْمَعْرُوْفِ الْيَوْمِ "مينكور"

(ص۔۱۱۵-۱۱۶،ط۳)

یعنی '' یہ دوسری وہ قبیح عادت ہے جو یورپ کی بدکار عورتوں سے بہت ساری مسلمان عورتوں میں سرایت کر چکی ہے اور وہ ہے سرخ گوند کے ساتھ ان کا اپنے ناخنوں کو رنگنا۔ آج کے دور میں اسے ''مینکور'' کہا جاتا ہے'' (امید ہے اہل یورپ کے گھر کی شہادت موجب اطمینان ہوگی۔''

پھر فرماتے ہیں: میں نے اپنے طور پر ناخن پالش کے اجزاء ترکیبی پر بھی نگاہ ڈالی ہے اس میں عام طور پر عام قسم کی اشیاء اور خوشبوجات استعمال کی جاتی ہیں۔ ان میں کوئی حرام شے شامل نہیں۔ آنجناب کو اس سلسلہ میں میرا مشورہ ہے بجائے خود تحقیق کرنے کے جو کمپنیاں اور کارخانے شب و روز اس کاروبار میں مصروف کار ہیں ان کے ذمہ داران حضرات سے رابطہ کر کے معلومات کاملہ حاصل کریں۔

توقع ہے اس طرح ہمارے اختیار کردہ نظریہ کی تائید ہوگی اور اگر بالفرض آپ کے حاصل کردہ حقائق اس کے منافی ہوئے تو مجھے رجوع میں کوئی عار نہیں ہوگی بلکہ میرے لئے باعث افتخار اور آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ نیز فرماتے ہیں:

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ وضو کے سلسلہ میں یہ واضح ہے کہ ناخن پالش سے رنگے ناخنوں تک پانی نہیں پہنچتا، آج کل مارکیٹ میں بے شمار قسم کے محلول دستیاب ہیں جو پانی کی طرح ناخن پالش کو اتار دیتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ خاتون ناخن پالش استعمال کرنا چاہے وہ ساتھ محلول بھی خریدے تا کہ نماز کے

وقت اس کا وضو درست ہو سکے۔ پھر پانچ وقتی نماز کے لئے اس کا التزام عادۃً نہایت دشوار ہے۔ دوسری طرف دولت کا ضیاع ہے۔ جس سے نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے:

« نَهٰى عَنْ إِضَاعَةِ الْمَالِ » ❶

ناخن پالش کو بار بار لگانا اور بار بار اتارنا کیا مال و دولت کا ضیاع نہیں ہے؟ کوئی بھی ذی شعور اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ اللہ رب العزت ہم سب کو سمجھ عطا فرمائے۔ آمین!

اخیر میں امید ہے آپ مجھے ناخن پالش کی جملہ اقسام کے بارے میں دستاویزی ثبوت فراہم کر کے ممنون فرمائیں گے۔

سوال: اسلام میں ذات پات کی کوئی تقسیم ہے؟ نیز پیشے کی بناء پر اسلام میں عزت و شرف اور ذلت اور رسوائی ہے؟

جواب: اسلام میں ذاتوں کی تقسیم ان معنوں میں تو موجود ہے کہ آپس میں جان پہچان کا ذریعہ بن سکے لیکن ایسی ذات جو تَفْرِيْقٌ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ کا سبب بنے اس کا وجود نہیں ہے۔ آپس میں رشتے قائم کرنے کی بنیاد محض عقائدی اتفاق اور اخوت اسلامی ہونا چاہیے۔ لوگوں کو مختلف طبقات میں تقسیم کر کے اس بنیاد پر سلوک روا رکھنا ہندوانہ تصور ہے۔ مدعیان کتاب و سنت کا اولین فرض ہے کہ معاشرہ میں موجود برائیوں اور قباحتوں کے خلاف جہاد کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔

سوال: کیا ایک شخص اگر خاندان میں اکیلا اہل حدیث ہوا ہو وہ انتظار کرے کہ اس کے معیار کے لوگوں میں رشتہ کرے۔ کیا رشتہ داری کے لئے برہمن اور اچھوت اور شودر کا تصور اسلام دیتا ہے؟

اگر یہ سب کچھ اسلام میں نہیں تو اہل حدیث میں یہ امراض کیوں ہیں۔ اس کے خلاف تحریک جو کہ صرف اہل حدیث کو چلانی چاہیے کیوں نہیں۔ کیوں کہ جب تک معاشرہ میں ذات برادریوں اور پیشوں کا ہندوانہ زہر موجود ہو گا۔ اسلام کا وہ انقلابی اثر نہ ہو گا۔ میں پنجاب اور سندھ کے لوگوں کا مطالعہ کرتا ہوں تو مجھے معاشرت کے لحاظ سے ان میں اور ہندوؤں میں فرق نظر نہیں آتا جب کہ عرب ممالک میں پیشے کو بالکل برا نہیں سمجھا جاتا۔ کویت کے سفیر کے نام کے ساتھ ''اَلنَّجَّار'' کا لفظ آتا ہے کئی مشہور لوگوں کے قبیلہ کا نام ''اَلْحَدَّاد'' ہے مگر وہاں وہ کوئی گھٹیا شمار نہیں ہوتے۔

---

❶ (٦٩٤) صحيح البخاري، كتاب الاستقراض، باب ما ينهى عن إضاعة المال (٢٤٠٨)، صحيح مسلم، كتاب الأقضية، باب النهي عن كثرة المسائل...... (٤٤٨١ إلى ٤٤٨٦).

جواب: سائل کے جذبات بڑے صحیح اور ٹھیٹھ اسلامی ہیں۔ کاش تمام مسلمان بالخصوص سب اہل حدیث انہی جذبات کے حامل اور ان کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے اہل ہو جائیں۔

سوال: ایسے تمام معاملات جو غیر شرعی ہوں، ان میں والدین کا حکم مانا جائے یا نہ؟

جواب: جملہ امور میں والدین کی اطاعت واجب ہے بشرطیکہ اوامر شریعت کے مخالف نہ ہوں۔ حدیث میں ہے:

« لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ .»[1] (بخاری)

یعنی ''خالق کی نافرمانی کر کے مخلوق کی اطاعت نہ کرو۔''

سوال: مقام خاص کی بدنظری، بوس وکنار، زنا، لواطت کیا یہ صرف حقوق اللہ میں داخل ہیں؟ کیا متعلقین سے معافی کا تعلق نہیں ہے؟ کیونکہ متعلقین سے معاف کرانا فتنہ کا باعث ہے۔

جواب: مخصوص حالات میں صدق دل سے توبہ کر لی جائے تو کافی ہے۔

سوال: میرے بھائی کا ایک بیٹا ۱۵سال کا ہے اور دو بیٹیاں ۱۰-۸سال کی ہیں۔ ہمارا سارا گھرانہ حتیٰ کہ دونوں بچیوں تک نماز پانچ وقت باقاعدگی سے پڑھتی ہیں لیکن میرا بھتیجا جو ۱۵سال کا ہے نماز باقاعدگی سے نہیں پڑھتا دن میں ایک یا دو نمازیں ڈانٹ ڈپٹ کر یا مار کر پڑھاتے ہیں چھوٹی بہنوں کو نماز پڑھتے دیکھ کر شرمندہ نہیں ہوتا۔ کوئی دعا یا دم بتائیں جو اس پر اثر انداز ہو؟

جواب: اس بچے کو سورۃ الفاتحہ پڑھ کر دم کر دیا کریں، اس سے ان شاء اللہ جذبۂ نیکی پیدا ہوگا۔ مزید کوشش کریں کہ وقتاً فوقتاً یہ کسی موحد عالم یا نیک صالح آدمی کے پاس بیٹھا کرے اس سے قلبی جلاء کے علاوہ باطنی کیفیت بدل کر تعلق باللہ مضبوط ہوگا۔ ان شاء اللہ۔

سوال: شادی میں لین دین، اساتذہ کا شاگرد سے معاوضہ اور تحائف کی امید اور مال پر نظر کا ہونا۔ ان چیزوں کا شرعی حکم درکار ہے؟

جواب: بموقعہ شادی لین دین طبعی خوشی میں شامل ہے۔ شریعت میں ممانعت وارد نہیں۔ اسی طرح اساتذہ

---

[1] (٦٩٥) صححه الألباني. أحمد ٦٦/٥ (٢٠٥٣١) شاكر وحمزه ،الطبراني فى الكبير (١٦٥/١٨) (٣٦٧) و (٢٠٨/٣) (٣١٥٠)، مجمع الزوائد (٢٢٦/٥) وقا ل: رواه البزاروالطبراني فى الكبير ورجا ل البزار رجال الصحيح، الصحيحة (١٧٩)، صحيح الجامع الصغير (٧٥١٩).

کرام کا اپنے شاگردوں سے تحفے تحائف وصول کرنا بھی طبعی خوشی کے زمرہ میں آتا ہے تاہم اساتذہ کو اس سلسلہ میں طلبہ کو مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ ❶

✿✿✿✿✿✿✿

❶ شادی کے موقعے پر جو لین دین ہوتا ہے جسے نیوتا کہا جاتا ہے، اس کی ابتداء تو بظاہر اچھے مقاصد ہی کے لئے ہوئی ہوگی کہ تمام رشتے داروں کی طرف سے تعاون حاصل ہو جاتا اور غریب آدمی کو مالی سہارا مہیا ہو جاتا ہے۔
اس کا جواز صرف اس صورت میں تو شک وشبہ سے بالا ہے کہ دینے والا صرف تعاون یا تحفہ کی نیت سے دے۔ واپسی کی نیت سے نہ دے لیکن اب یہ صورت تعاون یا تحفہ سے بڑھ کر سودی قرض کی سی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اب دینے والا اس نیت سے دیتا ہے کہ میں ۱۰۰ روپیہ دوں گا تو میرے بیٹے یا بیٹی کی شادی پر اس سے دوگنا یا ڈیڑھ گنا مجھے واپس مل جائے گا۔ اور اگر کوئی اس طرح واپس نہیں کرتا تو اس پر برا منایا جاتا ہے اور اسے رقم ہضم کر جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یوں گویا تعاون کی جگہ سودی ذہنیت نے لے لی ہے اور یوں بلا تامل سود لیا اور دیا جا رہا ہے۔ اور نام اس کا تحفہ، ہدیہ یا سلامی ہے۔
بنابریں اس رواج کو اب بدلنے کی ضرورت ہے، اور اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ شادی کے موقعوں پر تحائف و ہدایا اور سلامی وغیرہ کا سلسلہ بالکل ختم کر دیا جائے۔ کوئی محتاج اور ضرورت مند ہو تو اسے بطور قرض حسنہ آسان شرائط پر رقم دی جائے (صلاح الدین یوسف)

فرمان رسول ﷺ

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَزَوَّجَهَا وَهِيَ بِنْتُ سِتٍّ وَأُدْخِلَتْ عَلَيْهِ وَهِيَ بِنْتُ تِسْعٍ وَمَكَثَتْ عِنْدَه تِسْعًا »

(بَابُ إِنْكَاحِ الرَّجُلِ وَلَدَهُ الصِّغَارَ)

﴿۳۱﴾ نکاح اور اس کے متعلقات

سوال: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا صدیقہ کا نکاح صحاح ستہ وغیرہ کتب میں درج ہے کہ سات سال کی عمر میں نکاح ہوا اور ۹ سال کی عمر میں رخصتی ہوئی۔ اس پر غیر مسلموں کو بھی اعتراضات ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَزَوَّجَهَا وَهِيَ بِنْتُ سِتٍّ وَ أُدْخِلَتْ عَلَيْهِ وَهِيَ بِنْتُ تِسْعٍ، وَ مَكَثَتْ عِنْدَه تِسْعًا » [1] (بَابُ إِنْكَاحِ الرَّجُلِ وَلَدَهُ الصِّغَارَ)

یعنی ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبی ﷺ کا نکاح بعمر چھ سال ہوا اور نو سال کی عمر میں رخصتی ہوئی اور آپ ﷺ کے پاس نو سال رہیں۔''

اب اس نص صریح کے بعد کسی بھی حیل و حجت کی گنجائش باقی نہیں رہنی چاہیے۔

جہاں تک معترضین کا اعتراض ہے کہ اتنی کم عمر میں نکاح کیسے ممکن ہے؟ جواباً گزارش ہے کہ دین اسلام نے عمر کے اعتبار سے نکاح پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ نص قرآنی سے یہ بات ثابت ہے کہ صغر سنی میں بھی نکاح ہوسکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاللَّائِي لَمْ يَحِضْنَ . ﴾ (الطلاق:٤)

''اور جن عورتوں کو ابھی حیض نہیں آنے لگا۔'' (ان کی عدت بھی تین ماہ ہے)

امام بخاری رحمہ اللہ مشار الیہ باب کے تحت فرماتے ہیں:

'' فَجَعَلَ عِدَّتَهَا ثَلَاثَةَ أَشْهُرٍ قَبْلَ الْبُلُوغِ . ''

یعنی ''اللہ عزوجل نے قبل از بلوغت عورت کی عدت تین ماہ مقرر فرمائی ہے۔''

---

[1] (٦٩٦) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب إنکاح الرجل ولده الصغار (٥١٣٣).

اس سے استمتاع کا جواز مترشح ہے۔

پھر واقعاتی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ نو دس سال کا بچہ بالغ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

«وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ.» [1] (سنن أبي داؤد، باب متى يؤمر الغلام بالصلوة)

یعنی "بچے دس سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کے بستر جدا کر دو۔"

ان الفاظ کی تشریح میں علامہ مناوی فتح القدیر شرح الجامع الصغیر میں رقمطراز ہیں:

"أَيْ فَرِّقُوا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ فِيْ مَضَاجِعِهِمُ الَّتِيْ يَنَامُوْنَ فِيْهَا إِذَا بَلَغُوْا عَشْرَ سِنِيْنَ حَذَرًا مِّنْ غَوَائِلِ الشَّهْوَةِ وَإِنْ كُنَّ أَخَوَاتٍ."

(بحواله عونُ المَعْبود ۱/۱۸۵)

یعنی "دس سال کی عمر میں بچوں کی خواب گاہوں کو علیحدہ کر دو۔ اس خدشہ سے کہ کہیں مبادیات شہوت کا اظہار نہ ہو۔ اگرچہ وہ بہنیں ہی کیوں نہ ہو۔"

اور صحیح بخاری کے بَابُ "بُلُوْغِ الصِّبْيَانِ وَشهادتهم" کے تحت ترجمۃ الباب میں ہے:

وَقَالَ مُغِيْرَةُ : اِحْتَلَمْتُ وَ أَنَا ابْنُ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ سَنَةً...... وَقَالَ الْحَسَنُ بْنُ صَالِحٍ :أَدْرَكْتُ جَارَةً لَنَا جَدَّةً بِنْتَ إِحْدٰى وَ عِشْرِيْنَ سَنَةً." [2]

"یعنی مغیرہ بن مقسم ضبی کوفی نے کہا: میں بارہ سال کی عمر میں بالغ ہو گیا تھا۔ اور حسن بن صالح بن حی ہمدانی فقیہ کوفی نے کہا: میں نے اپنے پڑوس میں ایک جدہ (نانی) کو پایا جس کی عمر اکیس سال تھی۔"

المجالسۃ دینوری میں ہے:

"وَ أَقَلُّ أَوْقَاتِ الْحَمْلِ تِسْعُ سِنِيْنَ."

"کم از کم حمل کی عمر نو سال ہے۔"

اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی ذکر فرمایا ہے کہ انہوں نے ۲۱ سال کی جدہ (نانی) دیکھی ہے۔

[1] (۶۹۷) قال الألباني " حسن صحيح ".صحيح أبي داؤد، كتاب الصلاة،باب متى يؤمر الغلام بالصلاة(۴۹۵).

[2] (۶۹۸) صحيح البخاري كتاب الشهادات،رقم الباب(۱۸).

نو سال مکمل ہونے پر اسے حیض آیا اور دس سال مکمل ہونے پر بچی پیدا ہوئی۔ اور اس کی بیٹی کا معاملہ بھی اسی طرح ہوا۔ نیز یہ بات بھی مشہور ہے کہ عبداللہ بن عمرو باپ بیٹے کی عمر کا تفاوت بارہ سال کا تھا۔

(فتح الباری ۲۷۷/۵)

اور صنعانی نے تیرہ سال ذکر کئے ہیں۔ (سُبُلُ السَّلَام ۴۵/۱)

فقیہ ابن رشد فرماتے ہیں:

" فَإِنَّهُمْ اتَّفَقُوا عَلٰى أَنَّهٗ يُحَرِّمُ مِنْ كُلِّ امْرَأَةٍ بَالِغٍ وَ غَيْرِ بَالِغٍ . " (بداية المجتهد ۳۹/۲)

''سب کا اتفاق ہے کہ بالغ اور نابالغ عورت کے دودھ سے حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔''

جملہ نصوص ذکر کرنے سے مقصود صرف یہ کہ قرائن وشواہد اس بات پر دال ہیں کہ نو دس سال کی عمر میں بچہ بالغ ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے نو سال رخصتی کی عمر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی بالغہ ہوں۔ بصورت دیگر پھر بھی شریعت میں انعقاد نکاح کا جواز موجود ہے۔ كَمَا تَقَدَّمَ۔ لہٰذا تعجب و استغراب کی چنداں ضرورت نہیں۔ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ،وَهُوَالْهَادِيْ لِلصَّوَابِ.

سوال: کسی عورت کا کہنا کہ میرا خاوند میرا سارا دودھ پی لیتا ہے۔ میرا بچہ بھوکا رہتا ہے۔ میرا نکاح باطل ہوا ہے کہ نہیں جائز صورت سے آگاہ فرمائیں؟

جواب: اس خاوند کا یہ فعل درست نہیں۔ تاہم اس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ راجح مسلک کے مطابق رضاعت کبیر بلا ضرورت معتبر نہیں۔ ملاحظہ ہو: (عَوْنُ الْمَعْبُود جلد دوم)

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین شغار کا نکاح یعنی وٹہ سٹہ کا نکاح جائز ہے یا نہیں اور جانبین سے مہر بھی مقرر کیا گیا ہے کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

جواب: ''نکاح وٹہ سٹہ'' ناجائز ہے چاہے درمیان میں مہر مقرر ہو یا نہ ہو۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے تقرر مہر کے باوجود تفریق کرا دی تھی۔ ❶ ملاحظہ ہو: (سنن أبي داود)

❀❀❀❀❀❀❀

❶ (٦٩٩) صححه الألباني. صحيح أبي داؤد، كتاب النكاح، باب في الشغار (٢٠٧٤) و(٢٠٧٥) حسنه الألباني.

فرمانِ باری تعالیٰ

﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾ (التَّوبة=۹:۵)

فرمانِ رسول ﷺ

« سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَیُّ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ وَ اَیُّ الْاَعْمَالِ خَیْرٌ؟ قَالَ : « إِيْمَانٌ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ » قِیْلَ : ثُمَّ اَیُّ شَیْءٍ؟ قَالَ: « الْجِهَادُ سَنَامُ الْعَمَلِ » قِیْلَ ثُمَّ اَیُّ شَیْءٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: « ثُمَّ حَجٌّ مَبْرُوْرٌ »

۳۲ جہاد و قتال

سوال: موجودہ زمانے میں جہاد سب پر فرض ہے یا نہیں؟ ''اگر ہے تو کیا اس کے لئے کوئی شخص ساری زندگی اس میں وقف کر سکتا ہے؟ یعنی باوجود وسائل کے وہ شادی نہ کرے یا جہاد کے لئے اپنے والدین سے اجازت نہ ملے؟

جواب: قرآنی آیات : ﴿ وَ أَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ .﴾ (الأنفال:٦٠) کے پیش نظر جملہ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ فوجی تربیت حاصل کریں اور ہمہ تن جہاد کے لئے تیار رہیں۔ بوقت ضرورت میدان معرکہ میں کود پڑیں۔ ساری زندگی جہاد کے لئے وقف کرنے کا اگر یہ مفہوم ہے کہ جملہ عزیز و اقارب کو خیر باد کہہ کر کلیۃً ان سے کٹ جائے یہ تو غیر درست ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ چند ماہ بعد مجاہدین کو رخصت پر بھیج دیا کرتے تھے تا کہ بیوی بچوں کے حقوق ادا کر آئیں۔ اور اگر اس سے مقصود ہمہ تن جہاد کے لئے استعداد پیدا کرنا ہے تو پھر واقعۃً درست فعل ہے بلکہ اس عملی جذبہ کا پایا جانا ضروری ہے۔ ورنہ ڈر ہے کہیں علامات نفاق پر موت واقع نہ ہو جائے۔

سوال: خلیج عرب میں امریکہ اور اس کے حواری ممالک کی افواج کئی سال قبل عراق کویت جنگ کے حوالے سے آئی تھیں اور ان کی آمد کا مقصد صرف سعودی عرب اور دیگر خلیجی ممالک کا تحفظ اور دفاع بتایا گیا تھا۔ عراق کویت جنگ کو ختم ہوئے کئی سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر یہ افواج نہ صرف ابھی موجود ہیں بلکہ امریکہ کے راہ نماؤں کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ یہ فوجیں امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے خلیج میں موجود ہیں اور وہ واپس نہیں جائیں گی۔

اسرائیل نے امریکہ کی مکمل پشت پناہی کے ساتھ بیت المقدس اور فلسطین پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے اور اب اس کی طرف سے مستقبل کے ''عظیم تر اسرائیل'' کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے اس میں دیگر ممالک کے ساتھ

"مدینہ منورہ" کو بھی اسرائیل کا حصہ دکھایا گیا ہے اور اب امریکی اتحادی افواج عراق پر بھی قبضہ کر چکی ہیں۔
اس پس منظر میں جناب رسالت مآب ﷺ کا مشہور ارشاد گرامی ہے: "جزیرہ عرب سے یہود و نصاریٰ کو نکال دو۔" ❶ کیا خلیج میں امریکی افواج کی موجودگی اس ارشاد مقدس کی صریح خلاف ورزی نہیں؟

جواب: موجودہ حالات میں مسلمانان عالم کا فرض ہے کہ باہمی اتفاق و اتحاد سے ہر ممکن طریقے سے یہود و نصاریٰ پر مشتمل امریکی افواج کو جزیرہ عرب سے نکالنے کی سعی کریں سستی اور کاہلی کی صورت میں تمام ذمہ داران رب العالمین کی عدالت عالیہ میں جوابدہ ہوں گے۔

اللہ رب العزت ہمیں فہم و بصیرت سے بہرہ ور فرمائے تاکہ اپنی آخرت کا تحفظ کر سکیں۔

❀❀❀❀❀❀❀

---

❶ (٧٠٠) صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب إخراج اليهود والنصارى من جزيرة العرب (٤٥٩٤). الترمذى (١٦٠٦)، (١٦٠٧) عن عمر بن الخطاب رضى الله عنه.

۳۳ ناچ، گانا، آلات موسیقی اوران کے متعلقات

سوال: مندرجہ ذیل احادیث جو گانے بجانے کے متعلق ہیں ان کی صحت کے بارے میں مطلع فرمائیں:

① حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گانے بجانے والیوں کی خرید وفروخت نہ کرو۔ اور نہ اس پیشہ کی تعلیم کرو، نہ اس کی تجارت کرو۔ اور اس (پیشہ) کی آمدنی کا مال حرام ہے۔ [1] (جامع ترمذی)

② عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گانا دل میں اس طرح نفاق پیدا کرتا ہے جس طرح پانی کھیتی کو اگاتا ہے۔ [2] (بیہقی)

③ آخر زمانہ میں اس امت کے کچھ لوگوں (کی شکلوں) کو مسخ کر کے بندر اور خنزیر بنا دیا جائے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! کیا وہ لوگ اس بات کی گواہی نہیں دیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں؟ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں! بلکہ وہ روزے بھی رکھتے ہوں گے، نماز بھی پڑھتے ہوں گے اور حج بھی ادا کرتے ہوں گے۔ کہا گیا کہ آخر ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کی وجہ کیا ہو گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ گانے بجانے کے

---

[1] (۷۰۱) حسنه الألباني،صحيح الترمذي، أبواب البيوع ،باب ما جاء في كراهية بيع المغنيات (۱۳۰۵) ،ابن ماجه (۲۱٦۸)، وقالت عائشة : لا يحل بيع المغنيات ولا شراؤهن......الخ ،إتحاف الخيرة المهرة(۳٦٦۷) للبوصيري وسكت عليه.

[2] (۷۰۲) صححه الألباني موقوفاً ،البيهقي (۲۲۳/۱۰) السنن) مرفوعاً وموقوفاً. عبد الرزاق (٤/۱۱) (۱۹۷۳۷) عن إبراهيم قال هكذا . تحريم آلات الطرب للألباني (صـ۱۰،۱٤٥) وقال: هكذا قال ابن قيم في إغاثة اللهفان (۲٤۸/۱) يعني موقوفاً .

آلات، دف اور ناچنے گانے والیاں اپنا لیں گے۔ پھر شراب اور کھیل تماشا میں اپنی رات گزاریں گے اور اس حال میں صبح کر دیں گے کہ ان کی صورتوں کو مسخ کر کے بندر اور خنزیر بنا دیا جائے گا۔''[1] (إغاثة اللهفان، ج:۱)

جواب: گانے بجانے کی حرمت کے بارے میں وارد روایات اور آثار و اقوال بعض صحیح، بعض حسن اور بعض مجموعہ کے اعتبار سے قابل حجت ہیں۔ اس سلسلہ میں امام ابن حزم رحمہ اللہ کی سعی لا حاصل ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب: (إسکات الرعاع فی تحریم الغناء والسماع، مؤلف محمد أحمد باشمیل)

صورت سوال میں مشارالیہ روایات قطع نظر تفصیل کے قابل حجت و استناد ہیں۔ (وَاللّٰهُ أَعْلَمُ)

سوال: گانا بجانا، ریڈیو، ٹی وی یا ٹیپ ریکارڈ پر سننے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جہاں تک میں سوچتا ہوں جس چیز کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پسند نہیں کرتے۔ اس کو شیطان پسند کرتا ہے تو نادانستگی میں ہم شیطان کو خوش کرتے ہیں جو اس کی عبادت ہوتی ہے تو کیا یہ شرک ہی کی کوئی قسم تو نہیں؟

جواب: بلاشبہ اتباع ھوٰی (خواہش کی پیروی کرنا) شرک کی اقسام سے ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ ﴾ (الفرقان:۴۳)

''کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے۔''

سوال: کیا قوالی سننا اسلام میں جائز ہے یا نہیں؟

جواب: قوالی سننا ناجائز ہے کیونکہ یہ ﴿لَهْوَ الْحَدِيثِ﴾ میں داخل ہے۔ اس سے مراد گانا بجانا۔ اس کا سازوسامان اور آلات وموسیقی اور ہر وہ چیز جو انسان کو خیر اور معروف سے غافل کر دے۔ ملاحظہ ہو: (اوائل سورہ لقمان)[2]

❀❀❀❀❀❀❀

[1] (۷۰۳) صحيح البخاري، كتاب الأشربة، باب ما جاء فيمن يستحل الخمر و يسميه بغير اسمه (۵۵۹۰)، ابن ماجه، الفتن (۴۰۲۰)، الترمذي، الفتن (۲۲۱۲)، أحمد (۳۴۲/۵).

[2] (۷۰۴) بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں حمدیہ اور نعتیہ اشعار پڑھے جاتے ہیں اس لئے کوئی حرج نہیں لیکن مروجہ قوالی میں آلات موسیقی، سرنگی، باجا، ڈھول طبلہ اور تالیاں بجائی جاتی ہیں جن کو قرآن کریم میں مشرکین کی ←

← نماز قرار دیا گیا ہے:
﴿ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَّ تَصْدِيَةً﴾ (الأنفال:٣٥) اس اعتبار سے مشرکین عرب کے ساتھ مشابہت بھی ہو جاتی ہے جس کے متعلق ارشاد نبوی ﷺ ہے: ((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ))(حسنه و صححه الألبانى،صحيح أبي داؤد، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة (٤٠٣١)،الارواء(١٢٦٩)، المشكاة (٤٣٤٧). اسی طرح یہ فعل مقصد بعثت کے بھی خلاف ہے۔ جبکہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے: ((إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُكَسِّرَ الْمَزَامِيرَ))(عبد الشکور مدنی عفی اللہ عنہ) (الغيلانيات لأبى بكر محمد بن عبد الله البزار، رقم(٨٠) عن على رضى الله عنه بلفظ بعثت بكسر المزامير ......الخ و فيه موسى بن عمير القرسى مولاهم ابو هارون الكوفى الأعمى متروك ، كذبه أبو حاتم، التقريب (٧٠٤٦) (مجھے آلات موسیقی توڑنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔)(فائدہ) طبلہ حرام ہے دیکھیے: احمد (٢٨٩/١)، البيهقى(٢١٣/١٠)، و حسنه الالبانى كما فى تحريم آلات الطرب (ص:٥٦) گھنٹی کو "مزمار الشیطان" کہا: صحيح ابوداؤد للألبانى(٢٠٥٤ إلى ٢٠٥٦) "شیطان کا باجا" اور مزمار کو ملعون کہا ، البزار (٣٧٧/١، ٧٩٥، كشف الاستار) .

فرمانِ باری تعالیٰ

﴿إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا إِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ.﴾

(بنیٓ إسرآئیل:٢٦)

فرمانِ رسول ﷺ

« نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُسْكِرِ وَالْمُفْتِرِ.» (أبوداؤد)

۴۳ مسکرات ونشہ آور اشیاء اوران کا شرعی حکم

سوال: حقہ اورسگریٹ نوشی حلال ہے یا حرام؟

جواب: حقہ اورسگریٹ پینا مختلف وجوہ کی بناء پر حرام ہے۔

1 اس میں اسراف ہے۔قرآن میں ہے: ﴿ إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا إِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ.﴾(بنی إسرائیل:٢٦) یعنی اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔جس شے سے انسان شیطان کا بھائی بنے۔اگر وہ حرام نہ ہو تو اورکونسی شے حرام ہوگی۔ پھر قرآن میں اسراف سے نہی بھی وارد ہے۔فرمایا:﴿ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا .﴾ (بنی إسرائیل:٢٦) یعنی اسراف بالکل نہ کرو۔نہی تحریم کے لئے ہوتی ہے۔

2 حدیث میں ہے:

«نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُسْكِرِ وَالْمُفْتِرِ .» [1] (أبو داؤد)

''یعنی رسول ﷺ نے نشہ والی شی سے اور جس سے دماغ میں فتور پیدا ہو، نہی کی ہے۔''

بلاشبہ حقہ اورسگریٹ پینے سے دماغ میں فتور پیدا ہوتا ہے،لہٰذا یہ حرام ہے۔

3 متعدد احادیث میں کچا پیاز یا لہسن کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت وارد ہے۔[2] دوسری روایت میں ہے۔جس شے سے بنی آدم ایذا پاتے ہیں اس سے فرشتے بھی ایذا پاتے ہیں۔[3] ظاہر ہے حقہ سگریٹ

---

[1] (٧٠٥) ضعفه الألباني،ضعيف أبي داؤد ،كتاب الأشربة ،باب ماجاء في السكر(٣٦٨٦) والضعيفة (٤٧٣٢) ،ضعيف الجامع الصغير (٦٠٧٧) ،المشكاة (٣٦٥٠).

[2] (٧٠٦) صحيح البخاري ،كتاب الأذان ،باب ما جاء في الثوم والبصل والكراث (٨٥٣إلى٨٥٦) عن جابر وأنس وابن عمر رضي الله عنهم ،والارواء (١٥٥/٨، ١٥٦) صحيح أبي داؤد (٣٨٢٤إلى٣٨٢٧) عن أبي سعيد وحذيفة والمغيرة بن شعبة رضي الله عنهم . المشكاة (٧٣٦).

[3] (٧٠٧) ایضاً

پینے والے کے پاس بیٹھنے سے ہر ذی شعور فرد کو تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ بالخصوص وہ لوگ جو اس قبیح عادت سے مبرا ہیں دیکھیے ان کا کیا حال ہوتا ہے۔ الفاظ میں اس کی تصویر مشکل امر ہے۔

سوال: کیا حقہ اور سگریٹ نوشی اسلام میں حلال ہے یا حرام؟

جواب: حقہ سگریٹ تین وجوہات کی بنا پر حرام ہیں:

① یہ معاشرۃً ایک غلط عادت ہے جو بلا فائدہ محض دیکھا دیکھی شروع کی جاتی ہے۔ بعد میں چھوڑنا محال ہو جاتا ہے۔

﴿ إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا إِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ . ﴾ (بنی إسرائیل:۲۷)

''اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔''

ظاہر ہے کہ جس شئی کے استعمال سے انسان شیطان کا بھائی قرار پائے وہ حرام ہی ہوگی۔ پھر قرآن میں اسراف سے بھی منع فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا . ﴾ (بنی إسرائیل:۲۷) ''اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ۔'' اس سے بھی حرمت ثابت ہوگی۔

② حقہ یا سگریٹ وغیرہ میں سخت قسم کی بدبو ہے۔ حدیث میں ہے جس شے سے بنی آدم ایذا پاتے ہیں اس سے فرشتے بھی ایذا پاتے ہیں۔ [1] یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کچا پیاز یا لہسن کھا کر مسجد میں آنے سے منع فرمایا ہے۔ [2]

③ سنن ابوداؤد میں حدیث ہے:

« نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْمُسْكِرِ وَالْمُفْتِرِ.» [3]

یعنی ''رسول اللہ ﷺ نے نشہ آور اور جس شئی سے دماغ میں فتور پیدا ہو نہی کی ہے۔''

فتور کی تعریف میں صاحب القاموس فرماتے ہیں:

''فَتَرَفُتُوْرًا وَ فِتَارًا سَكَنَ بَعْدَ حِدَّةٍ وَلَانَ بَعْدَ شِدَّةٍ . ''

یعنی ''تیزی کے بعد ٹھہر گیا اور سختی کے بعد نرم ہو گیا۔''

---

[1] (۷۰۸) مسلم، کتاب المساجد، باب نهی من أکل ثومًا أو بصلًا......(۱۲۵۲-۱۲۵٤) .

[2] (۷۰۹) تخریج کے لیے دیکھیے اسی باب کی حدیث نمبر (۱) .

[3] (۷۱۰) تخریج کے لیے دیکھیے اسی باب کی حدیث نمبر (۲) .

اور تاج العروس شرح قاموس میں ہے:

" وَعَلَيْهِ يُحْمَلُ الْحَدِيْثُ « نَهٰى عَنْ كُلِّ مُسْكِرٍ مُفْتِرٍ »، وَالْمُسْكِرُ الَّذِىْ يُزِيْلُ الْعَقْلَ وَالْمُفْتِرُ الَّذِىْ يُفْتِرُ الْجَسَدَ إِذَا شَرِبَ » أَىْ يُحْمِى الْجَسَدَ وَ يَصِيْرُ فُتُوْرًا ."

یعنی "حدیث « نَهٰى عَنْ كُلِّ مُسْكِرٍ وَ مُفْتِرٍ......» کے یہی معنی ہیں پس مسکروہ ہے جو عقل کو زائل کردے، مُفتِر وہ ہے جو جثہ کو گرم کردے اور فتور پیدا کردے۔"

اور مجمع البحار میں ہے:

" هُوَالَّذِىْ إِذَا شَرِبَ أَحْمَى الْجَسَدَ وَ أُرِىَ فِيْهِ فُتُوْرٌ وَهُوَ ضُعْفٌ وَ انْكِسَارٌ. "

یعنی "مفتروہ ہے کہ جب پئے تو جثہ کو گرم کردے اور اس میں فتور پیدا ہو جائے۔فتور کمزوری اور شکستگی کو کہتے ہیں۔"

سب لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ شارب حقہ اور سگریٹ وغیرہ کو اس کیفیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان دلائل سے معلوم ہوا کہ بالا چیزیں مطلقاً حرام ہیں۔

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (فتاوی اہل حدیث ۳۱۸/۳-۳۲۰) لشیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ۔

سوال: چھالیہ،نسوار کھانا یا سگریٹ پینا شرعی لحاظ سے کیسا ہے؟ جب کہ ان اشیاء کو کھانے یا پینے والے عموماً بسم اللہ پڑھ کر کھانے پینے کا اہتمام نہیں کرتے اور نہ ہی بیٹھ کر ایک جگہ کھاتے پیتے ہیں بلکہ زیادہ تر چلتے پھرتے اور کھڑے کھڑے پان وغیرہ کھاتے اور سگریٹ نوشی کرتے ہیں؟

جواب: سگریٹ پینا یا ہر وہ شئی استعمال کرنا، جس میں تمباکو یا کسی نشہ آور شے کی آمیزش ہو۔ یہ حرام ہے۔ کیونکہ یہ مفتر و مسکر میں داخل ہے جس سے حدیث میں منع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کا جواز ہے بشرطیکہ کھانا پینا شرعی آداب کے مطابق ہو۔ عام حالات میں مباح شے کو بیٹھ کر کھانا پینا سنت ہے۔ الایہ کہ کوئی عارضہ لاحق ہو تو کھڑے ہو کر بھی کھایا پیا جا سکتا ہے۔اس طرح کھانے پینے سے پہلے "بسم اللہ" بھی پڑھنی چاہیے۔

سوال: ماموں کانجن سے نکلنے والا دسمبر ۱۹۹۵ء کا شمارہ تعلیم الاسلام صفحہ نمبر ۲۷ پر شیخ الحدیث حضرت مولانا حافظ بنیامین صاحب ﷾ نے ہومیو پیتھک میں الکحل کے استعمال کی وضاحت کرتے ہوئے ہومیو پیتھک دوائیوں کو استعمال میں نہ لانے کا مشورہ دیا ہے آج کل ایلو پیتھک اور دیسی دواؤں کی بجائے لوگوں کا رجحان ہومیو پیتھک کی طرف زیادہ ہے، اسکے بارے میں مزید وضاحت چاہتا ہوں؟

جواب: ہومیو پیتھک دوائیوں کے استعمال کے عدم جواز پر میرا ایک تفصیلی فتویٰ ہفت روزہ (''الاعتصام'' لاہور، جلد ۴۷ شمارہ ۳۵) میں شائع ہو چکا ہے اس کی طرف رجوع فرمائیں۔ امید ہے تشفی کا باعث بنے گا۔ ان شاء اللہ۔

سوال: کسی دوائی میں اگر الکحل کی آمیزش ہو تو ایسی دوائی کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

جواب: شراب سے تیار شدہ دوائی کا استعمال مطلقاً ممنوع ہے۔ چاہے علاج معالجے کے طور پر ہو یا غذائیت حاصل کرنا مقصود ہو چنانچہ صحیح مسلم میں حدیث ہے: طارق بن سوید رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے اس کو منع کیا۔ اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں صرف دوائی کے لئے شراب تیار کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ دوا نہیں بلکہ داء (بیماری) ہے۔'' [1]

❀❀❀❀❀❀❀

[1] (۷۱۱) صحیح مسلم، کتاب الأشربة، باب تحریم التداوی بالخمر (۵۱٤۱).

۳۵ گناہ، جرائم اور ان کے متعلقات

سوال: کسی شخص کو اس کے گناہ یاد آئیں اور اسے لذت محسوس ہو تو اسے کیا کرنا چاہیے کہ اس کو گناہ یاد نہ آئیں یا یاد آئیں تو شرمندگی اور ندامت محسوس ہو۔ جب کہ وہ ان گناہوں سے توبہ کر چکا ہو؟

جواب: سابقہ گناہ یاد آنے پر کثرت سے استغفار پڑھنا چاہیے۔

سوال: ہم نے اپنے لئے ایک نیا مکان بنایا ہے۔ وہ گاؤں سے باہر ہے۔ وہاں پر بجلی کا انتظام نہیں ہے۔ ہم وہاں پر بجلی لے جانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ کام بغیر رشوت کے نہیں ہوسکتا۔ واپڈا والے ہم سے دس ہزار روپے مانگ رہے ہیں۔ بجلی لے جانا ایک جائز چیز ہے۔ اس کے لئے دس ہزار روپے دینا کیا گناہ ہے؟ اور حدیث میں آیا ہے کہ رشوت دینے والا اور لینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ یہ پیسے دینے سے اس کا گناہ دونوں پر عائد ہوتا ہے یا کسی ایک پر؟

جواب: بعض اہل علم اس بات کے قائل ہیں کہ اپنا حق وصول کرنے کے لئے کچھ دینا جائز ہے۔ دینے والا بری اور لینے والا مجرم ہے۔[1] ملاحظہ ہو: (سُبُلُ السَّلَام شَرح بُلُوغِ الْمَرَام)

سوال: کیا یہ بات درست ہے کہ قاتل و مقتول دونوں دوزخی ہیں۔ اس لئے کہ مقتول کا ارادہ تھا کہ مجھے موقعہ ملا تو میں ماروں گا، لیکن اس کو موقعہ نہ مل سکا۔ وہ خود قتل ہو گیا۔ چونکہ وہ اسے قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس لئے وہ دونوں دوزخی ہونگے؟

جواب: یہ روایت صحیح ہے۔[2] ملاحظہ ہو: (صحیح بخاری، کتابُ الْفِتَنِ، بَابٌ إِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا)

سوال: چوہا مارنے کے لئے ایک آلہ (کڑکی یا پنجرہ) استعمال کیا جاتا ہے جس میں خوراک فراہم کی جاتی

---

[1] (۷۱۲) سبل السلام، کتاب القضاء، شرح الحدیث (۱۳۱۳، ۱۳۱۴).

[2] (۷۱۳) صحیح البخاری، کتاب الفتن، باب إذا التقى المسلمان بسیفهما (۷۰۸۳) والإیمان (۳۱)، صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب إذا تواجه المسلمان......(۷۲۵۲)

ہے یا چوہے کو مارنے کے لئے بعض دوائیں گولیوں کی شکل میں ملتی ہیں جس سے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے، سوال یہ ہے کہ اس میں دھوکہ دہی کا پہلو تو نہیں نکلتا جس سے آدمی پر گناہ لازم آتا ہو؟

جواب: چوہے کو ہر ممکن طریق سے ہلاک کیا جا سکتا ہے کیونکہ حدیث میں اس کو فاسق قرار دیا گیا ہے۔[1] جو حل وحرم میں ہر صورت مباح الدم ہے۔

عون المعبود ۴/۵۳۴ میں ہے:

"أَیْ لَا حُرْمَةَ لَهُنَّ بِحَالٍ."

یعنی "چوہوں کے ساتھ قطعاً نرمی کا برتاؤ نہیں ہونا چاہیے۔"

سوال: جو مسلمان خودکشی کر لے کیا وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا؟ جیسے نبی ﷺ نے فرمایا:"

« مَنْ تَرَدّٰی مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ فِیْ نَارِجَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِیْهَا أَبَدًا وَ مَنْ تَحَسّٰی سَمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَسَمُّهُ فِیْ یَدِهٖ یَتَحَسَّاهُ فِیْ نَارِجَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِیْهَا أَبَدًا وَ مَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِحَدِیْدَةٍ ثُمَّ انْقَطَعَ عَلٰی شَیْئٍ خَالِدًا یَقُوْلُ کَانَتْ حَدِیْدَتُهُ فِیْ یَدِهٖ یُحَابُهَا فِیْ بَطْنِهٖ فِیْ نَارِجَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِیْهَا .» [2]

(نسائی شریف، حاشیة سندھی، صفحہ ۲۷۹، کتاب الجنائز باب ترک الصلوة علی من قتل نفسه)

جواب: خودکشی واقعی بہت بڑا جرم "خلود فی النار" کا موجب ہے مگر یہ کہ اللہ کو کوئی نیکی پسند آ جائے تو ممکن ہے نجات کا ذریعہ بن جائے جس طرح کہ ایک مہاجر کے بارے میں صحیح مسلم وغیرہ میں موجود ہے کہ اس نے تکلیف کی وجہ سے انگلیاں جوڑوں سے کاٹ دیں۔ خون بہہ نکلا، اس سے موت واقع ہو گئی۔ بعد میں ایک دوست سے بحالت خواب ملاقات ہوئی۔ دریافت کیا۔ کیا حال ہے؟ کہا میری ہجرت کی وجہ سے اللہ نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ کہا ہاتھ کیوں ڈھانپ رکھا ہے؟ کہا رب نے فرمایا: اس فعل کا ارتکاب چونکہ تو نے کیا ہے لہٰذا اسے خود ہی درست کرو۔ نبی ﷺ کو جب اس بات کا علم ہوا تو فرمایا:

---

[1] (۷۱۴) ((إن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: خمس من الدواب کلهن فاسق، یقتلن فی الحرم :العقرب والحدأ، والغراب والفارة والکلب العقور و فی روایة لمسلم یقتلن فی الحل والحرم......)) الخ صحیح البخاری، کتاب جزاء الصید، باب ما یقتل المحرم من الدواب (۱۸۲۹)،صحیح مسلم، کتاب الحج، باب ماینذب للمحرم وغیرہ قتله من الدواب فی الحل والحرم(۲۸۶۱).

[2] (۷۱۵)صحیح مسلم ،کتاب الإیمان ،باب من قتل نفسه بشیٔ عذب به فی النار (۳۰۰) والنسائی (۱۹۶۷).

«اَللّٰھُمَّ وَلِیَدَیْهِ فَاغْفِرْ.» [1]

''اے اللہ اس کے ہاتھوں کو بھی معاف فرما دے۔''

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ خودکشی کرنے والے کے لئے بخشش کی دعا ہو سکتی ہے۔

دوسرا قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ أَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ.﴾ (النساء:١١٦)

''اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کے چاہے معاف کر دے۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا شرک کے علاوہ جملہ گناہوں سے درگزر ممکن ہے۔ اس کے عموم میں خود کشی بھی شامل ہے اور جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے جو سائل نے ذکر کی ہے، اس کی تأویل طول مکث (زیادہ مدت رہنے) سے ممکن ہے جس طرح کہ قرآن مجید کی ایک آیت:

﴿وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیْهَا.﴾ (النساء:٩٣)

''اور جو شخص مسلمان کو قصداً مار ڈالے تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ (جلتا) رہے گا۔''

کی تاویل وتفسیر طول مکث یعنی عرصہ دراز سے کی گئی ہے۔

سوال: عاق نامہ بوجہ نافرمانی کی اصل صورت کیا ہے؟

جواب: عامۃ الناس کے ہاں ''عاق'' کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ کسی قریبی تعلق دار کو نافرمانی کی بناء پر وراثت سے محروم کر دینا لیکن شریعت کی نگاہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ شرع میں محرومیٔ اِرث کے اسباب معروف ہیں (ناحق قتل، اختلاف دین، غلامی) عاق کرنا ان سے نہیں لہٰذا اس بناء پر کسی بھی وارث کو وراثت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

سوال: رمضان المبارک میں ہر نیک عمل کا ثواب ستر درجے بڑھ جاتا ہے کیا اسی طرح گناہ میں بھی اضافہ ہوتا ہے اگر ہوتا ہے تو کیا یہ اس کی شان کریمی کے خلاف نہیں؟ اور رمضان کی برکات پر حرف نہیں آئے گا؟

---

[1] (٧١٦) انظر: الرقم المسلسل (٤٠٦).

جواب: رمضان میں نیکی کا اجر وثواب ستر گنا بڑھنے والی روایت سنداً اگرچہ ضعیف ہے [1] لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ صدق و اِخلاص کے اعتبار سے ایک نیکی بلا حساب تک جا پہنچتی ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

﴿ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ . ﴾ (الزمر:۱۰)

اہل تأویل وتفسیر نے ''صابرون'' کی تشریح روزہ داروں سے کی ہے۔

اور صحیح حدیث میں ہے:

« إِلَّا الصَّوْمُ فَإِنَّهُ لِيْ وَ أَنَا أَجْزِيْ بِهِ .» [2]

اور جہاں تک برائی کا تعلق ہے سو اس کے ارتکاب سے رمضان غیر رمضان میں اضافہ نہیں ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے:

« فَإِنْ هُوَ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً .» [3]

(صحیح بخاری، بَابُ مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ أَوْ بِسَيِّئَةٍ)

یعنی ''بندہ اگر گناہ کا قصد کر کے برائی کر گزرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے صرف ایک برائی درج کرتا ہے۔''

اور قرآن کریم میں ہے:

﴿ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴾ (الأنعام:۱۶۰)

''جو کوئی (اللہ کے حضور) نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی اور جو برائی لائے گا اسے سزا ویسی ہی ملے گی۔''

اور الأعرج کی روایت میں ہے:

---

[1] (۷۱۷)'' کل عمل ابن آدم یضاعف ، اَلْحَسَنَةُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ...... الخ '' صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب فضل الصیام(۲۷۰۷)، المشکاۃ التحقیق الثانی للالبانی(۱۰۹۱) الصحیح الترغیب (۵۷۵/۱)(۹۷۸).

[2] (۷۱۸) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب هل یقول :إنی صائم إذا شتم(۱۹۰۴).

[3] (۷۱۹) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، رقم الباب(۳۱)عن ابن عباس رضی الله عنهما.

« فَاكْتُبُوهَا لَهُ بِمِثْلِهَا .» ❶

اور صحیح مسلم میں ابوذر کی روایت میں ہے:

« فَجَزَاءُهُ بِمِثْلِهَا أَوْ أَغْفِرُ .» ❷

اور صحیح مسلم میں ابن عباس کی روایت کے اخیر میں الفاظ یوں ہیں:

«أَوْ يَمْحُوهَا . » ❸

مفہوم اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم یا توبہ یا استغفار یا اچھا عمل کرنے سے برائی کو مٹا دیتا ہے۔لیکن پہلا معنی حدیث ابوذر کے قریب تر ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ يُسْتَفَادُ مِنَ التَّاكِيدِ بِقَوْلِهِ وَاحِدَةً أَنَّ السَّيِّئَةَ لَا تُضَاعَفُ كَمَا تُضَاعَفُ الْحَسَنَةُ وَهُوَ عَلَى وَفْقِ قَوْلِهِ تَعَالَى:﴿فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا.﴾ "

یعنی" سیئۃ کے ساتھ واحدۃ کی تاکید سے یہ بات مستفاد ہے کہ برائی میں اضافہ نہیں ہوتا جس طرح کہ نیکی میں کئی گناہ اضافہ ہوتا ہے اور یہ اللہ کے فرمان:﴿ فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا.﴾ (الأنعام:١٦٠) کے عین مطابق ہے۔"

ابن عبدالسلام نے اپنی" أمالی" میں کہا تاکید کا فائدہ یہ ہے کہ یہاں اس شخص کا وھم رفع کرنا مقصود ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ انسان جب برائی کرتا ہے تو برا عمل اس پر لکھ دیا جاتا ہے اور قصد برائی بدی میں مزید اضافہ کا موجب ہوتا ہے۔

دراں حالیکہ معاملہ اس طرح نہیں، برائی صرف ایک ہی لکھی جاتی ہے۔ہاں البتہ بعض اہل علم نے حرم مکی میں برائی کے ارتکاب کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اسحاق بن منصور نے کہا: میں نے امام احمد رحمہ اللہ سے دریافت کیا:

" هَلْ وَرَدَ فِي شَيْءٍ مِنَ الْحَدِيثِ أَنَّ السَّيِّئَةَ تُكْتَبُ بِأَكْثَرَ مِنْ وَاحِدَةٍ؟ قَالَ:لَا،مَا

---

❶(٧٢٠) صحيح مسلم،كتاب الإيمان،باب إذا هم العبد بحسنة(٣٣٦)، (تنبیہ) اعرج نہیں بلکہ ھمام بن منبہ کی روایت میں ہے۔

❷(٧٢١) صحيح مسلم،كتاب الذكر والدعاء،باب فضل الذكر والدعاء والتقرب إلى الله(٦٨٣٣).

❸(٧٢٢) صحيح مسلم(٣٣٩)فيه :" أو محاها الله " بدل " يمحوها ".

سَمِعْتُ إِلَّا بِمَكَّةَ لِتَعْظِيمِ الْحَرَمِ ."

"کیا کسی حدیث میں وارد ہے کہ برائی بھی ایک سے زیادہ لکھی جاتی ہے۔ جواباً فرمایا: میں نے یہ بات کسی سے نہیں سنی۔ ہاں البتہ حرم کی تعظیم و احترام کی خاطر مکہ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔"

تاہم جمہور زمان و مکان کے اعتبار سے عظیم کے قائل ہیں۔ لیکن بعض دفعہ شناعت کا تفاوت پایا جاتا ہے۔

اس پر یہ اعتراض وارد نہیں ہو سکتا کہ قرآن میں ازواج مطہرات کے بارے میں تو تضعیف عذاب کی نص موجود ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَن يَأْتِ مِنكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ.﴾ (الأحزاب :۳)

"تم میں سے جو کوئی صریح ناشائستہ الفاظ کہہ کر رسول اللہ ﷺ کو ایذاء دینے کی حرکت کرے اس کو دونی سزا دی جائے گی۔"

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نبی ﷺ کے حق کی عظمت کی بناء پر ہے۔ کیونکہ ازواج مطہرات سے فحش گوئی کا وقوع ایک زائد امر کا متقاضی ہے وہ ہے نبی ﷺ کی ذات گرامی کو اذیت دینا۔

(فتح الباری ۳۲۸/۱۱-۳۲۹)

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ برائی صرف ایک ہی برائی رہتی ہے اس میں اضافہ نہیں ہوتا۔ چاہے موسم رمضان ہو یا غیر لیکن ایام مبارکہ میں اس کے وقوع پر نکیر کا سختی سے اظہار کیا گیا ہے۔« يَابَاغِيَ الشَّرِّ أَقْصِرْ .» ❶ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ (وقال الترمذی: هذا حديث غريب)

دوسری روایت میں ہے:

« مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ أَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَ شَرَابَهٗ.» ❷ (صحیح بخاری، بابُ مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ)

امت مرحومہ پر اللہ رب العزت کا عظیم احسان ہے کہ ایک ایک نیکی میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ جبکہ بدی میں تعدی کے بجائے اسے اپنی جگہ بند رکھ کر توبہ و انابت کی دعوت عام دی تا کہ گناہ گار

---

❶(۷۲۳) صحيح الترمذي، أبواب الصيام، باب فضل شهر رمضان(۶۸۵). ابن ماجه(۱۶۴۲)للألباني.

❷(۷۲۴) صحيح البخاري، كتاب الصوم، باب من لم يدع قول الزور......(۱۹۰۳).

سیاہ کار بندے اس کی آغوش رحمت میں داخل ہو کر بہشت کے وارث بن سکیں۔ اسی بناء پر ترغیب دی گئی:

« مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيْمَانًا وَّ احْتِسَابًا غُفِرَلَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ، وَ مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَّ احْتِسَابًا غُفِرَلَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ.»[1] (صحیح بخاری کتاب الصیام)

اور جب اس کی مرضی ہو تو حقوق العباد کو بھی معاف فرما کر ظالم و مظلوم اور قاتل و مقتول دونوں کو خوش کر دیتا ہے۔

﴿ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ.﴾ (الأنبياء:٢٣)

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا .﴾ (الزمر:٥٣)

لہٰذا یہ اعتقاد رکھنا کہ رمضان المبارک میں نیکی کی طرح برائی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ بالا شرعی نصوص کے منافی نظریہ ہے۔ اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں کو برکات رمضان سے مستفید ہونے کی توفیق بخشے۔ آمین!

سوال: ہمارے ملک میں بعض سنگین جرائم کے ثبوت کے لئے وعدہ معاف گواہوں پر اعتماد کر کے دوسروں کو سزا دی جاتی ہے۔ حالانکہ اس کی گواہی خود جرم یا جرم میں تعاون کرنے کی بناء پر مشکوک اور ناقابل اعتماد بن جاتی ہے۔ وہ جرم میں نہ ملوث ہونے والے کسی دیگر پر بھی الزام عائد کر سکتا ہے یا جرم کے خلاف جرم کی سنگینی یا نرمی کی بلا جواز گواہی دینا اس سے بعید از قیاس نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ خود مجرم ہو اور قتل یا رجم جیسی سنگین سزا سے بچ نکلنے کے لئے کسی اور کو مجرم ٹھہرا دے۔ خیال ہے کہ ایسا گواہ عادل نہیں ہو سکتا۔ بایں ہمہ اگر وہ اپنے جرم کا من وعن اقرار بھی کر لیتا ہے تو کیا شرعی لحاظ سے وہ سزا کا مستوجب ہوگا یا نہیں؟ اور کیا حکام کو ایسا وعدہ کرنے اور اسے جرم کی سزا معاف کرنے کا حق حاصل ہے؟

جواب: وعدہ معاف گواہ کا دین اسلام میں کوئی تصور نہیں۔ اس کا صاف صاف مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ وعدہ معاف گواہ بہت بڑا مجرم ہونے کے باوجود خود ساختہ قانون کی نظر میں بڑا پاک صاف ہے۔ اگرچہ فی الواقع وہ ایسا نہ ہو۔ اس کی حیثیت موم کی ناک کی سی ہے۔ ارباب اقتدار جس طرف چاہیں موڑ لیں۔ اس کے ذریعے چاہیں تو غیر مجرم کو مجرم قرار دے دیں اور یہ سب سے بڑا ظلم ہے۔ قرآن میں واضح حکم ہے:

﴿ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ إِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ أَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى أَنْ تَعْدِلُوْا

[1] (٧٢٥) صحيح البخاري، كتاب الصوم، باب من صام رمضان إيمانا واحتسابا.......(١٩٠١) والإيمان ح(٣٥).

وَ إِنْ تَلْوُا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴾ (النساء:١٣٥)

''اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہتے ہوئے اللہ کے لئے سچی گواہی دو خواہ (اس میں) تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو۔ اگر کوئی امیر ہو یا فقیر تو اللہ ان کا خیر خواہ ہے۔ تو تم خواہش نفس کے پیچھے عدل نہ چھوڑ دینا۔ اگر تم پیچدار شہادت دو گے یا (شہادت سے) بچنا چاہو گے تو (جان رکھو) اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے''۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ دین و دنیا کی نعمتوں سے سرفراز ہونے کے لئے عدل و انصاف کا دامن کسی حالت میں نہیں چھوڑنا چاہیے۔ خواہ ظاہری حالات آدمی کے نامساعد ہی ہوں۔

مجرم کو اپنے کیئے کی سزا ہر صورت میں ملنی چاہیے۔ جب تک صاحب حق معاف نہ کرے۔ جرم معاف نہیں ہوتا، خواہ اس میں حکام عمل دخل کی سعی کیوں نہ کریں۔ حقوق العباد کا معاملہ نازک ہے۔ حکومت کا کام حقوق پر ڈاکہ ڈالنا نہیں بلکہ ہر حالت میں انصاف فراہم کرنا ہے۔ اللہ رب العزت جملہ اہل اسلام میں فہم و فراست پیدا فرمائے۔ آمین!

سوال: ایک آدمی نے امانت کے طور پر مدرسہ کے ریال تبدیل کرنے کے لئے مجھے دیئے اور وہ ریال میری کوتاہی کے بغیر میری جیب سے جیب تراش نے نکال لئے۔ مجھے اس کی کچھ خبر نہ ہوئی۔ بعد میں جب مجھے احساس ہوا تو بسیار تلاش کے باوجود وہ نہ مل سکے۔ منتظمین مدرسہ مجھ سے وہ ریال واپس طلب کرتے ہیں۔ میں غریب آدمی اور طالب علم بھی ہوں۔ ادائیگی کی طاقت نہیں رکھتا۔ میرے لئے قرآن وسنت کی روشنی میں کیا حکم ہے؟

جواب: حقائق اور واقعات سے اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ رقم کا ضیاع آپ کی کوتاہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس صورت میں آپ اس رقم کی ادائیگی کے ذمہ دار ہیں۔ اور اگر کوتاہی ثابت نہ ہو تو ریالات ادا نہیں کرنے پڑتے۔ کیونکہ اس کی حیثیت امانت کی ہے۔

سوال: ایک آدمی نے بھینس کے ساتھ زنا کیا ہے۔ آپ اس کے بارے میں بتائیں کہ اس کا کیا کیا جائے؟

جواب: چوپایہ کے ساتھ بدفعلی کے مرتکب پر مناسب تعزیر قائم کرنی چاہیے تاکہ اسے عبرت ہو اور مفعول بہ جانور کو قتل کی صورت میں تلف کر دیا جائے۔ تاکہ اس کی طرف عار منسوب نہ ہو اور اگر وہ جانور کسی غیر کا ہے تو فاعل پر اس کی قیمت کا تاوان ڈال دیا جائے۔ ظلم کو روکنے کی یہ ایک صورت ہے۔ تفصیل کے

لئے ملاحظہ ہو:(المغنی ابن قدامہ:۳۵۳-۳۵۱/۱۲)

سوال: گناہ اور جرم میں کیا فرق ہے؟ کیا گنہگار مجرم بھی ہوسکتا ہے اور مجرم گنہگار بھی یا بالفاظ دیگر کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک مجرم گنہگار نہ ہو۔ اور ایک گنہگار مجرم نہ ہو؟

جواب: گناہ ہر اس قول اور فعل کا نام ہے جس کا مرتکب گنہگار ٹھہرے۔ علامہ نواب صدیق الحسن خاں فرماتے ہیں:

" فَالِاثْمُ كُلُّ فِعْلٍ وَ قَوْلٍ يُوْجِبُ إِثْمَ فَاعِلِهِ وَ قَائِلِهِ ."

(نَيْلُ الْمَرَام مِنْ تَفْسِيْرِ آيَاتِ الْاَحْكَام ص۔ ۱۹۰)

نیز مسند احمد وغیرہ میں حدیث ہے:

« وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي الصَّدْرِ .» [1]

یعنی ''ہر وہ شئ گناہ ہے جس کے کرنے سے دل میں تردد پیدا ہو شاید کہ جائز نہ ہو۔''

دوسری روایت میں الفاظ یوں ہیں:

« وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِيْ نَفْسِكَ وَ كَرِهْتَ أَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ . » [2] (مسلم ترمذی وغیرہ)

یعنی ''ہر وہ شے گناہ ہے جس کے ارتکاب سے تیرے نفس میں کھٹکا گزرے اور تو اس کو مکروہ سمجھے کہ لوگ اس پر مطلع ہوں۔''

اور جہاں تک لفظ جرم کا تعلق ہے اس کا اطلاق کفر اور عصیان دونوں پر ہوتا ہے۔ تَفْسِيْرُ الْفُتُوْحَاتِ الْإِلٰهِيَّةِ ،(۷۹/۳) اور بعض دفعہ دونوں میں سے ہر ایک کا اطلاق دوسرے پر ہوسکتا ہے اس میں کوئی امر مانع نہیں۔ هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَاب.

سوال: (ا) ایک شخص کی حقیقی بیٹی عمر تقریباً چھ سات سال ہے۔ اس سے زیادہ نہیں ہے۔ رات کو باپ کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ باپ بری نیت سے (شہوت کی نیت سے) اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ بلکہ کپڑوں سمیت اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ جس سے کپڑوں کے اندر ہی منی خارج ہوگئی۔ اس حرکت کی وجہ سے اس کی بیوی

---

[1] (۷۲۶) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تفسیر البر والاثم(۶۵۱۶) ،احمد(۱۸۲/۴)(۱۶۵۶۳)

[2] (۷۲۷) صحیح مسلم، ایضاً (۶۵۱۷)، احمد(۱۸۲/۴)، (۱۷۵۶۴)، ابن حبان(۲۹۷)، الاحسان، الترمذی (۲۳۸۹)، فی الزهد، السنن الکبریٰ(۱۹۲/۱۰) للبیهقی، البغوی(۳۴۹۴).

اس پر حرام ہو گئی یا نہیں؟

(ب) ایک شخص کی بیٹی عمر تقریباً ۱۳، ۱۴ سال ہے۔ بالغ نہیں ہے۔ باپ باہر سے گھر آتا ہے سب بچے اسے ملتے ہیں۔ (دس بچے ہیں) بڑی بیٹی جب ملتی ہے تو دل میں برا خیال آ جاتا ہے۔ تین چار دفعہ ایسا ہوا ہے۔ اب بڑی بیٹی کو تو ملنا چھوڑ دیا ہے لیکن پہلے جو تین چار دفعہ ملنے سے دل میں برا خیال آیا اس کی وجہ سے اس کی بیوی اس پر حرام ہو گئی یا نہیں؟

جواب: ہر دو صورت میں اس فعل شنیع کے مرتکب کی بیوی اس پر حرام نہیں ہو گی۔ راجح اور محقق مسلک کے مطابق مس بالشھوۃ سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً مروی ہے:

« لَا يَفْسُدُ الْحَلَالُ بِالْحَرَامِ .» [1] (دارقطنی)

''یعنی'' حرام کے ارتکاب سے حلال شے فاسد نہیں ہوتی۔''

نیز ابن عمر رضی اللہ عنہما مرفوعاً بیان کرتے ہیں:

" لَا يُحَرِّمُ الْحَرَامُ الْحَلَالَ ." [2]

اَلتَّعْلِيقُ الْمُغْنِي میں ہے:

" وَإِسْنَادُهُ أَصْلَحُ مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ ."

یعنی ''اس حدیث کی سند حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے زیادہ درست ہے۔''

فتح الباری میں ہے:

" وَإِسْنَادُهُ أَصْلَحُ مِنَ الْأَوَّلِ ." (۱۵۶/۹)

واضح ہو کہ جمہور اہل علم کے نزدیک ارتکاب زنا سے بھی حرمت ثابت نہیں ہوتی تو پھر مس بالشھوۃ سے بطریق اولیٰ ثابت نہیں ہو گی۔ (ملاحظہ ہو: فتح الباری ۱۵۷/۹)

سوال: بندہ موضع پیال تحصیل وضلع قصور کا رہائشی ہے۔ اور شہد کی تجارت کا کاروبار کرتا ہے۔ کسی شخص کا

---

[1] (۷۲۸) ضعفه الألباني،السنن الكبرى (۱۶۹/۷) للبيهقي، دارقطني (۲٦٨/۳) (۳٦۳٦ إلى ۳٦۳۸) فيه عبدالرحمن الوقاصي وهو ضعيف، الضعيفة (۳۸۳/۱).

[2] (۷۲۹) ضعفه الألباني، ابن ماجه، كتاب الطلاق،باب لايحرم الحرام الحلال(۲۰۱۵) والضعيفة (۱۸۳/۱) (صـ۳۸۵، إلى۳۸۸)، وفي السنن الكبرى(۱٦۸/۷، ۱٦۹)فيه:عن ابن شهاب،قال:قال علي رضي الله عنه هكذا. وقال البيهقي:(هذا) المرسل صحيح.

شہد لگا ہوا چوری کر لیا گیا۔ اس شخص نے میرے اوپر بہتان اور الزام لگا دیا کہ شہد تو نے چوری سے اتار لیا ہے۔ حالانکہ میں نے حقیقتاً شہد چوری سے نہ اتارا تھا۔ میں نے اپنے طور پر اور پنچائتی طور پر اپنی بے گناہی کا ثبوت دینے کی پیش کش کی مگر یہ شخص نہ مانا۔ اس نے مجھے گندی اور فحش گالیاں دیں۔ اور میرے اوپر تشدد کیا۔ اس نے زبردستی میری داڑھی بھی مونڈھ ڈالی۔ بلیڈ والے استرے سے جو کہ ویسے بھی ناپاک تھا۔ اس طرح سے اس شخص نے سنت رسول ﷺ کی دھجیاں بکھیریں اور توہین کی۔ ساتھ ہی مجھے دھمکیاں دیں کہ تیرے ساتھ ابھی کم سلوک کیا گیا ہے۔ آئندہ ایسی غلطی کی تو کسی اور طریقہ سے سزا دیں گے۔

میں نے اس واقعہ کی اطلاع مقامی پولیس کو دے دی۔ پولیس نے اس شخص کے خلاف کارروائی کر کے پرچہ درج کر دیا۔ ملزم اب ضمانت پر رہا ہو چکا ہے۔ عدالت میں مقدمہ کی سماعت جاری ہے۔ اور کیس سماعت ہونے پر کیا سزا مجسٹریٹ صاحب دیں گے، مجھے معلوم نہیں۔

براہ مہربانی داڑھی مونڈنے، سنت رسول ﷺ کی توہین کرنے والے کے بارے میں شرعی فتویٰ دیں کہ اسلام کی رو سے ایسے شخص کی کیا سزا مقرر ہے؟

جواب: بظاہر واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشار الیہ شخص نے آپ کے ساتھ ظلم و زیادتی کی۔ یہاں تک کہ داڑھی سنت رسول اللہ ﷺ کی اہانت کا مرتکب ہوا۔ جرم ہذا مستوجب تعزیر ہے۔

مجاز افسر کے لئے ضروری ہے کہ اس ظالم کو مناسب حال ضرور سزا دے جو باعث عبرت ہو تا کہ آئندہ اسے خبث باطن کے اظہار کی جرأت نہ ہو سکے۔

''مشکوٰۃ'' باب الامر بالمعروف میں ہے: اگر کسی قوم میں کوئی گناہ ہوتا ہو اور وہ قوم ظالم کا ہاتھ پکڑنے پر قادر ہو پھر وہ نہ پکڑے تو اللہ کی طرف سے سب پر عذاب آئے گا۔[1]

سوال: ڈاک خانے کا لفافہ یا پوسٹل ٹکٹ جو مہر لگانے کے بعد ردی نہ ہوا ہو۔ دوبارہ استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ جب کہ اس کے استعمال میں کسی کا ذاتی نقصان نہیں ہے۔

جواب: بایں صورت فتویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ لفافہ یا پوسٹل ٹکٹ وغیرہ دوبارہ استعمال میں لانا جائز ہو۔ کیونکہ ترک استعمال اضاعت مال کو مستلزم ہے۔ حدیث میں اس بارے میں نہی وارد ہے:

---

[1] (٧٣٠) صححه الألباني، صحيح أبي داود، كتاب الملاحم، باب الأمر و النهي (٤٣٣٨ إلى ٤٣٣٩)، المشكاة (٥١٤٢)، ابن ماجه (٤٠٠٥).

« نَهٰى عَنْ إِضَاعَةِ الْمَالِ .» ❶

یعنی "نبی ﷺ نے مال ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔"

دوسری روایت میں ہے:

« وَ إِضَاعَةِ الْمَالِ. » ❷ (بخاری کتاب الأدب)

جب کہ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو دوبارہ استعمال نہ کیا جائے۔ کیونکہ بِالْقُوَّةِ یہ لفافہ وغیرہ استعمال ہو چکا ہے۔ غلطی مہر لگانے والے کی ہے جس نے کاہلی کا ثبوت دیا ہے اس کو دوبارہ استعمال میں لانا گویا حکومت کا نقصان کرنا ہے جس کی اسلام میں اجازت نہیں۔ حدیث میں ہے:

« دَعْ مَا يُرِيبُكَ إِلٰى مَا لَا يُرِيبُكَ .»❸

یعنی "شکی شے کو چھوڑ کر بلاشک کے اختیار کر احتیاط اسی میں ہے۔" وَاللّٰهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ.

سوال: ایک نوجوان نے جو کہ شادی شدہ ہے۔ اپنا گھر بار بچے وغیرہ ہیں۔ دوسری کسی عورت سے مراسم پیدا کر لئے (جو کہ بغیر نکاح کے کسی اور مرد کے ساتھ رہتی ہے) اور اس میں اس کی دو عدد بچیاں بھی ہو گئیں مگر اس چیز کا علم اس نوجوان کی اپنی پہلی بیوی اور بچے کو نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس چیز (دو بچیوں) کا علم دوسرے مرد کو ہے کہ یہ دونوں لڑکیاں جو میرے پاس رہتی ہیں۔ کسی اور مرد کی ہیں۔ مگر یہ نوجوان اب بھی اپنی دوست لڑکی کو ملتا ہے جو کہ ابھی تک اسی مرد کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ مرد ان کو اپنی اولاد تصور کرتا ہے اور یہ نوجوان اپنی اولاد تصور کرتا ہے۔ کیا

① یہ بچیاں حلال ہیں یا حرام۔ اگر حرام ہیں تو حلال کیسے ہو سکتی ہیں۔ اگر حرام ہیں تو ان بچیوں کا کیا قصور ہے؟

② اس نوجوان کی اب اپنی سہیلی سے شادی ہو سکتی ہے؟ (جو کہ اہل کتاب ہے)

③ اسلامی قانون کے تحت اس نوجوان کی کیا سزا ہے؟ اس کی سہیلی کی کیا سزا ہے؟ اور ان دو بچیوں کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟

---

❶(۷۳۱) صحیح البخاری، کتاب الاستقراض، باب ما ینهی عن إضاعة المال(۲٤۰۸)، صحیح مسلم، کتاب الأقضیة، باب النهی عن کثرة المسائل...... (٤٤٨١ إلی ٤٤٨٦).

❷ ایضاً

❸(۷۳۲) صححه الألبانی، صحیح الترمذی، أبواب صفة القیامة رقم الباب (۲۲) ح (۲٦٥٠) والنسائی، کتاب الأشربة، باب الحث علی ترك الشبهات(٥٢٦٩)، أحمد (۲۰۰/۱)، المشکاة (۲۷۷۳)، الارواء (۱۲، ۲۰۷٤).

④ اسلام میں جہاں سزا کا تعلق ہے وہاں معافی بھی ہے اس جرم کی معافی کیسے ہوسکتی ہے؟ بچیاں کیسے حلال ہو سکتیں ہیں؟ یا یہ کہ دونوں بچیوں کو یہ نوجوان بھول جائے اور اولاد تصور نہ کرے؟

جواب: ......① سوال میں مذکور دونوں بچیاں چونکہ نطفۂ حرام ہیں اس لئے ان کے حلال بننے کی کوئی صورت نہیں۔ واقعی ان بچیوں کا تو کوئی قصور نہیں، قصور سب زانی کا ہے یا پھر مزنیہ کا ہے لیکن چونکہ یہ حرام ملاپ کا نتیجہ ہیں اس لئے اولاد الزنا ہیں جس کی بناء پر انکا نسب اور میراث جہت والد شرعًا مفقود ہے۔ ہاں البتہ نیکی کی صورت میں ان کے اعمال کا اعتبار اور شمار ہے۔ مثلاً ولد الزنا اہلیت کی بناء پر امامت کرا سکتا ہے۔ حدیث میں ہے:

« يَؤُمُّهُمْ أَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ .» [1]

اس حدیث کے عموم کی بناء پر امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اپنی صحیح میں وَلَدُ الْبَغِيِّ کی صحت امامت پر استدلال کیا ہے۔[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" ذَهَبَ الْجُمْهُوْرُ إِلٰى صِحَّةِ إِمَامَةِ وَلَدِ الزِّنَا " (أيضًا ، فتح الباری ۲/۱۸۵)

یعنی ''جمہور اہل علم کے نزدیک بھی وَلَدُ الزِّنَا کی امامت درست ہے۔''

② کتابیہ سے نکاح کا جواز ہے۔ (سورۃ المائدۃ) بشرطیکہ یہ حرام کاری کے ذریعہ نہ ہو۔ بایں صورت تائب ہونا ضروری ہے۔

③ اگر یہ حرام کاری کے مرتکب ہیں تو ان پر شرعی سزا نافذ ہوگی۔ لیکن اس کا نفاذ کرنا حکومت کا کام ہے۔ بصورت دیگر تائب ہونا کافی ہے اور بچیاں نیکی کی سعی کریں۔

④ زانی اپنے جرم پر اللہ کے حضور تائب ہو اور بچیوں کا سلسلۂ نسب اس سے ملحق نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ حرامکاری کا نتیجہ ہیں۔ جب کہ اسلام عفت و عصمت کا درس دیتا ہے۔

سوال: جو گناہ تصوراتی طور پر سرزد ہو اور عملاً اس کا ارتکاب نہ ہوا ہو۔ کیا وہ قابل گرفت ہے؟

جواب: تصوراتی گناہ پر گرفت نہیں اور اگر عزم و جزم اور مصمم ارادہ ہو چکا ہے۔ تو گرفت ہے حدیث میں ہے:

« إِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِي النَّارِ.» قِيلَ: هٰذَا الْقَاتِلُ فَمَا

---

[1] (۷۳۳) صحیح مسلم ، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب من أحق بالامامة(۱۵۳۲)، ۱۵۳٤) ، صحیح البخاری ، کتاب الاذان ، رقم الباب (٥٤)، تعلیقاً.

بَالُ الْمَقْتُولِ؟ قَالَ:« إِنَّهُ كَانَ حَرِيصًا عَلَى قَتْلِ صَاحِبِهِ .»[1]

اور قرآن میں ہے:

﴿ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ . ﴾ نیز فرمایا: ﴿ اِجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ . ﴾

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مسئلہ ہذا پر نہایت عمدہ انداز میں بحث کی ہے جو لائق مطالعہ ہے۔ ملاحظہ ہو: (فتح الباری: ۳۲۷/۱۱-۳۲۸) حدیث میں حرص کو قابل گرفت شمار کیا گیا ہے جب کہ آیات میں حب اور ظن پر مواخذہ ہے۔ یہ سب افعال قلوب میں سے ہیں۔

سوال: کیا خاوند اپنی بیوی کے مادرزاد منہ میں ڈال سکتا ہے۔ اگر یہ گناہ کسی سے ہو جائے تو اس کے ازالے کا طریقہ کیا ہے؟

جواب: یہ قبیح فعل ہے اس سے احتراز ضروری ہے اس کے مرتکب کے لئے حکم یہ ہے کہ رب کے حضور توبہ استغفار کرے۔

سوال: ایک نوجوان کو کسی غیر محرم مسلمان عورت سے محبت ہوگئی وہ نوجوان پانچ وقت کا نمازی، صوم وصلوٰۃ کا پابند، وضع قطع، طرز بودوباش اسلامی کا حامل ہے مگر معاشرہ کے ۷۵ فیصد نوجوانوں کی طرح وہ بھی دل کھو بیٹھا۔ روزانہ عورت کا دیدار کرتا ہے تو دل کو سکون میسر ہوتا ہے مگر بری نگاہ سے نہیں بالکل پاکیزہ جائز طریقے سے نکاح کا خواہاں ہے۔ تو کیا بندہ کا یہ فعل غیر شرعی تو نہیں؟

جواب: سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آج کے دور کا بالعموم افسوسناک پہلو یہ ہے کہ طرز تعلیم خالصتاً مغربی اور استعماری ماحول کی عکاسی ہے۔ باعث تعجب ہے کہ مسلمانوں پر اغیار کی پروردہ غیر اسلامی حکومت مسلط ہے۔ یہ دراصل مغربی جمہوریت کا تحفہ ہے جسے جہلاء قوم باعث افتخار تصور کرتے ہیں اس کی وجہ سے دین کا درد رکھنے والے حضرات آج ہر جگہ پریشان نظر آتے ہیں۔ ایسے بے دین اور ملحدانہ معاشرہ سے متاثر ہونے کے بجائے اہل دین پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اجتماعی اور انفاقی صورت میں حتی المقدور اس سے نجات حاصل کرنے کی سعی کریں۔ تاکہ اسلامی طرز معاشرت کا قیام ممکن ہو سکے۔ زن مریض کے لئے میری نصیحت ہے کہ غیر محرم کی طرف نگاہ اور التفات سے مقدور بھر اپنے کو محفوظ و مصؤن رکھے۔ نگاہ کی پاکیزگی سے انسان

---

[1] (۷۳٤) صحیح البخاری ، کتاب الفتن ، باب اذا التقی المسلمان بسیفهما (۷۰۸۳) والایمان (۳۱) ، صحیح مسلم ، کتاب الفتن ، باب اذا تواجه المسلمان (۷۲۵۲).

کے دل و دماغ میں طہارت و صفائی اور جلا پیدا ہوتی ہے جس سے آدمی اللہ کے قریب ہو جاتا ہے اور شیطانی راہیں تنگ یا مسدود ہو جاتی ہیں۔ ورنہ نماز، روزہ وغیرہ کے ضیاع کا خوف ہے۔

اور جہاں تک غیر عورت کو نکاح کا پیغام دینے کا تعلق ہے سو شرافت اور اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے یہ کوئی مکروہ یا ممنوع شے نہیں حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا مشہور صحابیہ کے نکاح کا قصہ کتب احادیث [1] میں بالتفصیل درج ہے۔ کئی لوگوں نے ان سے نکاح کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے سے طے پایا کہ اسامہ سے نکاح کر لیا جائے۔ چنانچہ بالفعل ایسے ہی ہوا۔ جس پر بعد میں عورتوں کی طرف سے اظہار رشک ہوا۔ اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا [2] اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا [3] وغیرہ کے نکاح بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش پر ہوئے۔

نیز قبل از نبوت کے واقعات کو بغرض صحت سند جواز کے طور پر پیش کرنا موضوع ہذا سے غیر متعلق بحث ہے کیونکہ ہمارے لئے مستقلاً اصل قابل اتباع زندگی بعد از نبوت ہے۔ میرا مشورہ ہے ''مسئلہ نظر'' کی اہمیت معلوم کرنے کے لئے فرصت کے لمحات میں امام ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب ''کتاب الجواب الکافی'' کا مطالعہ ضرور کریں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ نظر ایک زہر آلود تیر ہے جس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔ اسی بناء پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رویت عین کو زنا قرار دیا ہے۔ [4]

سوال: ایک لڑکا جس کی عمر ۱۲ یا ۱۴ سال ہے ابھی تک اچھی طرح بلوغت کو نہیں پہنچا، اس نے کسی بکری سے برا فعل کر لیا ہے جب کہ بکری چند روز تک بیانے والی ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب: چوپائے سے بدفعلی کرنے والے کے بارے میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں:

① اس کی سزا قتل ہے۔

② زانی پر قیاس کرتے ہوئے اس پر حد زنا قائم ہوگی۔

③ صرف تعزیر ہے۔ دلیل کے اعتبار سے اول الذکر راجح معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے:

---

1 (۷۳۵) صحيح مسلم، كتاب الطلاق، باب المطلقة البائن لا نفقة لها (۳۷۰۴).

2 (۷۳٦) صحيح البخاری، كتاب النكاح، باب تزويج الصغار من الكبار (۵۰۸۱).

3 (۷۳۷) ضعفه الألبانی، النسائی، كتاب النكاح، باب إنكاح الابن أمه (۳۲۵٤)، ضعيف النسائی (۲۰٦).

4 (۷۳۸) صحيح البخاری، كتاب الاستئذان، باب زنا الجوارح دون الفرج (٦۲٤۳) والقدر (٦٦۱۲).

« مَنْ وَقَعَ عَلٰی بَهِیمَةٍ فَاقْتُلُوهُ وَاقْتُلُوهَا .» ❶ (رواه أحمد و أبو داؤد و الترمذی)

علامہ البانی نے ''إرواء الغلیل'' (۱۳/۸) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

موجودہ حالات میں اقامت حد کا مسئلہ چونکہ مشکل امر ہے۔ اس لئے بطور عبرت فاعل کو سزا ضرور ملنی چاہیے، چاہے تعزیر کے علاوہ مالی تاوان (چوپائے کی قیمت وغیرہ) کی صورت میں کیوں نہ ہو۔ یہ انسداد ظلم کی ایک صورت ہے۔ پھر چوپائے بکری وغیرہ کو قتل کر کے بہتر ہے دفن کر دیا جائے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا گیا تو کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ نہیں سنا۔ البتہ میں مکروہ سمجھتا ہوں کہ اس کا گوشت کھایا جائے یا اس سے فائدہ حاصل کیا جائے جب کہ اس سے بدفعلی جیسا قبیح فعل ہو چکا ہو۔

سوال: تنگ کرنے والی بلی کو مارنا جائز ہے؟

جواب: بلی کو قتل کرنا سخت جرم ہے۔ حدیث میں ہے اسی ظلم کی پاداش میں ایک عورت کو جہنم میں داخل کر دیا گیا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے:

« عُذِّبَتِ امْرَأَةٌ فِی هِرَّةٍ سَجَنَتْهَا حَتّٰی مَاتَتْ فَدَخَلَتْ فِیهَا النَّارَ لَا هِیَ أَطْعَمَتْهَا وَ سَقَتْهَا إِذْ حَبَسَتْهَا وَلَا هِیَ تَرَكَتْهَا تَأْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْأَرْضِ .» ❷ (المنتقٰی باب نفقة البهائم)

یعنی ''ایک عورت کو بلی کے سبب عذاب دیا گیا۔ اس نے اسے قیدی بنائے رکھا۔ یہاں تک کہ وہ مر گئی۔ اس کی وجہ سے آگ میں داخل ہوئی۔ اسے روکے رکھا، کھانے پینے کو کچھ نہ دیا۔ اور نہ آزاد کیا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا سکے۔''

نیز گھروں میں کثرت سے آمد و رفت کی بناء پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خدام سے تشبیہ دی اور رفع حرج کی بناء پر فرمایا:

« إِنَّهَا لَیْسَتْ بِنَجَسٍ إِنَّمَا هِیَ مِنَ الطَّوَّافِینَ .» ❸ (رَوَاهُ الْأَرْبَعَةُ وَ صَحَّحَهُ التِّرْمِذِیُّ وَ ابْنُ خُزَیْمَةَ)

---

❶ (۷۳۹) صححه الحاکم والذهبی وأحمد شاکر والألبانی، صحیح الترمذی، أبواب الحدود، باب ما جاء فیمن یقع علی بهیمة (۱۴۹۵)، أبی داؤد، کتاب الحدود، باب فیمن أتی بهیمة (۴۴۶۴)، ابن ماجه (۲۵۶۴) الحاکم (۳۵۵/۴)، أحمد (۲۱۷/۱)، الإرواء (۲۳۴۸).

❷ (۷۴۰) صحیح البخاری، کتاب المساقاة، باب فضل سقی الماء (۲۳۶۴، ۲۳۶۵) عن أبی بکر رضی الله عنه.

❸ (۷۴۱) صححه الألبانی، المؤطا، کتاب الطهارة، باب الطهور للوضوء (۴۱)، صحیح أبی داؤد، کتاب الطهارة، باب سؤر الهرة (۷۵، ۷۶)، الترمذی (۹۲)، ابن ماجه (۳۶۷)، النسائی (۶۸)، المشکاة (۴۸۲، ۴۸۳).

یعنی ''بلی پلید نہیں یہ تو گھر میں چکر لگانے والوں سے ہے۔''

علامہ صنعانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَالْحَدِيثُ دَلِيلٌ عَلٰی طَهَارَةِ الْهِرَّةِ وَسُؤْرِهَا وَ إِنْ بَاشَرَتْ نَجَسًا وَ أَنَّه لَا تَقْيِيدَ لِطَهَارَةِ فَمِهَا بِزَمَانٍ.'' (سُبُلُ السَّلام ۲٤/۱)

یعنی ''اس حدیث میں دلیل ہے کہ بلی اور اس کا جوٹھا پاک ہے۔ اگرچہ نجاست سے ملوث ہو چکی ہو۔ اور اس کے منہ کی طہارت کے لئے مدت کی کوئی قید نہیں۔''

بلی کی تمام قباحتوں کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اظہار رفق فرمایا ہے۔ آپ کی اقتدا میں ہمیں بھی حیوانوں سے نرمی کرنی چاہیے ماسوائے چندان جانوروں کے جن کے قتل کی حل وحرم میں اجازت عام موجود ہے حدیث میں ہے:

« إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلٰی كُلِّ شَيْئٍ .» [1] (رواہ مسلم)

پھر قبیلہ دوس کے ایک صحابی جلیل کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی سے پیار و محبت کی بناء پر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے نام سے نوازا۔ اس قدر غالب آیا کہ اصل نام اس میں دب کر رہ گیا۔ ملاحظہ ہو: (الإصابة وغيره)

لہٰذا اپنی جملہ اشیاء کی حفاظت کا خود بندوبست کریں۔ بلی پر ظلم وستم سے احتراز کریں۔ اور جو ظلم کر چکے ہیں اس کی رب کے حضور معافی کی درخواست کریں۔ ﴿إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا.﴾

ہاں البتہ ایسی خون خوار بلی کو اگر کہیں دور دراز علاقہ میں چھوڑ دیا جائے تو بظاہر اس میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔

سوال: ایک شخص نے ایک سانپ کو زندہ آگ میں جلا دیا۔ بعد میں اسے پتہ چلا کہ شریعت میں اس طرح کے فعل سے منع کیا گیا ہے۔ اب اس عمل کا کفارہ کیا ہوگا؟

جواب: اس فعل کا کفارہ صرف اللہ عزوجل کے ہاں توبہ اور اظہار ندامت ہے۔

❀❀❀❀❀❀❀

[1] (۷٤۲) صحيح مسلم، كتاب الصيد، باب الأمر بإحسان الذبح والقتل ......(۵۰۵۵)

فرمان رسول ﷺ

«أَصْدَقُهُمْ رُؤْيَا أَصْدَقُهُمْ حَدِيثًا .» (مسلم)

«أَصْدَقُ الرُّؤْيَا بِالْأَسْحَارِ .» (مسند أحمد)

«مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَايَتَمَثَّلُ بِي .» (صحيح بخاری)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" إِنَّ النَّائِمَ لَوْ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يَأْمُرُهُ بِشَيْئٍ هَلْ يَجِبُ امْتِثَالُهُ لَابُدَّ أَوْ لَابُدَّ أَنْ يَعْرِضَهُ عَلَى الشَّرْعِ الظَّاهِرِ ، فَالثَّانِي هُوَ الْمُعْتَمَدُ . " (ص:۳۸۹)

﴿۳۶﴾ متعلقاتِ خواب اور تعبیر الرؤیا

سوال: میں نے خواب دیکھا جس میں پہلے کچھ لوگوں کے چہرے دیکھے، پھر ایک سبز طوطا جس کے منہ میں زردی مائل سرخ رنگ کا مرغی کا چوزا جو طوطے سے چھوٹنے کی کوشش میں ہے مگر طوطا بلند ہوتے دیکھا؟

جواب: اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے کو بہتر سے بہتر بنانے کی سعی کریں۔ کوتاہیوں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ واللہ ولی التوفیق. (بحوالہ اَلْإِشَارَات فِیْ عِلْمِ الْعِبَارَاتِ خلیل بن شاہین ظاہری)

سوال: نبی پاک ﷺ کی زندگی میں یا بعد میں کسی صحابی نے آپ ﷺ سے کوئی مسئلہ دریافت کیا ہو؟ نیز ایسے صحابی، تابعی یا کسی عام امتی کا حضور ﷺ سے خواب میں مسئلہ دریافت کیا ہو ہمارے لئے حجت ہو سکتا ہے؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہو گی؟

جواب: بلال بن الحارث المزنی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بحالت خواب رسول اللہ ﷺ نے اسے حکم دیا تھا کہ قحط سالی کے ازالہ کے سلسلہ میں عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ لیکن یہ روایت محل نظر ہے۔ ملاحظہ ہو: (حاشیہ ابن باز، فتح الباری ۲/۴۹۵)

بہر صورت اگر ایسا کوئی واقعہ بحالت خواب پیش آئے تو اسے شریعت پر پیش کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ محض خوابوں سے شرعی احکامات ثابت نہیں ہوتے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

"فَقَدْ صَرَّحَ الْأَئِمَّةُ بِأَنَّ الْأَحْكَامَ الشَّرْعِيَّةَ لَا تَثْبُتُ بِذٰلِكَ ." (۳۸۸/۱۲)

یعنی "ائمہ نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ خواب کے ذریعہ شرعی احکامات ثابت نہیں ہوتے۔"

پھر چند سطور کے بعد رقمطراز ہیں:

" إِنَّ النَّائِمَ لَوْ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يَأْمُرُهُ بِشَيْئٍ هَلْ يَجِبُ امْتِثَالُهُ لَابُدَّ أَوْ لَابُدَّ أَنْ يَعْرِضَهُ عَلَى الشَّرْعِ الظَّاهِرِ ،فَالثَّانِيْ هُوَ الْمُعْتَمَدُ . " (ص:۳۸۹)

"سویا ہوا آدمی اگر خواب میں دیکھے کہ نبی ﷺ اسے کسی چیز کا حکم دے رہے ہیں تو کیا اس کی تعمیل ضروری ہے یا یہ ضروری ہے کہ اسے ظاہری شرع پر پیش کیا جائے؟ دوسری بات قابل اعتماد ہے۔"

سوال: مرنے والے کا دنیا والوں کے ساتھ رابطہ ختم ہو جاتا ہے کیا اس کا خواب میں آنا اور خواب میں اسے اچھے یا برے حال میں دیکھنا حقیقتاً کوئی اہمیت رکھتا ہے؟ بعض اوقات مردہ زندہ لوگوں کے بارے میں خواب میں خیالات کا اظہار بھی کرتا ہے؟

جواب: موت کے باوجود مردہ اور زندہ کا رابطہ خوابوں کی صورت میں قائم رہتا ہے جس طرح کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اسے اچھی اور بری حالت میں دیکھنا کافی اہمیت رکھتا ہے۔ مردے کا زندہ کے بارے میں خیالات کا اظہار کرنا بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ جملہ تفاصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (تَعْطِيْرُ الْأَنَامِ فِيْ تَعْبِيْرِ الْمَنَام، مؤلفه شیخ عبدالغنی نابلسی اور مُنْتَخَبُ الْكَلَامِ فِيْ تَفْسِيْرِ الْاَحْلَامِ اِمَامِ ابْنِ سِيْرِيْن اور اَلْإِشَارَات فِيْ عِلْمِ الْعِبَارَات لِلشَّيْخِ خَلِيْلِ بْنِ شَاهِيْن ظَاهِرِيْ)

سوال: خوابوں کی تعبیر کیسے معلوم کی جائے؟ کیا اس کے متعلق قرآن و حدیث میں کوئی راہنمائی ہے؟ اگر اس موضوع پر کوئی صحیح کتاب ہو تو اس کا نام تحریر فرمائیں؟

جواب: خواب کی تعبیر کتاب و سنت کے نصوص اور آثار سلف کی روشنی میں اور رائی (دیکھنے والے) کی حالت کے پیش نظر کی جاتی ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«أَصْدَقُهُمْ رُؤْيَا أَصْدَقُهُمْ حَدِيْثًا.» [1] (مسلم)

"سب سے زیادہ سچا خواب اس کا ہوتا ہے جو گفتگو میں سب سے زیادہ سچا ہو۔"

اسی بناء پر معروف ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے سب خواب سچے ہوتے ہیں۔ اگرچہ بعض خواب تعبیر کے محتاج ہوتے ہیں اور صالحین کے خواب بھی غالباً سچے ہوتے ہیں۔ اور بعض خواب ایسے بھی ہوتے ہیں جو تعبیر کے محتاج نہیں ہوتے۔ اور دیگر لوگوں کے خواب سچے اور پراگندہ سب قسم کے ہوتے ہیں۔ دوسری روایت میں ہے:

«أَصْدَقُ الرُّؤْيَا بِالْأَسْحَارِ.» [2] (مسند أحمد)

---

[1] (٧٤٣) صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، باب فی کون الرؤیا من الله (٥٩٠٥)، أبو داؤد (٥٠١٩).

[2] (٧٤٤) احمد (٣/٢٩،٦٩)، ح (١١١٧٩ ١١٥٩٣) عن ابی سعید خدری رضی الله عنه و حسنه محققه ـ حمزة، الحاکم (٤/٣٩٢)، ح (٨١٨٣) صححه و وافقه الذهبی.

''سب سے سچا خواب سحری کے وقت کا ہوتا ہے۔''

ایک دفعہ دو آدمیوں نے خواب میں اذان دی۔ امام ابن سیرین رحمہ اللہ نے ایک کے ورع و تقویٰ کے پیش نظر فرمایا۔ تو حج کرے گا۔ قرآن میں ہے:

﴿ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ﴾ (الحج:٢٧)

اور دوسرے کی حالت اس کے برعکس تھی۔ فرمایا: تو چوری میں پکڑا جائے گا۔ قرآن میں ہے:

﴿ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيرُ اِنَّكُمْ لَسَارِقُوْنَ . ﴾ (یوسف:٧٠)

تعبیر رؤیا کے جملہ اصولوں کی تشریح کتاب ''تعبیر الرؤیا'' کے شروع میں موجود ہے جو کافی نفع بخش ہیں۔ موضوع ہذا پر اس کتاب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ بازار سے بزبان اردو دستیاب ہے۔ مؤلف کا اسم گرامی امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ ہے۔

سوال: ازواج مطہرات و امہات المؤمنین میں سے کسی کا کسی امتی کو بطور دینی اصلاح کے خواب میں زیارت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ جیسا کہ حافظ عبدالمنان وزیرآبادی مرحوم کے متعلق واعظین لوگ بیان کرتے ہیں کہ انہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زیارت ہوئی تھی۔ بریلوی حضرات اعتراض کرتے ہیں کہ یہ چیز ازواج مطہرات کے تقدس اور بزرگی کے خلاف ہے۔ آپ واضح فرمائیں کہ حافظ صاحب مرحوم کے متعلق یہ واقعہ صحیح ہے یا نہیں یا عقلاً نقلاً اس طرح کا واقعہ پیش آسکتا ہے یا نہیں؟

جواب: کسی بھی امتی کو بحالت خواب ازواج مطہرات سے شرف ملاقات میسر آجانا کوئی بعید بات یا تقدس کے منافی نہیں بلکہ اس میں رائی کے جنتی ہونے کی بشارت کا پہلو غالب ہوتا ہے جو کہ ہر مسلم کی تمنا ہے۔ ان کی زیارت نصیب ہونا ناممکنات سے نہیں بلکہ ممکن ہے۔ جب خواب میں ذات باری تعالیٰ کی رؤیت ممکن ہے تو مخلوق کی رؤیت کیسے ناممکن ہوسکتی ہے؟

اور حضرت حافظ صاحب کی زیارت کا واقعہ بفرض صحت ظاہر ہے ملاقات بدون رؤیت ہو گی کیونکہ موصوف رحمہ اللہ نابینے تھے۔ بصورت دیگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مُحجَبَة ہوں گی۔ قرآن میں ہے:

﴿ فَاسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ . ﴾ (الأحزاب:٥٣)

ویسے بھی مرتبۂ اُمومت پر فائزہ سے شرف ملاقات عظیم سعادت کی نشاندہی کرتا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ وَ أَزْوَاجه أُمَّهَاتُهُمْ . ﴾

نیز بعض دفعہ خواب میں مرئی حسی شے کے بجائے معنوی بھی مراد ہو سکتی ہے۔ جس سے أَقْرَبُ إِلَى الصَّوَاب نتیجہ اخذ کرنا بتوفیق الٰہی ماہر معبر کا کام ہوتا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب: (تعطیر الأنام لعبد الغنی نابلسی)

سوال: نبی پاک ﷺ کا خواب میں ملنا کیسا ہے۔ کسی نیک متقی بندے کو زیارت ہو سکتی ہے یا نہیں جبکہ کئی امامانِ دین اس کے خلاف ہیں؟

جواب: بحالت خواب نبی ﷺ کا کسی بھی پرہیز گار متقی آدمی کو نظر آ جانا ممکن ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ رَآنِی فِی الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِی فَإِنَّ الشَّیْطَانَ لَایَتَمَثَّلُ بِی .» [1]

(مُخْتَصِرُ الشَّمائِلِ المُحَمَّدِيَّة :ص: ٢٠٦)

یعنی ''جس نے مجھے خواب میں دیکھا پس تحقیق اس نے مجھے دیکھ لیا۔ کیونکہ شیطان میری شکل اختیار نہیں کر سکتا۔''

بالفرض اگر کوئی اس مسلک کے خلاف نظریہ رکھتا ہے تو وہ باطل ہے کیونکہ کتاب و سنت کے نصوص کے منافی ہے۔

سوال: کیا نبی کریم ﷺ کی خواب میں زیارت ممکن ہے؟ اور جب کہ ہماری زبان غیر عربی ہے۔ ہم حالت خواب میں آپ ﷺ سے کس طرح گفتگو کریں گے؟

جواب: خواب میں آپ ﷺ کی زیارت ممکن ہے۔ جس طرح مومن جنت میں آپ ﷺ سے گفتگو کریں گے اسی طرح خواب میں بھی ہو سکتی ہے۔

❀❀❀❀❀❀❀

---

[1] (٧٤٥)صحیح البخاری، کتاب التعبیر، باب من رأی النبی ﷺ فی المنام(٦٩٩٤)،صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، باب قول النبی صلی الله علیه وسلم من رآنی فی المنام ......(٥٩١٩).

۳۷ موت اور اس کے متعلقات

سوال: اچانک موت جس سے اللہ کے نبی نے پناہ مانگی ہے اگر کوئی نیک آدمی اچانک حادثہ میں فوت ہو جاتا ہے، ایسی موت شہادت کی موت تصور کریں گے یا کہ بری موت ہے؟

جواب: اچانک موت بری نہیں۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے: ''ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کی، میری ماں ناگہانی مرگئی ہے۔ میرا خیال ہے اگر اسے گفتگو کا موقعہ میسر آتا تو وہ صدقہ کرتی پس اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کردوں تو اس کے لئے ثواب ہے؟ فرمایا: ''ہاں!'' ❶

وجہ استدلال یہ ہے کہ اس آدمی نے اپنی ماں کی ناگہانی موت کی اطلاع جب نبی ﷺ کو دی تو آپ ﷺ نے کراہت کا اظہار نہیں فرمایا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں حدیث ہذا پر بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے: ''بَابُ مَوْتِ الْفُجَاءَةِ الْبَغْتَةِ .''

مصنف کا مقصود اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اچانک موت مکروہ نہیں البتہ اس کو شہید قرار دینے کے لئے کوئی نص صریح موجود نہیں۔ نجات کا دارومدار انسان کی نیت و اعمال پر ہے۔ علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری مسئلہ ہذا کے بارے میں رقمطراز ہیں: ناگہانی موت کے بارے میں مختلف روایتیں آئی ہیں۔ بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ناگہانی موت اچھی نہیں۔ عبید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ نے ناگہانی موت غضب کی پکڑ ہے۔'' ❷ (أبو داؤد)

اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ: ''ناگہانی موت اچھی ہے''۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: ''ناگہانی موت مومن کے واسطے راحت ہے اور فاجر کے واسطے

---

❶ (٧٤٦) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب موت الفجأة البغتة (١٣٨٨).

❷ (٧٤٧) صححه الألبانی. صحیح أبی داؤد، کتاب الجنائز، باب موت الفجأة (٣١١٠)، أحمد (١٥٤٣٦) شاکر وحمزه، المشکاة (١٦١١).

غضب ہے۔'' [1] (مصنف ابن أبی شیبة)

علمائے حدیث نے ان حدیثوں میں اس طرح جمع وتوفیق بیان کی ہے: کہ جو شخص موت سے غافل نہ ہو اور مرنے کے لئے ہر وقت تیار ومستعد وآمادہ رہتا ہو، اس کے لئے ناگہانی موت اچھی ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم

(کِتَابُ الْجَنَائِز ،ص: ١٤)

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (فتح الباری:٣/ ٢٥٤، ٢٥٥).
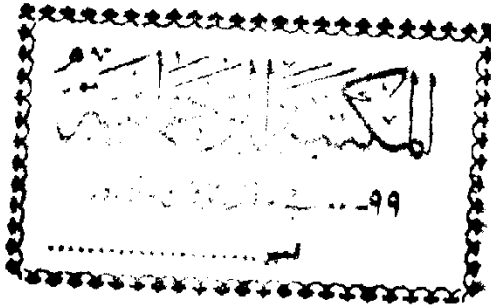
[1] (٧٤٨) (موت الفجأة رأفة بالمؤمن وأسف على الفاجر) موقوفا على عائشة وعبدالله رواه ابن أبی شیبة (٣/٢٤٧) والبیهقی فی الشعب (٧/٢٥٥) (١٠٢١٨) المشکاة (١٦١١) سکت ابن حجر، الفتح (٣/٢٥٤) وقال المندری: رواته ثقات، المرعاة (٥/٣٠٢).

مؤلف کی دیگر علمی تالیفات

١۔ جائزة الأحوذی فی التعلیقات السلفیة علی سنن الترمذی (زیر طبع)

٢۔ شرح العلل للإمام الترمذی (زیر طبع)

٣۔ الوصائل فی شرح الشمائل (زیر طبع)

٤۔ ''فتاویٰ ثنائیه مدنیه'' (جلد ثانی) (تکمیلی مراحل میں ہے)

''دارالإرشاد''

B/214 سبزہ زار سکیم لاہور موبائل 0333-4481597

فون: 8402365

فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ کی خصوصیات

- یہ جلد صرف عقائد سے متعلق تقریباً سوا چھ سو سوالات کے مفصل جوابات پر مشتمل ہے۔
- ''کتاب العقائد'' کو موضوع کی مناسبت سے ''سینتیس ابواب'' میں تقسیم کیا گیا ہے تاکہ عام قاری بھی مسائل کا صحیح ادراک کر سکے۔
- مختلف اشخاص کی طرف سے مختلف مواقع اور احوال میں پوچھے گئے ملتے جلتے سوالات کو ایک ''باب'' کے تحت درج کیا گیا ہے تاکہ قاری کی اجمالی و تفصیلی جوابات سے بیک وقت آگاہی ہو سکے۔
- اس جلد میں پانچ چھ ابواب بہت اہم ہیں۔ ان میں دور حاضر میں پیش آمدہ تقریباً ایک سو سے زائد مسائل پر مدلل اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مثلاً جی۔ پی فنڈ' پرائز بانڈ' بولی اور نیلامی کی کمیٹی' بیمہ زندگی' خاندانی منصوبہ بندی' برائلر مرغیوں کا حکم' ہنڈی کا کاروبار' بیعت کی شرعی حیثیت' انسانی اعضاء کی دوسروں کو منتقلی' انجکشن کے ذریعہ جانوروں کو حاملہ کرنا' عورت کا گاڑی چلانا' عورت کا سر کے بال کٹوانا وغیرہ۔
- تمام عربی عبارتوں پر اعراب لگائے گئے ہیں تاکہ ہر خاص و عام صحیح طور پر استفادہ کر سکے۔
- متن میں موجود آیات و احادیث اور دیگر ناقص حوالہ جات کو مکمل کیا گیا ہے۔
- تمام احادیث و آثار اور دیگر حوالہ جات کی مکمل و مفصل تخریج و تحقیق حاشیہ میں کی گئی ہے۔
- یہ جلد چیدہ چیدہ مقامات پر حافظ صلاح الدین یوسف ﷾ اور قاری نعیم الحق نعیم رحمہ اللہ کی جامع اور نہایت مفید تعلیقات و تصریحات سے آراستہ ہے۔
- اس مجموعہ میں مؤلف کے بعض جوابات پر مختلف اہلِ علم و فضل کے کئی اقساط میں تنقیدی تعاقب اور جواب تعاقب موجود ہیں۔ یہ علمی و تحقیقی مباحث خصوصاً اہلِ علم اور طلبہ کے لیے نہایت دلچسپ اور مفید ہیں۔
- اردو زبان میں پہلی مرتبہ ''افتاء'' اور ''استفتاء'' کے موضوع پر تقریباً پچیس عنوانات پر مشتمل ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر ﷾ کا لکھا ہوا ایک جامع اور وقیع مقدمہ موجود ہے۔ جو تقریباً ایک سو صفحات پر محیط ہے۔ اس کے علمی مباحث ہر خاص و عام کے لیے ایک انمول تحفہ ہیں۔

فتاویٰ

ثنائیہ مدنیہ

جلد اوّل

کتابُ العقائد

214۔ بی سبزہ زار سکیم لاہور۔ پاکستان
فون: 042-8402365-042-7845274
موبائل: 0300-4723844 - 0301-4678065